ماهنامه
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
سعودی عرب میں
قیمت ۴ ریال

SUPER
CRISP

ADMIRAL

LATHER SHAVING CREAM

ADMIRAL Roll-On After Shave Lotion

FOR DAY — LONG FRESHNESS

بھرپور جھاگ، شروع سے آخر تک پُرلطف شیو، نکھری نکھری باوقار شخصیت

ایڈمرل لیدر شیونگ کریم

ADMIRAL OF NEW YORK

پبلشر: معراج رسول ○ مقام اشاعت: اسید مینشن بلیمویا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ○ پرنٹر: ابن حسن ○ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی۔ تار کا پتا: "جاسوسی" کراچی

ڈائجسٹ ملکیت: محترم اے ڈی چشتی صاحب (پاکپتن)

جلد: ۲۲ ○ شمارہ: ۵ ○ مئی ۱۹۹۲ ○ قیمت فی پرچہ ۲۰ روپے ○ قیمت سعودی عرب ۱۰ ریال ○ زر سالانہ: ۲۰۰ روپے ○ خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس ۲۲۹ کراچی ۱

مدیر اعلیٰ

عزیزان من! السلام علیکم

گزشتہ ماہ ایک عجیب اتفاق ہوا۔ شاد صاحب کی طبع زاد کہانی "راہ فرار" کے اختتام پر "انگریزی سے ماخوذ" لکھ دیا گیا۔ حالانکہ وہ کہانی طبع زاد تھی۔ ہوا یوں کہ شاد صاحب نے ایک ہی لفافے میں چند کہانیاں مع سرورق کی کہانی رکھ کر ایک پرچا بھی اسی میں رکھ دیا جس میں بتایا گیا تھا کہ انگریزی کی ایک کہانی مجھے بہت پسند آئی اور اپنے ماحول اور معاشرتی مسائل کے مطابق محسوس ہوئی چنانچہ کچھ رد و بدل کے بعد میں نے اس کہانی کو مشرقی ماحول میں ڈھال دیا ہے۔ آپ بھی اسے چھاپنا پسند کریں گے۔ فوری طور پر چونکہ جاسوسی کے سرورق کی کہانی ہی کا مسئلہ درپیش تھا لہٰذا ہمارا ذہن اسی طرف گیا اور یوں ایک خوبصورت طبع زاد کہانی کی دوشیزگی مجروح ہوگئی۔ بعد ازاں شاد صاحب کے اطلاع دینے پر صورت حال واضح ہوئی اور اب ہم نے سارا ماجرا آپ کے روبرو رکھنا مناسب جانا۔ اس ماہ مزید کسی موضوع پر گفتگو کی اب گنجائش نہیں رہی ہے چنانچہ آیئے ہنگامہ ہائے خطوط کی طرف کہ اس بار بزم چینی نکتہ چینی میں بڑی گرما گرمی ہے۔

محمد امین انجم اس ماہ بزم چینی نکتہ چینی کے پہلے پائیدان پر براجمان ہیں۔ ان طویل انعام یافتہ تبصرے سے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے "چینی نکتہ چینی میں ٹانگ اڑانے کے لئے حصہ بقدر جثہ کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے جاسوسی شمارہ اپریل پر "خامہ فرسائی" کا آغاز جسے آپ اپنی سہولت کے لئے مشق ستم بھی کہہ سکتے ہیں' سرورق سے کرتے ہیں۔ ایک طویل عرصہ کے بعد ذاکر صاحب کے بجائے جناب شاہد کا سرورق نظر آیا لیکن 'معذرت کے ساتھ' قطعاً متاثر کن نہ تھا' بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ٹائٹل کا کوئی سر پیر ہی نہیں تھا' ایک ہاتھ ہی تھا جو ہیرے کا ہار تھا لیکن پہلی ہی نظر میں پتا چل جاتا تھا کہ یہ ہیرے کم اور پتھر زیادہ ہیں۔ جہاں تک سبز عینک کا تعلق ہے وہ تو قابل برداشت تھی لیکن یہ جاننے کے لئے کہ یہ عینک والی ہے یا عینک والا' تھوڑا سا تردد کرنا پڑا۔ جاسوسی کی حسیناؤں کی تو چاند چہرہ ستارہ آنکھیں ہوتی ہیں لیکن موصوفہ کے مردانہ ہونٹ دیکھ کر انہیں حسیناؤں میں شامل کرتے ہوئے ڈر سا لگا لیکن پھر بہ امر مجبوری اسے حسینہ تسلیم ہی کر لیا کیونکہ اگر زنانہ اور مردانہ میں سے کسی ایک صنف میں شمار نہ کرتے تو پھر کیا تیسری صنف میں! ہونٹوں کی سیدھ میں پڑے خون آلود چہرے کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ بغیر آنکھوں کے چہرہ کہاں سے آگیا کیونکہ سر سے بہنے والے خون کو ہم نے کبھی بھی اتنی صفائی سے بہتے نہیں دیکھا کہ وہ زخمی یا مقتول کی آنکھوں کو چھپا جائے کیونکہ خون آخر خون ہوتا ہے کوئی پولیس رپورٹ تو نہیں ہوتی جو حقائق کو چھپا جائے۔ اتنی تنقید کے بعد بھی اگر میں کہوں کہ سرورق اچھا تھا تو یہ میری منافقت ہوگی۔ محرابوں میں بجے کہانیوں کے عنوانات اور تصاویر دونوں جاذب نظر تھے' ان دو صفحات پر براہ ہونے والی یہ تبدیلی اچھی روایت ہے۔ صرف چودہ قارئین کے محبت ناموں پر مشتمل چینی نکتہ چینی' حسب معمول تھی۔ بشیر علی' غلام عباس اور محسن زیدی نے اپنے تبصروں میں زور قلم کا مظاہرہ کیا تھا' محترمہ ایلا خانم کی شکایت میں کوئی وزن نہیں تھا۔ انہیں چاہئے کہ آئندہ اس مقصد کے لئے "بات" استعمال کریں۔ اس وقت کرۂ ارض پر جس آگ کے شعلے سب سے نمایاں ہیں وہ بے تیل کی آگ۔ علیم الحق حقی کی یہ کاوش سسپنس اور واقعات کے اعتبار سے ایک یادگار تحریر تھی۔ خرم نواز نے بین الاقوامی فراڈیئے روبن کو اپنی ذہانت اور قوت فیصلہ سے جس طرح قدم قدم پر مات دی وہ اسی کا خاصہ ہے۔ مغنی روایات کے پس منظر میں لکھی جانے والی تسیم جاوید سید کی جعرات ایک خوب صورت تخلیق تھی۔ مائرہ رحمٰن نے ایک نقطے کو ذہن میں رکھتے ہوئے قاتل ڈاکٹر نیش اور مون کو قانون کے آہنی شکنجے تک پہنچایا۔ کتے کی چوری مشہور زمانہ فنکار رینگ ویلٹ کا نیا کارنامہ تھا' ویسے رینجیل تو کیا تک نے بھی واقعتاً کوئی ایسی چیز کھائی بھی ہے جو ناکارہ ہو؟ محمود احمد مودی کے سرکش کی بائیسویں قسط بھی حسب معمول خوب سے خوب تر تھی۔ جس میں وزیر خارجہ کی حفاظت کے لئے کئے جانے والے اقدامات کی واقعاتی تصویر کے ساتھ ساتھ مصنف نے ایک بیوروکریٹ کی زندگی کے اہم گوشوں سے بھی پردہ اٹھایا۔ یہ قسط بڑی حد تک تجسس سے بھرپور رہی۔ خالدہ شاد کی بازیابی ایک پُرلطف اور دلچسپ کہانی تھی' بل واقعی ایک ذہین اور مستقبل میں جھانکنے والا چالاک مجرم ثابت ہوا جس نے اپنی بیوی اور بچوں کو مشقت سے بچانے کے لئے اپنے خط کے ذریعے پولیس والوں کو چکمہ دیا۔ انعامی نمبر ایک متاثر کن تحریر تھی۔ دولت کا لالچ انسانی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے جس کا نتیجہ کبھی بھی مثبت نہیں نکلتا۔ یہی حال انعام یافتہ لاٹری کے یکے بعد دیگرے بننے والے تین مالکان کا ہوا جو انعامی رقم کے لالچ میں موت کی آغوش میں چلے گئے۔ ظفر اعجاز کی کتاب مرگ دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی جانے والی ایک طویل کہانی تھی جس کا حرف حرف لہو رنگ اور لمحہ لمحہ مسلسل تھا۔ کیملی کی موت وطن پر جان نثار کرنے والے مجاہد کی موت تھی جبکہ ہرمن نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے اپنی بہن اناستا کو آزادی دلوادی۔ مجموعی اعتبار سے کتاب مرگ متاثر کرنے والی اور پرجوش جذبوں کی ترجمان تحریر تھی۔ عدالت در حقیقت نصرت اسلام کے ضمیر کی عدالت تھی جس میں فیصلہ اس کے خلاف ہوگیا اور رکن الدین نے اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اور جو خود اپنے آپ کو سزا دینا چاہتا تھا اس کے ہاتھوں موت کی آغوش میں جا سویا۔ پہلی تماشا ایک چالاک دور بین اور معاملہ فہم عورت کی وصیت پر مبنی ایک انوکھی تحریر تھی' آنٹی سوسن نے کیولن کے لئے جو سزا تجویز کی تھی وہ واقعی منفرد تھی۔ اسی ہزار ڈالر سے محرومی واقعی عمر بھر کے لئے بے سکونی کی سزا تھی۔ احمد اقبال کے شکاری سکندر اور غالب دشمنوں پر غالب رہنے کے باوجود اس قسط میں بھی گنگا جمنا کے دیس میں صحرانوردی کرتے نظر آئے' ویسے یہ قیام کچھ زیادہ ہی طویل ہوتا چلا جارہا ہے۔ شرر لفظاتیوں' حشر سامانیوں' عیاریوں اور مکاریوں کے درمیان یہ قسط بغیر کسی خاص واقعہ کے گزر گئی' ماسوائے اس کے کہ بھارت کا مشہور ڈاکو اگروال مکافات عمل کے تحت اپنی محبوبہ ساتولی کے ساتھ واصل جہنم ہوگیا۔ عائشہ جمال کا سلسلہ در سلسلہ آپ اپنے دام میں آگیا صیاد کے مصداق قتل در قتل کا سلسلہ تھا۔ پلاٹ کے اعتبار سے کہانی جاندار تھی۔ سنتے آئے تھے کہ چالاک مجرم پولیس کو غلط راستے پر ڈالنے کے لئے لازمی ثبوت موقع واردات پر چھوڑ دیتے ہیں' لیکن ساجد امجد کی ٹیڑھا آدمی میں آمنہ جمال تو چالاک مجرموں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی۔ پاکیزہ خان کی کمان غالب

اوسط درجے کی ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی جس میں ماہر نفسیات ڈیوس 'مارک اسٹیفن کے بیٹے جمی کا نفسیاتی علاج کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ راہِ فرار سرورق کا بسلا رنگ تھا۔ کہانی کا مرکزی کردار سراج الحق اس اعتبار سے داد کا مستحق ہے کہ اس نے قدرت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی حرام کمائی کو نذرِ سمندر کیا اور نئی زندگی بسر کرنے کے عزم کے ساتھ جہاز پر قدم رکھے۔ آئیڈیے اور موضوع کے اعتبار سے راہِ فرار معیاری 'عبرت انگیز اور متنوع تحریر تھی۔ وفاؤں کی چکی کے دو پاٹوں میں پسنے والی مہرالنساء اور خاندانی وقار 'عزت اور اپنی بیوی سے وفا کا بھرم قائم رکھنے والے حیدر علی کی کہانی مقابلۂ وفا منظر امام کی شاہکار تخلیق تھی۔ یہ ایسی وفاؤں کا مقابلہ تھا جس میں وفا کا دم بھرنے والوں نے اپنی وفاداری کے لئے جان تک قربان کردی۔ ایک کردار مہرالنساء تھی جس نے ایک طرف تو اپنی پہلی چاہت سجاد حسین کی معاشی مشکلات میں اس کا ساتھ دیا لیکن دوسری جانب اپنے سہاگ سے بھی بے وفائی نہیں کی۔ دوسرا لازوال کردار حیدر علی کا تھا جس نے اپنی بیوی کے ماضی کو جانتے ہوئے بھی ہر کڑی آزمائش میں اس کا ساتھ دیا اور خلوص ووفا کے ان چراغوں کی لَو کو کبھی تھرتھرانے نہ دیا جس سے اس کی خانگی زندگی منور تھی۔ اس ساری کہانی میں جہاں حیدر ملک اور شجم جیسے خواہشات اور دولت کے پجاری سازشوں کے تانے بانے بُنتے نظر آتے ہیں وہاں خورشید جیسے وفادار ملازم بھی اپنے مالک کا آخری دم تک ساتھ نبھاکر حق نمک ادا کرتے ملتے ہیں۔ مقابلۂ وفا سرورق کی کہانیوں میں پہلے نمبر پر رہی کیونکہ اس میں سرورق بھی موجود تھا۔ دھرتی ماں کے ناموس اور حفاظت کے لئے اپنے ہی خون کو سلاخوں کے پیچھے پہنچانے والے رحمت اللہ کے کردار کے گرد گھومنے والی غلام قادر کی کھرا کھوٹا سرورق کا آخری رنگ تھا جو دوسری پوزیشن کا حقدار قرار پایا۔ معاشرے کی نفرتوں کا شکار لیلیٰ 'مولا بخش اور دارا 'سلام کے قابل ہیں جنہوں نے ناموسِ وطن کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیا۔ یہ تو تھے سرورق کے رنگ 'بہرحال کوئی بھی کہانی سرورق سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتی تھی 'ماسوائے دوسرے رنگ کے جس میں ہیروں کی حد تک ٹائٹل کی جھلک نظر آئی۔ کترنیں حسبِ معمول کم تھیں۔" (عزیزم! ایک سال کے لئے اعزازی طور پر سرگزشت حاصل کرنے کی مبارک باد قبول فرمایئے۔ آپ نے کتابت کی جن غلطیوں کی نشاندہی فرمائی ہے اس کے لئے ہم مشکور ہیں۔ البتہ آپ کی بعض آرا سے ہمیں اختلاف ہے۔ اقتباسات اگر قارئین کی جانب سے موصول ہوتے ہیں تو ہم ان پر نام ضرور دیتے ہیں۔)

اظہر کی لاہور سے بزمِ چینی میں زقندیں "اپریل کا شمارہ سامنے رکھا ہے۔ ایک صاحب سرورق کی مہ جبیں کے چشمے میں سے جھانکتے ہوئے پستول سے خاکسار کا نشانہ لئے ہوئے ہیں (خاکسار شاید سامنے ہی لیٹا ہوا ہے 'زخمی حالت میں) مہ جبیں کے چہرے پر سفاک سرد مہری ہے۔ ایک اور حضرت چہرے پر خون مل کر استراحت فرمارہے ہیں۔ غالباً قتل ہوچکے ہیں۔ چہرے سے ذرا اوپر کرکے عید مبارک لکھا ہے۔ عید مبارک کہنے کا کیا ہی بھیانک انداز ہے (کسی نہ کسی طرح عید کی مبارک باد آپ تک پہنچی تو) کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے پہلے محترمہ راحیلہ خان کی غلط فہمی دور کردوں بلکہ خوش فہمی کہنا زیادہ بہتر ہے۔ موصوفہ کو خوش فہمی یہ ہے کہ میں ان کی ایک خیالی ہم صنف پر مرمٹا ہوں ـــــ راحیلہ صاحبہ! مرنے مٹنے کے زمانے تو کب کے رخصت ہوئے (تو کیا اعصائے پیری ہاتھ میں پکڑے بیٹھے ہو؟) سپنے دیکھنا چھوڑیئے۔ شکر کیجئے اس پیشہ ورانہ دور میں کچھ لوگ حسنِ ظن سے کام لے کر خواتین کی تعریف کردیتے ہیں۔ تعریف کسی تصویر کی 'کسی کوّے کی 'پھول کی یا چمگادڑ وغیرہ کی ہوسکتی ہے مگر مرمٹنا۔ استغفراللہ! بچوں والی باتیں مت کیجئے۔ عقل سے کام لینا سیکھئے (حضرت! یہ جو اردو کے وعظ میں آپ نے عربی کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے کیا زورِ مسلمانی دکھانا مقصود تھا؟) آپ کو اس بات پر ناز ہے کہ آپ خیالی دنیا سے باہر رہ کر 'دوسرے لفظوں میں بغیر سوچے سمجھے تبصرہ کرتی ہیں۔ شاید اسی لئے اُلٹا سیدھا بانک جاتی ہیں۔ آئندہ احتیاط برتیے گا 'یہ تنبیہہ نہیں ہے صرف دوستانہ مشورہ ہے۔ معراج رسول صاحب! آپ نے جاسوسی پڑھنے والیوں کے بیچ مقابلۂ حسن کب کروایا؟ جس میں گوجرانوالہ کی ایک پڑھنے والی ملکۂ حسن منتخب ہوئیں اور مس جاسوسی کی نظرِ کرم سب سے پہلے مجھ پر پڑی (نتیجتاً آپ سنگھاردان کے آئینے کی طرح چمک رہے ہیں۔ واہ بھئی واہ کیا نظر پڑی ہے) مس جاسوسی نے خود کو بھولی بھالی لڑکیوں کی صف میں شامل کیا ہے۔ بھولا بھولا ہونا یا عقل سے پیدل ہونا ایک ہی بات ہے۔ صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔ اب رسم نبھاتے ہوئے کہانیوں پر تبصرہ کرلوں۔ پہلی کہانی جو حقی صاحب نے لکھی ہے۔ اس پر میں اپنا تبصرہ محفوظ رکھتا ہوں (کہاں؟) شکاری کی قسط زوردار تھی۔ سقوط ڈھاکا کا المیہ گزر گیا۔ لگتا ہے اب کہانی تیزی سے انجام کی سمت بڑھے گی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں رہا۔ شکاری ایک بوڑھا کھلاڑی ہے۔ جس پر ہمیں فخر ہے مگر جس کی ریٹائرمنٹ قریب ہے۔ سرکش میں راحیلہ سے ملاقات ہوئی (یہ راحیلہ تو آپ کی جان کو آگئی 'سرکش میں بھی ٹکراؤ ہوگیا! یا مسبّب الاسباب) پیسے پورے ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی ایکشن بھی کافی تھا۔ شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہی۔ ابوالمنصور بیگ ولیٹ کے ساتھ اور بیگ صاحب کتے کے چکروں میں جلوہ گر ہوئے۔ باغبانی میں باغبان کا کردار پسند آیا۔ ہمارا مالی بہت دنوں سے غائب ہے۔ باربار دھیان اس کی طرف گیا۔ مینڈکوں کا کردار بھی برا نہیں تھا۔ انعامی نمبر خوب صورت کہانی تھی 'نہایت خوب صورت۔ موضوع نیا نہیں تھا مگر اندازِ بیان اور کلائمکس انتہائی متاثر کُن تھا۔ ایسی کہانی جو ایک ہی سانس میں پڑھ لی جائے اور پھر دیر تک نظریں صفحے پر جمی رہیں۔ جیسے کسی اچھی فلم کے اختتام پر بندہ اسکرین کو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ کتاب مرگ جتنی تہلکہ خیز ہونی چاہئے تھی 'تھی نہیں۔ کافی عرصے سے جاسوسی میں کوئی چوندا چوندا ناول نہیں پڑھا۔ عدالت اتنی سیدھی اور جذباتی سی کہانی ہے کہ اس پر تبصرہ کرنا بیکار ہے۔ پہلی تماشا تجسس کے حوالے سے خوب تھی۔ سلسلہ در سلسلہ اسم بامسمّٰی کہانی تھی۔ پسند آئی۔ پیاز کی طرح ہر بات کے نیچے ایک اور پرت اور آخر تک پرتیں ہی پرتیں۔ ٹیڑھا آدمی نہایت کمزور کہانی ثابت ہوئی۔ گمان غالب دلچسپ کہانی تھی۔ ایسی کہانی پڑھ کر صحیح معنوں میں تفریح کا احساس ہوتا ہے۔ راہِ فرار اس ماہ کی سب سے زیادہ ہٹ کہانی ہے۔ آخر میں انگریزی سے ماخوذ پڑھ کر تھوڑی سی مایوسی ضرور ہوئی لیکن ـــــ (امید ہے وضاحت پڑھ کر مایوسی دور ہوگئی ہوگی) مقابلۂ وفا عید کے دوسرے دن پڑھی۔ اسی رات ٹی وی پر کراچی سینٹر کا اسٹارنائٹ شو تھا جو منظر امام صاحب کا ہی تحریر کردہ تھا اور جسے دیکھ کر احساس ہوا کہ کہانی زیادہ اچھی تھی۔ غلام قادر صاحب کو ہنی مون سے واپسی مبارک ہو۔ کھرا کھوٹا تیز رفتار اور پُراثر داستان تھی مگر کچھ مکالمے زیادہ جذباتی اور رسمی رنگ اختیار کرگئے تھے۔" (خط کے آخر میں جو بچگانہ دھمکی تحریر کی گئی ہے 'اسے پڑھ کر افسوس ہوا۔ ایسی باتیں بارہ سے پندرہ سال کی عمر تک اچھی لگتی ہیں۔ لطائف کے ضمن میں شکوہ بجا ہے۔ آئندہ خیال رہے گا۔)

طارق علی قمر کا بھوہ ،ضلع قصور سے "پہلی دفعہ یہ الزام اپنے سر لے رہا ہوں کہ میں بھی جاسوسی ڈائجسٹ کا قاری ہوں (آپ کی پاک دامنی پر اس داغ کا ہمیں افسوس ہے) کبھی خط لکھنے کی غلطی تو نہیں کی تھی لیکن اس دفعہ یہ غلطی کرنے کو بہت جی چاہا (انسان کو بھٹکتے کیا دیر لگتی ہے بھائی) اس

دفعہ سرورق شاہد حسین کی غلطی تھا(جی ہاں' شادی کے بعد یہ غلطی بہ صد اصرار کی ہے) اور نامعلوم رمضان کی کن راتوں کا خواب تھا جو انہوں نے چہرے کے اتنے نزدیک کے پوز بنا ڈالے۔ بہرحال سرورق پسند آیا۔ چینی نکتہ چینی میں معلوم ہوتا ہے کہ خواتین واک آؤٹ کر گئی ہیں(یہ غلط فہمی اس بار دور ہو جائے گی۔ اب تو میدان میں آئی ہیں) محسن زیدی کا تبصرہ پسند آیا لیکن انہوں نے خود شکایت کی تھی کہ انیس احمد صدیقی کا تبصرہ کچھ طویل تھا۔ اب ان کا بھی تبصرہ بڑا طویل ہے' اس کا کیا کریں(جتنا پڑھ سکتے ہیں' پڑھ لیں' باقی چھوڑ دیں) باقی تبصرے کچھ اچھے تھے اور کچھ بس گزارے لائق۔ تل کی آگ' علیم الحق حقی کی بہت پسند آئی۔ اس کے بعد تازہ کارنامۂ چوری جس طرح پاکستان کا تازہ کارنامہ ورلڈ کپ ہے اسی طرح تنگ دلیوٹ کا کارنامہ چوری جو ابوالمنصور صاحب کی تھی' بہت پسند آئی۔ بڑی جاندار کہانی تھی۔ اس کے بعد باری آتی ہے سرکش کی۔ اس دفعہ سرکش اچھی رہی لیکن اتنی بھی زیادہ نہیں۔ اس دفعہ سرورق کے رنگ میں سے کوئی بھی سرورق جیسا نہیں تھا لیکن راہِ فرار اچھی کہانی تھی۔ ہمارے معاشرے میں جو ناسور ان ٹاپ کلاس افسروں نے پھیلایا ہوا ہے یہ اسی طرح ہی ختم ہو سکتا ہے۔ دوسرا رنگ منظر امام کا مقابلۂ وفا بڑی اچھی کہانی تھی لیکن یہ بھی سرورق کے مطابق نہیں تھی۔ اس میں حیدر علی کا کردار بڑا اچھا تھا۔ حیدر علی نے مقابلۂ وفا جیت لیا لیکن کسی کی بے خبری میں۔ تیسرا رنگ غلام قادر کی کھرا کھوٹا اچھی کہانی تھی۔ باقی کہانیوں میں عدالت' جبران عدیل کی اور پہلی تماشا' مہتاب جلیل کی اچھی کہانیاں تھیں لیکن جو تعریف باغبانی میں خالدہ شاد کی کی جائے وہ کم ہے۔ اس کہانی میں تجسس بہت ہے جو کہ جاسوسی ڈائجسٹ کا لازمہ ہے۔"

شہناز ملک کا اظہارِ افسوس' کراچی سے "جاسوسی پڑھنے کا اتفاق اکثر و بیشتر ہوتا رہتا ہے۔ سلسلہ وار ناول کے علاوہ کہانیاں زیرِ مطالعہ ہوتی ہیں۔ خاص طور پر سرورق کے تینوں رنگ۔ چاہنے کے باوجود آج تک خط نہ لکھ سکی اور اکثر لکھے ہوئے خطوط سستی کی وجہ سے حوالۂ ڈاک نہ کر سکی۔(پھر تو یقیناً انہیں ردّی کی ٹوکری میں ڈالنا پڑا ہوگا۔ اب اگر یہ کام ہم کرتے تو ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے) سب سے پہلے میں چینی نکتہ چینی ہی پڑھتی ہوں۔ محسن زیدی' فیصل آباد کا تبصرہ پڑھا اور انہوں نے بشرطِ انصاف کے بارے میں جو کہا کہ اس میں سراسر قصور سلطانہ بیگم کا تھا۔ کتنے افسوس کا مقام ہے' کوئی بھی اپنی داڑھی میں تنکا تو دیکھتا نہیں دوسروں پر تنقید اپنا حق سمجھتے ہیں۔ کیا وہ شوہر اتنے مظلوم تھے کہ انہیں دوسری شادی کی ضرورت پیش آگئی اور وہ بھی اس وقت جب ان کے بچے بھی تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ وہ خود ایک مرد ہیں(اور آپ یہ سب کچھ اس لئے کہہ رہی ہیں کہ آپ ایک عورت ہیں) محسن زیدی صاحب کچھ غور تو کر لیں کیا آپ ہر چیز کو صرف ایک رخ سے دیکھتے ہیں؟ (حالانکہ اللہ نے دو آنکھیں دی ہیں' دو رخ سے دیکھنے کے لئے) میں کسی سے باوجود کوشش کے اختلاف نہیں کرتی کہ ہر کسی کی اپنی رائے ہوتی ہے لیکن یہ جملہ پڑھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں لکھنے پر مجبور ہو گئی(اس معاملے میں بھی یہ خیال کر لیا جاتا کہ ہر انسان کی اپنی رائے ہوتی ہے) اگر یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو میں بھی صرف چند لائنیں بھرنے کے لئے کچھ لکھ دیتی۔ اگر ان تمام واقعات کو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو آپ اتنے وثوق سے انہیں بے قصور نہ خیال کرپاتے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے(اب کی نا آپ نے پتے کی بات) اور علی عباس کتنے مظلوم تھے کہ اتنا اچھا پلان ترتیب دے لیا' صرف اس لئے کہ دوسری بیوی نہ چھوٹنی پڑے۔ دکھ اور غصے سے مجھے الفاظ نہیں مل پا رہے کہ میں مزید کچھ لکھوں۔"(بی بی حوصلہ رکھو' ہم تمہارے دکھ میں برابر کے شریک ہیں اور محسن زیدی کے اس شرانگیز بیان کی پُرزور مذمت کرتے ہیں)

قیصرہ نور عین کی خیال آرائی' لاہور سے "میری طرف سے شکاری کو نویں سالگرہ مبارک ہو۔ اسی مہینے میں میری بھی سالگرہ ہوتی ہے۔ شکاری مجھ سے صرف ١٠ سال ہی چھوٹا ہے۔ شکاری کی رفتار اب کچھ کم ہو گئی ہے۔ اینڈ چاہے سنسنی خیز نہ ہو میں پھر بھی شکاری کو ہی پڑھتی ہوں۔ اس ماہ کا سرورق مارچ سے بہت بہتر ہے۔ سرکش کو نہ جانے کیا ہوا ہے' باتیں کرنے پر آتا ہے تو کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس ماہ کی قسط بہت اچھی تھی۔ اس میں افضل ایکشن میں نظر آیا ہے۔ ابتدائی صفحات میں علیم صاحب کی تل کی آگ بہت پسند آئی۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ زر' زن اور زمین کے بعد سب سے زیادہ وجۂ نزاع تل ہی ہے۔ نسیم جاوید سید کی کہانی جمعرات اچھی تھی لیکن بیوہ موتی نے اپنے جرم کا اقرار بہت جلد کر لیا۔ کتے کی چوری نے اس بار بِگ کو کچھ عرصے کے لئے پھنسا ہی دیا۔ باغبانی پڑھنے سے معلوم ہوا کہ لوگ کیسے کیسے طریقوں سے اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ جین کا شوہر یقیناً بہت ذہین شخص تھا(اللہ ایسا شوہر سب کو دے) کامل ظہیر کا انعامی نمبر تو جراثیم کا پلندہ معلوم ہوتی تھی۔ نکٹ کا حشر پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ انعام ایڈتھ کو تو مل جانا چاہئے تھا اس کمزور سی عورت نے کتنی محنت کی تھی آخر۔ کتاب مرگ بہت خوب صورت کہانی تھی۔ خاص طور پر کرانز کا کردار بہت اچھا تھا۔ مہتاب جلیل نے پہلی تماشا میں کیرولین کے ساتھ بہت ناانصافی کی۔ اس نے کوئی جان بوجھ کے سوسن کے منگیتر کو قتل کیا تھا۔ عائشہ جمال کی سلسلہ در سلسلہ بہت اچھی تھی۔ ٹیڑھا آدمی جو کہ ساجد امجد نے تحریر کی تھی کوئی خاص تحریر نہیں تھی۔ سرورق کے رنگوں میں اس دفعہ سب سے پہلا رنگ پھر عبدالقیوم شاد کا تھا۔ شاد صاحب اس پوسٹ پر کسی اور کو کیوں نہیں آنے دیتے؟ (وہ کہتے ہیں "ہم سا ہو تو سامنے آئے") پہلا رنگ بہت اچھی اسٹوری تھی لیکن آخر میں انگریزی سے ماخوذ دیکھ کر بہت افسوس ہوا(اس غلطی کا ہمیں بھی افسوس ہے) دوسرا رنگ جو کہ منظر امام نے تحریر کیا' سرورق سے بھرپور تھا۔ میرا مطلب ہے سرورق کی تمام جزئیات اس میں تھیں۔ غلام قادر کی کھرا کھوٹا بہت زیادہ پسند آئی۔ غلام قادر پڑھتے ہی ذہن میں غلام جیلانی آتا ہے' نہ جانے کیوں۔ مائنڈ مت کیجئے گا(ہم تو خیر مائنڈ نہیں کرتے مگر..... ویسے تو انہیں بھی نہیں کرنا چاہئے) غلام قادر لگتا ہے بہت محبِ وطن ہیں۔ اسی لئے مجھے ان کی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ شملا رضا سے کہیں کہ وہ بھی کچھ لکھیں۔"

حضور بخش سمیجو اور ماسٹر نظیر احمد ناز کا مشترکہ عنایت نامہ' ٹنڈو مسو خان گھوکی سے "اپریل کا شمارہ جسے "عید نمبر" بھی کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا' ہمیں تھوڑا وقت سے پہلے مل گیا۔ حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ عید سے پہلے ہی ہماری عید ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ اگر شاہد صاحب کے یہی حال رہے تو ایک دن ذاکر صاحب کو مصوری کا اقتدار چھوڑنا ہی پڑے گا۔ کیا غضب کا سرورق تخلیق کیا ہے۔ حسن کی رنگینیوں کے ساتھ ساتھ دہشت بھی تھی۔ ابتدائی صفحات پر حقی صاحب قابض تھے۔ تل کی آگ پڑھنا شروع کیا تو کچھ ہوش نہ رہا۔ خرم نواز اور ہمارے حالات تھوڑے بہت ملتے جلتے ہیں۔ جب کہانی اپنے اختتام کو پہنچی تو دل سے بے اختیار یہ صدا اٹھی کہ کاش! حقی صاحب ہمارے سامنے ہوتے تو ہم قلم سمیت ان کے ہاتھ چوم لیتے۔ کہانی نے کسی بھی موڑ پر بوریت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ نسیم جاوید سید کی ہنسی مذاق سے شروع ہونے والی جمعرات آخر میں جا کر سمجھ میں آئی۔ شکاری کی گزشتہ قسط میں جب دلاور کا ذکر آیا تو ہم یہ سمجھے کہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ مگر موجودہ قسط پڑھ کر بلکہ شروع کرتے ہی یہ

احساس ہوا کہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ سرورق کا پہلا رنگ راہِ فرار شاد صاحب کی ایک لاجواب اور عمدہ کاوش تھی۔ شاد صاحب نے ہمیشہ حساس موضوع پر اپنے قلم کی نوک رکھی ہے۔ جو بھی تحریر کرتے ہیں حالات کی ہو بہو عکاسی ہوتی ہے۔ یعنی ایک آئینہ ہوتا ہے ہمارے آگے کہ دیکھیں آپ کیا سے کیا ہوتے جارہے ہیں۔ بس یہیں تک مطالعہ کرسکے ہیں۔"

نیلم رضا ٹوانہ کی باتیں، مظفر گڑھ سے "جاسوسی خریدا۔ حسبِ معمول سرورق پر نظر پڑی۔ خوب صورت تھی۔ لڑکی پیاری تھی۔ کچھ کچھ مجھ سے مل رہی تھی لیکن بہرحال ہم ــــ (یعنی ہم تو بس ہم ہی ہیں) یہ کیا! قریب ہی ایک جن صاحب لیٹے ہوئے ہیں۔ اوہ! نہیں یہ تو آدمی کا مجسمہ ہے۔ اس تصویر کو لے کر رات کو بچوں کو ڈرایا کریں گے۔ اب آگے چلیں۔ یہ شکاری کو کیا ہوتا جارہا ہے۔ حالیہ قسطوں میں مایوسی کا عنصر کچھ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ سرکش کچھ ٹھیک جارہی ہے۔ سرورق کے رنگ پڑھے۔ پہلا رنگ کچھ ٹھیک تھا۔ دوسرا رنگ انتہائی فضول تھا۔ تیسرا رنگ تقریباً ٹھیک تھا۔ اس شمارے کی بہترین کہانی پہلی کہانی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہت زبردست کہانی تھی۔ دوسری تمام کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ کتے کی چوری بھی پسند آئی۔ اس دفعہ جاسوسی نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔"

ح۔م۔ح، لاہور سے فرماتے ہیں یا فرماتی ہیں، کچھ پتا نہیں۔ نام کی طرح ان کی تذکیر و تانیث بھی مشکوک ہے۔ "اور سنائیے آج کل کیا معروفیات ہیں (آپ کے خطوط پڑھ رہے ہیں) امید ہے کہ بخیریت ہوں گے اور ہمارے نامہ بر کو ردی کی ٹوکری کی زینت بنانے کے لئے تیار (جھوٹ، بالکل جھوٹ ہم ثابت کرسکتے ہیں) اس بار سرورق کوئی خاص نہ تھا۔ محترم محسن زیدی کا تبصرہ اچھا تھا۔ علیم الحق حقی صاحب کی موجودہ عالمی پس منظر کی مناسبت سے تیل کی آگ اچھی تحریر تھی۔ جمعرات اچھی تھی (اور جمعہ کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ وہ چھٹی کا دن ہوتا ہے) بگ صاحب بہت دنوں بعد نظر آئے۔ سرکش اور شکاری کسی بھی تعریف کی محتاج نہیں۔ باغ بانی خالدہ شاد کی اچھی بہت اچھی تحریر تھی۔ انعامی نمبر اور کتاب مرگ بس ٹھیک ٹھاک تھیں۔"

انیلہ خانم کا اعلانِ جنگ کراچی سے "سرورق جاسوسی کے عین مطابق ہے۔ اس دفعہ ٹائٹل ذاکر صاحب کے بجائے شاہد حسین صاحب نے بنایا وجہ؟ (وجہ صاف ظاہر ہے۔ ذاکر صاحب ایک ماہ کی چھٹی مانگ رہے تھے کئی سال سے) انعام یافتہ محسن زیدی کا تبصرہ کچھ پسند نہیں آیا۔ کیا اس دفعہ اس سے بہتر تبصرہ کسی کا نہیں تھا؟ پچھلے دو چار ماہ سے کیپٹن مشتاق اور راحیلہ خان کے درمیان معمولی سی جنگ جاری تھی مگر اب اس میں بتدریج شدت آتی جارہی ہے۔ (آپ بھی حسبِ توفیق اپنا حق ادا کردیں) کیپٹن صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ انعام یافتہ ہیں اور دس سال سے جاسوسی کے قاری ہیں۔ کیا کیپٹن صاحب کے نزدیک اچھا تنقید نگار ہونے کے لئے انعام یافتہ ہونا ضروری ہے۔ میری تھیوری اس سے الگ ہے۔ کیپٹن صاحب، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص دس سال تک تنقید کرنے کے باوجود اچھا تنقید نگار نہیں بن سکتا اور کوئی تو صرف دس ماہ کی تنقید کے بعد ہی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے۔ کیا آپ میری اس بات سے اتفاق کریں گے؟ (دیکھو کیپٹن، ہرگز اتفاق نہ کرنا) کیپٹن صاحب تو تھے ہی تھے اب پولیس والے بھی بس راحیلہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ آخر عاجز صاحب بھی میدانِ جنگ میں کود گئے اور اس محاذ پر ہم راحیلہ بہن کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے نا۔ (سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو اس ماہ کی ڈاک سے ظاہر ہورہا ہے، لیڈیز قلم قبیلے میں سرگرمی کی لہر دوڑ گئی ہے) راحیلہ بہن فکر نہ کریں۔ ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔"

جویریہ مبین کی ثالثی، سرگودھا سے "میں نے سوچا تھا کہ اب جاسوسی ڈائجسٹ پر تبصرہ پیپروں کے بعد ہی کروں گی لیکن آپ کے بعض گرم دماغ بھتیجوں اور صاف گو یعنی منہ پر کھری بات کہہ دینے والی بھتیجیوں میں جنگ پلاسی چھڑ جانے کی وجہ سے میں خط لکھنے پر مجبور ہوگئی (خواہ اس چکر میں اپنا رزلٹ ہی کیوں نہ خراب ہوجائے مگر معرکۂ خواتین و حضرات میں اپنی فوج کمزور نہ پڑے۔ آفرین ہے بھئی اس جذبۂ جہاد پر) میں یہ خط غیر جانبداری سے لکھ رہی ہوں یعنی دونوں میں ثالث کا کردار ادا کرنے کی کوشش کروں گی۔ مارچ کے شمارے میں انعام یافتہ خط کے بعد مسٹر اظہر کا خط شائع ہوا جس میں انہوں نے لڑکیوں کی شان میں گستاخی کی (بالکل غلط۔ ہمیں تو یاد نہیں کہ ایسا کب ہوا) خیر سے لڑکی ہونے کے ناتے غصہ تو بڑا آیا مگر کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی گئی۔ کیونکہ میں ٹھہری ذرا صابر و شاکر اور درگزر کرنے والی لڑکی (وہ تو اس خط سے ظاہر ہے) اس کے بعد میرا شریف سا خط شائع ہوا اور پھر شاید راحیلہ خان کا تھا جس میں انہوں نے کیپٹن مشتاق کے خط پر تنقید کی۔ یہ کوئی بُرا منانے والی بات نہیں تھی۔ کیونکہ سنا ہے جمہوری دور ہے (تو کیا یہ جمہوریت صرف ایک فریق کے لئے ہے؟) ہاں! راحیلہ نے لفظ "بکواس" استعمال کرکے غلطی کی تھی لیکن بقول خود کیپٹن مشتاق کے وہ ابھی بچی ہیں (ہاں، یہ بات تو ہے۔ کیپٹن صاحب ان کے بزرگ ہوئے اور بزرگوں سے ادب سے بات کرنا چاہئے) لیکن وہ یہ لکھتے ہوئے یہ عام اور سادہ سی بات بھول گئے کہ بڑے، بچوں کی غلطیاں معاف کردیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بڑائی ہی اسی میں ہے مگر وہ اپنے قول کے برعکس بڑے جارحانہ انداز میں راحیلہ خان سے لڑے اور انہیں نفسیاتی طور پر پسپا کرنے کے لئے بڑے پُرغرور انداز میں اپنی ایک انعامی فتح کی دھونس جمائی (آخر کو فوجی جو ہوئے، شروع کردی فوجداری) ان کی یہ دھونس چینی تختہ چینی کے جنگی قانون کے خلاف تھی۔ مسٹر اظہر کو مس جاسوسی کی طرف سے نہلے پر دہلا قسم کا جواب مل چکا ہے۔ اب رہ گئے مسٹر خلیل الرحمٰن عاجز پولیس والے۔ ان کی سروس کے پیشِ نظر ان کی بات کا برا نہیں منانا چاہئے۔ کیونکہ جہاں اتنے لوگ عاجز ہیں وہاں چند اور سہی۔ یوں تو دھونس دینا اور رعب جمانا ان کا شیوۂ گفتار ہے لیکن یہاں بات چینی تختہ چینی کے قانون اور شیوۂ گفتار کی ہورہی ہے۔ تو یہ کیپٹن مشتاق سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے۔ یعنی بارہ سال کی دھونس جمائی (ہاں، یہ زیادتی کی۔ دو چار سال کی بات ہوتی تو برداشت کرلی جاتی) لیکن یہ مرد صاحبان یہ بھول گئے کہ یہ بچیاں جب ان کی عمر کو پہنچیں گی تو ان کا تجربہ بھی اتنا ہی ہوچکا ہوگا۔ لہٰذا یہ رعب جمانا ٹھیک نہیں اور نہ ہی عاجز صاحب کا یہ اعتراض درست ہے کہ راحیلہ خان نے مشتاق صاحب کے تبصرے پر تنقید کیوں کی جبکہ وہ اتنے عرصے سے تبصرہ کررہے ہیں۔ البتہ ان کا دوسرا اعتراض غلط لفظ استعمال کرنے والا درست ہے۔ ان باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچی کہ غلطی دونوں طرف سے تھی (اچھا، اب ثالثی کا عمل شروع ہورہا ہے) مرد حضرات میں سے پہل مسٹر اظہر نے اور خواتین بلکہ بچیوں میں سے پہل راحیلہ خان کی طرف سے ہوئی۔ لہٰذا دونوں فریقین کو اپنی اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے صلح کا بگل بجادینا چاہئے اور دلوں کے میل نکال کر واپس اپنی ریاستوں کو چلے جانا چاہئے۔ نہ کہ رائی کا پہاڑ بنا کر باتوں کے نشتر چلاتے رہیں۔"

مسٹر اینڈ مسز محمد ارشاد کا اظہار پسندیدگی' فیصل آباد سے "آپ کی محفل یاراں میں پہلی مرتبہ شریک ہونے کی جسارت کر رہے ہیں۔ اپریل کا شمارہ یکم اپریل کو مل گیا تھا۔ سرورق بہت پسند آیا۔ شاہد صاحب نے بڑی محنت کی ہے۔ فہرست بھی بہت دیدہ زیب اور خوب صورت تھی۔ چینی کچھ چینی میں آپ کے برجستہ جملے بہت مزہ دیتے ہیں (چھن لیا کریں تاکہ آئندہ بھی کام آتے رہیں) مبشر علی زیدی اور خلیل الرحمن عاجز کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ اس کے بعد اپنا پسندیدہ سلسلہ شکاری پڑھا۔ بے چارے بیلی کا پٹر کے پائلٹ کی موت کا افسوس ہوا۔ شکاری بہت اچھی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی سب شکاری وطن واپس لوٹ آئیں گے۔ سرکش بھی تیزی سے اپنے مقصد کی طرف بڑھ رہی ہے۔ محمود احمد مودی بڑی محنت سے اسے تحریر کر رہے ہیں۔ اس کے بعد تیل کی آگ پڑھی۔ موضوع اور انداز تحریر دونوں ہی بہت پسند آئے۔ علیم الحق حقی ہمیشہ کامیاب تحریروں کے ساتھ ہی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ نسیم جاوید سید کی جمعرات شروع میں تو کچھ بور رہی مگر آخر میں آکر بے حد دلچسپ ثابت ہوئی۔ ابوالمنصور کتے کی چوری کے ساتھ حاضر ہوئے۔ نئے نئے انکشافات لئے' یہ تحریر بہت پسند آئی۔ گلبرٹ کے کردار نے حیران کیا۔ خالدہ شاد کی تحریر باغبانی زیادہ متاثر نہیں کر سکی۔ البتہ بل کی ذہانت نے بہت متاثر کیا (چلئے کسی نے تو متاثر کیا) کامل ظہیر کی سبق آموز تحریر انعامی نمبر بھی بے حد دلچسپ ثابت ہوئی۔ اختتام بھی بہت عمدہ تھا۔ طویل ناول کتاب مرگ بھی بہت پسند آیا۔ جبران عدیل کی عدالت بھی اچھی تحریر تھی۔ دیر سے ہی سہی مگر ضمیر نے نصرت اسلام کو جھنجوڑا تو۔ اور اس نے ضمیر کی آواز کو سنا اور درست فیصلہ کیا۔ مہتاب جلیل کی عمدہ تحریر پہیلی تماشا بھی بے حد دلچسپ تھی۔ آنٹی سوسن کا انتقام بھی پسند آیا۔ ساجد امجد صاحب کی تحریروں میں کچھ نہ کچھ انفرادیت ہوتی ہے مگر اس ماہ ان کی تحریر ٹیڑھا آدمی ایک عام سے موضوع پر عام سی تحریر ثابت ہوئی جو کہ متاثر نہ کر سکی۔ گمان غالب پاکیزہ خان کی بہترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ مختصر مگر دلچسپ یہ تحریر بہت پسند آئی۔ اس ماہ کے رنگ راہِ فرار نے بہت متاثر کیا۔ البتہ اس میں سرورق کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی۔ منظر امام کی تحریر مقابلۂ وفا شروع میں کافی الجھی ہوئی محسوس ہوئی مگر آہستہ آہستہ تمام گتھیاں سلجھتی چلی گئیں۔ منظر امام نے واقعی اس کہانی پر بڑی محنت کی ہے۔ سرورق کا تیسرا اور آخری رنگ غلام قادر کا کمرا کھوٹا تھا۔ لگتا ہے کہ یہ تحریر قادر صاحب نے بڑی عجلت میں نمٹائی ہے (بس جناب کیا عرض کریں۔ نئے نئے امیر اور نئے نئے فقیر سے برکات کی توقع رکھنا چاہئے) اس ماہ کی کترنوں نے بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ غرضیکہ اپریل کا جاسوسی بہت پسند آیا۔"

ثوبیہ ناز جعفری' احمد پور شرقیہ سے "جاسوسی پڑھتے ۱۶ سال تو ہمیں بھی ہوگئے ہیں مگر کبھی جتایا نہیں جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ بھائی اگر کوئی دس سال سے یا چودہ سال سے پڑھ بھی رہا ہے تو کیا ہمارے اوپر احسان کر رہا ہے (سن رہے ہیں کیپٹن اور عاجز صاحب' یہ خطاب آپ سے ہے) جاسوسی کا نشہ ہی ایسا ہے کہ بندہ اسے مستقل پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور جو لوگ دس سال سے یا اس سے بھی زیادہ مدت سے پڑھ رہے ہیں ان کی عمریں بھی ماشاء اللہ بہت زیادہ ہیں (ہاں' یہ کہی نا پتے کی بات) جبکہ جن کی عمر کم ہے ان کی جاسوسی سے رفاقت بھی کم ہے۔ ویسے انکل' مجھے تو مشتاق صاحب کے کیپٹن ہونے پر ہی شک ہے (ہم اس کا اظہار نہیں کر سکتے' اگر واقعی ہوئے تو کیا ہوگا) یا پھر ان کو اعزازی عہدہ ملا ہوا ہے۔ اور دوسرے جو ان کے ہمدرد بنے ہوئے ہیں عاجز صاحب' فرماتے ہیں کہ اتنے برسوں سے کسی اور نے اعتراض نہیں کیا تو اب کیوں اعتراض ہو رہا ہے۔ مجھے تو ان کا خط فرمائشی خط لگتا ہے۔ ورنہ صحیح بات کو صحیح بات کہنا ہی مسلمان کی نشانی ہے۔ لاہور کے اظہر صاحب کا امید ہے کہ اب تک دماغ درست ہو گیا ہو گا ورنہ — " (اس خیال میں نہ رہنا بی بی! ان کے دماغ میں موچ ہے جو آپ تو کیا کوئی بھی نہیں نکال سکتا۔ یقین نہ آئے تو اس بار ان کا خط پڑھ کر دیکھ لو)

عظمیٰ حنیف' راسوائی کراچی سے لکھتی ہیں "پہلی دفعہ آپ کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں۔ سرورق کو ایک نئے اور انوکھے انداز میں پاکر قلم اٹھانے پر مجبور ہوئی ہوں۔ شاہد حسین نے سرورق کی جس طرح تراش کی' وہ ہمیں بہت پسند آئی ہے۔ بحیثیت مجموعی اپریل کا شمارہ دلچسپ رہا ہے۔ چینی کچھ چینی میں بھی خیریت رہی۔ محسن زیدی صاحب کا تبصرہ پسند آیا ہے لیکن دوسرے لوگوں نے جس طرح سرورق کے بارے میں تبصرہ کیا ہے' وہ پسند نہیں آیا۔ تیل کی آگ علیم الحق حقی کی کہانی بہت اچھی لگی ہے۔ واقعی تیل ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔"

مدثرہ طلعت کی جوابی کارروائی' فیصل آباد سے "ٹائٹل بہت شاندار تھا۔ بالکل جاسوسی کے معیار کے عین مطابق۔ ہمیں تو آپ کے بتانے پر پتا چلا کہ اس دفعہ شاہد صاحب نے ٹائٹل بنایا ہے ورنہ ہم تو ذاکر انکل کا سمجھے بیٹھے تھے۔ محسن زیدی کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ واقعی انعام کے قابل لیکن کیپٹن صاحب کے تبصرے سے غرور کی بو آتی ہے جس میں انہوں نے راحیلہ خان کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ انعام یافتہ ہیں۔ ویسے ان کے انعامی تبصرے والا جاسوسی میرے پاس پڑا ہوا ہے جو کہ مئی ۸۹ کا ہے۔ کیپٹن صاحب کے انعامی تبصرے پر تو وہی مثل صادق آتی ہے کہ اندھوں میں کانا راجا۔ خلیل الرحمن عاجز صاحب آخر ٹھہرے نا پولیس والے۔ ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ ستمبر ۸۹ میں بھی میرے تبصرے پر فضول سی تنقید کی تھی۔ اور اب ۱۲ سال سے جاسوسی پڑھ رہے ہیں تو ہم کیا کریں (بھئی' سینئر ہیں' تمہارے بزرگ ٹھہرے' تم پر لازم ہے کہ ان کا احترام کرو) ہم بھی تو دو سال سے پڑھ رہے ہیں لیکن ان کی طرح کبھی جتایا نہیں اور اب ایک نہایت قیمتی مشورہ لیکن ضمیر حسن ترمذی کے مشورے جیسا نہیں۔ اگر آپ چند مصنفین مثلاً ملک صفدر حیات' مرزا امجد بیگ' کی کہانیوں کے مجموعے شائع کریں تو ہم لوگ جنہوں نے چند سالوں سے آپ کے رسالے پڑھنے شروع کئے ہیں ان مصنفین کی پہلے والی کہانیاں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس پر نیک نیتی سے غور فرمائیں گے۔" (غور ہی نہیں فرما رہے بلکہ اس پر بہت جلد عمل درآمد ہونے والا ہے)

محمد طارق چوہدری' ملتان سے رقم طراز ہیں "اس دفعہ سرورق کچھ جانا پہچانا لگا۔ پہلے کی طرح اجنبیت نہیں تھی (کیا پہلے بھی کہیں مل چکا تھا؟) چینی کچھ چینی کے صفحات کچھ کم محسوس ہوئے۔ ابتدائی صفحات پر علیم الحق حقی کی تیل کی آگ ابھی پوری نہیں پڑھ سکا۔"

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دی ہوئی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر آیات و احادیث طبع ہیں۔ ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

چیتے کی طرح چست لومڑی کے مانند عیار ایک بھیڑیا صفت مجرم کی ہنگامہ خیزیاں

ڈائجسٹ ملکیت: محترم اے ڈی چشتی صاحب (پاکپتن)

محمود احمد چانڈیو

ایران کی انقلابی حکومت کو سب سے زیادہ مطلوب مجرم کی کہانی جس کی سفاکی اور چالاکی کا جرائم کی تاریخ میں حوالہ دیا جاتا ہے۔ کامیاب ڈکیتی جس کا ناقابلِ تقلید فن اور سفاکانہ خونریزی جس کے پیشے کا حِصہ تھی۔ اسے شاہِ ایران کا خُفیہ خزانہ چُرانے پر مامور کیا گیا اور اس نے ایسی مہارت دکھائی کہ اعلیٰ تربیت یافتہ سُراغ رساں اور پیچیدہ گتھیاں سُلجھانے والے دماغ بھی ششدر رہ گئے۔ اس مہم کے دوران اُس نے ایسی خوفناک اور بہیمانہ وارداتیں کیں کہ خطرناک ترین مجرم بھی تھرا اُٹھے۔ حکومتِ ایران نے اُس کے سَر کی بھاری قیمت مقرر کی تھی لیکن وہ اس کی سنسنی خیز وارداتوں میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ وہ آزادانہ ایران کے شہروں میں اپنی کارروائیوں میں مصروف رہا۔ پاکستان کی مَچھ جیل سے فرار اور دوبارہ ایران میں اُس کا نمودار ہونا ایک معمّا بن گیا تھا۔

ہر سطر تجسس اور دہشت کا طوفان لیے ایک ناقابلِ فراموش داستان

مچھ سنٹرل جیل کے حکام کا یہ دعویٰ بالکل درست تھا کہ کوئی قیدی یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جیل کی تاریخ بھی ان کے اس دعوے کی تصدیق کرتی نظر آتی ہے۔ یہ ملک کی واحد جیل ہے جہاں سے قیدیوں کے فرار کی کوئی کوشش اب تک کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس فصیل کے اندر سزا کاٹنے والے قیدی بہت سیدھے سادے اور شریف النفس ہوتے ہیں جو فرار کا خیال بھی ذہن میں نہ لاتے ہوں۔

اس دنیا کا کون شخص آزاد فضاؤں میں سانس نہیں لینا چاہتا؟ اس جیل کے قیدی بھی آزادی کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ یہاں بھی آئے دن فرار کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں مگر ایسی کوشش کرنے والے یا تو محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں یا دوبارہ پکڑ لئے جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر دوسرے قیدی ہمت ہار بیٹھتے لیکن کچھ ہی عرصے بعد جیل کے کسی نہ کسی گوشے میں فرار کی منصوبہ بندی ہونے لگتی ہے۔

مچھ جیل کے تین اطراف عمودی پہاڑیاں ہیں۔ ایک طرف آبادی اور اس کے سامنے بلندی پر ریلوے اسٹیشن واقع ہے۔ یہ پاکستان کا وہ ریلوے اسٹیشن ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ٹرین یہاں آکر راستہ بھول جاتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جس جگہ ریلوے اسٹیشن تعمیر کیا گیا ہے وہ بڑی آڑھی ترچھی سی ہے۔ پنجاب یا کراچی سے آنے والی ٹرین سیدھی پلیٹ فارم پر نہیں جاتی بلکہ مین لائن پر دو تین میل آگے نکل جاتی ہے اور وہاں سے اُلٹی چلتی ہوئی پلیٹ فارم پر آتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال کوئٹہ کی طرف سے آنے والی ٹرینوں کے ساتھ بھی ہے۔ کوئٹہ سے آنے والی ٹرین سیدھی پلیٹ فارم پر آتی ہے۔ مختصر سے قیام کے بعد آگے روانہ ہونے کے لئے وہ دو تین میل پیچھے جاتی ہے پھر رخ بدلتی ہوئی مین لائن پر انتہائی تیز رفتاری سے خطرناک ڈھلان پر اترنے لگتی ہے۔

اس صورتِ حال کی وجہ سے مچھ جیل کو ایک ناقابلِ تسخیر قلعے کی حیثیت حاصل ہے۔ مچھ کو دوسرے شہروں سے ملانے والی سڑک وہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے۔ سڑک تک پہنچنے کے لئے پہاڑیوں کے درمیان نشیب میں واقع تقریباً ہزار گز چوڑے دریا سے گزرنا پڑتا ہے۔ قصبے کو ہائی وے سے ملانے والی ذیلی سڑک اسی دریا میں سے ہو کر گزرتی ہے جو عام طور پر خشک رہتا ہے لیکن برسات کے دنوں میں سڑک کے راستے یہ قصبہ باقی شہروں سے کٹ جاتا ہے۔

مچھ جیل میں سزائے موت یا.... عمر قید پانے والے خطرناک قیدیوں کو بھیجا جاتا ہے۔ یہاں آنے والے ہر قیدی کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ اگر وہ اپنی سزا بھگتنے کے دوران جیل کے عملے سے تعاون کرے گا تو ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کچھ رعایت برتی

جائے۔ عدم تعاون اور فرار کی منصوبہ بندی کی جسارت میں نہ صرف یہ کہ اس سے اضافی مشقت لی جائے گی بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایسی کوشش میں اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں۔

قیدی نمبر ۲۱۷ تنگ و تاریک اور سیلن زدہ سی کوٹھری میں خاصی گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ وہ کبھی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور کبھی اٹھ کر ٹہلتے ہوئے دروازے کی سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی حالت اس شیر کی سی تھی جسے زخمی کر کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔

وہ جمشید منصوری تھا۔ اسے جب اس جیل میں لایا گیا تھا تو اسے بھی اسی قسم کی وارننگ دی گئی تھی جس کے جواب میں جمشید کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

اس کی فائل بہت ضخیم تھی۔ جمشید پر تین آدمیوں کے قتل کے علاوہ اور بھی بہت سے سنگین الزامات تھے۔ وہ قتل اس نے تین سال پہلے کئے تھے۔ اس جرم میں اسے عدالت سے عمر قید کی سزا سنائی گئی اور اسے کوئٹہ کی ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں چھ مہینے بعد ہی فرار کی کوشش میں اس نے ایک محافظ کو ہلاک کر ڈالا۔ دو روز تک وہ شہر میں چھپا رہا مگر تیسرے روز رات کے وقت بھیس بدل کر ایک ٹرک کے ذریعے شہر سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس پر ایک بار پھر مقدمہ چلا۔ مقدمے کی کارروائی ایک سال تک جاری رہی اور اسے لمبی سزا سنا کر ایک بار پھر جیل بھیج دیا گیا' جہاں وہ ایک سال تک بڑی شرافت سے سزا بھگتتا رہا۔ مگر یوں قید ہو کر بیٹھ رہنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر جیل سے بھاگ نکلا۔

اس مرتبہ فرار ہوتے ہوئے اس نے ایک محافظ کی ٹانگ توڑ دی.... اس کے جیل توڑنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد پورے شہر کی پولیس کو الرٹ کر کے شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی لیکن اس مرتبہ پولیس' جمشید منصوری کا سراغ نہ پا سکی۔ وہ اس طرح غائب ہوا تھا جیسے اس دنیا میں اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

جمشید کو جیل سے فرار ہوئے تین سال ہو چکے تھے لیکن پولیس اسے نہیں بھولی تھی۔ اس کی تلاش مسلسل جاری تھی۔ اور بالآخر وہ کوئٹہ سے تقریباً سو میل دور نوشکی نامی قصبے سے پکڑا گیا۔ اس مرتبہ اسے ایک اور سنگین جرم میں پکڑا گیا تھا۔ اسے ایک بار پھر عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ جلد ہی فیصلہ سنا دیا گیا اور اسے ایک نہایت خطرناک قیدی قرار دیتے ہوئے مچھ سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ یہاں اسے مجموعی طور پر اڑسٹھ سال کی سزا بھگتنی تھی۔ اگر وہ مر کر دوسرا جنم بھی لے لیتا تو اس جنم کی زندگی کے آخری لمحوں تک بھی اسے جیل سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔

اس کوٹھری کی لمبائی دس فٹ اور چوڑائی آٹھ فٹ تھی۔ لیکن چھت خاصی اونچی تھی۔ بلندی پر تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا روشندان بنا ہوا تھا۔ روشندان تک پہنچنا اگرچہ ممکن نہیں تھا لیکن سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے اس میں بھی موٹی موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

مضبوط آہنی سلاخوں والے دروازے کے سامنے نیم تاریک سی راہداری تھی جس میں ہر وقت مدھم روشنی کا بلب جلتا رہتا تھا۔ کوٹھری کے اندر مخصوص ناگوار سی بُو پھیلی ہوئی تھی جس کا احساس باہر سے آنے والے کو ہی ہوتا تھا۔

کوٹھری.... میں موجود مضطرب اور بے چین جمشید منصوری نے دھاری دار کپڑے کا قیدیوں والا مخصوص لباس پہن رکھا تھا جو کثرتِ استعمال سے بدرنگ ہو چکا تھا۔ اس کے بال الجھے ہوئے اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ قد لمبا' جسم مضبوط اور عمر تیس بتیس کے لگ بھگ تھی۔ کشادہ پیشانی اور آنکھوں کی چمک ظاہر کرتی تھی کہ وہ ذہین' چالاک اور.... تعلیم یافتہ ہے۔

اچانک راہداری میں قدموں کی گونج سنائی دینے لگی۔ قیدی ٹہلتے ٹہلتے رک گیا اور دروازے کے ساتھ کھڑے ہو کر متوقع نظروں سے آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ اس نے قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا کہ آنے والے ایک سے زیادہ تھے۔

اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد جیل کا سپرنٹنڈنٹ دو مسلح محافظوں کے ساتھ راہداری میں نمودار ہوا اور اس کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چابیوں کے وزنی گچھے میں سے ایک چابی منتخب کی' اسے تالے کے سوراخ میں لگا کر گھمایا اور دروازہ کھول دیا۔ قیدی بھویں سکیڑ کر آنے والوں کو گھورنے لگا۔

"مسٹر جمشید!" سپرنٹنڈنٹ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے متانت سے کہا "تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی گئی؟"

قیدی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے پہلی بار اس کا نام لے کر مخاطب کیا تھا اور نام ہی نہیں بلکہ مسٹر بھی کہا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اسے قیدی نمبر ۲۱۷ ہی کہا جاتا تھا اور وہ اس نمبر سے خاصا مانوس بھی ہو گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے جو سوال کیا تھا وہ بھی خاصا معنی خیز تھا۔

"سپرنٹنڈنٹ!" قیدی جمشید منصوری نے کہا "تم نے کچھ عجیب سا سوال کیا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے.... جیسے کسی شخص کو دو چار روز بھوکا رکھ کر پوچھا جائے کہ تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی ہے۔"

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ جہاں تک اس کوٹھری اور جیل کا تعلق ہے' اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی خلافِ قانون سختی تو نہیں کی گئی؟" سپرنٹنڈنٹ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

جمشید منصوری نے کندھے اُچکا دیئے۔ "میرے خیال میں تو میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے' وہ سب خلافِ قانون ہے کیا

تم سمجھتے ہو کہ اس تنگ اور غلیظ کوٹھری میں کوئی انسان خوش رہ سکتا ہے؟"

"اس معاملے میں میرے اختیارات محدود ہیں۔" سپرنٹنڈنٹ نے کہا "تمہارے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ تم ایک خطرناک مجرم ہو' اس لئے تمہیں کوٹھری میں بند رکھا جائے۔ تم خود سوچو' تم پر کم سے کم تین افراد کے قتل اور متعدد بار جیل توڑنے کا الزام ہے۔ اور آخری مرتبہ جب تم کوئٹہ سے ایران جانے والی شاہراہ پر واقع نوشکی ٹاؤن سے پکڑے گئے تھے تو تمہارے قبضے سے نصف ٹن سونا اور کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات برآمد ہوئے تھے۔ کچھ جیل کی تاریخ میں اتنی بھاری مقدار میں سونا اور ہیرے جواہرات اسمگل کرنے کا کیس کبھی ریکارڈ نہیں کیا گیا۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ تم نے یہ سونا اور ہیرے جواہرات کہاں سے حاصل کئے تھے؟"

"عزت افزائی کا شکریہ!" قیدی نے خشک لہجے میں کہا "میرا خیال ہے' تمہیں میرے بارے میں بہت کم بتایا گیا ہے۔ میرا پورا نام جمشید منصوری ہے اور میں ایران کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔"

سپرنٹنڈنٹ کے چہرے پر کوئی تبدیلی ظاہر نہیں ہوئی۔ اگر وہ جمشید کے اس انکشاف سے مرعوب ہوا تھا تو اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے تاثرات کو چھپالیا تھا۔

"اس فصیل کے اندر قدم رکھنے والا ہر شخص محض قیدی رہ جاتا ہے۔ بہر حال تم محافظوں کے ساتھ چلے جاؤ اور نہا دھو کر دوسرا لباس پہن لو۔ کچھ لوگ تم سے ملنے کے لئے آرہے ہیں۔" سپرنٹنڈنٹ نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔

قیدی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ تاہم وہ خاموشی سے محافظوں کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ سپرنٹنڈنٹ کچھ دیر تک اپنی جگہ پر کھڑا جمشید کی باتوں پر غور کرتا رہا پھر واپس مڑا اور اپنے دفتر پہنچ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اس کے دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک محافظ دو وجیہہ اور بارعب آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سپرنٹنڈنٹ نے اٹھ کر آنے والوں کا استقبال کیا۔

"میں الطاف نیازی ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "اس جیل کا سپرنٹنڈنٹ۔ تشریف رکھئے۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔"

دونوں ملاقاتیوں نے سپرنٹنڈنٹ سے ہاتھ ملایا اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک دراز قامت' قوی الجثہ اور تند چہرے کا مالک تھا۔ اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی بھوری مونچھیں اور چوڑا چکلا سینہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ ایک نڈر' بیباک اور خطرات میں کود پڑنے والا انسان ہے۔ اس نے حامد علی کے نام سے اپنا تعارف کرایا۔ جبکہ دوسرے نے اپنا نام نواز رضوی بتایا تھا۔ وہ قدرے مختلف شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے زیادہ تر دفتروں میں کام کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے چہرے پر حامد علی کی سی تندی نہیں تھی۔ اس کی پیشانی کشادہ' بال روئی کی طرح سفید اور مونچھیں چھوٹی تھیں۔ وہ انتہائی پُراسرار شخصیت کا مالک نظر آتا تھا۔

تعارف ہوجانے کے بعد نواز رضوی نے اپنے بریف کیس میں سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ نکال کر سپرنٹنڈنٹ الطاف نیازی کی طرف بڑھادیا۔ اس کاغذ کی پیشانی پر ابھرے ہوئے سبز حروف میں حکومت بلوچستان کے چیف سیکریٹری کے دفتر کا نام چھپا ہوا تھا اور ایک طرف حکومت بلوچستان کا مخصوص مونوگرام بھی موجود تھا۔ ٹائپ شدہ خط کے اختتام پر چیف سیکریٹری کی مہر اور دستخط بھی موجود تھے۔

سپرنٹنڈنٹ نے خط پڑھنے کے بعد میز کی مقفل دراز میں سے نیلے رنگ کی ایک فائل نکالی۔ اس فائل میں بھی اسی قسم کا ایک ٹائپ شدہ خط موجود تھا۔ اس پر بھی چیف سیکریٹری کے دستخط اور مہر ثبت تھی۔ یہ خط جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو آج سہ پہر ارجنٹ ڈاک سے ملا تھا اور حکومت کے ایک پروجیکٹ کا حوالہ دیتے ہوئے اسے ہدایت کی گئی تھی کہ حامد علی اور نواز رضوی سے ہر طرح کا تعاون کیا جائے۔ خط میں ان دونوں کو مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بتایا گیا تھا۔

دونوں خطوط کا موازنہ کرنے کے بعد سپرنٹنڈنٹ الطاف نیازی نے مطمئن انداز میں سرہلایا' نواز رضوی کا دیا ہوا خط بھی اس نے فائل میں لگایا اور فائل میز کی دراز میں رکھ کر اسے مقفل کرنے کے بعد ان دونوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔

"مسٹر نیازی!" حامد علی نے کلائی پر بندھی ہوئی قیمتی گھڑی دیکھتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ کو مخاطب کیا۔ "ساڑھے سات بج چکے ہیں۔ ہمیں واپس بھی جانا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رات کے وقت ہائی وے پر سفر کرنا مخدوش ہوجاتا ہے۔ اب مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے ملاقات کے لئے یہی جگہ مناسب رہے گی۔ جمشید منصوری کو یہیں لے آئیے۔"

"بہت بہتر جناب!" سپرنٹنڈنٹ نے کہا اور اٹھ کر دفتر سے نکل گیا۔

"یہ جمشید منصوری!" سپرنٹنڈنٹ کے جانے کے بعد نواز رضوی نے حامد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ایران کا انتہائی خطرناک اور تیز طرار مجرم ہے۔ اور نہایت ذہین بھی۔ ایران میں یہ شخص مجرموں کے ایک منظم گروہ کا سربراہ ہے۔ کچھ عرصہ اس کے گروہ نے شاہ کے خلاف انقلاب کے نتیجے میں برسراقتدار آنے والی انقلابی پارٹی کے لئے بھی کام کیا ہے۔ اس انقلاب کے بعد ایران کا دولت مند طبقہ برسراقتدار آنے والے مذہبی رہنماؤں سے خوفزدہ تھا۔ یہ لوگ اپنی جان کے خوف سے ملک سے فرار ہو

رہے تھے۔ پاسداران انقلاب ایسے لوگوں کی تلاش میں تھے۔ برسرِاقتدار آنے والے مذہبی رہنماؤں کا خیال تھا کہ ان لوگوں نے دولت ناجائز ذرائع سے جمع کی تھی۔ اس دولت پر عوام کا حق تھا' جسے چند لوگوں نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ شاہ کے فرار کے بعد مذہبی رہنما اور انقلاب کے بانی امام خمینی نے ایران کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ انقلاب کی مخالفت کرنے والے ایسے لوگوں کو نہیں بخشا جائے گا جنہوں نے غریب عوام کا خون چوس چوس کر اپنے گھروں میں دولت کے انبار لگا رکھے تھے۔ اور اب ایسے لوگ چوری چھپے ملک سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر پکڑ لئے گئے تو نہ صرف دولت...ان کے ہاتھ سے جائے گی بلکہ انہیں بھی گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ یہ لوگ انقلابی رہنماؤں کے عتاب سے بچنے اور ملک سے فرار ہونے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔

"منتشر پاسداران انقلاب کو منظم کر کے ان کی تنظیم کو کمیٹی کا نام دے دیا گیا تھا۔ کمیٹی کا ہر ممبر ایسے لوگوں کی تلاش میں تھا۔ وہ ہر اُس شخص کو گرفتار کر لیتے جس پر دولت مند ہونے کا شبہ ہوتا۔ دولت مندوں کے دلوں پر پاسداران کا خوف طاری ہو چکا تھا۔ ان پاسداران کی کوئی باقاعدہ یونیفارم نہیں تھی۔ ہر شخص دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ کہیں اس کا تعلق کمیٹی سے نہ ہو۔

جمشید منصوری نے اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے آدمی ایسے دولت مندوں کو تلاش کرتے جو ایران سے فرار ہونا چاہتے تھے۔ وہ ان سے بھاری معاوضے کے عوض یہ طے کر لیتے کہ اگر وہ اپنی دولت بھی ساتھ لے جانا چاہیں تو انہیں بحفاظت ایران کی سرحدوں سے نکال کر کسی یورپی ملک یا کسی بھی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے گا۔ یہ خوفزدہ لوگ فوراً ہی آمادہ ہو جاتے اور اپنی دولت سمیٹ کر فرار کے منصوبے بنانے لگتے۔ لیکن جمشید یا اس کے آدمی ایسے لوگوں کو سرحد پار کرانے کے بجائے اُن کی دولت سمیت انہیں پاسداران کے حوالے کر دیتے تو انہیں احساس ہوتا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار چکے ہیں۔

اسی دوران جمشید منصوری نے ایک ایسا منصوبہ بنایا جسے سن کر بے اختیار اس شخص کی جرأت اور ذہانت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس نے تہران میں واقع پاسداران کے ایک گودام سے نصف ٹن سونا اور کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات چوری کئے اور یہ مال راتوں رات وہاں سے سیکڑوں میل دور یزد پہنچا دیا۔ یہ ہیرے جواہرات اور نصف ٹن سونا تین دن تک شہر سے باہر ایک کھنڈر میں پڑا رہا۔ اس دوران ملک بھر کی پولیس اور پاسداران جمشید منصوری کو تلاش کرتے رہے لیکن وہ اس طرح غائب ہو چکا تھا جیسے ایران میں کبھی اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ اس کے ایک ہفتے بعد جمشید یہ خزانہ لے کر بڑے اطمینان سے رفسنجان' کرمان' زاہدان ہوتا ہوا میرجاوہ سے چند میل دور پہاڑیوں سے سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہو گیا۔"

"کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات اور نصف ٹن سونا!" حامد علی نے حیرت سے کہا "پاسداران انقلاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھرے ہوئے شیر ہیں۔ اور شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا معمولی بات نہیں۔ اتنے بڑے کام کے لئے یقیناً شیر کا جگر چاہئے۔"

"جمشید اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اس خزانے کو لے کر نہ صرف ایران کی سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا بلکہ ہمارے کسٹمز کے اہل کاروں کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ یہ خزانہ لے کر نوشکی پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دو روز نوشکی میں رکنے کے بعد وہ کوئٹہ کا رخ کرے گا۔ مگر اس کے ایک ساتھی نے کوئٹہ میں اینٹی اسمگلنگ ہیڈ کوارٹر کو اطلاع کر دی۔ اس مخبری پر ایک باقاعدہ پلاننگ کے تحت نوشکی کے اس مکان پر' جہاں جمشید قیام پذیر تھا' چھاپا مار کر اسے اس خزانے سمیت گرفتار کر لیا گیا۔

"جمشید منصوری کا باپ نوجوانی میں آرمینیا سے ہجرت کر کے ایران آیا تھا جہاں اس نے ایک ایرانی خاتون سے شادی کر لی تھی۔ وہ مشہد میں تھے۔ جمشید کی پیدائش کے چند ہی سال بعد اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس نے بڑے عجیب و غریب حالات میں پرورش پائی۔ باپ کا قالین بافی کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ دولت کی کمی نہیں تھی۔ جمشید اپنے آپ کو ایران کے بہت بڑے رئیس خاندان کا فرد بتاتا ہے۔ اس کی مادری زبان اگرچہ فارسی ہے لیکن آرمینیائی' اردو' فارسی اور یورپ کی کئی زبانیں روانی سے بول سکتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ شخص ایران کا سب سے ذہین اور دلیر مجرم ہے۔ اور ہمیں اپنے مشن کے لئے کسی ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔" نواز رضوی خاموش ہو کر حامد علی کی طرف دیکھنے لگا۔

"مگر اس کا باپ اتنی دولت چھوڑ کر مرا تھا تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ یہ جرائم کی طرف کس طرح راغب ہوا تھا؟" حامد علی نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔" نواز رضوی نے مسکراتے ہوئے کہا "جمشید کے باپ کے انتقال کے دو سال بعد اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی۔ اس کا سوتیلا باپ صادق دراصل ایک لالچی آدمی تھا اور اس نے خانم حمیرا سے شادی ہی محض دولت کے لالچ میں کی تھی۔ شادی کے فوراً ہی بعد اس نے جائداد اور دولت پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنانا شروع کر دیے لیکن وہ کمسن جمشید کو اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ بالآخر اس نے جمشید کو پیرس کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا۔ ایران کے دولت مند طبقے میں اپنے بچوں کو یورپ میں تعلیم دلانا فیشن بن

چکا تھا۔ جمشید کے جانے کے بعد صادق نے اطمینان کا سانس لیا اور خانم حمیرا کو آہستہ آہستہ مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں کرلیا۔

"شروع میں چند برسوں تک تو جمشید کو چھٹیوں میں ایران بلالیا جاتا لیکن پھر اس معمول میں فرق آ گیا۔ چند مرتبہ صادق اپنی بیوی کے ساتھ اس سے ملنے کے لئے پیرس بھی گیا لیکن پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ صادق اسے باقاعدگی سے اخراجات بھیجتا رہا۔ جمشید جب بھی مشہد آنے کے لئے لکھتا، صادق اسے منع کر دیتا کہ اس طرح اس کی تعلیم کا حرج ہوگا۔

"اور بالآخر کئی سال بعد جمشید کوئی اطلاع دیے بغیر ایران آگیا۔ اس وقت وہ اٹھارہ سال کا بھرپور نوجوان تھا۔ جب وہ مشہد پہنچا تو یہ انکشاف اس کے لئے بڑا روح فرسا ثابت ہوا کہ اس کی ماں کئی سال پہلے مرگئی تھی اور تمام جائداد اور کاروبار اس کی زندگی ہی میں صادق نے اپنے نام منتقل کروالیا تھا۔

"یہ بہت بڑا صدمہ تھا جسے جمشید کسی طرح برداشت کرگیا۔ اسے شبہ تھا کہ اس کی ماں کو قتل کیا گیا ہے۔ لیکن وہ صادق کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کرسکا۔ ایک روز اس کا صادق سے جھگڑا ہوگیا اور اس نے صادق کو قتل کردیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا جرم تھا جس کے لئے اسے سات سال جیل میں گزارنے پڑے۔

"جب وہ جیل سے رہا ہوا تو وہ ایک مختلف جمشید تھا۔ وہ جیل سے بہت کچھ سیکھ کر نکلا تھا۔ اس نے اپنا ایک گروہ بنالیا اور ایک خطرناک مجرم بن گیا۔ کئی سال تک پولیس سے اس کی آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ اس دوران وہ کئی مرتبہ پاکستان بھی آیا۔ کوئٹہ میں اس کی ماں کے کچھ رشتے دار تھے جن سے وہ وقتاً فوقتاً ملتا رہتا تھا۔

"اور پھر جب ایران میں شاہ کے خلاف امام خمینی کی تحریک شروع ہوئی تو ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے جمشید بھی انقلابیوں میں شامل ہوگیا۔ وہ ایک ذہین نوجوان تھا۔ اس میں صورت حال کو سمجھنے کی بھرپور صلاحیت موجود تھی۔

"شاہ کے فرار کے بعد ملک میں عجیب افراتفری کی سی کیفیت تھی۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری تھا۔ ذرا سے شبے میں لوگوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا۔ بیسیوں افراد کو روزانہ شاہ کا حامی ہونے کے شبے میں موت کے گھاٹ اتارا جارہا تھا۔ جمشید نے اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ پہلے انقلابیوں کے لئے کام کرتا رہا پھر پاسداران انقلاب کے گودام سے وہ خزانہ اڑالایا۔

"پاکستان آمد و رفت کے دوران اس نے جعلی کاغذات کے ذریعے یہاں کی شہریت حاصل کرلی تھی۔ اس نے بعض مقامی جرائم پیشہ افراد کی مدد سے یہاں بھی وارداتیں شروع کردیں۔ ڈکیتی کی ایک واردات کے دوران دو آدمی اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس نے زاہدان کی طرف فرار ہونے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ جیل سے بھاگ نکلا۔ فرار کی کوشش میں اس نے جیل کے ایک محافظ کو بھی ہلاک کرڈالا تھا۔ وہ دو روز تک شہر میں چھپا رہا مگر تیسرے روز رات کے وقت بھیس بدل کر ایک مال بردار ٹرک کے ذریعے شہر سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس پر ایک بار پھر مقدمہ چلا اور اس مرتبہ بھی اسے لمبی سزا سنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ لیکن جیل کی چاردیواری میں محصور رہنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر جیل سے بھاگ نکلا۔ اس مرتبہ فرار ہوتے ہوئے اس نے ایک محافظ کی ٹانگ بھی توڑ دی تھی۔ اس کے جیل سے فرار ہونے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر پورے شہر کی ناکا بندی کردی گئی تھی مگر پولیس اس کا کوئی سراغ نہ لگا سکی۔ وہ تین سال تک لاپتا رہا اور بالآخر چند ہفتے پہلے نوشکی سے نصف ٹن سونے اور کروڑوں روپے مالیت کے زر و جواہرات سمیت پکڑا گیا اور اسے نہایت خطرناک قیدی قرار دیتے ہوئے مچھ سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔"

اسی لمحے دفتر کا دروازہ کھلا اور سپرنٹنڈنٹ جمشید کو لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ جمشید نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

حامد علی اور نواز رضوی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ جیل کے شب و روز جمشید پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک تنومند نوجوان تھا۔ تازہ بنا ہوا شیو، سلیقے سے بنے ہوئے بال اور صاف ستھرے لباس میں وہ خاصی متاثر کن شخصیت

شگوفے

ٹیچر نے کلاس میں "خاموشی" کے فوائد پر سبق دیا اور آخر میں پوچھا "تم نے خاموشی کے فوائد سنے۔ اب یہ بتاؤ کہ مسلسل بولتے رہنے والے کو تم کیا کہو گے؟"

پیچھے سے کسی لڑکے کی آواز ابھری "ماسٹر صاحب"۔

ایک استاد بچوں کو پڑھا رہا تھا۔

"آگرے میں تاج محل ہے، لاہور میں شاہی مسجد ہے، دلی میں قطب مینار ہے....." (رک کر اس نے ایک لڑکے کی سمت دیکھا جو اونگھ رہا تھا) اس نے اسی لڑکے کو آواز دی اور پوچھا "ہاں حسن! تم بتاؤ میں ابھی کیا کہہ رہا تھا؟"

لڑکا اس کی آواز سن تو رہا تھا مگر نیند کی بنا پر پوری طرح کچھ نہیں سنا تھا، بولا "جناب آپ کہہ رہے تھے دلی میں کتا بیمار ہے اور....."

کا مالک نظر آ رہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے ان کے سامنے پیش کرنے کے لئے پوری طرح تیار کر کے لایا تھا۔

"آفیسر!" بالآخر حامد علی نے سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بارعب لہجے میں کہا "کیا ہم چند منٹ تنہائی میں اس نوجوان سے بات کر سکتے ہیں۔"

"یس سر!" سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔ اسے چیف سیکرٹری کی طرف سے ملنے والے خط میں ان دونوں سے مکمل تعاون کی ہدایت کی گئی تھی۔ اور ظاہر ہے وہ اس ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔ "آپ فارغ ہو جائیں تو کال بیل کا بٹن دبا دیجئے گا۔" وہ کہتے ہوئے دفتر سے باہر نکل گیا اور دروازہ بھی بھیڑ دیا۔

"نوجوان!" نواز رضوی نے جشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمہیں آخری مرتبہ سونے اور جواہرات کی اسمگلنگ کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اینٹی اسمگلنگ اسکواڈ نے تمہارے قبضے سے نصف ٹن سونا اور کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات برآمد کئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی تمہارے اوپر چند نہایت سنگین الزامات ہیں اور تمہیں مجموعی طور پر اڑسٹھ سال کی سزا سنائی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ خاصی طویل مدت ہے۔ اگر تم دوسرا جنم بھی لے لو تو اس جیل کی فصیل سے باہر نہیں نکل سکو گے۔"

"سنا تو یہی ہے کہ آج تک کوئی قیدی اس جیل سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جیل کی اونچی اور سنگلاخ دیواریں کب تک میرا راستہ روک سکتی ہیں۔" قیدی نے قدرے بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم تمہارے پاس ایک تجویز.... ایک پیشکش لے کر آئے ہیں۔" نواز رضوی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ نے ابھی تک تعارف نہیں کرایا۔" جشید نے سوالیہ نگاہوں سے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

"میرا نام نواز رضوی ہے اور میں اس وقت حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ!" جشید نے حیرانی سے کہا "ایک معمولی قیدی اتنا اہم کب سے ہو گیا کہ حکومت اس میں دلچسپی لینے لگے!"

نواز رضوی اس طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا "اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرنے کی ہامی بھر لو تو.... نہ صرف تمہارے خلاف عائد شدہ الزامات واپس لے لئے جائیں گے بلکہ ایک خطیر رقم بھی دی جائے گی۔"

"مثلاً کتنی رقم؟" جشید نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کم از کم دس لاکھ روپے۔"

"اور تعاون کی نوعیت کیا ہو گی؟"

"اگر تم تعاون پر آمادہ ہو تو تفصیلی گفتگو کل ہو گی۔" نواز رضوی نے کہا۔

"آزادی اور دولت ایسی چیز ہے جسے کوئی شخص ٹھکرانے کی حماقت نہیں کر سکتا۔" جشید نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کے باوجود میں پوری تفصیل سننے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔ کیونکہ بعض چیزیں آزادی سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔"

نواز رضوی کھڑا ہو گیا اور جشید کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "اوکے ینگ مین! اب کل صبح کوئٹہ میں ملاقات ہو گی۔ کل جمعہ ہے لیکن تمہیں لینے کے لئے گاڑی پہنچ جائے گی۔"

اس نے میز پر لگا ہوا کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ صرف ایک منٹ بعد سپرنٹنڈنٹ نیازی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور نواز رضوی اسے جشید منصوری کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔

○☆○

کوئٹہ کی فضا شدید سردی کی لپیٹ میں تھی۔ دو دن پہلے برف باری ہوئی تھی۔ زمین پر اگرچہ برف پگھل چکی تھی لیکن بعض مکانوں کی چھتوں پر ابھی تک برف کی تہ جمی ہوئی تھی۔ شہر کے چاروں طرف اونچے پہاڑ برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ موسم کے تیور بتا رہے تھے کہ ایک آدھ روز میں مزید برف باری ہو گی۔ سائبیریا سے آنے والی ہواؤں نے سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اس قیامت خیز سردی کے باوجود لوگوں کے معمولات زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

سیاہ رنگ کی ایک ٹویوٹا کار لٹن روڈ پر رینگتی ہوئی سی چل رہی تھی۔ سڑک بھیگی ہوئی ہونے کی وجہ سے تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف چنار کے اونچے درختوں کی قطاریں استادہ تھیں۔ اوپر سے درختوں کی چوٹیاں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ دھوپ سڑک تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

سریاب پھاٹک کی طرف سے آنے والی ٹویوٹا جناح روڈ کے موڑ سے ذرا پہلے ایک کشادہ گلی میں مڑ گئی۔ اس گلی کے دونوں طرف وسیع و عریض بنگلے تھے۔ سیاہ ٹویوٹا ایک بنگلے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ کار کا دروازہ کھلا اور تین افراد نیچے اتر آئے۔ ان میں دو سادہ لباس پولیس والے تھے جن کے داہنے ہاتھ اپنے اپنے کوٹوں کی جیب میں تھے۔ ان دونوں پولیس والوں کا تعلق مچھ سنٹرل جیل سے تھا۔ کار سے اترنے والا تیسرا آدمی جشید منصوری تھا۔ اس نے لمبا اوور کوٹ اور سر پر اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ وہ دونوں پولیس والوں کے درمیان چلتا ہوا بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ گارڈ کیبن میں کھڑا ہوا ایک آدمی سامنے آ گیا۔ اس نے بھی سیاہ رنگ کا اوور کوٹ اور اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس نے پولیس والوں سے کوئی بات کی اور پھر ان کے اندر جانے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ گیٹ کے اندر پختہ راستے کے دونوں طرف وسیع لان تھا۔ پودے پتیوں سے محروم تھے۔ گھاس پر کہیں کہیں برف جمی ہوئی

تھی۔ عمارت کے برآمدے میں بھی ایک آدمی موجود تھا۔ اس نے جمشید منصوری کے ساتھ آنے والے سادہ لباس پولیس والوں سے کچھ بات کی اور پھر ان کے اندر جانے کے لئے دروازہ کھول دیا۔

دوسری منزل پر ایک کشادہ کمرے میں حامد علی اور نواز رضوی، جمشید کے منتظر تھے۔ ان کے سامنے کافی کے کپ رکھے ہوئے تھے جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میز پر ایک فائل بھی رکھی ہوئی تھی۔ آتشدان کے سامنے اینٹوں کے ایک چھوٹے سے چبوترے پر الیکٹرک ہیٹر رکھا ہوا تھا جس سے کمرے کی فضا میں ایک خوشگوار سی حدت محسوس ہو رہی تھی۔ جمشید کے ساتھ آنے والے سادہ لباس پولیس والوں میں سے ایک نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر نواز رضوی کی طرف بڑھا دیا۔ نواز رضوی نے کاغذ پڑھا، یہ قیدی کی سپرداری کی رسید تھی۔ نواز رضوی نے دستخط کر کے کاغذ پولیس والے کو لوٹا دیا اور وہ دونوں واپس چلے گئے۔

"ہیلو ینگ مین!" نواز رضوی، جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ "آؤ بیٹھو!"

جمشید کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اپنے مکمل نام سے پکارا جانا پسند کروں گا۔ میرا نام جمشید منصوری ہے۔"

"اوکے مسٹر جمشید منصوری! تمہاری یہاں آمد کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ہماری پیشکش قبول کر لی ہے۔" نواز رضوی مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ اصولی طور پر۔" جمشید نے کہا "لیکن آخری فیصلہ پوری بات سننے کے بعد ہی کروں گا۔"

"بہت خوب!" حامد علی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ ایک اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم تم پر اعتماد کر سکتے ہیں۔"

"یقیناً جناب!" جمشید نے کہا "اگرچہ میری عمومی شہرت اچھی نہیں ہے لیکن میں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔ اور نہ کبھی اصولوں کے خلاف سمجھوتا کیا ہے۔ اگر میں نے آپ کا کام کرنے کی ہامی بھرلی تو میں زندگی کے آخری سانس تک اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر میں نے انکار کر دیا تو پوری دنیا کی دولت بھی مجھے ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ میں تیسرے درجے کا دھوکے باز انسان نہیں ہوں۔ شیر کی طرح شکار کر کے کھاتا ہوں۔"

اس دوران نواز رضوی نے الیکٹرک ہیٹر والے چبوترے پر رکھی ہوئی شیشے کی خوبصورت الیکٹرک کیتلی سے ایک کپ میں کافی انڈیلی اور کپ جمشید کے سامنے رکھ کر دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے جمشید کو کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"مسٹر جمشید! میں مختصر بات کروں گا۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ایران میں انقلاب سے پہلے شاہ سے پاکستان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ لیکن وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس وقت شاہ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور خود دوسروں کی مدد کا محتاج ہے۔ ہم شاہ کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن کھل کر سامنے نہیں آسکتے۔ یہاں شاہ کی حمایت میں کوئی بات کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ لیکن ہم اس موقع پر شاہ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا موجودہ حکومت شاہ کی واپسی کے لئے کسی جوابی انقلاب میں اس کی مدد کرنا چاہتی ہے؟" جمشید نے پوچھا۔

"نہیں۔" نواز رضوی نے نفی میں گردن ہلا دی "ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ کسی ایسی کارروائی میں حصہ لے سکیں، ویسے بھی شاہ کی واپسی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ ایران کے مذہبی رہنما حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے ہیں۔"

"تو پھر" جمشید نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا "آپ شاہ کی مدد کس طرح کرنا چاہتے ہیں؟"

"تم جانتے ہو کہ سوئٹزرلینڈ اور امریکا کے بینکوں میں شاہ کی بے حساب دولت جمع تھی لیکن ایران کی انقلابی حکومت نے ان اثاثوں پر حکومتِ ایران کی ملکیت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ متعلقہ ممالک کی عدالتوں نے وہ اثاثے منجمد کر دیئے ہیں اور اب ان میں سے ایک پائی بھی شاہ کو ملنے کی توقع نہیں ہے۔ لیکن ملک چھوڑنے سے پہلے شاہ نے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ چھپا دیا تھا۔ اس میں ملکہ فرح دیبا کے شاہی تاج کے علاوہ کروڑوں ڈالر مالیت کے ہیرے جواہرات اور کم از کم ایک ٹن سونا بھی شامل ہے۔ یہ خزانہ تہران میں ایک عورت کی تحویل میں ہے۔ خانم مہوز کے شاہ کے خاندان سے قریبی تعلقات تھے۔ انقلاب کے بعد شاہ کے حواریوں کی پکڑ دھکڑ کے باوجود خانم مہوز نے ایران سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اب بھی تہران میں موجود ہے۔ ایک موقع پر وہ پکڑی بھی گئی تھی لیکن ایک ہفتہ جیل میں رکھنے کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا۔ کیوں کہ وہ شاہ کے خاندان سے اپنی لاتعلقی ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یوں بھی وہ نہایت سادہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ پاسداران انقلاب کو اس کے قبضے سے دولت نام کی کوئی چیز نہیں ملی۔ اُسے بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔"

"خوب! تو آپ شاہ کا وہ خزانہ چوری کروانا چاہتے ہیں۔" جمشید نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"بالکل ٹھیک سمجھے" نواز رضوی نے کہا "شاہ کا یہ خفیہ خزانہ تہران میں موجود ہے۔"

"انتہائی خطرناک کام ہے" جمشید نے کہا۔

"اسی لئے ہم نے اس کام کے لئے تم جیسے خطرناک آدمی کا انتخاب کیا ہے جو پاسداران انقلاب کے گودام سے کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات اور نصف ٹن سونا چوری کر سکتا ہے یقیناً شاہ کا یہ خزانہ چرانا بھی تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں

ہوگا" نواز رضوی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

جمشید چند لمحوں تک سر جھکائے سوچتا رہا پھر بولا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ تہران میں یہ خزانہ کس جگہ چھپایا گیا ہے؟"

"خزانے کا پتا تو صرف اور صرف خانم مہروز ہی بتا سکتی ہے۔ البتہ ہم تمہیں مہروز کا پتا بتا دیں گے۔ تمہیں پہلے اس سے ملنا ہوگا" نواز رضوی نے کہا۔

"آپ نے اس کام کا کتنا معاوضہ بتایا تھا؟" جمشید نے کہتے ہوئے باری باری دونوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔

"تمہاری آزادی اور دس لاکھ روپے۔ ہو سکتا ہے بعد میں تمہیں مزید انعام بھی دیا جائے۔" نواز رضوی نے جواب دیا۔

"کیا مجھے تہران میں آپ کے آدمیوں کا بھی تعاون حاصل ہوگا؟" جمشید نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بالکل نہیں" نواز نے نفی میں سر ہلا دیا "تہران میں ہمارے اہل کاروں کو پہلے ہی شبے کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی باقاعدہ نگرانی کی جاتی ہے۔ اور یہ بات میں شروع میں ہی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ مشن تمہیں اپنے طور پر مکمل کرنا ہوگا۔ پکڑے جانے کی صورت میں ہماری حکومت کا نام بھی تمہاری زبان پر نہیں آئے گا۔ ہم تمہیں پہچاننے سے ہی انکار کر دیں گے۔ ایک اور بات ذہن میں رکھنا کہ یہ راز صرف تمہارے سینے تک محدود رہنا چاہئے۔ خانم مہروز کا نام بھی کبھی تمہاری زبان پر نہیں آئے گا۔ تمہارے اپنے آدمی تہران میں موجود ہیں۔ تم چاہو تو ان سے کام لے سکتے ہو۔"

"ہاں۔ میرے آدمی بھی ایران میں موجود ہیں" جمشید نے پُرخیال انداز میں کہا "لیکن وہ لوگ جب کام کریں گے تو انہیں کچھ دینا بھی پڑے گا۔ اس لئے دس لاکھ روپے اس کام کے لئے کافی نہیں ہیں۔"

نواز رضوی نے حامد علی کی طرف دیکھا۔ قدرے توقف کے بعد حامد علی نے جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگرچہ معاوضہ بہت معقول ہے لیکن ہم تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ اس لئے ہم پندرہ لاکھ روپے کر دیتے ہیں۔ لیکن اس سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں ہوگا۔"

"مجھے نصف رقم پیشگی چاہئے" جمشید نے کہا "پچاس ہزار ڈالر اور ڈھائی لاکھ مالیت کی ایرانی کرنسی۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہیں یہ رقم مل جائے گی" نواز رضوی نے کہا۔ "پچاس ہزار ڈالر اور ڈھائی لاکھ روپے مالیت کی ایرانی کرنسی۔ اگر تم ناکام ہو گئے تو اس رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔"

"آپ رقم کی واپسی کا مطالبہ کر بھی نہیں سکیں گے۔ کیوں کہ ناکامی کا مطلب میری موت ہوگا" جمشید نے جواب دیا۔

"تمہارا منصوبہ کیا ہوگا؟" حامد علی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں اس قسم کے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔ ویسے بھی میں وقت اور حالات دیکھ کر کام کرتا ہوں" جمشید نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" حامد علی نے کندھے اُچکا دیئے "لیکن ہم تمہیں اپنا منصوبہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔"

اور پھر وہ تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔

جمشید منصوری جب لٹن روڈ کے اس بنگلے سے باہر نکلا تو بالکل مختلف حلئے میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس تھا۔ جمشید منصوری دن بھر کوئٹہ کی سڑکوں اور گلیوں میں آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں اس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ اسے کوئی شخص اپنے تعاقب میں نظر نہیں آیا تھا' اگر کوئی تھا بھی تو وہ اسے جُل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جب رات کی تاریکی نے دامن پھیلایا تو وہ سٹلائٹ کے علاقے میں گھوم رہا تھا۔ یہاں وہ پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا تھا۔ وہ اس علاقے میں رہنے والی ایک طوائف کے مکان کی تلاش میں تھا۔ آخری مرتبہ گرفتار ہونے سے پہلے اس کے ایک دوست نے اس طوائف کے حسن کی بڑی تعریف کی تھی اور اس کے مکان کا پتا بتاتے ہوئے اسے وہاں جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ ادھر کا رخ نہیں کر سکا تھا۔

تقریباً پچیس سال پہلے طوائفیں بازار میں بیٹھا کرتی تھیں۔ سورج گنج بازار اور شارع اقبال کے درمیان واقع لاتعداد تنگ سی گلیاں طوائفوں کے لئے مخصوص تھیں۔ اس پورے علاقے کو چکلا کہا جاتا تھا' جہاں شام کا اندھیرا پھیلنے سے رات گئے تک گہما گہمی رہتی تھی۔ لیکن صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں جسم فروشی کو خلاف قانون قرار دے کر چکلے بند کر دیئے گئے تھے۔ وہ گندگی جو شہر کے ایک مخصوص علاقے تک محدود تھی' اس آرڈیننس کے نفاذ کے بعد پورے شہر میں پھیل گئی۔ طوائفوں نے شہر کے مختلف علاقوں میں اڈے قائم کر لئے تھے اور ان کے گاہک اب انہی اڈوں پر آتے تھے۔

پولیس' طوائفوں کے ان اڈوں سے پوری طرح واقف تھی لیکن کبھی ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ کیوں کہ اس کو ان اڈوں سے باقاعدہ کمیشن ملتا تھا۔

جمشید منصوری کو اس طوائف کا مکان تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ یہاں عیاشی کرنے نہیں آیا تھا۔ مسئلہ صرف رات گزارنے کا تھا۔ گو وہ اپنے کسی عزیز کے ہاں یا ہوٹل میں بھی قیام کر سکتا تھا لیکن اس نے شروع سے ہی احتیاط سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دستک کے جواب میں دروازہ اسی طوائف نے کھولا تھا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس برس رہی ہوگی۔ کمر تک جھولتے ہوئے

سیاہ بال' سیاہ بادامی آنکھیں اور چہرے کے تیکھے نقوش۔ وہ بے حد حسین تھی۔

"جی!" لڑکی نے اس کے اندر آنے کے بعد پوچھا "کتنا وقت گزارو گے؟"

"صرف ایک رات کا سوال ہے۔" جمشید منصوری اس کے مختصر سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ کمرے میں صرف ایک ہی بستر تھا۔ ایک طرف باتھ روم اور دوسری طرف چھوٹا سا کچن تھا' جس میں پتھر کے کوئلے کا اسٹوو جل رہا تھا اس کی وجہ سے کمرے میں کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی تھی۔ فرش پر ایک پرانا سا قالین بچھا ہوا تھا' جس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور دھاگے کئی جگہ سے اُدھڑے ہوئے تھے۔

"تمہارے پاس دوسرا بستر نہیں ہے؟" جمشید نے پوچھا۔

"دوسرا بستر!" لڑکی نے حیرت سے کہا "یہاں کبھی کسی نے دوسرے بستر کی بات نہیں کی۔"

"سنو ڈیئر! میں ذرا مختلف قسم کا آدمی ہوں۔ اپنے کام میں کسی کی شراکت برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لئے ہمیشہ الگ بستر پر سوتا ہوں۔ اور آج تو میں خاص طور پر الگ بستر پر سونا چاہتا ہوں کیوں کہ کئی راتوں سے پکے فرش پر کروٹیں بدلتے ہوئے ہڈیاں بھی دکھنے لگی ہیں" جمشید نے کہا۔

لڑکی نے بُرا سا منہ بنایا' چند لمحے ناگوار سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"تو پھر یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کسی ہوٹل میں چلے جاؤ۔ دس بیس روپے خرچ کر کے وہاں تمہیں رات بھر کے لئے بستر مل جائے گا۔"

"ایک رات کا کیا نذرانہ لیتی ہو؟" جمشید نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر کوئی اونچا ہو تو پانچ سو روپے بھی دے جاتا ہے اور اگر کوئی کنگلا ہو تو دو تین سو روپے پر قناعت کر لیتی ہوں" لڑکی نے کہا۔

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"شکل سے تو نہیں لگتے لیکن شاید......"

جمشید منصوری نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور پانچ سو روپے کے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ لڑکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کسی گاہک سے پانچ سو روپے والی بات محض گپ تھی۔ کسی نے آج تک اسے سو روپے سے زیادہ نہیں دیئے تھے۔ جمشید منصوری نے سو روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر لڑکی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"یہ رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے کے لئے ہے" اس نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کھانا لذیذ اور عمدہ ہونا چاہئے۔"

"بہتر جناب!" لڑکی مرعوب سی ہو گئی۔

"تمہیں خراٹے لینے کی عادت تو نہیں؟"

تین تین

موسم کی پہلی بارش ہوئی تو ایک شخص نے خوش ہو کر قہقہہ لگایا اور کہا "واہ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے۔ لگتا ہے زمین میں دبی ہوئی تمام چیزیں ابھر کر آگئی ہیں۔"

پاس کھڑے ہوئے شخص نے بوکھلا کر اسے دیکھا اور ڈرے ڈرے لہجے میں بولا "یا اللہ خیر میری تو تین تین بیویاں زمین کے اندر دبی ہوئی ہیں۔"

"نہیں۔" لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ویری گڈ!" جمشید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کھانے کے فوراً بعد میں سو جانا چاہتا ہوں۔ تم اس قالین پر سوؤ گی۔ او کے۔"

"لیکن ..... لیکن یہ پانچ سو روپے کس بات کے ہیں؟" لڑکی نے ایک بار پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اوہ! کیسی کند ذہن لڑکی ہو" جمشید نے اسے گھورا "میں نے یہ پیسے اپنی نیند خراب کرنے کے لئے نہیں دیئے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ سکون کی نیند....."

"سمجھ گئی" لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بستر ٹھیک کرنے کے بعد کچن میں چلی گئی۔

جمشید منصوری بستر پر لیٹ کر آئندہ کا پروگرام طے کرنے لگا۔ واپس ایران میں داخل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کیجی کے ہرکارے شکاری کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ اگلے روز علی الصبح وہ بیدار ہو گیا۔ شیو اور غسل کے بعد اس نے وہ لباس پہن لیا جو...... گزشتہ روز خریدا تھا۔ اس کے بعد اس نے قالین پر سوئی ہوئی لڑکی کو جگایا اور ناشتا تیار کرنے کے لئے کہا۔ وہ رات کو دیر تک جاگنے اور صبح دیر تک سونے کی عادی تھی۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور بڑبڑاتی ہوئی کچن میں گھس گئی۔ ناشتے کا سامان وہ رات ہی کو بیکری سے لے آئی تھی۔ انڈہ فرائی کرنے کے بعد اس نے ڈبل روٹی کے پیس بھی ہلکے سے تل دیئے۔ پھر جیلی' مکھن' پنیر اور انڈہ ڈبل روٹی کے سلائس چھوٹی میز پر رکھ دیئے۔

"سنو!" اس نے جمشید کی طرف دیکھے بغیر کہا "جب جانے لگو تو دروازہ بند کر جانا۔"

جمشید نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ دوبارہ بستر میں گھس گئی تھی۔ جمشید نے اطمینان سے ناشتا کیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ فضا دُھند آلود تھی۔ سڑکیں اور گلیاں تقریباً ویران پڑی تھیں۔ کہیں کہیں گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے لوگ آ جا رہے تھے' جو دُھند کے باعث چلتے پھرتے بھوت معلوم ہو رہے تھے۔

دس بجے تک وہ گزشتہ روز کی طرح گلیوں میں اور سڑکوں پر گھومتا رہا لیکن اسے اپنے تعاقب میں کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ایسی دکان میں گھس گیا جہاں ڈراموں میں استعمال ہونے والے ملبوسات اور دیگر اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ وہاں سے اس نے اپنی ضرورت کے مطابق چیزیں خریدیں اور اگلی دکان میں گھس گیا۔ اسی طرح اس نے کچھ اور دکانوں سے سامان خریدا اور مسجد روڈ کے پہلو میں ایک تنگ سی گلی میں واقع ایک دکان میں گھس گیا۔

دکان کے باہر پرانے سے بورڈ پر رشید سٹور کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہ دکان ایک کباڑ خانہ ہی لگتی تھی۔ کیوں کہ اس میں سب پرانا سامان بھرا ہوا تھا۔ لیکن جشید منصوری جانتا تھا کہ دکان کا مالک رشید کچھ اور بھی کام کرتا تھا۔ ایک کونے میں رکھے ہوئے پرانے سے ٹیپ ریکارڈر پر قوالی کا کیسٹ چل رہا تھا۔ رشید قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھا بڑی توجہ سے قوالی سن رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک مجہول سا آدمی تھا۔ کم از کم تین دن کا بڑھا ہوا شیو' سر پر اونی ٹوپی جس سے کان بھی ڈھکے ہوئے تھے' میلا سا اوور کوٹ اور پیروں میں براؤن جوتے' جنہیں غالباً بہت عرصہ سے پالش نصیب نہیں ہوئی تھی۔

"ہیلو مسٹر رشید!" جشید نے اس کے سامنے پہنچ کر کہا "مجھے تمہارے ایک دوست نے بھیجا ہے۔"

"کس دوست نے؟" رشید نے بھویں سکیڑ کر جشید کو گھورا۔

"رستم نے" جشید نے جواب دیا۔ یہ ایک پاس ورڈ تھا "اس نے کہا ہے کہ چاندنی واپس آ گئی ہے۔"

"کیوں نہ اندر بیٹھ کر بات کی جائے" رشید نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جہاں مرضی لے چلو" جشید منصوری مسکرا دیا۔

رشید نے دکان کا بیرونی شیشے والا دروازہ لاک کر دیا اور جشید منصوری کی رہنمائی کرتا ہوا ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔ یہ نسبتاً کشادہ کمرا تھا۔ ایک کونے میں میز پڑی ہوئی تھی جس پر رنگ برنگے کیمیکلز سے بھری ہوئی بوتلیں نظر آ رہی تھیں۔ دوسری طرف لکڑی کے اسٹینڈ پر دو کیمرے ایستادہ تھے۔

"اب بولو" رشید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے ایرانی شناختی کاغذات کے چند سیٹ درکار ہیں۔ ان میں جو تصویریں لگائی جائیں گی ان کے لئے میں مختلف لباس اور بھیس استعمال کروں گا۔ اس کے لئے میں تمام ضروری لباس وغیرہ ساتھ لایا ہوں۔ دستاویزات میں تم نام کا خانہ خالی چھوڑ دو گے جسے میں بعد میں پُر کر لوں گا۔ یہ کاغذات مجھے آج ہی چاہئیں۔"

"آج تو بہت مشکل ہے۔ مجھے کچھ اور کام بھی کرنے ہیں۔" رشید نے کہا۔

"تمہارے دوسرے کام انتظار کر سکتے ہیں لیکن میں انتظار نہیں کر سکتا" جشید نے کہا۔

"گویا تم یہ کام ارجنٹ بنیاد پر کروانا چاہتے ہو؟"

"بالکل ٹھیک سمجھے۔ معاوضہ بھی ارجنٹ کے حساب سے ہی دوں گا۔ مثلاً پانچ ہزار روپے فی سیٹ۔" جشید نے کہا۔

"بہت خوب!" رشید مسکرایا "سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔"

وہ خاصا طویل اور تھکا دینے والا کام تھا' جو رات گئے تک جاری رہا۔ سب سے پہلے جشید نے مختلف بھیسوں میں تصاویر اتروائیں۔ جب یہ تصویریں تیار ہو گئیں تو جشید نے ان کے نیگیٹو جلا دیئے۔ اس کے بعد جو سیٹ تیار ہو جاتا اس پر جشید اپنے ہاتھ سے نام لکھ دیتا۔ مقصد یہ تھا کہ رشید وہ نام نہ دیکھ سکے

کام مکمل ہونے کے بعد اس نے ہر سیٹ کو متعلقہ لباس کے ساتھ مختلف تھیلیوں میں بند کر کے انہیں ایک بڑے پیکٹ میں باندھ دیا۔ پیکٹ کے اندر ایک سربمہر لفافہ بھی رکھ دیا جو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے تیار کیا تھا۔ آخر میں اس نے رشید کو معاوضہ ادا کیا اور پیکٹ اٹھا کر دکان سے باہر نکل آیا۔

کچھ دور جا کر وہ ایک اور گلی میں مڑ گیا۔ اسی طرح دو تین گلیوں میں گھومتا ہوا جناح روڈ پر نکل آیا۔ یہ شہر کا سب سے خوب صورت کمرشل علاقہ تھا۔ بڑی بڑی دکانوں...... کے علاوہ شہر کے چند عمدہ ریسٹورنٹس بھی اسی سڑک پر تھے۔ شام کے وقت اس سڑک پر اچھی خاصی رونق ہوا کرتی تھی' لیکن آج سردی کی شدت کے باعث یہ سڑک بھی سنسان نظر آ رہی تھی۔ البتہ ریسٹورنٹس میں رونق تھی۔ وہ کیفے فرح میں داخل ہو گیا۔

دروازے میں داخل ہونے کے بعد جشید چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر کونے کی ایک میز پر جا بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی ویٹر پہنچ گیا۔ جشید نے اسے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ کھانے کے بعد وہ اپنا پیکٹ میز پر ہی چھوڑ کر کاؤنٹر پر آ گیا اور ٹیلی فون اپنی طرف کھسکا کے ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ہیلو ریاض!" رابطہ ملنے کے بعد اس نے کہا "سناؤ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"زندگی کی گاڑی کو دھکا لگانے کا شغل جاری ہے" دوسری طرف سے ریاض کی آواز سنائی دی "مگر تم یہاں کیسے؟ میں نے تو سنا تھا کہ......"

"ونڈر فل!" جشید منصوری نے اسے مزید بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "گویا تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ میں اس وقت جناح روڈ پر کیفے فرح میں بیٹھا ہوں اور تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ سارے کام چھوڑ کر یہاں آ جاؤ...... نہیں نہیں..... فون پر کچھ نہیں بتا سکتا' بالمشافہ بات ہو گی۔ حسب سابق مجھ سے مل کر تمہیں خوشی ہو گی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔

تقریباً پون گھنٹے بعد پچاس برس کا ایک صحت مند آدمی اس کی میز پر موجود تھا۔ وہ ریاض تھا۔ ریاض ریلوے کا ایک سینئر انجن ڈرائیور تھا زیادہ تر کوئٹہ سے زاہدان جانے والی ٹرین پر ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔ کوئٹہ سے یہ مسافر ٹرین ایران کے سرحدی شہر زاہدان تک ہفتے میں صرف ایک بار جایا کرتی تھی۔ یہ ہفتہ وار ٹرین اگرچہ پاکستان سے ایران اور عراق جانے والے زائرین کی سہولت کے لئے چلائی گئی تھی مگر زائرین کو جگہ کم ہی ملتی تھی۔ ٹرین پر عملی طور پر قبضہ اسمگلروں کا ہی ہوتا تھا۔ سرحد پر دونوں طرف سخت چیکنگ کے باوجود اسمگلر کروڑوں روپے مالیت کا مال لے کر سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے......... ریلوے کے بعض ملازمین بھی اسمگلنگ میں ملوث تھے۔

ریاض اگرچہ انجن ڈرائیور تھا اس کی تنخواہ محدود تھی لیکن وہ بڑی ٹھاٹ دار زندگی گزار رہا تھا۔ جمشید منصوری جیسے لوگوں کے کام آکر وہ لاکھوں کما رہا تھا۔ اس نے ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ایک کالونی میں ایک بڑا خوب صورت مکان بنا رکھا تھا' جہاں فون بھی تھا۔ اس کی رہائش اسی مکان میں تھی۔ سرکاری مکان اس نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔

رسمی گفتگو کے بعد جمشید منصوری اصل موضوع پر آگیا۔

"آج کل کس روٹ پر ڈیوٹی دے رہے ہو؟"

"وہی پرانا روٹ۔ کوئٹہ روہڑی' کوئٹہ چمن یا کوئٹہ زاہدان وغیرہ" ریاض نے جواب دیا۔

"یہ بیگ زاہدان پہنچانا ہے اور یہ بہت ہی اہم بیگ ہے۔" جمشید نے دوسری کرسی پر رکھے ہوئے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

"پہنچ جائے گا" ریاض نے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ زاہدان کی ٹرین ہفتے کی صبح کو یہاں سے روانہ ہوتی ہے اور آج ہفتے کا دن گزر چکا ہے۔ لیکن یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ شدید بارشوں کی وجہ سے احمد وال کے قریب ریل کی پٹری ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے آج ٹرین کی روانگی منسوخ کر دی گئی۔ اب یہ ٹرین کل صبح روانہ ہوگی۔ اس ٹرین پر اگرچہ میری ڈیوٹی نہیں ہے لیکن ایک قابلِ اعتماد دوست کے ذریعے بھجوا سکتا ہوں..... اگر جلدی نہ ہو...."

"جلدی تو ہے" جمشید نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن میں اس بیگ کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم خود پہنچاؤ۔ میں کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کر سکتا۔"

"ایسی صورت میں" ریاض سوچتے ہوئے بولا "مجھے ڈیوٹی تبدیل کرانی پڑے گی۔ ویسے اس میں کوئی خطرناک چیز تو نہیں؟" اس نے کرسی پر رکھے ہوئے بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"صرف کپڑے اور کاغذات ہیں۔ اس میں نہ تو منشیات ہیں' نہ ہی کوئی دھماکا خیز مادہ اور نہ ہی کسی قسم کی خفیہ دستاویزات ہیں۔"

"او کے۔ میں آج رات ہی کنٹرولر سے مل کر ڈیوٹی تبدیل کروا لوں گا۔ زاہدان میں یہ بیگ کہاں پہنچانا ہے؟" ریاض نے کہا۔

جمشید منصوری نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ "........ اس پر نام' پتا اور فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ یہ لفافہ اس شخص کو دے دینا اور کہنا کہ وہ فوراً اس میں لکھی ہوئی ہدایات پر عمل شروع کر دے۔ اس بیگ میں پانچ پیکٹ ہیں جو ایران میں مختلف جگہوں پر پہنچانے ہیں۔ ان جگہوں کے پتے اس خط میں موجود ہیں۔ اُسے تاکید کر دینا کہ تمام پیکٹ ایک ہفتے کے اندر اندر اپنی منزل پر پہنچ جانے چاہئیں" اس نے جیب سے دوسرا لفافہ نکالا اور ریاض کو دیتے ہوئے کہا "یہ تمہارا نذرانہ۔"

"خاصا وزنی لفافہ ہے" ریاض لفافے کو ہاتھ میں تولتے ہوئے بولا۔

"ہلکا کام میں نے کبھی نہیں کیا۔" جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ریاض نے لفافہ جیب میں ٹھونس لیا اور مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا "شکریہ منصوری!" اس نے کہا "پیر کے روز یہ بیگ اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔"

اس کے جانے کے بعد جمشید منصوری چند لمحے دروازے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ساتھ والی میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا۔ یہ آج ہی کا' شام کو شائع ہونے والا اخبار تھا لیکن بُری طرح مسلا ہوا تھا۔ جیسے بہت سے ہاتھوں سے گزر چکا ہو۔ جمشید نے اخبار کو ہلکا سا جھٹکا دے کر سیدھا کرتے ہوئے اپنے سامنے پھیلا لیا۔ ہیڈ لائن پر نظر پڑتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"ایران سے نصف ٹن سونا اور کروڑوں کے جواہرات چُرانے والا خطرناک مجرم جمشید منصوری ڈرامائی انداز میں مچھ جیل سے فرار ہو گیا۔"

یہ اخبار کی ہیڈ لائن تھی۔ اس کے ساتھ ہی جمشید کی تصویر بھی تھی' جسے دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے لیکن کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ جمشید اس وقت اپنی اصل شکل میں نہیں تھا۔ رشید کی دکان سے نکلنے سے پہلے اس نے چہرے پر پلاسٹک میک اپ کر لیا تھا جس سے اس کا چہرہ بالکل تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے خبر پڑھنے لگا۔

"ایرانی نژاد خطرناک مجرم جمشید منصوری جسے چند ہفتے قبل کوئٹہ سے نوے میل دور نوشکی سے گرفتار کیا گیا تھا اور گرفتاری کے وقت جس کے قبضے سے نصف ٹن سونا اور کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات برآمد ہوئے تھے' جمعہ کی صبح کو اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے نہایت ڈرامائی انداز میں مچھ جیل سے فرار ہو گیا۔ جمشید منصوری کے فرار کا یہ منصوبہ بڑی مہارت سے تیار کیا گیا تھا۔ تفصیلات کے مطابق جمعرات کی سہ پہر مچھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو ارجنٹ میل کے ذریعے چیف سیکریٹری کی طرف سے

ایک خط موصول ہوا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ مرکزی حکومت ایک نہایت اہم کیس کے سلسلے میں جمشید منصوری سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں مرکزی حکومت کے دو نمائندے اس سے ملاقات کے لئے کچھ جیل آرہے ہیں۔ چیف سیکریٹری کے خط میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو ہدایت کی گئی تھی کہ مرکزی حکومت کے نمائندوں سے بھرپور تعاون کیا جائے۔ اور اگر وہ تحقیقات کے سلسلے میں جمشید منصوری کو جیل سے باہر بھی لے جانا چاہیں تو اسے اُن کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی جائے۔

جیل سپرنٹنڈنٹ کے بیان کے مطابق جمعرات ہی کی شام کو مرکزی حکومت کے وہ دونوں مبینہ نمائندے مچھ جیل پہنچ گئے' انہوں نے چیف سیکریٹری کا ایک دستی خط بھی اسے دیا۔ اس خط میں بھی ہدایت کی گئی تھی کہ ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا جائے۔ مرکزی حکومت کے دونوں نمائندے آدھے گھنٹے تک جمشید منصوری سے تنہائی میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر انہوں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو ہدایت کی کہ جمشید منصوری کو کل صبح کوئٹہ بھیج دیا جائے تاکہ وہاں اطمینان سے اس سے ایک اہم سرکاری معاملے میں تفتیش کی جاسکے۔

دوسرے دن جمعہ کو تمام دفاتر بند ہونے کی وجہ سے جیل سپرنٹنڈنٹ' چیف سیکریٹری کے دفتر سے اس حکم نامے کی تصدیق نہیں کرسکا لیکن اس دفتر سے چیف سیکریٹری کی مہر اور دستخطوں سے جاری ہونے والے دونوں خطوط سے وہ مطمئن تھا چنانچہ جمشید منصوری کو جمعہ کی صبح کو دو کانسٹیبلوں کی نگرانی میں کوئٹہ روانہ کردیا گیا' جنہوں نے اسے لٹن روڈ کے ایک بنگلے میں پہنچادیا۔ مرکزی حکومت کے ایک نمائندے مسٹر نواز رضوی نے قیدی کی سپرداری کی رسید بھی دی تھی۔ اس روز جمعہ کی چھٹی ہونے کی وجہ سے جیل سپرنٹنڈنٹ' چیف سیکریٹری کے دفتر کو قیدی کی منتقلی کی اطلاع نہیں دے سکا اور آج صبح جب جیل کی طرف سے اس خطرناک قیدی کے بارے میں یہ اطلاع ملی تو چیف سیکریٹری کے دفتر میں کھلبلی سی مچ گئی۔

ہمارے نمائندے کے مطابق چیف سیکریٹری کے دفتر سے قیدی جمشید منصوری کے سلسلے میں اس قسم کا کوئی خط جاری نہیں کیا گیا تھا۔ یہ بات اب پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اپنے آپ کو مرکزی حکومت کے نمائندے ظاہر کرنے والے' جمشید منصوری کے ساتھی تھے اور انہوں نے چیف سیکریٹری کے نام سے جعلی خطوط کے ذریعے بڑی مہارت سے اُس کے فرار کا یہ منصوبہ تیار کیا تھا جو کامیاب رہا۔ پولیس نے لٹن روڈ والے بنگلے پر چھاپا مارا تو انکشاف ہوا کہ یہ بنگلا پندرہ دن پہلے علی اکبر نامی ایک شخص نے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ اس نے ایک مہینے کا کرایہ بھی پیشگی ادا کردیا تھا۔ علی اکبر نے اپنے آپ کو کراچی کا باشندہ ظاہر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ برف باری دیکھنے کے لئے کوئٹہ آیا ہے۔

مچھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر الطاف نیازی اور جمشید منصوری کو جیل سے لے جانے والے دونوں کانسٹیبلوں کو معطل کرکے حراست میں لے لیا گیا ہے اور پولیس بڑی سرگرمی سے جمشید منصوری اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کررہی ہے۔ کوئٹہ میں رہنے والے جمشید منصوری کے بعض رشتے داروں کو بھی حراست میں لے لیا گیا ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ پولیس نے کوئٹہ سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کردی ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ جمشید منصوری ابھی تک کوئٹہ ہی میں روپوش ہے اور اسے بہت جلد گرفت میں لے لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں مزید انکشافات کی توقع ہے۔

یہ خبر پڑھ کر جمشید منصوری سنّاٹے میں آگیا۔ اس کے فرار کا انکشاف آج ہوا تھا اور وہ آج صبح ہی سے رشید کی دکان میں بند اس کے ساتھ کام میں مصروف رہا تھا۔ پورے دن میں اسے باہر کے حالات کی خبر تک نہیں رہی تھی جبکہ پولیس پورے شہر میں اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ لیکن...... وہ سوچ رہا تھا کہ حامد علی اور نواز رضوی کون تھے؟ انہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس ڈرامائی انداز میں اسے جیل سے کیوں نکلوایا تھا؟ مطلب تو صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ تہران میں پوشیدہ معزول شاہ کا خزانہ حاصل کرنا چاہتے تھے' جس کی مالیت یقیناً اربوں ڈالر تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اپنے آپ کو حکومتِ پاکستان کے نمائندے ظاہر کرکے اسے جیل سے فرار کرانے والے یہ دونوں کون تھے؟ یہ تو ثابت ہوگیا تھا کہ ان دونوں کا حکومتِ پاکستان سے کوئی تعلق نہیں تھا اور انہوں نے محض اس کو جیل سے نکلوانے کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر اُن کا راز فاش ہوجاتا تو اس وقت وہ دونوں بھی جیل کی کسی تنگ سی کوٹھری میں بند ہوتے۔ لیکن انہوں نے بڑی مہارت سے منصوبہ تیار کیا تھا۔ چیف سیکریٹری کے نام سے خط ارجنٹ میل سے جمعرات کو اس وقت مچھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو پہنچایا گیا تھا جب سرکاری دفاتر بند ہوچکے تھے اور سپرنٹنڈنٹ ٹیلی فون یا کسی دیگر ذریعہ سے چیف سیکریٹری کے دفتر سے اس خط کے بارے میں تصدیق نہیں کرسکتا تھا۔ پھر جمعرات کی شام کو وہ دونوں' چیف سیکریٹری کا ایک اور خط لے کر خود مچھ جیل پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے چیف سیکریٹری کے نام سے دونوں جعلی خطوط اس مہارت سے تیار کئے تھے کہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ بھی دھوکا کھا گیا تھا۔ اور پھر ان دونوں کی شخصیت بھی اس قدر بھاری بھرکم تھی کہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ انہوں نے بڑے پُروقار اور دبنگ لہجے میں بات کی تھی۔ وہ اگر چاہتے تو جمشید کو جمعرات کی شام ہی کو اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے لیکن انہوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو ہدایت کی تھی کہ اسے اگلے روز دو کانسٹیبلوں کی نگرانی میں کوئٹہ بھیج دیا جائے۔ اگلے روز جمعہ تھا' تمام سرکاری دفاتر بند تھے۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ کسی بھی ذریعے سے چیف سیکریٹری

کے خطوط یا اُن دونوں کے بارے میں تصدیق نہیں کر سکتا تھا لیکن بہرحال، وہ چیف سیکریٹری کے خطوط سے مطمئن تھا اور اس نے جمشید منصوری کو دو کانسٹیبلوں کی نگرانی میں کوئٹہ بھیج دیا اور آج جب اس نے چیف سیکریٹری کے دفتر کو قیدی کی منتقلی کے بارے میں اطلاع دی ہوگی تو یہ راز کھلا ہوگا کہ ایک بہت بڑا فراڈ ہو چکا ہے۔

لیکن یہ سوال بدستور اپنی جگہ موجود تھا کہ وہ دونوں کون تھے؟ کیا واقعی ان کا تعلق ایران کے معزول شاہ سے تھا یا وہ کسی ایسی تنظیم سے وابستہ تھے جنہیں شاہ کے پوشیدہ خزانے کا علم ہو گیا تھا اور وہ خزانہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان دنوں ایران سے دولت باہر لے جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن وہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ خزانہ صرف اور صرف جمشید منصوری ہی حاصل کر سکتا تھا۔ جو شخص پاسداران انقلاب کے گودام سے نصف ٹن سونا اور کروڑوں روپے مالیت کے جواہرات چرا سکتا تھا اس کے لئے شاہ کا پوشیدہ خزانہ حاصل کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

اُن دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس وقت کہاں ہوں گے لیکن جمشید کو یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی موقع پر اس سے رابطہ ضرور قائم کریں گے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اسے جیل سے رہائی دلائی تھی بلکہ ایک خطیر رقم بھی خرچ کر ڈالی تھی۔ اور ظاہر ہے یہ سب کچھ تفریح کے طور پر نہیں کیا گیا تھا۔ جمشید منصوری نے بہرحال یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اس کھیل کو اختتام تک پہنچائے گا۔ یہ کھیل دلچسپ ہونے کے ساتھ خطرناک بھی تھا اور اسے خطرات سے کھیلنا پسند تھا۔

جمشید منصوری ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس کر کے چونک گیا۔ اس کی نظر سب سے پہلے اس شخص کے جوتوں پر پڑی تھی جو اس کے قریب کھڑا تھا۔ سیاہ رنگ کے بوٹ تھے جن کی ٹو چمک رہی تھی۔ جوتوں سے اوپر خاکی پتلون تھی۔ جمشید کی نظریں پتلون کی کریز کے ساتھ ساتھ اوپر اٹھتی چلی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے سینے میں اپنا سانس رکتا محسوس ہوا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ پولیس کا سب انسپکٹر تھا جو اُس کی میز کے قریب کھڑا گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو کانسٹیبل بھی تھے جنہوں نے رائفلیں سنبھال رکھی تھیں۔

"یس آفیسر!" جمشید منصوری نے اپنے لہجے پر کنٹرول رکھتے ہوئے کہا۔

"زحمت کے لئے معذرت چاہتا ہوں" سب انسپکٹر نے کہا۔ "کیا آپ اپنا شناختی کارڈ دکھائیں گے؟"

"اوہ! کیوں نہیں" جمشید منصوری نے کہتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ یہ

کارنامہ

ایک روسی انقلابی جب "جنت" کے دروازے پر پہنچا تو وہاں کے داروغہ نے اس کا استقبال کیا اور اسے ادھر اُدھر گھماتے ہوئے بولا "تم یہاں جہاں چاہے جا سکتے ہو، بس ادھر مت جانا جدھر کڑاہی گرم دکھائی دے رہی ہے۔"

"وہ کیوں؟" انقلابی نے پوچھا۔

"وہ جگہ صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جنہوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔"

"مگر میں ایک بڑا کارنامہ انجام دے چکا ہوں" انقلابی نے کہا "میں نے روسی حکام کے خلاف کریملن میں ایک شدید تنقیدی تقریر کی تھی اور پھر روسی عوام کو اکسایا تھا کہ وہ اس حکومت کا تختہ الٹ دیں۔"

"اور... یہ کب کی بات ہے؟" داروغہ نے پوچھا۔

انقلابی نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا "صرف دو منٹ پہلے کی۔"

شناختی کارڈ جمشید نے رشید سے لیا تھا اور اس پر لگی ہوئی تصویر کے مطابق اپنے چہرے پر پلاسٹک میک اَپ کر لیا تھا۔ شناختی کارڈ اصلی اور حکومت پاکستان کا جاری کردہ تھا۔ رشید کے پاس ایسے بہت سے کارڈ تھے۔ یہ کارڈ یا تو گمشدہ تھے یا ان کے مالکان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کارڈ پر زاہد حسین کا نام لکھا ہوا تھا اور پتا شارع شارک روڈ کے ایک مکان کا تھا۔

سب انسپکٹر نے پہلے کارڈ پر لگی ہوئی تصویر کو دیکھا پھر جمشید منصوری کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کارڈ واپس کر دیا۔

"آپ کو شاید اس شخص کی تلاش ہے آفیسر" جمشید نے اپنے سامنے میز پر رکھے ہوئے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کا خیال درست ہے" سب انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اخبار کی اطلاع کے مطابق یہ شخص گزشتہ روز جیل سے فرار ہوا تھا۔ کیا آپ کے خیال میں وہ ابھی تک شہر میں آزادانہ طور پر گھوم رہا ہوگا؟" جمشید منصوری نے کہا۔

"ہم کم از کم اسے تلاش کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں" سب انسپکٹر کہتے ہوئے دوسری میز کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے انداز اور لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ کارروائی محض خانہ پُری کے لئے کی جا رہی تھی۔

چند منٹ بعد پولیس والے چلے گئے۔ کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگ اب اس موضوع پر باتیں کرنے لگے تھے۔ جمشید منصوری اپنی

سیٹ پر بیٹھا لوگوں کی باتیں سنتا رہا پھر اس نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے کوٹ کا کالر گردن تک اٹھایا، دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے اور ٹپے تلے قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔

O☆O

زاہدان سے کرمان تک ۵۳۰ کلومیٹر کا فاصلہ اس نے ایک مال بردار ٹرک کے ذریعے طے کیا تھا۔ تافتان سے پاکستان کی سرحد عبور کرتے ہوئے جمشید منصوری کو محتاط ہو جانا پڑا تھا۔ کمیٹی کا عملہ سرگرم تھا۔ بڑی سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ بعض مشتبہ افراد کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ جمشید منصوری کے کاغذات بھی بڑی باریک بینی سے چیک کئے گئے تھے۔ اس سے متعدد ایسے سوالات کئے گئے تھے کہ اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو گڑبڑا جاتا مگر جمشید نے بڑے پُرسکون لہجے میں ان سوالات کے جواب دئے تھے۔

تافتان سے زاہدان پہنچتے ہی اس نے فرخ سے رابطہ قائم کیا۔ پاکستانی سرحد سے تقریباً ۸۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ریگزار کویر کے کنارے پر آباد تقریباً دو لاکھ کی آبادی پر مشتمل یہ شہر سطح سمندر سے ۱۳۷۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں زیادہ لوگ تجارت پیشہ ہیں۔ قالین بافی کی کئی چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں ہیں۔ اس سے صرف ۲۲۶ کلومیٹر کے فاصلے پر افغان سرحد کے قریب دریائے ہرمند کے کنارے زابل کا تاریخی شہر آباد ہے۔ زابل، سیستان کا مرکزی شہر ہے۔ حال ہی میں یہاں ایک قدیم شہر کے کھنڈرات بھی دریافت ہوئے ہیں، جن کے بارے میں خیال ہے کہ چار ہزار سال پہلے یہاں ایک خوب صورت شہر آباد تھا۔ یہاں سے بہت سی ایسی چیزیں دریافت ہوئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ اب تک دریافت ہونے والے بیشتر کھنڈرات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے یہ قدیم شہر آگ لگنے سے تباہ ہوا ہو۔ لیکن فی الحال کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ مقامی باشندے اسے شہر سوختہ (جلا ہوا شہر) کے نام سے پکارتے ہیں۔

کمیٹی کے اہل کار پورے زاہدان شہر میں دندناتے پھر رہے تھے۔ ہر مشتبہ شخص کو روک کر پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ جمشید منصوری کو بھی شہر میں دو مرتبہ روکا گیا اور دونوں مرتبہ بڑی باریک بینی سے اس کے شناختی کاغذات چیک کئے گئے..... ان کاغذات کے مطابق وہ شیراز میں قالین تیار کرنے والی ایک کمپنی کا مالک تھا اور کاروبار کے سلسلے میں پاکستان گیا ہوا تھا۔

جب وہ زاہدان پہنچا تو اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ شہر میں زیادہ گھومنا پھرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گیا۔ پہلی مرتبہ اس نے فرخ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ فرخ کے مکان پر تالا لگا ہوا تھا اور اب وہ ریسٹورنٹ میں بیٹھا وقت گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے ریسٹورنٹ کے ٹیلی فون سے فرخ کے نمبر پر فون کیا۔ اس مرتبہ رابطہ قائم ہو گیا۔ وہ چند منٹ پہلے ہی گھر پہنچا تھا۔ جمشید نے اسے انتظار کرنے کو کہا اور ریسٹورنٹ سے نکل آیا۔ فرخ کے مکان تک پہنچنے میں صرف پندرہ منٹ لگے۔ وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کمیٹی کو تمہاری آمد کی اطلاع مل چکی ہے۔ پورے شہر میں تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔ ہر مشتبہ شخص کو روک کر پوچھ گچھ کی جا رہی ہے" فرخ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"مجھے اندازہ ہو چکا ہے" جمشید منصوری نے کہا "تم نے یہاں سے میری روانگی کا کیا بندوبست کیا ہے؟"

"دوپہر کو ایک مال بردار ٹرک کرمان کے لئے روانہ ہونے والا ہے۔ تم ٹرک ڈرائیور کے ہیلپر کی حیثیت سے ساتھ جاؤ گے۔ تم نے جو پیکٹ بھیجے تھے وہ متعلقہ جگہوں تک پہنچا دیئے گئے ہیں۔ تم لباس وغیرہ تبدیل کر لو۔ میں معلوم کر کے آتا ہوں کہ ٹرک کس وقت روانہ ہو گا۔" فرخ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی جمشید منصوری نے میز پر رکھا ہوا ایک تھیلا کھول لیا جس میں بوسیدہ سے لباس کے علاوہ اس کے نئے شناختی کاغذات بھی موجود تھے۔ لباس پر جگہ جگہ گریس اور تیل کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس نے لباس تبدیل کر کے کاغذات جیب میں رکھے اور کچن میں گھس گیا اور فریج کھول کر جائزہ لینے لگا۔ فریج میں انڈے، مکھن اور ضرورت کی دیگر چیزیں موجود تھیں۔ اس نے دو انڈوں کا آملیٹ بنایا اور ڈبل روٹی کے سلائس گرم کرنے لگا۔

ابھی اس نے سلائس پلیٹ میں رکھے ہی تھے کہ باہر گاڑیوں کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ ٹائروں کی چرچراہٹ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ گاڑیاں بہت عجلت میں روکی گئی ہیں۔ وہ پلیٹ ہاتھ میں اٹھائے کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی پر رنگین شیشے لگے ہوئے تھے جن سے آرپار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے ایک انچ کے قریب کھڑکی کا پٹ کھول دیا اور باہر جھانکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے پلیٹ گر گئی اور تلے ہوئے سلائس فرش پر بکھر گئے۔

جمشید منصوری کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ کمیٹی والوں کو اس کی آمد کی اطلاع مل چکی ہے اور اسے شہر میں بڑی سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کمیٹی والے اتنی جلد اس تک پہنچ جائیں گے۔

وہ ایک کار اور دو چھوٹے ٹرک تھے جو گلی میں آکر رکے تھے۔ کمیٹی کے تقریباً ڈیڑھ درجن مسلح آدمی ٹرکوں سے اتر کر آٹومیٹک ہتھیار سنبھالے پوزیشن لینے کے لئے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔

کار میں سے تین آدمی اترے۔ دو تو کمیٹی کے آفیسر معلوم ہوتے تھے اور تیسرا ایک مقامی مذہبی رہنما تھا۔ اس نے سیاہ جبّہ پہن

رکھا تھا اور سر پر سیاہ پگڑی تھی۔ بھرے بھرے چہرے پر گول داڑھی تھی جس میں ہلکی سی سفیدی بھی جھلک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کمیٹی کے افسران کو احکامات جاری کر رہا تھا۔

جمشید منصوری کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کمیٹی کے مسلح آدمی جس طرح گلی میں پوزیشن لے رہے تھے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اس مکان کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔ گویا کمیٹی کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ وہ اس مکان میں موجود ہے۔ لیکن.... انہیں یہ اطلاع کیسے ملی؟

اچانک اس کے ذہن میں فرخ کا نام ابھرا۔ کمیٹی نے جمشید منصوری کی گرفتاری کے لئے ایک گرانقدر رقم کے انعام کا اعلان کر رکھا تھا۔ یہ رقم اتنی بڑی تھی کہ کسی کی نیت تو کیا ایمان تک ڈگمگا سکتا تھا۔ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ فرخ یہاں سے جانے کے بعد سیدھا کمیٹی کے دفتر پہنچا ہو اور انہیں جمشید کی اس مکان میں موجودگی کی اطلاع دے دی ہو۔

جمشید نے آہستگی سے کھڑکی بند کر دی اور تیزی سے کچن سے نکل آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال لیا۔ سامنے والے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ پچھلی طرف سے بھی فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس مکان کے پیچھے بھی ایک مکان تھا جس کی پشت ملی ہوئی تھی۔

اس نے سوچنے میں صرف ایک لمحہ ضائع کیا اور پھر اندرونی زینہ چڑھ کر اوپر آگیا۔ مکان کی چھت کے اطراف میں تقریباً تین فٹ اونچی منڈیر تھی۔ چھت پر ٹوٹا پھوٹا فرنیچر بکھرا ہوا تھا۔ پچھلا مکان دو منزلہ تھا۔ اس مکان کی چھت پر پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی نظریں اپنے مکان کی چھت کے آخری کونے میں پانی کی ٹنکی پر جم گئیں۔ یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں پناہ مل سکتی تھی۔

گلی میں بھاگ دوڑ کی آوازوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جمشید تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹنکی کے قریب پہنچ گیا۔ آہستگی سے ڈھکنا اٹھا کر اندر جھانکا۔ تہ میں تقریباً ڈیڑھ فٹ پانی تھا' باقی ٹنکی خالی تھی۔ وہ بڑی آہستگی سے ٹنکی میں اتر گیا اور آہنی ڈھکنا اس طرح رکھ دیا کہ ہوا کی آمدورفت کے لئے تھوڑی سے جھری باقی رہے۔

اُسے پانی کی ٹنکی میں پناہ لئے ہوئے ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ چھت پر شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر یوں لگا جیسے ساتھ والے مکان کی چھت سے کوئی اس چھت پر کودا ہو۔ جمشید ٹنکی کی پچھلی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا سانس تک روک رکھا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس کا پتا چلا بھی لیا گیا تو ہاتھ آنے سے پہلے وہ دو چار آدمیوں کو تو موت کی نیند سُلا ہی دے گا۔

اچانک فائر کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک نسوانی چیخ سنائی دی۔ جمشید چونک گیا۔ جب وہ اس مکان میں آیا تھا تو یہاں کوئی عورت نہیں تھی۔ فرخ اکیلا ہی رہتا تھا لیکن چھت پر نسوانی چیخ نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک چھت پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی' پھر خاموشی چھا گئی۔

پانی کی ٹنکی میں جمشید کا سانس گھٹ رہا تھا لیکن وہ باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ تقریباً آدھا گھنٹا گزر گیا۔ پھر گاڑیوں کے روانہ ہونے کی آواز سنائی دی۔ کمیٹی والے واپس جا رہے تھے۔ لیکن جمشید نے پانی کی ٹنکی سے باہر آنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ کمیٹی کا کوئی نہ کوئی آدمی مکان میں موجود ہو گا۔

دس منٹ اور گزر گئے۔ چھت پر قدموں کی آواز سن کر وہ ایک بار پھر چونک گیا۔ پستول پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اسی لمحہ اسے احساس ہوا کہ چھت پر چلنے والے کے قدموں کی آواز بھاری نہیں تھی۔ کوئی بہت ہلکے قدموں سے چل رہا تھا۔

جمشید منصوری نے ٹنکی کے ڈھکنے کی جھری سے جھانک کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ وہ فرخ تھا جو چھت پر ایک جگہ کھڑا پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جمشید نے ایک منٹ انتظار کیا اور پھر آہنی ڈھکنا آہستگی سے ایک طرف ہٹا دیا۔ آواز سن کر فرخ تیزی سے اس طرف گھوم گیا اور پھر جمشید کو ٹنکی میں سے سر ابھارتے دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

"خدا کا شکر ہے تم محفوظ ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ....."

"لیکن.... انہیں میری یہاں موجودگی کی اطلاع کیسے ملی؟" جمشید نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"انہوں نے تمہاری تلاش میں یہاں چھاپا نہیں مارا تھا" فرخ نے کہا۔

"تو پھر انہیں کس کی تلاش تھی؟" جمشید نے اسے گھورا۔ وہ فرخ کو اب بھی شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

"انہیں اطلاع ملی تھی کہ تہران کی ایک دولت مند عورت ساتھ والے مکان میں چھپی ہوئی ہے جو اپنی دولت سمیت پاکستان کی طرف فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ چھاپا اسی عورت کو پکڑنے کے لئے مارا گیا تھا۔ اس نے ہمارے مکان کی چھت کے راستے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن اسے گولی مار کر زخمی کر دیا گیا۔ بہرحال' اب وہ لوگ جا چکے ہیں اور مقامِ شکر ہے کہ تم ان کی نظروں میں نہیں آئے" فرخ نے کہا۔

"جب ان کی گاڑیاں گلی میں آ کر رکیں تو میں ڈر گیا تھا کہ شاید وہ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میں پانی کے ٹینک میں چھپ گیا تھا۔" جمشید منصوری نے کہا۔

"وہ لوگ جا چکے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں' نیچے آ جاؤ۔" فرخ نے زینے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جمشید منصوری کے جوتے بھیگ چکے تھے۔ پہلے آکر اس نے جوتے اتار کر آتش دان کے سامنے رکھ دیئے۔ اس کا خیال تھا کہ جوتے اور بھیگے ہوئے کپڑے چند منٹ میں سوکھ جائیں گے۔ فرخ نے لکڑی کے چند اور ٹکڑے آتشدان میں ڈال دیئے تھے۔

"کمیٹی والے اب تک تین آدمیوں کو تمہارے شبہے میں گرفتار کرچکے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ تم شہر کے شمالی اڈے پر چلے جاؤ۔ ٹرک ٹھیک دو بجے روانہ ہوگا" فرخ نے اسے ٹرک کا نمبر اور ڈرائیور کا نام وغیرہ بتادیا۔

جمشید منصوری آدھے گھنٹے بعد فرخ کے مکان سے نکل گیا۔ جب وہ ٹرکوں کے اڈے پر پہنچا تو مذکورہ ٹرک پر کرمان جانے والا سامان لوڈ کیا جاچکا تھا۔ ڈرائیور کو پہچاننے میں جمشید منصوری کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ٹھیک دو بجے ٹرک اڈے سے نکل کر کرمان کی طرف روانہ ہوگیا۔

○☆○

رات کا آخری پہر تھا۔

زاہدان سے نکلنے کے بعد وہ شام کے وقت تھوڑی دیر کے لئے ایک جگہ رکے تھے۔ اور پھر کسی پڑاؤ کے بغیر ان کا سفر جاری رہا تھا۔ وہ ابھی کرمان سے تقریباً اسی کلومیٹر دور تھے کہ ٹرک خراب ہوگیا اور انہیں نئی بند نامی قصبے میں رکنا پڑا۔ ڈرائیور تو رات گزارنے کے لئے قصبے کی سرائے میں چلا گیا اور جمشید ٹرک کے کیبن میں لیٹ گیا۔

پورا دن ٹرک کی مرمت پر لگ گیا' جب وہ نئی بند سے روانہ ہوئے تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ ساڑھے چار بجے کے لگ بھگ وہ کرمان پہنچ گئے۔ یہاں بھی کمیٹی کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی تھی۔

ٹرک ڈرائیور سے رخصت ہونے کے بعد جمشید منصوری نے ایک بار پھر اپنا حلیہ تبدیل کیا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ٹویوٹا کار میں سوار کوہ پایہ نامی قصبے کی طرف جارہا تھا۔

کرمان سے بتیس کلومیٹر دور دشت لوط کے کنارے کوہ پایہ نامی اس قصبے کی آبادی پانچ ہزار نفوس سے زیادہ نہیں تھی۔ پختہ سڑک یہاں ختم ہوگئی تھی۔ اس سے آگے کچی سڑک تھی جو ریگستان کے کنارے کنارے ہوتی ہوئی دربند' عرب آباد اور طبس کی طرف چلی گئی تھی۔ جمشید منصوری قصبے کے قریب سے گزرتا ہوا کچی سڑک پر کئی میل آگے نکل گیا اور بالآخر ایک جگہ اس نے کار روک لی۔

اس کے چاروں طرف ویرانہ تھا۔ میلوں دور تک لق ودق صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کچی سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی گزر جاتی تھی۔

اس وقت چھ بج رہے تھے۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا لیکن صحرا کی ریت ابھی تک تپ رہی تھی۔ وہ کار سے اتر کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دائیں طرف ریت کے تپتے ہوئے ٹیلے تھے اور بائیں طرف کچھ فاصلے پر سرخ چٹانیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

اچانک چٹانوں کے دوسری طرف ایک گدھ کو فضا میں پرواز کرتے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ چند سیکنڈ بعد ایک اور گدھ نظر آیا۔ کچھ دیر بعد جب اس نے دوبارہ سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو گدھوں کی تعداد تین ہوچکی تھی جو ایک دائرے کی صورت میں پرواز کررہے تھے۔

جمشید منصوری کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ وہ پچھلے تین دن سے سفر کررہا تھا اور بہت بری طرح تھک چکا تھا۔ اسے اپنا لباس بھی جسم پر بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے لباس کے اندر چھپے ہوئے پستول کو چھو کر محسوس کیا۔ اب اسے یہ پستول بھی ناگوار سا بوجھ محسوس ہورہا تھا لیکن وہ اسے بے کار سمجھ کر پھینک نہیں سکتا تھا۔ اس نے ٹویوٹا ایک ٹیلے کی آڑ میں کھڑی کردی' جسے سڑک سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ یہ ٹویوٹا اس نے کرمان سے کرائے پر حاصل کی تھی۔ لیکن اب سوچ رہا تھا کہ کاش اس نے منوچہر سے ملاقات کے لئے اس ویرانے کے بجائے کسی اور جگہ کا انتخاب کیا ہوتا۔

وہ چند لمحے کار کے قریب کھڑا رہا اور پھر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا چٹانوں کی طرف بڑھنے لگا۔ چٹانوں کے دوسری طرف تنگ سا راستہ بتدریج نشیب کی طرف چلا گیا تھا' وہ اس راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر اس کے پیروں کے نیچے سے پھسل کر نشیب میں لڑھک رہے تھے۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا' ہوا میں ایک ناگوار سی بو کا احساس شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔ یہ بو گندھک یا گیس کی بو سے مشابہ تھی۔

راستے کے ایک تنگ سے موڑ پر وہ رک گیا۔ نشیب میں کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب چند کچے مکانوں کے کھنڈرات نظر آرہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک کنواں تھا جو عرصہ پہلے خشک ہوچکا تھا اور اس کی منڈیر ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ غالباً خانہ بدوشوں کی کوئی بستی تھی جو عرصہ پہلے ویران ہوچکی تھی اور اب وہاں کھنڈرات کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"منوچہر!"

جمشید منصوری نے کھنڈرات کی طرف رخ کرکے پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس پرسکوت ویرانے میں کسی ذی روح کا نام ونشان تک نہ رہا ہو۔ لیکن نہیں .... آسمان پر تین.... نہیں' چار گدھ منڈلا رہے تھے۔

جمشید چند لمحے وہیں کھڑا کھنڈرات کو گھورتا رہا جن کے سائے لمبے ہورہے تھے۔ سورج غروب ہونے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ فضا میں گیس یا گندھک جیسی ناگوار سی بو اب بھی موجود تھی اور یہ بو شمال کی طرف سے ہوا کے ساتھ آرہی تھی۔

کھجور کے سوکھے ہوئے درختوں کے قریب والا مکان دوسرے

مکانوں سے نسبتاً بڑا تھا۔ اس کی چھت اور شمال کی سمت والی دیوار گر چکی تھی۔ بڑی بڑی پکی اینٹیں آس پاس بکھری ہوئی تھیں۔ ان اینٹوں کو دیکھ کر جمشید کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ چھوٹی سی بستی غالباً صدیوں پہلے آباد ہوئی تھی۔ پھر کنویں کا پانی خشک ہوجانے کی وجہ سے خانہ بدوش ہجرت کرکے کہیں اور چلے گئے اور یہ بستی ویران ہوگئی۔

"منوچہر!" جمشید منصوری کھنڈرات کی طرف رخ کرکے ایک بار پھر پکارا۔ لیکن اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا نشیب میں کھنڈرات کی طرف بڑھنے لگا۔

جمشید منصوری کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو احتیاط کا دامن کسی موقع پر بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اور پھر اس وقت تو وہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا چاہتا تھا۔ یہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں تھی۔ چند ہفتے پہلے جب وہ پاسداران انقلاب کے ایک گودام سے کروڑوں روپے مالیت کے ہیرے جواہرات اور نصف ٹن سونا لے کر فرار ہوا تھا تو اس کے ایک ساتھی نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اپنے ساتھی کی مخبری پر ہی وہ پکڑا گیا تھا۔ اور اب وہ دوبارہ پھر ایران کی حدود میں داخل ہوچکا تھا' جہاں کیپٹی نے اس کے سر کی بھاری قیمت مقرر کر رکھی تھی اور قدم قدم پر اس کی تلاش ہو رہی تھی۔ گویا وہ شیروں کی کچھار میں گھس آیا تھا لیکن وہ ڈرنے والوں میں سے نہیں تھا' موت سے پنجہ آزمائی اس کی زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ اس عزم کے ساتھ ایران کی حدود میں داخل ہوا تھا کہ شاہ کے اس خفیہ خزانے کے بغیر واپس نہیں جائے گا۔ ایران میں اس کے چند ایسے ساتھی اب بھی موجود تھے جو اس کے لئے جان بھی دے سکتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

سورج غروب ہونے والا تھا' ہوا کے جھونکوں میں اب خنکی بڑھ گئی تھی۔ وہ بے تکے قدم اٹھاتا ہوا کھنڈروں میں پہنچ گیا۔ پہلا جھونپڑا خالی تھا۔ دوسرے جھونپڑے میں کسی جانور کا خستہ سا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ یہ ڈھانچہ غالباً کتے کا تھا۔ اس کے آس پاس مٹی کے چند ٹوٹے ہوئے برتن بکھرے ہوئے تھے۔

مکان کے صحن میں اسی طرح کی چند اور چیزیں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ جنہیں ریت نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ مکان کے صحن سے نکل کر کھلی جگہ پر آگیا۔ یہاں ریت پر کسی گاڑی کے ٹائروں کے نشان نظر آئے جو درختوں کے جھنڈ کے قریب بڑے جھونپڑے کی طرف رہنمائی کررہے تھے۔ جمشید کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ منوچہر کی گاڑی کے ٹائروں کے نشان تھے۔ وہ اس بڑے جھونپڑے کے قریب رک گیا۔ چند سیکنڈ تک کسی قسم کی آہٹ محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا جھونپڑے کے اوپر سے گھوم کر دوسری طرف نکل گیا۔ اس طرف آتے ہی اسے

بالاقساط

جیل میں ایک قیدی کسی حادثے میں اپنا گردہ گنوا بیٹھا۔ چند روز بعد اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ پھر کچھ دنوں بعد بازو ٹوٹ گیا۔ جب ایک روز اس کی ایک ٹانگ بھی ضائع ہوگئی تو جیلر کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ اس نے گرج کر کہا "قیدی نمبر سات سو پندرہ۔ تم ٹکڑوں میں بھاگنے کی کوشش کررہے ہو لیکن یاد رکھو' میں تمہیں ہرگز کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔"

منوچہر نظر آگیا۔

منوچہر کھجور کے گرے ہوئے دو خشک تنوں کے درمیان پڑا تھا۔ وہ بالکل برہنہ تھا اور اس کے آس پاس بھی لباس نام کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔

جمشید منصوری تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر رک کر منوچہر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ اور پیر اونٹ کے بالوں سے بٹی ہوئی رسّی سے بندھے ہوئے تھے' جس کا دوسرا سرا درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا۔ آس پاس ریت پر قدموں کے نشان نظر آرہے تھے۔

جمشید وہیں رک کر محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ درختوں کے جھنڈ کے دوسری طرف اسے منوچہر کی شیورلٹ کار بھی نظر آگئی۔ وہ بے تکے قدم اٹھاتا ہوا کار کے قریب پہنچ گیا اور کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا۔ منوچہر کا کوٹ ڈرائیونگ سیٹ کی پشت پر پڑا ہوا تھا لیکن جمشید نے کوٹ یا کسی اور چیز کو چھونے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے گردن گھما کر منوچہر کی برہنہ لاش کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی وہ بُری طرح چونک گیا۔ اسے منوچہر کے سینے میں ہلکا سا زیروبم محسوس ہوا تھا۔

وہ مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا منوچہر کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے سینے کے زیروبم سے جمشید کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ابھی زندہ تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر جمشید کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ منوچہر کو اس حالت تک پہنچانے والے ایک سے زیادہ تھے۔ وہ یقیناً اپنے کام میں ماہر تھے۔ منوچہر کو جس طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اسے دیکھ کر جمشید جیسا سفاک انسان بھی کانپ اٹھا تھا۔

منوچہر کی ناف کے نیچے بہت بڑا زخم تھا جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھی کاٹ دیئے گئے تھے اور اس طرح اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ لیکن آنکھوں کے سکڑے ہوئے ڈھیلوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کی بینائی ختم ہوچکی ہے۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا جس سے سونے کا ایک دانت جھانکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ جمشید منوچہر کے قریب جھک گیا۔

"منوچہر!" اس نے ہولے سے پکارا۔
منوچہر کے سینے میں زیروبم پیدا ہوا، جس سے جمشید کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ وہ ابھی زندہ تھا۔
"منوچہر!" اس نے ایک بار پھر پکارا۔
منوچہر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بڑی مشکل سے بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"تو... م..." آواز ہوا کی سرسراہٹ سے بھی مدھم تھی۔
"میں جمشید ہوں... جمشید منصوری" جمشید نے کہا۔
"تت... تم نے بہت... دیر کر دی..." منوچہر کے ہونٹ پھڑپھڑائے "مم... مجھے... قتل کر دو... جم... شید..."
جمشید نے پتلون کی بیلٹ میں اُڑسی ہوئی پانی کی بوتل نکال کر اس کا ڈھکن کھولا اور بڑی احتیاط سے چند قطرے اس کے زخمی اور خشک ہونٹوں پر ٹپکا دیئے۔
"مم... مجھے... قتل کر دو... پلیز..."
"حوصلہ رکھو منوچہر..." جمشید کہتے ہوئے کچھ اور جھک گیا۔
منوچہر کچھ کہہ رہا تھا لیکن آواز بہت مدھم تھی۔
"کون تھے وہ لوگ؟" جمشید نے پوچھا۔
"تت... تت..."
جمشید نے پانی کے مزید چند قطرے اس کے حلق میں ٹپکا دیئے اور ایک بار پھر اس کا جائزہ لینے لگا۔ منوچہر کے جسم پر دو تین جگہوں سے کھال کاٹ ڈالی گئی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن غائب تھے۔ انگلیوں کی پوروں پر ناخنوں کے بجائے جما ہوا خون نظر آ رہا تھا۔ اس کے ناخن غالباً پلاس سے کھینچے گئے تھے۔ دونوں پیروں کے انگوٹھے کٹے ہوئے تھے۔ غالباً اس کی پشت پر بھی زخم تھے لیکن خون جم جانے کی وجہ سے اس کا جسم ریت سے چپکا ہوا تھا اور اسے ہلائے بغیر زخموں کا جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔
"کون تھے وہ لوگ منوچہر... بتاؤ... وہ کون تھے؟" جمشید نے ایک بار پھر پوچھا۔
"تت... تلاتی..." منوچہر کے ہونٹوں سے مُردہ سی آواز نکلی۔
"وہ... وہ خزانے کا پتا... پوچھ رہے تھے..." منوچہر کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔
"خزانہ!" جمشید چونک گیا۔
تلاتی اس کا وہ ساتھی تھا جس نے اس سے غداری کی تھی اور پاکستان پہنچنے کے بعد مخبری کر کے اسے ہیرے جواہرات اور نصف ٹن سونے سمیت پکڑوا دیا تھا۔ تلاتی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ہیرے جواہرات اور سونا اب حکومت پاکستان کی تحویل میں تھا لیکن وہ منوچہر سے کس خزانے کا پتا پوچھ رہا تھا؟
اچانک اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کیا تلاتی کو کسی طرح یہ راز معلوم ہو گیا تھا کہ وہ شاہ کا خفیہ خزانہ حاصل کرنے کے لئے یہاں آیا ہے؟ اسے یہ راز کس طرح معلوم ہوا اور کیسے پتا چلا کہ منوچہر ان کھنڈرات میں موجود ہے؟
"میں بڑی... اذیت میں ہوں جمشید... پلیز! مجھے قتل کر دو... اس اذیت... سے... نجات دلا دو..." منوچہر نے رک رک کر کہا۔
"گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی تمہیں کہاں لے جا رہا ہوں۔ تم..."
"نہیں پلیز!" منوچہر نے کراہتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے ہلانا مت... مجھے... گولی مار دو... اور یہاں سے... چلے جاؤ... وہ لوگ..."
"نہیں منوچہر!" جمشید بولا "میں تمہیں گولی نہیں مار سکتا۔"
"پپ... پلیز...!" منوچہر کی آواز ڈوب گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی گردن ڈھلک گئی۔
وہ ختم ہو گیا تھا اور اسے زندگی کی اس اذیت سے نجات مل گئی تھی۔
جمشید منصوری چند لمحے منوچہر کی لاش کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر شیورلیٹ کے قریب آ گیا۔ اس نے کار کی چابی نکال لی۔ اگر وہ چاہتا تو کار پر پیٹرول چھڑک کر اسے آگ لگا سکتا تھا لیکن اندیشہ تھا کہ دھواں دیکھ کر نئی بند سے کمپنی والے تحقیق حال کے لئے یہاں نہ پہنچ جائیں۔
جمشید کمپنی والوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کوئی ویرانہ بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ البتہ وہ یہ کر سکتا تھا کہ کار کو ناقابلِ شناخت بنا دے۔ اس نے کار کی دونوں لائسنس پلیٹیں اتار کر وہاں سے کافی دور ریت میں دفن کر دیں۔ انجن کے سیریل نمبر کے بارے میں ظاہر ہے وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔
کار کی پچھلی سیٹ پر دو کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ناول تھے، جن میں سے ایک کا ایک صفحہ مڑا ہوا تھا۔ غالباً منوچہر نے یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے یہاں نشان لگا کر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے کوٹ کی جیبوں سے تمام چیزیں اور رقم نکال کر اپنی جیبوں میں رکھ لی اور ... کوٹ وہیں ڈال دیا۔
جمشید نے ایک بار پھر تنقیدی نگاہوں سے کار کا جائزہ لیا اور وہاں سے ہٹ کر چٹان کی طرف چلنے لگا۔ سورج اس وقت غروب ہو چکا تھا۔ تنگ سے راستے پر چلتا ہوا وہ اوپر پہنچ گیا۔ اس نے آخری مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے میں منوچہر کی لاش نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ مڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ اسی لمحہ چاند چٹان کی چوٹی سے جھانکتا ہوا نظر آیا۔
جمشید ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ٹیلے کی آڑ میں اپنی ٹویوٹا کے قریب اسے ایک اور گاڑی کھڑی نظر آ رہی تھی۔ وہ واکس ویگن تھی۔ جمشید محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن واکس ویگن کے اندر یا آس پاس اسے کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔
جمشید ابھی اس واکس ویگن کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ

اچانک تین انسانی سائے چٹان کی آڑ سے نکل کر اس کے سامنے آگئے۔ وہ دو مرد تھے اور ایک عورت۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں J.P.12 آٹومیٹک رائفل تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں ریوالور۔ عورت خالی ہاتھ تھی۔ وہ اسے زد میں لئے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔

مدھم چاندنی میں جمشید اب انہیں صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ دونوں آدمیوں میں سے ایک بھاری بھرکم اور طویل قدوقامت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرختگی تھی۔ دوسرا قدرے پستہ قامت اور قدرے دُبلا پتلا تھا۔ اسی کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ جمشید کے اندازے کے مطابق وہ دونوں تیس اور پینتیس سال کے درمیان رہے ہوں گے۔ ان کی ساتھی ایک جوان لڑکی تھی۔ اس نے پینٹ شرٹ اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی عمر پچیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ بلاشبہ حسین لڑکی تھی جو اپنے ساتھیوں سے چند قدم دور ایک طرف ہٹ کر کھڑی تھی۔

"کون ہو تم لوگ؟" جمشید باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے لیکن اگر تم چاہو تو میں یہ رقم تمہارے حوالے کرسکتا ہوں۔"

"ہمیں تمہاری رقم سے کوئی غرض نہیں ہے" لمبے قد والے نے کہا "اپنا ریوالور نکال کر ایک طرف پھینک دو۔ اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تمہارا جسم چھلنی کردیا جائے گا۔"

جمشید نے گہری نظروں سے ایک بار پھر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اگر وہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش بھی کرتا تو کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ لمبے قد والے کے پاس آٹومیٹک رائفل کی موجودگی میں اس کے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ سے ہٹ کر چٹان کے قریب چلی گئی تھی۔

"میں تمہیں صرف دس سیکنڈ دے رہا ہوں۔ ریوالور ثریا کی طرف اچھال دو" لمبے قد والے نے سب مشین گن کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

جمشید کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ اس نے لمبے قد والے کے کرخت چہرے کی طرف دیکھا اور بڑی احتیاط سے پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا ریوالور نکال کر پہلے ہتھیلی پر رکھا اور پھر اسے لڑکی کی طرف اچھال دیا۔ لڑکی نے بڑی مہارت سے ریوالور کو ہوا ہی میں کیچ کرلیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچ گئی۔

"عقلمند ہو۔ اب آگے چلو۔ اس طرف...." لمبے قد والے نے نشیب کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" جمشید نے پوچھا۔

"یہ بات تمہارے ساتھی کے قریب پہنچ کر ہی بتائیں گے؟" لمبے قد والے نے جواب دیا۔ اب تک ساری گفتگو وہی کرتا رہا

تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی اور لڑکی' جسے ثریا کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا' خاموش ہی رہے تھے۔

وہ نشیب کی طرف جانے والے تنگ سے راستے پر رک گئے۔

جمشید نے ایک بار پھر باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اس سے صرف ریوالور لیا تھا۔ اس کی تلاشی نہیں لی تھی۔ جمشید کے پاس وہ خنجر اب بھی موجود تھا جو اس کے کوٹ کے نیچے بغل میں چھپا ہوا تھا۔

"چلو..... نیچے اترو" اس مرتبہ چھوٹے قد والے نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

جمشید منصوری نے ایک بار پھر ان کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر تنگ سے راستے پر نیچے اترنے لگا۔ اس کے پیچھے لمبے قد والا تھا' جس نے J.P.12 آٹومیٹک رائفل سنبھال رکھی تھی۔ اس کا پستہ قامت ساتھی دوسرے نمبر پر تھا اور ثریا سب سے پیچھے تھی۔

اس تنگ سے راستے پر اترتے ہوئے جمشید نے بڑی احتیاط سے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر بغل میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا۔ وہ جیسے ہی مڑا' لمبے قد والے نے اپنی رائفل کی جھکی ہوئی نال اوپر اٹھائی۔ لیکن اسے رائفل استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جمشید کے ہاتھ سے نکلا ہوا خنجر بڑی تیزی سے ہوا میں اڑتا ہوا اس کے حلق میں ترازو ہوگیا۔ وہ کھڑے کھڑے لہرا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹریگر دب گیا اور رائفل سے نکلنے والی گولیاں چاند کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگیں۔

ثریا کے منہ سے ایک خوف ناک چیخ نکل گئی۔ اس کا پستہ قامت ساتھی بدحواس سی نگاہوں سے اپنے گرتے ہوئے ساتھی کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا' جمشید نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی۔ جمشید کے سر کی زوردار ٹکر اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ کراہتا ہوا نیچے گر گیا۔ لیکن اس نے گرتے ہوئے جمشید کو بھی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ دونوں بڑی تیزی سے نشیب میں لڑھکنے لگے۔

اس دوران لمبے قد والا آدمی' جسے جمشید نے خنجر کا نشانہ بنایا تھا' تنگ سے راستے کے کنارے سے لڑھک کر بیسیوں فٹ نیچے جا گرا تھا۔ جمشید نے دوسرے آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ڈھلان پر لڑھک رہے تھے۔ ثریا اوپر کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے پاس اگرچہ جمشید والا ریوالور موجود تھا لیکن اس کے حواس شاید مختل ہو چکے تھے اور غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورتِ حال میں اس کا ردِعمل کیا ہونا چاہئے۔ وہ لڑکی' جمشید کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی لیکن جمشید فی الحال اس کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

نیچے لڑھکتے ہوئے پتھر بری طرح چبھ رہے تھے۔ جمشید کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ وہ اپنے حواس پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شاید یہ ڈھلان کبھی ختم نہیں ہوگی۔ پھر اچانک وہ کسی بڑے پتھر سے ٹکرا کر رک گیا۔

جمشید کو محسوس ہوا جیسے اس کے حواس رخصت ہو رہے ہوں۔ وہ چند لمحے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسے اپنے اوپر آسمان بڑی تیزی سے گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ اس نے لوٹ لگا کر اپنی جگہ سے ہٹنا چاہا تو اس کا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ جس چیز سے اس کا ہاتھ ٹکرایا تھا وہ کوئی پتھر نہیں تھا۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا' وہ اس کے حریف کا ریوالور تھا جسے اس نے گرفت میں لے لیا۔

ڈھلان پر اوپر سے ابھی تک چھوٹے چھوٹے پتھر گر رہے تھے۔ وہ گھٹنوں پر بوجھ ڈال کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے ایک بار پھر اپنے اردگرد کی ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلی ہوئی تھی' وہ سر کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔

جمشید چند سیکنڈ تک اسی طرح پڑا رہا پھر گھسٹتا ہوا آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھنے لگا۔ اسے داہنی ٹانگ میں خاصی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں ٹانگ کی ہڈی محفوظ تھی۔ یہ تکلیف پتھروں کے ٹکرانے سے ہوئی تھی۔ وہ گھسٹتا ہوا ایک بڑے پتھر کے قریب پہنچ گیا اور پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ جب حواس کسی قدر بحال ہوئے تو متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

چاند گہرے بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ ثریا یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا........ جیسے ثریا کسی کو پکار رہی ہو۔ یہ آواز اوپر سے آئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا لیکن تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا۔

اس کے چاروں طرف بڑے بڑے پتھر ٹیلوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ اس نے پہلی مرتبہ غور سے جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ وہ اس پستہ قامت آدمی کے ساتھ گتھم گتھا لڑھکتا ہوا چٹان کے دامن میں اس جگہ گرا تھا جہاں کسی زمانے میں دریا بہتا ہوگا لیکن اب وہاں پتھروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

جمشید کو وہ پستہ قامت آدمی قرب و جوار میں کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک بار پھر چٹان کی طرف دیکھنے لگا۔

چاند کچھ دیر کے لئے بادلوں سے نکل آیا تھا۔ اب وہ لڑکی کو دیکھ سکتا تھا' جو بہت محتاط ہو کر اس تنگ سے راستے پر نیچے آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور صاف نظر آرہا تھا۔ یہ جمشید ہی کا ریوالور تھا۔ وہ بہت محتاط انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی چٹان کے قدموں میں آکر رک گئی۔ اس لمحہ چاند ایک بار پھر گہرے بادلوں میں چھپ گیا اور تاریکی چھا گئی۔ اس کے ساتھ ہی تقریباً بیس

گز آگے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز ابھری اور ایک آواز سنائی دی۔

"ثریا!"

وہ لڑکی کا ساتھی تھا جو سرگوشیانہ انداز میں اسے پکار رہا تھا۔ جمشید اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور چیک کیا، جو پوری طرح لوڈ تھا لیکن سیفٹی کیچ لگا ہوا تھا۔ یہ اسی پستہ قامت آدمی کا ریوالور تھا۔ سیفٹی کیچ لگا ہونے کی وجہ سے جمشید کو یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ شخص فی الحال اس ریوالور کو استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ جمشید نے آہستگی سے سیفٹی کیچ ہٹادیا۔ ریوالور آٹومیٹک پر سیٹ تھا جسے اس نے سنگل فائر پر سیٹ کردیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بہت محتاط ہو کر پتھر کے دوسری طرف جھانکنے لگا۔

چند گز دور لمبے قد والا آدمی زمین پر پڑا تھا جسے جمشید نے خنجر مارا تھا۔ خنجر کے وار اور اتنی بلندی سے پتھروں پر گرنے سے وہ ختم ہوچکا تھا۔ اس کا پستہ قامت ساتھی اس پر جھکا اسے ہلا جُلا کر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر تاریکی میں غائب ہوگیا۔

جمشید آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے سرکنے لگا۔ اس کی ٹانگ میں اب زیادہ تکلیف نہیں رہی تھی۔ وہ آسانی سے چل سکتا تھا۔ وہ بڑے بڑے پتھروں کی آڑ لیتا ہوا اس طرف بڑھتا رہا جہاں اس نے آخری مرتبہ چھوٹے قد والے آدمی کو دیکھا تھا۔

"جمشید!"

یہ سرگوشی دائیں طرف سے ابھری تھی اور آواز بلاشبہ ثریا کی تھی۔ لیکن جمشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"جمشید! ہوشیار رہنا" ثریا کی سرگوشی دوبارہ سنائی دی۔

ثریا کے لہجے میں اضطراب تھا اور جمشید کو حیرت تھی کہ وہ اسے خبردار کیوں کررہی تھی۔ لیکن اس نے اس مرتبہ بھی جواب نہیں دیا۔ یہ بات جمشید کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ثریا اپنے ساتھی کے برخلاف اسے ہوشیار رہنے کا مشورہ کیوں دے رہی تھی؟ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ثریا اس کی ہمدرد بن کر اس کے خلاف کسی قسم کی چال چلنے کی کوشش کررہی تھی۔

وہ محتاط انداز میں آگے بڑھتا رہا۔

تقریباً پچاس گز آگے وہ بائیں طرف مڑگیا۔ اس کے سامنے عمودی چٹان تھی اور بائیں طرف وہ کھڈ تھا جہاں لمبے قد والے کی لاش پڑی تھی۔ جمشید اب اسی طرف بڑھ رہا تھا۔ جمشید کو اس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اگر وہ اسے نہ مارتا تو لمبے قد والا اسے ختم کردیتا۔ اور شاید ہلاک کرنے سے پہلے اسے منوچہر کی طرح بے پناہ تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا۔

اچانک چند پتھر اس کے پیروں کے نیچے سے پھسل کر ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے۔ سناٹے میں پتھروں کے لڑھکنے کی آواز دور تک سنی جاسکتی تھی لیکن اس کے حریف کی طرف سے کوئی ردِ عمل سامنے

نہیں آیا۔ جمشید نے ایک بار پھر رک کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ جس تنگ راستے سے لڑھکتے ہوئے وہ نیچے آیا تھا وہاں سے واپس جانا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس طرح وہ نظروں میں آسکتا تھا۔

"ثریا!"

یہ پستہ قد شخص کی آواز تھی جو ثریا کو پکار رہا تھا۔ جمشید نے آواز کی سمت دیکھا لیکن اسے وہ شخص دکھائی نہیں دیا، نہ ہی ثریا کہیں نظر آئی۔ وہ محتاط انداز میں چلتا ہوا لمبے قد والے آدمی کی لاش کے قریب پہنچ گیا اور اس کے لباس کی تلاشی لینے لگا۔ جیبوں سے برآمد ہونے والی رقم، کاغذات اور گاڑی کی چابیاں اس نے اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اس شخص کی جیب سے برآمد ہونے والی رقم کی گڈی خاصی موٹی تھی۔ جمشید نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے آٹومیٹک رائفل کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ رائفل شاید اس کا دوسرا ساتھی لے گیا تھا۔

جمشید ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ نشیب کی طرف سے آٹومیٹک رائفل کا برسٹ مارا گیا۔ ویرانہ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ گولیاں جمشید کے سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی چٹان پر لگیں۔ جمشید نے فوراً ہی ایک پتھر کے پیچھے چھلانگ لگادی اور اس سمت کا اندازہ لگانے لگا جہاں سے فائرنگ کی گئی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ فائرنگ کھنڈرات والی سمت سے کی گئی تھی۔

"ثریا..... یہاں آؤ....."

ایک بار پھر وہ سرگوشی سنائی دی۔ لیکن ثریا نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ جمشید آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے ایک بار پھر پتھر کے پیچھے دُبک جانا پڑا۔ کیونکہ ایک بار پھر دوسری طرف سے برسٹ مارا گیا تھا۔ جمشید زمین پر لیٹ گیا اور پتھروں پر پیٹ کے بل رینگتا ہوا نشیب میں خشک دریا کی طرف بڑھنے لگا۔ چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ رک گیا۔

جمشید رینگتا ہوا کھنڈرات کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک دائیں طرف کسی کے حرکت کرنے اور کوئی چھوٹا پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اس طرف دیکھنے لگا۔ کچھ فاصلے پر شکستہ مکانوں کے ستون نظر آرہے تھے۔ یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ اگر یہاں کوئی موجود تھا تو وہ کس ستون کے پیچھے ہوسکتا تھا۔ ریوالور کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ لیکن دوسری طرف خاموشی تھی۔

چند سیکنڈ گزر گئے، پھر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دبے قدموں چلنے کی کوشش کررہا ہو۔ جمشید بھی دبے قدموں چلتا ہوا ایک شکستہ ستون کی آڑ میں پہنچ گیا۔ لیکن دوسری طرف ایک بار پھر خاموشی چھاچکی تھی۔

"ثریا!"

ویرانے میں ایک بار پھر ثریا کے ساتھی کی سرگوشیانہ آواز ابھری۔ لیکن یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ یہ آواز کس سمت سے آئی

تھی۔ انداز سرگوشیانہ ہونے کے باوجود آواز چاروں طرف گونجتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ اس بار غصے میں زور سے پکارا گیا تھا۔ لیکن ثریا نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اچانک جمشید چونک گیا۔ اس سے چند قدم آگے نشیب سے ایک سر ابھرتا ہوا نظر آیا' پھر کندھے دکھائی دیئے۔

جمشید فوراً ہی حرکت میں آگیا۔ اس نے نشیب سے نمودار ہونے والے ہیولے پر چھلانگ لگادی۔ اسی لمحہ بائیں طرف سے فائرنگ کی گئی۔ جمشید پرندے کی طرح ہوا میں اڑتا ہوا اس ہیولے پر جاگرا اور اسے ساتھ لیتا ہوا نشیب میں گر گیا۔ اسے جلدی ہی اندازہ ہوگیا کہ جس پر اس نے چھلانگ لگائی تھی وہ مرد نہیں عورت تھی' یقیناً ثریا ہی تھی۔

ثریا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ جمشید کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ جمشید نے جلدی سے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کی دونوں کلائیاں پشت پر گرفت میں لے کر اس کی کمر پر گھٹنے سے دباؤ ڈالنے لگا۔

"منہ سے آواز مت نکالنا" جمشید کے منہ سے غراہٹ سی نکلی۔ "کوئی آواز نکلی تو تمہاری گردن مروڑ دوں گا۔"

ثریا مزاحمت کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس دھمکی کے بعد اس کی مدافعت ختم ہوگئی اور جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

"ثریا۔۔۔"

ثریا کے ساتھی کی آواز چٹانوں میں بازگشت پیدا کر رہی تھی۔

"میری بات غور سے سنو" جمشید نے سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا "کیا تم میری آواز سن رہی ہو؟"

ثریا نے بڑی مشکل سے سر کو اثبات میں حرکت دی۔ اسے سینے میں سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جمشید نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا اور کمر پر گھٹنے کا زور کچھ اور بڑھادیا۔

"تم میرے ہر سوال کا جواب دوگی لیکن آواز زیادہ بلند نہیں ہونی چاہئے۔ تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح گھیرنے کی کوشش کیوں کی گئی تھی؟" جمشید نے کہا۔

"بہروز' طلاتی کے لئے کام کر رہا تھا۔ وہ میرا دوست تھا" ثریا نے جواب دیا۔

"بہروز کون؟"

"جسے تم نے قتل کر دیا ہے۔ بہمن اس کا ساتھی ہے۔"

"مجھے کیوں گھیرا گیا تھا؟"

"میں تفصیل سے کچھ نہیں جانتی" ثریا نے جواب دیا "بہروز کا خیال تھا کہ تم شاہ کے کسی خفیہ خزانے سے واقف ہو۔ وہ تم سے اس خزانے کا پتا پوچھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے طلاتی نے اسے ایک بڑی رقم دی تھی۔ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں محض دولت کے لالچ میں اس کے ساتھ آگئی تھی۔ بہروز کا خیال تھا کہ تم سے خزانے کا پتا معلوم کرنے کے بعد وہ طلاتی کو بھی قتل کر دے گا اور اس طرح خزانے پر اکیلا ہی قابض ہو جائے گا۔ بہمن کو بھی دولت کا لالچ دے کر اس نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔"

"منوچہر کو کس نے قتل کیا تھا؟" جمشید نے پوچھا۔

"بہروز نے" ثریا نے جواب دیا "ہم کہاں ہی سے منوچہر کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ بہروز کا خیال تھا کہ اگر منوچہر سے خزانے کا پتا معلوم ہو جائے تو تم سے الجھنے کی ضرورت نہیں رہے گی اور تمہارے تہران پہنچنے سے پہلے ہی خزانے پر قبضہ کرلیا جائے گا۔ لیکن وہ بڑا سخت جان ثابت ہوا۔ بہروز انسان نہیں درندہ تھا۔ وہ تشدد کے ایسے ایسے طریقے جانتا تھا کہ پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے تھے مگر وہ تمہارے ساتھی کی زبان نہیں کھلوا سکا۔"

"کچھ دیر پہلے تم نے مجھے ہوشیار کیوں کیا تھا؟"

"ہم۔۔۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے" ثریا نے جواب دیا۔ "بہروز ختم ہو چکا ہے' بہمن بھی اس سے کم خطرناک نہیں ہے۔ وہ تم سے خزانے کا پتا معلوم کرکے تمہیں اور مجھے قتل کر دے گا۔"

جمشید چند لمحے خاموش رہا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے ثریا کے جسم کو ٹٹولنے لگا۔ اس کا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور اس کی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا' جسے اس نے قبضے میں لے لیا' اس کے علاوہ ثریا کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ جمشید نے مطمئن ہو کر ثریا کو چھوڑ دیا۔

"ثریا" بہمن کی آواز ویرانے میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس مرتبہ بہت غصے اور جھنجلاہٹ میں پکارا گیا تھا۔

جمشید نے ایک طرف ہٹ کر بہمن والا ریوالور پتلون کی جیب میں اڑس لیا اور اپنا ریوالور ہاتھ میں سنبھال لیا۔ ثریا چند لمحے اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑی رہی پھر لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کے لمبے بال شانوں پر بکھر گئے تھے۔ وہ جمشید سے تقریباً دو گز کے فاصلے پر تھی۔ تاریکی کے باعث جمشید کو اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ چند لمحے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا' پھر پتھر کی آڑ سے گردن نکال کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ تاریکی میں چٹانوں کے ہیولوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

جمشید نے آگے بڑھ کر ثریا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے ایک طرف کھینچنے لگا۔ ثریا کے خیال میں یہ کھنڈر ان کے لئے بہترین پناہ گاہ تھی۔ وہ اس سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی لیکن جمشید کے سامنے وہ کوئی مزاحمت بھی نہیں کر سکی۔

جمشید نے محسوس کیا کہ ثریا ہولے ہولے کپکپا رہی ہے۔ یہ کپکپاہٹ سردی کی وجہ سے تھی یا خوف سے؟ وہ کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ بائیں طرف قدرے فاصلے پر چند شکستہ ستون نظر آرہے تھے۔ وہ ثریا کا ہاتھ پکڑے دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا۔

جمشید چشم تصور سے بہمن کو گھات لگائے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے اگرچہ ثریا کو اپنے سامنے ڈھال بنا رکھا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اگر بہمن نے انہیں دیکھ لیا تو وہ فائر کرنے سے دریغ نہیں

کرے گا کیونکہ ثریا کی اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے ثریا کو ایک ستون کے پیچھے دھکیل دیا اور خود بھی آڑ میں چلا گیا۔ لیکن ان کا تحفظ غیر یقینی تھا۔ بہمن کہیں بھی ہو سکتا تھا۔ دائیں بائیں یا پیچھے تنگ سے درّے میں۔

"وہ اس طرف!" ثریا نے سرگوشی کی۔

جمشید نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا۔

"میں نے اُسے اس طرف حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا" ثریا نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

جمشید کو اس مرتبہ بھی اگرچہ کچھ نظر نہیں آیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ بہمن آس پاس ہی کہیں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ ثریا اس کی ہمدرد بن گئی تھی۔ ثریا نے اسے جو کہانی سنائی تھی' جمشید نے اس پر اس حد تک تو یقین کرلیا تھا کہ وہ لوگ اس سے شاہ کے خفیہ خزانے کا پتا معلوم کرنا چاہتے تھے لیکن اس بات پر یقین نہیں کیا تھا کہ وہ بہمن کے ہاتھوں اپنی جان کے خوف سے اس کے ساتھ آن ملی تھی۔ ممکن ہے یہ کوئی چال ہو اور موقع پاکر اسے گرفت میں لینے کی کوشش کی جائے۔

اس مرتبہ جمشید نے خود ہی بہمن کو سامنے لانے کی کوشش کی۔

"بہمن!" اس نے زور سے پکارا "ثریا میرے قبضے میں ہے۔ وہ زخمی ہے اور اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

جواب میں ایک جنونی قہقہے کی آواز سنائی دی۔ آواز اگرچہ گونجتی ہوئی سی تھی لیکن جمشید اس کی سمت کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ بہمن درّے کی طرف کسی جگہ موجود تھا۔

"تم یہیں رکو' میں ابھی آتا ہوں" جمشید نے ثریا کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی" ثریا نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

"ٹھیک ہے' چلو۔"

"ایک منٹ!" ثریا رک گئی "وہ اوپر ہے۔ ہم آسانی سے اس کی نظروں میں آجائیں گے۔"

"مجبوری ہے۔ ہم زندگی بھر یہاں کھڑے نہیں رہ سکتے" جمشید نے کہا۔

اسی لمحہ درّے کی طرف سے برسٹ مارا گیا۔ گولیاں ان کے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ ایک گولی ستون پر لگی۔ پتھر کا ایک ٹکڑا جمشید کے کان کے قریب سے گزر گیا۔ ثریا کانپ کر رہ گئی۔ جمشید نے فائرنگ کی آواز کی سمت دیکھا۔ چٹان کی طرف اس تنگ سے راستے کے ایک طرف کسی بڑے پتھر کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔

جمشید نے ثریا کا ہاتھ پکڑلیا اور اسے کھینچتا ہوا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس مرتبہ ان پر فائرنگ نہیں کی گئی۔ وہ مکانوں کے کھنڈرات کے اوپر سے گھومتے ہوئے پچھلی طرف نکل گئے اور ایک جگہ رک گئے۔ جمشید نے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر ثریا کا ہاتھ پکڑ کر اس تنگ سے راستے کی طرف دوڑ لگادی جس سے چٹان کے اوپر پہنچا جاسکتا تھا۔ اسی لمحہ ان پر دو فائر کئے گئے۔ لیکن گولیاں ان کے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ وہ دوڑتے ہوئے اس تنگ سے راستے پر پہنچ گئے اور پتھروں کی آڑ لے کر اوپر چڑھنے لگے۔

اچانک ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ گولی قریب سے چلائی گئی تھی۔ جمشید نے مڑ کر دیکھا۔ ایک انسانی ہیولہ ایک طرف دوڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ بہمن تھا جو ایک بڑے پتھر کی آڑ لینے کے لئے دوڑ رہا تھا۔ جمشید نے فائر کردیا۔ گولی بہمن کی پیشانی پر لگی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

وہ دونوں اس تنگ سے راستے پر اوپر چڑھنے لگے۔ تقریباً دو فٹ چوڑے اس راستے کے ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف گہرا کھڈ۔ جمشید نے ثریا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ راستے کے ایک موڑ پر پہنچ کر اس نے ثریا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس سے تین چار قدم آگے نکل گیا۔ اچانک ثریا کا پیر پھسل گیا۔ ایک بڑا پتھر اس کے پیر کے نیچے سے نکل گیا تھا۔ ثریا کی چیخ سن کر جمشید تیزی سے پیچھے مڑا۔ ثریا راستے کے کنارے پر اپنا توازن سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی لیکن کامیاب نہ ہوسکی اور بیسیوں فٹ گہرے کھڈ میں لڑھکتی چلی گئی۔ اس کی آخری چیخ بڑی بھیانک تھی۔

جمشید خطرناک حد تک تیزی سے چلتا ہوا نیچے آیا۔ ثریا پتھروں پر پڑی تھی۔ اس کا جسم خون میں لت پت تھا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ ختم ہوچکی تھی۔

جمشید واپس آگیا۔ اسے اپنی ٹویوٹا تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگے تھے۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر پھینک دیا اور خود اپنی ٹویوٹا میں بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کرکے اس نے ٹویوٹا کا رخ سڑک کی طرف موڑدیا۔

کرمان کی طرف جاتے ہوئے وہ منوچہر اور تلاتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تلاتی کو کسی طرح اس کا راز معلوم ہوگیا تھا۔ اور اسی راز کے لئے منوچہر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ تلاتی کے دو آدمی اس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ ثریا کی موت کا اسے بہرحال افسوس ہوا تھا۔

جمشید کو یقین تھا کہ کسی نہ کسی موقع پر تلاتی سے آمنا سامنا ضرور ہوگا۔ سامنے کوہ پایہ قصبے کی مدھم سی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ اس نے ٹویوٹا کی رفتار بڑھادی۔

○☆○

تہران کا موسم کوئٹہ کے مقابلے میں قدرے خوشگوار تھا۔

ایرانی انٹیلی جنس کا کرنل مصدق جلالی اپنے دفتر میں داخل ہوا تو اسے پیغام ملا کہ چیف نے اسے فوراً اپنے دفتر میں طلب کیا

ہے۔ کرنل مصدق فوراً ہی واپس مڑا اور چیف کے دفتر کی طرف چل پڑا۔

چیف رضا آغا نے اس کے سلام کا جواب دیا اور نیلے رنگ کا ایک کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا، جس پر سرخ رنگ کا کراس بنا ہوا تھا۔

"یہ پیغام گزشتہ رات اسلام آباد سے موصول ہوا ہے" چیف نے کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

کرنل مصدق جلالی نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا اور پیغام پڑھنے لگا۔

"کوئٹہ میں لٹن روڈ پر واقع ایک بنگلے میں چار روز پہلے ایک خفیہ میٹنگ ہوئی تھی جس میں تین افراد شامل تھے۔ دو کا تعلق ایک بین الاقوامی خفیہ تنظیم سے ہے اور تیسرا جمشید منصوری تھا، جسے اسی روز مچھ جیل سے نہایت ڈرامائی انداز میں رہا کروایا گیا تھا۔ خیال ہے کہ اس میٹنگ میں شاہ کے کسی خفیہ خزانے کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ بین الاقوامی خفیہ تنظیم کے دونوں آدمی اور جمشید لاپتا ہیں۔ کوئٹہ پولیس بڑی سرگرمی سے انہیں تلاش کررہی ہے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ جمشید منصوری ایران کی طرف فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ پولیس نے تمام راستوں کی ناکا بندی کررکھی ہے۔ جیسے ہی مزید کچھ معلوم ہوا مطلع کردیا جائے گا۔"

"اس رپورٹ کے بارے میں کیا خیال ہے کرنل؟" چیف رضا آغا نے پوچھا۔ وہ ایک پستہ قامت، تندمزاج آدمی تھا۔ کلین شیو، گٹھا ہوا جسم اور گنجا سر، وہ کوجیک کی طرح سر پر بھی باقاعدگی سے شیو کیا کرتا تھا۔

"جمشید منصوری ایک بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے وہ کمیٹی کے محافظوں کو چکر دے کر ان کے گودام سے تقریباً نصف ٹن سونا اور کروڑوں ریال مالیت کے ہیرے جواہرات لے بھاگا تھا۔ لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ پاکستان پہنچتے ہی گرفتار ہوگیا تھا۔ غالباً اس کے کسی ساتھی نے غداری کی تھی" کرنل مصدق نے جواب دیا۔

"یہ بات میں بھی جانتا ہوں" چیف غرایا "میں نے اس پیغام کے بارے میں تمہاری رائے پوچھی تھی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ معزول شاہ کا کوئی خفیہ خزانہ اُڑانا چاہتے ہیں، لیکن وہ خزانہ....."

"میرا بھی یہی خیال ہے" چیف نے کرنل کی بات کاٹ دی۔ "اگر شاہ نے ملک چھوڑنے سے پہلے کوئی خزانہ چھپایا تھا تو وہ یہیں ہوگا۔ تہران میں.... اور یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے۔ آخری دنوں میں شاہ بہت محتاط ہوگیا تھا۔ اس کی سرگرمیاں اگرچہ گلستان محل تک محدود ہوکر رہ گئی تھیں لیکن اس کے چند خاص معتمد خاصے سرگرم نظر آتے تھے۔ ان کی سرگرمیاں خاصی پُراسرار تھیں۔ جب شاہ ملک چھوڑ کر فرار ہوا تو اس کے وہ خاص معتمد بھی اس کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔ لہٰذا یہ بات خارج از امکان نہیں ہوسکتی کہ آخری دنوں میں انہوں نے کوئی بہت بڑا خزانہ کہیں چھپادیا ہو تاکہ انقلابیوں سے محفوظ رہے۔ انہیں امید رہی ہوگی کہ انقلاب ناکام ہوجائے گا اور ایک نہ ایک دن شاہ ضرور واپس آئے گا یا بعد میں کسی وقت وہ لوگ اس خزانے کو وہاں سے نکال لے جائیں گے۔ لیکن اب شاہ کی واپسی کے تمام امکانات ختم ہوچکے ہیں۔ اس کے خلاف یہ انقلاب کامیاب ہوچکا ہے، حکومت پر امام خمینی اور ان کے حامی مذہبی رہنماؤں کی گرفت خاصی مضبوط ہورہی ہے۔ اگرچہ ملک میں انتشار اور افراتفری ہے، لوگوں پر کچھ زیادتیاں بھی ہورہی ہیں، جسے دبے لفظوں میں ظلم و تشدد کا نام دیا جارہا ہے۔ ابھی تک کوئی نظم ونسق قائم نہیں ہوسکا۔ حکمرانوں میں باقاعدہ رابطے مفقود ہیں۔ ہر مذہبی رہنما اپنے زیر اثر علاقے پر اپنے طور پر حکومت چلارہا ہے اور ممکن ہے اسی انتشار اور افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے شاہ کا خفیہ خزانہ یہاں سے نکالنے کا منصوبہ بنایا ہو اور اس کے لئے جمشید منصوری جیسے شخص کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

"جمشید منصوری کے جیل سے فرار کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ ہمیں پہلے بھی مل چکی ہے۔ اسے ڈرامائی انداز میں رہا کرانے والے دونوں آدمیوں نے اپنے آپ کو مرکزی حکومت کا نمائندہ ظاہر کیا تھا لیکن بعد میں حکومت نے بڑی سختی سے اس کی تردید کردی تھی۔ اب اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان دونوں کا تعلق براہِ راست شاہ سے ہو اور انہوں نے جمشید منصوری کی مدد سے شاہ کے خزانے کے حصول کا یہ منصوبہ بنایا ہو۔ جہاں تک حکومت پاکستان کا تعلق ہے تو ماضی میں اسلام آباد سے ملنے والی رپورٹوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ حکومتِ پاکستان نے سرکاری طور پر امام خمینی کے انقلاب کی حمایت کا اعلان کردیا تھا اور اس انقلاب کو پاکستانی عوام کی بھی بھرپور حمایت حاصل ہے۔ لیکن بعض سرکاری اہل کار درپردہ شاہ کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس منصوبے میں حکومت براہِ راست ملوث نہ ہو بلکہ اس کے بعض افسران خفیہ طور پر شاہ کی خوشنودی اور کسی بڑے انعام کے لالچ میں اس منصوبے میں شامل ہوگئے ہوں۔ لیکن..... یہ بات تمہیں ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ان کا یہ مشن کسی بھی صورت میں کامیاب نہیں ہونا چاہئے۔ پاکستانی سرحد سے لے کر تہران تک تمام سیکیورٹی کو الرٹ کردو۔ اس کے علاوہ کوئٹہ سے جمشید منصوری اور اسے رہا کروانے والے دونوں آدمیوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے ہدایات بھیج دو۔"

"یس سر!" کرنل مصدق نے جواب دیا۔

"اور جیسے ہی جمشید منصوری کے بارے میں کوئی اطلاع ملے، فوراً مجھ سے رابطہ قائم کرنا" چیف نے کہا۔

"یس سر! میں آج ہی احکامات جاری کر دیتا ہوں" کرنل مصدق نے جواب دیا اور کمرے سے نکل گیا۔

O☆O

یہ اس کے دوسرے روز کی بات ہے۔

سیاہ رنگ کی ایک کار تہران کے سب سے خوب صورت پارک باغ ملت کے سامنے رکی۔ اس وقت صبح کے چھ بجے تھے اور پارک کے سامنے صرف ایک سیٹرون کار کھڑی تھی جس کا شوفر نہایت انہماک سے کار کے شیشے چمکانے میں مصروف تھا۔

سیاہ کار کے ڈرائیور نے باہر نکل کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور باادب کھڑا ہو گیا۔ اندر سے کرنل مصدق نے پہلے باہر جھانک کر دیکھا اور پھر نیچے اتر آیا۔

فضا میں ہلکی سی دھند تھی۔ کوہ البرز کی برفانی چوٹیوں سے ٹکرا کر آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نوکِ خنجر کی طرح جسم میں پیوست ہو رہے تھے۔

ہوا کا پہلا یخ بستہ جھونکا ٹکراتے ہی کرنل مصدق کو جھرجھری سی آگئی۔ اس نے اونی ٹوپی کانوں تک کھینچ لی' اوور کوٹ کا کالر گردن تک اٹھا دیا اور متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر سُو سناٹا تھا۔ چند گز دور سیٹرون کار کا ڈرائیور بدستور کار کی صفائی میں مصروف تھا۔ اس نے اس طرف نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں تھا۔ شاید اپنے آپ کو اس طرح مصروف رکھ کر وہ سردی کی شدت سے بچنا چاہتا تھا۔

"بابک!" کرنل مصدق نے اپنے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا "میں چند منٹ میں واپس آجاؤں گا۔ یہیں رک کر میرا انتظار کرو" پھر وہ باوقار انداز میں چلتا ہوا پارک میں داخل ہو گیا۔

سامنے وسیع و عریض لان تھا۔ جس کے گرد پھولوں کے پودوں کا بارڈر اور بیچ میں کہیں کہیں پودوں کی مختلف شکلوں والی کیاریاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ سبز مخملی گھاس کی پتیاں شبنم کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔

کرنل مصدق نے فوارے کے قریب رک کر چند لمحے متجسس نگاہوں سے اطراف میں دیکھا اور پھر پختہ روش پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگا۔ پارک میں بھی سناٹا تھا۔ اگر بہار کا موسم ہوتا تو اس وقت یہاں ہوا خوری کے لئے آنے والوں کا ہجوم ہوتا۔ لیکن یہ مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ یہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔ ایسے یخ بستہ موسم اور ایسے وقت میں لوگ گرم گرم بستروں میں دبکے رہنا پسند کرتے ہیں۔

کرنل مصدق روش کے ایک موڑ پر بائیں طرف مڑ گیا۔ یہاں روش کے ساتھ ساتھ قد آور پودے تھے۔ ان گنجان پودوں کے دوسری طرف کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ ایک جگہ پودوں کے درمیان خلا میں سے گزر کر دوسری طرف آگیا۔ اس طرف بھی ایک وسیع و عریض لان تھا اور گنجے سر والا ایک پستہ قامت شخص ننگے پیر شبنم میں بھیگی ہوئی گھاس پر ٹہل رہا تھا۔ اس کے جسم پر پتلون اور آدھے آستین کی ٹی شرٹ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ انٹیلی جنس کا سربراہ رضا آغا تھا۔ اس سے تقریباً بیس گز دور چیف کے دو مسلح محافظ بھی مستعد کھڑے تھے۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے۔ انہوں نے اوور کوٹ پہن رکھے تھے۔ سروں پر اونی ٹوپیاں بھی تھیں جو پیشانی تک جھکی ہوئی تھیں۔ کوٹ کے اٹھے ہوئے کالروں اور پیشانی پر جھکی ہوئی ٹوپیوں میں ان کے چہرے تقریباً چھپ گئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ اپنے کوٹوں کی جیبوں میں تھے۔ کرنل مصدق کو یقین تھا کہ ان کے دائیں ہاتھ جیبوں میں رکھے ہوئے ریوالوروں کے دستوں پر ہوں گے۔ کرنل مصدق نے قریب پہنچ کر چیف کو سلام کیا اور اس کے ساتھ ہی ٹہلنے لگا۔

"زاہدان سے ایک اہم پیغام ملا ہے" چیف نے کہا اور پتلون کی جیب سے نیلے رنگ کا ایک کاغذ نکال کر کرنل کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ پیغام گزشتہ رات ہی ملا ہے۔"

وہ دونوں اس وقت لان کے آخری سرے پر اونچے درختوں کے نیچے پہنچ چکے تھے۔ کرنل مصدق پیغام پڑھنے لگا۔

"جمشید منصوری زاہدان کے راستے ایران میں داخل ہو چکا ہے۔ وہ کسی بھی وقت تہران پہنچ سکتا ہے۔ کمیٹی کو اس کی بھنک مل گئی ہے۔ پچھلی رات کمیٹی نے زاہدان کے ایک مشتبہ مکان پر چھاپا مارا تھا۔ اس کارروائی میں کمیٹی کا ایک آدمی اور مخالف پارٹی کے دو آدمی مارے گئے لیکن بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ مکان میں موجود پارٹی کا جمشید منصوری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ممکن ہے جمشید منصوری کو بھی کمیٹی کی سرگرمیوں کی اطلاع مل گئی ہو اور اس نے کمیٹی کے آدمیوں کو غلط راستے پر ڈالنے کے لئے کرائے کے آدمیوں کے ذریعے یہ ڈراما اسٹیج کیا ہو اور اس طرح خود بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ خیال ہے کہ وہ کرمان کی طرف گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کل رات کسی وقت تہران میں داخل ہونے کی کوشش کرے۔"

"یعنی آج رات؟" کرنل مصدق نے پیغام پڑھنے کے بعد کہا۔

"ہاں' آج رات" چیف کے حلق سے غراہٹ سی نکلی "پیغام اگرچہ واضح نہیں ہے لیکن میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ تم تہران میں اپنے آدمیوں کو ڈبل الرٹ کر دو۔ جمشید منصوری کو اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی اسے ..... کمیٹی کے آدمیوں کے ہاتھ لگنا چاہئے۔"

"یس سر!" کرنل مصدق نے کہا۔ پھر قدرے تامل کرتا ہوا بولا "میرا خیال ہے کہ آپ کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں' میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہوں اور اس جگہ کا انتخاب بھی اسی لئے کیا ہے۔ یہاں پر ہم پوری آزادی کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔ اس بات کا خطرہ نہیں ہے کہ کوئی ہماری گفتگو سن لے

گا یا ریکارڈ کرلے گا" چیف نے کہا' پھر دھیمے لہجے میں بولا "ہم کچھ عرصے سے ایک دوسرے منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ تمہارا یہ کام اس منصوبے میں رکاوٹ یا تاخیر کا باعث نہیں بننا چاہئے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ کچھ افراد کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے تم نے کہا تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔"

"ہاں' اچھی طرح یاد ہے" کرنل مصدق نے جواب دیا "اور اس وقت ایران کی تقدیر انہی افراد کے ہاتھ میں ہے۔"

چیف رضا آغا چلتے چلتے رک گیا اور کرنل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اب یہ تقدیر دوسرے ہاتھوں میں جانے والی ہے۔ فوج اور سول سروس میں نوجوان اور ترقی پسند افسروں کا ایک گروہ ابھر کر سامنے آرہا ہے جن کے نظریات ہمارے نظریات سے ہم آہنگ ہیں۔ انہیں وطن سے محبت ہے اور وہ اس جنونی فضا کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ روزانہ کتنے ہی بے گناہ اس جنون کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ اس خوفناک صورتِ حال کو ختم کرکے ملک کو امن اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں۔

"تم جانتے ہو کہ انقلاب کے بعد ملک کی معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ رہی سہی کسر عراق سے جنگ نے پوری کردی ہے۔ تمام ترقیاتی کام رک گئے ہیں۔ کاروبار تباہ ہو چکے ہیں۔ سرمایہ بڑی تیزی سے غائب ہو رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انقلاب سے پہلے چند خاندانوں نے دولت سمیٹ رکھی تھی لیکن وہ اس دولت کو ترقیاتی کاموں پر بھی لگا رہے تھے۔ ان کا سرمایہ متحرک تھا۔ بڑے بڑے پروجیکٹ تعمیر ہو رہے تھے۔ لیکن اب یہ سب کچھ ختم ہو رہا ہے۔ جن کے پاس دولت تھی وہ جان کے خوف سے یا تو ملک چھوڑ کر فرار ہو چکے ہیں یا چھپتے پھر رہے ہیں۔ مذہبی رہنماؤں کو دوسروں پر اعتماد نہیں ہے۔ سول سروس اور فوج کے افسران کو بھی شبے کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے بعض نوجوان افسروں میں عدم اطمینان کی سی کیفیت پیدا کردی ہے اور وہ اس کا سدباب کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایک لاوہ ہے جو اندر ہی اندر پک رہا ہے اور پھٹ پڑنے کو بے قرار ہو رہا ہے۔"

کرنل مصدق کے چہرے پر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔ چیف رضا آغا نے اس سے قبل اتنی آزادی سے اس قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آج وہ واضح الفاظ میں حکومت کا تختہ الٹنے کی بات کر رہا تھا۔

"مصدق! کیا میں تمہیں اپنے دوستوں میں شمار کر سکتا ہوں؟" چیف نے کہتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"میں ہمیشہ سے آپ کے ساتھ ہوں سر!" کرنل مصدق نے بلا تامل جواب دیا۔

"بہت خوب! مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔ وقت آنے پر میں تمہیں پوری تفصیل بتا دوں گا۔ فی الحال میں موجودہ مشن کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں" چیف چند لمحے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تم جانتے ہو کہ ایران کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہی عراق نے ایران کے خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شط العرب اور ایران کے بعض اہم علاقوں پر قبضہ کرلے گا۔ اس نے کردوں کو بھی ایران کے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عراق کو اپنے مقصد میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ کچھ عرصہ پہلے میں فوج اور سول سروس میں اپنے ہم خیال گروپ کے نمائندے کی حیثیت سے چوری چھپے بغداد گیا تھا اور میں نے عراقی صدر صدام حسین سے بات کی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اگر ہم خمینی سے نجات حاصل کرلیں تو معاہدۂ امن کے لئے بغداد کی کیا شرائط ہوں گی۔ میری بات کا جواب ایک ہفتے بعد ملا تھا۔ صدام حسین نے کہا تھا کہ معاہدۂ امن کے لئے ایرانی فوج کو غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے ہوں گے" چیف رک گیا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے کہ مذہبی رہنماؤں کے تسلط سے آزادی اور امن کے لئے ہمیں یہ قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

"لیکن سر....."

"میں نے ابھی بات پوری نہیں کی" چیف رضا نے اسے ٹوک دیا۔ "اگر واقعی یہاں شاہ کا کوئی خزانہ پوشیدہ ہے تو وہ اس منصوبے میں ہمارے کام آسکتا ہے۔"

"کیا سول سروس اور فوج کے یہ افسران شاہ کو واپس لانا چاہتے ہیں؟" کرنل مصدق نے پوچھا۔

"تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم اپنی تمام تر توجہ اس مشن پر مبذول رکھو۔ جمشید منصوری اس وقت ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم ہے" چیف رضا آغا نے کہا۔

"یس سر!" کرنل مصدق نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد جب کرنل مصدق' چیف سے رخصت ہو کر باغ ملت سے نکل رہا تھا تو اس پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ چیف رضا آغا نے اس پر جو راز منکشف کیا تھا وہ اسے حکومت کے کسی اعلیٰ رتبے پر بھی پہنچا سکتا تھا اور موت کے منہ میں بھی لے جا سکتا تھا!

O☆O

جمشید منصوری جب کرمان پہنچا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس نے کرائے کی ٹویوٹا ایجنسی کو واپس کردی اور آگے روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ پہلے اس کا پروگرام یہ تھا کہ کرمان سے بذریعہ ٹرین تہران کی طرف روانہ ہوگا لیکن دشتِ لوط کے کنارے ان کھنڈرات میں جو کچھ بھی ہوا تھا اس سے وہ خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ طلائی کے دو آدمی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ان کی موت کی اطلاع ملتے ہی وہ پاگل کتے کی طرح اس کی تلاش شروع کردے گا۔ اور عین ممکن ہے کہ وہ کمپنی کو بھی اس کے بارے میں اطلاع کردے۔ ویسے بھی کمپنی والے بڑی سرگرمی سے اسے تلاش کر رہے تھے۔ اس لئے ٹرین کا راستہ محفوظ نہیں تھا۔ اس نے لمبا

راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھاتے ہی وہ مال بردار ٹرکوں کے اڈے پر پہنچ گیا۔ ایک بہت بڑا تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے کرمان کے ملک کے باقی حصوں سے مواصلاتی رابطوں کی کمی نہیں تھی۔ ریل' ہوائی جہاز اور پختہ سڑکوں کے ذریعے ملک کے تمام بڑے شہروں سے اس کے رابطے قائم تھے۔

جمشید کے خیال میں اس وقت سفر کے لئے سڑک کا راستہ سب سے زیادہ محفوظ تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک مال بردار ٹرکوں کے اڈے پر گھومنے کے بعد ایک ایسے ٹرک ڈرائیور سے اس کا رابطہ قائم ہو ہی گیا جو اُسے قلی کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ اس کے لئے جمشید کو ایک بڑی رقم اپنی جیب سے ٹرک ڈرائیور کی جیب میں منتقل کرنی پڑی تھی۔

مال بردار ٹرک عام طور پر رات کے وقت سفر کرتے ہیں۔ جمشید کا ٹرک بھی رات کے دس بجے کے قریب اڈے سے روانہ ہوا۔ شہر کی آخری چیک پوسٹ پر ایک بار پھر چیکنگ ہوئی لیکن اس مرتبہ معاملہ خود ٹرک ڈرائیور ہی نے نمٹادیا تھا۔ کمیٹی والوں نے جمشید سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔

یہ ٹرک رفسنجان ہوتا ہوا یزد جارہا تھا۔ تقریباً ساڑھے تین سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے ٹرک صبح چار بجے کے قریب یزد پہنچ گیا۔ جمشید منصوری نے صبح روشنی پھیلنے تک کا باقی وقت ٹرک کے کیبن ہی میں سو کر گزارا تھا۔

صبح سات بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اگرچہ ٹرک ڈرائیور نے اسے کاشان تک پہنچانے کا وعدہ کیا تھا لیکن یزد پہنچ کر اس نے انکشاف کیا کہ آگے جانے کے لئے کم از کم چوبیس گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ کرمان سے ٹرک پر لادا جانے والا مال یہاں اتار دیا گیا تھا اور آگے وہ اسی وقت روانہ ہو سکتا تھا جب تک اسے ٹرک پر لادنے کے لئے مال نہ مل جاتا۔ بہرحال' اس ٹرک ڈرائیور نے یہ مہربانی ضرور کی کہ اسے ایک اور ٹرک ڈرائیور کے سپرد کردیا جو سہ پہر چار بجے روانہ ہونے والا تھا۔ اس نئے ڈرائیور نے تھوڑی بہت رقم لے کر اسے اپنے ساتھ لے جانے کی ہامی بھرلی۔

جمشید منصوری اچھی طرح جانتا تھا کہ ان دنوں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جگہ جگہ چیکنگ کی وجہ سے ڈرائیور بھی کسی کو اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ لیکن پیسے میں بڑی طاقت تھی' پیسہ جیب میں آتے ہی ٹرک ڈرائیور خطرات کو فراموش کردیتے تھے۔

چار بجے یزد سے روانہ ہو کر رات کے تقریباً گیارہ بجے وہ کاشان پہنچ گئے۔ جمشید نے ٹرک ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور اڈے سے نکل کر ایک طرف چلنے لگا۔

بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ شہر سے تقریباً دو کلو میٹر دور ایک اُجڑی ہوئی چھوٹی سی بستی میں کھڑا تھا۔ یہ بستی چند کچے مکانوں پر مشتمل تھی جو امتدادِ زمانہ سے کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ ایک شکستہ دیوار کے پیچھے بیٹھ کر وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی الیکٹرونک واچ کا ننھا سا بٹن دبا کر وقت دیکھ رہا تھا۔

بارہ بج کر بیس منٹ پر اسے کھنڈرات میں کچھ فاصلے پر روشنی سی چمکتی ہوئی نظر آئی۔ وہ کوئی ٹارچ تھی جو جل کر فوراً ہی بجھ گئی تھی۔

جمشید نے جیب سے پنسل ٹارچ نکال لی اور تاریکی میں اس طرف گھورنے لگا جہاں چند لمحے پہلے روشنی چمکی تھی۔ ٹھیک تیس سیکنڈ بعد روشنی دوبارہ چمکی۔ اس مرتبہ ٹارچ دو مرتبہ جلی بجھی تھی۔ جمشید نے بھی ٹارچ کو دو مرتبہ جلایا بجھایا اور پھر تاریکی میں گھورنے لگا۔

ایک منٹ بعد تین آدمی تاریکی سے نکل کر اس کے سامنے آگئے۔ دو تو دور ہی رک گئے اور تیسرا جمشید کے قریب آگیا۔

وہ علی تھا' فرخ کے گروہ کا آدمی۔ دو روز پہلے زاہدان سے فرخ نے اسے اطلاع دی تھی کہ ایک آدمی مقررہ وقت پر ان کھنڈرات میں اس سے ملاقات کرے گا۔ وہ اسے سادہ لباس اور ریلوے ٹکٹ دے کر تہران جانے والی ٹرین پر سوار کرادے گا۔

علی کا شمار بھی علاقے کے نامی گرامی مجرموں میں ہوتا تھا۔ انقلاب سے پہلے اس علاقے پر اس کی حکمرانی تھی لیکن انقلاب کے بعد خود ساختہ محافظ انقلاب' پاسداران...... ہاتھ دھوکر اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اگر علی بعض اہم آدمیوں کی گرفتاری میں کمیٹی سے تعاون نہ کرتا تو اب تک اس کا بھی تیا پانچہ ہو چکا ہوتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ کمیٹی والوں نے اسے بخش دیا تھا یا نظرانداز کردیا تھا۔ وہ اب بھی ان کی نگاہوں میں تھا۔ اس پر ہاتھ ڈالنے کے لئے کسی بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔

علی بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا لیکن اس کے باوجود اس کی سرگرمیوں میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اگرچہ محتاط ہوگیا تھا لیکن اس کی غیر قانونی سرگرمیاں اب بھی جاری تھیں۔

ان دنوں اس کا اہم کاروبار مذہبی حکمرانوں کے زیرِ عتاب لوگوں کو قانون کی نظروں سے بچا کر ملک سے فرار کروانا تھا۔ اور اس کام میں سامنے آئے بغیر وہ بڑی دولت کما رہا تھا۔ اس قسم کے کام وہ اپنے گروہ کے آدمیوں سے لیا کرتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ گزشتہ چند مہینوں میں اس کے اس قسم کے کئی منصوبے ناکام ہوگئے تھے۔ وہ جن لوگوں سے بھاری معاوضہ لے کر انہیں ملک سے فرار کرانے کا وعدہ کرتا وہ عین وقت پر پکڑے جاتے۔ اس طرح اس کے تین آدمی بھی اب تک کمیٹی کے ہاتھوں مارے جاچکے تھے۔ پس منظر میں رہنے کی وجہ سے وہ خود ابھی تک بچا ہوا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

اسے اس بات کا بھی یقین ہو چکا تھا کہ اس کے گروہ کا کوئی آدمی غداری کر رہا ہے جو کمیٹی کو اس کے منصوبوں سے آگاہ کر دیتا ہے۔

دو روز پہلے زاہدان سے فرخ نے اسے بتایا تھا کہ ایک نہایت اہم آدمی کاشان پہنچ رہا ہے' جس کے لئے فرخ نے اسے کچھ ہدایات دے دی تھیں۔ فرخ' علی کا بہترین دوست تھا۔ پہلے وہ اکٹھے ہی کام کیا کرتے تھے' پھر فرخ زاہدان چلا گیا تھا۔ ان کا بزنس اب بھی ایک ہی نوعیت کا تھا اور ان میں وقتاً فوقتاً رابطہ رہتا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کے تعاون سے ہی اپنا بزنس جاری رکھے ہوئے تھے۔

فرخ کا فون ملنے کے بعد علی کو حیرت بھی ہوئی تھی کہ نئی مذہبی حکومت کے مخالفین تو ملک چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے پھر یہ کون تھا جو تہران جانا چاہتا تھا۔ اس نے فرخ سے اس سلسلے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی' نہ ہی اسے کوئی تجسس تھا۔ فرخ نے بڑی سختی سے اسے رازداری کی ہدایت کر دی تھی۔ علی نے اس آدمی کی آمد کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو بھی عین وقت پر آگاہ کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی غدار موجود تھا تو اسے کمیٹی والوں کو اطلاع دینے کا موقع نہ مل سکے۔ اسی لئے اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی چند گز دوری روک دیا تھا اور خود جمشید کے قریب آگیا تھا۔

"خوش آمدید!" اس نے جمشید سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام علی ہے اور میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"شکریہ!" جمشید منصوری نے جواب دیا۔ لیکن اپنا نام نہیں بتایا۔ "مجھے امید ہے کہ یہ جگہ محفوظ ہوگی۔"

"ہاں۔ بالکل محفوظ جگہ ہے" علی نے کہا اور ایک چھوٹا سا بیگ اس کی طرف بڑھا دیا "اس میں تمہارے کاغذات اور تہران کا ٹکٹ ہے۔ تہران جانے والی ٹرین ایک بج کر پچیس منٹ پر روانہ ہوگی۔ تم یہاں اپنی خالہ خانم گوہر کی عیادت کرنے آئے تھے۔ اس بیگ میں خانم گوہر کا ایک خط بھی موجود ہے جو اس نے دو ہفتے قبل تمہیں لکھا تھا۔ تہران میں ہمارے آدمی موجود ہیں۔ اگر تم ان سے رابطہ قائم کرنا چاہو تو میں تمہیں ان کا پتا دے سکتا ہوں۔ اب یہ کپڑے پہن لو۔ اور پرانے کپڑے اتار کر میرے حوالے کر دو۔ انہیں صبح تک ضائع کر دیا جائے گا۔"

جمشید منصوری نے بیگ زمین پر رکھ دیا۔ علی کے کپڑے لئے اور تھوڑا سا پرے ہو کر لباس تبدیل کرنے لگا۔

"یہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟" اس نے لباس تبدیل کرنے کے بعد پوچھا۔

"یوں تو تم جانتے ہو کہ ایران میں آج کل قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن یہاں ہمارے لئے کچھ زیادہ ہی خطرہ ہے۔ کمیٹی والے پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میرے گروہ میں کوئی غدار موجود ہے' جو ہماری سرگرمیوں کی اطلاع کمیٹی کو پہنچا رہا ہے" علی نے بتایا۔

جمشید کچھ پریشان سا ہو گیا "پھر تو کسی بھی وقت ہمیں گھیرے میں لیا جا سکتا ہے" وہ بولا۔

"نہیں۔" علی نے اطمینان سے جواب دیا "فرخ نے مجھے تمہارے بارے میں ہدایت کر دی تھی۔ میں نے تمہاری آمد کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا تھا۔ بلکہ مشورے کے بہانے یہاں بلانے کے بعد تمہاری آمد کے بارے میں بتایا تھا۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ آج رات ان آدمیوں کے ساتھ ایک ہی مکان میں گزاروں گا تاکہ ان میں اگر کوئی غدار موجود ہے تو اسے کمیٹی تک پہنچنے کا موقع نہ مل سکے۔"

"ٹھیک ہے" جمشید منصوری گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "میں چلتا ہوں۔ ٹرین کی روانگی میں تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔ دس منٹ بعد تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔ تم اپنی فکر کرو۔ ان کے ساتھ ایک مکان میں رات گزارنے کی بھی ضرورت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کو ٹرین کی روانگی تک اپنی نظروں میں رکھو پھر جانے دو۔"

علی نے اثبات میں سر ہلا دیا' وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا مخاطب غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس نے اسٹیشن تک جانے کا راستہ سمجھا دیا اور الوداعی سلام کر کے اپنے ساتھیوں کی طرف چل پڑا۔ اس کے دونوں ساتھی' جمشید کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے تھے لیکن اس نے یہ کہہ کر انہیں چپ کرا دیا کہ وہ خود بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

O☆O

رات دم توڑ رہی تھی۔

علی اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ رات کی مختصری مہم نے اسے خاصا تھکا دیا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ جمشید منصوری کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ زاہدان سے فون پر بات کرتے ہوئے فرخ نے اگرچہ یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہے لیکن جمشید کو علی نے پہچان لیا تھا۔ بدلے ہوئے بھیس میں ہونے کے باوجود اس کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ "شکریہ" نے اس کا راز فاش کر دیا تھا۔ علی ماضی میں ایک دو مرتبہ جمشید سے مل چکا تھا' وہ جب شکریہ کا لفظ کہتا تو اس کا لہجہ کچھ عجیب سی نوعیت اختیار کر جاتا تھا۔ اور اسی انداز سے علی نے اسے پہچان لیا تھا لیکن اس نے جمشید پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے۔

جمشید منصوری کے جانے کے بعد رات دو بجے علی نے زاہدان فرخ کو فون کیا تو اس نے علی کے اس شبہے کی تصدیق کر دی تھی۔ لیکن اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ جمشید کس مشن پر تہران جا رہا ہے۔ لیکن اسے ایران میں جمشید کی آمد پر حیرت ضرور ہوئی تھی۔ ایران میں جمشید کے سر کی قیمت مقرر تھی اور اسے بڑی شدت سے تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس حقیقت سے جمشید بھی پوری طرح

واقف ہوگا۔ اگر وہ کسی کی نظروں میں آگیا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے کیپٹی والوں کے عتاب سے نہیں بچاسکے گی۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے علی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

لیکن..... رات کے آخری پہر اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ہڑبڑا کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی خوب صورت بیوی مہ پارہ اس کے پہلو میں گہری نیند سو رہی تھی' شب خوابی کا لباس زیب تن کیے۔ چند بال اس کے چہرے اور سینے پر پھیلے ہوئے تھے۔ سحر آگیں نیلگوں روشنی میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

علی یہ بھول کر کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی تھی' وہ مہ پارہ کے حسن خوابیدہ میں کھو گیا تھا۔ وہ چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اچانک ہی وہ چونک گیا۔

مکان کے باہر گاڑیوں کے رکنے کی آواز نے اسے بدحواس کردیا تھا۔ علی کے ذہن پر طاری نیند کا خمار غائب ہوگیا۔ وہ اچھل کر پلنگ سے اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے جیسے ہی باہر جھانکا' اسے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ کیپٹی والوں کی گاڑیاں تھیں اور کیپٹی کے مسلح آدمی گاڑیوں سے اتر کر اس کے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ علی تیزی سے پیچھے مڑا۔ اس کی خوب صورت بیوی مہ پارہ بھی بیدار ہوگئی تھی۔ گلی میں بھاری بوٹوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مہ پارہ دہشت زدہ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔

"ک... کیپٹی..." علی نے ہکلاتے ہوئے کہا "جلدی چلو..."

مکان کا بیرونی دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جارہا تھا۔ پھر یوں لگا جیسے دروازے کو توڑنے کے لئے اس پر کسی چیز سے ضربیں لگائی جارہی ہوں۔ وہ دونوں خود حفاظتی کے لاشعوری جذبے کے تحت خواب گاہ سے نکل کر عقبی دروازے کی طرف بھاگے لیکن خوش بختی ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی وہ تیز روشنی میں نہا گئے۔ چاروں طرف سے آٹومیٹک رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں نے خاموشی سے ہاتھ اوپر اٹھادیے' انہیں رائفلوں کی زد میں لے کر گاڑی میں ٹھونس دیا گیا۔

سب مشین گنوں سے لیس کیپٹی کے چار آدمی بھی ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ علی ایک سیٹ پر تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے والی سیٹ پر اس کی بیوی مہ پارہ دو آدمیوں کے درمیان سینڈوچ بنی بیٹھی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد انہیں کیپٹی کے مقامی ہیڈکوارٹر پہنچادیا گیا۔ وہاں ایک آدمی کو دیکھتے ہی علی پر ایک لمحہ کو سکتہ سا طاری ہوگیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن حقیقت کو جھٹلانا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔

جس آدمی کو دیکھ کر وہ اس قدر بدحواس ہوا تھا' وہ فریدون تھا' اس کا اپنا نائب!

رات بارہ بجے جب علی شہر کے نواح میں واقع کھنڈرات میں جمشید سے ملنے گیا تھا تو فریدون بھی اس کے ساتھ تھا۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ فریدون ہی وہ غدار تھا جو اس کی مخبری کرتا رہا تھا۔ دوسری بات جو علی کے ذہن میں آئی' اس نے اس کے بدن پر لرزہ سا طاری کردیا۔ اس وقت فریدون کا سامنے آنا اس بات کی دلیل تھی کہ اب وہ اپنے پیروں پر چل کر اس عقوبت گاہ سے باہر نہیں جاسکے گا۔

کیپٹی کے جلادوں کے بارے میں علی بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بربریت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کے تشدد سے شیطان بھی پناہ مانگتا تھا۔ یہ ان کا ظلم و تشدد ہی تھا کہ لوگ ان کا نام سنتے ہی تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔

کیپٹی کے دو آدمی مہ پارہ کو بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ مہ پارہ چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد علی کو بھی دو آدمی دھکیلتے ہوئے تہ خانے میں لے گئے۔

تہ خانے میں اذیت پہنچانے والے مختلف قسم کے آلات دیکھ کر علی کا جسم پسینے میں نہا گیا۔ چند منٹ بعد فریدون ایک اور آدمی کے ساتھ تہ خانے میں داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ لمبے قد اور ٹھوس جسم کی بدولت وہ کوئی ریسلر ہی لگتا تھا۔ اس کا سر گھٹا ہوا' چہرے پر بے پناہ سفاکی اور آنکھوں میں بربریت کی جھلک نمایاں تھی۔

"اب تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ تمہارے بہت سے منصوبے کامیاب کیوں نہیں ہوسکے تھے" فریدون نے علی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "آخرکار تمہاری زندگی میں یہ دن آنا ہی تھا لیکن اگر تم ہم سے تعاون کرو تو تم پر یہ بُرا وقت بھی ٹل سکتا ہے۔ ہم صرف چند سوالوں کا جواب چاہتے ہیں۔ اگر تم ٹھیک ٹھیک بتادو تو تمہاری جان بچ جائے گی۔"

"ذلیل..... کتے..... غدار....." علی نے کہا اور فریدون کے منہ پر تھوک دیا "میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔"

"زاہدان سے آنے والا کون تھا اور اس وقت کہاں ہے؟"

فریدون نے رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کا لہجہ پُرسکون تھا۔

"تم سمجھتے ہو کہ میری زبان کھلوالوگے" علی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی "تم... ذلیل... کتے....."

فریدون نے لمبے قد والے گنجے کو اشارہ کیا۔ وہ پے تُلے قدم اٹھاتا ہوا علی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں علی کے چہرے پر

مرکوز تھیں اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ علی کے چہرے پر خوف کے سائے رقص کرنے لگے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ لمبے قد والا گنجا بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ اس کے چہرے پر سفاکی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔

علی پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگا۔ گنجا اس سے صرف دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ وہ چند لمحے علی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک ہی اس کا ہاتھ حرکت میں آگیا۔ علی اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچے جھک گیا۔ گنجے کا گھونسا دیوار پر لگا۔ اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ وہ ایک دم سنبھل گیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا دایاں ہاتھ سہلاتے ہوئے علی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔

"یہاں آنے والے خاموشی سے مار کھا لیتے ہیں اور مجھے اس میں بالکل مزہ نہیں آتا" گنجے نے علی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم پہلے شخص ہو جو مزاحمت کر رہا ہے۔ تم پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے واقعی لطف آئے گا۔"

گنجا اچانک علی پر جھپٹا' علی اس مرتبہ بھی اچھل کر اپنے آپ کو بچا گیا۔ اور پھر اس کمرے میں دونوں کی اچھل کود شروع ہو گئی۔ تین منٹ میں گنجے کا ہاتھ ایک مرتبہ بھی علی کے جسم کو نہیں چھو سکا تھا۔ فریدون ایک طرف کھڑا دلچسپ نظروں سے یہ کھیل دیکھ رہا تھا۔ اس نے مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔

گنجا ایک بار پھر علی کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ اس نے ایک طرف جھکائی دے کر اچانک ہی دوسری طرف سے حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ علی مار کھا گیا۔ گنجے نے اس پر مکوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ علی اب بھی بچنے کی کوشش کر رہا تھا کیوں کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں شدید ضربیں نہ لگ رہی ہوں۔

فریدون بڑے اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ چند منٹ بعد علی گوشت کے ڈھیر کے مانند فرش پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ چہرہ لہولہان تھا اور آنکھیں بری طرح سوج گئی تھیں۔

"میں انقلابی حکومت کا وفادار ہوں علی!" فریدون نے کہا' "بات صرف اصولوں کی ہے۔"

"تت۔۔۔ تم مجھ سے کچھ نہیں اُگلوا سکتے۔ ذلیل کتے!" علی نے اٹک اٹک کر کہا۔

"ہم زبان کھلوانے کے طریقے جانتے ہیں" فریدون نے کہا۔ اور دروازے پر کھڑا ہوا محافظ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی اور دو آدمی مہ پارہ کو گھسیٹتے ہوئے اندر آ گئے۔ مہ پارہ کے ساتھ غالباً ابھی تک کوئی زیادتی نہیں کی گئی تھی لیکن خوف و دہشت سے اس کا چہرہ چاک کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس نے جب اپنے شوہر کا حشر دیکھا تو دہشت سے اس کا انگ انگ کانپنے لگا۔

وہ دونوں آدمی مہ پارہ کو بازوؤں سے پکڑے کھڑے تھے۔ فریدون نے گنجے کو اشارہ کیا۔ وہ بے تکے قدم اٹھاتا ہوا مہ پارہ کے قریب پہنچ گیا۔ مہ پارہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے بری طرح مچل رہی تھی۔ دونوں محافظوں نے مہ پارہ کی ٹانگیں پکڑ کر ٹخنوں پر ہتھکڑیوں کی طرح کے آہنی کلپ پہنا دیئے۔ ان آہنی کلپوں سے منسلک ایک موٹی زنجیر چھت تک چلی گئی تھی۔ یہ زنجیر چھت پر لگی ہوئی ایک ریل پر سے گزر کر دوسری طرف لٹکی ہوئی تھی۔

فریدون کا اشارہ پا کر دونوں آدمی زنجیر کا دوسرا سرا کھینچنے لگے۔ مہ پارہ کا جسم فرش سے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ الٹی لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت تھی اور وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ اس کے سامنے کھڑے ہوئے گنجے نے خنجر نکالا اور اس کی دھار چیک کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی بکری ذبح کرنے کی تیاری کر رہا ہو۔

"کیا خیال ہے علی! تمہاری بیوی پر کام شروع کیا جائے؟" فریدون نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا "سعد کو آج تک صرف مردوں سے واسطہ پڑا ہے۔ تمہاری بیوی کے خوب صورت جسم پر خنجر چلاتے ہوئے اسے یقیناً ایک نیا لطف آئے گا۔"

علی نے آنکھیں بند کر لیں اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا۔ "نہیں نہیں! خدا کے لئے اسے کچھ مت کہو۔۔۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔۔۔۔ یہ کچھ نہیں جانتی۔۔۔۔"

اچانک تہ خانے میں مہ پارہ کی خوف ناک چیخیں گونجنے لگیں۔ علی نے نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دیکھا کہ گنجے نے مہ پارہ کے دونوں بازو پکڑ رکھے تھے اور محافظ اس کی دونوں ٹانگوں کو مخالف سمتوں میں کھینچ رہے تھے۔

"اسے چھوڑ دو۔۔۔۔ خدا کے لئے اسے چھوڑ دو۔۔۔۔" علی اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا "میں۔۔۔ میں بتاتا ہوں۔۔۔ تم جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو میں بتاؤں گا۔"

فریدون نے محافظوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے مہ پارہ کو چھوڑ دیا۔ وہ دھپ کی آواز سے سر کے بل فرش پر گری۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے خوف ناک چیخ نکل گئی تھی۔ محافظوں نے اس کے پیروں پر لگے ہوئے آہنی کلپ بھی کھول دیئے تھے۔

"ہاں اب بتاؤ وہ کون تھا؟" فریدون نے علی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ میں جھوٹ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ اور غلط بیانی تم دونوں کے لئے بھی نقصان دہ ہوگی۔"

"وہ جمشید تھا" علی نے جواب دیا "جمشید منصوری۔۔۔ وہ رات ایک بج کر پچیس منٹ والی ٹرین سے تہران گیا ہے۔"

اس کے چند منٹ بعد ہی کمیٹی کے تہران ہیڈ کوارٹر کو اطلاع ملی کہ جمشید منصوری صبح کی ٹرین سے تہران پہنچ رہا ہے۔ جمشید

منصوری کمیٹی کو سب سے زیادہ مطلوب آدمی تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی ہیڈ کوارٹر میں کھلبلی سی مچ گئی۔ صبح ہونے سے پہلے ہی تہران کے ریلوے اسٹیشن کو کمیٹی کے آدمیوں نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ یہ اطلاع کسی طرح انٹیلی جنس تک بھی پہنچ گئی۔ کرنل مصدق اور اس کے آدمی بھی حرکت میں آ گئے۔

صبح ساڑھے نو بجے جب ٹرین تہران اسٹیشن پر پہنچی تو ایک ایک آدمی کو چیک کیا جانے لگا۔ کمیٹی کے آدمی اس چیکنگ میں بھی بڑی بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ عورتوں کے بال کھینچ کر اور ان کے جسموں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا گیا۔ لیکن جمشید منصوری نہیں ملا۔

اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ علی کاشان میں کمیٹی کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے تہ خانے میں فرش پر گوشت اور ہڈیوں کے ڈھیر کی صورت میں پڑا زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ فریدون اور ایک ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لئے نہیں کہ انہیں اس کی سلامتی سے کوئی دلچسپی تھی بلکہ وہ اس لئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔

تھوڑی دیر میں علی نے آنکھیں کھول دیں اور گہرے سانس لیتا ہوا ویران سی نظروں سے فریدون کو گھورنے لگا۔

"تم نے ہمیں دھوکا دیا ہے علی!" فریدون نے دانت پیستے ہوئے کہا "جمشید منصوری تہران پہنچنے والی ٹرین پر موجود نہیں تھا۔ ٹرین سے اترنے والے ایک ایک مسافر کو چیک کیا گیا تھا۔"

"مم..... میں نے ..... دھوکا نہیں دیا۔ وہ ...... وہ اسی ٹرین سے ..... روانہ ہوا تھا" علی نے رک رک کر کہا۔

"تم بکتے ہو" فریدون بھیڑیئے کی طرح غرایا "اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تمہاری بیوی کے ساتھ بہت نرمی کا سلوک کیا ہے" پھر وہ قریب کھڑے ہوئے محافظ کی طرف مڑا "ذرا اس کی چہیتی کو اندر لاؤ۔ دیکھیں اس کی قوتِ برداشت کہاں تک ساتھ دیتی ہے۔"

"نہیں نہیں ..... رک جاؤ ....." علی چیخ اٹھا "میری بیوی کو .... اب یہاں مت لانا ..... وہ ..... وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی اور ......میں.... میں اسے نہیں دیکھ سکوں گا۔"

"تو پھر وہ بات بتاؤ جو ہم سننا چاہتے ہیں" فریدون نے کہا۔ "جمشید منصوری تہران میں کب اور کہاں مل سکتا ہے؟"

"مم..... میں سچ کہتا ہوں" علی رک رک کر بولا "مجھے اس کے پروگرام کا ..... کوئی علم ..... نہیں..... لیکن ..... میرا خیال ہے وہ .... بازار ولی عصر کے علاقے میں واقع ..... کیفے دشت میں حمادی سے ..... ملنے کی کوشش .... کرے گا۔ وہ..... اس کا گہرا دوست ہے اور جب ...... وہ تہران میں تھا تو ..... اکثر اس سے ..... ملا کرتا ..... تھا۔"

"گڈ!" فریدون کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی "اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی" اس نے جیب سے پستول نکالا اور علی کے سر پر فائر کر دیا۔

علی کے منہ سے ایک بھیانک سی چیخ نکلی اور وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا۔ فریدون ایک محافظ کی طرف مڑ گیا۔

"اس کی بیوی کو بھی لے آؤ۔ اب وہ حسینہ اس دنیا میں اکیلی رہ کر کیا کرے گی۔ ویسے بھی ایران کی سرزمین پر اس جیسی بدکردار عورتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد دو آدمی مہ پارہ کو گھسیٹتے ہوئے لے آئے۔ علی کی حالت دیکھ کر وہ چیختی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔ وہ علی کو دیکھنے کے لئے اس پر جھکی ہی تھی کہ تہ خانہ ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ دو گولیاں مہ پارہ کے پہلو کو چیرتی ہوئی دل میں پیوست ہو گئیں اور وہ بھیانک انداز میں چیختی ہوئی علی کی لاش پر ڈھیر ہو گئی۔

O☆O

جمشید منصوری نے اس صورت حال کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ ویسے بھی اس کی منزل تہران نہیں تھی۔ صبح سات بجے کے قریب وہ تہران سے تقریباً پینتالیس کلومیٹر دور رباط کریم نامی ایک اسٹیشن پر اتر گیا۔ پچھلے تمام اسٹیشنوں کی طرح اس اسٹیشن پر بھی ضرورت سے زیادہ تعداد میں پولیس اور کمیٹی والے نظر آ رہے تھے۔ چھ سات مسافر رباط کریم پر ٹرین سے اترے تھے۔ ان مسافروں میں ایک ادھیڑ عمر عورت بھی شامل تھی جس کے ساتھ دس گیارہ سال کی عمر کی ایک لڑکی اور تقریباً ڈھائی سال کی عمر کا ایک بچہ بھی تھا۔ عورت ان بچوں کے ساتھ جمشید والے ڈبے ہی سے اتری تھی۔ ڈبے میں ان کی سیٹیں قریب قریب ہی تھیں اور جمشید راستے میں اس ڈھائی سالہ بچے سے باتیں کرتا ہوا آیا تھا۔

کمسن لڑکی نے حجاب پہن رکھا تھا جس سے نہ صرف اس کے کندھے اور سر پوری طرح ڈھک گیا تھا بلکہ چہرے کا کچھ حصہ بھی چھپ کر رہ گیا تھا۔ جب کہ ادھیڑ عمر کی عورت نے سیاہ رنگ کی چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ ہاتھوں کے علاوہ اس کے جسم کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں ہی سے جمشید نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔

انقلاب سے پہلے ایران میں خواتین کو مکمل آزادی تھی۔ لباس کے معاملے میں بھی ایرانی خواتین مادر پدر آزاد تھیں۔ زیادہ تر یورپین لباس ہی پہنا جاتا تھا۔ بعض خواتین تو اس قسم کا لباس استعمال کرتی تھیں کہ یورپی خواتین بھی شرما جاتیں۔

درمیانے اور نچلے طبقے کی خواتین میں پھر بھی شرم و حیا کا مادہ کسی قدر موجود تھا لیکن اونچے طبقے کی خواتین نے بے حیائی میں تو یورپ کی خواتین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں

کی رونق انہی سے تھی۔ لیکن انقلاب کے ساتھ ہی صورت حال تبدیل ہونے لگی۔ رنگین تتلیوں کی طرح ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں نظر آنے والی خواتین غائب ہونے لگیں۔ بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز اور مارکیٹیں ان کی رونق سے محروم ہو گئیں جب بے پردہ خواتین کو سزا دینے کا سلسلہ شروع ہوا تو سڑکیں بھی ویران نظر آنے لگیں۔ آزادی پسند خواتین نے پکڑے جانے اور سزا کے خوف سے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ چادر اور حجاب کو خواتین کے لئے لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔ اب جن خواتین کو کسی مجبوری کے تحت گھر سے نکلنا ہوتا تھا وہ چادر میں اس طرح لپٹی ہوتیں کہ جسم مکمل طور پر چھپ جاتا۔ دس سال سے اوپر کی بچیوں کے لئے بھی حجاب لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔

یہ عورت اپنے بچوں کے ساتھ قم سے ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ وہ بچہ اور بچی اگرچہ راستے میں جمشید منصوری سے باتیں کرتے رہے تھے لیکن اس عورت سے بات کرنے کا ایک مرتبہ بھی موقع نہیں ملا تھا۔

رباط کریم اسٹیشن پر اترتے ہی جمشید منصوری نے اندازہ لگا لیا کہ پچھلے اسٹیشنوں کی طرح یہاں بھی چیکنگ ہو رہی تھی۔ ٹرین سے اترنے والے دو مسافروں کو کمیٹی کے تین آدمیوں نے روک لیا تھا اور ان کے کاغذات چیک کئے جا رہے تھے۔

جمشید منصوری کے پاس تہران تک کا ٹکٹ تھا۔ گیٹ پر ٹکٹ چیک کرنے کی صورت میں اسے بھی روک کر پوچھ گچھ کی جا سکتی تھی۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پلیٹ فارم کے خارجی گیٹ پر ٹکٹ کلکٹر کے قریب کھڑا ہوا ایک آدمی مشتبہ نگاہوں سے آنے جانے والوں کو گھور رہا تھا۔

جمشید منصوری اس چادر پوش خاتون سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ بچہ غالباً ضد کر رہا تھا کہ اسے گود میں اٹھا لیا جائے اور عورت اسے ڈانٹ رہی تھی۔ ان کے پاس دو بیگ بھی تھے۔ ایک بیگ بچی نے اٹھا رکھا تھا اور دوسرا چادر پوش عورت سنبھالے ہوئے تھی۔ جمشید نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ کر بچے کو گود میں اٹھا لیا اور گیٹ کی طرف چلنے لگا۔ چادر پوش عورت نے اس کی اس حرکت پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

وہ جیسے جیسے گیٹ کے قریب پہنچ رہے تھے جمشید منصوری کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ ایک مسافر ان سے پہلے گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ قد کاٹھ میں وہ جمشید کے برابر تھا۔ وہ ٹکٹ کلکٹر کو ٹکٹ دے کر جیسے ہی آگے بڑھنے لگا گیٹ پر کھڑے ہوئے دوسرے آدمی نے اسے روک لیا۔

اسی دوران جمشید اس چادر پوش خاتون اور بچوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس سے پہلے پہنچنے والا مسافر جیب سے کاغذات نکال رہا تھا۔ جمشید منصوری نے اپنی گود میں اٹھائے ہوئے بچے کے کولہے پر زور سے چٹکی کاٹ دی۔ بچہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔

"کیا ہوا، بچہ کیوں رو رہا ہے؟" یہ سوال اس آدمی نے کیا تھا جو پہلے مسافر کے کاغذات چیک کر رہا تھا۔

"شاید پیٹ میں تکلیف ہے۔ بہت دیر سے پریشان کر رہا ہے؟" جمشید منصوری نے جواب دیا۔

"سامنے والی سڑک پر تقریباً ایک فرلانگ آگے بیمارستان ہے۔ اسے وہاں لے جاؤ" اس شخص نے اشارہ کیا۔

ٹکٹ کلکٹر نے بھی ان پر توجہ نہیں دی تھی۔ جمشید منصوری ان لوگوں کو لے کر اسٹیشن کی عمارت سے نکل آیا۔ کچھ ہی فاصلے پر دو کنارہ سی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ چادر پوش عورت ایک ٹیکسی کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ جمشید منصوری نے بچے کو گود سے اتار دیا۔ چٹکی کاٹنے پر دل ہی دل میں اس سے معذرت کی اور اس کا رخسار تھپتھپا کر خدا حافظ کہتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پلیٹ فارم کا گیٹ یہاں سے نظر نہیں آ رہا تھا۔

رباط کریم زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ بازار کی بعض دکانیں کھل چکی تھیں لیکن سڑکوں پر ابھی زیادہ لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ جمشید تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا تقریباً دس منٹ بعد بس اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ کرج جانے والی بس تیار ہی کھڑی تھی۔ جمشید ٹکٹ لے کر بس میں سوار ہو گیا۔

کرج، رباط کریم سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر اس لائن پر واقع ہے جو تہران سے قزوین، زنجان اور تبریز وغیرہ کی طرف چلی گئی ہے۔ یہ چھوٹا سا پرانی طرز کا شہر تہران سے اڑتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بس نے تقریباً دو گھنٹے میں جمشید منصوری کو رباط کریم سے کرج پہنچا دیا۔

بس اسٹیشن سے نکل کر جمشید نے ایک ریسٹورنٹ میں ناشتا کیا۔ ریسٹورنٹ سے نکل کر بظاہر بے فکری سے چلتا ہوا وہ سوغان اسٹریٹ پر پہنچ گیا۔ یہاں اس کا ایک پرانا ساتھی دُراب رہتا تھا۔

جمشید نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دو منٹ بعد ایک فربہ اندام عورت نے دروازہ کھولا اور جمشید منصوری پر نظر پڑتے ہی بُری طرح چونک گئی۔

"اوہ! جمشید منصوری!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "آؤ آؤ۔ اندر آ جاؤ۔"

جمشید منصوری اندر داخل ہو گیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

"میرا دوست دُراب کہاں ہے؟" اس نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کام پر گیا ہے۔ کل تمہارا پیکٹ مل گیا تھا۔ لیکن میں پیکٹ بعد میں لاؤں گی، پہلے تمہارے لئے ناشتا بنا کر لاتی ہوں" عورت نے کہا۔

"میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔ البتہ ایک کپ کافی پی لوں گا۔"

جمشید نے جواب دیا۔
دُراب کی بیوی اسے کمرے میں بٹھا کر کافی بنانے چلی گئی۔
بظاہر وہ ایک سیدھی سادی سی خاتونِ خانہ نظر آتی تھی لیکن درحقیقت بڑے مضبوط دل گردے کی عورت تھی۔ چند منٹ بعد وہ کافی کی ٹرے اور ایک پیکٹ لئے کمرے میں داخل ہوئی۔
"یہ رہا تمہارا پیکٹ!" اس نے پیکٹ جمشید کے قریب ہی ایک کرسی پر رکھ دیا۔
جمشید منصوری نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف اُچھال دیا "اور یہ رہا تمہارا نذرانہ" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
دُراب کی بیوی نے لفافہ اٹھا کر کھولا تو اندر رکھے ہوئے نوٹ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔
"اوہ! یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"
"جمشید منصوری اپنے دوستوں کو خوش دیکھنا پسند کرتا ہے۔" جمشید منصوری نے کہا اور کافی کی چسکیاں لینے لگا۔
ایک گھنٹے بعد جب وہ دُراب کے گھر سے نکلا تو ایک بدلا ہوا انسان تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی اور گھنی مونچھیں نظر آرہی تھیں۔ جسم پر کسانوں والا لباس تھا۔ شناختی کاغذات کی رُو سے وہ آذربائی جان کا ایک کاشت کار تھا۔ اس کے پاس حکام کا جاری کردہ ایک خصوصی اجازت نامہ بھی تھا جس کی رُو سے وہ مویشیوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں کہیں بھی جا سکتا تھا۔
وہ سہ پہر چار بجے کے قریب ٹرین سے تہران اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر حسبِ معمول چیکنگ ہو رہی تھی لیکن اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پُرہجوم گیٹ سے گزرتے ہوئے وہ ایک شخص کا دھکا لگنے سے لڑکھڑا گیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو ایک طویل قامت شخص تیزی سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کا رخ باہر کھڑی سیاہ رنگ کی کار کی طرف تھا۔ جمشید منصوری نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ وہ انٹیلی جنس کا کرنل مصدق جلالی تھا۔

O☆O

دو دن بعد

بازار ولی عصر کے چوراہے پر واقع کیفے دشت، کیٹی کے سادہ لباس آدمیوں کے نرغے میں تھا۔ دو آدمی داخلی دروازے کی نگرانی پر مامور تھے۔ ان میں ایک قدرے بھاری بھرکم تھا اور دوسرا دُبلا پتلا سا نوجوان، جس کی عمر بمشکل بیس سال رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی بے ترتیب داڑھی تھی۔ ویسے یہ داڑھی اس کے چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔
دو آدمی کیفے کے عقبی دروازے پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ان دونوں نے کوٹ پہن رکھے تھے جن کی دائیں جیبیں بوجھ سے کسی قدر لٹکی ہوئی تھیں۔ اور ظاہر ہے جیبوں کا یہ بوجھ ریوالور یا پستول کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
ایک آدمی کیفے کے اندر گاہکوں کے ساتھ بیٹھا خوش گپیاں کر رہا تھا۔ کیفے میں گاہکوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن جو لوگ موجود تھے وہ اپنے ساتھیوں سے بھی بات چیت میں بہت محتاط نظر آرہے تھے۔ پبلک مقامات پر یوں بھی لوگ سیاست یا ملک کے موجودہ حالات پر گفتگو کرتے ہوئے گھبراتے تھے اور کبھی باتوں کے دوران سیاست کا موضوع نکل بھی آتا تو انقلاب کے حق میں بات کی جاتی۔ یہ سب ہی جانتے تھے کہ کسی پبلک مقام پر انقلاب یا کسی مذہبی رہنما کے خلاف کوئی بات کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اسی لئے لوگ آپس کی بات چیت میں بھی خاصے محتاط تھے۔ اور کسی اجنبی کی موجودگی میں تو کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
کیفے دشت سے کچھ دور حسن اسٹریٹ پر سیاہ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی جس میں کیٹی کا مقامی سربراہ علی جواد بیٹھا ہوا تھا۔ قریبی گلیوں میں کچھ اور کاریں بھی موجود تھیں اور ان سب کا آپس میں ریڈیو کنٹرول کے ذریعے رابطہ قائم تھا۔
علی جواد چوڑے شانوں والا بھاری بھرکم آدمی تھا۔ دو روز پہلے اسے کاشان سے اطلاع ملی تھی کہ جمشید منصوری تہران کے لئے روانہ ہو چکا ہے۔ جواد اپنے آدمیوں کو لے کر صبح سویرے ہی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا تھا۔ جب ٹرین اسٹیشن پر آکر رکی تو اسے پوری طرح گھیرے میں لیا جا چکا تھا۔ ایک ایک مسافر کو چیک کیا گیا۔ بعض مشتبہ افراد کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ بھی کی گئی لیکن جمشید منصوری کا کوئی سراغ نہیں ملا۔
اسی روز جواد نے اسٹیشن پر انٹیلی جنس کے کرنل مصدق جلالی کو بھی اپنے چند آدمیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ کرنل مصدق کو وہاں دیکھ کر جواد الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کیا انٹیلی جنس کو بھی جمشید منصوری کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے؟ جواد کے پاس اس سوال کا فی الحال کوئی جواب نہیں تھا لیکن اس نے کرنل مصدق سے محتاط رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
تہران ریلوے اسٹیشن پر مایوسی کے بعد علی جواد نے کیٹی کے کاشان آفس کو بھی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا اور کاشان سے تہران تک تمام ریلوے اسٹیشنوں کو یہ ہدایت جاری کر دی کہ اس ٹرین سے کسی مشتبہ آدمی کو اترتے ہوئے دیکھا گیا ہو تو اس کے بارے میں اطلاع دی جائے۔
دو پہر بارہ بجے کے قریب رباط کریم سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ ایک آدمی کو ایک عورت اور دو بچوں کے ساتھ مشتبہ انداز میں اسٹیشن سے باہر آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی علی جواد کار پر رباط کریم روانہ ہو گیا۔
اس کی اطلاع کے مطابق اس ٹرین سے چھ سات مسافر رباط کریم اسٹیشن پر اترے تھے۔ تمام مسافروں کے کاغذات چیک کئے گئے تھے۔ وہ اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ البتہ ایک آدمی کو چیک نہیں کیا گیا تھا جو ایک عورت اور دو بچوں کے ساتھ تھا۔ اس

آدمی نے ڈھائی سالہ بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا جو مسلسل رو رہا تھا۔ پوچھنے پر اس شخص نے بتایا تھا کہ بچے کے پیٹ میں تکلیف ہے۔ پلیٹ فارم کے گیٹ پر موجود کمیٹی کے آدمی نے اسے بیمارستان لے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن تقریباً ایک گھنٹے بعد کمیٹی کے اس آدمی کے ذہن میں اچانک ہی خیال آیا کہ بیمارستان جا کر اس بچے کے بارے میں معلوم کرے۔ لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ کسی بچے کو علاج کے لئے یہاں نہیں لایا گیا۔

اس شخص کے بارے میں نجانے کیوں جواد کے ذہن میں شبہ جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ اس نے تحقیقات کا فیصلہ کر لیا۔ تحقیقات کا آغاز اس نے ریلوے اسٹیشن کے سامنے ٹیکسی اسٹینڈ سے کیا۔ ٹرین کی آمد کے وقت یہاں عام طور پر تین چار ٹیکسیاں کھڑی رہا کرتی تھیں لیکن اس روز صرف دو ٹیکسیاں تھیں۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کو تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی جو صبح چادر پوش عورت اور بچوں کو لے کر گیا تھا۔

"صبح کاشان سے آنے والی ٹرین سے اترنے والے مسافروں کو تم کہاں لے گئے تھے؟" جواد نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔ وہ اس وقت کمیٹی کے مقامی دفتر میں موجود تھے۔ یہ دفتر ایک رہائشی مکان کے دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے کو حوالات کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ جب کہ دوسرے کمرے میں دفتر قائم تھا۔ اس میں ایک ٹوٹی ہوئی میز اور چند جھولتی ہوئی کرسیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"خانم اور اس کے دونوں بچوں کو میں نے خیابان سعد پر واقع ان کے مکان کے سامنے اتار دیا تھا" ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا۔

"اور وہ آدمی اسے کہاں اتارا تھا؟" جواد نے اسے گھورا۔

"ان کے ساتھ کوئی آدمی نہیں تھا۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

جواد چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر اس کا بھرپور تھپڑ ٹیکسی ڈرائیور کے منہ پر پڑا۔ یہ صورت حال ٹیکسی ڈرائیور کے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔ وہ کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا' جواد نے اٹھ کر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ڈرائیور بلبلاتا ہوا فرش پر لوٹتا رہا۔

"میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔ اس آدمی کو تم نے کہاں اتارا تھا؟" جواد نے اس کی کھوپڑی پر ایک اور ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔

"میں سچ کہتا ہوں۔ ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔" ڈرائیور کراہتے ہوئے بولا۔

"لیکن میری اطلاع کے مطابق وہ عورت ٹرین سے اتری تھی تو اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا جس نے بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ اور تم کہتے ہو کہ ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔" جواد غرایا۔

"وہ... وہ آدمی...." ڈرائیور اپنے آپ کو اس کی ایک اور ٹھوکر سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا۔ "وہ.....وہ ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ خانم اور بچوں کو ٹیکسی کے پاس چھوڑ کر وہ بازار کی طرف چلا گیا تھا۔ ممکن ہے وہ بعد میں گھر پہنچا ہو لیکن میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔"

جواد چند لمحے ٹیکسی ڈرائیور کو گھورتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس نے عورت کے گھر کا پتا معلوم کرنے کے بعد ڈرائیور کو چھوڑ دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ خیابان سعد پر واقع اس مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دستک کے جواب میں دروازہ ایک عورت نے کھولا تھا۔ لیکن وہ اس طرح دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی کہ اس کا چہرہ پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کس سے ملنا ہے؟" عورت نے پوچھا۔

"آج صبح کاشان والی ٹرین سے یہاں کون آیا تھا؟" جواد نے پوچھا۔

"میں آئی تھی۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔ کیوں.... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں کمیٹی کے تہران آفس کا سربراہ ہوں۔ تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اندر آنے کے لئے نہیں کہو گی؟" جواد نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ عورت نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ کمیٹی والوں کے سامنے مزاحمت کرنے کا مطلب اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔

جواد کو اپنے سامنے دیکھ کر عورت کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ اس وقت گھریلو لباس میں تھی۔

"کیا تم ایسا ہی لباس پہنتی ہو؟" جواد نے اسے گھورا۔

"نن.... نہیں.... یہ تو گھر میں پہننے کا لباس ہے۔" عورت ہکلائی۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔

"تمہارا شوہر کہاں ہے؟"

"وہ کام کے سلسلے میں قم میں رک گیا ہے۔ میں بھی قم گئی ہوئی تھی اپنی ماں کے پاس۔ آج صبح ہی بچوں کو لے کر واپس آئی ہوں۔ میرا شوہر ایک دو دن بعد آئے گا۔ لیکن.... کمیٹی کو ہم سے کیا دلچسپی ہے۔ ہم نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ میرے شوہر نے ہمیشہ انقلاب کی حمایت کی ہے۔"

"ہوں!" جواد ہنکارہ بھرتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ وسیع سٹنگ روم تھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور قیمتی صوفے قرینے سے آراستہ تھے۔ درمیان میں شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل پڑی تھی۔ قالین پر تین چار قیمتی کھلونے بھی بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مینٹل پیس پر چند اور چیزوں کے علاوہ تصویر کا ایک فریم بھی رکھا ہوا تھا۔ اس تصویر میں ایک عورت اور ایک مرد تھا۔

مرد نے پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا اور عورت کے جسم پر بھی یورپی لباس تھا۔ تصویر کو دیکھ کر جواد کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کئی سال پہلے کی اسی عورت کی تصویر تھی جو اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ گھوم کر عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ خاصی حسین عورت تھی۔

"صبح تمہارے ساتھ آنے والا مرد کون تھا؟" اس نے عورت کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"م.... میرے ساتھ.... کوئی مرد نہیں تھا۔" وہ عورت اس کا سوال سن کر ہی کانپ اٹھی تھی۔ اس نے صوفے پر پڑی ہوئی سیاہ چادر اٹھا کر جسم پر اوڑھ لی۔

"میں اس آدمی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو کاشان سے تمہارے ساتھ آیا تھا۔" جواد نے کہا۔

"کاشان سے!" عورت کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ "میں قم سے آئی ہوں۔ میں کاشان سے آنے والے کسی آدمی کو نہیں جانتی۔"

"میں تمہارے اس دوست کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو ٹرین سے اترتے وقت تمہارے ساتھ تھا اور جس نے تمہارے بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔" جواد نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"اوہ وہ!" عورت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "لیکن میں اُسے نہیں جانتی۔ وہ ٹرین میں میرے بچوں سے مانوس ہوگیا تھا۔ اور جب ہم ٹرین سے اترے تو میرا بچہ ضد کر رہا تھا کہ اسے گود میں اٹھالوں۔ میرے پاس بیگ بھی تھا۔ میں اسے گود میں نہیں اٹھا سکتی تھی۔ بچے کو روتے اور ضد کرتے دیکھ کر اجنبی نے اسے گود میں اٹھالیا تھا اور پھر ہمیں ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

"میں اس اجنبی سے تمہارا تعلق جاننا چاہتا ہوں۔" جواد نے کہا۔

"م.... میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" عورت ایک بار پھر کانپ گئی۔ "میں ایک شریف عورت ہوں۔ کسی غیر مرد کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔"

"لیکن.... وہ تمہارا ہم سفر تھا اور اس نے تمہارے بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔" جواد نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"ہم سفر ہونا محض اتفاق ہے اور میرے بچے کو اس نے محض انسانی ہمدردی کی بنا پر گود میں اٹھایا تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"دیکھو!" جواد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر تم بتادو گی کہ وہ کہاں ہے تو تمہارے ساتھ نرمی برتی جائے گی۔ بصورت دیگر...."

"م.... میں سچ کہتی ہوں۔ اس اجنبی کے بارے میں مَیں کچھ نہیں جانتی۔" عورت روہانسی ہو گئی۔

جواد چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تمام کمروں میں گھومتا رہا۔ عورت مجرمانہ انداز میں سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ پورا گھر قیمتی سازوسامان سے آراستہ تھا جس سے اہل خانہ کی مالی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"تمہارا شوہر کیا کرتا ہے؟" جواد نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ پھلوں کا بیوپاری ہے۔ باغات کے ٹھیکے لیتا ہے۔" عورت نے جواب دیا۔

"کیا تم جیسی کوئی جوان اور حسین عورت شوہر کے بغیر رہ سکتی ہے؟" جواد نے کہا۔

عورت کا چہرہ یکدم سرخ ہوگیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہونٹ کپکپا رہے تھے اور منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ جواد کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا۔

"تمہارے بچے کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ دیر پہلے باہر نکلے تھے۔ پڑوس کے کسی مکان میں ہوں گے۔" عورت نے جواب دیا۔

"تمہارا دوست تمہیں ٹیکسی میں بٹھانے کے بعد کہاں گیا تھا؟" جواد نے ایک بار پھر اپنا سوال دُہرایا۔

"وہ میرا دوست نہیں تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" عورت نے جواب دیا۔ خوف کے ساتھ اب غصہ بھی اس پر غالب آنے لگا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ نوکیلے ناخنوں سے جواد کا منہ نوچ لے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اگرچہ کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ کمیٹی کے کسی آدمی کے ساتھ اس طرح کا طرزِ عمل اس کے لئے بہت زیادہ نقصان دہ ہوگا۔

"اُس کا حلیہ بتا سکتی ہو؟" جواد نے پوچھا۔

"میں نے اسے توجہ سے نہیں دیکھا تھا لیکن جو کچھ سمجھ میں آرہا ہے بتا دیتی ہوں۔" عورت نے کہا اور اسے اجنبی کا حلیہ بتانے لگی۔

"ٹھیک ہے" جواد نے کہا "میں تمہاری بات کا یقین کرلیتا ہوں لیکن اگر اُس آدمی سے تمہارا تعلق ثابت ہوگیا تو تمہیں کمیٹی کے فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔"

جواد تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔ اپنے عقب میں اس نے دھڑ سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی۔

رباط کریم میں مزید تحقیقات کے بعد پتا چلا کہ اس حلیے کا ایک آدمی صبح ساڑھے سات بجے والی بس پر سوار ہوا تھا۔ اس نے گرج کا ٹکٹ خریدا تھا۔ جواد کمیٹی کے مقامی آدمیوں کو اس عورت کے بارے میں ہدایات دیتا ہوا گرج کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس کا یہ شبہ پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ رباط کریم اسٹیشن پر اترنے والا وہ اجنبی جمشید منصوری ہی تھا۔ وہ بہت چالاک انسان تھا۔ اسے بھی یقیناً یہ شبہ ہوگیا ہوگا کہ اگر کاشان میں علی پکڑا گیا تو وہ کمیٹی کو اس کے بارے میں بتادے گا کہ وہ ٹرین سے تہران کے لئے روانہ ہوا ہے۔ جمشید منصوری کو یقیناً یہ خیال ہوگا کہ تہران میں اس ٹرین سے آنے والے مسافروں کو چیک کیا جائے گا۔ وہ رباط کریم اسٹیشن پر اتر گیا اور اس عورت اور اس کے بچوں کی آڑ میں اسٹیشن سے باہر چلا گیا۔

رباط کریم سے گرج اور پھر وہاں سے تہران پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ یہ راستہ اگرچہ طویل تھا مگر زیادہ محفوظ تھا۔ اس عورت کے بارے میں بھی وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے وہ سچ بول رہی ہو لیکن وہ اسے نظرانداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے کمیٹی کے مقامی آدمیوں کو اس عورت کی نگرانی کی ہدایت کردی تھی۔

جواد گرج کے بس ٹرمنل اور اس کے قرب و جوار میں جمشید منصوری کے معلوم حلئے کی مدد سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوسکی اور آخر کار جب وہ تہران پہنچا تو شام ہوچکی تھی۔

یہاں ایک اور اطلاع اس کی منتظر تھی۔ کاشان سے فریدون نے یہ اطلاع دی تھی کہ علی سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق جمشید منصوری بازار ولی عصر کے علاقے میں واقع کیفے دشت میں حمادی سے ملنے کی کوشش کرے گا۔ کیوں کہ وہ اس کا گہرا دوست ہے۔ جب وہ تہران میں تھا تو اکثر اکٹھے ہی کام کیا کرتے تھے۔

جواد کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ یہ اطلاع خاصی امید افزا تھی۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ جمشید منصوری کی شناخت کا تھا۔ وہ اب تک بڑی خوب صورتی سے پولیس اور کمیٹی کی آنکھوں میں دھول جھونکتا آیا تھا۔ وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر بلا روک ٹوک زاہدان سے تہران پہنچ چکا تھا۔ اور ظاہر ہے وہ اپنی اصل شکل میں نہیں گھوم رہا ہوگا۔ وہ بھیس بدلنے کا ماہر تھا اور بدلے ہوئے بھیس میں کسی کو شناخت کرلینا آسان نہیں۔

اچانک اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ فریدون کی اطلاع کے مطابق وہ حمادی سے ملنے کی کوشش کرے گا۔ جمشید منصوری تک پہنچنے کے لئے حمادی کو تلاش کرنا ضروری تھا۔ حمادی کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن اسے یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے جرائم پیشہ لوگوں کا ریکارڈ تیار کیا گیا تھا۔ ان میں حمادی کا ریکارڈ بھی ضرور ہونا چاہئے۔

اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ ریکارڈ روم میں حمادی کی فائل موجود تھی جسے لے کر وہ اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک حمادی کی فائل پر جھکا رہا۔ فائل میں حمادی کی کوئی تصویر نہیں تھی لیکن اس کا حلیہ لکھا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ متعدد سنگین جرائم میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اس پر ایک عورت کے قتل کا الزام بھی تھا لیکن وہ کبھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک شاہ پرست' دولت مند خاندان کے افراد کو بھاری معاوضہ لے کر ترکی کے راستے فرار کرانے کی کوشش کرتے ہوئے تبریز سے بیس کلومیٹر دور ایک چھوٹی سی بستی میں پاسداران کے گھیرے میں آگیا تھا۔ لیکن وہ بڑی دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے نہ صرف فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا بلکہ لاکھوں ڈالر مالیت کے ہیرے جواہرات پر مشتمل ان لوگوں کی ساری پونجی بھی ساتھ لے گیا تھا جنہیں وہ سرحد پار کرانے کے لئے لے جارہا تھا۔ پاسداران صرف انہی لوگوں کو گرفتار کرسکے تھے جو ملک سے فرار ہونے کی کوشش کررہے تھے۔ حمادی کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ جھیل ارمید کے اوپر سے گھومتا ہوا پہاڑوں میں آباد خانہ بدوش کردوں سے جا ملا تھا۔ اس کے بعد حمادی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا گیا۔ ممکن ہے وہ پہاڑی سلسلہ عبور کرکے ترکی کی طرف نکل گیا ہو۔ یا پہاڑی میں کردوں کے ساتھ ہی رہ گیا ہو۔

علی جواد نے فائل بند کردی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے حمادی واپس آگیا ہو اور تہران کی زیر زمین دنیا میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہو۔ بہرحال' اس کا مبہم سا حلیہ معلوم ہوگیا تھا۔ اگر وہ اپنی اصل شکل میں ہو تو اسے شناخت کیا جاسکتا تھا۔

جواد نے فوراً ہی کیفے وشت کی نگرانی شروع کرادی اور اپنے آدمیوں کو سختی سے ہدایت کردی کہ مہاوی کے حلیے کا کوئی آدمی نظر آئے تو فوراً اسے اطلاع دی جائے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو جمشید منصوری کا وہ حلیہ بھی بتادیا تھا جو رباط کریم میں اس عورت سے معلوم ہوا تھا۔

کیفے وشت کی دو دن کی نگرانی کے بعد اسے امید افزا اطلاع ملی تو وہ خود بھی ہوٹل کے قریب پہنچ گیا۔ وہ جمشید منصوری کی گرفتاری کے سلسلے میں بے حد پُرامید تھا۔ اسے یقین تھا کہ انٹیلی جنس کا کرنل صدق بھی جمشید منصوری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ وہ چاہتا تو کرنل صدق کے ساتھ مل کر کوئی مناسب منصوبہ بندی کر سکتا تھا لیکن جمشید منصوری کی گرفتاری کا سہرا وہ اپنے سر باندھنا چاہتا تھا۔ دوسرے اسے یہ شبہ بھی تھا کہ کرنل صدق انقلابی حکومت کے ساتھ پوری طرح مخلص نہیں ہے۔

کیفے وشت ایک بدنام ریسٹورنٹ تھا۔ انقلاب سے پہلے یہ کیفے ناپسندیدہ افراد اور طوائفوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ لیکن انقلاب کے بعد طوائفیں یہاں سے اس طرح غائب ہو گئی تھیں جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ ویسے اس وقت گاہکوں کی ایک معقول تعداد کیفے میں موجود تھی۔

چار بج کر پندرہ منٹ پر ایک خوش پوش شخص ہوٹل میں داخل ہوا۔ کیفے میں موجود جواد کا آدمی اس پر نظر پڑتے ہی چونک گیا۔ اس نے اٹھ کر بل ادا کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ حسن اسٹریٹ پر پہنچ کر وہ سیاہ رنگ کی کار کے قریب رک گیا' دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ کھول کر کار کے اندر بیٹھ چکا تھا۔

"ابھی ابھی ایک مشتبہ قسم کا آدمی ہوٹل میں داخل ہوا ہے۔" اس نے علی جواد کو بتایا "اس نے گرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا ہے۔ چہرے پر گھنی مونچھیں ہیں۔ یا تو وہ جمشید منصوری ہے یا اس کا بھیجا ہوا کوئی آدمی۔"

علی جواد نے کلائی پر بندھی ہوئی..... گھڑی پر نظر ڈالی اور اسٹیئرنگ پر بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"اب تم اندر جا کر بیٹھ جاؤ اور نووارد پر نگاہ رکھو۔"

اسٹیئرنگ پر بیٹھا ہوا شخص خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے اترا اور ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔

تقریباً آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ کیفے میں موجود گرے سوٹ والا کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار کھول کر دیکھنے لگتا اور کبھی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف۔ اس کے چہرے پر بتدریج مایوسی پھیلتی جارہی تھی۔ پانچ بجے کے قریب اس نے میز پر دس تومان کا نوٹ رکھا اور اپنا اخبار لپیٹتا ہوا اٹھ گیا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

گرے سوٹ والا تیزی سے گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ اس کے سامنے کیفے کا ایک آدمی کھڑا تھا۔

"خود کو زیرِ حراست سمجھو۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔"

لیکن اس شخص نے بھاگنے میں قطعاً دیر نہیں لگائی۔ وہ کسی جنگلی بھینسے کی طرح شیشے کی پارٹیشن سے ٹکرایا اور زبردست چھناکے سے فٹ پاتھ پر جاگرا' شیشے کے ٹکڑے اس کے چاروں طرف بکھر گئے۔

کیفے کے اندر بھگدڑ مچ گئی۔ دو تین آدمیوں کی چیخیں بھی گونجی تھیں۔ باہر گرے سوٹ والا گرتے ہی اٹھا اور بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ اسی لمحہ کسی طرف سے تین فائر ہوئے اور وہ سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کمیٹی کی دو تین گاڑیاں پہنچ گئیں۔ ایک گاڑی سے سب سے پہلے علی جواد باہر نکلا اور دوڑتا ہوا زخمی شخص کے پاس پہنچ گیا۔

"ابھی زندہ ہے۔" وہ چلایا "فوراً ایمبولینس منگواؤ۔ اسے مرنا نہیں چاہئے۔"

اسی لمحے کیفے وشت کے سامنے والی عمارت کے پورچ سے ایک آدمی باہر نکلا اور ادھر اُدھر دیکھے بغیر بے پروائی کے انداز میں چلتا ہوا ایک قریبی گلی میں داخل ہو گیا۔

دس سیکنڈ بعد اس کے ساتھ والی عمارت کے نیم تاریک برآمدے سے ایک عورت نکلی اور پہلی عمارت کے پورچ سے نکلنے والے شخص کے تعاقب میں چل پڑی۔ وہ عورت سرتاپا سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ رات کے وقت کسی عورت کا اکیلے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن اس چادر پوش عورت کو شاید خطرات کی پروا نہیں تھی۔

اگلا شخص اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کا تعاقب کیا جارہا ہے۔ وہ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا خیابان باہنر کی طرف نکل گیا اور بالآخر ایک طویل چکر کاٹتا ہوا بازار بزرگ کے علاقے میں واقع البرز ریستوران میں داخل ہو گیا۔

تعاقب کرنے والی عورت شیشے کے دروازے پر ذرا سا رکی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ اس کی چال میں ایک دم تیزی آگئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ مصطفیٰ اسٹریٹ پر واقع ایک پرانی سی عمارت میں داخل ہوئی اور چوبی زینے پر چڑھنے لگی۔ تیسری منزل پر پہنچ کر اس نے ایک دروازے پر تین مرتبہ مخصوص انداز میں دستک دی۔

"آجاؤ ماہ رخ!" اندر سے جمشید منصوری کی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھلا ہے۔"

O☆O

شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ عامری ریسٹورنٹ میں گاہکوں کا ہجوم تھا۔ ریسٹورنٹ کا مالک خاصا مصروف تھا۔ اتنے میں ایک ویٹر نے اسے بتایا کہ عقبی فون بوتھ میں ایک آدمی اس سے

ملنا چاہتا ہے۔ ریسٹورنٹ کے مالک عباس نے اسے گھورا اور اپرن سے ہاتھ پونچھتا ہوا پچھلے حصے میں پہنچ گیا' جہاں فون بوتھ میں ایک آدمی ریسیور کان سے لگائے کھڑا تھا۔ عباس نے بوتھ کا دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے' تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" عباس نے تیز لہجے میں کہا "جلدی بات کرو۔ اس وقت گاہکوں کا بہت رش ہے۔ میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔"

"میں جانتا ہوں' دولت کی فراوانی انسانی قدروں کو پامال کر دیتی ہے۔" بوتھ میں کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔

"آواز سن کر عباس اچھل پڑا۔ "او' میرے خدا! تم ..... جمشید!"

"تمہارا پرانا خادم۔ جمشید منصوری۔"

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا زندگی سے بیزار ہو چکے ہو؟" عباس نے اسے گھورا۔

"زندگی سے پیار کرنے والے ہمیشہ پہلے مرتے ہیں۔" جمشید نے کہا "میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ کیا تم چند منٹ نکال سکتے ہو؟"

عباس اسے ایک پرائیویٹ کمرے میں لے گیا۔

"یہاں آرام سے بات کی جا سکتی ہے۔ تم نے تو کمال کا بھیس بدل رکھا ہے۔ شکل سے تو میں نے اب بھی نہیں پہچانا۔"

"یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔" جمشید نے کہا "میں البرز ریسٹورنٹ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"اس ریسٹورنٹ کے مالک کا نام فخری ہے' جو شہر کا رہنے والا ہے۔ اور کچھ؟" عباس نے کہتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا اس شخص کا تعلق کمیٹی یا انٹیلی جنس سے ہو سکتا ہے؟"

"اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے فرخ کو ضرور معلوم ہو گا۔"

"فرخ کچھ نہیں جانتا۔ میں اس سے مل چکا ہوں۔" جمشید نے جواب دیا۔

"تو پھر۔" عباس نے سوچتے ہوئے جواب دیا "حاجی کو معلوم ہو گا۔ کہو تو اسے فون کروں؟"

"نہیں۔" جمشید اٹھتے ہوئے بولا "فون پر ایسی بات کرنا ٹھیک نہیں۔ میں خود اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

تقریباً ایک گھنٹے بعد جمشید منصوری تہران کے زیریں علاقے میں ریلوے لائن کے قریب پسماندہ بستی میں واقع ایک مکان میں موجود تھا۔ یہ مکان حاجی کا تھا۔ جمشید جب یہاں پہنچا تو حاجی موجود نہیں تھا۔ اس نے تالا ہاتھ کی صفائی سے کھولا تھا اور اب اندر بیٹھا حاجی کا انتظار کر رہا تھا۔

جمشید کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا' تقریباً آدھے گھنٹے بعد حاجی پہنچ گیا۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ سامنے کرسی پر ایک آدمی کو بیٹھے دیکھ کر اس نے پستول تان لیا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ پستول جیب میں رکھ لو۔" جمشید منصوری نے کہا۔ حاجی یہ آواز ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ چند لمحوں تک حیرت سے جمشید کی طرف دیکھتا رہا پھر پستول جیب میں رکھتے ہوئے آگے بڑھا۔

"میں سمجھا تھا کہ شاید کوئی چور وغیرہ گھس آیا ہے۔ بھائی تالا کھلا دیکھ کر میں حیران ہو گیا تھا۔" اس نے کہا۔

"پولیس یا کمیٹی والوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟" جمشید نے اسے گھورا۔

"تم جانتے ہو انہیں مجھ پر پہلے بھی کبھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ پولیس یا کمیٹی کے پاس میرا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ ویسے بھی میں آج کل شرافت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ ریلوے اسٹیشن پر کام کرنے والے کسی شخص پر پولیس یا کمیٹی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے۔" حاجی نے کہا۔

"بہر حال۔" جمشید منصوری نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "البرز ریسٹورنٹ کے مالک فخری کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"فخری!" حاجی کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ "وہ تلاتی کا آدمی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ پولیس کے لئے بھی مخبری کرتا ہے لیکن اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ بہر حال' وہ تمہارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"مجھے بھی یہی شبہ تھا۔" جمشید کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ "میں پھر تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

جمشید منصوری جب حاجی کے مکان سے باہر نکلا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ بادل تو ویسے آج صبح ہی سے چھائے ہوئے تھے۔ دن میں ایک آدھ مرتبہ ہلکی سی بوندا باندی بھی ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت جس طرح بارش شروع ہوئی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کھل کر برسے گی۔

جمشید منصوری کا یہ اندازہ درست نکلا۔ وہ بستی سے نکل کر ریلوے لائن عبور کر کے بس ٹرمنل کی طرف آیا تو بارش خاصی تیز ہو چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑکیں اور بازار سنسان ہو گئے۔ لوگ بارش سے بچنے کے لئے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ جمشید منصوری کو ایک پرائیویٹ ٹیکسی مل گئی جس نے چند ہی منٹ میں اسے البرز ریسٹورنٹ کے سامنے اتار دیا۔ وہ جب ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو کاؤنٹر پر گنجے سر والا ایک دبلا پتلا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

ریسٹورنٹ میں کئی گاہک موجود تھے' جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ بعض عورتیں سر تا پا چادر میں لپٹی ہوئی تھیں اور بعض نے حجاب پہن رکھے تھے۔ ان دنوں ہوٹلوں میں بہت کم

عورتیں دیکھنے میں آتی تھیں۔ اور یہ عورتیں غالباً بارش سے بچنے کے لئے یہاں آگئی تھیں۔

جمشید منصوری گوشے کی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ اس نے کافی منگوائی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک شخص ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ وہ غالباً ٹیکسی یا کار سے اتر کر آیا تھا کیونکہ اس کے لباس پر بارش کے چند چھینٹے ہی پڑے تھے۔

جمشید اس شخص کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ تہران سے فرار ہونے سے پہلے جب تلاتی اس کے ساتھ کام کرتا تھا تو یہ شخص بھی تلاتی سے ملا کرتا تھا۔ اسے یہاں دیکھ کر حاجی کے اس بیان کی تصدیق ہوگئی کہ البرز ہوٹل کا مالک فخری، تلاتی کا آدمی ہے۔

وہ شخص اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ جمشید نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا زینے پر پہنچ گیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

پہلی منزل پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ وہ شخص راہداری میں دائیں طرف والے تیسرے دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔ جمشید نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ کو رکا اور پھر زوردار دھکے سے دروازہ کھول دیا۔ وہ کمرے میں داخل نہیں ہوا بلکہ دروازے ہی میں رک گیا۔ پستول اس کی جیب سے نکل کر ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔

کمرے میں پانچ افراد بیٹھے ہوئے تھے، جن میں وہ شخص بھی شامل تھا جو جمشید سے چند سیکنڈ پہلے اندر داخل ہوا تھا۔ سامنے والی کرسی پر ایک ادھیڑ عمر عورت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جمشید اسے اچھی طرح جانتا تھا، وہ طوائف تھی اور آج کل شاید روپوشی کی زندگی گزار رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" ایک آدمی پھرتی سے کرسی سے اٹھ گیا۔ اس نے جیب کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا تھا لیکن اسی لمحے جمشید کے حلق سے بھیڑیئے کی سی غراہٹ نکلی۔

"نہیں! تم کوئی حرکت نہیں کرو گے۔ اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔" اس نے پستول کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا "تم میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بصورت دیگر کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔"

"کون ہو تم؟" اس مرتبہ اس شخص نے پوچھا تھا جس کا تعاقب کرتا ہوا جمشید یہاں تک پہنچا تھا۔

"میں جمشید منصوری ہوں۔" جمشید نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں۔ تم جمشید نہیں ہو سکتے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہی شخص بولا۔

"تو میں تمہیں وہی جمشید دکھا دیتا ہوں جسے تم اچھی طرح جانتے ہو۔" جمشید نے کہا اور اپنا میک اَپ اتارنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس کی داڑھی، مونچھیں اور نقلی بال فرش پر پڑے تھے۔ "میں تلاتی کی تلاش میں آیا تھا۔" جمشید نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن وہ یہاں نظر نہیں آرہا۔ تم لوگوں سے پھر کبھی ملاقات ہوگی۔"

جمشید منصوری نے باہر نکل کر پھرتی سے دروازہ بند کر دیا اور زینے کی طرف دوڑا لیکن ابھی اس نے پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا تھا کہ نیچے دھماکے سے دروازہ کھلنے اور بھاری قدموں کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اسی لمحہ پہلی منزل کے تیسرے کمرے کا دروازہ اندر سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ جمشید نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ جوتے اتار کر پھینک دیئے اور اوپر کی طرف بھاگا۔

اوپر فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نیچے آوازوں کے شور کے درمیان سب مشین گن کی آواز گونجی۔ حملہ آوروں کا کمانڈر زور زور سے فارسی زبان میں ہدایات دے رہا تھا۔ جمشید کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کمیٹی والے تھے جنہوں نے ہوٹل پر چھاپا مارا تھا۔

جمشید منصوری تیسری منزل کی بالکونی پر لٹک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کمیٹی کے آدمی تلاتی کے آدمیوں کو گرفتار کرنے کے بعد اوپر کی تلاشی لے کر واپس چلے جائیں گے تو وہ اوپر آجائے گا۔

بارش بدستور ہو رہی تھی۔ بادلوں کی وجہ سے فضا میں تاریکی سی تھی۔ جمشید نے بالکونی کے جس کنارے پر ہاتھ ڈال رکھے تھے وہ خاصا چکنا تھا۔ اچانک بائیں ہاتھ والی ٹائل اکھڑ گئی۔ اگر وہ فوری طور پر سینٹری پائپ پر ہاتھ نہ ڈال دیتا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ اس نے دوسرا ہاتھ بھی پائپ پر ڈال دیا اور آہستہ آہستہ نیچے سرکنے لگا۔ اس کے ہاتھوں کو بُری طرح رگڑ لگ رہی تھی اور انگلیوں سے خون بھی رسنے لگا تھا۔

خوش قسمتی سے عقبی گلی میں کوئی نہیں تھا۔ وہ پائپ سے گلی میں اتر کر تیزی سے ایک طرف دوڑا۔ ابھی وہ گلی کے موڑ پر پہنچا ہی تھا کہ دوسری طرف سے دوڑتا ہوا ایک آدمی سامنے آگیا۔ اسے دیکھ کر جمشید کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ کمیٹی کا آدمی تھا۔ اس کا تعلق یقیناً کسی مسجد یا مدرسے وغیرہ سے رہا ہوگا۔ لمبی داڑھی اور سر پر سیاہ ٹوپی۔ اس کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفل بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔

چھاپا مار ٹیم کو شاید یہ پتا چل گیا تھا کہ کوئی شخص ہوٹل کے پچھلی طرف سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور یہ...... غالباً اسے روکنے کے لئے اس طرف آیا تھا۔

جمشید منصوری نے اپنے حواس بحال رکھے۔ داڑھی والا سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس پر رائفل تان رہا تھا۔ جمشید منصوری نے چھلانگ لگائی اور کسی پرندے کی طرح اُڑتا ہوا

داڑھی والے پر جاگرا۔

داڑھی والے کو فائر کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ دھکا لگنے سے رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ خود بھی لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل سڑک پر گر گیا۔ جمشید اس کے اوپر گرا تھا۔

وہ دونوں کیچڑ میں لت پت ایک دوسرے کو رگید رہے تھے۔ داڑھی والے کی عمر پینتالیس سے اوپر ہی رہی ہوگی لیکن جمشید کو دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ وہ بے حد پھرتیلا اور طاقتور تھا۔ ایک موقع پر جمشید اس کے شکنجے میں آگیا۔

داڑھی والا' جمشید کے سینے پر سوار تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جمشید کے گلے پر تھے اور انگلیوں کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جارہی تھی۔ جمشید کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی گردن کسی آہنی شکنجے کی گرفت میں آگئی ہو۔ اسے سینے میں سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ داڑھی والے کے منہ سے خرخراہٹ سی نکل رہی تھی۔ اور کف بہہ رہا تھا۔ اس نے شور مچا کر اپنے ساتھیوں کو بلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا کہ حریف کو بے بس کردے گا۔

جمشید نے دونوں پیر سمیٹ کر اس کے پیٹ پر جمادئے اور جسم کی پوری قوت مجتمع کرکے اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ داڑھی والا اس کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا چھپ کی آواز سے پشت کے بل کیچڑ میں گرا۔ جمشید نے فوراً ہی سنبھل کر اسے چھاپ لیا۔

اب جمشید' داڑھی والے کے سینے پر سوار تھا اور اس کا نرخرہ جمشید کی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔ جمشید کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ داڑھی والے کا کوئی دوسرا ساتھی اس طرف نہ آنکلے' اس لئے وہ جلد سے جلد اس سے نجات حاصل کرلینا چاہتا تھا۔

داڑھی والے کے نرخرے پر جمشید کی فولادی انگلیوں کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ داڑھی والا مزاحمت کررہا تھا لیکن پھر بتدریج اس کی مزاحمت کمزور پڑتی چلی گئی۔ اور بالآخر وہ بے حس حرکت ہوگیا۔

جمشید اسے چھوڑ کر کھڑا ہوگیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اسی لمحہ گلی کے دوسری طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جمشید نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر تاریکی میں ایک طرف دوڑ لگادی۔ وہ ایک عمارت کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اسے دیکھ لیا گیا تھا اور اس پر فائرنگ کی جارہی تھی۔ جمشید نے عمارت کی ڈیوڑھی میں چھلانگ لگادی۔

اس عمارت کا ایک گیٹ دوسری طرف تھا۔ وہ اندھا دھند دوڑتا ہوا اس طرف دوسری گلی میں نکلا اور کچھ دور تک دوڑنے کے بعد ایک اور عمارت میں داخل ہوگیا۔

گلیوں میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ کمیٹی والے اسے ہر جگہ تلاش کررہے تھے لیکن جمشید ان کی پہنچ سے دور نکل چکا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد جب وہ مصطفیٰ اسٹریٹ پر ماہ رخ کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اس کی حالت سخت ناگفتہ بہ تھی۔

O☆O

انٹیلی جنس کے سربراہ رضا آغا کے چہرے پر سخت برہمی پائی جاتی تھی۔ اسی دوران کمیٹی کا مقامی سربراہ علی جواد کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے رضا آغا کو سیلیوٹ کیا لیکن موخرالذکر نے اس کے سیلیوٹ کو نظرانداز کردیا۔

"جواد!" اس نے علی جواد... کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا "کیا تم اپنی نامعقول سرگرمیوں کی وضاحت کروگے؟"

"میں سمجھا نہیں سر!" جواد نے حیرت اور پریشان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھتے ہو۔" رضا آغا غرایا۔

"مزید وضاحت میں کردیتا ہوں۔" کرنل مصدق جلالی نے کہا۔ وہ کمرے میں بائیں طرف بیٹھا تھا۔ جواد گردن گھما کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "چیف کا اشارہ تمہاری اُن حرکتوں کی طرف ہے جو آج تم سہ پہر سے لے کر تھوڑی دیر پہلے تک کرتے رہے ہو۔ میں تمہاری ان حرکتوں کو انتہائی نامعقول' احمقانہ اور مجرمانہ سمجھتا ہوں۔"

"مجرمانہ! کیا مجرموں کی سرکوبی مجرمانہ حرکت ہے؟" علی جواد نے کہا "کرنل مصدق! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم کمیٹی کے ایک اعلیٰ افسر سے مخاطب ہو۔"

"تم میرے مشن میں رکاوٹ کا باعث بن رہے ہو علی جواد!" کرنل مصدق نے کہا "ایک انتہائی خوفناک اور چالاک ترین مجرم اس وقت تہران میں موجود ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو تمہاری کمیٹی کے گودام سے نصف ٹن سونا اور لاکھوں ڈالر مالیت کے ہیرے جواہرات لے اُڑا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق وہ ایک خاص مشن پر یہاں آیا ہے۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو انقلابی حکومت کو پہلے سے کہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ تم میرے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے بے گناہ عوام کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارتے پھر رہے ہو۔ جانتے ہو آج البرز ریسٹورنٹ میں کتنے بے گناہ تمہارے آدمیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے ہیں۔ چھ آدمی اور دو عورتیں ہلاک ہوچکی ہیں اور تقریباً ایک درجن افراد زخمی ہیں۔ یہ ایک سنگین جرم ہے۔ کمیٹی کا اعلیٰ افسر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس طرح اپنی من مانی کرکے نہ صرف عوام کی جان و مال کو نقصان پہنچاؤ بلکہ انقلابی حکومت کو بھی بدنام کرتے پھرو۔ انقلابی حکومت ظالم نہیں ہے۔ عوام کو ظلم سے نجات دلانے کے لئے آئی ہے۔ لیکن تم نے آج بہت بُری مثال قائم کی ہے۔ اور میں اپنی رپورٹ میں اس کا تذکرہ کرچکا ہوں۔"

علی جواد کے چہرے پر گھبراہٹ سی نمودار ہوگئی۔ وہ چیف رضا

آغا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ کس رپورٹ کا ذکر کیا جا رہا ہے؟"

"یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں ہر ہفتے ایک تفصیلی رپورٹ تم بھیجی جاتی ہے۔ اس مرتبہ بھی یہ رپوٹ حسبِ معمول کرنل مصدق نے تیار کی ہے اور اس کی کاپیاں تہران میں موجود متعلقہ افراد کو پہنچا دی گئی ہیں اور تم جانتے ہو کہ ان ذمے دار افراد کے امام کمیٹی سے قریبی رابطے ہیں۔ وہ کسی قسم کی بے ضابطگی یا ایسی بات برداشت نہیں کریں گے جس سے انقلابی حکومت کی نیک نامی پر حرف آتا ہو۔ یہ رپورٹ میرے تصدیقی دستخطوں کے ساتھ روانہ کی گئی ہے۔" چیف رضا آغا نے کہا۔

"ایک منٹ سر!" علی جواد نے کہا۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ کا عنصر بدستور موجود تھا۔ "میں اپنے کاموں میں بااختیار ہوں۔ آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔"

"تمہیں جمشید منصوری کی گرفتاری کے سلسلے میں تعاون کا حکم دیا گیا ہے۔" کرنل مصدق نے تلخ لہجے میں کہا "لیکن تم نے جمشید منصوری کے بارے میں ملنے والی اطلاعات کو اپنے تک محدود رکھا اور ہمیں بتائے بغیر کارروائی کر ڈالی جس سے نہ صرف متعدد بے گناہ افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے بلکہ جمشید منصوری کو بھی فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ جب تم نے البرز ریستوران پر چھاپا مارا تھا تو جمشید منصوری وہاں موجود تھا۔ اگر تم اندھا دھند فائرنگ کے بجائے حکمتِ عملی سے کام لیتے تو شاید وہ گرفتار ہو جاتا۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے آدمیوں نے واقعی کچھ عجلت سے کام لیا تھا۔ آپ فی الحال یہ رپورٹ روک دیں۔ باہمی مشورے سے مفاہمت کی کوئی راہ نکل سکتی ہے۔ کیونکہ ہمارا مقصد ایک ہی ہے۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ چیف رضا آغا نے کال ریسیو کی اور پھر ریسیور علی جواد کی طرف بڑھا دیا۔ "تمہاری کال ہے۔"

علی جواد نے ریسیور لے کر کان سے لگا لیا اور چند لمحوں تک دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور رضا آغا کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا۔ میرا خیال ہے کوئی اچھی خبر نہیں تھی؟" چیف رضا آغا نے کہا۔

"جمشید منصوری کے ہاتھوں ہمارا ایک آدمی زخمی ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے ہسپتال میں دم توڑ دیا ہے۔" جواد نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہو گا۔ جمشید انتہائی خطرناک آدمی ہے۔" چیف رضا آغا نے کہا' پھر کرنل مصدق کی طرف رخ کر کے گویا ہوا۔ "مصدق! فی الحال اپنی رپورٹ روک لو۔ جمشید منصوری انتہائی ہوشیار اور شاطر آدمی ہے۔ اس کے لئے ہمیں از سرِ نو پلاننگ کرنی ہو گی۔"

"مجھے اجازت ہے سر؟" علی جواد دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ پھر اجازت کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گیا۔

"کیا خیال ہے مصدق!" علی جواد کے جانے کے بعد چیف رضا آغا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم علی جواد پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ یہ ہمیں ڈبل کراس کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے پہلے جمشید منصوری تک پہنچنا ہو گا۔" کرنل مصدق نے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

O☆O

جمشید منصوری اپنے تیسرے بھیس میں تھا۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی تھی اور وہ پُر وقار انداز میں تہران کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ حالانکہ یہ وہ شخص تھا جس کی تلاش میں کمیٹی والے' پاسداران' پولیس اور انٹیلی جنس والے تہران کے ہر کونے میں جھانک رہے تھے۔

وہ کچھ دیر تک مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا اور پھر ایک اعلیٰ ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ ہال میں مہمانوں کی ایک معقول تعداد موجود تھی۔ چند ایسے لوگ بھی نظر آ رہے تھے جن کا تعلق موجودہ حکومت سے تھا۔ انقلاب سے پہلے اس ہوٹل کو شہر کا سب سے بڑا نائٹ کلب بھی سمجھا جاتا تھا جہاں مقامی رقاصاؤں کے علاوہ غیر ملکی رقاصائیں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد وصول کیا کرتی تھیں۔ لیکن اب اسٹیج سنسان پڑا تھا۔

جمشید منصوری بے نیازی سے چلتا ہوا کاؤنٹر کے اس حصے پر پہنچا جہاں ہوٹل کا مالک بطرس کھڑا تھا۔ وہ اپنے ایک ملازم کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ جمشید منصوری اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی' خوبصورت طلائی لائیٹر سے اسے سلگایا' ایک کش لیا اور بے نیازی سے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ جب بطرس نے ملازم کو رخصت کر دیا تو جمشید منصوری اس کی طرف مڑا۔

"مسٹر بطرس!" اس نے کہا "میری آواز سن کر اگر تم مجھے پہچان لو تو چونکنا نہیں۔"

"اوہ میرے خدا!" اس کی آواز سنتے ہی بطرس کے چہرے پر زبردست بدحواسی اور حیرت نظر آنے لگی۔

"اگر تم پُرسکون رہو تو زیادہ اچھا ہے۔" جمشید منصوری نے کہا "خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ تمہاری طرف مبذول ہو جائے گی۔"

بطرس نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پایا اور بولا' "تت۔۔۔۔۔ تم۔۔۔ جم۔۔۔ جم۔۔۔"

"نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" جمشید نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں تھوڑی دیر کے لئے یہاں آیا ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ مریم کہاں ہے؟"

"مریم اوپر ہے۔ میرے دفتر میں۔" بطرس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔ میں خود ہی اس سے مل

لیتا ہوں۔ اور دیکھو..... ذرا دھیان سے کام کرو۔ مجھے ہال میں کچھ آفیسر قسم کے لوگ بھی نظر آرہے ہیں۔"

"ہاں..... ہاں..... نظر آرہے ہیں..... بالکل نظر آرہے ہیں۔ لیکن اس طرح کھلے بندوں پھرنا تمہارے لئے بالکل مناسب نہیں ہے۔" بطرس نے کہا۔

"میرا نظریہ تم سے مختلف ہے۔ میں ہمیشہ دشمن کی ناک کے نیچے چل پھر کر کام کرتا ہوں۔ یہ جگہ سب سے زیادہ محفوظ رہتی ہے۔ او کے بطرس! میں خرم سے ملنے جارہا ہوں۔ واپسی میں شاید تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔ اس لئے خدا حافظ!"

جمشید منصوری کہتے ہوئے مڑا اور پُروقار انداز میں چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

خرم اس کا پرانا اور قابلِ اعتماد دوست تھا۔ اس نے عملی زندگی کا آغاز ایک باکسر کی حیثیت سے کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ مجرمانہ زندگی اپنالی۔ جمشید منصوری نے تہران میں جو گروہ بنایا تھا اس میں خرم اس کا دست راست تھا۔ پاسداران کے گودام سے سونے اور جواہرات کی چوری میں بھی خرم نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اسے دنیا کی دو چیزوں سے محبت ہے۔ اول دولت سے اور دوم جمشید منصوری سے۔ ان دو چیزوں کی خاطر وہ اپنی جان بھی قربان کرسکتا ہے۔ اور وہ اپنے اس دعوے میں بالکل سچا تھا۔

پہلی منزل پر پہنچ کر جمشید منصوری نے بطرس کے دفتر کے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوگیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرکے بولٹ چڑھادیا۔ جب وہ مڑا تو خرم اس کے سامنے پستول تانے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی تھی۔

"کون ہو تم....؟" اس نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا "اور اس طرح اندر کیوں آئے ہو؟"

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو معمولی سی گھبراہٹ کا مظاہرہ بھی نہ کرتا۔" جمشید منصوری نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ تم!" خرم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے پستول جیب میں رکھا اور بے اختیار جمشید منصوری سے لپٹ گیا۔

"او میرے خدا! تمہیں زندہ دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ اب کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ لیکن تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ ویسے اگر تم خاموش رہتے تو میں بھی تمہیں پہچان نہ سکتا۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو خرم کہ مجھے سکون کی زندگی پسند نہیں ہے۔ ہنگاموں کے بغیر مزہ نہیں آتا۔" جمشید منصوری نے کہا اور پھر چند رسمی باتوں کے بعد جمشید منصوری نے اسے پاکستان میں پیش آنے والے حالات مختصر طور پر بتادئے۔

"اب اس نئے منصوبے میں تمہاری شرکت بہت ضروری ہے۔" جمشید نے مزید کہا "سب سے پہلے تو کسی ایسے ٹھکانے کا انتظام کرنا ہے جہاں چند روز سکون سے گزارے جاسکیں۔"

"کل صبح تک انتظام ہو جائے گا۔" خرم نے جواب دیا۔

"اس کے علاوہ" جمشید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ پاسداران میری تلاش میں ہیں۔ کیمپ کے آدمیوں سے میری ایک جھڑپ بھی ہو چکی ہے۔ پاسداران کے علاوہ تلاتی اور انٹیلی جنس والوں کو بھی تہران میں میری آمد کی اطلاع مل چکی ہے۔ تلاتی کو تو میں زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ وہ ہمارے لئے پریشانی پیدا کرسکتا ہے لیکن اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں انٹیلی جنس کے کرنل مصدق کی طرف سے زیادہ فکر مند ہوں۔ اسے بھی غالباً میرے مشن کی بھنک مل چکی ہے۔ میں اسے اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہوں۔ میں مصدق کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ شخص ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ غیر شادی شدہ ہے اور خوبصورت لڑکیوں کا رسیا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس کا بندوبست کرنا ہے۔ اس کے لئے ہمیں ایک حسین اور نازک اندام لڑکی کی ضرورت ہوگی۔ کوئی ایسی لڑکی جو ہمارے اشاروں پر کام کرسکے۔"

"اس کے لئے ہمیں اردشیر سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔" خرم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اردشیر!" جمشید منصوری یہ نام سن کر اچھل پڑا۔ "وہ ابھی تک ایران میں موجود ہے؟"

"ہاں۔ نہ صرف موجود ہے بلکہ خوب دولت کما رہا ہے۔ ان دنوں تو اس کا بزنس کچھ زیادہ ہی چمک اٹھا ہے۔" خرم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ اس سے بات کرتے ہیں۔" جمشید منصوری نے کہا۔

"ایسا کرو تم ہوٹل کی عقبی گلی میں پہنچ جاؤ۔ وہاں میری سیاہ رنگ کی سیٹروئن کار کھڑی ہے۔ یہ چابی لے جاؤ۔ تم کار میں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" خرم نے کہتے ہوئے کار کی چابیوں والا گچھا اس کی طرف بڑھادیا۔

جمشید منصوری نے چابیاں جیب میں ڈال لیں اور کمرے سے نکل آیا۔ اس نے راہداری میں رک کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر عقبی زینے کی طرف چل پڑا۔

عقبی گلی میں اِکّادُکّا لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ ہوٹل کی عمارت کے دروازے سے نکلنے کے بعد جمشید منصوری نے محتاط نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ گلی میں تین چار کاریں کھڑی تھیں۔ دائیں طرف کچھ فاصلے پر اسے سیاہ رنگ کی ایک پرانی سی سیٹروئن بھی نظر آگئی۔ وہ نپے تُلے قدم اٹھاتا ہوا کار کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر اس نے ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا ایک چابی لگا کر لاک کھولا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ٹھیک دس منٹ بعد خرم بھی پہنچ گیا۔ اس نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھتے ہوئے انجن اسٹارٹ کیا

اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھادی۔
"میرا خیال ہے کہ تمہارے مالی حالات کچھ بہتر نہیں ہیں۔" جمشید منصوری نے کہا۔
"یہ بات شاید تم اس پرانی سی کار کو دیکھ کر کہہ رہے ہو۔" خرم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "لیکن شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ دولت کی نمائش ایران میں سب سے بڑا جرم ہے۔ نئی کار رکھنا خطرات کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ شتر بے مہار کی طرح شہر میں گھومتے ہوئے پاسداران ہر اس شخص کو پکڑ لیتے ہیں جس کے پاس قیمتی کار ہو یا جس نے قیمتی کپڑے پہن رکھے ہوں۔ میں نے اپنی پہلی کار بیچ دی تھی اور کام چلانے کے لئے یہ پرانی کار خرید لی۔ اس طرح میں ان لوگوں کی نظروں میں آنے سے بچا رہتا ہوں جو خود تو دولت سے محروم رہے اور اب دوسروں کے پاس بھی یہ چیز نہیں دیکھ سکتے۔"
جمشید منصوری جواب دینے کے بجائے گہرا سانس لے کر رہ گیا۔
کار شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتی ہوئی عباس آباد کی کشادہ سڑکوں پر نکل آئی۔ البرز کے دامن میں یہ علاقہ انقلاب سے پہلے صاحبِ ثروت لوگوں کی جنت سمجھا جاتا تھا لیکن اب وہاں ویرانی اور بربادی محوِ نظارہ تھی۔ عظیم الشان وسیع و عریض بنگلے سنسان پڑے تھے۔ کچھ عمارتوں کو انتقاماً منہدم کیا جا چکا تھا۔ اور جو باقی تھیں ان میں بھی بیشتر ویران پڑی تھیں۔ ان پُر شکوہ عمارتوں کے مکین یا تو ملک چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے یا شاہ پرستی کے الزام میں جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔
خرم کی سیٹرون ایک ویران سے بنگلے میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ وہ دونوں گاڑی سے اتر کر اندر داخل ہو گئے۔ راہداری کے آخری سرے پر گھوم کر وہ ایک تنگ اور تاریک سے کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ اسٹور روم تھا جہاں ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، کاٹھ کباڑ اور ردی اخبارات بکھرے ہوئے تھے۔
خرم نے اوندھی پڑی ہوئی دو تین ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور ایک میز اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ نیچے سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ خرم نے پہلے جمشید منصوری کو اشارہ کیا اور پھر اس کے پیچھے خود بھی تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ چند سیڑھیاں اترنے کے بعد اس نے میز کھینچ کر اس طرح رکھ دی کہ سیڑھیوں والا راستہ تقریباً چھپ گیا۔
وہ سیڑھیاں اتر کر ایک کشادہ اور نیم تاریک تہ خانے میں پہنچ گئے۔ ایک کونے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ وہیں دیوار کے قریب ایک میز بھی پڑی ہوئی تھی لیکن کسی ذی روح کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ میز کے قریب رک گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہی نجانے کس طرف سے ایک مجہول سا آدمی نکل کر سامنے آگیا۔ وہ اردشیر تھا۔

اردشیر ہر قسم کی جعلی دستاویزات اور شناختی کاغذات تیار کرنے کا ماہر تھا۔ شاہ پرست اور انقلاب کے مخالفین جان بچانے کے لئے ملک سے فرار ہو رہے تھے۔ اصل کاغذات پر سفر کرنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ایسے لوگ جعلی کاغذات کے لئے اردشیر کی خدمات حاصل کر رہے تھے۔ وہ جعلی دستاویزات اور شناختی کاغذات اس خوبصورتی سے تیار کرتا کہ ان پر جعلی ہونے کا شبہ تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔
وہ کچھ دیر تک رسمی باتیں کرتے رہے۔ پھر خرم اصل موضوع پر آگیا۔
"ہمیں ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو بے حد حسین ہو اور بلا چون و چرا ہمارا کام کر سکے۔"
"میری نظروں میں ایک ایسی لڑکی ہے۔" اردشیر نے کہا "وہ چند مہینے پہلے میرے پاس جعلی کاغذات تیار کروانے آئی تھی۔ بے حد حسین بھی ہے اور ذہین بھی۔"
"ونڈر فل" یہ لڑکی کام کی معلوم ہوتی ہے۔ ہم آج شام ہی اس لڑکی سے ملیں گے۔" جمشید نے کہا اور پھر اس لڑکی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے لگا۔

○☆○

آسمان پر اَن گنت ستارے ٹمٹما رہے تھے لیکن ان کی روشنی زمین تک پہنچنے سے قاصر تھی۔ رات تاریک تھی اور فضا میں اداسی پائی جاتی تھی۔
قشہ اپنے فلیٹ کی بالکونی میں آرام دہ کرسی پر بیٹھی آسمان کو گھور رہی تھی۔ اس کا ذہن بہت دور ماضی میں بھٹک رہا تھا۔ اس کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن کاغذات میں قشہ اردکان لکھا ہوا تھا۔ اس کا باپ یہودی اور ماں ایرانی تھی جس کا تعلق بہائی فرقے سے تھا۔ باپ بزنس مین تھا۔ اس کی طرح اور بھی بہت سے یہودی ایران میں آباد تھے۔ یہ تمام یہودی کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ایران کی معیشت انہی یہودیوں کے قبضے میں تھی۔ شاہ کی طرف سے انہیں بے شمار مراعات حاصل تھیں اور یہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ لیکن انقلاب کی آمد کے ساتھ ہی یہودیوں نے سب کچھ سمیٹ کر ملک سے بھاگنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ تو راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ انقلاب پسند عوام اور پاسداران کے ہاتھوں مارے گئے۔ قشہ کا باپ بھی انہی لوگوں میں شامل تھا جو اپنا کاروبار اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگنے کی فکر میں تھا لیکن انقلاب پسندوں کے ہاتھوں مارا گیا۔
قشہ ان دنوں اپنی ایک دوست کے پاس ہمدان گئی ہوئی تھی۔ اپنے باپ کی ہلاکت کی خبر اسے ہمدان ہی میں ملی تھی۔ وہ اسی روز واپس آنا چاہتی تھی لیکن اس کی دوست کے والدین نے اسے روک لیا۔ ہمدان میں مزید چند روز گزارنے کے بعد جب قشہ

تہران واپس پہنچی تو اسے پتا چلا کہ پاسداران اس کی ماں اور بھائی کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ اس کی ماں کا تعلق چونکہ بہائی فرقے سے تھا۔ انقلاب کے بعد یہ فرقہ بھی زیرِ عتاب آگیا تھا۔ ان کی مذہبی روایات اسلام سے متصادم تھیں۔ انہیں واشگاف الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ وہ یا تو اسلام قبول کرلیں یا ملک چھوڑ دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس فرقے کی مذہبی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ بہائی فرقے سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ ملک سے فرار بھی ہو چکے تھے اور جو ملک میں موجود تھے وہ پکڑے جانے اور جان کے خوف سے چھپتے پھر رہے تھے۔ قشہ کی ماں اور بھائی بھی گھر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن بالآخر انہیں بھی گرفتار کرلیا گیا۔

یہ اطلاع قشہ کے حواس پر بجلی بن کر گری۔ قریب تھا کہ وہ شدتِ غم سے پاگل ہو جاتی لیکن جان بچانے کے لاشعوری جذبے کے تحت اس کے حواس بحال رہے۔ اس نے بھاگ کر خانم فرح اردکان کے ہاں پناہ لی۔

فرح اردکان اس کالج میں پروفیسر تھی جہاں قشہ زیرِ تعلیم تھی۔ اس نازک اور ہنگامی صورتِ حال میں قشہ کو صرف اسی کا چہرہ نظر آیا تھا جو اسے پناہ دے سکتا تھا۔ خانم فرح اردکان نے پڑوسیوں کے سامنے اسے اپنی بھانجی ظاہر کیا اور اسے اپنے پاس رکھ لیا اور اس کا نام بھی قشہ اردکان رکھ دیا۔

خانم فرح اردکان کے ہاں پناہ لینے کے بعد قشہ نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ وہ کسی انتہائی ہنگامی ضرورت کے تحت گھر سے نکلتی' لیکن دروازے سے باہر قدم رکھنے سے پہلے چادر اس طرح اوڑھ لیتی کہ آنکھوں کے سوا اس کا پورا جسم چھپ کر رہ جاتا۔

اس وقت وہ بالکونی میں کرسی پر بیٹھی تاریک خلا کو گھورتے ہوئے گزرے ہوئے انہی واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پہلے اس نے کبھی مذہب کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور نہ ہی اسے مذہب سے کوئی دلچسپی تھی۔ لیکن انقلاب کے بعد جو کچھ ہوا یا ہو رہا تھا' اسے دیکھ کر قشہ کو مذہب سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔ بعض لوگ مذہب کے نام پر جس طرح بے گناہ لوگوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے' وہ قابلِ نفرت تھا۔ وہ سر سے پیر تک انسان تھی۔ لیکن انسان ہی اس کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔

قشہ یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ دستک اگرچہ ہلکی تھی لیکن یہ آواز قشہ کے لئے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ وہ بدحواس سی ہوگئی اور اٹھ کر بھاگتی ہوئی خانم فرح کے پاس پہنچ گئی۔ تہران میں خانم کا کوئی رشتے دار نہیں تھا اور کبھی کوئی ان کے گھر نہیں آیا تھا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی' دروازے پر دستک پہلی بار ہوئی تھی۔

"گھبراؤ نہیں' یہاں رکو میں دیکھتی ہوں کون ہے۔" خانم فرح نے اسے تسلی دی اور دروازہ کھولنے چلی گئی۔

قشہ وہیں کھڑی اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

"جی فرمایئے!" خانم فرح اردکان نے دروازے پر کھڑے ہوئے دو اجنبیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خانم فرح! ہم تمہاری بھانجی سے ملنا چاہتے ہیں۔" بولنے والا خرم تھا اور اس کا ساتھی جمشید تھا۔

"میری بھانجی گھر پر نہیں ہے۔" خانم فرح نے کہا اور پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنے لگی۔

"ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے!" جمشید منصوری دروازے میں پیر پھنساتے ہوئے بولا "او خرم! میں نے سنا ہے کہ خانم اپنے مہمانوں کو بھی دروازے سے واپس نہیں لوٹاتی۔"

پھر وہ دونوں خانم فرح کو نرمی سے ایک طرف دھکیلتے ہوئے اندر گھس گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی خرم نے دروازہ بند کر دیا۔

"تک۔۔۔ کیا تم لوگ۔۔۔ کمیٹی سے تعلق رکھتے ہو؟" خانم فرح ہکلائی۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے رقص کرنے لگے تھے اور وہ باری باری دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

دونوں میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ خرم دروازے کے پاس کھڑا رہا اور جمشید منصوری آگے بڑھ کر دوسرے کمرے میں جھانکنے لگا۔ خانم فرح کا چہرہ یکدم سفید ہو گیا تھا' جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔

جمشید منصوری دوسرے کمرے کے دروازے ہی میں رک گیا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں قشہ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا' اور ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔

جمشید منصوری کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اسے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ اتنی حسین لڑکی اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بے تکے قدم اٹھاتا ہوا قشہ کے قریب پہنچ گیا اور چند لمحے تیز تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"عجیب بات ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "مجھے دیکھ کر تمہاری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور تمہیں دیکھ کر میرا دل کانپ رہا ہے۔"

"پلیز! میری بچی کو کوئی نقصان مت پہنچانا۔" خانم فرح کمرے میں داخل ہو کر جمشید منصوری کے قدموں میں گر پڑی۔

"ہم تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" جمشید منصوری نے بے پروائی سے کہا "لیکن تمہاری یہ بچی مجھے سراسر نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس بات کا ذمے دار کون ہے؟"

خانم ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ حیرت سے جمشید منصوری کو گھورے جا رہی تھی۔ اس کے دماغ میں تیز سنسناہٹ سی ہو رہی تھی لیکن پھر بتدریج اس کی کیفیت معمول پر آتی چلی گئی۔

اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان لوگوں کا تعلق پولیس یا پاسداران سے نہیں ہے۔ اس نے قشہ کی طرف دیکھا۔ اس کی ٹانگوں کی کپکپاہٹ بھی کسی حد تک کم ہو گئی تھی اور چہرے کی رنگت بھی اب آہستہ آہستہ لوٹ رہی تھی۔

"تم.... تم کون ہو؟" خانم فرح نے جمشید منصوری کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ اس مرتبہ اس کے لہجے میں کسی حد تک اعتماد کا عنصر موجود تھا۔

"ہم صلح پسند لوگ ہیں خانم!" جمشید منصوری نے کہا "تم ہمیں اپنا دوست سمجھ سکتی ہو۔ تمہیں ہم سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔" پھر وہ قشہ کی طرف گھوم گیا۔ "تم یہودی ہو اور خانم فرح اردکان سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

قشہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے دماغ میں ایک بار پھر سنسناہٹ ہونے لگی اور آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔

"لیکن ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" جمشید منصوری نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "ہمارا پولیس یا پاسداران سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ہم تو پاسداران کے دشمن ہیں۔ ہمیں ایک اہم معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"مم.... میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔" قشہ نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ اس کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

"چہرے کی طرح تمہاری آواز بھی خوبصورت ہے۔" جمشید منصوری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر جیب سے کرنل مصدق کی تصویر نکال کر دکھاتے ہوئے بولا "اس شخص کا نام مصدق جلالی ہے اور یہ انٹیلی جنس میں کرنل کے عہدے پر فائز ہے۔ یہ خوبصورت لڑکیوں کو بہت پسند کرتا ہے۔ تمہیں چند روز کے لئے اس کے ساتھ دوستی کرنی ہو گی۔"

یہ سنتے ہی قشہ اس طرح اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا اور ایک بار پھر خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔

"نہیں، نہیں...... آج تک کسی غیر مرد نے میرے جسم کو نہیں چھوا۔ کجا یہ کہ میں ایک فوجی آفیسر کی آغوش میں چلی جاؤں۔ یہ نہیں ہو سکتا، میں اس ذلت پر موت کو ترجیح دوں گی۔ میں سخت نفرت کرتی ہوں ان لوگوں سے۔ انہوں نے میرے باپ کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا اور میری ماں اور بھائی کو گرفتار کر لیا۔ نہ جانے ان دونوں پر کیا گزری ہو گی، میں کسی ایسے شخص کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی جو......"

"اگر تم تعاون نہیں کرو گی تو......" جمشید منصوری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سرد لہجے میں کہا "تو میں پاسداران یا انٹیلی جنس کو فون پر صرف یہ بتاؤں گا کہ تم یہودی ہو اور تمہارے کاغذات جعلی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ تمہارے ساتھ ہو گا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ تم نے صرف یہ سنا ہے کہ تمہارے باپ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا لیکن یہ نہیں جانتیں کہ موت سے پہلے اسے کیسی کیسی اذیت اٹھانا پڑی تھی۔ انٹیلی جنس اور پاسداران اپنے مخالفین کو اذیت پہنچانے کے ایسے ایسے طریقے جانتے ہیں کہ شیطان بھی کانپ اٹھے۔ وہ تمہارے اس خوبصورت جسم کا تار تار اس طرح الگ کریں گے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ تمہیں موت سے ہمکنار کرنے سے پہلے وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح تم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ لیکن اگر ہمارا ساتھ دو گی تو تمہیں صرف ایک ذلت برداشت کرنا پڑے گی اور جب تمہاری اس ذلت کے نتیجے میں اس انقلابی حکومت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا تو تم اپنی ساری تکلیف بھول جاؤ گی۔ بولو۔ کیا خیال ہے؟"

قشہ پر سکتہ سا طاری تھا، وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی کہ انکار کی صورت میں یہ شخص پاسداران کو اس کے بارے میں اطلاع کر دے گا اور پاسداران اس کا جو حشر کرتے اس کے تصور ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ دوسری طرف اسے صرف ایک رسوائی اٹھانی تھی، جس کے نتیجے میں بقول اس شخص کے اس انقلابی حکومت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا جس نے اس کا سب کچھ اس سے چھین لیا تھا۔ اور انقلابی حکومت کا یہ نقصان اس کے زخموں پر مرہم ثابت ہو سکتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں تمہارے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہوں" اس کے ہونٹوں سے مُردہ سی آواز نکلی۔

"مجھے افسوس ہے" جمشید کے چہرے پر افسردگی سی آ گئی "کہ میں تمہیں اپنے مقصد کے لئے استعمال کر رہا ہوں" اس نے قشہ کے چہرے پر نظریں جما دیں "اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میں تمہیں اپنے لئے منتخب کرتا۔ تم بے حد حسین اور بہت معصوم ہو۔"

قشہ بستر پر گر کر سسکیاں لینے لگی۔

"خدا حافظ۔" جمشید منصوری دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولا "تفصیلی گفتگو کے لئے پھر آؤں گا۔"

وہ خرم کے ساتھ فلیٹ سے نکلا اور عمارت سے باہر آکر تاریکی میں غائب ہو گیا۔

خانم فرح اردکان، قشہ کے قریب آ گئی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ قشہ اٹھ کر خانم فرح سے لپٹ گئی۔ اس کی سسکیاں بلند ہو گئی تھیں۔

O☆O

تہران کی گھڑیاں رات کے نو بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔

کرنل مصدق جلالی کھانا کھانے کے بعد اپنے بیڈ روم کی طرف جا رہا تھا کہ اس کے اردلی نے کسی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع دی۔

کرنل مصدق کی بھویں سکڑ گئیں۔ وہ آج دن بھر کی بھاگ دوڑ سے بُری طرح تھک گیا تھا اور آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت کسی ملاقاتی کی آمد اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک سیاہ کار کھڑی تھی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر دروازے میں آگیا۔ کار کا ڈرائیور اسے دیکھ کر مستعدی سے آگے بڑھا اور سلام کرنے کے بعد جیب سے ایک رقعہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ مصدق نے رقعہ کھول کر پڑھا تو اس کی پیشانی کی شکنیں گہری ہو گئیں۔ کاغذ پر مختصری عبارت تحریر تھی۔

"میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔
یہ رقعہ پڑھتے ہی اس شخص
کے ساتھ آجاؤ۔"

رضا آغا!

رضا آغا کی طرف سے اس طرح اچانک طلبی کرنل مصدق کے لئے حیرت انگیز تھی۔ اس نے پیغام بر سے کچھ پوچھنا چاہا مگر پھر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ اسے روک کر اندر آگیا' لباس تبدیل کیا اور واپس آکر سیاہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد کار ہوٹل کیموز انٹرنیشنل کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اس اٹھارہ منزلہ خوب صورت ہوٹل کی آخری منزل پر گھومنے والا ریستوران' سولویں منزل پر کشادہ اوپن پارک اور دوسری منزل پر ڈائننگ ہال تھا۔

یہ ہوٹل ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ انقلاب کے بعد جب دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے شاہ کے پروردہ یہودیوں کے لئے یہ زمین تنگ ہو گئی تو وہ لوگ اس ملک سے فرار کی راہیں تلاش کرنے لگے۔ ہوٹل کیموز انٹرنیشنل کا یہودی مالک بھی سب کچھ چھوڑ کر ملک سے فرار ہو گیا اور یہ ہوٹل ان دنوں پاسداران کے قبضے میں تھا۔

انٹیلی جنس کا ایک آفیسر باہر ہی منتظر کھڑا تھا۔ اس نے لپک کر دروازہ کھول دیا اور کرنل کی رہنمائی کرتا ہوا ایک بند ہال نما کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ کرنل مصدق کو حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس کے چیف رضا آغا نے ملاقات کے لئے اس ہوٹل کا انتخاب کیوں کیا تھا جب کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پاسداران اس عمارت کو اپنے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

ہال نما کمرے کے دروازے پر انٹیلی جنس کے دو آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے کرنل کو دیکھتے ہی جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور کرنل مصدق اندر داخل ہو گیا۔

وہ ایک آراستہ کمرا تھا۔ داہنی جانب صوفوں پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک انٹیلی جنس کا چیف رضا آغا تھا' جب کہ باقی دو آدمی مصدق کے لئے اجنبی تھے۔ لیکن ان کے چہرے اور بالوں کی مخصوص تراش بتا رہی تھی کہ ان کا تعلق فوج سے ہے۔ کرنل مصدق نے تینوں کو سلام کیا اور مؤدب کھڑا ہو کر احکامات کا انتظار کرنے لگا۔

"بیٹھو مصدق!" رضا آغا نے کہا "یہ ایک نجی ملاقات ہے۔ پروٹوکول کی ضرورت نہیں ہے۔"

کرنل مصدق ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ رضا آغا نے ان دو آدمیوں کا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ مصدق کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"مصدق! تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ایران اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ہم اس کی سلامتی کے لئے جو کوشش کر رہے ہیں اس میں امید بھی ہے اور خلوص بھی۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

"یس سر! بخوبی سمجھ رہا ہوں" کرنل مصدق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہم نے جو منصوبہ بنایا ہے اس پر عمل کرنے کا وقت قریب آچکا ہے۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کی صورت حال کیا ہے۔ جمشید منصوری کا کچھ پتا چلا؟" رضا آغا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"آج دو مشتبہ آدمیوں کو عباس آباد کے ایک بنگلے میں جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہ بنگلا ایک ایسے شخص کی ملکیت ہے جس کے شاہ کی فیملی سے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ شاہ کے فرار ہونے کے دو دن بعد وہ شخص بھی جعلی کاغذات کے ذریعے اپنے بیوی بچوں سمیت ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسی شام کچھ لوگوں نے اس بنگلے پر ہلا بول دیا اور پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی بنگلے کا سازو سامان لوٹ لیا گیا۔ وہ بنگلا کافی عرصے سے خالی پڑا تھا لیکن کچھ دنوں سے وہاں کچھ پُراسرار قسم کی سرگرمیاں دیکھی جا رہی ہیں۔ آج دو مشتبہ آدمی سیاہ رنگ کی ایک سیٹرون کار پر وہاں آئے تھے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک بنگلے میں رہے۔ شام کو ایک اور اطلاع ملنے پر میں نے اس بنگلے پر چھاپا مارا لیکن بنگلا خالی تھا۔ ایک کمرے میں ٹوٹا ہوا فرنیچر اور کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ اس کمرے میں تہ خانے کا راستہ بھی ہے لیکن تہ خانے سے بھی کچھ نہیں ملا۔ بنگلے میں آنے والی سیاہ رنگ کی سیٹرون کا نمبر اگرچہ نہیں دیکھا جا سکا تھا لیکن میرے آدمی اس کار کو تلاش کر رہے ہیں۔"

"احمقانہ بات ہے" رضا نے کہا "اس شہر میں سیاہ رنگ کی درجنوں سیٹرون کاریں موجود ہوں گی" وہ چند لمحے خاموش رہا' پھر بولا "جمشید منصوری کا ہمارے ہاتھ آنا بہت ضروری ہے۔ اسے تلاش کرو۔ اگر علی جواد تم سے پہلے اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں سر؟" کرنل مصدق نے جواب دیا۔

"لیکن بہت ہوشیاری سے قدم اٹھانا۔ ہمارا دوسرا منصوبہ متاثر نہیں ہونا چاہئے" رضا آغا نے کہا۔

"دوسرا منصوبہ؟"

"میرا اشارہ اس گفتگو کی طرف ہے جو ہمارے درمیان باغِ ملت پارک میں ہوئی تھی۔"

"او سمجھا! آپ فکر نہ کریں سر!" کرنل مصدق نے کہا۔

اس کے بعد وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک مزید گفتگو کرتے رہے۔ اس مرتبہ وہ دونوں آدمی بھی گفتگو میں شریک تھے۔

کرنل مصدق جب ہوٹل سے باہر نکلا تو دس بج چکے تھے۔ اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے چیف رضا آغا نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ بے حد خطرناک تھا اور مصدق کے خیال میں اس میں کامیابی کے امکانات کم اور خطرات زیادہ تھے۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ شاید ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکے۔

ڈرائیور نے اسے دیکھ کر کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن کرنل مصدق اسٹیئرنگ سائیڈ والے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

"تم جاؤ۔ گاڑی میں خود ڈرائیو کروں گا" اس نے کہا۔

ڈرائیور پچھلی سیٹ کا دروازہ بند کر کے مودبانہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔ کرنل مصدق نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور اسے ہوٹل کی حدود سے نکال لے گیا۔

کرنل مصدق اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اور یہ بے چینی رضا آغا کا منصوبہ سن کر پیدا ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ وہ اپنا دھیان بٹانا چاہتا تھا تاکہ ذہن سکون پذیر ہو سکے۔ یہی سوچ کر اس نے گاڑی رنڈ سینما کے سامنے روک لی جہاں آج کل انقلاب کی کہانی اسٹیج پر تمثیل کی صورت میں دکھائی جا رہی تھی۔

انقلاب کے بعد تہران کے تمام سینما ہاؤس بند ہو چکے تھے۔ کچھ عرصہ تک تو یہ سینما ہاؤس ویران رہے لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کی رونق لوٹنے لگی۔ لیکن ان سینماؤں میں چلنے والی فلمیں پہلی فلموں سے مختلف تھیں۔ اب ایسی فلمیں دکھائی جاتی تھیں جن کے ذریعے دیکھنے والوں کو درس دیا جاتا تھا۔ بعض سینما ہاؤس تھیٹر میں بدل گئے تھے، جہاں تمثیل اور زندہ جاوید کرداروں کے ذریعے لوگوں کو انقلاب کی کہانی بتائی جاتی تھی۔

کرنل مصدق باکس میں بیٹھا تو ہال کی روشنیاں بجھ گئیں اور اسٹیج خوب صورت رنگ برنگی روشنیوں میں نہا گیا۔ پروگرام شروع ہونے سے قبل بائیں طرف والے باکس کا دروازہ کھلا اور کچھ نسوانی آوازیں سنائی دیں۔ کرنل مصدق نے بے خیالی میں سر گھما کر دیکھا تو پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہاں حسن و رعنائی کا ایک مجسمہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر مصدق کے سینے میں ہلچل سی مچ گئی۔ اتنی خوب صورت اور معصوم چھوکری اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اسٹیج پر پروگرام جاری تھا لیکن کرنل مصدق کو اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ تو بار بار مڑ کر اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے پہلی ہی نظر میں اس کا سکون برباد کر دیا تھا۔

پروگرام ختم ہو گیا۔ ہال کی بتیاں جل گئیں۔ شائقین سیٹوں سے اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے باہر نکلنے لگے۔ کرنل مصدق کو سارے پروگرام کے دوران حسن و جمال کی وہ دیوی پریشان کرتی رہی تھی جو ساتھ والے باکس میں بیٹھی تھی۔ اس نے اس کے سینے میں آگ سی لگا دی تھی۔

پروگرام کے اختتام پر جب وہ باکس سے باہر نکل رہا تھا تو لڑکی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ لڑکی کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا۔

جب وہ لابی میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ لڑکی بھی لابی میں پہنچ کر رک گئی۔ اس کے چہرے پر الجھن سی نظر آ رہی تھی۔ کرنل مصدق کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ اکیلی تھی اور اس کے پاس سواری نہیں تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس قدر حسین اور جوان لڑکی رات کے وقت اکیلی گھر سے باہر کیسے آ گئی تھی۔ اس نے اگرچہ چادر اوڑھ رکھی تھی لیکن اس کا چہرہ برہنہ تھا۔

لڑکیوں کے معاملے میں کرنل مصدق دوسرے مردوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ حسین لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگتی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے کبھی اپنے رتبے کا خیال بھی نہیں رکھا تھا۔ اس وقت تو وہ ویسے بھی سادہ لباس میں تھا۔ عام لوگ اسے نہیں پہچانتے تھے۔ وہ ٹہلتا ہوا لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو!" اس نے خوش گوار لہجے میں کہا "شاید تمہارے پاس سواری نہیں ہے اور تم اکیلی بھی ہو۔"

"جج.... جی!" لڑکی نے کہتے ہوئے چادر اس طرح درست کر لی کہ آنکھوں کے سوا اس کا چہرہ چھپ گیا "اوہ! کوئی بات نہیں۔ میں ٹیکسی کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"میری ٹیکسی حاضر ہے۔"

"آ.... آپ ٹیکسی ڈرائیور تو نہیں لگتے!" لڑکی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ لوگوں کے لئے بننا پڑتا ہے۔ آؤ.... تمہیں چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔" کرنل مصدق نے کہا۔

"جی شکریہ! میں ٹیکسی میں چلی جاؤں گی" لڑکی نے جواب دیا۔

"دیکھو، رات کا وقت ہے۔ تم جیسی حسین اور جوان لڑکی اگر بدمعاشوں کے ہاتھ نہ لگی تو پاسداران کی نظروں سے نہیں بچ سکے گی۔ وہ تمہیں بے حیائی کے الزام میں گرفتار بھی کر سکتے ہیں۔ اس طرح تم اچھی خاصی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ آؤ، میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

لڑکی نے کچھ تامل کیا پھر اس کے ساتھ کار میں جا بیٹھی۔

"خانم کا گھر کہاں ہے؟" کرنل صدق نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں ریلوے اسٹیشن کے دوسری طرف شہر کے زیریں علاقے میں رہتی ہوں" لڑکی نے جواب دیا۔

صدق نے کار کو گیئر میں ڈال دیا اور کار ایک ہلکے سے جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے' پھر کرنل نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام صدق جلالی ہے۔ انٹیلی جنس میں کرنل ہوں۔ خانم کو کس نام سے پکاروں؟"

"میرا نام قشہ ہے.... قشہ اردکان" لڑکی نے اپنا نام بتایا۔

"تم بہت حسین ہو" صدق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بے حد حسین اور بہت معصوم! تم جیسی حسین لڑکیاں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ بلکہ یہ کہوں گا کہ تم پہلی لڑکی ہو جسے قدرت کا حسین ترین شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ آؤ تھوڑی دیر کسی کیفے میں بیٹھتے ہیں۔ نجانے کیوں تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

کرنل صدق نے کہتے ہوئے گاڑی کی رفتار کم کردی اور آخر کار اسے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک دیا۔ دونوں کار سے اتر کر ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ ریسٹورنٹ میں گاہکوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ کوئی عورت نظر نہیں آرہی تھی۔ کرنل صدق' قشہ کو لے کر کونے کی ایک میز پر بیٹھ گیا اور ویٹر کو کافی کے لئے کہہ دیا۔ اور پھر اس کے کہنے پر قشہ نے چہرے سے چادر ہٹادی۔ کافی پیتے ہوئے کرنل صدق اس کے حسن کی تعریفیں کرتا رہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ریسٹورنٹ سے اٹھ گئے۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ ان کی کار ریلوے اسٹیشن کے دوسری طرف جیسے ہی ایک سڑک پر مڑی' تین چار آدمیوں نے انہیں روک لیا۔ صدق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پاسداران تھے۔ ان میں دو داڑھی والے تھے اور ان دونوں کی عمریں چالیس کے لگ بھگ تھیں جب کہ دوسرے دو نوجوان تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ وہ رائفلیں سنبھالے سڑک کے عین وسط میں کھڑے تھے۔ سڑک کے کنارے سفید رنگ کی ایک نئی مرسڈیز کھڑی تھی۔

"تم کون ہو' یہ عورت کون ہے اور اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟" ایک داڑھی والے نے کرنل صدق کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں انٹیلی جنس کا کرنل صدق جلالی ہوں۔ یہ میری عزیزہ ہے اور اسے گھر چھوڑنے جارہا ہوں" کرنل صدق نے بارعب لہجے میں جواب دیا۔

"کاغذات دکھاؤ" داڑھی والے نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"کیا؟" صدق چیخ اٹھا۔

"کاغذات دکھاؤ۔ اور یہ بھی بتاؤ کہ اس عورت سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔" داڑھی والا بولا۔ اس پر کرنل کے چیخنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

پاسداران نے انہیں رائفلوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ نوجوان خاموش تھے جب کہ دونوں داڑھی والے بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو کرنل صدق کو گرفتار کرنے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ ممکن ہے وہ لوگ انہیں واقعی گرفتار کر بھی لیتے کہ کمیٹی کا مقامی سربراہ علی جواد اپنے دو تین آدمیوں کے ساتھ پیٹرولنگ کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور اس طرح ان ملاؤں سے ان کی جان چھوٹ سکی تھی۔

قشہ نے اپنے گھر سے دور ہی گاڑی رکوالی۔ وہ کرنل صدق کو اپنے گھر تک نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے کرنل صدق اس سے اگلی شام ملاقات کا وعدہ لے چکا تھا۔

ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد قشہ جب اپنے فلیٹ میں پہنچی تو جشید منصوری کو اپنا منتظر پایا۔ سینما ہاؤس میں کرنل صدق سے قشہ کی ملاقات محض کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں تھی۔ خرم شام ہی سے کرنل صدق کی نگرانی کر رہا تھا اور جب کرنل صدق ہوٹل کیمبوز میں داخل ہوا تھا تو اس نے ٹیلی فون پر جشید منصوری کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ جشید' قشہ کو لے کر ہوٹل کے قریب پہنچ گیا اور گاڑی میں بیٹھا صدق کے ہوٹل سے برآمد ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اور جب کرنل صدق ہوٹل سے نکلنے کے بعد سینما ہاؤس میں داخل ہوا تو جشید' قشہ کو وہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس نے قشہ کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ قشہ کو سینما کے سامنے چھوڑ کر وہ اس کے فلیٹ میں بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

قشہ نے اسے کرنل صدق سے ملاقات کی ساری تفصیل بتادی اور یہ بھی بتایا کہ صدق نے اسے کل پھر بلایا ہے۔

"گڈ!" جشید منصوری مسکراتے ہوئے بولا "معاملہ میری توقع کے عین مطابق جارہا ہے۔"

"پلیز! مجھ پر رحم کرو" قشہ ایک دم سسکیاں لینے لگی "میری پیشانی پر رُسوائی کا یہ داغ نہ لگاؤ۔ میں نے نہایت صاف ستھری اور شریفانہ زندگی گزاری ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ سوچا تھا کہ کسی ایک کی ہو کر ساری زندگی گزاروں گی۔ مجھے ایسے کاموں سے سخت نفرت ہے۔ مجھے قتل کردو' میرا گلا گھونٹ دو مگر اس کام پر مجبور مت کرو۔ آج جب وہ بدمعاش مجھے گھور رہا تھا تو مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ کل جب وہ مم.... میرے.... میرے جسم کو..... اوہ میرے خدا! میں کیا کروں' میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

جشید منصوری پتھر نہیں انسان تھا۔ قشہ کی گریہ وزاری سے اس کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی لیکن وہ جس مقصد کے لئے کام کر رہا تھا اس کے لئے یہ قربانی ناگزیر تھی۔

"دیکھو قشہ!" وہ اس سے نظریں چُراتے ہوئے بولا "کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے کچھ قربانی دینا پڑتی ہے۔ تم اپنے باپ کے قتل اور اپنے گھر کی بربادی کا انتقام لینا چاہتی ہو۔ اس کے لئے تمہیں ایک اچھا موقع ملا ہے۔ ویسے مجھے تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔"

"کیا تمہیں پورے تہران میں کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی؟" خانم فرح نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "اس شہر میں درجنوں طوائفیں ایسی ہیں جو چند ٹکوں کی خاطر تمہارا ساتھ دینے پر تیار ہو جائیں گی۔"

"یہ کام کوئی طوائف نہیں کر سکتی" جمشید نے جواب دیا۔ "مجھے ایک بے حد حسین، سیدھی سادی گھریلو لڑکی کی ضرورت تھی اور قشہ سے بہتر کوئی لڑکی نہیں مل سکتی۔ طوائف تو دور سے ہی پہچان لی جاتی ہے۔ اور سنو قشہ!" وہ قشہ کی طرف متوجہ ہو گیا "کہیں خود کشی مت کر بیٹھنا، تم تو مرجاؤ گی مگر تمہاری یہ محسنہ خانم فرح اردکان بہت بڑی مصیبت میں پھنس جائے گی۔ اور تم جانتی ہو کہ خانم فرح اس عمر میں کوئی زیادتی یا تشدد برداشت نہیں کر سکتی۔" اس نے قشہ کا کندھا تھپتھپانے کی کوشش کی مگر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

"اپنا ہاتھ میرے جسم سے دور ہی رکھو!" وہ چیخی۔

جمشید منصوری کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"تم خاصی مختلف لڑکی ہو" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "لیکن تمہیں حالات کے ساتھ قدم ملا کر چلنا چاہئے۔"

"میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہارے حالات پر" قشہ نے نفرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"یہ بھی اچھی بات ہے۔ یہ ماحول اسی قابل ہے کہ اس پر لعنت بھیجی جائے۔" جمشید کہتے ہوئے اٹھ گیا "اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ کل کرنل مصدق سے ضرور ملنا۔ اور ایک بات ذہن میں رکھنا کہ میرے آدمی چوبیس گھنٹے تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔"

جمشید منصوری چلا گیا اور قشہ، خانم فرح سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

وہ رات کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزری۔ ایک ایک لمحہ قشہ کے لئے بے حد اذیت ناک ثابت ہو رہا تھا۔ آنے والے وقت کے خیال سے وہ بار بار کانپ اٹھتی۔ اس نے کئی مرتبہ خود کشی کے بارے میں سوچا لیکن ہر مرتبہ خانم فرح کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔ خانم فرح نے اسے پناہ دے کر نئی زندگی دی تھی۔ وہ اسے دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ خانم فرح کا بوڑھا جسم تشدد برداشت نہیں کر سکے گا۔

دوسرا دن بھی گزر گیا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر آج وہ کرنل مصدق سے نہ ملی تو وہ اسے تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ پولیس اور پاسداران سے زیادہ خطرناک۔ وہ اسے تلاش کئے بغیر نہیں رہے گا۔ اور جب اسے قشہ کی اصلیت کا پتا چلے گا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکے گی۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے قشہ نے جمشید منصوری کی ہدایات پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر اس رات وہ کرنل مصدق کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ کھانا بے حد شاندار اور لذیذ تھا لیکن قشہ کو ذرا بھی رغبت نہیں تھی۔ اس کی طبیعت اندر سے بجھی ہوئی تھی اور دل زار و قطار رو رہا تھا۔

کھانے کے بعد کرنل مصدق نے اسے اپنی رہائش گاہ تک چلنے کے لئے کہا تو وہ انکار نہ کر سکی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ کرنل مصدق کی خواب گاہ میں بے بس پڑی تھی۔ اس نے نہ تو کوئی مزاحمت کی تھی اور نہ ہی تعاون۔ اس کی حالت اس بکری کی سی تھی جو قصائی کی چھری تلے خوفزدہ پڑی ہو۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں تاریکی میں سیدھے لیٹے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ اس وقت دونوں کے خیالات کی رو بالکل مختلف تھی۔

کرنل مصدق کی سوچ میں اب کسی قدر حقیقت پسندی آگئی تھی۔ اب وہ اس پہلو پر غور کر رہا تھا کہ اس کی خواب گاہ میں قشہ کی موجودگی کسی سازش کا نتیجہ تو نہیں تھی۔ یہ سوچ کر وہ بستر سے اٹھا، نشست گاہ میں جا کر صوفے پر رکھا ہوا قشہ کا پرس اٹھا کر کھولا، شناختی کاغذات چیک کئے پھر فون پر اپنے ایک ماتحت کا نمبر ملانے کے بعد اسے ہدایت دینے لگا۔

ایک گھنٹے بعد اس کے ماتحت نے فون کر کے اس کے سوال کا جواب دے دیا جسے سن کر اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

O☆O

میدان فردوسی کے بارونق بازار میں واقع جنرل اسٹور کے پچھلے کمرے میں بیٹھا ہوا کمال اپنے سامنے کاغذات پھیلائے کسی حساب کتاب میں مصروف تھا۔ اسی لمحہ اسٹور میں کام کرنے والا ایک ملازم اندر داخل ہوا اور دو ملاقاتیوں کی آمد کی اطلاع دی۔

"انہیں اندر بھیج دو" کمال نے کہا اور دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔

"ہیلو کمال!"

آواز سن کر کمال نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک خرم تھا جسے اس نے فوراً پہچان لیا۔ البتہ دوسرا شخص کچھ اجنبی سا لگا۔ لیکن جب وہ بولا تو کمال اچھل پڑا۔

"جمشید تم!" اس نے حیرت سے کہا "یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟"

"آج کل یہی مشغلہ ہے" جمشید نے جواب دیا "ہر دوسرے تیسرے روز ایک نیا بھیس اپنانا پڑتا ہے۔ تہران کی سڑکیں اور گلیاں میری دشمن ہو گئی ہیں۔"

"تم تو ایران سے فرار ہو گئے تھے اور سنا تھا کہ تمہیں پاکستان

میں گرفتار کر کے متعدد سنگین الزامات کے تحت طویل سزا بھگتنے کے لئے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ واپس کب آئے؟" کمال نے کہا۔

"یہ سب کچھ مت پوچھو۔ بڑی طویل کہانی ہے۔ کبھی فرصت ملی تو بتاؤں گا۔ اس وقت میں ایک خاص کام کے سلسلے میں تمہارے پاس آیا ہوں" جمشید بولا۔

"میں دل و جان سے حاضر ہوں" کمال مسکرا دیا۔

"تم تلاتی کے لئے بھی تھوڑا عرصہ کام کر چکے ہو؟" جمشید نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ تمہارے گروہ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ میں نے چند مہینے ہی اس کے ساتھ کام کیا تھا پھر الگ ہو گیا اور یہ دکان کھول لی۔ اس وقت سے میں کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث نہیں ہوا۔ تلاتی سے ملے ہوئے بھی عرصہ بیت چکا ہے۔"

"تعلقات کیسے ہیں؟" جمشید نے پوچھا۔

"ملاقات ہو گی تو بہت اچھے طریقے سے ملے گا" کمال نے کہا۔

"تم جانتے ہو اس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا" جمشید نے کہا۔

"ہاں۔ اور مجھے اس کی ذہنیت پر افسوس بھی ہوا تھا" کمال بولا۔

"میں ایک خاص مشن پر تہران آیا ہوں۔ اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتا۔ لیکن تلاتی کو میرے اس مشن کی بھنک مل گئی ہے۔ جب میں زاہدان سے یہاں آ رہا تھا تو اس نے کرمان کے قریب میرے ایک آدمی منوچہر کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا۔ اب تلاتی تہران میں موجود ہے۔ وہ میرے لئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ انٹیلی جنس اور پاسداران والے بھی شہر بھر میں میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ تلاتی کی وجہ سے میری پریشانیاں بڑھ گئی ہیں۔ سب سے پہلے میں اس کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟" کمال نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

جمشید منصوری چند لمحے خاموش رہا اور پھر اُسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔

"سمجھ گئے؟" جمشید منصوری نے آخر میں کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا "لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اگر تم نے دھوکا دینے کی کوشش کی تو تمہیں دنیا کے کسی گوشے میں مجھ سے پناہ نہیں ملے گی۔"

"مطمئن رہو" کمال نے جواب دیا "آدمی کسی کو دھوکا اسی وقت دیتا ہے جب اسے دولت کا لالچ ہو یا جان کا خوف۔ اور مجھے نہ تو دولت کا لالچ ہے اور نہ ہی تمہاری طرف سے جان کا خوف۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر کل رات میں تمہارے پیغام کا انتظار کروں گا۔" جمشید کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی خرم نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ کمال نے انہیں وہیں سے ہاتھ ملا کر رخصت کر دیا۔ دروازے تک ان کے ساتھ آنا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے اس فعل سے اخلاقی قدروں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ ان میں سے کوئی بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

اندرونی کمرے سے نکل کر وہ دونوں اسٹور میں رک گئے۔ اس وقت اسٹور میں کوئی گاہک نہیں تھا۔ لیکن اسی لمحے تین چار گاہک دُکان میں داخل ہوتے ہوئے نظر آئے۔ ان میں دو چادر پوش عورتیں تھیں' ایک مرد اور ایک کمسن بچہ جسے مرد نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔

جمشید منصوری ایک لمحہ کو دکان میں رکا اور پھر خرم کو اشارہ کرتا ہوا دکان سے باہر نکل گیا۔ خرم کی گاڑی دکان سے چند گز دور کھڑی تھی۔

اس وقت شام کے آٹھ بجے تھے۔ سڑکوں پر بتی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ بازاروں میں اگرچہ لوگوں کی آمد رفت تھی' دکانیں بھی سامان سے سجی ہوئی تھیں مگر ان سجی ہوئی دکانوں اور لوگوں کی آمدورفت میں رونق کا تصور نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر شخص اپنی حرکات و سکنات اور گفتگو کے معاملے میں بہت محتاط ہو۔ بعض لوگ تو بار بار چونک کر اس طرح پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے جیسے انہیں اپنے تعاقب کا شبہ ہو۔

خرم کی سیاہ سیٹرون وسیع و عریض چوراہے' میدان فردوسی پر گھوم کر دائیں طرف ایک کشادہ سڑک پر نکل آئی۔ چوراہے پر ایران کے عظیم شاعر فردوسی کا مجسمہ نصب تھا' جس کے ایک ہاتھ میں شاہنامہ تھا اور ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ۔

شہنشاہ کے عہد میں سارے تہران میں چوراہوں پر مختلف لوگوں کے مجسمے نصب تھے۔ ان میں زیادہ تر خود شاہ اور اس کی ملکہ اور بچوں کے مجسمے تھے۔ اور بہت سے مجسمے اس کے پیشرو بادشاہوں اور آباؤ اجداد کے بھی تھے۔ مہرآباد ائرپورٹ سے شہر آتے ہوئے سب سے پہلے چوراہے پر معزول شاہ کے باپ کا مجسمہ نصب تھا' جو بلندی' چوڑائی اور حسن و رعنائی میں اپنی مثال آپ تھا۔ لیکن انقلاب کے بعد تہران کے چوراہوں سے مجسموں کو صاف کرنے کی مہم کا آغاز اسی مجسمہ کی شکست و ریخت سے ہوا اور اس وقت کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس آیت اللہ خلخالی نے پہلا ہتھوڑا مار کر اس کی توڑ پھوڑ کا آغاز کیا تھا۔ اور پھر یہ سلسلہ اس طرح چل نکلا کہ شہر کے سارے مجسمے زمین بوس ہو گئے۔ صرف فردوسی کا یہ مجسمہ جوں کا توں رہنے دیا گیا تھا۔ اس واحد مجسمے کو دیکھ کر ایرانی قوم کے روایت پسند ہونے اور اپنے شاعروں فنکاروں کے قدردان ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

سیاہ سیٹرون ایک اور سڑک پر مڑ گئی۔ یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ اس کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔ زیادہ دکانیں صرافوں کی تھیں' صراف موجود تھے مگر دکانوں میں مال برائے نام تھا۔

ہوٹل ہو یا ریستوران
مشروب کے طور پر
رُوح افزا
طلب کیجیے

Adarts – HRA-10/91

"آگے دائیں موڑ پر ایک ریسٹورنٹ ہے۔ گاڑی وہاں روک لینا، کافی پینے کو دل چاہ رہا ہے" جمشید نے خرم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

خرم نے کار کی رفتار کم کردی۔ میدان فردوسی کے اس علاقے کو کراچی کے صدر اور بوہری بازاروں سے مثال دی جاسکتی تھی۔ لاتعداد چھوٹی چھوٹی گلیاں جن میں چھوٹی چھوٹی دکانوں کی بہتات تھی۔ ان دکانوں میں بقول شخصے سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب تھا۔

خرم نے کار موڑ سے ذرا آگے روک لی اور انجن بند کردیا۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ ریسٹورنٹ وہاں سے تقریباً پندرہ گز آگے تھا۔ وہ دونوں ٹہلنے والے انداز میں چلتے ہوئے ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ ریسٹورنٹ میں گاہکوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔ انقلاب سے پہلے اس علاقے میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ یہاں گاہکوں کی زیادہ تعداد عورتوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ یورپی اور نیم عریاں لباس میں چلتی پھرتی عورتیں دعوتِ نظارہ دیتی تھیں اور مرد یہاں آنکھیں سینکنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ لیکن اب چند چادر پوش عورتوں کے سوا کوئی نظارہ نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے اس علاقے میں واقع ریستورانوں کی رونق بھی اُجڑ گئی تھی۔

کافی پینے کے بعد وہ تقریباً پندرہ منٹ وہاں بیٹھے رہے۔ جمشید نے اٹھ کر بل ادا کیا اور وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکل کر کار کی طرف چل دیئے۔ ابھی وہ کار سے چند گز ہی دور تھے کہ خرم ٹھٹک گیا۔ اسے کار کے قریب ایک آدمی مشتبہ انداز میں کھڑا نظر آیا تھا۔ اس نے جمشید منصوری کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی لیکن وہ رکنے کے بجائے کار کی طرف بڑھتے رہے۔ قریب پہنچ کر خرم نے جیب سے چابی نکالی اور دروازے کے لاک کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کار سے دو گز دور کھڑا ہوا شخص قریب آگیا۔

"یہ کار تمہاری ہے؟" اس شخص نے خرم کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا قوی الجثہ شخص تھا۔

"ہاں۔ کیوں؟" خرم نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا" اس شخص نے کہنے کے ساتھ ہی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

خرم کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ شخص اکیلا تھا لیکن اس نے 'ہمارے' کا لفظ استعمال کیا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے کچھ اور ساتھی بھی آس پاس موجود تھے اور پھر خرم کے اس خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ ٹھیک اسی لمحے ایک اور آدمی کار کی دوسری طرف سے تاریک گوشے سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ اس نے آتے ہی جمشید منصوری کو ریوالور کی زد پر لے لیا تھا۔

"ہمارا تعلق انٹیلی جنس سے ہے۔ ہم کل سے اس کار کی تلاش میں ہیں۔" اس لمبے تڑنگے قوی الجثہ آدمی نے کہا "اس کار کو عباس آباد کے ایک ایسے بنگلے میں دیکھا گیا تھا جو بعض جرائم پیشہ افراد کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔"

جمشید منصوری ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔ اس نے اطراف میں دیکھا۔ قرب و جوار کے لوگ بھی غالباً صورتِ حال کو بھانپ گئے تھے۔ دو آدمیوں کے ہاتھوں میں ریوالور دیکھ کر لوگ بڑی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں سے ہٹنے لگے۔

صورتِ حال خاصی پیچیدہ تھی۔ ایک آدمی نے خرم کو ریوالور کی زد پر لے رکھا تھا اور دوسرے نے جمشید منصوری کو۔ لیکن وہ دونوں پُرسکون تھے۔ کسی کے چہرے پر پریشانی یا بدحواسی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ ان دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ہوا اور پھر وہ دونوں بیک وقت اپنے اپنے حریف پر پل پڑے۔

دونوں کے پیر بیک وقت ان دونوں کے ریوالور والے ہاتھوں پر لگے تھے۔ یہ صورتِ حال غالباً ان کے لئے غیر متوقع تھی۔ خرم کے حریف کے ہاتھ سے تو ریوالور نکل کر کار کی چھت پر جاگرا۔ البتہ جمشید منصوری کے حریف کے ہاتھ سے ریوالور نکلا نہیں۔ بلکہ وہ ایک جھٹکے سے لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔ اس نے ریوالور والا ہاتھ بلند کرکے فائر کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسی لمحے جمشید منصوری کے پیر کی دوسری ٹھوکر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ ٹریگر دب گیا تھا لیکن گولی خرم کے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی ایک دکان کے روشن پلاسٹک سائن میں جا لگی۔

فائر کی آواز سے بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ بدحواس ہو کر بھاگنے لگے اور دکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ جمشید نے حریف کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اسے ایک اور ٹھوکر رسید کردی۔ جھٹکا لگنے سے ریوالور کا ٹریگر ایک بار پھر دب گیا۔ گولی اس مرتبہ جمشید منصوری کے داہنے کان کے قریب سے گزر گئی تھی۔ اس نے حریف کو تیسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا، اس کی ایک اور بھرپور ٹھوکر حریف کے ریوالور والے ہاتھ پر لگی۔ وہ لڑکھڑایا۔ جمشید منصوری نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حریف کے سینے پر زوردار فلائنگ کک رسید کردی۔ وہ بلبلاتا ہوا پشت کے بل ڈھیر ہوگیا۔ جمشید منصوری نے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اسے چھاپ لیا۔

دوسری طرف خرم اپنے حریف سے گتھم گتھا نظر آرہا تھا۔ اس کے حریف نے اسے اس طرح زمین پر گرا رکھا تھا کہ خرم کا سر کار کے اگلے ٹائر سے لگا ہوا تھا اور حریف سینے پر سوار تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خرم کے گلے پر جمے ہوئے تھے۔ وہ اس کا نرخرہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

خرم نے جسم کی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے حریف کو دائیں طرف پلٹ دیا۔ اس کا گلا..... حریف کی گرفت سے آزاد ہوا۔ خرم بڑی پھرتی سے اٹھ گیا اور اس نے حریف پر ٹھوکروں کی

بارش کر دی۔ ہر ٹھوکر پر اس کا حریف ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھتا۔ لیکن آخر کار اسے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے خرم کا پیر پکڑ کر اسے پوری قوت سے موڑ دیا۔ خرم کراہتا ہوا ایک پیر پر گھوم کر نیچے گرا۔ اب اس کے حریف کی باری تھی۔ اس نے خرم پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔

ادھر جمشید منصوری کا حریف ایک بار پھر سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زمین پر گرنے سے اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ اس نے لوٹ لگاتے ہوئے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر جمشید منصوری کے بوٹ کی ٹھوکر اس کے ہاتھ پر لگی۔ وہ بُری طرح بلبلا اٹھا۔ اس کی دوسری ٹھوکر حریف کی کھوپڑی پر لگی۔

ادھر خرم ایک بار پھر سنبھل گیا تھا۔ اب وہ اپنے حریف کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر گھونسوں اور ٹھوکروں سے حملے کر رہے تھے۔

اچانک فضا سائرن کی آواز سے گونج اٹھی۔ غالباً کسی نے پولیس کو فون پر اس ہنگامے کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ خرم نے اپنے حریف کی کھوپڑی پر زوردار گھونسا مارا۔ وہ کراہتا ہوا لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔

"جمشید بھاگو!" خرم نے کہتے ہوئے ایک طرف دوڑ لگا دی۔

جمشید منصوری نے بھی اپنے حریف سے نجات حاصل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے بھی خرم کے پیچھے ہی دوڑ لگا دی۔ اس بازار کی دکانیں دور دور تک بند ہو چکی تھیں۔ تاریکی ان کے لئے سودمند تھی۔

اچانک فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی خرم کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا گیا۔ انٹیلی جنس کے دو آدمیوں میں سے کسی نے ریوالور اٹھا کر فائر کر دیا تھا اور گولی خرم کے بائیں بازو میں کہنی سے ذرا اوپر لگی تھی۔

جمشید منصوری نے رک کر خرم کو سہارا دیا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے زخمی بازو کو پکڑ رکھا تھا۔

"جمشید! میں ٹھیک ہوں۔ تم بھاگ جاؤ۔ اگر پولیس نے ان گلیوں کو گھیرے میں لے لیا تو فرار کا راستہ نہیں ملے گا" خرم نے کہا۔

"لیکن تم......"

"میری فکر مت کرو" خرم نے اس کی بات کاٹ دی "گولی بازو کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تم نوشابہ کے ہاں پہنچ جاؤ۔ میں بھی وہیں آؤں گا۔ ان حالات میں وہی جگہ ہمارے لئے محفوظ ثابت ہو سکتی ہے۔ جاؤ۔ جلدی کرو۔ پولیس کی گاڑی قریب آ رہی ہے۔"

جمشید منصوری نے خرم کو چھوڑ دیا اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔ دور دور تک بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ لوگ یقیناً یہی سمجھے تھے کہ پاسداران کا کسی پارٹی سے ٹکراؤ ہوا تھا۔ پاسداران کا خوف سب کے ذہنوں پر سوار تھا۔ اس لئے لوگ دکانیں بند کر کے بھاگ رہے تھے۔ اس صورت حال سے جمشید منصوری نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مختلف گلیوں میں دوڑتا چلا گیا۔

O☆O

ادھر جمشید منصوری اور خرم جب کمال کی دکان سے نکلے تھے تو اس کے ٹھیک دس منٹ بعد کمال نے دکان بند کر دی تھی۔ دکان بند کرنے کے بعد اس نے ایک پرائیویٹ ٹیکسی روکی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو اپنی منزل کا پتا بتا دیا۔

چند منٹ بعد ٹیکسی کیپل کے مقامی ہیڈ کوارٹرز کی عمارت کے سامنے رکی۔ کمال نے کرایہ ادا کیا اور نیچے اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے کے بعد اس نے ایک آدمی سے علی جواد کے بارے میں دریافت کیا۔ اس شخص نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

کمال جب کمرے میں داخل ہوا تو خاصا بدحواس نظر آ رہا تھا۔ وہ اس میز کے قریب پہنچ کر رک گیا جس کے دوسری طرف علی جواد بیٹھا تھا۔ کمرے میں دو آدمی اور بھی تھے۔ ایک داڑھی والا تھا۔ اس کی عمر پچاس سے کچھ اوپر ہی ہو گی۔ سفید داڑھی، سیاہ لبادہ اور سر پر سیاہ پگڑی تھی۔

"کیا بات ہے۔ کون ہو تم؟" علی جواد نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں جمشید منصوری کے بارے میں ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔" کمال نے کہا اور علی جواد اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ داڑھی والا اور دوسرا آدمی بھی جمشید منصوری کا نام سن کر اپنی اپنی جگہوں سے اُچھل پڑے تھے۔

"تم خوف زدہ ہو۔ آرام سے بیٹھو۔ یہاں تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے" علی جواد نے کہا۔

کمال ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد جب وہ اپنے حواس پر قابو پا چکا تو علی جواد کو بتانے لگا کہ جمشید منصوری کہاں مل سکتا ہے۔

O☆O

نشہ ایک بار پھر کرنل صدیق کی خوابگاہ کی زینت بنی ہوئی تھی۔

رات کے بارہ بجنے والے تھے اور دونوں سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ کرنل صدیق کا بریف کیس، جسے وہ ہمیشہ الماری میں لاک کر کے رکھا کرتا تھا، ڈریسر پر پڑا تھا۔ لیٹنے سے قبل اس نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی پھر وہ بریف کیس کی طرف بڑھا۔ انداز ایسا ہی تھا گویا پہلے اسے بریف کیس کا خیال ہی نہیں رہا تھا اور اب اسے الماری میں رکھنا چاہتا ہو۔

اس اثنا میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ فون کی طرف لپکا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ لمحہ بھر کے بعد اس کے چہرے پر تردد

اور پریشانی کے آثار نمودار ہوگئے۔ اس نے تیز تیز لہجے میں چند ادھورے جملے کہے اور فون بند کرکے لباس تبدیل کرنے لگا۔
قشہ بستر پر خاموش لیٹی یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ اس نے صدق سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چند لمحوں کے اندر کرنل نے لباس تبدیل کرلیا۔
"میں تھوڑی دیر میں واپس آرہا ہوں۔" وہ جوتے پہنتے ہوئے بولا۔ "دفتر سے ایک ضروری پیغام ملا ہے۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کا بریف کیس بدستور ڈریسر پر پڑا رہ گیا تھا۔
اس کے جاتے ہی قشہ تیزی سے بستر سے اٹھی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ کرنل صدق کی کار بنگلے کے ڈرائیو وے سے نکل رہی تھی۔ قشہ نے دروازہ بند کرکے بولٹ چڑھا دیا۔ کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے۔ اور بریف کیس کھول کر اس میں رکھے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے لگی۔
ان کاغذات میں اسے ایک ایسا خط بھی مل گیا جو فارسی میں ٹائپ شدہ تھا۔ اس خط کو پڑھتے ہوئے قشہ کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس نے اپنے بیگ سے منی کیمرا نکالا۔ سب سے پہلے اس خط کی تصویر کھینچی پھر جلدی جلدی تمام کاغذات کی تصویریں اتارلیں۔ پھر تمام کاغذات کو اسی ترتیب سے واپس رکھ کر بریف کیس بند کردیا اور کیمرا اپنے بیگ میں چھپا کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔
تقریباً چالیس منٹ بعد کرنل صدق واپس آگیا۔ اس کے ہونٹوں پر خوشگوار مسکراہٹ تھی۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور قشہ کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔ قشہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہوگئی لیکن ۔۔۔ پھر بتدریج اس کی کیفیت اعتدال پر آتی چلی گئی۔
قشہ ۔۔۔ کرنل صدق کے لئے ایک کھلونا تھا اور وہ اس حسین کھلونے سے دل بہلا رہا تھا۔
صبح ساڑھے تین بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی، صدق نے جھپٹ کر ریسیور اٹھالیا۔ اس فون کال کے انتظار میں وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سویا تھا۔ دوسری طرف سے اسے جو خبر سنائی گئی وہ اسے سن کر اچھل پڑا۔
گزشتہ رات اس کے دو آدمیوں نے میدان فردوسی کے ایک بازار میں سیاہ رنگ کی وہ سیٹروِن کار تلاش کرلی تھی جسے وہ ہفتے قتل عباس آباد والے مشتبہ بنگلے میں دیکھا گیا تھا۔ اس کے آدمیوں نے کار پر آنے والے دو آدمیوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اس کے آدمیوں کی اطلاع کے مطابق ان دونوں میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو جمشید کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ فرار ہوتے ہوئے انٹیلی جنس کے ایک آدمی کی فائرنگ سے جمشید یا اس کا ساتھی زخمی بھی ہوا تھا۔

پھر رات بارہ بجے اسے فون پر اطلاع ملی کہ جمشید اور اس کے ساتھی یوسف آباد کے ایک فیشن ایبل بنگلے میں موجود ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی وہ دفتر پہنچ گیا تھا۔ اگر قشہ اس کی خوابگاہ میں نہ ہوتی تو وہ خود اس بنگلے پر ریڈ کرتا لیکن اپنے آدمیوں کو بنگلے پر چھاپا مارنے کی ہدایات دے کر اپنی رہائش گاہ پر لوٹ آیا تھا تاکہ قشہ کے حسن و شباب سے لطف اندوز ہوسکے۔ اور اب اس چھاپے کے بارے میں اسے اطلاع دی جارہی تھی۔
اس اطلاع کے مطابق یوسف آباد کے اس بنگلے میں کئی آدمی موجود تھے جن سے زبردست مقابلہ ہوا تھا۔ اس مقابلے میں مخالفین کے تین آدمی مارے گئے تھے جبکہ باقی فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ایک انٹیلی جنس کا آدمی بھی مارا گیا تھا۔
"اور جمشید منصوری؟" صدق نے پوچھا۔ پھر دوسری طرف کی بات سننے کے بعد بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں پہنچ رہا ہوں۔" ریسیور رکھنے کے بعد وہ قشہ کی طرف مڑا اور پُرتاسف نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "تمہارا ڈراما ختم ہوگیا ہے گڑیا!"
یہ الفاظ قشہ کے حواس پر بجلی بن کر گرے۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔
"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" کرنل صدق نے کہا۔ "اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھے بہت پہلے پتا چل گیا تھا کہ تم کون ہو اور تمہاری اصلیت کیا ہے۔"
"تت۔۔۔ تو۔۔۔ تو تم نے مجھے پہلے ہی دن گولی کیوں نہیں ماردی؟" قشہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے جسم کو کیوں پامال کیا؟ کیوں روندا مجھے؟" وہ بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"تم ایک اچھی لڑکی ہو۔۔۔ خوبصورت ہو۔۔۔ بھولی بھالی ہو۔۔۔ تمہارے پہلو میں سکون ہے، محبت ہے۔ اگر ملاؤں کی حکومت نہ ہوتی تو میں تمہارے لئے بہت کچھ کرسکتا تھا۔ لیکن۔۔۔"
صدق کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ چند لمحے وہ دوسری طرف کی آواز سنتا رہا پھر دہاڑا۔
"کیا۔ کیا بکواس کر رہے ہو؟ ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا اور قشہ کی طرف گھوم گیا۔ "کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ میں دفتر جارہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم بھاگنے کی کوشش نہیں کروگی۔ ویسے تم بھاگ کر کہیں جا بھی نہیں سکتیں۔"
صدق نے بڑی عجلت میں لباس تبدیل کیا اور بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ کرنل صدق کے جانے کے چند منٹ بعد فون کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بجی۔ قشہ پلنگ پر اوندھی پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر فون کی طرف دیکھا۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ آخرکار اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔
"قشہ! میں خرم بول رہا ہوں۔ شاید تم نام سے مجھے نہ پہچان سکو۔ پہلی مرتبہ جب جمشید تمہارے فلیٹ پر گیا تھا تو میں اس کے

ساتھ تھا۔" ریسیور اٹھاتے ہی خرم کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"تم لوگوں نے مجھے تباہ کردیا ہے۔" قشہ نے کہا۔ "اس خبیث کرنل کو میرے بارے میں سب کچھ پتا چل گیا ہے۔"

"تم ایک اچھی لڑکی ہو قشہ۔" خرم نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم جس مقصد کے لئے کام کر رہی ہو اس کے پیش نظر یہ معمولی سی قربانی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کرنل نے تمہارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس سلسلے میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کرپایا۔ غالباً وہ تم سے بہت زیادہ متاثر ہے۔"

"میں تم سب پر لعنت بھیجتی ہوں۔" قشہ نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

"تم بہت سیدھی لڑکی ہو۔" خرم نے کہا۔ "تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ گالیاں دے دے کر میرے کان بہرے کردیتی۔ کبھی کبھی دو چار گالیاں دے دینا چاہئے۔ صحت اچھی رہتی ہے۔ اچھا سنو! میں ٹھیک پانچ منٹ بعد تمہارے کمرے کے روشندان میں سے ایک ڈوری کے ساتھ پستول باندھ کر پھینکوں گا۔ پستول کو ڈوری سے علیحدہ کرلینا۔"

"خودکشی کرنے کے لئے؟"

"نہیں۔ انتقام اور آزادی کے لئے۔ کرنل مصدق تمہیں باقاعدہ طور پر انٹیلی جنس کی تحویل میں دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ تم اس پستول سے کرنل کی کھوپڑی میں سوراخ کردینا اور آرام سے نکل جانا۔ تمہیں کوئی پریشان کرنے نہیں آئے گا۔ کرنل مصدق کے سوا کوئی تمہاری اصلیت سے واقف نہیں ہے۔ اور ہاں۔۔ پستول اپنے پاس رکھ لینا اور منی کیمرا اس ڈوری سے باندھ دینا۔ کیمرے کا کام ختم ہوگیا ہے یا نہیں؟"

"ہاں۔ کام ہوگیا ہے۔" قشہ نے جواب دیا۔

"گڈ!" خرم کی آواز سنائی دی۔ "تمہاری خدمات کے صلے میں جمشید نے خانم فرح کو پچاس ہزار تومان دیئے ہیں۔ یہ رقم تمہارے کام آئے گی۔ اوکے قشہ! میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔"

ٹھیک پانچ منٹ بعد کمرے کے عقبی روشندان سے ڈوری سے بندھا ہوا ایک پستول اندر لٹکا اور دھیرے دھیرے نیچے آنے لگا۔ جب وہ قشہ کی دسترس میں آگیا تو اس نے پستول کھول کر منی کیمرا ڈوری میں احتیاط سے باندھ دیا اور ڈوری کو ہلکا سے جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ دوسری طرف خرم نے ڈوری کو واپس کھینچ لیا۔ ڈوری کے سرے پر بندھا ہوا کیمرا دیوار پر کسی چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا روشندان میں غائب ہوگیا۔

قشہ کچھ دیر تک پستول کو ہاتھ میں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پستول پلنگ کے میٹرس کے نیچے چھپادیا اور بستر پر گر کر ایک بار پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

==

جمشید منصوری کی اب تک کی حکمت عملی کامیاب رہی تھی۔ گزشتہ رات میدان فردوسی کے ایک بازار میں وہ انٹیلی جنس کے ہتھے چڑھ گئے تھے لیکن قسمت ان کے ساتھ تھی' وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے لیکن فرار کی کوشش میں خرم گولی لگنے سے زخمی ہوگیا۔ خرم نے اسے نوشابہ کے ہاں پہنچنے کا مشورہ دیا تھا۔

جمشید منصوری گلیوں میں دوڑتا ہوا ایک کشادہ سڑک پر نکل آیا۔ اب وہ دوڑنے کے بجائے اطمینان سے چل رہا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مطمئن ہوگیا تھا۔ اس کے خیال میں پولیس ہنگامے کی جگہ پر پہنچ چکی ہوگی اور آس پاس کی گلیوں اور بازاروں میں ان کی تلاش ہورہی ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ تلاش... فی الحال اسی علاقے تک محدود ہوگی اور پھر تلاش کا یہ سلسلہ پورے شہر تک پھیل جائے گا۔ وہ جلد سے جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ دوڑ لگاتے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جمشید اگر چاہتا تو یہاں سے کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر دور نکل سکتا تھا مگر وہ یہ بات بھی جانتا تھا کہ پولیس' کیتی اور انٹیلی جنس والے سارے شہر کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے پوچھ گچھ کریں گے کہ وہ اس علاقے سے کسی مشتبہ شخص کو تو لے کر نہیں گئے تھے۔ اس لئے وہ کوئی ٹیکسی روکنے کے بجائے تیز تیز چلتا رہا۔

خیابان ولی عصر سے ہوتے ہوئے وہ بازار بزرگ پہنچ گیا۔ تقریباً چھ کلو میٹر کا یہ فاصلہ طے کرنے میں اسے بیس منٹ لگے تھے۔ اور ان بیس منٹوں میں اس کی تلاش کا سلسلہ خاصا دراز ہوچکا تھا۔

بازار بزرگ شہر کا گنجان ترین علاقہ تھا۔ سب سے بڑا کاروباری مرکز ہونے کے علاوہ یہاں رہائشی فلیٹ بھی تھے۔ تنگ اور پیچ در پیچ گلیوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ یہاں مختلف کاروبار کے لئے مختلف شعبے تھے' جنہیں مارکیٹیں کہا جاسکتا ہے۔ ایک علاقہ مرچ مسالا جات اور اسی قسم کی چیزوں کے لئے مخصوص تھا۔ دوسرے علاقے میں کراکری کی دکانیں تھیں۔ ان دکانوں میں ایران ہی کی فیکٹریوں میں تیار کردہ پلاسٹک کی کراکری بھری ہوئی تھی۔ ایک علاقہ قالینوں کے کاروبار کے لئے مخصوص تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں میں قالینوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دکانوں کے اندر اور باہر خوبصورت ڈیزائنوں والے قالین لٹکے ہوئے تھے۔

یہ بہت ہی تنگ گلیاں تھیں۔ یہاں لوگوں کی آمدورفت بھی نسبتاً زیادہ تھی۔ عمارتوں کے نیچے دکانیں تھیں اور اوپر رہائشی فلیٹ وغیرہ تھے۔ بازار بزرگ کو تہران کا قدیم ترین علاقہ کہا جاسکتا تھا۔ بعض عمارتیں اس قدر خستہ تھیں کہ کسی بھی وقت زمین بوس ہوسکتی تھیں۔

جمشید اس وقت بازار بزرگ کے قالینوں والے سیکشن میں تھا۔ وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے محض ٹہلنے کے لئے گھر سے نکلا ہو۔ وہ دائیں بائیں دکانوں کے اندر اور باہر لٹکے ہوئے قالینوں کو

دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کی زیادہ توجہ اس طرف تھی جس طرف وہ خود چل رہا تھا۔

ایک جگہ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے دکان کے سامنے ٹنگے ہوئے قالین دیکھ رہا ہو۔ لیکن اس کی توجہ اس تنگ دروازے پر مرکوز تھی جو دو دکانوں کے بیچ میں نظر آرہا تھا۔ دونوں دکانوں پر ٹنگے ہوئے قالینوں کی وجہ سے یہ دروازہ تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔

اس وقت دونوں دکانوں پر گاہک موجود تھے۔ جمشید منصوری نے کن انکھیوں سے باری باری دونوں طرف دیکھا۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے دروازے میں گھس گیا۔

یہ تنگ دروازہ اور تاریک سی ڈیوڑھی تھی۔ سامنے ہی لکڑی کا زینہ تھا۔ جمشید زینے پر چڑھنے لگا۔ یہ عمارت بازار بزرگ کی غالباً سب سے قدیم عمارت تھی۔ زینہ نہایت خستہ تھا۔ تختے اس کے قدموں کے نیچے چرچرا رہے تھے۔ وہ پہلی منزل کے دروازے پر رک گیا۔ یہاں اچھی خاصی تاریکی تھی۔ اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک منٹ بعد اس نے دوبارہ دستک دی۔ اس مرتبہ اندر سے زنجیر ہٹائے جانے کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ چند انچ کے قریب کھلا اور ایک عورت کا چہرہ جھانکتا ہوا نظر آیا۔

"کون ہو تم۔۔ کس سے ملنا چاہتے ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"خانم نوشابہ سے ملنا ہے۔" جمشید نے جواب دیا۔

"یہاں کوئی نوشابہ نہیں رہتی۔" عورت نے جواب دیا اور دروازہ بند کرنا چاہتی تھی کہ جمشید نے جلدی سے پیر آگے پھنسا دیا۔

"پردیسیوں کے ساتھ یہ سلوک اچھا نہیں ہے۔ اجنبی مہمان کیا سوچے گا۔" اس نے کہا۔

"اوہ!" عورت چونک گئی۔ "میں تمہیں پہچان نہیں سکی تھی۔ اندر آجاؤ۔"

جمشید اندر داخل ہو گیا۔ عورت نے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ وہ نوشابہ تھی۔ کمرے میں ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔ اندر پہنچنے کے بعد ہی جمشید اس کا چہرہ اچھی طرح دیکھ سکا تھا۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ خاصی حسین عورت تھی۔ اس نے گلابی رنگت کی شیفون کی سیکسی پہن رکھی تھی جس سے اس کا سنہری بدن جھلکتا ہوا نظر آرہا تھا۔

نوشابہ ایک رقاصہ تھی۔ اس کا شمار تہران کی صفِ اوّل کی رقاصاؤں میں ہوتا تھا۔ اس کے پروگرام بڑے بڑے نائٹ کلبوں میں ہوتے تھے۔ جس رات جس کلب میں اس کا پروگرام ہوتا وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی۔ اس کا آخری پروگرام رائل کلب میں ہوا تھا۔ نوشابہ کو وہ رات نہیں بھولتی تھی۔ یہ شاہ کے ملک سے فرار ہونے سے دو روز پہلے کی بات تھی۔ ایک طرف انقلابی سرگرمیاں عروج پر تھیں تو دوسری طرف ابلیس کے پجاری دولت مند لوگ عیش و عشرت میں مست تھے۔ بعض سنجیدہ لوگوں نے وقت کی نبض کو دیکھتے ہوئے آنے والے دور کا اندازہ لگالیا تھا اور وہ اپنے بچاؤ کا بندوبست کر رہے تھے لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو شہر میں ہونے والے ہنگاموں کو محض باسی کڑھی کا اُبال سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاہ کی طاقتور سلطنت سے ٹکر لینا کوئی آسان بات نہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ جب سینوں میں دین کا جذبہ بیدار ہوتا ہے تو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس سیلاب کا راستہ نہیں روک سکتی۔ ٹینکوں سے جسموں کو تو کچلا جا سکتا ہے لیکن روح کو نہیں کچلا جا سکتا۔

شہر میں ہونے والے ہنگاموں کے ساتھ دولت مند طبقے کی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ اس رات رائل کلب میں ہونے والے پروگرام کی خوب تشہیر کی گئی تھی۔ پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہی تمام میزیں بھر گئی تھیں۔

اس رات دو بجے جب رقصِ ابلیس عروج پر تھا' انقلاب کے حامیوں نے رائل کلب پر بلّہ بول دیا۔ وہ بیسیوں لوگ تھے جنہوں نے رائل کلب کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا۔ درجنوں آدمی اندر گھس آئے تھے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عورتوں کی چیخوں سے فضا گونج اٹھی۔ لوگ جانیں بچانے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

اس رات خرم بھی رائل کلب میں موجود تھا۔ جمشید کو علم نہیں تھا کہ خرم اور نوشابہ میں تعلقات کس طرح قائم ہوئے تھے۔ نوشابہ لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھی۔ لوگ اس کا ایک رات کا قرب حاصل کرنے کے لئے اس کے قدموں میں اپنا سب کچھ ڈھیر کر دینے کو تیار تھے۔ لیکن نوشابہ نے خرم کا انتخاب کیا تھا۔ حالانکہ خرم کے پاس نہ زیادہ دولت تھی اور نہ ہی اسے کوئی اچھا آدمی سمجھا جاتا تھا۔

لوگ بدحواسی میں چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ حملہ آور اسٹیج پر چڑھ گئے تھے۔ نوشابہ چیختی ہوئی اسٹیج کے پچھلی طرف ڈریسنگ روم کی طرف دوڑی۔ خرم اسٹیج سے خاصا دور تھا۔ وہ نوشابہ کی مدد کے لئے ڈریسنگ روم کی طرف دوڑا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر نوشابہ' حملہ آوروں کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

کلب کی دوسری رقاصائیں نیم عریاں لباس میں چیختی ہوئی اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ خرم جب اسٹیج کے پیچھے پہنچا تو نوشابہ ڈریسنگ روم میں نہیں تھی۔

اس دوران حملہ آوروں نے کلب کو آگ لگادی۔ چاروں طرف شعلے بھڑکنے لگے۔ چیخوں کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ اور پھر نوشابہ کی چیخ سن کر خرم عقبی دروازے کی طرف دوڑا۔

دو آدمی نوشابہ کو گھسیٹتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف لے

جا رہے تھے۔ اور نوشابہ چیختے چلاتے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ خرم نے اس طرف دوڑ لگا دی۔ وہ دونوں آدمی نوشابہ کو گھسیٹتے ہوئے سوئمنگ پول کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ اور اب اسے اٹھا کر پول میں پھینکنا ہی چاہتے تھے کہ خرم نے ان پر چھلانگ لگا دی۔ یہ مزاحمت ان دونوں کے لئے غیر متوقع تھی۔ نوشابہ ان کی گرفت سے نکل گئی۔ خرم نے انہیں سنبھلنے کا موقع دئے بغیر ان پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دئے۔ اس نے ایک آدمی کو اٹھا کر سوئمنگ پول میں پھینک دیا اور دوسرے کی کھوپڑی پر زور دار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ شخص کراہتا ہوا سوئمنگ پول کے کنارے پر گرا۔ خرم نے بڑی پھرتی سے اسے بھی اٹھا کر سوئمنگ پول میں پھینک دیا اور نوشابہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو ایک طرف گری ہوئی تھی۔ خرم نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اسے لے کر درختوں کی طرف دوڑ لگا دی۔

خرم، نوشابہ کو لے کر سوئمنگ پول کے دوسری طرف بہت دور عقبی دیوار پھاند گیا۔ اس طرح وہ نوشابہ کو اس ہنگامے سے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس رات نوشابہ اپنے مکان پر بھی نہیں گئی۔ خرم اسے بازار بزرگ کے اس مکان میں لے آیا۔ یہ مکان اس کے ایک عزیز کا تھا جس کا انتقال ہو چکا تھا اور مکان عرصہ سے خالی پڑا تھا۔ اس کے بعد سے نوشابہ یہیں رہ رہی تھی۔ جمشید جب تہران میں تھا تو خرم کے ساتھ کئی مرتبہ نوشابہ سے مل چکا تھا۔ اس وقت وہ چونکہ میک اپ میں تھا اسی لئے نوشابہ اسے نہیں پہچان سکی تھی۔

"خرم نہیں آیا؟" جمشید نے سوالیہ نگاہوں سے نوشابہ کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ کیا بات ہے؟ تم پریشان نظر آ رہے ہو" نوشابہ نے کہا۔

"پولیس سے آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ خرم زخمی ہے، اسے گولی لگی تھی۔ میں اس کے لئے پریشان ہوں" جمشید بولا۔

نوشابہ یک دم پریشان ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں "خرم زخمی ہے اور تم اسے چھوڑ کر یہاں آ گئے!" نوشابہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں" جمشید نے جواب دیا "گولی بازو پر لگی تھی، معمولی زخم ہے، وہ یہاں پہنچنے ہی والا ہو گا۔"

نوشابہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ جمشید کرسی پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شیفون کی میکسی میں سے جھلکتا ہوا نوشابہ کا سنہری گداز بدن دعوتِ گناہ دے رہا تھا لیکن جمشید ذرا مختلف قسم کا آدمی تھا۔ اسے عورت سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ عورت کی کوئی ادا اسے مسخر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ نوشابہ کی طرف اس لئے دیکھ رہا تھا کہ وہ کس قدر پریشان تھی۔ خرم کے زخمی ہونے کی اطلاع نے اسے بدحواس سا کر دیا تھا۔

خرم کے لئے جمشید خود بھی پریشان تھا۔ خرم اگر خود نہ کہتا تو وہ اسے کبھی چھوڑ کر نہ آتا۔ لیکن پھر خود بھی یہ سوچ کر وہ خرم سے الگ ہو گیا تھا کہ اگر ایک پکڑا جائے تو دوسرا محفوظ رہے۔

آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اب جمشید کی پریشانی بھی بڑھ رہی تھی۔ پھر اچانک وہ چونک گیا۔ چوبی زینے پر تختوں کے چرچرانے کی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی، جیسے کوئی بہت محتاط قدموں سے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر قدموں کی وہ آواز رک گئی اور چند سیکنڈ بعد دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سنائی دی۔

نوشابہ نے جمشید کو اشارہ کیا۔ جمشید کرسی سے اٹھ کر دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ جب دروازہ کھلتا تو وہ مکمل طور پر اس کے پیچھے چھپ جاتا۔ اس طرح اگر آنے والا خرم کے بجائے کوئی اور ہوتا تو اس پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا تھا۔

نوشابہ نے محتاط انداز میں چند انچ کے قریب دروازہ کھول دیا۔ سیاہ چادر میں لپٹا ہوا ایک سایہ سامنے کھڑا تھا۔ دروازے سے آنے والی ہلکی سی روشنی میں اس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن پھر اس نے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ وہ خرم تھا۔ نوشابہ نے دروازہ کھول دیا اور خرم کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔

خرم کو دیکھ کر جمشید کے چہرے پر طمانیت سی آ گئی۔ نوشابہ کی حالت قابلِ دید تھی۔ خرم کے اندر داخل ہوتے ہی وہ اس سے لپٹ گئی تھی لیکن پھر فوراً ہی ہٹ گئی۔

"کہاں گولی لگی ہے، زخم کہاں ہے؟" اس نے متوحش نگاہوں سے خرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

خرم نے جسم پر لپٹی ہوئی چادر ہٹا دی۔ اس کی بائیں آستین اوپر سے نیچے تک خون میں تر ہو رہی تھی۔ قمیص کے دوسرے حصوں پر بھی خون کے دھبے موجود تھے۔ خون بہہ جانے کی وجہ سے خرم کے چہرے پر ہلکی سی نقاہت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ نوشابہ دوڑ کر فرسٹ ایڈ باکس لے آئی۔ جمشید نے خرم کو کرسی پر بٹھا کر اس کی قمیص اتار دی اور زخم صاف کر کے ڈریسنگ کرنے لگا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا، گولی گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ لیکن خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے خرم کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔

"یہاں تک آنے میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟" جمشید نے پوچھا۔

"زیادہ نہیں" خرم نے جواب دیا "میدان فردوسی کے بازاروں میں بھاگتے ہوئے میں نے ایک عورت سے یہ چادر چھین لی تھی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہماری تلاش کا سلسلہ یہاں تک پھیل چکا ہے۔ بازار بزرگ کے پارچہ جات والے سیکشن میں، میں نے پاسداران کو چیکنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی سرگرمی سے ہماری تلاش میں ہیں۔ میں بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔"

"ہوں!" جمشید نے ہنکارہ بھرا "ویسے تمہاری کار تو ان کے قبضے میں پہنچ چکی ہے۔ وہ کار کے ذریعے تمہارے مکان تک پہنچ جائیں گے۔"

"نہیں۔" خرم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یہ کار میں نے جس شخص سے خریدی تھی وہ اس سے اگلے ہی روز ایران سے فرار ہو گیا تھا' کاغذات اسی کے نام پر ہیں۔ مجھے ٹرانسفر کروانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ اگر پولیس یا انٹیلی جنس نے لائسنس پلیٹ کے ذریعے کار کے مالک کا پتا چلا بھی لیا تو وہ اس کو تلاش کرتے رہیں گے۔ کوئی یہ نہیں جان سکے گا کہ یہ کار میری ملکیت تھی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے" جمشید نے جواب دیا "لیکن صورتِ حال کچھ الجھتی جا رہی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاملات بھی پیچیدگی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اصل مشن کی طرف میں نے ابھی تک توجہ نہیں دی۔ ایران کی حدود میں داخل ہوتے ہی کمیٹی اور انٹیلی جنس والے میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ تلاتی نے الگ جال بچھا رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد اصل کام پر توجہ دوں گا لیکن معاملہ پیچیدگی اختیار کرتا چلا گیا۔ اب مجھے بہت جلد ان لوگوں سے پیچھا چھڑانا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو شاید مرتے دم تک ایران سے باہر نہ نکل سکوں۔"

"اگر تم اجازت دو تو کل ہی مصدق اور علی جواد کو گولی سے اُڑا دیا جائے" خرم نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"ان دونوں کو قتل کر دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا" جمشید نے کہا "بلکہ صورتِ حال کچھ اور گمبھیر ہو جائے گی۔ ویسے میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔"

"وہ کیا؟" خرم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پہلے کچھ کھا لیں" جمشید نے کہا "معدہ خالی ہو تو دماغ بھی بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیوں نوشابہ' کچھ کھلاؤ گی نہیں؟" اس نے آخری جملہ نوشابہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے تم لوگوں کے آنے کی اطلاع ہوتی تو کچھ بندوبست کر لیتی۔ لیکن بہرحال' جو کچھ بھی ہے پیش کر دیتی ہوں" نوشابہ کہتی ہوئی اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ تینوں کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے دوران خاموشی ہی رہی۔ البتہ کھانے کے بعد کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے جمشید اپنا منصوبہ بتانے لگا۔

"میرا منصوبہ یہ ہے کہ علی جواد اور مصدق کو تلاتی کے پیچھے لگا دیا جائے۔ یہ تینوں آپس میں الجھے رہیں گے اور ہم اطمینان سے اپنا کام کر کے نکل جائیں گے۔"

"وہ کیسے؟" خرم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ اس طرح کہ" جمشید ایک لمحہ کو خاموش ہوا اور پھر بتانے لگا کہ ان تینوں کو آپس میں کس طرح الجھایا جائے گا۔ آخر میں وہ بولا "میرے ذہن میں ایک اور بات بھی ہے۔ میں نے قدسیہ کو محض اس لئے مصدق کے پیچھے لگایا تھا کہ ہم اپنے بارے میں اس کے پروگرام سے آگاہ ہوتے رہیں گے لیکن قدسیہ نے ابھی تک ہمیں کوئی اچھی خبر نہیں سنائی۔ میرا خیال تھا کہ مصدق نے میرے بارے میں باقاعدہ پلاننگ کی ہوگی۔ اسی لئے میں نے قدسیہ کو ایک منی کیمرا بھی دے دیا تھا کہ وہ موقع پا کر اس کے بریف کیس میں رکھے ہوئے کاغذات کی تصویریں کھینچ لے۔ لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ مصدق بہت محتاط آدمی ہے۔ بہرحال' کل رات تم قدسیہ سے رابطہ قائم کرو گے۔"

جمشید ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور چند لمحوں بعد خرم کو سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔

جمشید نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ واقعی بہت شاندار تھا۔ دوسرا دن انہوں نے نوشابہ کے فلیٹ میں ہی محبوس ہو کر گزارا تھا۔ اور پھر شام کا اندھیرا پھیلتے ہی حرکت میں آ گئے تھے۔

رات کو بارہ بجنے سے کچھ پہلے اس نے انٹیلی جنس کے دفتر فون کر کے بتایا کہ جمشید اور اس کے گروہ کے چند آدمی یوسف آباد کے ایک فیشن ایبل بنگلے میں موجود ہیں۔ ان کا پروگرام رات اسی بنگلے میں گزارنے کا ہے۔ اگر انٹیلی جنس کو جمشید منصوری سے کچھ دلچسپی ہو تو اسے اس کے ساتھیوں سمیت اس بنگلے سے گرفتار کر لیا جائے۔ اس وقت کرنل مصدق اگرچہ دفتر میں موجود نہیں تھا لیکن جمشید کو یقین تھا کہ اس تک یہ اطلاع پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔

انٹیلی جنس کے دفتر کو فون کرنے سے پہلے جمشید ایک اور حرکت کر چکا تھا۔ اس رات دس بجے کے قریب اس نے کمیٹی کے مقامی دفتر میں علی جواد کو فون کیا اور اپنے آپ کو جمشید کا ایک پرانا ساتھی ظاہر کر کے یہ دلچسپ اطلاع دی کہ جمشید منصوری اور اس کے ساتھی آج رات بارہ بجے کے قریب یوسف آباد کے ایک بنگلے میں آنے والے ہیں۔ وہ اگر چاہے تو اپنے آدمیوں کو لے کر پہلے ہی بنگلے میں چھپ جائے اور جب جمشید منصوری اور اس کے ساتھی وہاں پہنچیں تو انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ اس نے یوسف آباد والے بنگلے کا نمبر بھی بتا دیا تھا۔ علی جواد اس کا نام پوچھتا رہ گیا لیکن جمشید نے فون بند کر دیا تھا۔

علی جواد' جمشید کی توقع سے کچھ زیادہ ہی بے وقوف ثابت ہوا تھا۔ اس نے صرف یہ معلوم کر لیا تھا کہ جس بنگلے کا نمبر بتایا گیا تھا وہ ملکہ فرح کے ایک دور کے کزن کی ملکیت تھا۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ جمشید کے بارے میں فون پر دی جانے والی

اطلاع میں صداقت کتنے فیصد تھی۔ اس کے لئے یہی اطلاع کافی تھی کہ وہ بنگلا ملکہ فرح کے کسی رشتے دار کا تھا۔

وہ اپنے چھ آدمیوں کو لے کر رات گیارہ بجے اس بنگلے میں پہنچ گیا تھا۔ وسیع و عریض بنگلا خالی پڑا ہوا تھا۔ تھوڑا بہت فرنیچر موجود تھا جو بہت پہلے توڑ پھوڑ دیا گیا تھا۔

علی جواد اور اس کے آدمیوں کے پاس سب مشین گنیں تھیں۔ جواد نے اپنے آدمیوں کو بنگلے میں مختلف جگہوں پر اس طرح پھیلا دیا تھا کہ وہ کسی کو نظر نہ آسکیں اور اگر جمشید اور اس کے ساتھی وہاں پہنچیں تو وہ بچ کر نہ جاسکیں۔ یہ تمام انتظامات کرنے کے بعد وہ وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ سوا بارہ بجے کے قریب چند آدمی بہت محتاط انداز میں بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھے' جواد کے ایک ماتحت نے وارننگ دیے بغیر آنے والوں پر فائر کھول دیا۔

آنے والوں میں سے ایک آدمی چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ لیکن اس کے دوسرے ساتھیوں نے پوزیشن سنبھال کر فائرنگ شروع کردی۔ دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوتی رہی۔ آدھے گھنٹے تک یوسف آباد کا علاقہ گولیوں کی آواز سے گونجتا رہا۔

آنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کا ایک آدمی مارا جاچکا تھا جب کہ علی جواد کے تین آدمی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ جواد کے صرف تین آدمی رہ گئے تھے۔ چوتھا وہ خود تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے ان لوگوں کی آمد سے پہلے بنگلے میں پوزیشن لے کر سخت حماقت کی تھی۔ اسے باہر چھپ کر بنگلے کو گھیرے میں لینا چاہئے تھا۔ جب جمشید اور اس کے ساتھی بنگلے میں گھستے تو انہیں گھیرے میں لے لیتا لیکن اب وہ خود گھیرے میں تھا اور تین آدمیوں کی جانیں ضائع ہونے کے بعد سوچ رہا تھا کہ اگر وہ بنگلے میں رہے تو حملہ آور انہیں بھی ختم کردیں گے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو پسپائی کا حکم دے دیا اور وہ لوگ بڑی مشکل سے بنگلے سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ بھاگتے ہوئے اچانک ہی جواد کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ جمشید اور اس کے ساتھی بعد میں آئے تھے۔ بنگلے سے فائرنگ ہونے کے بعد تو انہیں بھاگ جانا چاہئے تھا۔ لیکن وہ نہ صرف مقابلے پر ڈٹے رہے بلکہ خود انہیں میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کردیا گیا۔

علی جواد کی گاڑی وہاں سے تقریباً دو فرلانگ دور کھڑی تھی۔ اس نے کار کے ریڈیو پر اپنے دفتر سے رابطہ قائم کرکے مزید فورس طلب کرلی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ایک درجن آدمی وہاں پہنچ گئے اور جب وہ اس بنگلے پر پہنچے تو صورتِ حال جان کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ جن حملہ آوروں کو جمشید منصوری اور اس کے ساتھی سمجھا تھا' وہ انٹیلی جنس کے آدمی تھے جنہوں نے اس اطلاع پر بنگلے پر چھاپا مارا تھا کہ جمشید منصوری اور اس کے ساتھی یہاں چھپے ہوئے ہیں۔

انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جمشید منصوری نے انہیں بڑی خوب صورتی سے بے وقوف بنادیا تھا اور آپس کے تصادم میں ان دونوں پارٹیوں کے چار آدمی مارے گئے تھے۔

اسی دوران خرم' تنشہ سے رابطہ قائم کرکے اسے پستول پہنچا کر اس سے منی کیمرا لے آیا تھا اور رات کے آخری پہر تین بجے کے قریب جب کرنل صدق کو یہ اطلاع ملی کہ جمشید منصوری نے انہیں اور کیپٹل والوں کو بے وقوف بنایا تھا تو ٹھیک اسی وقت جمشید منصوری منی کیمرے سے نکالی گئی فلم ڈیولپ کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ تیار شدہ پرنٹس کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک پرنٹ میں نظر آنے والی تحریر پڑھتے ہی وہ اس طرح اچھل کر کھڑا ہوگیا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ ایک بار پھر اس تحریر کو پڑھنے لگا۔ اور پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

O☆O

شہر بھر میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دو سیکیورٹی ایجنسیوں کا آپس میں تصادم ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ایک ایسے شخص نے انہیں بے وقوف بنایا تھا جو حکومتِ ایران کو سب سے زیادہ مطلوب تھا اور جس کے سر کی بھاری قیمت مقرر تھی۔ انقلابی حکومت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کھل کر ان سیکیورٹی ایجنسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جارہا تھا' جن کا کام ہی صرف یہ تھا کہ وہ ایسے لوگوں پر نگاہ رکھیں جنہیں سرزمینِ ایران پر یہ انقلابی تبدیلی پسند نہیں آئی تھی۔ مذہبی روایات سے بیگانہ' بے حیائی اور بے غیرتی کے یہ علم بردار مادر پدر آزاد رہنا چاہتے تھے۔ ایک مردِ قلندر نے یہ طاغوتی حصار توڑ دیا تھا۔ تاریکی اور بدی کا دیوتا اس ملک سے فرار ہوچکا تھا۔ ایک نیا سویرا طلوع ہوچکا تھا۔ اُجالے پھیل رہے تھے۔ لیکن کچھ ایسے لوگ اب بھی موجود تھے جو اندر ہی اندر اس اسلامی انقلاب کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ یہ لوگ جان کے خوف سے اگرچہ کھل کر کبھی سامنے نہیں آئے تھے لیکن ایسے ہی کسی موقع پر انقلابی حکومت کو براہِ راست تنقید کا نشانہ بنا کر دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے۔

بعض حلقوں کی طرف سے یہ الزام بھی لگایا جارہا تھا کہ چونکہ جمشید منصوری کی گرفتاری پر بھاری انعام مقرر تھا۔ اس لئے ان دونوں سیکیورٹی ایجنسیوں کے نااہل افسران نے انعام کے لالچ میں سوچے سمجھے بغیر یہ کارروائی کرڈالی تھی جس میں ان کے اپنے ہی چار آدمی مارے گئے تھے۔ اگر یہ لوگ مل کر پلاننگ کرتے اور اس اطلاع کی تصدیق کی کوشش کرتے تو یہ افسوسناک واقعہ پیش نہ آتا لیکن لالچ انہیں لے ڈوبا۔ یہ الزام لگانے والے حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی کیا جارہا تھا کہ ان نااہل افسروں کو گرفتار کرکے ان پر مقدمہ چلایا جائے اور انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔

صورتِ حال خاصی سنگین ہوگئی تھی۔ کرنل صدق بری طرح

جھنجلایا ہوا تھا۔ وہ زخمی شیر کی طرح اپنے دفتر میں غراتا پھر رہا تھا۔ اس کے ماتحت سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ کرنل صدق نے اپنے چیف رضا آغا کو اس واقعہ کی اطلاع دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ تہران میں موجود نہیں تھا۔ وہ دو دن پہلے قم گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ صدق نے قم کے فون نمبر پر بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

کرنل صدق گزشتہ رات سے دفتر میں تھا۔ پورا دن گزر گیا تھا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ اس کا لباس مسلا ہوا اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ سارا دن چائے اور کافی پیتے ہوئے گزر گیا تھا جس سے اس کی طبیعت اوبھ گئی تھی۔ اور اب تو چائے یا کافی کے تصور ہی سے ابکائی آنے لگتی تھی۔ سگریٹ پی پی کر حلق خشک ہو گیا تھا اور کانٹے سے پڑنے لگے تھے۔ اس وقت بھی اس کی انگلیوں میں سلگتی ہوئی سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ اس نے کش لگایا تو یوں محسوس ہوا جیسے پیٹ میں آنتیں الٹ گئی ہوں۔ اسے قے سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے سگریٹ میز کے کونے پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں مسل دی۔ ٹھیک اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

"یس۔ کرنل صدق" وہ ماؤتھ پیس میں دہاڑا۔

"بہت غصے میں ہو" دوسری طرف سے کہا گیا "اس ناکامی نے شاید تمہارا دماغ پلٹ دیا ہے۔"

"کون ہو تم؟" صدق کے لہجے میں بدستور تندی تھی۔

"جس کی تمہیں تلاش ہے۔ جشید منصوری" دوسری طرف سے جواب ملا۔

کرنل صدق کو یوں محسوس ہوا جیسے چھٹانک بھر پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا گیا ہو۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گر گیا۔ اس کا چہرہ اس طرح سفید پڑ گیا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ اس کے ماتحت اس کی یہ حالت دیکھ کر بری طرح چونک گئے۔ کرنل صدق نے ریسیور اٹھا لیا۔

"تت ۔۔۔۔ تم ۔۔۔۔" وہ ہکلایا "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا جم ۔۔۔۔" وہ یکایک خاموش ہو گیا اور کن انکھیوں سے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ان کے سامنے یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ فون پر جشید بات کر رہا ہے۔ اس لئے وہ اس کا نام لیتے لیتے رہ گیا تھا۔

"زندہ چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب میں تمہاری گرفت میں آؤں۔ لیکن تم ۔۔۔۔"

"تم مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ نہ ہی تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہو۔ میری پیشانی پر رُسوائی کا جو دھبا لگا ہے وہ تمہارے خون ہی سے دُھل سکتا ہے۔ میں دنیا کے آخری سرے تک تمہارا تعاقب کروں گا" کرنل صدق نے کہتے ہوئے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے اپنے ایک ماتحت کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ماتحت کو تحریر کے ذریعے ہدایت کی تھی کہ دوسرے فون پر ایکسچینج سے یہ معلوم کرے کہ اس نمبر پر کال کہاں سے آ رہی ہے۔ ماتحت فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔

"تم تہران میں تو مجھے اب تک تلاش نہیں کر سکے۔ دنیا کے آخری سرے تک میرا تعاقب کیا کرو گے؟" جشید منصوری کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی "میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔"

"لیکن ۔۔۔۔ میں تمہیں روکوں گا۔ تمہیں ایسی خوفناک سزا دوں گا کہ ایران میں پھر کسی مجرم کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی۔" کرنل صدق نے کہا۔ وہ جشید کو باتوں میں لگا کر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا تاکہ اس دوران میں معلوم کیا جا سکے کہ وہ کس نمبر سے بات کر رہا ہے۔

"جو شخص خود مجرم ہو وہ دوسروں کو کیا سزا دے سکتا ہے۔" جشید منصوری نے کہا۔

"کیا مطلب۔ کیا بکتے ہو؟" کرنل صدق غرایا۔

"میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ میں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے" جشید نے جواب دیا۔

"کیا بکتے ہو؟" کرنل صدق دہاڑا۔

"سزا مجھے نہیں تمہیں ملے گی کرنل صدق جلالی! یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ تم کل کا سورج طلوع ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکو گے۔" جشید نے کہا اور اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو گئی۔

اسی لمحے کرنل صدق کا ماتحت کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کاغذ کی سلپ کرنل صدق کی طرف بڑھا دی۔ کرنل صدق نے ریسیور رکھ دیا اور وہ سلپ اٹھا لی۔

"پبلک بوتھ نمبر ۲۳ بازار بزرگ۔"

"چلو۔ جلدی کرو۔ ایک درجن آدمی تیار کرو۔ وہ ابھی اسی علاقے میں ہوگا" کرنل صدق نے اپنے ایک ماتحت سے کہا اور پھر مختلف احکامات جاری کرنے لگا۔

دو منٹ کے اندر اندر دو گاڑیاں طوفانی رفتار سے بازار بزرگ کی طرف جا رہی تھیں۔ ان میں کرنل صدق کے علاوہ چودہ آدمی تھے جو سب مشین گنوں سے لیس تھے۔

انہیں بازار بزرگ تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ پبلک ٹیلی فون بوتھ نمبر ۲۳ بازار کے اس سیکشن میں تھا جہاں کراکری وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ یہ بوتھ گلی کے ایک موڑ پر تھا۔ لیکن اس وقت خالی تھا۔

کرنل صدق کے حکم پر اس کے آدمیوں نے ارد گرد کے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ اسے یقین تھا کہ جشید منصوری ابھی اسی علاقے میں ہوگا۔ بازار کو اس طرح گھیرے میں لئے جانے پر

خوف و ہراس پھیل گیا۔

کرنل مصدق کے آدمی ہر مشتبہ شخص کو روک کر پوچھ گچھ کرنے لگے۔ کرنل مصدق خود لوگوں کے شناختی کاغذات چیک کر رہا تھا۔ وہ اس وقت ٹیلی فون بوتھ نمبر ۲۳ سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر کھڑا ایک آدمی کے کاغذات چیک کر رہا تھا کہ دائیں طرف سے ایک بوڑھا اور ایک عورت آتی ہوئی نظر آئی۔ بوڑھا کلین شیو تھا۔ چہرے پر چند باریک سی جھریاں بھی نظر آرہی تھیں۔ اس کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ ستر پچھتر کے درمیان لگایا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ عورت سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ چادر پر سفید چھوٹے چھوٹے پوکا ڈاٹس بنے ہوئے تھے۔ عورت کا جسم پوری طرح چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں اور ہاتھ برہنہ تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے چادر کا کونا تھام رکھا تھا اور دوسرے میں کوئی بنڈل تھا۔ اس عورت کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

کرنل مصدق کے ایک ماتحت نے انہیں روک لیا۔ بوڑھے نے اپنے کاغذات نکال کر اس کی طرف بڑھادیئے۔ اس وقت کرنل مصدق دوسرے آدمی کے کاغذات واپس کرتے ہوئے اس چادر پوش عورت کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ نرم و نازک ہاتھ اور مخروطی انگلیاں دیکھ کر کرنل مصدق کی رال ٹپکنے لگی۔ ٹھیک اسی وقت عورت کے ایک کان پر اڑسا ہوا چادر کا کونا نکل گیا۔ چادر کا نقاب نما وہ حصہ لٹک گیا اور عورت کا چہرہ برہنہ ہوگیا۔ عورت نے بڑی عجلت سے ہاتھ میں پکڑا ہوا بنڈل نیچے رکھا اور چادر کا کونا درست کرنے لگی۔ لیکن مصدق اس کا چہرہ دیکھ چکا تھا۔ صبیح و ملیح اور حسین چہرہ دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ نجانے اسے یہ احساس کیوں ہوا تھا کہ یہ چہرہ اس نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک بار پھر عورت کی طرف دیکھا۔ اب اس عورت کی صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں اور کرنل مصدق کو یہ آنکھیں بھی جانی پہچانی سی لگ رہی تھیں۔ لیکن اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ حسین چہرہ اور نشیلی آنکھیں اس نے کب اور کہاں دیکھی تھیں۔

کرنل مصدق کے ماتحت نے بوڑھے کے کاغذات واپس کر دئیے "اس عورت سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" اس نے بوڑھے سے پوچھا۔

"میری بہو ہے" بوڑھے نے جواب دیا "میرا بیٹا ایرانی فوج میں سارجنٹ ہے اور اس وقت شط العرب کے محاذ پر عراق کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے جاؤ" کرنل مصدق کے ماتحت نے اسے اشارہ کردیا۔

بوڑھے نے عورت کو اشارہ کیا۔ اس نے زمین پر پڑا ہوا اپنا بنڈل اٹھالیا اور بوڑھے کے ساتھ چل پڑی۔

کرنل مصدق کا ذہن بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ اس حسینہ کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔

کرنل مصدق ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے ایک ماتحت نے کولڈ ڈرنک کی بوتل اس کی طرف بڑھادی۔

"نوشابہ سر!" (ایران میں کولڈ ڈرنک کو "نوشابہ" کہتے ہیں)

کرنل مصدق نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھادیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا اور وہ بُری طرح اچھل پڑا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ وہ حسینہ نوشابہ تھی۔ مشہور و معروف رقاصہ۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نوشابہ، خرم کی داشتہ تھی اور خرم، جمشید منصوری کا دست راست تھا۔ جمشید کے ایران سے فرار ہونے کے بعد خرم بھی غائب ہوگیا تھا۔ کرنل مصدق کو یقین تھا کہ جمشید کا اب بھی خرم سے قریبی رابطہ ہوگا۔ وہ نوشابہ کے ذریعے خرم اور پھر جمشید تک پہنچ سکتا تھا۔

"بھاگو!" وہ اپنے ماتحتوں کو مخاطب کرتے ہوئے دہاڑا "اس بوڑھے اور اس کے ساتھ چادر پوش عورت کو تلاش کرو۔ جلدی کرو۔ چاروں طرف پھیل جاؤ۔"

کرنل مصدق خود بھی اس طرف بھاگا جس طرف وہ بوڑھا اور چادر پوش عورت گئی تھی۔ ایک بار پھر بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ بوڑھے اور چادر پوش عورت کو گئے ہوئے صرف دو منٹ ہوئے

سکے لیکن وہ اس طرح غائب ہو چکے تھے جیسے اس دنیا میں ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

کرنل مصدق انہیں تلاش کرتا ہوا بازار بزرگ کے قالینوں والے سیکشن میں پہنچ گیا۔ اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ سائے قالینوں کی دکانوں کے درمیان کہیں غائب ہو گئے ہوں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا۔ قالینوں کی دکانوں کے درمیان ایک تنگ سا دروازہ تھا۔ اندر تاریک ڈیوڑھی تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ لکڑی کے زینے پر کوئی نہیں تھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر ڈیوڑھی میں زینے کے پیچھے دیکھا مگر وہاں کسی کا وجود نہیں تھا۔ وہ باہر آگیا اور متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

کرنل مصدق کی تلاش ناکام ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ پبلک ٹیلی فون بوتھ نمبر ۳۳ کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ماتحت کاروں میں بیٹھ چکے تھے۔ اچانک کرنل مصدق کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

"تم لوگ جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد دفتر پہنچوں گا۔ اور تم سب لوگ میرے آنے تک دفتر میں موجود رہو گے۔ کوئی آدمی ادھر ادھر نہیں ہو گا۔" کرنل مصدق کہتے ہوئے بازار کے قالینوں والے سیکشن کی طرف چل دیا۔

وہ چادر پوش عورت نوشابہ ہی تھی اور اس کے ساتھ وہ خمیدہ کمر بوڑھا جمشید منصوری تھا۔ اس کا میک اپ اس قدر مکمل اور شاندار تھا کہ کوئی اس پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

جمشید دل ہی دل میں کرنل مصدق کی پھرتی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ فون کال کے بعد چند منٹ کے اندر اندر اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے فون کیا گیا تھا لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ جمشید کو نہیں پہچان سکا تھا۔ البتہ جب نوشابہ کے چہرے سے چادر ہٹ گئی تھی اور مصدق نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا تو جمشید کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا کہ نوشابہ پہچان نہ لی جائے۔ لیکن اس وقت تو نہیں البتہ کچھ دیر بعد غالباً مصدق نے اسے پہچانا تھا اور اب بڑی شدومد سے ان دونوں کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔

جمشید نوشابہ کو ساتھ لے کر بڑی تیزی سے مختلف گلیوں میں گھومتا ہوا بحفاظت نوشابہ کے فلیٹ میں پہنچ گیا تھا جہاں خرم ان کا منتظر بیٹھا تھا۔ اس نے قمیص اتار رکھی تھی اور بائیں بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ لوگ دیر تک بیٹھے تازہ ترین صورت حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ جمشید منصوری نے چہرے سے بوڑھے والا میک اپ صاف کر دیا تھا۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ چہار سو مکمل سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ان گلیوں میں دن کے وقت لوگوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی لیکن اس وقت یہاں قبرستان کا سا سکوت طاری تھا۔

وہ تینوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک خرم چونک گیا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کوئی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ جمشید اور نوشابہ بھی گوش بر آواز ہو گئے اور پھر چند سیکنڈ بعد انہوں نے بھی وہ آواز سن لی۔ وہ ایک سے زیادہ آدمیوں کے قدموں کی آواز تھی۔ جیسے کچھ لوگ بہت محتاط انداز میں سڑک پر چل رہے ہوں۔ خرم نے قمیص پہن لی اور اٹھ کر دبے قدموں چلتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی کے سامنے دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے پردے کا ایک کونا ذرا سا سرکایا اور بازار میں جھانکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

اسٹریٹ لیمپ کی مدھم روشنی میں اسے دو انسانی سائے نظر آئے جو دکانوں کی آڑ لیتے ہوئے بہت احتیاط سے ایک طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ خرم کو یقین تھا کہ وہ صرف دو ہی نہیں ہوں گے ان کے کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی کہ انہیں گھیرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر تیزی سے جمشید اور نوشابہ کے قریب آگیا۔

"ہمیں گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے" اس نے جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "ان کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں۔ صرف دو آدمی نظر آئے ہیں۔"

جمشید ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ نوشابہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ خرم اندر کمرے کی طرف دوڑ گیا اور دو سب مشین گنیں نکال لایا۔ ایک گن اس نے جمشید کی طرف اچھال دی جسے اس نے ہوا میں ہی دبوچ لیا۔

اسی لمحے لکڑی کے زینے پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ قدموں کے بوجھ سے زینے کے تختے چرچرا رہے تھے۔ قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کم از کم دو آدمی تھے جو دروازے کے سامنے لینڈنگ پر رک گئے تھے۔ پھر یوں لگا جیسے دروازے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالا جا رہا ہو۔

"اس طرف" نوشابہ نے اشارہ کیا "ہم دوسرے کمرے کی کھڑکی سے ساتھ والے مکان کی چھت پر کود سکتے ہیں۔"

اسی لمحے دروازے پر زوردار دستک دی گئی اور اس کے ساتھ ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھولو جمشید منصوری! تم لوگ چاروں طرف سے گھیرے میں ہو۔ کسی طرف سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔ بہتر ہو گا کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو" یہ کرنل مصدق کی آواز تھی۔

اس دلچسپ داستان کی دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے۔

کامل ظہیر

ٹائپ رائٹر کی چوری

اس مرتبہ نک ویلوٹ یہودیوں کے خلاف مصروف عمل ہے اور وہ بھی فلسطینیوں کی خاطر۔ یہ دلچسپ صورت حال ایک بہ ظاہر معمولی ٹائپ رائٹر کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے جسے چرانے کے لیے آپ کے محبوب چور کو بڑے جتن کرنا پڑے۔

ایک حیرت انگیز ایجاد کی چوری کا دلچسپ واقعہ

نک ویلوٹ ان دنوں چھٹیاں منانے کے لئے ہالینڈ آیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ گلوریا بھی اس کے ساتھ تھی۔ گلوریا سے اکثر ان بن رہتی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اس کے بغیر نک ویلوٹ اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا تھا۔ ان میں ناراضگی بھی ہوتی تھی۔ بعض اوقات نوبت ہاتھا پائی تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ کئی کئی روز ان میں بول چال بند رہتی تھی اور جب تک راضی نامہ نہ ہو جاتا' نک کو چین نہیں آتا تھا۔ ہر لڑائی کے بعد صلح کا ہاتھ عام طور پر نک کی طرف سے ہی بڑھتا تھا۔

چند روز پہلے ان میں ایک بار پھر جھگڑا ہو گیا تھا اور فساد کی جڑ حسب معمول ایک خوب صورت لڑکی ہی تھی۔ یہ حسین لڑکی نک کو ایک پارک میں اکیلی بیٹھی ہوئی ملی تھی۔ اس کے قریب ہی بینچ پر ایک شولڈر بیگ بھی رکھا ہوا تھا۔ لڑکی کا لباس کسی حد تک میلا اور

بال الجھے ہوئے تھے۔ چہرے پر بے پناہ اداسی تھی لیکن یہ سب چیزیں مل کر بھی اس کے حسن کو متاثر نہیں کر سکی تھیں۔ نک کے خیال میں اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سترہ سال رہی ہوگی۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ لڑکی نیویارک کی رہنے والی نہیں تھی۔ اس کے لباس کی تراش بتا رہی تھی کہ وہ دیہی علاقے کی رہنے والی تھی یا اس کا تعلق کسی چھوٹے قصبے سے تھا۔ نک کا خیال تھا کہ شاید وہ ملازمت وغیرہ کی تلاش میں یہاں آئی تھی اور اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد پریشان ہو رہی تھی۔

نک ویلوٹ نے دو ایسے آدمیوں کو بھی اس لڑکی کے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا جن کے لباس اور چہرے بتا رہے تھے کہ وہ شریف آدمی نہیں ہیں۔ نک اس قسم کے لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایسی بے سہارا اور معصوم لڑکیوں کو لالچ دے کر پھانس لیتے تھے اور پھر یا تو انہیں نشے کا عادی بنا کر یا بلیک میلنگ کے ذریعے ان سے اپنے مقاصد پورے کرتے رہتے تھے۔ کوئی لڑکی ان کے جال میں پھنس کر بس پھڑپھڑا کر رہ جاتی تھی۔ پھر زندگی بھر ان کے چنگل سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

نک ویلوٹ کو وہ معصوم اور بھولی بھالی شکل والی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ گلوریا بھی ان دنوں موجود نہیں تھی۔ وہ دو دن پہلے ہی اپنے باس کے ساتھ ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے شکاگو گئی تھی اور مزید تین دن سے پہلے اس کی واپسی کی توقع نہیں تھی۔ لہٰذا نک نے گلوریا کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور اس لڑکی کے قریب بینچ پر بیٹھ گیا۔

ہمدردی کے دو بول سن کر وہ لڑکی جلد ہی کھل گئی۔ اس کا نام میرین تھا اور وہ جیکسن وائل کے قریب ایک چھوٹے سے ساحلی قصبے کی رہنے والی تھی۔ میرین ہائی اسکول پاس کر چکی تھی۔ اس کا ارادہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا لیکن اپنے بوائے فرینڈ کے بہکاوے میں آکر گھر سے بھاگ آئی تھی۔ بوائے فرینڈ نے اسے شاندار مستقبل کا لالچ دیا تھا لیکن نیویارک پہنچنے کے دو دن بعد وہ میرین سے اس کی رقم ہتھیا کر غائب ہو گیا تھا اور میرین نیویارک جیسے شہرِ بے وفا میں ٹھوکریں کھانے کے لئے اکیلی رہ گئی تھی۔ اس کے پاس جو تھوڑی بہت رقم بچی تھی وہ بھی ان دو دنوں میں ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنے گھر واپس جانا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس کرائے کے پیسے نہیں تھے۔ آج تو اس نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ ان دو دنوں میں بعض لوگوں نے لالچ دے کر اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہا تھا لیکن اپنے بوائے فرینڈ سے دھوکا کھانے کے بعد میرین کو تھوڑی بہت سمجھ آ گئی تھی۔ لیکن اب نک کو اپنا ہمدرد پا کر اس نے دل کی بات کہہ دی تھی۔ نک پہلا شخص تھا جس پر وہ بھروسا کرنے کو تیار ہو گئی تھی۔

اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ نک اسے گھر لے آیا۔ میرین نے جب نہا دھو کر نک کے دیئے ہوئے گلوریا کے کپڑے پہنے تو اس کا حسن نکھر آیا۔ نک دیر تک پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ رات کا کھانا انہوں نے ایک شاندار ریسٹورنٹ میں کھایا... کھانے کے بعد نک اسے براڈوے کے ایک تھیٹر میں لے گیا جہاں میرین کی کہانی سے ملتا جلتا کھیل دکھایا جا رہا تھا۔ تھیٹر سے نکل کر جب وہ گھر پہنچے تو ایک بج چکا تھا۔

نک نے جیب سے چابی نکال کر بیرونی دروازہ کھولا۔ اسی وقت میرین نے کوئی بات کہی جس پر نک کے منہ سے بے اختیار قہقہہ ابل پڑا۔ لیونگ روم کے دروازے میں رک کر نک ویلوٹ نے جیسے ہی بتی جلائی' اس کا قہقہہ حلق میں اٹک گیا۔ اپنے بالکل سامنے گلوریا کو صوفے پر بیٹھے دیکھ کر نک کے دیدے آ کوچ کر گئے۔ گلوریا کے سامنے ہی میز پر اس کا سفری بیگ بھی پڑا ہوا تھا۔

"ارے! تم کب آئیں؟" نک نے خفت مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تمہیں تو ابھی مزید تین دن شکاگو ہی میں رہنا تھا۔"

"سیمینار میں شریک ایک ممبر کی اچانک موت کی وجہ سے کانفرنس ملتوی کر دی گئی۔ میں دس بجے یہاں پہنچ گئی تھی۔ لیکن کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ یہ سب کیا ہے؟" گلوریا نے کہا۔ اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنا غصہ دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ میرین ہے" نک نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "اس کا بوائے فرینڈ اسے ورغلا کر جیکسن وائل سے لے کر آیا تھا لیکن یہاں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ پارک میں پریشان بیٹھی تھی۔ میں اسے گھر لے آیا۔"

"تم یہ آج کل کچھ زیادہ ہی سوشل بننے کی کوشش کر رہے ہو نک!" گلوریا نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور پھر ایک ایسا جملہ کہہ ڈالا جو نک کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ پھر جو ہنگامہ شروع ہوا تو صبح تین بجے تک جاری رہا۔ بالآخر جب نک پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو اسے میرین کی عدم موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ غالباً ان دونوں کی لڑائی سے پریشان ہو کر چلی گئی تھی اور جاتے ہوئے اپنا سفری بیگ بھی لے گئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد کئی روز تک نک ویلوٹ اور گلوریا میں بات چیت بند رہی۔ نک بڑی شدت سے بوریت محسوس کرنے لگا تھا۔ ان دنوں اس کے پاس کوئی کیس بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا' کیوں نہ غیر ملکی سیاحت کا پروگرام بنایا جائے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گلوریا کے بغیر سیر و تفریح میں مزہ نہیں آئے گا اور گلوریا کا منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔ چنانچہ نک نے خود ہی صلح کا ہاتھ بڑھایا اور اس طرح تین دن بعد وہ سیاحت کے لئے نکل کھڑے ہوئے.... مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے وہ ایک دن پہلے ایمسٹرڈم پہنچے تھے۔

جواہرات کی تجارت کے حوالے سے ایمسٹرڈم کا نام دنیا بھر کے شہروں میں سرِفہرست تھا۔ یہاں جواہرات کا نوّے فیصد بزنس غیر قانونی تھا۔ ایمسٹرڈم کو ہیروں کے اسمگلروں کی جنت بھی کہا جاتا تھا۔ خام ہیروں کو تراشنے اور پالش کرنے میں بھی ایمسٹرڈم کو سب سے بڑی عالمی منڈی کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کام کو یہاں گھریلو صنعت کی حیثیت حاصل تھی۔ گھر گھر مشینیں لگی ہوئی تھیں جہاں ہیروں کی تراش خراش کا غیر قانونی کاروبار ہوتا تھا۔ ہیروں کے کاروبار میں دھوکے اور فراڈ میں بھی ایمسٹرڈم کو عالمی شہرت حاصل تھی۔

نک، گلوریا کے ساتھ اس تنگ سی گلی میں گھوم رہا تھا جہاں جواہرات کی لاتعداد چھوٹی چھوٹی دُکانیں تھیں۔ مرکری بلبوں کی تیز روشنی میں شوکیسوں میں سجے ہوئے جواہرات ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ دونوں ایک دُکان میں گھس گئے۔ نک، گلوریا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایک خوب صورت نیکلس خریدنا چاہتا تھا۔ سیلزمین نے ان کے سامنے کئی سیٹ رکھ دیئے تھے۔ دونوں ایک سیٹ کے بارے میں مشورہ کررہے تھے کہ دُکان میں داخل ہونے والا ایک آدمی نک کے بالکل ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔

"یہ نقلی ہیرے ہیں مسٹر ویلوٹ" اجنبی نے نک کے کان میں اس طرح سرگوشی کی کہ سیلزمین نہ سن سکے "اگر تم یہاں لٹنا نہیں چاہتے تو میرے ساتھ چلو۔"

"تم کون ہو اور تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" نک نے مڑ کر اسے گھورا۔

اس کا خیال تھا کہ یہ بھی گھوم پھر کر جواہرات کا بزنس کرنے والا کوئی دلال ہوگا جو اس دُکان کے گاہکوں کو کاٹ رہا تھا۔ یہاں اس قسم کی باتیں عام تھیں۔ لیکن چونکا تو وہ اس بات پر تھا کہ اجنبی نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں، یہاں تم لٹ جاؤ گے" اجنبی نے پھر سرگوشی کی "جہاں تک تمہارا نام جاننے کا تعلق ہے تو ہوٹل کے رجسٹر سے کسی کا نام معلوم کرلینا زیادہ مشکل نہیں۔"

نک نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا نیکلس کاؤنٹر پر رکھ کر گلوریا کو اشارہ کیا۔ دونوں دُکان سے باہر نکل آئے۔ اجنبی بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی آیا تھا۔ وہ مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے کاروباری علاقے سے باہر آگئے۔ نک کا خیال تھا کہ وہ انہیں کسی دُکان میں لے جائے گا لیکن جب وہ تمام دُکانیں پیچھے چھوڑ آئے تو نک کے ذہن میں طرح طرح کے شبہات سر ابھارنے لگے۔

"تم ہمیں کہاں لے جارہے ہو مسٹر؟" آخر کار اس نے پوچھ ہی لیا۔

"زیادہ دور نہیں۔ میرا دفتر اس سامنے والی بلڈنگ میں ہے"

اجنبی نے چوراہے کی دوسری طرف ایک کثیرالمنزلہ عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

وہ لوگ زیبرا کراسنگ سے سڑک عبور کر کے اس بائیس منزلہ عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ اجنبی نے ایک لمحے کو رک کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر انہیں ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہ اٹھارھویں منزل پر لفٹ سے برآمد ہوئے۔ دو تین راہداریوں سے گزر کر وہ ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ دروازے پر پیتل کی ایک پلیٹ آویزاں تھی جس پر "تیوزج ڈائمنڈ کمپنی" کندہ تھا۔ اس شخص نے دروازہ کھول دیا اور انہیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد خود بھی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

یہ کمرا شوروم کے طور پر آراستہ تھا۔ تیز روشنی میں ہیرے جواہرات جگمگا رہے تھے۔ یہاں صرف ایک آدمی بیٹھا کوئی باتصویر میگزین پڑھ رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے میگزین چھپا دیا۔ نک اور گلوریا کو ساتھ لانے والے شخص نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا جس پر دفتر کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ آفس ٹیبل کے پیچھے ایک دراز قامت' بھاری بھرکم شخص بیٹھا تھا' جس کے سر کا درمیانی حصہ تقریباً صاف ہو چکا تھا۔ بھاری مونچھوں نے اس کی شخصیت کو خاصا متاثر کن بنا دیا تھا۔ نک کے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے نک سے ہاتھ ملایا اور گلوریا کی طرف دیکھ کر صرف گردن ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ دفتر کا یہ کمرا خاصا وسیع تھا۔ میز کے سامنے دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا' اس پر قیمتی صوفے تھے۔ اس شخص نے انہیں لانے والے کو اشارہ کیا اور انہیں صوفے پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔ وہ خود بھی میز کے پیچھے سے نکل کر ان کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ نک اور گلوریا کے ساتھ آنے والے نے ایک طرف رکھے ہوئے فریج میں سے مقامی مشروب کی ٹھنڈی بوتلیں نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں اور اپنے ساتھی کے قریب بیٹھ گیا۔

"میرا خیال ہے' پہلے ہم اپنا تعارف کرا دیں مسٹر ولیٹ!" مونچھوں والے نے کہا "یہ میرا دوست وان ہینڈر ہے اور مجھے صالح عبداللہ کہتے ہیں" اس کے لہجے ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق کسی عرب ملک سے ہے لیکن اس نے اس ملک کا نام نہیں بتایا تھا۔

"بات شروع کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" نک نے کہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر ولیٹ" صالح عبداللہ نے جواب دیا "ہمیں اپنا دوست ہی سمجھو" وہ چند لمحے خاموش رہ کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "بات دراصل یہ ہے کہ ہم تم سے ایک کام لینا چاہتے ہیں۔ ہمارا آدمی ایک ہفتے پہلے تم سے ملنے کے لئے نیویارک گیا تھا لیکن پتا چلا کہ تم سیر و تفریح کے لئے ملک سے باہر جا چکے ہو۔ ہمارے پاس چونکہ وقت بہت کم تھا اس لئے تمہاری تلاش شروع کر دی گئی۔ اتفاق سے آج صبح تم ہوٹل سے نکلتے ہوئے نظر آ گئے لیکن کچھ ہی دیر بعد تم لوگ ہمارے آدمی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر اتفاق سے ہی تم لوگ ڈائمنڈ مارکیٹ میں وان ہینڈر کو نظر آ گئے اور یہ تم لوگوں کو یہاں لے آیا۔ اس سلسلے میں تم لوگوں کو جو بھی زحمت اور کوفت ہوئی ہے اس کے لئے میں معذرت چاہوں گا اور اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا" اس نے وان ہینڈر کو اشارہ کیا جو اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اسے واپسی میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس کے ہاتھ میں جواہرات کے چار ڈبے تھے جو اس نے ان کے سامنے میز پر رکھ کر کھول دیئے۔ ان میں نیکلس کے خوب صورت سیٹ رکھے ہوئے تھے۔

"میڈم اپنی پسند کا نیکلس منتخب کر لیں۔ اس دوران میں ہم بات کر لیتے ہیں" صالح عبداللہ نے نک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

گلوریا ایک ایک سیٹ اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وان ہینڈر اسے سیٹوں میں لگے ہوئے ہیروں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"ہاں۔ تو تم کیا چاہتے ہو؟" نک نے صالح عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن ایک بات ذہن میں رہے کہ میرے کچھ اصول ہیں اور......"

"ہمیں سب معلوم ہے۔ ہم تم سے کوئی ایسی فرمائش نہیں کریں گے جس کے لئے تمہیں اپنے اصولوں کو نظرانداز کرنا پڑے" صالح عبداللہ نے کہا۔

"کیا چیز چوری کروانا چاہتے ہو؟" نک نے پوچھا۔

"ایک ٹائپ رائٹر" صالح عبداللہ نے کہا۔ پھر اٹھ کر میز کی دراز سے ایک لفافہ نکال لایا اور اس میں سے دو فوٹوگراف نکال کر نک کی طرف بڑھا دیئے "یہ اس ٹائپ رائٹر کی تصویریں ہیں۔ یہ تصویریں دیکھنے کے بعد تمہیں اصل ٹائپ رائٹر شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

وہ دونوں رنگین تصویریں تھیں۔ ایک سامنے کے رخ سے اور ایک غالباً بیک سائیڈ سے کھینچی گئی تھی۔ یہ ایک عام سا پورٹیبل ٹائپ رائٹر تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے رولر سے تقریباً چار انچ اوپر ایک اور رولر لگا ہوا تھا جس پر کاغذ کی ریل چڑھی ہوئی تھی۔ ایسی ریلیں عام طور پر ٹیلی پرنٹر پر لگی ہوتی ہیں۔ یہ الیکٹرک ٹائپ رائٹر تھا۔ اس کے پیچھے بجلی کی تار بھی لگی ہوئی تھی۔ سامنے کے رخ پر ٹائپ رائٹر کا نام بھی صاف لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ ٹائپ رائٹر کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ نک ولیٹ ایک دو مرتبہ پہلے بھی اس قسم کے ٹائپ رائٹر دیکھ چکا تھا۔

"یہ ٹائپ رائٹر کہاں ملے گا؟" نک نے پوچھا "یہاں ایمسٹرڈم

میں؟"
"نہیں، اس کے لئے تمہیں اپنے سیر و تفریح کے پروگرام منسوخ کر کے واپس نیویارک جانا پڑے گا، کیوں کہ ہمارے پاس صرف ایک ہفتے کا وقت ہے اور تمہیں یہ کام ایک ہفتے کے اندر اندر کرنا ہوگا۔ یہ ٹائپ رائٹر لانگ آئی لینڈ کی ایک عمارت میں موجود ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے تمہیں کچھ محنت کرنی پڑے گی۔ میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھوں گا۔ تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"میں خطرات سے نہیں گھبراتا" ٹک نے کہتے ہوئے گلوریا کی طرف دیکھا جو جواہرات کی چمک دمک میں الجھی ہوئی تھی۔ اس دوران میں وان ہینڈر نے شوروم والے کمرے سے کئی ڈبے لاکر اس کے سامنے ڈھیر کر دیئے تھے۔

"گڈ!" صالح عبداللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی "اس کا مطلب ہے کہ تم ہمارا کیس لینے کو تیار ہو؟"

"ہاں" ٹک نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو پھر تم کل ہی نیویارک روانہ ہو جاؤ" صالح عبداللہ نے کہا اور وان ہینڈر کی طرف دیکھنے لگا جو گلوریا کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک نیکلس کے بارے میں بتا رہا تھا "میں تمہارے انتخاب کی داد دیتا ہوں میڈم! اس نیکلس کی قیمت تین ہزار امریکی ڈالر ہے لیکن..."

"ہینڈر!" صالح عبداللہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ نیکلس میڈم کو تحفے میں پیش کر دو۔ مس گلوریا، ٹک ولیٹ کی دوست ہیں۔ کیا ہم انہیں کوئی تحفہ پیش نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں سر" وان ہینڈر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور گلوریا حیرت سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

"مسٹر ولیٹ!" صالح عبداللہ ٹک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تم اپنی فیس یہاں لینا چاہو تو میں ابھی پیش کر دیتا ہوں اور اگر تم چاہو تو پچیس ہزار ڈالر کی یہ رقم تمہیں نیویارک میں مل جائے گی۔ تم جس دن نیویارک پہنچو گے اسی روز ہمارا ایک آدمی یہ رقم تمہاری خدمت میں پیش کر دے گا۔ جیسا تم پسند کرو۔"

"ٹھیک ہے، رقم میں نیویارک میں لے لوں گا۔ لیکن ......"

"مطمئن رہو۔ نیویارک پہنچتے ہی تمہیں رقم مل جائے گی" صالح عبداللہ نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا "آج چار تاریخ ہے۔ چودہ تاریخ کو وہ اس ٹائپ مشین کے حصول کے لئے تم سے دوبارہ رابطہ قائم کرے گا۔ کوشش کرو کہ تم لوگ کل ہی یہاں سے نیویارک کے لئے روانہ ہو جاؤ۔"

"ٹھیک ہے، ہم کل ہی چلے جائیں گے" ٹک کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ گلوریا بھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے نیکلس گلے میں پہن لیا تھا اور بہت خوش نظر آرہی تھی۔ وہ صالح عبداللہ اور وان ہینڈر سے ہاتھ ملا کر دفتر والے کمرے سے باہر آگئے۔ دونوں میں سے کوئی بھی انہیں چھوڑنے دروازے تک نہیں آیا تھا۔

اس وقت سہ پہر کے چار بجے تھے۔ ٹک اس عمارت سے نکل کر سب سے پہلے ائرلائن کے دفتر پہنچا۔ دوسرے دن کے لئے اس نے سیٹیں بک کروائیں اور وہ شہر کی تفریح کے لئے نکل گئے۔ گلوریا چہک رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اسے تین ہزار ڈالر مالیت کا نیکلس مفت مل گیا تھا!

○☆○

ٹک ولیٹ اور گلوریا دوسرے دن صبح گیارہ بجے نیویارک پہنچے تھے۔ گلوریا واپسی کے اس سفر سے بری طرح تھک گئی تھی۔ گھر پہنچتے ہی وہ بستر پر گر کر انٹا غفیل ہو گئی۔ ٹک پر بھی اگرچہ کسی حد تک تھکن سوار تھی لیکن وہ سو کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں بھی اس کے پاس وقت کم تھا اور وہ ایک ایک لمحے سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

گرم پانی کے غسل سے اس کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ اس نے لباس بدلا، کافی بنائی اور لیونگ روم میں بیٹھ کر کافی کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ ساتھ ہی وہ اس کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ صالح عبداللہ کے کہنے کے مطابق وہ ٹائپ رائٹر لانگ آئی لینڈ پر واقع ایک عمارت میں تھا۔ صالح عبداللہ نے اسے مکمل پتا سمجھا دیا تھا۔ سب سے پہلے اسے اس عمارت اور وہاں کی صورت حال کا جائزہ لینا تھا، اس کے بعد ہی کسی قسم کی منصوبہ بندی کی جا سکتی تھی۔

گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ ابھی اس نے اپنی گاڑی پر تقریباً ایک میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے پر نظر پڑی تو چونک گیا۔ اس ایک میل کے سفر کے دوران وہ تین مرتبہ مختلف سڑکوں پر مڑا تھا اور آئینے میں سرخ رنگ کی وہ اسپورٹس کار بھی اسے تیسری مرتبہ نظر آئی تھی۔ اس نے کار کی رفتار کم کر دی اور اسے مختلف سڑکوں پر گھمانے لگا۔ سرخ رنگ کی وہ اسپورٹس کار بدستور اس کے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی تھی لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ نگرانی کرنے والا کون تھا اور کیوں اس کی نگرانی کر رہا تھا۔

دونوں کاروں کے درمیان فاصلہ کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ ٹک نے ایک بار پھر عقبی آئینے میں دیکھا، سرخ اسپورٹس کار کے اسٹیئرنگ پر کوئی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے کار ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک لی۔ اس ریسٹورنٹ کا ایک دروازہ عقبی گلی میں بھی کھلتا تھا۔ ٹک نے سوچا تھا کہ اس ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کافی پیئے گا اور اگر وہ لڑکی بھی ریسٹورنٹ میں آگئی تو اسے چکمہ دے کر عقبی دروازے سے غائب ہو جائے گا۔

اس نے ایک ایسی میز کا انتخاب کیا جہاں سے ٹائلٹ کی طرف جانے والا راستہ قریب ہی تھا۔ وہ ابھی ٹھیک طرح سے کرسی

پر بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ سرخ اسپورٹس کار والی لڑکی ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی۔ اس نے نیلے رنگ کا اسکرٹ بلاؤز پہن رکھا تھا اور سر پر اسکارف باندھا ہوا تھا۔ ٹمک نے اس اسکارف کی وجہ سے ہی اسے پہچانا تھا۔ وہ لڑکی چند لمحے دروازے میں کھڑی متجسس نگاہوں سے ہال میں دیکھتی رہی، پھر ٹمک کو دیکھ کر بے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اس کی میز کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ میز کے قریب آکر رک گئی۔ ٹمک نے چونکنے والے انداز میں سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ لڑکی خاصی حسین تھی۔ عمر بیس بائیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

"سنا تھا کہ تم عورتوں کے پیچھے دیوانے ہوئے پھرتے ہو لیکن آج ایک عورت سے بچنے کے لئے بھاگے پھر رہے ہو" اس نے ٹمک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" ٹمک بری طرح چونک گیا۔

"میں گھنٹے بھر سے تمہارے مکان کے سامنے کھڑی تمہارا انتظار کررہی تھی لیکن تم تو اس طرح بھاگے ہو جیسے تمہارے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہو" لڑکی نے کہا۔

"اوہ! تم میرا انتظار کررہی تھیں۔ لیکن کیوں؟" ٹمک نے حیرت سے پوچھا۔ ویسے وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

"تمہاری یہ امانت تم تک پہنچانے کے لئے" لڑکی نے کہتے ہوئے اپنے ہینڈ بیگ میں سے نیلے رنگ کا ایک بھاری لفافہ نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

ٹمک نے لفافہ اٹھالیا، وہ بند تھا۔ اس نے ایک طرف سے لفافہ چاک کیا تو اسے ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ لفافے میں ڈالر تھے۔ ٹمک نے گردن اٹھا کر دیکھا لیکن وہ لڑکی غائب ہو چکی تھی۔ وہ ہال میں کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ ٹمک کو حیرت تھی کہ لڑکی اتنی جلدی کہاں غائب ہو سکتی تھی۔ اس کی سرخ اسپورٹس کار ریسٹورنٹ کے سامنے پارکنگ لین میں کھڑی نظر آرہی تھی۔ ٹمک لفافہ ہاتھ میں پکڑے ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا۔

وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک وہاں کھڑا رہا۔ اسپورٹس کار پارکنگ لین میں موجود تھی لیکن لڑکی کا دور دور تک کہیں نام و نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ ٹمک نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لفافے کو دیکھا۔ اس میں سے نوٹ نکال کر گنے۔ وہ پچیس ہزار ڈالر تھے۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ رقم صالح عبداللہ کی طرف سے بھیجی گئی تھی۔ لیکن رقم پہنچانے والی وہ لڑکی بڑی پُراسرار ثابت ہوئی تھی۔ وہ لفافہ اس کی میز پر پھینک کر چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑا اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ پولیس کی ایک پیٹرول کار سرخ اسپورٹس کے قریب آکر رکی اور دو پولیس والے نیچے اترے۔ ایک کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پُرزہ تھا۔ اس نے اسپورٹس کار کے قریب رک کر پہلے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کے پُرزے کو پھر اسپورٹس کار کی نمبر پلیٹ کو دیکھا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ٹمک ولوٹ ایک نیوز اسٹینڈ کے قریب کھڑا تھا۔ پولیس والا بھی وہاں آگیا۔

"یہ کار یہاں کس نے کھڑی کی ہے؟" کانسٹیبل نے نیوز اسٹینڈ والے سے پوچھا۔

"پتا نہیں؟" نیوز اسٹینڈ والے نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا بات ہے آفیسر؟" ٹمک نے دریافت کیا۔

"یہ کار تقریباً ایک گھنٹہ پہلے تھرا اینو سے چوری کی گئی تھی۔ تمام پیٹرول کاروں کو اس کا نمبر بتا دیا گیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چور پکڑے جانے کے خوف سے اسے یہاں پارک کر کے بھاگ گیا ہے" کانسٹیبل نے بتایا۔

ٹمک کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے نیلا لفافہ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

لانگ آئی لینڈ میں مطلوبہ عمارت تلاش کرنے میں ٹمک ولوٹ کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ سولہ منزلہ وہ عمارت وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ عمارت میں آمدورفت کے تین گیٹ تھے اور ہر گیٹ ایک دوسرے سے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ عمارت کاروباری علاقے میں واقع تھی۔ اس کے سامنے والی سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بعض عمارتوں کے گراؤنڈ فلور پر بڑے بڑے گودام تھے، اس لئے یہاں ٹرکوں کی آمدورفت بھی جاری تھی۔ ان ٹرکوں کی وجہ سے ٹریفک میں بھی بڑی گڑبڑ ہو رہی تھی۔

لانگ آئی لینڈ کا یہ علاقہ سو فیصد کاروباری علاقہ تھا۔ یہاں کئی کئی منزلہ عمارتیں تھیں اور ہر عمارت میں مختلف تجارتی کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ اس بزنس ڈسٹرکٹ سے ذرا آگے رہائشی علاقہ شروع ہو جاتا تھا جہاں بڑے خوب صورت اور وسیع و عریض بنگلے تھے۔ یہاں زیادہ تر رہائش ان لوگوں کی تھی جو کسی نہ کسی طرح غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہو کر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ یہ مافیا کی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھا۔ مافیا کے کئی ڈان لانگ آئی لینڈ میں رہائش پذیر تھے۔ ان میں ایک برونو، ٹمک ولوٹ کا دوست تھا۔ اس کی کوٹھی تقریباً چار ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کوٹھی کے گرد فصیل نما دیوار تھی جس کے اوپر خاردار تاروں کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ ان تاروں میں چوبیس گھنٹے برقی رو دوڑتی رہتی تھی۔ ٹمک کو صرف ایک مرتبہ برونو کی کوٹھی میں داخل ہونے کا موقع ملا تھا اور یہاں کے حفاظتی انتظامات دیکھ کر وہ حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔ اس کے خیال میں وہائٹ ہاؤس میں بھی اتنے زبردست حفاظتی انتظامات نہیں تھے جتنے اس کوٹھی میں تھے۔

ٹمک اپنی کار مطلوبہ عمارت کے سامنے سڑک کے دوسری طرف کھڑی کر کے کچھ دیر تک کار میں بیٹھا رہا، پھر اتر کر ایک چھوٹے سے کافی ہاؤس میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس وقت صرف

دو تین گاہک تھے لیکن ٹک اچھی طرح جانتا تھا کہ چند منٹ بعد جب دفتروں میں لنچ کا وقفہ ہو گا تو اس علاقے کے کسی کافی ہاؤس یا ریسٹورنٹ میں تل دھرنے تک کو جگہ نہیں ملے گی۔ دروازے کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ کر ٹک نے ویٹرس کو چکن سینڈوچ اور کافی کا آرڈر دیا اور سڑک کے دوسری طرف عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ اس عمارت کا درمیان والا گیٹ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ ایک بہت بڑے ٹرک کو گیٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس عمارت میں بھی گودام ہوں گے۔

"کچھ اور سر؟" اپنے قریب ہی نسوانی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ وہ تیکھی ویٹرس تھی جس نے کافی کا مگ اور سینڈوچ کی پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی تھی اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دانت آبدار موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

"تھینکس" ٹک نے کہتے ہوئے پلیٹ میں سے ایک سینڈوچ اٹھالیا۔

سینڈوچ کھاتے اور کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ سامنے والی عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دوسری عمارتوں کی طرح یہ سولہ منزلہ عمارت بھی مختلف تجارتی کمپنیوں کے دفاتر پر مشتمل تھی۔ ہر منزل پر کھڑکیوں کے ساتھ متعلقہ کمپنیوں کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے بعض بورڈ تو پڑھے بھی نہیں جاتے تھے۔ چھٹی منزل کی ایک کھڑکی کے ساتھ سالویشن آرمی کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ بورڈ اگرچہ خاصا پرانا تھا لیکن بورڈ کی تحریر پڑھی جاسکتی تھی۔

گلوبل ایکسپورٹ کا وہ آفس بھی چھٹی منزل پر ہی تھا جس میں وہ ٹائپ مشین موجود تھی۔ ٹک کو آفس کا نمبر تو معلوم تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ عمارت کے سامنے والے رخ پر تھا یا پچھلی طرف۔ فی الحال یہی معلوم کرنے کے لئے وہ یہاں آیا بھی تھا۔ اس نے کافی کا آخری گھونٹ بھر کر خالی مگ میز پر رکھا ہی تھا کہ سامنے والی عمارت سے لاتعداد لوگ باہر نکلتے ہوئے نظر آئے۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دفتروں میں لنچ کا وقفہ ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور کافی ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ وہ کچھ دیر تک دروازے کے قریب کھڑا ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ کافی ہاؤس اب کھچا کھچ بھر چکا تھا۔

ٹک سڑک عبور کر کے سولہ منزلہ عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ درمیان والے گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا۔ یہ عمارت بھی بیشتر دوسری عمارتوں کی طرح تھی۔ درمیان میں وسیع و عریض کمپاؤنڈ تھا اور چاروں طرف بلڈنگ پھیلی ہوئی تھی۔ گراؤنڈ فلور پر گودام ہی تھے۔ ایک گودام کے سامنے کھڑے ہوئے ٹرک پر پرانے کپڑوں کی بڑی بڑی گانٹھیں لادی جارہی تھیں۔ ٹرک پر موٹے حروف میں "سالویشن آرمی" لکھا ہوا تھا۔ ٹک کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس گودام میں جمع ہونے والے کپڑے کہیں اور بھیجے جارہے تھے۔

وہ لفٹ کے ذریعے چھٹی منزل پر پہنچ گیا۔ طویل راہداری تقریباً سنسان تھی۔ اکثر لوگ لنچ کے لئے باہر جاچکے تھے۔ اکا دکا لوگ ہی نظر آرہے تھے۔ ٹک اس راہداری میں واقع دفاتر کے دروازوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کچھ فاصلے پر سالویشن آرمی کا چھوٹا سا بورڈ نظر آیا۔ ایک فٹ چوڑا اور ڈیڑھ فٹ لمبا یہ بورڈ دیوار میں ایک بریکٹ کے ذریعے اس طرح لگا ہوا تھا کہ اسے دونوں طرف سے پڑھا جاسکتا تھا۔ دروازے کے سامنے اسٹول پر ایک آدمی بیٹھا سینڈوچ کھا رہا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور وہ چلتے چلتے سالویشن آرمی کے دفتر والے دروازے کی طرف مڑ گیا۔ لیکن اس نے جیسے ہی دروازے کے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا' اسٹول پر بیٹھا ہوا آدمی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کا راستہ روکتے ہوئے بولا "اے مسٹر! کہاں منہ اٹھائے چلے جارہے ہو؟ کس سے ملنا ہے؟"

"کیا سالویشن آرمی کے دفتر میں جانے کے لئے اجازت لینی پڑتی ہے؟" ٹک نے اسے گھورا۔

"سالویشن آرمی کے دفتر کا دروازہ یہ ہے" اس شخص نے دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

ٹک نے چونک کر دیکھا' دونوں دروازے ساتھ ساتھ تھے۔ ان میں تقریباً ایک فٹ کا فاصلہ تھا اور سالویشن آرمی کا وہ بورڈ دونوں دروازوں کے درمیان دیوار پر آویزاں تھا۔ ٹک نے اس دروازے کی طرف دیکھا جس میں اس نے داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس پر ایک چھوٹی سی پلیٹ آویزاں تھی جس پر "گلوبل ایکسپورٹ" لکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ محض اتفاق سے اپنے مطلوبہ دفتر کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ اس نے دروازے پر کھڑے ہوئے اس آدمی کی طرف دیکھا جس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ وہ طویل القامت اور گٹھے ہوئے جسم کا تھا۔ دائیں بغل کے نیچے اس کا کوٹ قدرے ابھرا ہوا تھا جس سے ٹک کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے کوٹ کے نیچے بغلی ہولسٹر پہن رکھا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس ہولسٹر میں ریوالور بھی موجود ہو گا۔

ٹک نے مسکرا کر اس شخص کی طرف دیکھا' اس کا شکریہ ادا کیا اور سالویشن آرمی کے دفتر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ وسیع و عریض کمرا تھا جس میں تین میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف پرانے کپڑوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اس عمارت میں تمام کمرے اتنے ہی لمبے چوڑے تھے اور لوگوں نے اپنی ضرورت کے مطابق پارٹیشن لگا کر انہیں مختلف حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا لیکن سالویشن آرمی والوں نے کسی پارٹیشن کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

سامنے والی میز پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے پلاسٹک کا لنچ بکس کھلا رکھا تھا اور وہ سینڈوچ کھا رہی تھی۔ اس عورت کی عمر ساٹھ سے کچھ اوپر ہی رہی ہو گی۔ بال برف کی طرح سفید اور چہرے پر لاتعداد جھریاں تھیں۔ ناک پر موٹے عدسوں والی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ اس نے عینک درست کرتے ہوئے ٹمک کی طرف دیکھا۔

"ہیلو گرینڈ ما!" ٹمک نے قریب پہنچ کر کہا اور بڑی بے تکلفی سے میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس عورت نے "گرینڈ ما" کے نام سے مخاطب کئے جانے پر برا نہیں مانا تھا۔

"ہیلو!" اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سینڈوچ کا ٹکڑا لنچ بکس میں رکھ دیا اور ٹمک کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں دراصل اپنی ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ اس کا نام بینسی ہے۔ تین مرتبہ شادی کر چکی ہے لیکن مس کہلاتی ہے۔ پہلے وہ سالویشن آرمی کے مین بلڈنگ والے دفتر میں ہوا کرتی تھی لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ اب وہ یہاں آ گئی ہے" ٹمک نے بڑھیا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"یہاں اس نام کی کوئی شادی شدہ مس کام نہیں کرتی" بڑھیا نے اسے گھورا۔

"آج کل وہ شادی شدہ نہیں ہے۔ فارغ ہی ہے۔ اسی لئے میں اس کی تلاش میں آیا ہوں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کس دفتر میں ہے؟" ٹمک نے کہا۔

"میں سالویشن آرمی میں اس نام کی کسی مس کو نہیں جانتی۔ میں نے بارہ سال کی عمر میں سالویشن آرمی میں رضاکارانہ طور پر کام شروع کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک اس ادارے میں یہ نام سننے میں نہیں آیا۔ میرا خیال ہے تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ یہ زندگی اس لئے تو نہیں ملی کہ اسے اس طرح عورتوں کے پیچھے بھاگ کر ضائع کیا جائے۔ یہی وقت اگر تم اچھے کاموں میں صرف کرو تو اس سے نہ صرف تمہارا بلکہ بہتوں کا بھلا ہو گا۔ تم سے خدا بھی خوش ہو گا اور خدا کے بندے بھی....."

"خدا کے بندے تو کبھی کسی سے خوش نہیں ہو سکتے" ٹمک نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس بڑھیا نے دین دنیا کی بھلائی پر لیکچر شروع کر دیا تو اسے روکنا مشکل ہو جائے گا۔ "البتہ میں خدا کو خوش رکھنے کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کیا کروں، وقت ہی نہیں ملتا۔"

"ضروری نہیں کہ تم بھاگ دوڑ کرو۔ اگر وقت نہ ہو تو مالی خدمات سے بھی خدا اور اس کے بندوں کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہو" بڑھیا نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے" ٹمک نے کہتے ہوئے جیب سے پرس نکال لیا۔ بڑھیا کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ ٹمک نے پرس میں سے بیس ڈالر کا ایک نوٹ نکال کر بڑھیا کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ بڑھیا نے میز پر ایک طرف رکھی ہوئی رسید بک کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ٹمک نے اسے روک دیا۔

"رسید کی ضرورت نہیں" ٹمک نے کہا "ویسے آج کل میرے پاس کچھ فالتو وقت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اسے کسی بھلائی کے کام پر صرف کیا جائے" اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک منصوبہ کلبلانے لگا تھا۔

"اوہ! کیوں نہیں" بڑھیا کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے میز پر رکھا ہوا بیس ڈالر کا نوٹ اٹھا کر اپنے پرس میں رکھ لیا تھا۔ "کیا تم ہمارے لئے عطیات جمع کرو گے؟"

"نہیں۔ بلکہ میں کچھ اور سوچ رہا ہوں" ٹمک نے جواب دیا۔ ...اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بڑھیا کو بتانے لگا کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ بھی نیکی کا ایک کام ہے" بڑھیا نے کہا۔

اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک نوعمر لڑکا بھی تھا۔ بڑھیا نے ریتا اور جیکب کے ناموں سے ان کا تعارف کرایا۔ وہ دونوں اسی دفتر میں کام کرتے تھے۔ وہ کپڑوں کے انبار کے پاس کھڑے ہو گئے اور کپڑے چھانٹ چھانٹ کر الگ کرنے لگے۔

"اوکے گرینڈ ما! میں کل آؤں گا" ٹمک کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گیا۔ اس نے ریتا اور جیکب کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

O☆O

دفتروں میں لنچ کا وقفہ ختم ہو چکا تھا۔ لوگ جوق در جوق واپس آ رہے تھے۔ اس بلڈنگ میں چار لفٹیں لگی ہوئی تھیں اور وہ سب کی سب نیچے گئی ہوئی تھیں۔ ٹمک لفٹ کا انتظار کرنے کے بجائے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک بار پھر اسی ریسٹورنٹ میں تھا جہاں اس نے کافی پی تھی۔ اس وقت ریسٹورنٹ بالکل خالی تھا۔ وہ جیسے ہی کرسی پر بیٹھا، وہی نیگرو ویٹرس چمکتے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

"کافی" ٹمک نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

چند سیکنڈ بعد ویٹرس نے اس کے سامنے کافی کا مگ رکھ دیا۔ وہ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے سامنے والی عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ وہ کسی اور نظریئے سے اس عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ گلوبل ایکسپورٹ کا دفتر سالویشن آرمی کے دفتر سے ملحق تھا۔ لیکن اس نے جو خاکہ بنایا تھا وہ ابھی پوری طرح اس کے ذہن میں واضح نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ پہلے گلوبل ایکسپورٹ اور اس میں کام کرنے والے لوگوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کی جائیں۔ ...گلوبل ایکسپورٹ کے دفتر کے سامنے گن مین کی موجودگی نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔ ایسٹرڈام میں صالح عبداللہ نے اسے

پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس کیس میں اس کی زندگی کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ دن کے وقت دروازے پر گن مین کی موجودگی کا مطلب تھا کہ رات کو بھی یہاں حفاظت کے خصوصی انتظامات ہوتے ہوں گے۔ ممکن ہے کوئی خفیہ الارم بھی نصب ہو۔ اپنے منصوبے کے تانے بانے بننے سے پہلے اسے ان تمام باتوں کا جائزہ لینا تھا۔

شام کو جب وہ گھر پہنچا تو چھ بج رہے تھے۔ گلوریا گھر پر موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی نک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"کیا بات ہے' بہت خوش نظر آرہے ہو۔ کوئی نئی لڑکی مل گئی ہے کیا؟" گلوریا نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں" نک نے جواب دیا "اور آج میں تمہیں بھی اس لڑکی سے ملوانے لے جاؤں گا۔ ہم آٹھ بجے یہاں سے نکلیں گے۔ میں نے اسے ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ اس کا گھر ہیڈن پارک کے قریب ہے۔ اسے لے کر ہم کسی ریسٹورنٹ میں چلیں گے۔ اس مرتبہ تم میرے انتخاب کی داد دوگی۔"

"میں اس کتیا کا منہ نوچ لوں گی" گلوریا چڑ کر بولی۔

"میرا خیال ہے تم ایسا نہیں کرسکو گی" نک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اس کے برعکس تم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکو گی۔"

گلوریا کوئی جواب دینے کے بجائے اسے گھور کر رہ گئی تھی۔ نک نے بھی یہ پروگرام اچانک ہی بنایا تھا۔ سالویشن آرمی کے دفتر میں اس بڑھیا سے باتوں کے دوران اس نے نہ صرف اس کا نام بلکہ گھر کا پتا بھی معلوم کرلیا تھا۔ اور اب گلوریا کو ساتھ لے کر اس کے گھر جانا چاہتا تھا تاکہ اس سے گلوبل ایکسپورٹ والوں کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کرسکے۔

گلوریا نہ چاہنے کے باوجود آٹھ بجے اس کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔ نک راستے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا "دیکھو گلوریا! میری وہ دوست بے حد حساس ہے۔ اس کے سامنے کوئی ایسی بات مت کرنا جس سے کسی قسم کی بدمزگی پیدا ہو۔"

"تو پھر ایسا کرو کہ مجھے یہیں اتار دو" گلوریا نے چڑ کر کہا "تم جہاں چاہو جھک مارتے پھرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اعتراض تو تمہیں مس سلویا سے ملنے کے بعد بھی نہیں ہوگا" نک معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ہیڈن پارک پہنچ گئے۔ بوڑھی مس سلویا کا مکان تلاش کرنے میں بھی نک کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ چھوٹا سا مکان تھا۔ دستک کے جواب میں دروازہ اسی بڑھیا نے کھولا تھا۔

"کون ہو؟ کس سے ملنا ہے؟" اس نے ناک پر عینک درست کرتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"میں سولومن ہوں گرینڈ ما! آج دن میں آپ کے دفتر میں ملاقات ہوئی تھی" نک نے کہا۔

"اوہ! مسٹر سولومن! کیسے آنا ہوا؟ آؤ۔ اندر آجاؤ" بڑھیا نے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔

"اس طرف سے گزر رہا تھا' سوچا کیوں نہ تم سے بھی ملاقات ہوجائے" نک نے کہتے ہوئے پیچھے مڑ کر گاڑی میں بیٹھی ہوئی گلوریا کو اشارہ کیا۔ گلوریا گاڑی سے اتر کر اس کے قریب آگئی تو نک نے کہا "اس سے ملو گرینڈ ما! یہ میری بیوی ہے' گلوریا۔ اور گلوریا! یہ ہیں مس سلویا۔"

گلوریا کا دماغ گھوم گیا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ نک مذاق کررہا ہے لیکن پھر وہ سنبھل گئی۔ اب ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ گھر سے روانہ ہونے سے پہلے نک نے گلوریا کو تجسس میں رکھ کر مس سلویا کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ اسے چڑانے کے لیے تھا۔

"جلدی سے تیار ہوجاؤ گرینڈ ما! ہم تمہیں ڈنر پر لے جارہے ہیں" نک نے کہا۔

مس سلویا اکیلی ہی رہتی تھی۔ وہ فوراً ہی جانے پر آمادہ ہوگئی

مکالمہ

ایک صاحب ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو ان دونوں میں عمر کے موضوع پر گفتگو چل پڑی۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ ساٹھ برس کی عمر ہوجانے کے باوجود تمہاری صحت بے حد اچھی ہے" ڈاکٹر نے کہا۔

"میں نے یہ کب کہا کہ میں ساٹھ برس کا ہوں" آدمی نے کہا "میری عمر تو اسی سال ہورہی ہے۔"

"اوہ" ڈاکٹر نے حیرت سے اسے دیکھا پھر بولا "پھر تو تمہارے والد کافی طویل عمر تک زندہ رہے ہوں گے۔"

"مگر میں نے یہ کب کہا کہ ان کا انتقال ہوچکا ہے۔ وہ زندہ ہیں اور ان کی عمر ایک سو دو سال ہے۔"

"میرے خدا! یہ بتاؤ کہ تمہارے دادا کتنے عرصے جیے تھے؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ مرچکے ہیں۔ وہ اس وقت ایک سو چوبیس سال کے ہیں۔ اور شادی کرنے جارہے ہیں۔"

"اللہ ہو غنی! ایک سو چوبیس سال کی عمر میں انہیں شادی کی کون سی ضرورت آپڑی ہے؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ انہیں کوئی ضرورت آپڑی ہے؟"

اور دوسرے کمرے میں جا کر تیاری کرنے لگی۔ اس دوران میں گلوریا نے نک کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی، "تمہیں شرم آنی چاہئے تھی! مس سلویا تمہاری ماں کے برابر ہے اور تم اسے بیوقوف بنا رہے ہو۔"

"میں اسے بیوقوف کب بنا رہا ہوں" نک نے اسے گھورا۔ "تم قسم کھا کر کہو' اگر میں نے اس کے بارے میں تم سے کوئی غلط بات کی ہو یا کوئی ایسا جملہ کہا ہو جس سے اس کی توہین کا پہلو نکلتا ہو؟"

گلوریا چپ ہو گئی۔ نک نے واقعی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ اس نے تو صرف یہ کہا تھا کہ وہ اسے اپنی ایک نئی دوست سے ملوانا چاہتا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد مس سلویا جب دوسرے کمرے سے برآمد ہوئی تو گلوریا بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر سکی تھی۔ مس سلویا پر بوڑھی گھوڑی لال لگام والی مثال بالکل فٹ آتی تھی۔ شوخ رنگ کے لباس پر اس نے بہت گہرا میک اپ کیا تھا۔

جب وہ لوگ ریسٹورنٹ پہنچے تو ساڑھے نو بج چکے تھے۔ نک نے بہترین کھانے کا آرڈر دیا۔ پھر کھانے کے دوران وہ جلد ہی اصل موضوع پر آگیا "ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں گرینڈ ما' بُرا تو نہیں مانو گی؟"

"بالکل نہیں" مس سلویا نے نوالہ نگلتے ہوئے کہا "کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"آج دن میں تمہارے دفتر جاتے ہوئے میں غلطی سے ساتھ والے گلوبل ایکسپورٹ کے دفتر میں گھسنے لگا تھا لیکن گن مین نے مجھے روک دیا۔"

"گن مین نے!" مس سلویا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ میرا خیال ہے اس دفتر کے دروازے پر جو آدمی متعین ہے' اس نے کوٹ کے نیچے بغلی ہولسٹر پہن رکھا تھا جس میں ریوالور بھی موجود تھا" نک نے کہا "بہرحال' میں پوچھ رہا تھا ان کا بزنس کیا ہے؟ وہ کیا ایکسپورٹ کرتے ہیں؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں" مس سلویا نے نفی میں سر ہلایا "ویسے وہ کچھ عجیب' پُراسرار قسم کے لوگ ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ٹیڈ سے پوچھا تھا لیکن اس نے بھی بات ٹال دی تھی۔"

"ٹیڈ کون؟" نک نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہی جو اُن کے دروازے پر ڈیوٹی دیتا ہے۔ وہ فارغ اوقات میں کبھی کبھار میرے دفتر میں آجاتا ہے۔ ویسے وہ ٹائلٹ بھی میرے ہی دفتر کا استعمال کرتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اپنے دفتر کے ٹائلٹ میں کیوں نہیں جاتا۔"

"اس دفتر میں کتنے آدمی کام کرتے ہیں؟" نک نے پوچھا۔

"ٹیڈ کے علاوہ تین آدمی ہیں جو مستقل کام کرتے ہیں" مس سلویا نے کہا "ٹیڈ اور وہ تینوں یہودی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی وہاں آتے رہتے ہیں جو سب کے سب یہودی ہیں۔"

"ان کے دفتر میں کوئی الارم سسٹم بھی لگا ہوا ہے؟" نک نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چند مہینے پہلے بعض نامعلوم آدمیوں نے اس دفتر میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بلڈنگ کے محافظ نے انہیں دیکھ لیا تھا جس پر وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے الارم لگوا لیا جس کا سلسلہ قریبی پولیس اسٹیشن سے ملا ہوا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ پولیس اسٹیشن وہاں سے صرف سو گز کے فاصلے پر ہے۔ لیکن تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو مسٹر سولومن؟"

"کچھ نہیں۔ ویسے ہی کچھ تجسس سا ہو گیا تھا" نک نے بات بناتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور پھر وہ مس سلویا کو لے کر اس کے گھر آ گئے۔

"ڈنر کا بہت بہت شکریہ! لیکن تھوڑی دیر بیٹھو گے نہیں؟" مس سلویا نے کہا۔

"چلو۔ تھوڑی دیر بیٹھ لیتے ہیں" نک نے کہتے ہوئے گلوریا کو اشارہ کیا اور وہ دونوں گاڑی سے اتر آئے۔

مس سلویا انہیں سٹنگ روم میں لے آئی۔ نک نے بیٹھنے سے پہلے پچاس ڈالر کا ایک نوٹ اس کی مٹھی میں دبا دیا۔

"یہ..... یہ کس لئے؟" مس سلویا بولی۔

"خدا کو خوش رکھنے کے لئے اس کے بندوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں" نک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں پرانے سے صوفوں پر بیٹھ کے کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر نک ویلیٹ اصل موضوع پر آگیا "گرینڈ ما! ریسٹورنٹ میں کھانے کے دوران جب میں گلوبل ایکسپورٹ کے بارے میں سوالات کر رہا تھا تو تم نے کہا تھا کہ میں یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا تعلق..." اس نے اپنے اور گلوریا کی طرف اشارہ کیا۔ "حکومت کی ایک خفیہ ایجنسی سے ہے۔ چند روز پہلے ہمیں نہایت باوثوق ذرائع سے یہ اطلاع ملی تھی کہ گلوبل ایکسپورٹ والے ہیروئن کا بزنس کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایکسپورٹ تو کیا نہیں کیا کرتے ہیں لیکن تھائی لینڈ' برما اور جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک سے غیر قانونی طور پر ہیروئن امپورٹ کر کے یہاں پھیلا رہے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ ہیروئن ہماری نوجوان نسل کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ اسکولوں کے نو عمر بچوں تک کو اس نشے کا عادی بنایا جا رہا ہے۔ تم خود سمجھ سکتی ہو کہ اس کا نتیجہ کتنا بھیانک ہو گا۔ ہماری آنے والی نسلیں ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج ہو جائیں گی اور یہ ملک تباہ ہو جائے گا۔

"میں گلوبل ایکسپورٹ والوں کے خلاف تحقیقات کر رہا ہوں۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ لوگ ہیروئن کن ذرائع سے اسمگل کرتے ہیں اور اس گھناؤنے کاروبار میں کون کون ملوث ہے۔ ان کے خلاف کوئی کارروائی ٹھوس ثبوت حاصل ہونے کے

بعد ہی ہو سکتی ہے اور وہ ثبوت ان کے دفتر کی فائلوں ہی سے مل سکتا ہے۔ آج میں اندازہ لگا چکا ہوں کہ ان کے دفتر میں گھسنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔ اگر تمہارے تعاون سے مجھے ان کے خلاف کوئی کامیابی حاصل ہو گئی تو تمہارے پرسنل اکاؤنٹ میں ایک خطیر رقم جمع ہو سکتی ہے۔"

ہیروئن کے نام پر مس سلویا سناٹے میں آ گئی۔ اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپنے لگے۔ جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں بھی ہلکا سا ارتعاش تھا "اوہ! مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ ڈرگس کا بزنس کرتے ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی ان کی پُراسرار سرگرمیوں پر شبہ تھا۔ مجھے بتاؤ، میں اس سلسلے میں تمہارے ساتھ کیا تعاون کر سکتی ہوں؟"

"اس کے لئے رازداری شرط ہے" ٹمک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مطمئن رہو۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی کہ میں کیا کر رہی ہوں" مس سلویا نے اس مرتبہ ٹھوس لہجے میں کہا۔

ٹمک نے معنی خیز نگاہوں سے گلوریا کی طرف دیکھا اور پھر بُڑھیا کی طرف جھک کر مدھم لہجے میں بتانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

O☆O

دوسرے دن شام کو جب ٹمک ولیٹ، مس سلویا کے گھر پہنچا تو وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ کوئی بات شروع کرنے سے پہلے اس نے موم کا ایک ٹکڑا ٹمک کی طرف بڑھا دیا "یہ گلوبل ایکسپورٹ کے دفتر کے بیرونی دروازے کی چابی کا عکس ہے۔"

"کوئی دشواری پیش تو نہیں آئی تھی؟" ٹمک نے موم کا وہ ٹکڑا لیتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی بہت" مس سلویا نے جواب دیا "آج دن میں جب ٹائلٹ جانے کے لئے نیڈ ہمارے دفتر میں آیا تو اس نے باتھ روم جانے سے پہلے بیلٹ اتار کر میری میز پر رکھ دی تھی۔ اسی بیلٹ میں چابیوں کا گچھا اُڑسا ہوا تھا۔ وہ لنچ کا وقفہ تھا اور اتفاق سے مس ریٹا اور جیکب بھی اس وقت دفتر میں موجود نہیں تھے۔ میں نے موقع ملتے ہی تمہاری ہدایت کے مطابق موم کے اس ٹکڑے پر بیرونی دروازے کی چابی کا دونوں طرف کا عکس لے لیا۔"

ٹمک موم کے ٹکڑے کو دیکھنے لگا جس پر دو جگہ چابی کا عکس بنا ہوا تھا۔ یہ عکس اس قدر مکمل اور واضح تھا کہ بڑی آسانی سے ڈپلی کیٹ چابی بنائی جا سکتی تھی۔

"اور الارم سسٹم؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کل وہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کروں گی" مس سلویا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل آؤں گا" ٹمک نے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پچاس ڈالر کا نوٹ تھمایا اور باہر نکل گیا۔

دوسرے دن شام کو ٹمک ولیٹ ایک بار پھر بوڑھی مس سلویا کے مکان پر پہنچ گیا۔ اس دوران میں وہ ڈپلی کیٹ چابی بنوا چکا تھا۔ لیکن مس سلویا نے گلوبل ایکسپورٹ میں لگے ہوئے الارم سسٹم کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ خاصا تشویش ناک تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق الارم کا یہ نظام کمپیوٹرز سسٹم کے تحت کنٹرول کیا جاتا تھا۔ وہ کمپیوٹر پولیس اسٹیشن میں تھا اور اسے براہ راست وہیں سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ شام کو جب دفتر بند کر دیا جاتا تو تالے میں چابی گھماتے ہی خودکار نظام کے تحت الارم آن ہو جاتا تھا لیکن الارم کو آف کرنے کے لئے پولیس اسٹیشن کے کمپیوٹر سے کی بیچ کی جاتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ کمپنی کا باس جب صبح دفتر آتا تو وائی تالی کے ذریعے متعلقہ پولیس آفیسر کو مخصوص کوڈ بتا کر الارم آف کرنے کی ہدایت کر دیتا۔ یہ کوڈ صرف کمپنی کے باس کو معلوم تھا اور یہ مستقل کوڈ نہیں تھا۔ ہر دو دن بعد تبدیل کر دیا جاتا تھا۔

یہ صورت حال ٹمک ولیٹ کے لئے خاصی تشویش ناک تھی۔ کوڈ معلوم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ پہلے کمپنی کے باس کو گرفت میں لیا جاتا اور کمپنی کا باس، مس سلویا کی طرح سیدھا سادا تو تھا نہیں جو اس کی کسی چال میں آ جاتا۔ ٹمک کے خیال میں اس کی اب تک کی ساری محنت رائیگاں گئی تھی۔ اسے کوئی اور طریقہ سوچنا تھا۔ جب تک الارم سسٹم کو ناکام نہ بنایا جاتا، دفتر میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس کے پاس صرف تین دن رہ گئے تھے اور اسے ان تین دنوں ہی میں سب کچھ کرنا تھا۔

اس سے اگلے روز ٹمک، گلوریا کے ساتھ ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ ایک جگہ ہجوم دیکھ کر اسے گاڑی روک لینا پڑی۔ وہ گلوریا کو گاڑی ہی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے گاڑی سے اتر کر ہجوم میں گھس گیا۔ وہ لوگوں کو ادھر اُدھر دھکیلتا ہوا جیسے ہی آگے پہنچا ٹھٹک کر رک گیا۔ سڑک پر ایک آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ لاش کیا تھی گوشت پوست کا ایک ڈھیر تھا۔ کھوپڑی کے پرخچے اُڑ چکے تھے اور بھیجہ آس پاس بکھرا ہوا تھا۔ گوشت کے لوتھڑے اور خون کے چھینٹے دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کسی نیگرو کی لاش تھی۔

"کیا ہوا؟ یہ کیسے مرا؟" ٹمک نے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا جو لاش پر چادر ڈالنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"یہ شخص اس عمارت کے شیشے صاف کر رہا تھا کہ نیچے گر گیا" اس شخص نے جواب دیا۔

ٹمک نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ یہ بیس بائیس منزلہ عمارت تھی۔ اٹھارھویں یا اُنیسویں منزل پر رسیوں سے بندھا ہوا ایک تختہ لٹکا ہوا تھا۔ یہ شخص غالباً اس تختے پر کھڑا کھڑکیوں کے شیشے صاف کر رہا تھا اور شاید توازن بگڑ جانے سے نیچے گر گیا تھا۔ اتنی بلندی سے پختہ سڑک پر گرنے کے بعد اس کا جو حشر ہوا تھا وہ ٹمک

دیکھ چکا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں بجلی کا ایک کوندہ سا لپکا۔ وہ ایک بار پھر اوپر دیکھنے لگا۔ رسیوں کی مدد سے عمارت کے ساتھ جھولتا ہوا وہ تختہ اسے عجیب سا لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ بلندی سے گر کر مرنے والا نیگرو اسے ایک راستہ دکھا گیا تھا۔

فضا میں پولیس کی گاڑی اور ایمبولینس کے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔ سائرن کی آواز سنتے ہی لوگوں کا ہجوم چھٹنے لگا۔ ٹک بھی وہاں سے ہٹ کر اپنی کار کے قریب آگیا۔

"کیا ہوا؟" اس کے کار میں بیٹھتے ہی گلوریا نے پوچھا۔

"ایک نیگرو عمارت کی کھڑکیوں کے شیشے صاف کرتے ہوئے گر کر مر گیا ہے" ٹک نے اس عمارت کی طرف اشارہ کیا "لیکن اس سے مجھے ایک راستہ مل گیا ہے۔"

"تم کتنے خود غرض اور بے حس ہو گئے ہو ٹک" گلوریا نے اسے گھورا۔

"اس میں خود غرضی اور بے حسی کی کیا بات ہے! اسے میں نے تو دھکا نہیں دیا تھا" ٹک نے کہتے ہوئے انجن اسٹارٹ کر دیا۔

اس دوران میں ایمبولینس اور پولیس کی پیٹرول کار وہاں پہنچ چکی تھی۔ دو پولیس والوں نے کار سے اترتے ہی کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ لوگوں کو سڑک سے ہٹا دیا گیا تھا تاکہ ٹریفک جاری رہ سکے۔ راستہ ملتے ہی ٹک نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ قریب سے گزرتے ہوئے گلوریا نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ ایک پولیس آفیسر چادر ہٹا کر لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ لاش دیکھ کر گلوریا کپکپا کر رہ گئی۔

اس روز گھر پر دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے ٹک ویلوٹ کا ذہن بڑی تیزی سے اس منصوبے کے تانے بانے بُن رہا تھا۔ منصوبہ تو اس نیگرو کی لاش دیکھتے ہی اس کے ذہن میں آگیا تھا۔ اب وہ اس کی باریکیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کھانا ختم کرتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گلوبل ایکسپورٹ کے دفتر میں داخل ہونے کا منصوبہ بنا لیا تھا لیکن اس کے لئے مس سلویا کا تعاون ضروری تھا۔

ایک گھنٹے بعد ٹک اسی عمارت میں سالویشن آرمی کے دفتر میں بیٹھا مس سلویا سے بات کر رہا تھا۔ اس وقت اگرچہ مس ریٹا اور جیکب بھی موجود تھے لیکن وہ دونوں اپنے کام میں مصروف تھے۔ یوں بھی ٹک اور سلویا مدھم لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔

"ٹھیک ہے گرینڈ ما" ٹک کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا "میں کل صبح ہی سے کام شروع کر دوں گا۔"

"ہمارے دفتر پر تمہارا یہ بہت بڑا احسان ہوگا" مس سلویا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

سالویشن آرمی کے دفتر سے نکلنے کے بعد ٹک چند منٹ تک عمارت کے سامنے کھڑا اس کی بلندی کا جائزہ لیتا رہا، پھر کار میں بیٹھ کر شہر کے اس علاقے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کی مطلوبہ چیزیں مل سکتی تھیں۔ رات دس بجے کے قریب جب وہ گھر لوٹا تو اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ اور ڈکی اس کی مطلوبہ چیزوں سے بھری ہوئی تھی جنہیں اٹھا کر وہ اندر لے آیا، اور پھر رات بھر اپنے کام میں مصروف رہا۔ صبح سات بجے جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو اپنی رات بھر کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔

○☆○

ٹک ویلوٹ جب ایک چھوٹے پک اپ ٹرک میں گھر سے نکلا تو گلوریا بھی اس کے ساتھ تھی۔ ٹک نے براؤن کلر کی پرانی سی پتلون اور اسی رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ یہ کپڑے خاصے استعمال شدہ تھے اور ان پر مختلف رنگوں کے چھینٹے وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ سر پر ایک پرانی سی ٹوپی بھی تھی۔ گلوریا کا حلیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ان کے یہ حلیے دیکھ کر صاف اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ دونوں رنگ و روغن کا کام کرتے تھے۔

پک اپ ٹرک میں ساز و سامان لدا ہوا تھا۔ آدھا انچ موٹی کئی گز نائلون کی رسیاں، ایک تختہ جس پر صندوق سا بنا ہوا تھا، ایک انچ موٹی لوہے کی چھ فٹ لمبی راڈ، جس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی ریلیں لگی ہوئی تھیں، بیٹری سے چلنے والی ایک چھوٹی مگر انتہائی طاقتور موٹر اور بجلی کے تار کا ایک پورا کوائل موجود تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایسی چیزیں تھیں جو ضرورت کے وقت کام آ سکتی تھیں۔ وہ گھر سے نکلے تو اس وقت دوپہر کا ایک بجا تھا۔ جب اس سولہ منزلہ عمارت کے قریب پہنچے تو دو بجنے والے تھے۔ ٹک پک اپ ٹرک کو عمارت کے کمپاؤنڈ میں لیتا چلا گیا۔ وہ اپنا سامان ٹرک سے اتار کر لفٹ میں رکھنے لگے تو عمارت کے سپرنٹنڈنٹ نے انہیں روک لیا۔

"یہ سامان کیسا ہے اور کہاں لے جا رہے ہو مسٹر؟"

"سالویشن آرمی کے دفتر کی کھڑکیوں کے شیشوں کی صفائی اور رنگ و روغن وغیرہ کرنا ہے۔ یہ ورک آرڈر ہے" ٹک ویلوٹ نے مس سلویا کی طرف سے جاری کردہ ورک آرڈر دکھا دیا۔

"ٹھیک ہے، جاؤ" سپرنٹنڈنٹ کہتا ہوا اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔

ٹک اور گلوریا نے مل کر سامان لفٹ میں رکھا اور سب سے آخری منزل پر پہنچ گئے۔ یہاں تک تو سامان لفٹ کے ذریعے آگیا تھا لیکن زینے کے ذریعے یہ سامان چھت تک لے جانے میں ان دونوں کے سانس پھول گئے۔ اتنی بلندی پر تیز ہوا کی وجہ سے سنبھل کر کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ چھت پر چاروں طرف تقریباً ڈھائی فٹ اونچی منڈیر تھی۔ ٹک نے اس پر جھک کر نیچے جھانکا اور وہ سامان اسی جگہ لے آئے جہاں سے بالکل نیچے سالویشن آرمی کا دفتر تھا۔

چھت پر جگہ جگہ تین تین فٹ اونچے ستون اٹھے ہوئے تھے۔ یہ ستون غالباً اس لئے چھوڑے گئے تھے کہ اس سے اوپر اگر کوئی منزل تعمیر کرنی ہو تو آسانی رہے۔ ٹمک نے منڈیر کے قریب دو ستونوں کا انتخاب کیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے چھ فٹ لمبی آہنی راڈ دونوں ستون کے درمیان باندھ کر اس میں دونوں طرف چھوٹی ریلیں پھنسا دی تھیں اور ان پر نائلون کی رسّی چڑھا دی تھی۔ نائلون کی رسّی ایک بہت بڑے، کوائل پر لپٹی ہوئی تھی۔ اس کوائل کے ساتھ ایک چھوٹی سی الیکٹرک موٹر نصب تھی۔ کوائل کو ستون کے ساتھ مضبوطی سے باندھنے کے بعد ٹمک نے بیٹری سے چلنے والی دوسری موٹر کا کنکشن کوائل کی موٹر سے ملا دیا اور بجلی کے تار کا ایک سرا اسی موٹر سے ملا دیا۔ باقی تار کوائل میں لپٹا ہوا تھا جس کے دوسرے سرے پر بجلی کا سوئچ لگا ہوا تھا۔ سوئچ والا یہ سرا کوائل کے اندر سے باہر نکلا ہوا تھا۔

آہنی راڈ میں لگی ہوئی ریلز میں سے ہو کر آنے والے رسّوں کو تختے سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ وہ جھولے کی طرح لٹک گیا۔ جھولتا ہوا یہ پلیٹ فارم تقریباً پانچ فٹ لمبا اور ڈھائی فٹ چوڑا تھا۔ اسی کے ایک حصے میں لکڑی کا صندوق بنا ہوا تھا جس میں پرانے چیتھڑے، برش اور اس قسم کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں جو کھڑکیوں کی صفائی وغیرہ میں کام آ سکتی تھیں۔

ٹمک نے گلوریا کی مدد سے وہ تختہ دیوار سے نیچے لٹکا دیا۔ پہلے اس نے بیٹری والی موٹر اسٹارٹ کی، پھر تار کے کوائل میں لگا ہوا سوئچ آن کر دیا۔ رسّوں میں بندھا ہوا تختے کا پلیٹ فارم آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا۔ ٹمک نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے سوئچ آف کر دیا۔ تختہ رک گیا۔ دوسرا سوئچ آن کرنے سے تختہ اوپر آنے لگا۔ منڈیر کے قریب آتے ہی ٹمک نے سوئچ آف کر کے تختہ روک دیا اور گلوریا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اس وقت چار بجے ہیں، پانچ بجے دفتروں کی چھٹی ہو جائے گی۔ ہم ساڑھے پانچ بجے اپنا کام شروع کریں گے۔ بلکہ میں اپنا کام شروع کروں گا اور تم ٹھیک آٹھ بجے گاڑی لے کر سالویشن آرمی کے دفتر کے عین نیچے سڑک پر پہنچ جاؤ گی۔"

"ٹھیک ہے" گلوریا نے اثبات میں سر ہلا دیا "اس دوران میں کیا کروں؟"

"تم چاہو تو گھر چلی جاؤ۔ میں ادھر اُدھر گھوم پھر کر وقت گزار لوں گا" ٹمک نے جواب دیا۔

وہ دونوں سیڑھیوں کے راستے چھت سے پہلی منزل پر آ گئے اور وہاں سے لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ عمارت کے گیٹ سے نکلتے ہی ان کے راستے الگ ہو گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد گلوریا تو ایک ٹیکسی میں سوار ہو گئی اور ٹمک ولیوٹ مخالف سمت میں پیدل ہی چلتا رہا۔ اس کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔ پولیس اسٹیشن وہاں سے تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر ایک گلی میں واقع تھا۔ یہ سڑک ون وے تھی اور اس عمارت تک جانے کے لئے دوسری سڑک سے گھوم کر آنا پڑتا تھا۔ ٹمک کے اندازے کے مطابق اگر پولیس بڑی عجلت میں بھی اس عمارت تک پہنچنے کی کوشش کرے تو انہیں سات آٹھ منٹ ضرور لگیں گے۔

ٹمک وہاں سے ٹہلتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ دفاتر کی چھٹی ہو گئی تھی۔ سڑکوں پر ایک دم ٹریفک بڑھ گیا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے تک اچھی خاصی ہاہو رہی اور پھر ان سڑکوں پر ٹریفک بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔ چھ بجے بالکل سناٹا چھا گیا۔ صرف اِکّا دُکّا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ٹمک ٹھیک چھ بجے ریسٹورنٹ سے نکلا اور ٹہلتا ہوا ساڑھے چھ بجے عمارت کے گیٹ میں داخل ہوا۔ اس عمارت میں اِکّا دُکّا دفاتر اب بھی کھلے تھے۔

عمارت کا سپرنٹنڈنٹ اپنے دفتر سے نکل رہا تھا۔ اس نے ٹمک کی طرف دیکھا لیکن کوئی تعرض نہیں کیا۔ ٹمک نے لفٹ میں داخل ہو کر آخری منزل کا بٹن دبا دیا۔ آخری منزل پر لفٹ سے نکل کر وہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا چھت پر آ گیا۔ اس نے اپنے سامان کا جائزہ لیا، رسّوں کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور بیٹری والی موٹر اسٹارٹ کر کے منڈیر پر چڑھ کر رسّے سے بندھے ہوئے لکڑی کے پلیٹ فارم پر آ گیا۔ اس وقت اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر اس کا توازن ذرا سا بھی بگڑ جاتا تو اسے موت کے منہ سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ صرف ایک روز پہلے وہ اس ٹمرو کا حشر دیکھ چکا تھا جو کھڑکیاں صاف ..... کرتے ہوئے اٹھارھویں منزل سے نیچے گرا تھا۔ اس وقت ٹمک نے اپنی زندگی واقعی داؤ پر لگا دی تھی۔

بجلی کے تار والا کوائل پلیٹ فارم پر ہی رکھا ہوا تھا۔ ٹمک اپنا توازن درست کرتا ہوا پلیٹ فارم پر بیٹھ گیا اور کوائل میں لگی ہوئی چھوٹی سی راڈ پکڑ کر پہلا سوئچ آن کر دیا۔ اس کی تیار کردہ لفٹ آہستہ آہستہ نیچے آنے لگی۔ کوائل میں لپٹا ہوا تار بھی آہستہ آہستہ کھلتا چلا گیا۔ لکڑی کی یہ لفٹ جیسے جیسے نیچے جا رہی تھی ٹمک کو سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ نیچے جاتا ہوا تختہ آہستہ آہستہ جھولے کی طرح جھول رہا تھا۔

سالویشن آرمی کے دفتر کی کھڑکیوں کے سامنے پہنچ کر اس نے سوئچ آف کر دیا۔ لفٹ رک گئی۔ ٹمک نے بجلی کے تار والا کوائل تختے پر رکھ دیا اور رسّے کو پکڑ کر آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم میں سنسنی کی لہریں سی بھری ہوئی تھیں۔ تختہ آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔ معمولی سا بھی عدم توازن اسے موت کے منہ میں دھکیل سکتا تھا۔ وہ رسّے کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا عمارت کی کھڑکیوں کا جائزہ لینے لگا۔ سالویشن آرمی کے دفتر کی کھڑکی اور گلوبل ایکسپورٹ کے دفتر کی ایک کھڑکی کے درمیان تقریباً پانچ فٹ کا فاصلہ تھا۔ کھڑکیوں کے آگے تقریباً چھ انچ چوڑی کارنس بنی ہوئی تھی۔ پوری عمارت کی کھڑکیوں کی یہی صورت حال تھی۔ چھ انچ

چوڑی اس کارنس پر کھڑے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسی کوئی کوشش کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن ٹمک نے عمارت کی چھت پر جس حساب سے رسّے باندھے تھے اس سے اس کی یہ لفٹ سالویشن آرمی کے دفتر کی کھڑکی اور گلوبل ایکسپورٹ کے دفتر کی کھڑکی کے درمیان آگئی تھی۔

ٹمک نے نیچے دیکھا۔ سڑک پر اِکاّ دُکاّ راہ گیر کھلونے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ سورج غروب ہونے میں ابھی تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ اپنا کام شروع کردے تاکہ نیچے سے اگر کوئی اسے دیکھے تو کسی قسم کا شبہ نہ کرسکے۔ اس نے پلیٹ فارم پر ایک طرف لگے ہوئے بکس میں سے پوڈر کا ایک ڈبّا اور اسفنج کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔ یہ شیشے صاف کرنے کا مخصوص پوڈر تھا۔ اس نے پہلے کھڑکی کے شیشوں پر پوڈر چھڑکا اور پھر اسے اسفنج سے رگڑنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد وہ کپڑے سے شیشہ صاف کرنے لگا۔ بظاہر یہ شیشے بالکل صاف ہوگئے۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا جو بتدریج گہرا ہوتا جارہا تھا۔ نیچے سڑک پر اب مکمل سناٹا تھا۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی گزرتی ہوئی نظر آجاتی۔

ٹمک نے کلائی پر بندھی ہوئی الیکٹرونک واچ کا بٹن دبا کر دیکھا۔ آٹھ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ اس نے اپنے اصل پروگرام پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور.... گلوبل ایکسپورٹ کے دفتر والی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ تختے کے آخری سرے سے اس کھڑکی کا فاصلہ تقریباً ڈھائی فٹ تھا۔ جھولتے ہوئے تختے سے کھڑکی پر چڑھنے کی کوشش کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ یوں بھی وہ کھڑکی، تختے سے تقریباً تین فٹ اونچی تھی۔ اگر کھڑکی کھلی ہوتی تو کوئی کوشش کی جاسکتی تھی لیکن کھڑکی بند تھی۔

اس نے کھڑکی کی چوکھٹ کے اوپر والے حصے پر دونوں طرف دو موٹی موٹی آہنی کیلیں ٹھکی ہوئی دیکھ لی تھیں۔ ٹمک کو اس بات سے غرض نہیں تھی کہ یہ کیلیں کیوں ٹھونکی گئی تھیں۔ لیکن اس نے ان سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رسّوں کو مضبوطی سے پکڑلیا اور جسم کو جھٹکے دے کر تختے کو جھولے کی طرح دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔ اس کا یہ اقدام نہایت ہی خطرناک تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ تختہ دائیں بائیں تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ ٹمک کی نظریں کھڑکی کی چوکھٹ پر پہلی کیل پر مرکوز تھیں۔ رسّہ جیسے ہی کیل کے قریب پہنچتا، ٹمک اسے زوردار جھٹکا دے کر کیل میں پھنسانے کی کوشش کرتا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو سڑک پر سے گزرتے ہوئے لوگ اسے ایسی حرکت کرتے دیکھ کر پاگل یا اپنی جان کا دشمن ہی سمجھتے۔

بالآخر پانچویں کوشش میں رسّہ کیل میں اٹک گیا۔ تختہ ایک جھٹکے سے رک کر تقریباً ساٹھ کے زاویے پر ایک طرف جھک گیا۔ اس طرح جھٹکا لگنے اور تختے کے جھکنے سے ٹمک کے پیر بھی پھسل گئے۔ اسے بھی ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اگر اس نے رسّے کو مضبوطی سے نہ پکڑا ہوتا تو اسے نیچے گرنے سے کوئی طاقت نہیں بچاسکتی تھی۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ اس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے نیچے جھانکا اور پھر کھڑکی کے اوپر والے شیشے پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔ شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ ٹمک کو یقین تھا کہ اتنی بلندی پر شیشہ ٹوٹنے کی آواز کہیں بھی نہیں سُنی گئی ہوگی۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا اور پھر ٹوٹے ہوئے شیشے میں ہاتھ ڈال کے بولٹ گرا کر کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔

کھڑکی پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹمک کا پیر پھسل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے رسّہ بھی چھوٹ گیا اور وہ ساٹھ کے زاویے پر جھولتے ہوئے تختے پر بڑی تیزی سے پھسلنے لگا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے موت ناچتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اور پھر.... یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا ہاتھ تختے کے نچلے سرے پر بندھے ہوئے رسّے پر جم گیا۔ اس نے مضبوطی سے گرفت جمائی۔ وہ تختے سے نیچے فضا میں معلق تھا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا اور دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔

وہ چند لمحے اسی طرح لٹکا رہا، پھر اس نے پیر قریبی کھڑکی کی چھ انچ چوڑی کارنس پر جمائے اور آہستہ آہستہ تختے پر واپس آنے کی کوشش کرنے لگا۔ دوبارہ تختے پر پہنچ کر وہ کئی منٹ تک رسّے کو مضبوطی سے پکڑے آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ جب حواس بحال ہوئے تو پھر کھڑکی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس مرتبہ اسے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔

کھڑکی سے اندر کود کر اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر پہلے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بجنے میں دو منٹ تھے۔ پھر وہ ٹارچ کی روشنی میں اس دفتر کا جائزہ لینے لگا۔ پارٹیشن کے ذریعے اس دفتر کو چار مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر پارٹیشن میں میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک میز پر ٹائپ رائٹر بھی رکھا ہوا دکھائی دیا لیکن وہ اس طرح کا ٹائپ رائٹر نہیں تھا جس کی اس نے تصویر دیکھی تھی۔ ایک پارٹیشن والے کمرے کا دروازہ مقفل تھا۔ اسے یہ تالا کھولنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ سامنے ہی میز پر اس کا مطلوبہ ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔

ٹمک میز کے قریب رک گیا۔ اس وقت آٹھ بج کر تین منٹ ہوئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ گلوریا گاڑی لے کر نیچے سڑک پر پہنچ چکی ہوگی۔ وہ گہری نظروں سے ٹائپ مشین کا جائزہ لینے لگا۔ اس سے منسلک تار دیوار میں لگے ہوئے ساکٹ میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس ٹائپ مشین کا کہیں اور کوئی کنکشن نہیں تھا۔ ٹمک ولیوٹ نے ہاتھ بڑھا کر ساکٹ میں سے تار کھینچ لیا اور اس کے ساتھ ہی وہ بُری طرح اچھل پڑا۔

باہر راہداری میں الارم کا شور گونج اٹھا تھا۔ ٹمک کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس ساکٹ کا تعلق بھی الارم سسٹم سے تھا۔ اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیب میں سے کیوٹس کا ایک ننھا

کیا ہوا تھیلا نکالا جو خاصا بڑا تھا۔ اس نے ٹائپ رائٹر کو تھیلے میں ڈال کر زپ بند کر دی۔ اور اس کے اسٹریپ کندھوں پر ڈال لئے۔ یہ بیگ بچوں کے اسکول بیگ کی طرح تھا جسے اسٹریپرز کی مدد سے پشت پر لادا جا سکتا تھا۔

اب یہاں ایک لمحے کو بھی رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ راہداری میں الارم بج رہا تھا۔ عمارت کے محافظ کسی بھی لمحے راہداری میں پہنچ سکتے تھے اور پولیس کو بھی یہاں پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگنے تھے۔ نک کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ کر رسے کا سہارا لے کر کارنس پر کھڑا ہو گیا اور کھڑکی بند کر کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں ہاتھ ڈال کر اندر سے بولٹ چڑھا دیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے رسے کو مضبوطی سے پکڑے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے کھڑکی کے اوپر کیل میں اٹکے ہوئے رسے کو کھینچ کر باہر نکال دیا۔ رستہ کیل سے نکلتے ہی ایک زوردار جھٹکا لگا اور تختہ بڑی تیزی سے جھولے کی طرح دائیں بائیں جھولنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رسے کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ جب تختہ کسی قدر رکا۔۔۔ تو نک رسے پر پھسلتا ہوا تختے پر آ گیا۔

نک نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ اس کے عین نیچے ایک گاڑی کھڑی تھی جس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ نک نے پہلا سوئچ آن کر دیا۔ تختہ آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا۔ اس نے پشت پر لدا ہوا بیگ اتار لیا اور لکڑی کے صندوق میں سے چیزیں نکال نکال کر تختے پر رکھنے لگا۔ پھر اس نے اندر ہاتھ ڈال کر صندوق کو اوپر کھینچا۔ اس کے اندر ایک اور صندوق تھا جو آسانی سے باہر آ گیا۔ نک نے ٹائپ رائٹر والا بیگ اس میں رکھ کر ڈھکنا بند کر دیا اور باہر نکالی ہوئی چیزیں دوسرے صندوق میں رکھنے لگا۔ یہ دُہرا صندوق اس نے گزشتہ رات بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔

تختہ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔ نک نے بہت سوچ سمجھ کر یہ ساری پلاننگ کی تھی۔ اس نے رسوں کی لمبائی کا انتظام بھی عمارت کی بلندی کے حساب سے ہی کیا تھا۔ ابھی تختہ زمین سے دس فٹ اوپر تھا کہ فضا میں سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز عمارت کے دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ پولیس والے واقعی قانون پرست تھے۔ یہ سڑک اگرچہ سنسان پڑی تھی، وہ چاہتے تو اسی سڑک سے صرف تین منٹ میں یہاں پہنچ سکتے تھے لیکن انہوں نے ون وے کے قانون کی خلاف ورزی کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور لمبا چکر کاٹ کر اس طرف آ رہے تھے۔ پولیس والوں کی یہ قانون پرستی نک کے مفاد میں تھی۔ تختہ زمین سے تقریباً چار فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ سامنے ہی گلوریا کی گاڑی کھڑی تھی جس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ نک چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا اور ٹائپ رائٹر والا صندوق اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔

"سامنے والی گلی سے نکل جاؤ، جلدی۔ پولیس آ رہی ہے" وہ کہتا ہوا دوبارہ اچھل کر تختے پر چڑھ گیا اور دوسرا بٹن دبا دیا۔

وہ چوتھی منزل کے قریب سے گزر رہا تھا کہ پولیس کی گاڑی گھوم کر اس سڑک پر آ گئی۔ ٹھیک اسی لمحے نک نے ذرا آگے گلوریا کی گاڑی کو بھی سامنے والی گلی میں گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ چھٹی منزل کے سامنے پہنچ کر نک نے اپنی لفٹ روک لی اور بڑے اطمینان سے سالویشن آرمی کے دفتر کی کھڑکی کے شیشے صاف کرنے لگا۔ پولیس کی گاڑی نیچے رک چکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ایک اور گاڑی آ گئی۔ کئی پولیس والے ان گاڑیوں سے اتر کر دوڑتے ہوئے عمارت میں گھس گئے تھے۔ پھر غالباً نک کو دیکھ لیا گیا۔ پولیس گاڑیوں پر لگی ہوئی سرچ لائٹس کا رخ اوپر کی طرف کر دیا گیا اور میگا فون پر نک کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی ٹرالی چھت پر لے جائے۔

نک نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دوسرا بٹن دبا دیا۔ تختہ آہستہ آہستہ اوپر جانے لگا۔ جب وہ چھت پر پہنچا تو وہاں پر موجود کئی پولیس والے اسے رائفلوں کی زد پر لئے ہوئے تھے۔

O☆O

نک ویلوٹ کو تقریباً دو گھنٹے پولیس اسٹیشن میں روکے رکھنے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اس دوران میں پولیس نے سالویشن آرمی کے دفتر کی انچارج مس سلویا اور گلوبل ایکسپورٹ کے یہودی باس کو بھی طلب کر لیا تھا۔ مس سلویا نے نک کے حق میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ وہ مسٹر سولومن کو ذاتی طور پر جانتی ہے اور اس نے ہی اسے کھڑکیوں کے شیشوں کی صفائی کا کام سونپا تھا۔ جب کہ گلوبل ایکسپورٹ کے باس نے یہ بیان دیا تھا کہ اس کے دفتر سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ ممکن ہے الارم کسی فنی خرابی کی وجہ سے بج اٹھا ہو۔ نک ویلوٹ کے پاس سے کوئی مشکوک چیز برآمد بھی نہیں ہوئی تھی اس لئے اسے چھوڑ دیا گیا۔

نک کی ہدایت کے مطابق گلوریا ٹائپ رائٹر لے کر سیدھی اپنے اپارٹمنٹ پر پہنچی تھی۔ نک گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ گلوبل ایکسپورٹ کے باس نے ٹائپ مشین کی چوری کی رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی تھی؟

وہ رات اور اگلا دن نک یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ اس ٹائپ رائٹر میں ایسی کیا خاص بات تھی جس کی چوری کے لئے اسے اتنی خطیر رقم دی گئی تھی اور جس کے چوری ہونے پر مالک نے رپورٹ تک نہیں لکھوائی تھی، جبکہ اسے یقین تھا کہ دفتر میں اس قدر سخت حفاظتی انتظامات صرف اس ٹائپ رائٹر ہی کے لئے کئے گئے تھے لیکن اس کے چوری ہونے پر خاموشی معنی خیز تھی۔

دوسرے دن شام سے کچھ پہلے نک ٹائپ رائٹر کا راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ محض اتفاق سے ہوا تھا۔ اس نے ٹائپ رائٹر کی تار ساکٹ میں لگا رکھی تھی۔ شام چھ بجے کے قریب ٹائپ رائٹر ٹیلی پرنٹر کی طرح خود بخود چل پڑا۔ اس کے اوپر لگے ہوئے رول کے کاغذ پر پیغام ٹائپ ہو رہا تھا۔ چند سطریں ٹائپ ہونے کے بعد مشین پھر خاموش ہو گئی۔ نک نے کاغذ کا وہ ٹکڑا پھاڑ لیا، صرف چھ سطریں ٹائپ ہوئی تھیں۔ لیکن وہ جو کچھ بھی تھا نک کی سمجھ میں نہیں آ سکا۔ وہ صرف اتنا سمجھ سکا کہ اگر یہ کوئی پیغام تھا تو

اس کے لئے کوڈ الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ کوئی عام آدمی یہ پیغام نہیں سمجھ سکتا تھا۔

ٹمک ایک بار پھر ٹائپ مشین میں الجھ گیا۔ مشین کے نیچے ایک چھوٹی سی کیل ابھری ہوئی دیکھ کر اس نے اس پر انگلی رکھ دی۔ اس کیل کو دباتے ہی یوں لگا جیسے ٹائپ مشین کے اندر زلزلہ سا آگیا ہو۔ چند سیکنڈ بعد مشین پُرسکون ہوگئی۔ اچانک ٹمک کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ اس نے موصول ہونے والا پیغام سامنے رکھا اور اسے دیکھ کر وہی حروف ٹائپ کرنے لگا جو اس پیغام میں استعمال کئے گئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ اس نے اس ٹائپ مشین کا راز معلوم کرلیا تھا۔

O☆O

وہ چودہ تاریخ تھی۔ اس رات وہ خوب صورت لڑکی ٹمک ولیوٹ سے وہ ٹائپ مشین لے گئی، جس نے پُراسرار طریقے سے اسے چوبیس ہزار ڈالر پہنچائے تھے۔ ٹمک نے اسے دوسرے دن ڈنر پر مدعو کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے معذرت کرلی کہ وہ کل صبح کی فلائٹ سے فرینکفرٹ جارہی ہے۔

دوسرے دن صبح گیارہ بجے ٹی وی کی خبروں پر جب ٹمک نے یہ سنا کہ آج صبح فرینکفرٹ جانے والا طیارہ ٹیک آف کے آدھے گھنٹے بعد فضا میں ایک دھماکے سے پھٹ کر تباہ ہوگیا تو ٹمک بے اختیار دل تھام کر رہ گیا۔ اس وقت گلوریا بھی موجود تھی۔

"وہ لڑکی اسی جہاز میں سفر کررہی تھی" ٹمک نے کہا۔

"کون لڑکی؟" گلوریا نے اسے گھورا۔

"جو رات کو مجھ سے ٹائپ رائٹر لے کر گئی تھی" ٹمک بولا "اور مجھے یقین ہے کہ طیارہ کسی اتفاقی حادثے کا شکار نہیں ہوا بلکہ اسے تباہ کیا گیا ہے اور اس کی وجہ اس ٹائپ مشین کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی۔"

"اس ٹائپ مشین کے بارے میں تم نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا" گلوریا بولی۔

"وہ کوئی عام ٹائپ مشین نہیں تھی" ٹمک نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "یہ تو تمہیں ماننا ہی پڑے گا کہ اسرائیلی یہودی زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کررہے ہیں۔ ان کی انٹیلی جنس موساد کو دنیا کی ذہین ترین انٹیلی جنس سمجھا جاتا ہے۔ فلسطینی حریت پسندوں کے خلاف ان کی دہشت گردی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ فلسطینیوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ موساد کے ہیڈ کوارٹرز اور ان کے بعض اہم ترین فیلڈ اسٹیشنوں کے درمیان مخصوص فریکوئنسی والے ٹیلی پرنٹرز پر خفیہ زبان کے ذریعے پیغامات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ یہ ٹیلی پرنٹر اسرائیلیوں ہی کی ایجاد ہے۔ اس مشین کی ظاہری شکل وصورت پورٹیبل ٹائپ رائٹر سے ملتی جلتی ہے۔ اسے استعمال بھی ٹائپ مشین ہی کی طرح کیا جاتا ہے۔ یعنی جو خفیہ پیغام موصول ہوگا اسے سامنے رکھ کر مشین کے نیچے ایک مخصوص بٹن دبانے کے بعد جو کچھ ٹائپ ہوگا وہ خفیہ پیغام کا سیدھا سادا سا مطلب ہوگا۔"

"یعنی کی بورڈ اور ٹائپ ہونے والے حروف الگ ہیں۔ مثلاً ہم اے پر انگلی ماریں گے تو کاغذ پر جو حرف ٹائپ ہوگا وہ کوئی دوسرا ہوگا" گلوریا نے کہا۔

"بالکل یہی بات ہے" ٹمک نے کہا "لیکن اس کے لئے پہلے مشین کے نیچے ننھا سا خفیہ بٹن دبا کر ایڈجسٹ کرنا ہوتا ہے" ٹمک چند لمحے خاموش رہ کر بولا "اب صورت حال یہ ہے کہ اسرائیلیوں میں بھی دو دھڑے بن چکے ہیں۔ ایک دھڑا موساد کی پالیسیوں کا مخالف ہے۔ سرکاری طور پر اس قسم کی ستائیس مشینیں تیار کی گئی تھیں جبکہ دراصل مشینوں کی تعداد اٹھائیس ہے۔ اٹھائیسویں مشین موساد کے مخالف دھڑے کے پاس تھی جس کا ان کے سوا کسی کو علم نہیں تھا۔ وہ مشین خفیہ طور پر یہاں لگائی گئی تھی اور مخالف دھڑا اس کے ذریعے موساد کی پالیسیوں سے باخبر رہتا تھا تاکہ وقت آنے پر انہیں نیچا دکھایا جاسکے۔ اس مخالف دھڑے کو اعتدال پسند کہنا مناسب ہوگا۔ یہ فلسطینیوں کے ساتھ تشدد کے بجائے افہام وتفہیم کی پالیسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ بہرحال، کسی طرح فلسطینی حریت پسندوں کی ایک تنظیم کو اس خفیہ مشین کا پتا چل گیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے اسے خود چرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکے اور آخر کار انہوں نے میری خدمات حاصل کرلیں۔ لیکن شاید یہودیوں کے مخالف دھڑے کو اس کا پتا چل گیا تھا کہ آخر میں وہ مشین کس کے پاس تھی اور کہاں جارہی تھی۔ انہوں نے اس جہاز کو ہی تباہ کردیا۔"

"لیکن گلوبل ایکسپورٹ والوں نے اس کی چوری کی رپورٹ کیوں نہیں کی؟" گلوریا نے کہا۔

"اس طرح اس خفیہ مشین کا راز فاش ہوجاتا اور اس اعتدال پسند دھڑے کو غدار قرار دے دیا جاتا۔ اور عین ممکن ہے ان لوگوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا۔ لیکن انہوں نے وہ ٹائپ مشین تباہ کردی اور اب شاید کبھی کسی کو معلوم نہ ہوسکے کہ کوئی اٹھائیسویں مشین بھی موجود تھی" ٹمک نے کہا۔

"اور جہاز کے جو بے گناہ مسافر مارے گئے ہیں؟" گلوریا بولی۔

"اس کا افسوس کس کو ہوگا؟" ٹمک نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "آج کے دور میں انسانی زندگی کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ مرنے والوں کے ورثا کو چند ہزار ڈالر دے کر ان کی اشک شوئی کی کوشش کی جائے گی اور بس!"

گلوریا کے منہ سے بھی بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ٹمک نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ آج کے دور میں انسانی زندگی کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی۔ لیکن اسے بہرحال اس طیارے کے حادثے میں مرنے والوں کا افسوس تھا!

ایک شخص کا احوال جو نفرتوں کی آبیاری کرنے کا عادی تھا

کچھ لوگ اس قدر بد لحاظ ہوتے ہیں کہ کسی کی عزت نفس تک کی پروا نہیں کرتے اور منٹوں میں دوسروں کو ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مصلحتاً یا مجبوراً ہی برداشت کیا جاتا ہے۔ وہ کبھی پسندیدہ شخصیت قرار نہیں دیے جا سکتے۔ دل آزاری کرنے والوں کو پسند بھی کون کرتا ہے۔ وہ تو صرف نفرتوں ہی کی فصل کاٹ سکتے ہیں۔

فضہ ہاشمی

درگا دیوی کا دایاں ہاتھ زینے کی ریلنگ پر تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کے زینوں پر چڑھ رہی تھی۔ بائیں جانب دیوار تھی اور وہ دیوار سے تقریباً چپکی ہوئی تھی۔ بلندی سے اسے کچھ زیادہ ہی خوف آتا تھا۔ اگر وہ دیوار سے ہٹ کر اور ریلنگ سے لگ کر چڑھتی تو اسے زینوں کا مہیب خلا نظر آتا۔ اور اسے ایسا لگتا جیسے وہ مہیب خلا اسے اشارے کر رہا۔ بلا رہا۔ اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اسی لئے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی نظر اس طرف پڑے۔ وہ بالکل سامنے دیکھتے ہوئے چل رہی تھی۔

وہ ساتویں منزل کی لینڈنگ پر پہنچی تو ہانپ رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کو رکی۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ اوپر کی جانب سے
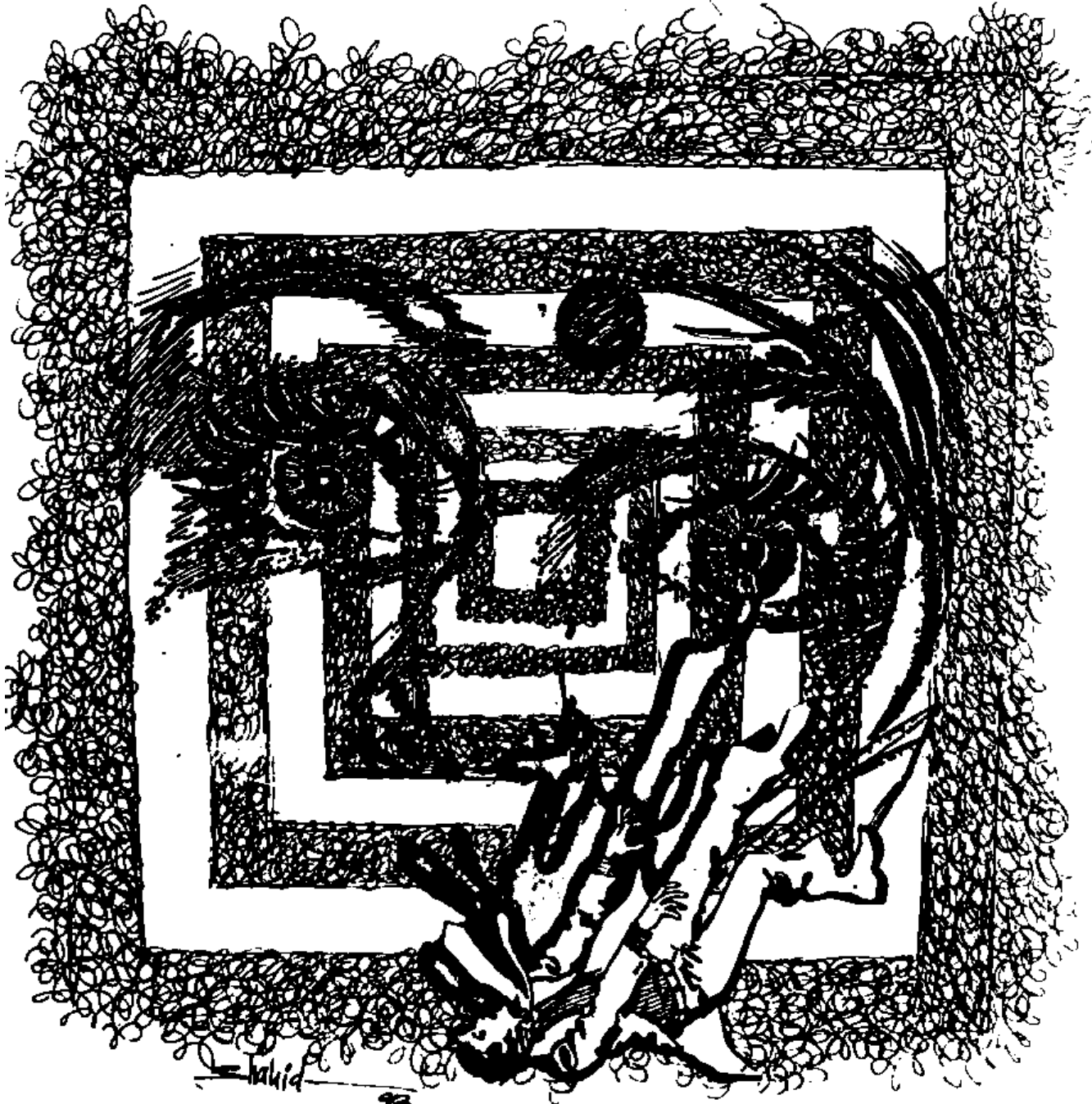
اسے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ وہ ایک چمک دار متحرک سی لکیر تھی۔ بلکہ درحقیقت وہ محض متحرک تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کی نگاہ کچھ سمجھ سکتی' وہ چیز اس کے حیطۂ بصارت سے گزر گئی۔

اس کے ذہن کو یہ حقیقت سمجھنے میں ایک لمحہ لگا کہ وہ اڑتی ہوئی چیز درحقیقت کوئی انسانی جسم تھا۔ اور جس لمحے اس کے ذہن نے یہ بات سمجھی' اسی لمحے اس کی سماعت نے سات منزل نیچے اوپر سے گرنے والی کسی بھاری چیز کے کنکریٹ کے فرش سے ٹکرانے کے دھماکے کی آواز کو محسوس کیا۔

درگادیوی کو اپنے مضبوط اعصاب پر بہت فخر تھا۔ وہ بہت صحت مند اور توانا عورت تھی جو زندگی میں پہلے کبھی بے ہوش نہیں ہوئی تھی لیکن اس بار وہ بے ہوش ہو گئی۔

○☆○

دوپہر کے دو بجے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی کیمپس پولیس اسٹیشن کا انچارج انسپکٹر بمل اپنے آفس میں میز پر کاغذات کا ڈھیر پھیلائے معمول کے مطابق پریشان بیٹھا تھا۔ اس نے میز کی دراز کھول کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ پیکٹ میں سے سگریٹ نکالا اور ماچس تلاش کرنے لگا۔ یہ حرکت بھی اس کے روز کے معمولات میں شامل تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ ماچس تو اس کی جیب میں ہے۔ ہمیشہ ہی رہتی ہے۔ وہ اپنی اس عادت سے عاجز آچکا تھا کہ ماچس کی جیب میں موجودگی کا خیال اسے پانچ منٹ ضائع کیے بغیر نہیں آتا تھا۔

سگریٹ سلگا کر اس نے تازہ رپورٹس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ فیکلٹی آف آرٹس کی پارکنگ سے ایک موٹر سائیکل چرالی گئی تھی۔ سائنس بلڈنگ میں تین چار لڑکوں کے درمیان مار پیٹ ہوئی تھی۔ چند ایک واقعات توڑ پھوڑ کے تھے۔

گویا سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اس نے سکون کی گہری سانس لی۔

اس کے کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ پھر اس میں سے ڈیسک کلرک ببیتا کا وجود بڑی مشکل سے گزر کر کمرے میں داخل ہوا۔

انسپکٹر بمل کے پیٹ میں مروڑ سی اٹھی۔ اس کی توجہ ببیتا کی طرف سے ہٹ گئی۔ وہ اپنے معدے کی طرف سے پریشان رہتا تھا۔ دشواری یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل نہیں کرتا تھا۔ اس سے پرہیز نہیں کیا جاتا تھا۔

مروڑ کی لہر تھمی تو اس نے ببیتا کو دیکھا۔ ببیتا کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے ہونٹ ہلے لیکن کوئی آواز نہیں نکلی۔ چند لمحوں میں اس نے خود کو سنبھالا اور بولی "انسپکٹر۔۔۔ انسپکٹر۔۔۔ کوئی شخص۔۔۔ کوئی آدمی۔۔۔"

انسپکٹر کا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوا ہے۔ اس نے ببیتا کو ایک طرف ہٹایا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

باہر والے کمرے میں اس کا پورا اسٹاف ایک عورت کے گرد جمع تھا۔ عورت پست قامت مگر مضبوط اور توانا تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ عورت اسے جانی پہچانی لگی۔

ہیڈ کانسٹیبل گلزار آگے بڑھا۔ "سر۔ یہ درگادیوی ہیں۔ اکاؤنٹس میں کام کرتی ہیں۔ لنچ کر کے واپس آ رہی تھیں کہ انہوں نے ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کی آٹھویں منزل سے کسی کو گرتے دیکھا۔"

انسپکٹر بمل کے حلق میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ وہ اپنے سب انسپکٹر اور دوسرے عملے کو ہدایات دیتا ہوا آگے بڑھا۔ "گلزار۔۔۔ تم میرے ساتھ چلو۔ رائے۔۔۔ تم اور شبا یہیں درگادیوی کے ساتھ ٹھہرو۔ میری واپسی تک انہیں یہیں روکنا ہے۔"

○☆○

اپنی دس سالہ سروس کے دوران بمل کا واسطہ لاشوں سے پڑتا رہا تھا لیکن اب تو یہ پچھلی صدی کی بات لگتی تھی۔ کیمپس پولیس اسٹیشن میں اس کی تعیناتی کو پانچ سال ہو چکے تھے۔ یہاں اسے سوائے چھوٹے موٹے جھگڑے نمٹانے اور طلبا کے درمیان صلح صفائی کرانے کے۔۔۔ کبھی کچھ کرنا نہیں پڑا تھا۔

لیکن جی چاہے نہ چاہے' لاش تو اسے دیکھنا ہی تھی۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔

لاش ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کے فرش پر بکھری پڑی تھی۔ آٹھویں منزل سے گرنے کے بعد آدمی کا جو حشر ہو سکتا ہے اس کا تصور کچھ زیادہ مشکل نہیں' لیکن ایسی لاش دیکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ تصور اور حقیقت میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔

لاش کسی مرد کی تھی۔ گہرے براؤن بال' اوسط قدوقامت اور وہ سفید شرٹ اور کریم کلر کی پینٹ میں تھا۔ لباس کی تراش خراش بے حد نفیس تھی۔ پیروں میں براؤن سینڈل تھے۔ موزے بھی براؤن ہی تھے۔ لاش کے آس پاس خون کا تالاب سا بن چکا تھا۔ اس میں کہیں کہیں مغز کی وجہ سے سفیدی بھی جھلک رہی تھی۔

انسپکٹر بمل نے اسے پہچان لیا۔ وہ ڈاکٹر گھوش تھا۔۔۔ ڈراما ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ۔

لاش کے گرد مجمع لگ رہا تھا۔ سرگوشیوں کا آہنگ بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔ انسپکٹر نے گلزار کو لاش کو چادر سے ڈھانپنے کا حکم دیا۔

○☆○

سی آئی اے کا اے ایس آئی جسی لال انسپکٹر بمل کے کمرے میں یوں پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا جیسے وہ اس کا اپنا آفس ہو۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ جسم مضبوط اور

پھک دار تھا۔

"بمل۔ سنا ہے، تمہیں کوئی مسئلہ درپیش ہے۔" اس نے کہا۔ "کسی پروفیسر نے آٹھویں منزل سے چھلانگ لگا دی ہے۔"

"ہاں۔ درست سنا ہے تم نے۔"

"چھلانگ لگائی گر گیا یا دھکا دیا گیا اسے؟"

"یہ تو ابھی معلوم نہیں ہو سکا۔ میں عینی شاہد کا بیان لینے جا رہا ہوں۔"

"سنبھال لو گے یہ کیس؟ یہ کوئی معمولی لڑائی جھگڑے کا کیس نہیں ہے بمل۔ سوچ لو ابھی وقت ہے۔ ہم یہ کیس لینے کے لئے تیار ہیں۔ تمہاری مدد کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

بمل نے اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز محسوس کیا۔ اسے غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے کوشش کر کے خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں جنسی لال۔ کچھ عرصہ پہلے میں اس قسم کے کیسز نمٹاتا رہا ہوں۔ تمہاری یادداشت شاید کمزور ہو گئی ہے۔ اس لئے میں تمہیں یاد دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے دس سال سٹی پولیس میں کام کیا ہے۔"

"مجھے یاد ہے اور یہی تمہاری خوشی، لیکن اگر کوئی دشواری پیش آئے تو بلا جھجک فون کر لینا۔ ہم پر کام کا بوجھ پہلے ہی بہت زیادہ ہے۔ پھر بھی ایک ساتھی کی مدد کے لئے تو وقت نکالنا ہی پڑتا ہے۔"

بمل، جنسی لال کو جاتے دیکھتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ سی آئی اے والے اس کیس میں باضابطہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ کیمپس پولیس کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی تھی۔ انہیں چھوٹے موٹے کیسوں کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔ یعنی پرکشش نہیں ملتی تھی انہیں۔ حالانکہ ان میں بہت زیادہ باصلاحیت افسر بھی تھے۔ انہیں حق حاصل تھا کہ وہ اپنے علاقے میں تمام چھوٹے بڑے کیس بغیر کسی بیرونی مداخلت کے حل کریں۔ بمل اس علاقے میں ہونے والے تمام کیسز کا انچارج تھا۔

بمل بیٹھا سوچتا اور الجھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پہلے عینی شاہد سے ملاقات کرے یا اپنے ڈویژن کے ڈی ایس پی سے ملے۔ آخرکار وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔

ڈی ایس پی کھنہ ایک تنومند آدمی تھا۔ بمل کے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا۔ اس کے لبوں پر ایک خیر مقدمی مسکراہٹ ابھری۔

"آؤ بمل آؤ۔ سنا ہے جنسی لال نے تم سے رابطہ کیا تھا۔ یہ الو کا پٹھا ہمیشہ اپنی ٹانگ اڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ وہ ہمارے کیسز کے بارے میں اتنی تیزی سے کیسے معلوم کر لیتا ہے۔"

"اس کے اپنے ذرائع ہیں... اور وہ ٹوہ میں بھی لگا رہتا ہے۔" بمل نے کہا۔ "میں اسی موضوع پر بات کرنے آیا ہوں۔ اس بار جو کیس ہمارے ہاتھ آیا ہے وہ روزمرہ کیسوں کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہے۔ میں اس کیس کو خود حل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ سی آئی اے والے اس کیس کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کریں گے۔ میں دو دن کی مہلت چاہتا ہوں تاکہ اس کیس کے بارے میں اپنے طور پر پوری آزادی کے ساتھ تفتیش کروں۔ اگر دو دن میں کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا تو پھر آپ کو اختیار ہے۔ ٹھیک ہے نا سر؟"

ڈی ایس پی کھنہ چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے بمل۔ تم مستعد اور محنتی افسر ہو۔ تمہیں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملنا چاہئے۔"

بمل واپس آیا تو بہت مطمئن تھا۔ برسوں بعد کوئی چیلنج اس کے سامنے آیا تھا... اور وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار تھا۔

O☆O

بمل عینی شاہد درگا دیوی سے ملاقات کے لئے چل دیا۔

درگا دیوی اچھی عینی شاہد ثابت ہوئی۔ اتنی دیر میں وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ بمل نے بڑے تپاک سے اسے پرنام کیا۔ اس کے لہجے اور انداز میں احترام تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو تھوڑی بہت گھبراہٹ رہ گئی ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔

چند لمحے بعد انسپکٹر بمل نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور درگا دیوی کو مخاطب کیا۔ "درگا دیوی، مجھے اندازہ ہے کہ آپ کے لئے گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرنا اور دہرانا کوفت کا باعث ہے لیکن ایک اچھی شہری کی حیثیت سے آپ خاموش رہنے کے بجائے قانون کی مدد کرنے کی غرض سے آگے آئی ہیں تو یہ کوفت بھی آپ کو اٹھانا ہی پڑے گی۔ آپ کے لئے یہ واقعہ بیان کرنا ناگزیر ہے۔"

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں نے قانون کی مدد کے لئے آگے آ کر کوئی غلطی کی ہو۔"

"ہمارے ملک میں عام طور پر لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ کی شہادت بہت زیادہ اہم بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ یاد رکھئے گا۔"

"میں اپنا فرض ادا کر رہی ہوں... اور کروں گی۔" درگا دیوی نے نرم لہجے میں کہا۔

"مجھے یہ بتایئے کہ آپ نے ڈاکٹر گھوش کے گرنے سے پہلے کیا دیکھا... اور کیا سنا؟"

"میں ساتویں منزل کی لینڈنگ پر سانس درست کرنے کے لئے ذرا دیر کو رکی تھی۔ جیسے ہی میں رکی ویسے ہی اوپری منزل سے ایک عجیب سی آواز آئی۔"

"عجیب آواز! پلیز۔ یاد کرنے کی کوشش کریں کہ وہ کس قسم کی آواز تھی؟"

درگا دیوی سوچ میں پڑ گئی۔ اس کی پیشانی پر لکیریں ابھر

آئیں۔ "بس کچھ عجیب سی آواز تھی۔"

"میرا خیال ہے' یہ آواز بہت اہم ہے۔ اس کے لئے کوئی مثال سوچ سکتی ہیں آپ؟"

درگا دیوی کی پیشانی پر پڑی ہوئی لکیروں میں اضافہ ہو گیا۔ "کھانسی یا کھنکھارنے یا ابکائی سے ملتی جلتی آواز تھی۔ میں واضح طور پر سمجھا نہیں سکتی۔ آپ مجھے کچھ وقت دیں تو شاید میں وضاحت کر سکوں۔"

"اچھا۔ پھر کیا ہوا؟ اور کیا دیکھا آپ نے؟"

"میں نے آواز سن کر اوپر کی طرف دیکھا۔ آٹھویں منزل پر زینوں کی ریلنگ کے قریب مجھے دو متحرک ہیولے نظر آئے۔"

"متحرک ہیولے!" انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔ "وہ تو دن کا وقت تھا۔ وہاں اندھیرا بھی نہیں ہوتا۔"

درگا دیوی کے رخسار خفت سے تمتما اٹھے۔ "دراصل میں نے چشمہ نہیں لگا رکھا تھا۔ اس لئے میں ٹھیک طور سے نہیں دیکھ سکی۔ بہرحال' مجھے وہ دو ہیولے لڑتے نظر آئے۔ ان میں سے ایک ریلنگ کے قریب آگیا۔ اور پھر۔" وہ بولتے بولتے رک گئی۔ آخری منظر یاد کر کے اس کا گلا خشک ہونے لگا۔ رنگت پیلی پڑ گئی اور ایک لمحے کے لئے اسے بیان دینا بھی یاد نہیں رہا۔

انسپکٹر کو اندازہ ہو گیا کہ اب وہ کم از کم اس وقت اس گواہ سے کام کی کوئی بات نہیں اگلوا سکے گا۔ "شکریہ دیوی جی۔ آپ نے ہماری بڑی مدد کی۔ آپ کو اس آواز کے متعلق کچھ یاد آجائے تو بلا جھجک میرے پاس چلی آیئے گا۔ اور ہاں' ایک سوال اور۔ آپ نے اترنے کے لئے سیڑھیاں ہی کیوں استعمال کیں۔ جبکہ بلڈنگ میں لفٹ بھی موجود ہے۔"

درگا دیوی نے یوں انسپکٹر کو دیکھا جیسے اسے اس سے اس قدر احمقانہ سوال کی توقع نہ رہی ہو۔ پھر وہ فخر آمیز لہجے میں بولی۔ "میں ہمیشہ زینے ہی استعمال کرتی ہوں۔ ایکسر سائز کے خیال سے۔ لوگوں کو علم نہیں کہ اس ذرا سی زحمت سے ٹانگیں کتنی مضبوط ہو جاتی ہیں۔"

اس حوالے سے ڈاکٹر گھوش بد قسمت ہی ثابت ہوا۔ انسپکٹر نے سوچا۔

درگا دیوی نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی۔ کیونکہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

○☆○

انسپکٹر بل مقتول ڈاکٹر گھوش کے متعلق معلومات جمع کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ڈاکٹر گھوش ڈراما فیکلٹی کا ہیڈ ہونے کے باوجود بے حد ناپسندیدہ شخصیت تھا۔ اس کا سبب اس کی شخصی کمزوریاں تھیں۔ اسے معمولی معمولی باتوں پر اتنا غصہ آتا کہ وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ ایسے میں وہ کسی پر بے سبب بھی برس پڑتا۔ اس کا غصہ دیر تک قائم رہتا۔ اس کے طور طریقے بھدے تھے۔ وہ جھگڑالو طبیعت کا آدمی تھا۔ فیکلٹی کے بیشتر اسٹاف اور اچھے طلبا سے اس کا جھگڑا ہو چکا تھا۔ ان تمام خامیوں کے باوجود خواتین کے لئے وہ محض ایک وجیہہ مرد تھا۔ اس کے افیئرز کی تعداد کم نہیں تھی۔

ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کی آٹھویں منزل پر اکاؤنٹس کے دفاتر تھے۔ اپنی موت سے قبل وہ اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں پراویڈنٹ فنڈ ایڈوانس کا چیک لینے گیا تھا لیکن چیک اس وقت تک بنا ہی نہیں تھا۔ اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں جس لڑکی سے اس نے بات کی تھی' اس لڑکی کو وہ خوب اچھی طرح یاد تھا۔ کیونکہ لڑکی جلدی میں تھی۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ لنچ پر نہیں جا سکی تھی۔ اور اس کا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ وہ جلد از جلد سیٹ چھوڑنا چاہتی تھی۔ اسے وقت بھی بہت اچھی طرح یاد تھا۔ یہ ایک بج کر پینتیس منٹ کی بات تھی۔

اور درگا دیوی نے ڈاکٹر گھوش کو ایک بج کر چالیس منٹ پر گرتے دیکھا تھا۔ یعنی جو کچھ بھی ہوا تھا' صرف پانچ منٹ کے دوران ہوا تھا۔ انسپکٹر کو حیرت تھی کہ ڈاکٹر گھوش کو لفٹ کے ہوتے ہوئے سیڑھیوں کے ذریعے اترنے کی کیا سوجھی۔ اس نے آٹھویں منزل اور اس کے زینوں اور لینڈنگ کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا تھا لیکن اسے کوئی کلیو نہیں مل سکا تھا۔ کسی لڑائی جھگڑے یا دھینگا مشتی کی کوئی علامت نظر نہیں آئی تھی۔ زینوں کی ریلنگ ایسی تھی کہ اوسط قد کے آدمی کی کمر تک آتی تھی۔ مقتول ڈاکٹر گھوش اوسط قد کا مگر تنومند آدمی تھا۔ ایسے آدمی کو اٹھا کر ریلنگ کے اوپر سے پھینک دینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پھینکنے والا کوئی بہت طاقتور آدمی رہا ہو گا۔

انسپکٹر بل جتنا غور کر رہا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ ڈراما فیکلٹی کا ہر فرد ڈاکٹر گھوش کو ناپسند کرتا تھا۔ اس سے نفرت کرتا تھا۔ یعنی مشتبہ افراد کی فہرست بہت طویل تھی۔

انسپکٹر بل کے لئے گزرنے والا ہر لمحہ بہت قیمتی تھا۔ اس کے ذہن پر اے ایس آئی جسی لال اور سی آئی اے کا ہوّا بیٹھا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ کیس اسے خود سے دور اور سی آئی اے سے قریب ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تصور کر سکتا تھا کہ جسی لال بڑے یقین کے ساتھ منتظر ہے کہ وہ سر جھکائے اس کے پاس جائے گا' اپنی شکست تسلیم کرے گا اور کیس اس کے سپرد کردے گا۔

"احمق جسی لال۔۔۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا" وہ بڑبڑایا۔

انسپکٹر نے سب سے پہلے فہرست بنا کر ان لوگوں سے ملنے کا فیصلہ کیا جو ڈاکٹر گھوش سے نفرت کرتے تھے۔ تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ ڈاکٹر گھوش نے دو بار شادی کی تھی۔۔۔ اور دونوں بار

علیحدگی اختیار کرلی تھی لیکن ان دونوں بیویوں کے نام انسپکٹر کی فہرست میں شامل نہیں تھے کیونکہ ان دونوں ہی نے علیحدگی کے فوراً بعد دوسری شادی کرلی تھی اور اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی تھیں۔ ڈاکٹر گھوش کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ نہ ہی اس کا کوئی عزیز رشتے دار تھا۔

تفتیش کا دائرہ فیکلٹی کے اراکین کے گرد گھوم رہا تھا۔ ڈاکٹر گھوش کا کوئی دوست تو تھا ہی نہیں۔ اپنی جھگڑالو طبیعت اور بلا تفریق ناپسندیدگی کے باوجود یہ اعتراف سب کو تھا کہ وہ ایک مستعد اور فرض شناس آدمی تھا۔

ڈراما فیکلٹی کے ڈاکٹر شرما ایسے آدمی تھے، جو ڈیپارٹمنٹ کی سربراہی کے لئے ڈاکٹر گھوش کے حریف تھے۔ ونود فنِ اداکاری کا ایک ایسا طالب علم تھا، جو لوگوں میں بہانگِ دہل ڈاکٹر گھوش سے اپنی نفرت کا اعلان کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کا بس چلے تو ڈاکٹر کو اپنے ہاتھوں سے پھانسی پر لٹکا دے۔ اس کا سبب اس کی کلاس فیلو بلا کی خودکشی تھی۔ وہ بے چاری ڈاکٹر گھوش پر مرمٹی تھی۔ اس افیئر کا انجام بہت دردناک ہوا تھا۔ بلا دل کی وہ چوٹ برداشت نہیں کر سکی تھی اور اس نے خودکشی کرلی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ تھے جو ڈاکٹر گھوش سے نفرت کرتے تھے۔ سب کے پاس نفرت کا کوئی نہ کوئی معقول سبب موجود تھا۔ رادھا نامی ایک لڑکی بھی تھی جس نے ڈاکٹر گھوش سے محبت کی حماقت کی تھی۔ انجام اس کا بھی وہی ہوا۔ ڈاکٹر نے اسے کھلونے کی طرح استعمال کیا اور دل بھر جانے پر پھینک دیا۔ اب وہ بھی ڈاکٹر سے شدید نفرت کرتی تھی۔

○☆○

انسپکٹر بمل کی نگاہیں اسٹیج پر جمی ہوئی تھیں، جہاں ایک طالب علم اور طالبہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ تھیٹر میں اندھیرا کر دیا گیا تھا۔ روشنی صرف اسٹیج پر تھی۔

لڑکا لمبے قد کا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بڑا پھرتیلا پن تھا۔ مجموعی طور پر اسے خوب رو کہا جا سکتا تھا۔ لڑکی بھی سرو قامت اور بے حد حسین تھی۔

رادھا اور ونود بھی اسٹیج کی طرف متوجہ تھے۔ اس ڈرامے کی ہدایات ڈاکٹر شرما کی تھیں۔ فیکلٹی کا تمام اسٹاف ڈرامے کو تنقیدی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ڈرامے کے تمام شعبوں کے طلبا بھی ناظرین کی حیثیت سے موجود تھے۔ وہ اس قسم کے ڈراموں سے بہت کچھ سیکھتے تھے۔

اسٹیج پر ایک اور لڑکی نمودار ہوئی۔ وہ بے حد دبلی پتلی تھی۔ انسپکٹر اسے بھی جانتا تھا۔ وہ اوشا تھی۔ اس کا تعلق طلبا سے نہیں اسٹاف سے تھا۔ وہ مقتول ڈاکٹر گھوش کا انتخاب تھی۔ وہ بہت اچھی مصورہ تھی اور سیٹ ڈیزائن کرتی تھی۔ انسپکٹر کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ڈاکٹر گھوش کے متعلق اس کے کیا

محسوسات ہیں۔ تاہم وہ اپنا کام دیانت داری سے کرتی تھی اور اپنے فن میں ماہر بھی تھی۔ ڈاکٹر گھوش نے اسے ایک چھوٹے سے اسٹیج پر اداکاری کرتے دیکھا تھا اور متاثر ہو کر اسے یہاں لے آیا تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

وقفہ ہوا تو انسپکٹر نے ونود کو گھیر لیا۔

ونود کا چہرہ جو عام طور پر سرخ رہتا تھا اور بھڑک اٹھا۔ "ہاں۔ میں اس سے نفرت کرتا تھا۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "میرے پاس اس سے نفرت کی معقول وجہ بھی ہے۔ بلا اگر زندہ رہتی تو ایک عظیم اداکارہ ثابت ہوتی۔ یقین کرو انسپکٹر وہ تھیٹر اور فلم کی دنیا میں تہلکہ مچا دیتی۔ لیکن وہ بے حد سیدھی تھی۔ گھوش کی چرب زبانی کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ میں اس سے محبت کرتا تھا لیکن گھوش نے اسے مجھ سے چھین لیا اور پھر اسے خوشی بھی نہیں دی، دکھ دیئے۔ اور آخر میں موت۔ میں گھوش کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن یہ نیک کام کسی اور کے ہاتھوں انجام پایا۔ مجھے افسوس ہے اس بات کا۔"

"ایک اور دو بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میں اس وقت رادھا کے ساتھ تھا۔ ہماری کوئی کلاس نہیں تھی۔ ہم دونوں تین بجے تک ساتھ رہے تھے۔"

انسپکٹر ونود کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ونود نے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ امکان یہی تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے لیکن انسپکٹر جانتا تھا کہ اس کے پیشے میں کبھی کسی پر یقین نہیں کیا جاتا۔ "کسی نے تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تھا؟ کوئی گواہ ہے اس بات کا کہ تم دونوں ایک اور دو بجے کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ تھے؟"

"نہیں۔ ہمیں کسی نے نہیں دیکھا۔ ہم ہاسٹل میں تھے۔ میرے کمرے میں۔ تم کمرے کی تلاشی بھی لے سکتے ہو اور پوچھ گچھ کر کے دیکھ لو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے اور رادھا کو کسی نے دیکھا ہی ہو۔"

"ممکن ہے۔ میں ضرور پوچھ گچھ کروں گا۔"

رادھا نے ونود کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کر دی۔ اس نے انسپکٹر کو بتایا کہ وہ بھی ڈاکٹر گھوش سے نفرت کرتی تھی اور اسے ڈاکٹر کی موت کا ذرا ملال نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ وقوعے کے وقت ونود کے ساتھ تھی۔

رادھا طویل القامت اور جان دار عورت تھی۔ وہ اتنی مضبوط و توانا تھی کہ گھوش جیسے شخص کو بہ آسانی اٹھا کر ریلنگ کے اوپر سے پھینک سکتی تھی۔ اس کے پاس قتل کا محرک بھی موجود تھا لیکن وہ تو ڈراما فیکلٹی میں تقریباً سبھی کے پاس تھا۔ ڈاکٹر گھوش نے زندگی میں بڑی محنت اور سچائی سے یہی کچھ کمایا تھا۔

رادھا کے بعد انسپکٹر نے ڈاکٹر شرما سے بات کی۔ ڈاکٹر شرما کو بار بار تھوڑی کھجانے کی عادت تھی۔

"میں ہی کیا، یہاں تقریباً سبھی لوگ ڈاکٹر گھوش کو ناپسند کرتے تھے۔" ڈاکٹر شرما نے انسپکٹر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "لیکن اسے قتل کرنا ایک بالکل مختلف بات ہے۔ میرے ذہن میں تو کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا۔"

"ایک اور دو بجے کے درمیان آپ کہاں تھے؟"

"میں بارہ بجے سے تین بجے تک اپنے آفس میں رہا تھا۔" ڈاکٹر شرما نے جواب دیا۔ "اس کی تصدیق ڈراما سیکریٹری اوشا کرے گی۔ ہم نے رات بہت دیر تک ریہرسل کی تھی اور میں بہت تھک گیا تھا۔"

آخر میں انسپکٹر نے اوشا سے ملاقات کی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی بسی ہوئی تھی۔ اس کے چھوٹے سے چہرے پر وہ بڑی بڑی آنکھیں بہت عجیب لگتی تھیں۔

"آپ ایک اور دو بجے کے دوران ڈاکٹر شرما کے ساتھ ان کے کمرے میں تھیں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ رات بہت دیر تک ریہرسل ہوئی تھی۔ ڈاکٹر شرما بہت تھکے ہوئے تھے۔"

"ڈاکٹر گھوش کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

اوشا نے نگاہیں جھکا لیں۔ چند لمحے بعد اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "وہی جو سب لوگوں کی ہے۔ انہیں کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ ان کے ساتھ کام کرنا آسان نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ آدمی کا خون نچوڑ لیتے تھے۔ انہوں نے بلا کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ بعد میں رادھا بھی ان کا نشانہ بنی۔ ایسے آدمی سے نفرت کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ بلا تو میری روم میٹ بھی تھی۔ اس کی موت کے بعد ڈاکٹر سے میری گفتگو صرف کام کے متعلق ہوتی تھی۔ مجھے ان سے بات کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔"

"پھر بھی تم اس جاب سے چپکی رہیں؟"

"یہ پارٹ ٹائم جاب ہے۔ میں اکیلی ہوں۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ اس جاب سے میرے تعلیمی اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہاسٹل میں اقامت بھی میسر آگئی ہے۔ ڈاکٹر گھوش کو برداشت کرنا ہی پڑتا تھا۔ ویسے بھی میں محتاط رہتی تھی۔ میں نے کبھی انہیں اتنا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ مجھ پر چڑھ دوڑیں۔"

وہ ہر اعتبار سے بچوں کی طرح معصوم لگتی تھی۔ انسپکٹر کا جی چاہا کہ اس کے کندھے تھپتھپائے لیکن اس نے بروقت اس خواہش پر قابو پالیا۔ باہر نکلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ گھوش نے کسی کو اتنا پریشان کیا ہوگا۔ اس کی زندگی اتنی اجیرن کر دی ہوگی کہ اس شخص کو گھوش سے جان چھڑانے کے لئے انتہائی اقدام کرنا پڑا ہوگا۔ وہ جو کوئی بھی تھا انسپکٹر کو اس سے ہمدردی سی محسوس ہونے لگی۔

انسپکٹر بل کو ایک بے نام خلش اگلے روز دوبارہ اکاؤنٹ

آفس لے گئی۔ اس نے اکاؤنٹ کلرک سے مزید پوچھ گچھ کی۔ اس کے نتیجے میں اس بار ایک ایسی بات معلوم ہوئی کہ اس کا ڈاکٹر شرما اور اوشا سے ملنا ناگزیر ہو گیا۔

اوشا اسے باہر ہی مل گئی۔ "کہیے انسپکٹر، آپ کی تفتیش کیسی جا رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے لیکن میں تمہاری کل کی غلط بیانی کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔" انسپکٹر نے کہا۔

"کون سی غلط بیانی؟" اوشا نے بے حد معصومیت سے پوچھا۔

"یہی کہ کل ایک بجے سے تین بجے تک تم ڈاکٹر شرما کے ساتھ ان کے آفس میں تھیں۔"

"یہ غلط تو نہیں....."

"اکاؤنٹس کلرک کا کہنا ہے کہ کل ڈاکٹر گھوش سے پہلے تم ان کا چیک وصول کرنے آئی تھیں۔"

"ہاں۔ یہ درست ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق تو پڑتا ہے۔ اس دوران ڈاکٹر شرما اکیلے رہ گئے"

"تو پھر؟ میں اکاؤنٹس سے واپس آئی اور ڈاکٹر گھوش کو بتایا کہ ان کا چیک ابھی تیار نہیں ہے۔ وہ اس وقت زندہ تھے۔ میں فوراً ہی ڈاکٹر شرما کے دفتر میں واپس آ گئی۔ ڈاکٹر شرما وہیں موجود تھے۔ اس کے بعد تین بجے تک ہم ساتھ رہے۔ جبکہ ڈاکٹر گھوش کی موت کا وقت ایک بج کر چالیس منٹ ہے۔ یعنی انہیں قتل کرنے کا موقع نہ میرے پاس تھا نہ ڈاکٹر شرما کے پاس۔"

"بات تو معقول ہے لیکن تمہیں مجھ کو بتانا چاہئے تھا۔"

"خیال نہیں رہا تھا مجھے۔" اوشا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"جب چیک کے سلسلے میں تم نے ڈاکٹر گھوش کو بتا دیا کہ تیار نہیں ہے تو پھر وہ اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کیوں گئے؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں تو انہیں مطلع کر کے ڈاکٹر شرما کے پاس چلی گئی تھی۔ ویسے ڈاکٹر گھوش کو غصہ بہت آیا تھا یہ سن کر۔"

"تم ڈاکٹر شرما کے دفتر سے کتنی دیر غائب رہیں؟"

"ڈاکٹر گھوش نے ایک بجنے میں پانچ منٹ پر مجھے ڈاکٹر شرما کے دفتر میں انٹرکام کے ذریعے چیک لانے کی ہدایت کی تھی۔ یہ بھی تنگ کرنے والی بات تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک بجے لنچ ہو جاتا ہے۔ میں احتجاج بھی نہیں کر سکی تھی۔ بس جلدی سے ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کی طرف لپکی تھی۔ خوش قسمتی سے ڈیلنگ کلرک کام کی زیادتی کی وجہ سے لنچ کے لئے نہیں اٹھ سکی تھی۔ اس نے اپنی ٹرے چیک کی اور بتایا کہ ڈاکٹر گھوش کا چیک ابھی اس کے پاس نہیں پہنچا ہے۔ میں نے یہ بات ڈاکٹر گھوش کو بتا دی۔ میں ایک بج کر بیس منٹ پر ڈاکٹر شرما کے دفتر واپس آ گئی تھی۔"

"ایڈمنسٹریشن بلڈنگ میں تم نے لفٹ استعمال کی تھی یا زینے؟"

"لفٹ استعمال کی تھی۔"

اس کے بعد انسپکٹر ہمل، ڈاکٹر شرما سے ملا۔ ڈاکٹر نے بھی وہی دلیل دی اور انسپکٹر کو دلیل کی معقولیت تسلیم کرنا پڑی۔

"ڈاکٹر گھوش نے اوشا کو چیک لانے کی ہدایت آپ کے انٹرکام پر دی تھی؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"وقت کیا تھا؟"

"ایک بجنے میں پانچ منٹ۔"

"اور اوشا جانے کے بعد واپس کس وقت آئی؟"

"میں بہت تھکا ہوا تھا۔ میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اس لئے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ویسے میرا خیال ہے، زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا لگا ہو گا اسے۔"

'یعنی ایک بج کر پچیس منٹ! اور ڈاکٹر گھوش کا قتل ایک بج کر چالیس منٹ پر ہوا تھا۔' انسپکٹر نے سوچا۔ اس اعتبار سے وہ دونوں غلط بیانی کے باوجود شک سے بالاتر تھے۔

وہ اپنے کمرے میں واپس آیا تو بے سود دوڑ دھوپ کی وجہ سے بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ چائے کی طلب بھی شدید تھی۔ اس نے اردلی کو بلا کر چائے لانے کی ہدایت دی۔ پھر وہ بیٹھ کر سوچنے لگا۔

ان تمام افراد کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم گئے جن سے وہ تحقیش کے سلسلے میں ملا تھا۔ کاش... کاش! اس وقت درگا دیوی نے چشمہ پہنا ہوتا۔ اس نے شدید مایوسی کے عالم میں سوچا۔ یا پھر اس نے اوپر سے آنے والی آواز کو غور سے سنا ہوتا۔

اردلی چائے لے آیا تھا۔ وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے قتل کے اس کیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ چائے پینے کے دوران اسے ایک خیال سوجھا اور اس نے اسے بنیاد بنا کر ایک منصوبے کے تانے بانے بن لئے۔ بنیاد وہی آواز تھی جس کی وضاحت نہیں ہو سکی تھی... کھانسی یا کھنکھار سے لیا ابکائی سے ملتی جلتی آواز۔

اسے جو کچھ کرنا تھا، بہت تیزی سے کرنا تھا۔ مانگی ہوئی مہلت ختم ہو رہی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ یونیورسٹی کا پرسنل آفس ابھی کھلا ہوگا۔ اور وہاں ڈراما فیکلٹی سے متعلق تمام لوگوں کا ریکارڈ بھی موجود ہوگا...

O☆O

پرسنل آفس کی سپروائزر سروجنی انسپکٹر بمل کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ انسپکٹر وردی میں نہیں تھا اور بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔

"دیر تک بیٹھ کر کام کرنا بھی ایک قیامت ہے۔ بس... میں اٹھنے ہی والی تھی۔"

"میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔" انسپکٹر نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ "مجھے چند افراد کی ریکارڈ فائلیں درکار ہیں۔ ڈاکٹر شرما، اوشا، ڈراما فیکلٹی کے اسٹوڈنٹس ونود اور رادھا۔"

سروجنی کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن وہ خاموشی سے اٹھی۔ اس نے وہ کیبنٹ کھولی جس پر ڈراما فیکلٹی لکھا تھا۔ اس نے چار فائلیں لا کر انسپکٹر کے سامنے رکھ دیں۔

انسپکٹر نے چاروں.... کے ریکارڈ چیک کئے۔ کچھ باتیں اپنی نوٹ بک میں لکھیں اور فائلیں سروجنی کی طرف کھسکا دیں۔

"میرا خیال ہے، تمہیں جس چیز کی تلاش تھی، وہ تمہیں مل گئی ہے۔" سروجنی نے بے تکلفی سے کہا۔

انسپکٹر مسکرا دیا۔ "ہاں... کم از کم میرا خیال تو یہی ہے۔"

اس نے سروجنی کا شکریہ ادا کیا اور پرسنل آفس سے نکل آیا۔

چار میں سے ایک فائل میں... صرف ایک فائل میں وہ اشارہ موجود تھا جو مبہم سے امکان کو ظاہر کرتا تھا۔ وہ کوئی یقینی بات نہیں تھی لیکن انسپکٹر بمل کو نہ جانے کیوں یقین تھا کہ وہ اشارہ کیس حل کر دے گا۔

اب وہ تھیٹر ہال کی طرف جا رہا تھا۔

تھیٹر کی لائٹس آن تھیں۔ ریہرسل جاری تھی لیکن تمام کام کرنے والے بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

ڈاکٹر شرما نے انسپکٹر کو آتے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ "پھر کوئی سوال؟" اس نے کہا۔ "لیکن انسپکٹر ایک بات بتا دوں۔ ہم سب لوگ اس وقت بہت تھکے ہوئے ہیں۔"

انسپکٹر نے بے حد طمانیت سے سر ہلایا۔ "کم از کم اس وقت میں یہاں کسی سے کوئی سوال کرنے نہیں آیا ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں۔ میرا پیشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ تاک جھانک کی عادت سی پڑ گئی ہے۔"

ڈاکٹر شرما نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔ اس کی نظریں اسٹیج پر جمی ہوئی تھیں، جہاں ونود اور رادھا اداکاری کر رہے تھے۔

انسپکٹر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر وہ ٹہلتا ہوا اسٹیج کی طرف چل دیا۔ اسٹیج پر موجود اداکاروں نے اپنا سین مکمل کر دیا تھا۔ اوشا ایک طرف کھڑی سیٹ کے ایک حصے کو پینٹ کر رہی تھی۔ اس نے قدموں کی آہٹ سن کر سر اٹھا کر انسپکٹر کو دیکھا۔

"آج دیر تک کام کر رہی ہو اوشا؟" انسپکٹر نے کہا۔

"آپ بھی دیر تک کام کر رہے ہیں۔" اوشا نے جواباً کہا۔

"اور نہ آپ کا دیر تک کام کرنا خلافِ قانون ہے نہ میرا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں اوشا جی۔ بس میں تمہیں ذرا سی تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ ذرا دیر کے لئے میرے ساتھ ڈاکٹر گھوش کے آفس چلو۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟" اوشا کچھ پریشان ہو گئی۔

"ایک کام ہے، وہیں چل کر بتاؤں گا۔"

اوشا نے برش میز پر رکھ دیا اور جینز کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونس لئے۔

انسپکٹر آگے آگے تھا اور اوشا پیچھے پیچھے تھی۔ وہ دونوں ڈاکٹر گھوش کے آفس کی طرف جا رہے تھے۔ ڈاکٹر گھوش کا آفس صرف دس قدم دور رہ گیا تو انسپکٹر بالکل اچانک ایڑیوں کے بل گھوم کر پلٹا اور تیزی سے لڑکی پر جھپٹا...

جو کچھ بھی ہوا، چشم زدن میں ہوا۔ اسے اوشا کی پھیلی ہوئی آنکھیں نظر آئیں جن میں خوف اور حیرت کا عجیب امتزاج تھا۔ پھر انسپکٹر نے خود کو اکھڑ کر اٹھتے... اور نازک کندھوں کے اوپر سے گزرتے محسوس کیا۔ ان پھیلے ہوئے چند لمحوں میں اسے چھت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ پھر وہ دھپ سے کمر کے بل فرش پر گرا لیکن شاک کے سوا جسمانی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہا۔ اب وہ فرش پر لیٹا پلکیں پٹپٹاتے ہوئے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

لیکن اس سب کچھ کے آغاز میں... انسپکٹر کو یاد تھا کہ اس نے ابکائی سے مشابہ کوئی آواز سنی تھی۔ یعنی اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی۔ یہ آواز وہ تھی، جو جوڈو کے ماہرین کسی پر حملہ کرتے وقت مخصوص انداز میں نکالتے ہیں... کیائی... اور

اس کے ساتھ ہی وہ فضا میں اٹھ گیا تھا۔

وہ چت لیٹا رہا۔ ابھی تک اس کے اوسان ٹھکانے نہیں آئے تھے لیکن اس طرف آتے ... دوڑتے قدموں کی آوازیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں اور ہانپتی ہوئی اوشا کی ناہموار سانسوں کی آواز بھی بے حد واضح تھی۔

○☆○

انسپکٹر اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ اوشا سامنے والی کرسی پر تھی۔ وہ صورت سے کسی بھی طرح قاتل نہیں لگتی تھی۔ وہ تو بے حد معصوم بلکہ مسکین لڑکی تھی۔ انسپکٹر کو اس پر ترس آنے لگا۔

"آپ کو مجھ پر شک کیسے ہوا انسپکٹر؟" اوشا نے بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"مجھے یقین تو نہیں تھا۔ یعنی شاہد درگادیوی نے ڈاکٹر گھوش کے گرنے سے چند سیکنڈ پہلے عجیب سی آواز سنی تھی... ابکائی کی سی آواز۔ میں نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک آواز مارشل آرٹس کے ماہرین حملہ کرتے وقت نکالتے ہیں... کیائی۔ یہ وہ آواز بھی ہوسکتی ہے۔ اس خیال کو تقویت اس بات سے پہنچتی تھی کہ ڈاکٹر گھوش کو اتنی اونچی ریلنگ پر سے اٹھا کر پھینکنا عام آدمی کے بس کا روگ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ میں نے تمام مشکوک افراد کی پرسنل فائلیں چیک کیں۔ تم... صرف تم ایسی تھیں، جس نے دو سال مارشل آرٹس کی کلاسیں اٹینڈ کی ہیں۔"

اوشا انسپکٹر کو ستائشی نظروں سے دیکھتی رہی۔ "کمال کردیا آپ نے۔" اس نے آہستہ سے کہا، پھر سر جھٹک کر بولی۔ "میں نے یہ قتل کسی منصوبے کے تحت نہیں کیا۔ حالانکہ بلا کی موت کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ڈاکٹر گھوش سے حساب برابر کروں گی لیکن جو کچھ ہوا، بس اچانک ہی ہوگیا..."

انسپکٹر اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اداسی تھی۔ دونوں ہاتھ اس کی گود میں یوں پڑے تھے، جیسے بے جان اشیاء ہوں۔

"میں اور بلا گہری سہیلیاں تھیں۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اوشا نے مزید کہا۔ "ہم ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ میں بلا سے محبت کرتی تھی..."

"کل کیا ہوا تھا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

وہ چند لمحے انسپکٹر کو یوں دیکھتی رہی، جیسے اس کی بات سمجھ نہ پارہی ہو، پھر وہ بولی۔ "اس کا چیک تیار نہیں تھا۔ میں نے اسے آگر بتایا تو اس نے مجھ سے بہت خراب لہجے میں بات کی... جیسے وہ میرا قصور ہو۔ اس نے کہا... مجھے دس منٹ کے اندر اندر چیک مل جانا چاہئے۔ میں خود جارہا ہوں۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس کی میز پر بکھرے کاغذات کا جائزہ لیا۔ وہاں پراویڈنٹ فنڈ ایڈوانس کی درخواست بھی پڑی تھی۔ اس نے درخواست داخل ہی نہیں کی تھی تو چیک کہاں سے بنتا۔ درخواست ہر اعتبار سے مکمل تھی۔ میں نے سوچا، درخواست اُسے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں دے آؤں۔ ورنہ وہ ڈیپارٹمنٹ کو الٹ کر رکھ دے گا۔"

"تو تم وہ کاغذات لے کر ایڈمنسٹریشن بلڈنگ چلی گئیں؟"

"جی ہاں اور کیونکہ میں جلدی میں تھی۔ اس لئے کینٹین والے راستے سے گئی۔ مجھے ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا جو مجھے جانتا ہو۔ میں لفٹ کے ذریعے آٹھویں منزل پر پہنچی مگر مجھے دیر ہوچکی تھی۔ وہ اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ سے نکل رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں درخواست دیکھتے ہی وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے مجھے گالیاں دینا شروع کردیں۔ میں ضرورت کی کمزوری کی وجہ سے اسے جواب بھی نہیں دے سکتی تھی... روک بھی نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ میں جان چھڑانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ وہ اس پر اور برہم ہوگیا اور لپک کر میرے پیچھے آیا۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ اس وقت تک میں لینڈنگ پر پہنچ چکی تھی۔ تھپڑ کھانے کے بعد اس کے لئے میری تمام نفرتیں ابھر آئیں۔ وہ مسلسل مجھے گالیاں دیئے جارہا تھا۔ بس پھر... پھر..." وہ بجلی کی سی تیزی سے کرسی سے اٹھی اور اپنے جسم کے بالائی حصے کو خم دیتے ہوئے اپنا داہنا کندھا اوپر اٹھایا...

انسپکٹر چشم تصور سے سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر واضح تصویر ابھری... ڈاکٹر گھوش کی تصویر کہ کیسے وہ اوشا کے کندھوں پر سے گزرتا ہوا ریلنگ کے اوپر سے سیڑھیوں کے اندھے خلا میں گرا ہوگا۔

انسپکٹر کے آفس میں خاموشی چھاگئی۔ آخر کار باہر سے سنائی دینے والی ایک سخت نسوانی آواز نے اس خاموشی کو توڑا۔ پھر ڈیسک کلرک سمیتا کی آواز آئی۔ اس کے بعد آفس کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ...

انسپکٹر نے نرمی سے اوشا کے کندھوں کو تھپتھپایا۔ اسی لمحے سمیتا نے دروازہ کھولا۔ "درگادیوی آپ سے ملنا چاہتی ہیں..."

انسپکٹر باہر نکل آیا۔

درگادیوی کے رخسار تمتما رہے تھے۔ انداز سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ کچھ بتانے کو بے تاب ہورہی ہے۔ "تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مجھے کچھ یاد آجائے تو فوراً تمہارے پاس چلی آؤں۔ مجھے یاد آگیا ہے۔" اس نے فتح مندی سے کہا۔ "اس آواز کے بارے میں جو میں نے کل اوپری لینڈنگ سے سنی تھی۔ آج میں ٹی وی پر ایک ایکشن فلم دیکھ رہی تھی۔ فلم دیکھتے ہوئے ایک سین میں مجھے یاد آگیا..."

شدتِ جذبات سے درگادیوی کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

انسپکٹر ورمل اب جلد از جلد جان چھڑالینا چاہتا تھا۔ اس کے معدے میں اینٹھن ہورہی تھی۔ صبح سے اس نے کچھ بھی تو نہیں کھایا تھا۔

انگریزی سے ماخوذ

سرکش

محمود احمد مودی

ہمارے اپنے گلی کوچوں میں جنم لینے والا تماشا ئے آہن و سنگ
ہمارے آپ کے گرد بکھرے ہوئے کرداروں کی داستانِ ہزار رنگ

زندگی کٹھن بھی ہے اور آسان بھی، پُرپیچ بھی ہے اور سادہ بھی۔ اس میں رنگِ وفا بھی ہے اور زہرِ جفا بھی۔ کہیں لوگ غیروں کو اپنا لہو دے کر زندہ رکھتے ہیں تو کہیں اپنوں کا خون چوستے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتے۔ یہ پل پل رنگ بدلتی زندگی کے ایسے ہی اونچے نیچے راستوں اور رنگین و سنگین لمحوں کی کہانی ہے ایک سادہ اور معصوم نوجوان کا فسانۂ حیات ہے جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور آنکھوں میں مستقبل کے حسین مگر دُھندلے خواب تھے۔ اُسے شاہراہِ حیات پر ایک طویل سفر درپیش تھا لیکن گردشِ ایام اور شورشِ حالات نے اُس کے راستے ہی بدل دیے، نت نئی منزلیں اُس کے سامنے آ گئیں۔

باذوق و حقیقت پسند قارئین کے لیے بطورِ خاص ایک نیا سلسلہ

شکر گڑھ کے ایک غریب خاندان میں میری پیدائش ہوئی۔ کچھ عرصے بعد ہی والدہ وفات پا گئیں۔ والد نے زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اسکول میں داخلہ دلا دیا۔ ابھی میں نے ایف اے ہی کیا تھا کہ میرے والد دو چوہدریوں کے ایک تنازعے میں اپنے آقا پر قربان ہو گئے۔ مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ عرصۂ حیات تنگ ہونے پر میں نے ایک جعلی پیر مشل شاہ کا سہارا ڈھونڈ لیا۔ بھانڈا پھوٹ جانے پر مشل شاہ نے مجھے اپنے ایک ٹھیکے دار دوست کے پاس بھیج دیا جہاں لالی نامی ایک لڑکی مجھ سے ٹکرائی اور میں اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ ابھی میں مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اشرف خان نامی ایک اسمگلر مجھ سے آ ٹکرایا۔ وہ مجھے شہداد کوٹ اپنے گھر لے گیا۔ وہاں ایک عورت زرینہ بھی تھی جو اشرف خان کی ساتھی اور بہترین دوست تھی۔ میں نے اشرف خان کے ساتھ مل کر اسمگلنگ کا مال ادھر اُدھر کرنا شروع کر دیا۔ ہمارا دھندا کامیابی سے جاری تھا کہ ایک روز میں ٹرکاروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے مجھ پر بہت تشدد کیا۔ ایک روز موقع پاکر میں ایک نو عمر لڑکے راشد کے ہمراہ ٹرکاروں کے کیمپ سے بھاگ نکلا۔ جاں گسل مراحل سے گزرنے کے بعد میں نے راشد کو اس کے گھر چھوڑا اور اشرف، زرینہ کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اشرف خان نے میری گمشدگی سے پریشان ہو کر استاد لمبو کے گروہ کے ایک آدمی

کو قتل کر دیا تھا۔ ہم نے دوبارہ اپنے دھندے کا آغاز کر دیا۔ ایک کامیاب مہم سے لوٹنے کے بعد ہم گھر میں آرام کر رہے تھے کہ استاد لمبو کی مخبری پر کسٹم اور ایکسائز والوں نے چھاپا مارا۔ افراتفری کے عالم میں فرار ہوتے ہوئے ہم زرینہ کو اپنے ساتھ نہ لا سکے۔ اشرف خان کی ران میں گولی لگ چکی تھی۔ میں اسے لے کر لاہور پہنچا اور اس کے کزن قاسم خان سے جو خود بھی ایک بہت بڑا اسمگلر تھا' رابطہ قائم کیا۔ قاسم خان نے ڈاکٹر کو طلب کیا لیکن اس کی آمد سے قبل ہی اشرف خان مر چکا تھا۔ میں نے قاسم خان کی فرمائش پر اس کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ اشرف خان کی موت اور زرینہ کی تباہی کا ذمے دار استاد لمبو تھا لہٰذا اب وہ میرا بھی دشمن ٹھہرا۔ میں نے اس کے ایک کارندے کو قتل کر کے لاش استاد لمبو کو روانہ کر دی۔ قاسم خان کے لئے کام شروع کرنے کے بعد ایک روز سرحد پار کا چکر لگاتے ہوئے میں رینجرز کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا۔ اسی دوران مجھے راشد کے دو خطوط ملے۔ فرصت ملتے ہی میں راشد کے گھر جا پہنچا جہاں میری ملاقات اس کی بہن راحیلہ سے ہوئی جو محبت میں بدل گئی۔ ایک روز طلاقہ غیر سے واپسی پر کسٹم والوں سے مڈبھیڑ میں قاسم خان کا خاص آدمی اور میرا گہرا دوست شرفو مارا گیا۔ اس کی موت پر قاسم خان نے جس سنگدلی اور بے حسی کا مظاہرہ کیا اس سے مجھے بہت صدمہ پہنچا۔ قاسم خان منشیات کی ایک بڑی کھیپ امریکا اسمگل کرتے ہوئے گرفتار ہو گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی الگ خود مختار حیثیت بنانے کے لئے میں گروہ سے علیحدہ ہو گیا۔ اس دوران راحیلہ نے اچانک ہی شادی کر لی۔ یہ میری زندگی کی بدترین شکست تھی۔ میرا کام کامیابی سے چل نکلا تھا۔ میں نے تیزی سے ترقی کرنے کے لئے بہت سے منصوبے شروع کر دیئے تھے۔ اپنی تمام بلیک منی کو وہائٹ کر کے میں نے کراچی میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی تعمیر شروع کر دی۔ پھر ایک فلم کمپنی خرید لی۔ فلم میکنگ کے دوران ہی مجھے خانہ بدوشی کے عرصے میں ٹھیکیدار کے ہاں نکرانے والی لڑکی لالی ملی جو آج کی مشہور فلم اسٹار ستارہ تھی۔ ایک فلم کی شوٹنگ کے موقع پر میری ملاقات ایک ایکسٹرا لڑکی ہنی سے ہوئی جس نے بعد میں ایک بہت کٹھن موقع پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری مدد کی۔ میرے ایک بزنس پارٹنر سیٹھ کرامت نے مجھے دغا دینے کی کوشش کی تو ہم نے اسے اغوا کر لیا۔ استاد لمبو نے سیٹھ کرامت کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ اسے دیکھ کر میرے وجود میں دبی ہوئی نفرت کی آگ پوری شدت سے بھڑک اٹھی۔ ایک سخت اور خونریز معرکے کے بعد میں نے اسے گردن توڑ کر ہلاک کر دیا۔ ایک موقع پر ستارہ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی مگر میں نے اسے بچا لیا لیکن حملہ آور کو نہ پکڑ سکا۔ ایک جعلی فلمی مصنف نصیر نواز کو میں نے اس کی دوسروں کے ساتھ زیادتیوں اور فلم پر اس خوبصورتی سے پھانسی پر لٹکایا کہ اس کی موت خودکشی معلوم ہو۔ کراچی میں ایک اسمگلر سیٹھ عالم شیر کے آدمیوں نے میری ایک لانچ کو گرینیڈ مار کر تباہ کر دیا۔ میرے آدمیوں نے عالم شیر کو اغوا کر کے ایک خاص اور خفیہ اڈے "دو نمبر" پہ پہنچا دیا جہاں اچھی خاصی مرمت کے بعد اس نے ایک بھاری رقم زرِ تلافی کی مد میں دینا منظور کر لی۔ اپنی کمپنی کے مالی مشیروں کی تجویز پر میں ایک بڑے زمیندار کی زمینوں کا سودا کر کے واپس آ رہا تھا کہ مجھ پر گھات لگا کر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ حملہ آوروں میں سے تین میرے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے جبکہ چوتھا میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ زندگی کے انہی ہنگامہ خیز روز و شب میں کراچی میں میرے فائیو اسٹار ہوٹل کے افتتاح کا خوبصورت لمحہ بھی آ گیا۔ میں کراچی پہنچا تو میری ملاقات اچانک ہی راشد سے ہو گئی۔ اس کے ممی ڈیڈی فوت ہو چکے تھے۔ راحیلہ کو طلاق ہو گئی تھی اور اب دونوں بہن بھائی کلفٹن کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ ان دونوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں کراچی سے واپس لاہور پہنچا تو عجیب و غریب واقعات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ کوئی ریڈ ڈاٹ نامی پُراسرار تنظیم تھی جو میری مخالفت پر اتر آئی تھی۔ ان کے ایک بندر نما' عجیب و غریب کارندے اے نن نے مجھے زچ کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے ہنی اور اس کی والدہ کو بھی اغوا کر لیا۔ اس کی والدہ کو بعد میں قتل کر دیا گیا۔ ایک روز ستارہ کے گھر سے واپسی پر میں نے ایک شخص کو ایک لڑکی سے سیاہ ماسک نما کوئی چیز کھینچتے دیکھ کر پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلا۔ گھر پہنچا تو سیکیورٹی انچارج نے بتایا کہ اے نن نے گھر میں گھس کر تلاشی لی تھی۔ میں ٹونی کو اے نن کو زندہ پکڑنے کی ہدایات دے کر باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ طاہرہ خانم جسے میں مرحوم نصیر نواز کے حوالے سے جانتا تھا مجھ سے ملنے آ گئی۔ میں طاہرہ خانم کے ساتھ ایک ڈانس شو میں چلا گیا۔ دوسری صبح میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ میری نظر اسی ڈانس شو والی لڑکی پرنسس تہمینہ پر پڑی۔ یک لخت میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ پرنسس تہمینہ اصل میں گمشدہ ہنی تھی۔ میں ہنی عرف پرنسس تہمینہ کا راز جاننے کے لئے اس کے ہوٹل پہنچ گیا لیکن وہاں ہنی کے اغوا کنندگان میں سے ایک میرے ہاتھوں مارا گیا اور دو کو میرے آدمیوں نے ہلاک کر دیا۔ جبکہ ان کا سرغنہ اپنے ہی ساتھی کی لات لگنے سے بے ہوش ہو گیا۔ ہنی نے دوسرے روز رات کو ہوٹل کی لانڈری کے قریب ملنے کو کہا۔ دوسرے روز ملاقات ہونے پر ہنی نے مجھے اپنے متعلق بتانے کے بعد ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بھی بہت سی کارآمد باتیں بتائیں۔ ہنی سے ملاقات کے چند روز بعد ایک انتہائی ہولناک سازش میرے علم میں آئی' جس کے تحت ملک کے وزیرِ خارجہ کو ایک تقریب کے دوران میرے کراچی کے فائیو اسٹار ہوٹل میں قتل کروایا جانا تھا لیکن میں نے حفیظ صاحب کے ایک خاص آدمی نذیر کے ساتھ مل کر اس خوفناک سازش کو انتہائی کامیابی سے ناکام بنایا کہ حفیظ صاحب حیران رہ گئے اور جب میں نے انہیں ان کے سیکیورٹی چیف اکرام بیگ کے متعلق بتایا' جو ان کے قتل کی سازش میں شامل تھا تو ان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس سازش میں شریک ایک ویٹر کی لاش بھی ان کے سامنے پڑی تھی جس نے منصوبہ ناکام ہونے پر کوئی مہلک اور زہریلی چیز کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ حفیظ صاحب کے سیکیورٹی چیف اکرام بیگ کو سی آئی ڈی والوں کی تحویل میں دے دیا گیا' حفیظ صاحب پروگرام کے مطابق مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ میں بھی اس سازش کو ناکام بنانے کے بعد راحیلہ سے مل کر نذیر خان کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گیا۔ میں نے راحیلہ اور راشد کو لاہور شفٹ ہونے پر آمادہ کر لیا تھا اور اس پر بہت خوش تھا۔ دورانِ سفر ایک صاحب نے مجھ سے شناسائی کا اظہار کیا مگر میں نے انہیں بالکل نہیں پہچانا۔ اس پر انہیں بہت حیرت ہوئی اور بولے کہ آپ نے ہمیں نہیں پہچانا ـــ بڑے افسوس کی بات ہے۔

تئیسویں قسط

میں نے ملائمت سے کہا "اخباروں کا کیا ہے جناب! اخباروں میں تو عجیب عجیب تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔ کبھی تصویر چھپ جاتی ہے' فلاں جگہ دو ناکوں اور چار آنکھوں والا ایک بچہ پیدا ہو گیا۔ کبھی لائن میں کھڑے ہوئے چار چھ ٹیڑھے میڑھے سے آدمیوں کی تصویر چھپی ہوتی ہے جن کے بارے میں لکھا ہوتا ہے کہ پولیس مقابلے میں یہ پکڑے گئے اور ان کے اتنے ساتھی مارے گئے۔ کبھی کبھی تو تلاش گمشدہ میں کسی بیگم صاحبہ کے کتے کی تصویر بھی چھپ جاتی ہے کہ کالی آنکھوں اور بھورے بالوں والا ٹونی تین دن سے غائب ہے اور اس کی جدائی میں بیگم صاحبہ کا رو رو کر بُرا حال ہے۔ اتنی تصویریں چھپتی ہیں اخباروں میں ..... انسان کس کس کو یاد رکھ سکتا ہے۔"

ملک صاحب تو ایک لمحے کے لئے گڑبڑا گئے۔ ان کی رنگت کچھ متغیر سی ہو گئی۔ لیکن ان کے کچھ بولنے سے پہلے ان کے معزز قسم کے چمچوں میں سے ایک بول اٹھا "کمال ہے چوہدری صاحب!

آپ بات کو کہاں لے گئے.... اپنے ملک ریاض راہی صاحب تو بڑے مشہور لیڈر ہیں۔ روزانہ ان کے بیانات چھپتے رہتے ہیں اخباروں میں' تصویر بھی اکثر چھپتی رہتی ہے۔ بڑے پاپولر آدمی ہیں اپنے علاقے میں..... ڈنکا بجتا ہے ان کے نام کا۔"

"یہ میری بد قسمتی ہے کہ اس ڈنکے کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچی۔" میں نے بدستور شائستگی سے کہا "بہرحال آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے مصافحے کے لئے ملک ریاض راہی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی باچھیں ذرا کھل گئیں۔ اس نے گرم جوشی اور مضبوطی سے مصافحہ کیا۔ آدمی مضبوط معلوم ہوتا تھا۔

اسی لمحے مجھے کچھ یاد آیا کہ ضلعی خبروں والے صفحے پر نظر دوڑاتے وقت شاید یہ نام میری نظر سے گزرا تھا لیکن ظاہر ہے وہ صفحہ میں پڑھ نہیں پاتا تھا۔ یونہی سرسری سے انداز میں نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جاتا تھا۔ اخبارات کے ان صفحوں پر شاید کبھی کبھار اس کی چند سطری کوئی خبر سنگل کالم میں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی شاید تصویر بھی چھپتی تھی لیکن میرے ذہن میں نہیں رہی تھی۔ میں نے کبھی توجہ سے دیکھی ہی نہیں تھی۔

"یہ راہی کیا آپ کا تخلص ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"جی ہاں...." اس نے فخر سے جواب دیا "لیکن ابھی میں نے شاعری شروع نہیں کی۔ ابھی میں کوئی اچھا سا استاد ڈھونڈ رہا ہوں جو میرے کلام پر اصلاح دے سکے۔"

'کلام پر اصلاح دینے کی' بات بھی خوب تھی۔ میں نے کہا۔ "جب آپ نے کچھ کہنا شروع ہی نہیں کیا تو پہلے سے ہی اصلاح کرنے والے کی تلاش کیوں شروع کردی؟"

"دیکھیں نا چوہدری صاحب! انسان کوئی بھی نیا کام شروع کرتا ہے تو اس میں غلطیاں تو ہوتی ہیں نا..... میں زیادہ خوش فہمی میں مبتلا رہنے والا آدمی نہیں ہوں۔" وہ حتی الامکان متانت سے بولا۔ میں اس کے اس بیان سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ حالانکہ اس کے ساتھ چھ سات آدمی ایسے سفر کر رہے تھے جن کا کام ہی غالباً اسے دن رات خوش فہمیوں میں مبتلا رکھنا تھا۔ مگر وہ کہہ رہا تھا کہ وہ خوش فہمیوں میں مبتلا رہنے والا آدمی نہیں۔ عجیب بات تھی۔ بیشتر لوگوں کے ساتھ میں نے یہی معاملہ دیکھا تھا کہ جو وہ ہوتے تھے' اپنے آپ کو اس کے بالکل الٹ سمجھتے تھے..... یا کم از کم الٹ ظاہر ضرور کرتے تھے۔ مثلاً ہر وقت خوشامدیوں میں گھرے رہنے والے اور ذرا ذرا سی تعریف پر پھول جانے والوں کو میں نے کہتے سنا تھا کہ وہ خوشامد کو بالکل پسند نہیں کرتے۔

میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ملک ریاض راہی کو دراصل استاد کی نہیں' کسی ایسے مفلوک الحال شاعر کی ضرورت تھی جو اپنا کلام اس کے ہاتھ فروخت کر سکے جسے وہ اپنے نام سے چھپوا کر اور مشاعروں میں پڑھ کر شاعر ہونے کی سند پا سکے۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس کا اصل شوق لیڈری ہی تھا۔ شاعری کی یہ جعلی تحریک اس نے فالتو میں ہی پالی ہوئی تھی۔ وہ انہی لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جن کے لئے سیاست ہر اعتبار سے منافع بخش' ہوتی ہے۔ شوق کا شوق' شہرت کی شہرت' مشغلے کا مشغلہ اور کاروبار کا کاروبار۔ جہاں لاکھ لگاؤ وہاں سے بعد میں دس لاکھ کماؤ۔ ان لوگوں کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ صرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے ہوتا ہے۔ دلی طور پر انہیں کسی نظریئے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ جدھر کا پلڑا جھکتے دیکھتے ہیں اسی طرف ہو جاتے ہیں۔

تاہم ملک ریاض راہی فی الحال ایک چھوٹی سی پارٹی میں تھا۔ شاید اس لئے کہ وہاں اسے بڑا سا عہدہ ملا ہوا تھا۔ دولت اس کے پاس ٹھیک ٹھاک ہی لگتی تھی۔ بنیادی طور پر زمیندار تھا لیکن پراپرٹی کے دھندے میں بھی سرگرم معلوم ہوتا تھا۔ لاہور میں بڑی بڑی کوٹھیاں خرید کر بیچتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ سفر کرنے والے چھ سات آدمی بھی خوشحال ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی اس کی پارٹی کا عہدیدار تھا اور کوئی بغیر عہدے کے ہی اس کے لئے کوئی نہ کوئی خدمت انجام دے رہا تھا۔ وہ کچھ شاطر اور موقع پرست سے آدمیوں کا ایک چھوٹا سا گینگ معلوم ہوتا تھا۔

کافی باتیں ہو چکیں تو وہ سوال میری زبان پر آگیا جو شروع سے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ "ملک صاحب! آپ نے مجھے پہچانا کیسے؟ جبکہ بقول آپ ہی کے 'میری تصویر اخباروں میں بھی نہیں چھپتی'؟"

وہ ایک غیر ملکی سگریٹ سلگا کر طویل کش لینے کے بعد بولا۔ "آپ جیسے لوگ عوامی سطح پر مشہور نہیں ہوتے لیکن شہر کے خاص خاص لوگوں میں اور اونچے طبقوں میں بہت اچھی طرح جانے پہچانے جاتے ہیں۔" پھر وہ معنی خیز سے انداز میں ہنسا "اور آپ جیسے لوگ ہم جیسے سیاسی لوگوں کی تو لسٹ پر ہوتے ہیں۔ آپ کو پہچاننا تو ہماری ضرورت ہوتا ہے۔ خواہ غائبانہ طور پر ہی سہی۔"

"لسٹ پر ہوتے ہیں!" میں نے حیرت سے دُہرایا "کون سی لسٹ پر ملک صاحب؟ کیا ہٹ لسٹ پر؟"

اس نے ایک کو نجدار قہقہہ لگایا۔ سگریٹ کا ایک اور کش لے کر راکھ جہاز کے قالین پر جھاڑی اور خوشدلی سے بولا "خدا نہ کرے آپ کسی کی ہٹ لسٹ پر ہوں۔ ابھی تو آپ نوجوان ہیں۔ ابھی تو آپ کو بے شمار کام کرنے ہیں۔ ملک و قوم کے لئے..... ہمارے لئے۔"

ایک تو یہ قوم کے نحیف و نزار اور مریل گھوڑے کی پیٹھ پر سواری کرنے والے موٹے موٹے تگڑے ہر بات میں ملک و قوم کو درمیان میں ضرور لے آتے تھے جن کی حالت انہی کے اعمال کے بوجھ سے ابتر تھی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے۔ گرچہ کیڑا ہوں میں ذرا سا۔"

اس نے ایک بار پھر گونجیلا سا قہقہہ لگایا۔ اس کے ہنسنے کے ساتھ ہی اس کے ہم سفروں کی باچھیں بھی پھیل جاتی تھیں۔ وہ میرے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر بولا "آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں چوہدری صاحب۔ آپ کی نوجوانی کے باوجود' آپ کی کاروباری حیثیت کو دیکھتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ آپ بھی دوسرے کاروباری بڑے لوگوں کی طرح خشک نہ ہوں۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ "بہرحال...... آپ کی مصروفیات زیادہ تر خشک قسم کی ہی ہوں گی۔ کاروبار بڑا خشک کام ہے لیکن اگر کبھی آپ شہری زندگی سے بور ہوجائیں اور آپ کی طبیعت سیروشکار' تفریح اور ایڈونچر کی طرف مائل ہو تو ہمیں یاد فرمایئے گا۔ ہم آپ کو اپنے علاقے میں لے چلیں گے۔ کچھ دن تفریح میں گزاریں گے تو یاد کریں گے۔"

پھر وہ آنکھ دبا کر سرگوشی میں بولا "یہ مت سمجھئے گا کہ گاؤں جاکر آپ خاک پھانک کر آجائیں گے۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ بلکہ بلا ضرورت بھی آپ جو کہیں گے' حاضر کردیا جائے گا۔ جنگل میں منگل ہے۔ ایک بار تجربہ کر کے ضرور دیکھئے گا۔"

"مجھے اندازہ ہے ملک صاحب! آدمی کے پاس دولت ہو تو جنگل بھی شہر ہیں اور دولت نہ ہو تو شہر بھی بیاباں ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ پھڑک اٹھنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا "لاکھ روپے کی بات کی ہے آپ نے...... پیسے والے ہیں نا آپ...... اس لئے آپ کو پیسے کی طاقت کا اندازہ ہے۔ سارا کھیل ہی پیسے کا ہے جی۔ یہ پوری دنیا اپنے محور کے گرد نہیں' پیسے کے گرد گھوم رہی ہے۔ ہمارے ہاں ہر سرگرمی پیسے کی وجہ سے ہے یا پیسے کے لئے۔ سیاست' نوکری' حتیٰ کہ سماجی خدمت' سب کی تہہ میں پیسے کا ہی چکر ہے۔ ہم بھی زمانے کے ساتھ چل رہے ہیں۔"

"کیا زمانہ بہت بُرا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو اس میں کوئی شک ہے کیا؟ آپ دنیا کی حالت نہیں دیکھ رہے' چاروں طرف کیا ہو رہا ہے!" وہ گویا میری بے خبری پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں نے حال ہی میں ایک حدیث پڑھی ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ زمانے کو بُرا مت کہو' زمانہ میں ہوں' انسان زمانے کو بُرا کہہ کر مجھے تکلیف پہنچاتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "اور واقعی...... زمانہ تو غیب کی علامت ہے۔ بُرے تو ہم انسان ہوتے ہیں۔ ہم اپنی حرکتوں سے جس دور کو چاہیں اچھا بنا سکتے ہیں اور جس دور کو چاہیں بُرا۔ تو پھر ہم یہ کیوں نہیں کہتے کہ انسان بہت بُرا ہوگیا ہے۔ یہ کیوں کہتے ہیں کہ زمانہ خراب آگیا ہے۔"

ملک ریاض راہی نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "چوہدری صاحب! کہیں میں آپ کو غلط تو نہیں سمجھ رہا؟ کہیں آپ اندر سے مولوی تو نہیں ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا "مولوی ہونا تو کافی مشکل کام ہے۔ میں تو پہلے اندر سے انسان بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اوہ..... آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" وہ طمانیت کی گہری سانس لے کر بولا۔

"آج کل یہی بات سن کر لوگ ڈر کیوں جاتے ہیں؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"چوہدری صاحب......!" وہ ایک بار پھر آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے بولا "اب آپ اتنے بھولے بادشاہ نہ بنیں۔ آپ کو بہت اچھی طرح پتا ہے دنیا کدھر جارہی ہے' لوگ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کو دنیاداری کے سارے چکروں کا پتا ہے۔ اگر آپ اتنے سیدھے ہوتے تو اتنے بڑے بزنس مین نہ بنتے۔"

"میں نے کب کہا کہ مجھے دنیاداری کے چکروں کا پتا نہیں؟" میں نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں۔ "جب سے پتا چلا ہے..... دنیا کو زیادہ قریب سے دیکھا ہے تب سے ہی تو دل زیادہ دکھنے لگا ہے۔ آگہی بلاشبہ ایک عذاب ہے۔"

"چھوڑیں جی..... " وہ میرا ہاتھ تھپک کر بولا "آپ کسی قسم کے عذاب ثواب کے چکروں میں نہ پڑا کریں۔ آپ کی ابھی عمر کیا ہے۔ دنیا دیکھیں' ہر چیز کو انجوائے کریں۔ ورنہ بعد میں پچھتائیں گے۔"

"انجوائے تو میں کر رہا ہوں۔ میں تو آپ جیسے لوگوں کی باتوں کو بھی انجوائے کرتا ہوں۔ لیکن ہو سکتا ہے پھر بھی بعد میں پچھتانا پڑے۔ پچھتاوے کا کیا ہے۔ زندگی کے آخری موڑ پر پہنچ کر تو میں نے اکثر لوگوں کو..... خصوصاً دنیاداروں کو پچھتاتے ہی دیکھا ہے۔ دنیا میں سب کچھ دیکھ لینے' حاصل کر لینے اور برتنے کے بعد بھی آخر میں ہاتھ جھاڑ کر یہی سوچتے ہیں۔ "اچھا.....! بس یہی تھی دنیا؟ اس کے لئے اتنے پاپڑ بیلے؟ اتنے پاپ کمائے؟ دُر نٹے منہ.....! چاہے وہ منہ سے ایسا نہ کہیں لیکن قریب سے مشاہدہ کرنے پر ان کے محسوسات کچھ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"چھوڑیں چوہدری صاحب! آپ تو خیالوں خوابوں کی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ فولڈنگ میز کی ایش ٹرے میں سگریٹ مسلتے ہوئے بولا "ہم نے تو زندگی کی آخری سانس تک دنیا والوں کو دنیاداری ہی کے چکروں میں پریشان دیکھا ہے۔ بستر مرگ پر پڑے ہوں گے' آخری سانس سینے میں اٹکی ہوئی ہوگی لیکن فکر پڑی ہوگی کہ فلاں جائداد کا کیا بنا؟ فلاں کارخانہ فلاں لڑکے نے سنبھال لیا یا نہیں' فلاں فلاں فائلیں فلاں فلاں محکموں سے نکل آئیں یا نہیں؟ انہی فکروں میں تڑپتے ہوئے اور خواب آور دواؤں کے انجکشن لگواتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں..... اور میں کہتا ہوں یہ ٹھیک ہی ہے۔ زندگی اسی جدوجہد کا نام ہے۔ آدمی کو اسی طرح ہاتھ پاؤں مارتے مارتے مرنا چاہئے' مفلوج ہو کر نہیں۔ بے بسی اور فالج زدگی کی سی موت سے مجھے خوف آتا ہے جس میں انسان کچھ کر

ہی نہ سکتا ہو۔ حتیٰ کہ سوچ بھی ٹھیک طرح سے اس کے قابو میں نہ ہو۔"

"اب یہ تو کوئی انسان یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اسے کیسی موت نصیب ہوگی۔ دنیا کی ساری دولت بھی انسان کو اس کی پسند کی موت نہیں دلوا سکتی۔" میں نے کہا۔ "اسی لئے تو میں سوچتا ہوں کہ ہر طرح کی موت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ بلکہ صرف موت کے لئے انسان تیار رہ لے تب بھی غنیمت ہے۔ یہ یاد رکھ لے کہ موت کے بعد کسی کے سامنے پیشی ہونی ہے۔"

"اب آپ غالباً توشۂ آخرت وغیرہ کی بات کریں گے۔ خدارا ناں لیں چوہدری صاحب! کوئی ہم جیسے گناہ گار انسانوں میں اٹھنے بیٹھنے والی باتیں کریں۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"گناہ گار تو میں بھی بہت ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن گناہ کو گناہ سمجھنے میں، اچھے اور برے کے درمیان امتیاز رکھنے میں کیا حرج ہے؟ انسان کم از کم گناہوں پر فخر تو نہ کرے۔ انہیں زندگی کا حاصل تو نہ سمجھے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ اس سے انسان کا ضمیر زندہ ہونے کا سراغ ملتا ہے۔"

"چھوڑیں جی چوہدری صاحب! خالی خولی امتیاز رکھنے اور شرمندہ ہونے کا کیا فائدہ؟ جب انسان گناہوں کو چھوڑ نہ سکتا ہو، برائیوں سے پرہیز نہ کر سکتا ہو، اچھائی کے راستے پر قائم ہی نہ رہ سکتا ہو، ان ساری باتوں کی اس میں طاقت ہی نہ ہو تو پھر خالی وعظ کرتے رہنے کا کیا فائدہ؟ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ خالص دنیا دار ہی بن جائیں۔ ہر وقت ایک خلش میں، ایک کسک میں تو مبتلا نہ رہیں۔ بیچ میں تو نہ لٹکے رہیں۔ یا تو آپ سارے احکام کی عملی پابندی کریں یا پھر پورے دنیا دار ہو جائیں، کسی ایک طرف کے ہو جائیں۔ انسان کسی بھی معاملے میں دو کشتیوں کا سوار نہیں رہ سکتا۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا، شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ آدمی جاہل معلوم ہوتا تھا لیکن جاہل بھی کبھی کبھی پتے کی بات کر جاتے ہیں۔ وہ جو بھی تھا لیکن جہاندیدہ بہرحال معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پہلے کی نسبت ذرا کمزور لہجے میں کہا "میں تو نہ اپنے آپ کو اچھے، نیک اور پارسا لوگوں میں شمار کر رہا ہوں اور نہ ہی بیچ والوں میں۔ میرا خیال ہے میں تو خود بھی آپ جیسے دنیا داروں میں ہی شامل ہوں ملک صاحب! لیکن یونہی کبھی کبھی کوئی غیبی آواز سی بے چین کر دیتی ہے۔ میرا بھی جی بہت نیک، بہت پارسا بن جانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کس چیز نے روکا ہوا ہے۔"

"دنیا کی کشش نے۔" ملک مسکرایا۔ "اس دنیا میں بڑی کشش ہے۔ اس کی ہر چیز میں بڑی لذت ہے۔ سچی ہے یا جھوٹی، پائیدار ہے یا ناپائیدار، لیکن بہرحال لذت ہے۔ آپ غیبی آوازوں سے زیادہ پریشان نہ ہوا کریں۔ ہم جیسوں سے دوستی رکھیں، آپ کو ہر طرح کی غیبی آوازیں ستانا بند کر دیں گی۔"

پھر اس نے انگوٹھے کے اشارے سے بوتل منہ سے لگانے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ شغل چلتا ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہی تو خرابی ہے آپ میں۔" وہ گویا مرض کی جڑ پکڑتے ہوئے بولا "جب بھی غیبی آوازیں آپ کو ستایا کریں، بوتل کھول لیا کریں۔ ساری آوازیں ختم ہو جائیں گی۔ صرف خواہشوں کی آواز رہ جائے گی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، آپ کو ہم جیسے انسانوں کی صحبت کی اشد ضرورت ہے۔ آپ پہلی فرصت میں چاہے لاہور میں ہمارے ساتھ نشست رکھیں یا پھر زمینوں پر چلنے کا کوئی پروگرام بنائیں۔"

مجھے اس کی دعوت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن معلومات کی خاطر میں نے پوچھا "کہاں ہیں آپ کی زمینیں؟"

"اوپر والے کا بڑا کرم ہے....." ایک لمحہ پہلے وہ جس طرح کی باتیں کر رہا تھا، ان کی روشنی میں یہ اوپر والے کے کرم کی بات اس کے منہ سے بڑی عجیب لگی لیکن معاشرہ ایسے ہی تضادات سے بھرا پڑا ہے۔ میں کس کس پر حیران ہوتا۔ وہ بڑے تفاخر بھرے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "دو مختلف علاقوں میں زمین ہے اپنی۔" اس نے علاقوں کا نام بتایا اور میں چونکے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ ان میں سے ایک علاقے کا نام شکر گڑھ تھا۔

میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "شکر گڑھ کے قریب تو کافی زمین ملک اسلم حیات کی بھی تھی۔ کئی چک آباد تھے ان زمینوں پر۔"

میں نے تو اپنا چونکنا اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا لیکن وہ واضح طور پر چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "کیا آپ جانتے تھے ملک اسلم حیات کو؟"

میں نے بے نیازی سے کہا "نہیں۔ البتہ ملک اسلم حیات کا کوئی بیٹا تھا۔ شاید قیصر ملک نام تھا اس کا۔ وہ فلم بزنس میں بھی تھا۔ میرا بھی کچھ پیسہ فلم بزنس میں لگا ہوا ہے۔ وہیں اسٹوڈیو میں اتفاقاً ایک آدھ بار اس سے ملاقات ہوئی۔ اور وہ کچھ ایسے خوشگوار حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال اس کے بیک گراؤنڈ کا پتا چلا تھا۔"

وہ گویا اطمینان کی سانس لے کر بولا "قیصر سے تو کم ہی لوگوں کی ملاقات خوشگوار حالات میں ہوتی تھی۔ تھا تو وہ بڑا زندہ دل اور ہمارے جیسے ہی شوق رکھنے والا لڑکا۔ لیکن فلم لائن نے اسے کچھ زیادہ خراب کر دیا تھا....."

میں نے دل میں سوچا، میرے خیال میں تو وہ فلم لائن کو زیادہ خراب کر رہا تھا، لیکن میں خاموش رہا۔ ملک ریاض بات جاری رکھتے ہوئے بولا "خرابی اس میں صرف یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اسے اپنے فائدے نقصان کی تمیز نہیں رہی تھی۔ کیا آپ کو معلوم ہے وہ دونوں باپ بیٹے کچھ ہی عرصے میں مارے گئے تھے؟"

"ہاں۔ میں نے کچھ سنا تو تھا لیکن مجھے صحیح طور پر حالات کا علم نہیں۔ میں نے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لی تھی۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ شاید ملک ریاض کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ دونوں باپ بیٹے میرے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچے تھے۔

وہ ترحم آمیز سے لہجے میں بولا "وہ جیسے بھی تھے بہر حال نہایت غیر متوقع طور پر ان کے خاندان کا نام و نشان مٹ گیا تھا۔ باپ پُراسرار حالات میں غائب ہوا۔ غائب کیا ہوا... سب ہی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کے بعد زمین جائداد وغیرہ اکلوتے بیٹے کے نام منتقل ہوئی۔ پھر وہ بھی مر گیا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ یعنی اتنی بڑی زمینداری وغیرہ کا کوئی وارث ہی نہیں۔ بس قریب ترین رشتے دار میں ہی تھا۔ میرے پاس پہلے ہی اللہ کا دیا بہت کچھ تھا لیکن ان کا سب کچھ بھی مجھے ہی مل گیا۔ کچھ عدالتی کارروائیاں ضرور کرنی پڑیں۔ لیکن تھانے کچہریاں ہم لوگوں کے لئے گھر کی طرح ہوتی ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میں بیٹھے بٹھائے پہلے سے دگنا بڑا زمیندار بن گیا۔ حالانکہ ان لوگوں کی زندگی میں میرا کبھی ان لوگوں سے میل جول نہیں رہا... بلکہ یوں سمجھ لیں کہ دونوں طرف ایک طرح کی ہلکی پھلکی سی ناپسندیدگی پائی جاتی تھی۔"

پھر وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "لیکن بھئی سچی بات ہے، ان کے مرنے کے بعد میں ان کا کافی شکر گزار ہوں۔ کافی فائدہ پہنچا ہے ان کی موت سے۔ میری صاف گوئی شاید آپ کو پسند نہ آئے لیکن میں کھرا آدمی ہوں۔ سچی بات کرتا ہوں۔ خواہ مخواہ منہ لٹکا کر بیٹھنے اور ایسے لوگوں کی موت پر اظہارِ افسوس کرنے کی کوشش نہیں کرتا جن کی موت کا مجھے حقیقت میں کوئی افسوس ہوا ہی نہیں ہوتا۔ کیوں جی، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں چوہدری صاحب؟"

"نہیں۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے بے دھیانی سے کہا۔ میں اصل میں اب ایک نئے زاویۂ نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے یہ اتفاق بڑا عجیب سا لگ رہا تھا کہ میری زندگی کے سادہ ورق پر دشمنی اور نفرت کے خانے میں جس شخص کا نام سب سے پہلے.... اور بہت گہرے حروف میں لکھا گیا تھا، آج اس کی زمینوں اور جائداد کا وارث میرے برابر بیٹھا مجھ سے گپ شپ کر رہا تھا۔ وارث بھی وہ جو در حقیقت وارث تھا ہی نہیں۔ وقت نے ویسے ہی اٹھا کر سب کچھ اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اس دولت و جائداد کے لئے ملک اسلم حیات اور پھر اس کے بیٹے قیصر ملک نے نہ جانے کیا کیا پاپ کمائے تھے، کیا کیا ظلم ڈھائے تھے۔ اس دولت و جائداد کو حقیقی وارث بھی میسر نہیں آسکا تھا.... اور اس کے بل پر وہ اپنے لئے عزت کی موت بھی نہیں خرید سکے تھے۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو بڑی بے وقعت لگتی ہیں یہ چیزیں۔

اچانک وہی ائرہوسٹس ایک بار پھر ہمارے قریب سے گزری جس کی نظر التفات کے لئے ملک ریاض خاصی دیر سے پھڑک رہا تھا۔ وہ مجھے ہلکے سے کہنی مار کر اور آنکھ دبا کر بولا "کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔" میں نے سادگی اور سنجیدگی سے کہا "لیکن آپ اُسے اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ بے چاری یہاں سے گزرتی ہے تو کچھ سہمی سہمی سی نظر آتی ہے۔"

"چھوڑا ہوا تو ہے اس کے حال پہ۔ ہم کون سا اُسے اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔" ملک ریاض نے قدرے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا "ویسے آپ اس کے سہمی سہمی نظر آنے پر نہ جائیں۔ یہ تو ایسے ہی ذرا دکھاوے کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ جہاز ان کا اسٹیج ہے نا۔ ذرا پرفارمنس دیتی ہیں اور ایکٹنگ کرتی ہیں کہ بڑی سیدھی سادی، پاکباز اور معصوم ہیں۔ لیکن بڑی خرانٹ ہوتی ہیں۔ یہ تو دل سے چاہتی ہیں کہ ہم جیسے مشہور اور دولت مند لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں، انہیں لفٹ دیں۔ جال ہم تھوڑا ہی پھینک رہے ہوتے ہیں، جال تو ان کے پاس ہوتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے کچھ واقعی سیدھی سادی، پاکباز اور معصوم ہوتی ہوں۔ خرانٹ نہ ہوتی ہوں۔ جال لئے نہ پھرتی ہوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آخر ہم، لوگوں کے بارے میں حسنِ ظن کیوں نہیں رکھتے؟ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ شاید ہماری نظریں دھوکا کھا رہی ہوں۔ شاید ہمارا تجربہ جھوٹ بول رہا ہو؟ کبھی کبھی خواہ حقیقت سامنے ہو تب بھی کیا کچھ اور فرض کر لینا زیادہ بھلا نہیں لگتا؟"

"چوہدری صاحب! ہم جیسے لوگوں کے منہ سے یہ افسانوی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" وہ ہاتھ ہلا کر بولا "ہم حقیقت کی دنیا کے لوگ ہیں۔ کم از کم میرا اپنے بارے میں تو یہی خیال ہے کہ میں ایسی سوچیں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ یہ باتیں پرورش پانے والے خیالی اور خواب پرست نوجوانوں کے لئے۔ چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے والے شریف اور شرمیلے بابوؤں کے لئے۔ ناکام شاعروں اور ادیبوں کے لئے۔ ہم بہت آگے کے لوگ ہیں چوہدری صاحب! ہمیں دنیا کو اسی طرح دیکھنا چاہئے جیسی وہ ہے۔"

وہ ائرہوسٹس کو خرانٹ کہہ رہا تھا لیکن خود زبردست خرانٹ معلوم ہوتا تھا۔ اندر سے وہ یقیناً بہت کھُردرا، سفاک اور خود غرض تھا۔ میں نے اس سے بحث کرنا فضول سمجھا۔ ویسے بھی اب زیادہ باتوں کا وقت نہیں رہا تھا۔ اسپیکر پر کیپٹن کی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ چند منٹ بعد ہم لاہور ائرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔

ریاض ملک بولا "آپ سے تو کچھ امید نظر نہیں آرہی کہ آپ کبھی ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں گے۔ اس لئے جلدی ہم خود آپ کے درِ دولت پر حاضری دیں گے۔"

میں ازراہِ مروت کارڈ نکال کر اسے دینے لگا تو وہ بے پروائی سے بولا "اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے عرض کیا، نا کہ ہم جیسے لوگ آپ جیسے لوگوں کو غائبانہ طور پر بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ویسے بھی آپ جیسے لوگوں کا ایڈریس، فون نمبر وغیرہ معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ ڈائرکٹری میں بھی آپ کی تو یہ سب چیزیں نہایت

نمایاں طور پر آپ کے گروپ آف کمپنیز کے مونوگرام کے ساتھ چھپی ہوئی ہیں۔"

اس کا میرے بارے میں اس طرح سطحی سی معلومات رکھنا بھی مجھے کھٹک رہا تھا۔ بغیر کسی مطلب کے کوئی کسی کے بارے میں اتنی معلومات بھی کہاں رکھتا ہے۔ بہر حال میں نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ لاہور ائرپورٹ پر ایک چھوٹا سا جلوس اسے لینے آیا ہوا تھا۔ ملک ریاض ارائیول لاؤنج میں پہنچا تو جلوس کے شرکا نے اس کی گردن ہاروں سے لاد دی۔ دو تین فوٹوگرافر بھی اس وقت موجود تھے جنہیں یقیناً پارٹی ورکر ہی کھینچ کھانچ کر ساتھ لائے تھے۔

ملک ریاض فاتحانہ انداز میں ہاتھ ہلاتا اور ہر دو تین قدم بعد بڑی متانت سے رک کر فوٹوگرافروں کو اپنی تصویر کھینچنے کا موقع دیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اس سے چند قدم پیچھے تھا۔ اچانک اس نے ہاروں کے انبار میں بڑی مشکل سے گردن ذرا گھما کر متلاشی نظروں سے پیچھے دیکھا۔ یقیناً اسے میری تلاش تھی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی غالباً سب سے پہلے تو اسے یہ اطمینان حاصل ہوا کہ میں اس کے استقبال کا یہ عظیم اور متاثر کن نظارہ دیکھ رہا ہوں۔ پھر اس نے مجھے بھی اس اعزاز میں شریک کرنے کے لئے جلدی سے قریب آنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے اشارے سے ہی معذرت کی اور فوراً اس طرف کو کھسک لیا جہاں ٹونی کھڑا تھا۔ حالانکہ میں نے فون کرکے صرف ڈرائیور کو بلوایا ہوا تھا لیکن ٹونی میری آمد کی اطلاع سن کر خود بھی چلا آیا تھا۔

میں نے بریف کیس اسے تھمایا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ لپک کر میرے ساتھ ہوتے ہوئے بولا "خیریت ہے سر؟ آپ بہت عجلت میں دکھائی دیتے ہیں۔"

"تم نے دیکھا نہیں، قوم کا ایک عظیم خادم مجھے اپنی رفاقت کا اعزاز بخشنے پر تلا ہوا ہے۔"

ٹونی اپنے مخصوص، دھیمے سے انداز میں ہنس دیا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے ہجوم کے سامنے آنے اور پبلک مقامات پر خواہ مخواہ خود کو نمایاں کرنے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔ وہ لوگ ابھی لاؤنج میں ہی نعرے بازی کر رہے تھے۔ ہم باہر آکر پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ٹونی شہر کے تقریباً ہر قابلِ ذکر آدمی کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "تم اس شخص کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"ملک ریاض راہی کے بارے میں؟" اس نے تصدیق چاہی۔ میں نے اثبات میں سرہلایا تو وہ بولا "کچھ ہی عرصے پہلے ایک تانگہ پارٹی میں شامل ہوا تھا...."

"تانگہ پارٹی میں؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔

"اوہ.... معاف کیجئے گا.... یہ ایک عوامی اصطلاح ہے اور آپ کا اب عوامی اصطلاحوں سے زیادہ واسطہ نہیں رہا۔" ٹونی مسکراتے ہوئے بولا "دراصل ہمارے ملک میں بہت سی ایسی پارٹیاں بھی ہیں جن کے عہدیدار اور ارکان وغیرہ سب مل کر ایک تانگے میں سما سکتے ہیں۔ انہیں تانگہ پارٹی کہا جاتا ہے۔ ملک ریاض جب اس پارٹی میں شامل ہوا تو وہ بھی تانگہ پارٹی ہی تھی۔ لیکن اس کے آتے ہی گویا پارٹی میں بھی جان پڑ گئی اور خود ملک ریاض بھی راکٹ کی رفتار سے سیاست کے افق پر سفر کر رہا ہے۔ ابھی اس سطح پر تو نہیں پہنچا کہ گلی کوچوں میں جانا پہچانا جانے لگے لیکن آثار بتاتے ہیں کہ سال دو سال میں بڑے بڑے جغادری لیڈروں کے کان کترجائے گا۔"

"ایسی کیا خوبی ہے اس میں؟" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا "جہاز میں سفر کے دوران میری اس سے تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو رہی۔ مجھے تو انتہائی عیار، بدمعاش، منافق اور جھوٹا آدمی دکھائی دیا۔"

"یہی تو ہمارا المیہ ہے سر!" ٹونی ٹھنڈی سانس لے کر بولا، "اکثر و بیشتر سیاست میں آنے والوں کی یہی برائیاں ان کی خوبیاں بن جاتی ہیں۔ انہی کے سہارے وہ تیزی سے آگے آتے چلے جاتے ہیں۔ سیدھے سادے اور کم علم لوگوں کو جو جتنا زیادہ اُلّو بنا سکتا ہے وہ اتنا ہی بڑا اور کامیاب لیڈر بن جاتا ہے۔"

"کیا اس میں لوگوں کا کوئی قصور نہیں؟ میرا مطلب ہے عوام کا؟" میں نے کہا۔

"عوام کا تو شاید نہیں...." ٹونی ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا، "لیکن ان کی کم علمی، کم فہمی اور بے خبری کا ضرور ہے۔ لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ انہیں جان بوجھ کر کم علم اور ذہنی طور پر پسماندہ رکھا گیا ہے۔"

"ملک ریاض کے بارے میں اور کچھ جانتے ہو؟" میں نے اس طوالت طلب موضوع سے کتراتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی کامیابی کی دوسری بڑی وجہ پیسہ ہے سر!" ٹونی بولا۔ "پیسہ وہ پانی کی طرح بہا رہا ہے۔ پارٹی کے دفتروں میں لنگر کھلے رہتے ہیں۔ پولیس والوں کے لئے، جلسے جلوسوں کے لئے گویا تھیلیوں کے منہ کھلے رہتے ہیں۔ ویسے تو بہت سے لوگ سیاست میں خاندانی دولت اس امید پر خرچ کرتے رہتے ہیں کہ آج دس بیس لاکھ لگائیں گے تو کل دس بیس کروڑ کمائیں گے۔ لیکن ملک ریاض جس دریادلی سے خرچ کر رہا ہے اس سے تو لگتا ہے کہ وہ خاندانی دولت بھی نہیں ہے۔ جوں جوں سیاست میں اس کے خرچے بڑھ رہے ہیں، اس کی خاندانی دولت اس سے بھی زیادہ بڑھتی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ ویسے ہی بس میرا مشاہدہ ہے۔ صحیح اعداد و شمار تو مجھے معلوم نہیں۔ کیونکہ میں نے اسے کبھی اتنی اہمیت نہیں دی۔"

"وہ زمیندار ہے اور بڑی پراپرٹی کا سائڈ بزنس بھی کرتا ہے۔ دونوں کام بہت زیادہ منافع دے رہے ہوں گے۔ جتنا مہینے میں خرچ ہو رہا ہوگا اتنا تو شاید وہ ایک گھنٹے میں کما لیتا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تو یسے بھی ہمارے ہاں جب لوگ سیاست میں آجاتے ہیں تو ان سے حساب کتاب لینے والا کوئی نہیں رہتا۔ ایک عام آدمی ذرا صاف ستھری سی کپڑے کی دکان بھی کھول لے تو اس کے پاس انکم ٹیکس والے پہنچ جاتے ہیں اور حساب مانگتے ہیں۔ پوچھتے ہیں کہ دکان کھولنے کے لئے پیسہ کہاں سے آیا لیکن سینڈل جوتیاں چٹخانے والے جب سیاست میں آکر مرسیڈیزوں میں گھومنے لگتے ہیں' بلڈنگیں کھڑی کرلیتے ہیں تب بھی ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ دریا کہاں سے بہتے چلے آرہے ہیں۔"

ٹونی استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر رہ گیا۔ نذیر خان کراچی سے لے کر اب تک صرف سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ اتنی دیر سے وہ بالکل نہیں بولا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "نذیر بھائی! آپ تو بالکل ہی چپ ہیں۔ جب سے کراچی سے چلے ہیں تب سے ایک لفظ بھی نہیں بولے۔ ایسی بھی کیا خموشی۔ آپ کے سامنے اتنے اتنے عظیم موضوعات پر تبادلہ خیال ہو رہا ہے۔ آپ بھی تو کچھ اظہار خیال کیجئے نا۔"

نذیر خان پہلو بدلتے ہوئے ایک مربیانہ بے نیازی سے بولا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک بولنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے موقع ملتا' میں تب بھی نہ بولتا۔ ایک بے چارے نذیر خان کے بولنے سے کیا ہوگا؟ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر لوگ ہر پہلو سے بول چکے' لکھ چکے' ہر زاویئے سے ان پر اظہار خیال کرچکے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑگیا؟ کچھ بھی نہیں۔ پرنالہ وہیں بہہ رہا ہے اور وہیں بہے گا۔ الجھاوے وقت کے ساتھ ساتھ مزید بڑھیں گے' کم نہیں ہوں گے۔ ہمارے نظام اور ہمارے مسائل کی مثال الجھے ہوئے دھاگوں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کی سی ہے۔ ہر دھاگا الجھا ہوا ہے۔ ہر ایک کہیں نہ کہیں جاکر پھنسا ہوا ہے۔ جس کسی کو بھی یہ ڈھیر سلجھانے کے لئے بٹھایا جاتا ہے' وہ اپنی آنکھوں پر اپنے کچھ مخصوص مفادات کی پٹی باندھ کر اسے سلجھانے بیٹھتا ہے۔ ظاہر ہے آپ آنکھوں پر پٹی باندھ کر تو اس ڈھیر کو نہیں سلجھا سکتے نا۔ آپ تو مزید الجھائیں گے۔ بس یہی ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔" اس نے گویا بات ختم کردی۔

گاڑی میں ایک لمحے کے لئے سکوت چھا گیا۔ صرف ائرکنڈیشنر اور انجن کی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ آخر کار ٹونی بولا "آپ کیوں ملک ریاض کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس ویسے ہی مجھے لگا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا تھا جبکہ میری بے خبری کا یہ عالم ہے کہ میں اسے جانتا تک نہیں تھا۔ مجھے اس کی دلچسپی کچھ عجیب لگی۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوسکتا ہے وہ آپ کو اپنی پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دینا چاہتا ہو۔" ٹونی مسکراتے ہوئے بولا "آپ جیسے لوگوں کی تو ہر پارٹی کو ضرورت رہتی ہے نا۔ الیکشن بھی قریب ہیں۔"

"خدا نہ کرے کہ وہ ایسی کوئی دعوت لے کر میرے پاس آئے۔" میں نے صدق دل سے کہا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے ٹونی سے پوچھا "میری غیر موجودگی میں یہاں کوئی خاص مسئلہ تو سامنے نہیں آیا؟"

"نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے جو آپ کے علم میں لائی جائے۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"اس کے بارے میں کوئی خبر..... جسے تلاش کرنے کی ذمے داری میں نے تمہارے سپرد کی تھی؟" میرا اشارہ اے ون کی طرف تھا جس کی تلاش پر میں نے صرف ٹونی کو ہی نہیں بلکہ اپنے دفتر کے ملازم محسن علی اور اس احمق نوجوان وسیم احمد کو بھی لگا دیا تھا لیکن سنجیدگی سے یہ حکم میں نے در حقیقت صرف ٹونی کو ہی دیا تھا۔

ٹونی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور سفر کے دوران بھی اس کی نظر ہر آتی جاتی گاڑی سے الجھ رہی تھی۔ متاسفانہ سے انداز میں گہری سانس لے کر وہ بولا "سر! اس کی تلاش میں پھر پھر کر تو میں نے گاڑی کے ٹائر گھسالئے ہیں' مگر وہ نظر نہیں آیا۔ اگر اس کا ذرا سا بھی کوئی سراغ ہوتا....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہی تو مسئلہ ہے۔ سراغ ہوتا تو شاید مشکل کچھ نہ کچھ آسان ہو جاتی۔ اب تک تو وہ چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر چھلاوے ہی کی طرح غائب ہوتا رہا ہے۔ اب اس بھرے پُرے شہر میں اسے تلاش کرنا انگریزی محاورے کے مطابق گھاس کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے کے ہی مترادف ہے۔ میرا خیال ہے تم خاص طور پر اس کی تلاش میں خاک چھانتے نہ پھرو۔ اپنے دوسرے کام بھی کرتے رہو۔ بس ساتھ ساتھ گردوپیش پر نظر رکھو۔ اگر کبھی نظر آگیا تو ٹھیک ہے ورنہ لعنت بھیجو۔"

"ٹھیک ہے سر! جیسے آپ کا حکم۔" ٹونی بولا۔

نذیر خان نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "اگر یہ کوئی زیادہ پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس کا ذکر خیر ہو رہا ہے؟ شاید کسی کی تلاش میں مَیں بھی کسی کام آسکوں۔"

"نذیر بھائی! آپ نے تو جو کام کر دکھایا ہے وہی بہت ہے..... فی الحال میں آپ کو اور کسی معاملے میں الجھانا نہیں چاہتا۔ اگر حقیقتاً آپ کی کوئی ضرورت پڑی تو ضرور دوبارہ آپ کو تکلیف دوں گا۔" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔

"ارے..... یہ بھی کوئی کام تھا؟" وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ پھر جیسے اسے ہوٹل کے لاکر روم والا وہ منظر یاد آگیا اور وہ جھرجھری سی لے کر بولا "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حفیظ صاحب کا سیکیورٹی چیف ہی انہیں قتل کرنے کی سازش کرے گا۔"

"سازش تو کہیں اور تیار ہوئی ہے نذیر بھائی! اکرام بیگ تو صرف مہرہ تھا۔" میں نے کہا "مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ کوئی اس کو مہرہ بنانے میں کیونکر کامیاب ہوا؟ اس کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ

وہ ایک وفادار اور غیر متزلزل انداز میں اپنے فرائض انجام دینے والا آدمی تھا۔"

"ہر کام کا کوئی نہ کوئی پہلا دن تو ہوتا ہے۔ اس کا بھی یہ بگاڑ بننے کا آغاز ہو گا۔"

"شکر ہے وہ آغاز میں ہی پکڑا گیا۔" میں نے کہا "اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی اور حفیظ صاحب کی موت کا سبب دل کا دورہ ہی سمجھا جاتا تو اکرام بیگ کی طرف یا سازش کے امکان کی طرف تو کسی کا بھی دھیان نہ جاتا اور وہ مزید آگے بڑھ کر نہ جانے کہاں کیا مزید کام دکھاتا۔"

"اب اکرام بیگ کا بنے گا کیا؟" نذیر خان نے جاننا چاہا۔

"میں نے حفیظ صاحب کو جو بندوبست کرتے دیکھا تھا اس کے مطابق تو خفیہ ایجنسیاں اسے تفتیش کے لئے لاہور لائیں گی۔ شاید آج ہی کسی فلائٹ سے اسے لاہور پہنچا دیا جائے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہمیں بھی تفتیش میں گھسنا پڑے گا؟" نذیر خان نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے اس کا بندوبست کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا ہم دونوں ہی اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ میں نے حفیظ صاحب سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہم نے جتنا کر دیا اتنا ہی کافی ہے۔ ہمیں احمقانہ قسم کے سوالوں جوابوں میں نہ گھسیٹا جائے۔ آپ کو یاد نہیں... رات میں نے آپ سے ایک کاغذ پر سائن کروائے تھے جسے آپ نے پڑھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی کیونکہ آپ کا نیند سے بُرا حال تھا؟"

"ہاں۔" نذیر خان نے سرہلایا "آپ نے بھی اس پر دستخط کئے تھے۔"

"جی ہاں۔ وہ ہمارا ایک سیدھا سادا سا تحریری بیان تھا۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا یا جس حد تک بتانا میں بہتر سمجھتا تھا وہ میں نے لکھ کر ان کے حوالے کر دیا تھا اور حفیظ صاحب سے کہہ دیا تھا کہ فائلوں میں جہاں جہاں بھی ضروری سمجھا جائے' بس اس کو آگے بڑھایا جائے' مجھے یا نذیر خان کو کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ حفیظ صاحب اب اپنی بات تو نہیں ٹال سکتے نا... انہوں نے اسی وقت اس تحریری بیان پر اپنا نوٹ لکھ دیا تھا۔"

"شکر ہے خدایا!" نذیر خان نے اطمینان کی سانس لی۔ "یہ آپ نے بڑا اچھا کام کیا۔"

میں نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ مجھے گھر اتار کر وہ نذیر خان کو چھوڑنے چلا جائے۔ ٹونی کی گاڑی بھی میرے ہاں کھڑی تھی۔ وہ بھی وہیں اتر گیا۔ نذیر خان رخصت ہو چکا تو ٹونی میرے ساتھ ڈرائیو وے میں آتے ہوئے بولا "سر! میں اس شخص کی موجودگی میں آپ کو بتاتے بتاتے رک گیا... آپ کی غیر موجودگی میں ایک خاص واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ گزشتہ رات مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی... بلکہ یوں سمجھیں کہ میں تقریباً اغوا ہو ہی گیا تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہو بھئی؟" میں نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔ میں اندر جاتے جاتے لان کی طرف مڑ گیا۔ میں نے اسے ایک لان چیئر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے مخصوص کھلنڈرانہ انداز میں' ڈھیلی ڈھالی امریکی جیکٹ پہنے' دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں ٹھونسے بے پروائی سے چلا آ رہا تھا۔ بھورے بال حسب معمول پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ کم از کم چہرے پر تو کوئی خراش وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"کیا ہوا تھا...؟ مجھے ٹھیک سے بتاؤ۔" وہ بیٹھ چکا تو میں نے تشویش سے پوچھا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے سر!" وہ بے پروائی سے بولا' تھوڑی سی پریشانی اس بات کی ضرور ہے کہ میں ان میں سے کسی کو قابو میں نہیں کر سکا کہ کچھ معلومات ہو جاتیں۔ اس چکر میں میرا پتہ صاف ہو جاتا' اس لئے میں نے معاملے کو زیادہ طول نہیں کھینچنے دیا۔"

"یعنی تم نے ان کا پتہ صاف کر دیا؟" میں نے اب پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"جی سر! وہ مجھے لبرٹی سے اغوا کر کے ظفر علی روڈ پر لے جا چکے تھے... نہر والی ٹریک پر..." ٹونی بالکل دھیمے اور سرسری سے لہجے میں بتائے جا رہا تھا۔ "پھر وہ درختوں کے عقب میں اندھیرے میں گاڑی روک کر انتظار کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ اور لوگ پہنچنے ہی والے تھے۔ میں نے رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔ لبرٹی سے تو میں خود ہی سعادت مندی سے اغوا ہو کر ان کے ساتھ چل دیا تھا' لیکن جب میں نے انہیں اور لوگوں کا انتظار کرتے دیکھا تو انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں دونوں میرے ہاتھوں مارے گئے۔"

"لاشیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہر میں پھینک دی تھیں۔ کہیں بہت دور جا کر دریافت ہوئی ہوں گی۔" وہ بے پروائی سے بولا گویا وہ تربوز نہر میں پھینکنے کا ذکر کر رہا ہو۔

"اغوا کیسے کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل سیدھے سادے اور پُرامن انداز میں' لبرٹی میں کتابوں کی ایک دکان سے۔" اس نے پودے سے ایک پتہ توڑتے ہوئے جواب دیا۔ پھر ذرا شرمیلے سے لہجے میں بولا "آج کل مجھے تھوڑا سا مطالعے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ رات کو لیٹ کر جب تک کوئی نہ کوئی چیز تھوڑی بہت پڑھ نہ لوں تب تک نیند نہیں آتی۔ میں لبرٹی میں کتابوں کی دکان پر انگریزی رسالے دیکھ رہا تھا کہ وہ دونوں اسپائی فلموں والے انداز میں آ کر میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے ہاتھ جیکٹوں کی جیبوں میں تھے اور وہ ریوالوروں کی نالیں میری پسلیوں میں چبھنے لگی تھیں۔ سرگوشی میں'

نہایت سرسری انداز میں انہوں نے مجھے باہر چل کر گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے سوچا' چلو دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ گاڑی میں بٹھاتے ہی انہوں نے میرا ریوالور اور پستول وغیرہ بھی نکال لیا۔ وہ بھی میں نے سعادت منندی سے نکلوالیا۔ لیکن نہر پر لے جاکر جب وہ اور لوگوں کا انتظار کرنے لگے تو پھر مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ تب بھی میرا ارادہ انہیں مارنے کا نہیں تھا لیکن صورتِ حال کچھ ایسی پلٹی کہ......" اس نے معذرت خواہانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"خیر.... جو ہوا سو ٹھیک ہوا۔" میں نے بے پروائی سے کہا" یہ بتاؤ کہ ان کے بارے میں کچھ اندازہ بھی ہوا؟"

"نہیں سر۔ وہ ہمارے کسی بدخواہ یا دشمن کے آدمی بھی ہو سکتے تھے اور کرائے کے قاتل یا دہشت گرد بھی کسی گینگ سے بھی تعلق ہو سکتا تھا ان کا۔ شکلوں سے ویسے روایتی قسم کے دہشت گرد ہی لگ رہے تھے۔ کسی جرائم پیشہ گروہ کے رکن۔ خاص تراش خراش کی گھنی داڑھیاں تھیں۔ بل دار مونچھیں.... ذرا چڑھی چڑھی سی سرخ سرخ آنکھیں... بھاری جسم... چہرے مہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کمزوروں پر ظلم کرنے اور ان کے سامنے بدمعاشی جھاڑنے کے بہت زیادہ عادی ہیں۔ لیکن انداز بہرحال فلمی یا تھرڈ ریٹ بدمعاشوں سے ذرا اونچا تھا۔"

ٹونی نے خاصی کامیابی سے ان کی شخصیت کا نقشہ کھینچ دیا لیکن میں انہیں کسی خانے میں فٹ نہیں کر سکا۔ اس لئے سردست میں نے اس الجھن کو ذہن سے جھٹک دیا۔

کچھ دیر بعد ٹونی رخصت ہو گیا اور میں اندر آگیا۔ شاور لینے کے بعد میں کچھ دیر کے لئے سو گیا۔ شام کو اٹھا تو میں نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ اب میں ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے دو نمبر ایسے تھے جن پر فون ملازمین ریسیو کرتے تھے اور میری عدم موجودگی میں ایک مخصوص پیڈ پر پیغامات نوٹ کر کے رکھ دیتے تھے۔ لیکن میرا ایک ڈائریکٹ نمبر جو خاص خاص جاننے والوں ہی کے پاس تھا' اس کے ساتھ ریکارڈنگ سسٹم منسلک تھا جو میری غیر موجودگی میں کام آتا تھا۔ یہ انسورنگ مشین Answering Machine کا کام بھی دیتا تھا اور اگر فون کرنے والا کوئی پیغام چھوڑنا چاہتا تو وہ بھی ریکارڈ کر لیتا تھا۔

میں نے اس مشین کے سوئچ آن کئے تو پتا چلا کہ میری غیر موجودگی میں ستارہ اور طاہرہ خانم نے ایک ایک مرتبہ فون کیا تھا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں دو دن کے لئے شہر سے باہر گیا ہوں' کوئی پیغام چھوڑے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

تیسرا فون کسی اور کا تھا۔ اسے جب یہ ریکارڈ شدہ آواز سنائی دی۔ "مسٹر افضل چوہدری دو دن کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ براہِ کرم اپنا نام بتا دیجئے اور اگر کوئی پیغام دینا چاہیں تو ریکارڈ کرا دیجئے...." یہی مفہوم انگریزی میں دُہرایا گیا اور اس کے بعد مشین خاموش ہو گئی۔ چونکہ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع نہیں کیا گیا تھا اس لئے مشین آن تھی اور منتظر تھی کہ کوئی پیغام ریکارڈ کرایا جائے۔

فون کرنے والی نے ہیلو بھی سرگوشی کے انداز میں کہا تھا اور اب تو وہ بالکل ہی خاموش تھی' گویا تذبذب میں ہو کہ پیغام ریکارڈ کرائے یا نہیں۔ اس نے اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا ہی اندازہ ہوا تھا کہ آواز نسوانی تھی لیکن میں اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ پھر اس سرگوشی نما آواز نے صرف اتنا کہا "آئی.... میں...." اس کے بعد یوں لگا جیسے اس عورت کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا گیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے سلسلہ منقطع ہو گیا اس لئے مشین بھی آف ہو گئی تھی۔ میں نے ٹیپ کو بہت آخر تک چلایا مگر اس پر مزید کوئی آواز نہیں تھی۔

میں الجھن میں پڑ گیا۔ ستارہ اور طاہرہ خانم تو اپنا نام بتا کر فون کر چکی تھیں۔ تو پھر یہ بیٹھی بیٹھی سی نسوانی آواز کس کی تھی اور وہ کیوں ایک جملہ بھی مکمل نہیں کر سکی تھی۔ آواز سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ خوفزدہ تھی۔ کیا واقعی اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا گیا تھا یا یہ محض میرا وہم تھا؟

میں ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ معلوم نہیں کیوں میرا ذہن فوراً ہی سامنے کی بات پر نہیں گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی انٹرکان کا نمبر ڈائل کیا اور آپریٹر سے کہا "سوئٹ نمبر تین سو ستر.... پرنسس تہمینہ سے بات کراؤ۔"

"سر....! وہ تو جا چکی ہیں..." آپریٹر نے مخصوص پیشہ ورانہ انداز میں تیزی سے کہا اور غالباً کوئی دوسری کال اٹینڈ کرنے لگا تھا کہ میں نے تیزی سے کہا "لائن مت چھوڑنا گدھے! صحیح طرح بات کا جواب دو۔ کب جا چکی ہیں؟ کہاں جا چکی ہیں؟"

آپریٹر فوراً مؤدب ہو گیا اور ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سر! مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔ بس رات ان کی پرفارمنس کے بعد سے ان کا کوئی پتا نہیں۔ ان کے اسٹاف میں سے بھی کوئی موجود نہیں ہے۔ ان کا سوئٹ خالی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو جنرل منیجر صاحب سے بات کر لیں۔ شاید وہ آپ کو کچھ بتا سکیں۔"

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا۔ "نہیں' رہنے دو۔"

"سر! آپ کا نام؟" آپریٹر نے گویا ڈرتے ڈرتے پوچھا لیکن میں نے جواب دیئے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرا خود جانا ہی ضروری تھا۔ میں باہر آکر گاڑی میں بیٹھا اور آندھی طوفان کی طرح ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے پہلے اِدھر اُدھر معلومات کرنے کے بجائے سیدھا اپنی عرف پرنسس تہمینہ کے سوئٹ کا ہی رخ کیا۔ اب تو مجھے اس میں قطعاً کوئی شک رہا ہی نہیں تھا کہ میں نے اپنی مشین

پر ریکارڈ شدہ جو سرگوشی نما آواز سنی تھی وہ ہنی عرف پرنس تہمینہ کے سوا کسی کی نہیں تھی۔

تیسری منزل کی اس مخصوص راہداری میں آج ویرانی اور سکوت نے میرا استقبال کیا۔ آج وہاں کوئی مسلح گارڈ نہیں تھا کوئی وزیٹنگ کارڈ لینے والا نہیں تھا۔ میں نے سوئٹ کے دروازے کی ناب گھمائی۔ دروازہ بھی مقفل نہیں تھا۔ ورنہ ہوٹلوں میں جو کمرے وغیرہ خالی ہوجاتے ہیں ان کے دروازے مقفل ہوتے ہیں۔

میں نے اندر جھانکا۔ ہر چیز صاف ستھری' اسی طرح قرینے سلیقے سے رکھی ہوئی تھی جس طرح اونچے ہوٹلوں کے ان خالی کمروں میں ہوتی ہے جو مہمانوں کی آمد کے منتظر ہوتے ہیں۔ میں ڈرائنگ روم سے گزر کر بیڈ روم میں جا پہنچا۔ وہاں بھی صاف ستھری' ویرانی گویا میرا مضحکہ اڑا رہی تھی۔ صرف ہنی کے میک اپ کے سامان اور خوشبویات کی بچی کچی مہک کمرے میں رچی ہوئی تھی اور اسے بھی صرف میں ہی پہچان سکتا تھا۔ اس کے سوا کوئی ایسی نشانی نہیں تھی جس سے ظاہر ہوسکتا کہ وہ کبھی اس کمرے میں آئی بھی تھی۔

گو مجھے امید نہیں تھی کہ وہاں میرے لئے کوئی سراغ' کوئی پیغام' کوئی اشارہ موجود ہوگا۔ اس کے باوجود میں نے جاسوسوں کی طرح خوردبینی انداز میں دونوں کمروں کو کھنگالنا شروع کیا۔ میں نے بیڈ کی چادر' کمبل' میٹرس اور تکئے اٹھا کر' جھاڑ جھاڑ کر دیکھے۔ تکیوں کے غلافوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر دیکھا۔ کونے کھدروں میں جھانکا' ڈرائنگ روم کے صوفوں کے کشن کھنگالے۔ باتھ روم کی ہر چیز کا معائنہ کیا۔ ٹشو پیپر کا رول تک کھول کر دیکھا کہ کہیں اس پر میرے لئے کچھ لکھا ہوا تو نہیں۔ حتیٰ کہ میں نے دیواروں کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا کہ شاید کہیں لپ اسٹک' آئی برو پنسل یا عام پنسل سے ایک آدھ لفظ ہی لکھا ہو۔ لائٹوں کے شیڈز تک میں جھانکا۔ مگر کہیں پیغام تو کیا' ایک لکیر تک موجود نہیں تھی۔ اگر اس وقت ہوٹل کا کوئی ملازم مجھے اس مصروفیت میں منہمک دیکھ لیتا تو اس کا نہ جانے کیا ردِعمل ہوتا! میں نے چند لمحے پہلے نظر آنے والی ترتیب و صفائی اور قرینے کا جس طرح بیڑا غرق کیا تھا اس پر یقیناً کمروں کے در و دیوار بھی رو رہے ہوں گے۔

فلموں اور جاسوسی کہانیوں میں عام طور پر اتنی تلاش کے بعد جاسوس کے ہاتھ کوئی نہ کوئی سراغ آہی جاتا ہے لیکن میرے ہاتھ کوئی سراغ نہ آیا۔ مایوس ہوکر میں باہر آگیا۔ برابر کا کمرا پرنس تہمینہ کے اسٹاف کے لئے تھا۔ اس کا دروازہ بھی غیر مقفل تھا۔ اس کا بھی وہی عالم تھا۔ اس کی بھی میں نے تلاشی لی لیکن اب جوش و خروش کچھ کم ہوچکا تھا۔

وہاں سے بھی جب مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو میں نے سوچا کہ جنرل منیجر سے مل ہی لینا چاہئے۔ شاید اس سے کوئی کام کی

بات معلوم ہو سکے۔ اس کا نام مائیکل تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ادھیڑ عمر اور خوش اطوار مقامی کرسچن تھا۔ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ خصوصاً اس وقت سے تو بہت ہی احترام کرنے لگا تھا جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ کراچی میں میرا اپنا ہوٹل مکمل ہو چکا تھا۔ ایک بار تو ہنستے ہوئے کہہ چکا تھا۔ "آپ سے تو فرض کے تحت بھی شناسائی رکھنی چاہئے مسٹر چوہدری تاکہ اگر کبھی یہاں سے نوکری چھوڑنی پڑے تو درخواست لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکوں۔"

اس پر میں نے سنجیدگی سے کہا تھا "آپ کو درخواست لے کر کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر مائیکل! آپ ہوٹل مینجمنٹ میں جس مقام پر ہیں وہاں اس کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اگر خدانخواستہ کبھی آپ کو یہ آفس چھوڑ کر نکلنا ہی پڑا تو میرے آدمی آپ کو لینے کے لئے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔"

یہ سن کر وہ خوشی سے نہال ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کبھی پریشان نہیں دیکھا تھا لیکن آج میں اس کے آفس میں داخل ہوا تو وہ مجھے مخبوط الحواس سا نظر آیا۔ تاہم مجھے دیکھ کر وہ حتی الامکان خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسٹاف کے کچھ آدمی کمرے میں موجود تھے۔

"سر! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" کرسی پیش کرنے کے بعد اس نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا "آپ نے کیوں زحمت کی؟ مجھے کہیں بلا لیا ہوتا۔"

"میں ایسی زحمتیں کرنے کا عادی ہوں۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا "تم ان لوگوں سے بات چیت ختم کر لو۔ میں تنہائی میں بات کروں گا۔"

اس نے جلد ہی ان لوگوں کو فارغ کر دیا۔ موضوعِ گفتگو وہی پرنسس تہمینہ کی پُراسرار گمشدگی تھی۔ اخبارات میں اشتہار دینے اور ہوٹل کی لابی میں نوٹس چسپاں کرنے کی تیاری ہو رہی تھی کہ پرنسس تہمینہ کے شو کی ایڈوانس بکنگ منسوخ کی جا رہی ہے۔ جو لوگ ٹکٹ کی رقم واپس لینا چاہیں وہ ہوٹل سے لے لیں۔ جو لوگ ٹکٹ استعمال کرنا چاہیں وہ متبادل شو میں استعمال کر سکتے ہیں جو آج ہی سے پرنسس کے شو کی جگہ شروع ہو رہا تھا۔ انہوں نے ہنگامی طور پر ایک مقامی ڈانسر نغمہ کے شو کا انتظام کیا تھا اور بہانہ یہ کیا تھا کہ پرنسس تہمینہ ناسازیٔ طبع کی بنا پر اپنے ملک واپس جا رہی ہیں۔

وہ لوگ جا چکے تو مائیکل خلافِ عادت مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوا۔ "سر! آپ کیا پئیں گے؟"

"رسمی چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں مائیکل! میں بھی پرنسس تہمینہ ہی کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔ کہاں غائب ہو گئی ہے وہ؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"مائی گاڈ...!" وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے رہ گیا۔ "سر! آپ بھی...؟"

قیصرِ اعظم جولیس کے دربار میں جب دوسرے سازشیوں کے ساتھ ساتھ اس کے سوتیلے بیٹے بروٹس نے بھی تلوار نکال کر اس کے پہلو میں گھونپ دی تھی اور اس نے جب یہ تاریخی جملہ کہا تھا۔ "بروٹس! یو ٹو...؟" تو اس کے لہجے میں بھی شاید وہ کرب پنہاں نہ رہا ہو جو اس وقت مائیکل کے لہجے میں تھا۔

"گھبراؤ نہیں مائیکل! میں اس کا عاشق یا پروانہ نہیں ہوں۔ میں کسی اور وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے اسے تسلی دی۔

"نہیں سر! یہ بات نہیں ہے۔" وہ گڑبڑا کر بولا "یہ تو مجھے معلوم ہے، آپ جیسا نفیس آدمی ایسی چلتی پھرتی عورتوں کا عاشق یا پروانہ نہیں ہو سکتا۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں آپ نے اپنے ہوٹل کے لئے اس سے کوئی کنٹریکٹ وغیرہ... یا کوئی بات چیت تو نہیں کر لی تھی؟"

"نہیں، ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے ہوٹل میں ابھی ایسی خرافات شروع نہیں ہوئیں۔"

"اوہ...." اسے اپنے ہوٹل کی اس 'تفریحی پیشکش' کے لئے خرافات کا لفظ سن کر تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے غالباً اس احساس کے تحت سکون کی سانس لی کہ پرنسس تہمینہ سے میرا کوئی جذباتی یا کاروباری چکر نہیں تھا تو پھر میں اس کے بارے میں پوچھتا ہوا آیا کیوں تھا؟

وہ ایک سگریٹ سلگانے کے بعد بولا "اس خبیث عورت کے چکر میں تو میں صبح سے پریشان ہوں...." ہی کے لئے "خبیث" کا لقب سن کر اب مجھے ذرا تکلیف پہنچی لیکن میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اصل معاملہ تو مائیکل کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

وہ ایک کش لے کر بولا "میں تو اس وقت کو کوس رہا ہوں جب اس کی آمد کی خبر سن کر میں اس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ میں اس کے بیک گراؤنڈ سے واقف تھا۔ ہوٹل آج کل ٹھنڈا جا رہا تھا۔ سامنے ہی دوسرا فائیو اسٹار ہوٹل بن گیا ہے نا.... میں نے سوچا، پرنسس کے شو سے ہوٹل کو سنبھالا مل جائے گا۔ اچھی بھلی وہ دوسرے ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس ہوٹل والوں نے تو اس کے ساتھ شو کا کوئی پروگرام نہیں بنایا اور میں گدھا دوڑا دوڑا چلا گیا۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے ان سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا؟ تم نے ان لوگوں کو باہر سے نہیں بلوایا تھا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں سر! مجھے تو پتا چلا تھا کہ وہ یورپ اور امریکا کے دورے سے واپس ترکی جاتے وقت پاکستان اور بھارت سے ہوتی ہوئی جائے گی لیکن ان دونوں ملکوں میں ڈانس کا کوئی پروگرام نہیں کرے گی کیونکہ وہ بہت تھکی ہوئی ہے، صرف سیر و تفریح کے لئے ان دونوں ملکوں سے گزر رہی ہے۔ لیکن میں نے سوچا، چلو بات کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ خلافِ توقع وہ بہت ہی آسانی سے

مان گئی اور اس نے کچھ زیادہ لمبے چوڑے مطالبے بھی نہیں کئے۔" مائیکل نے بتایا "جتنا میں ڈر رہا تھا' کام اس سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا۔ میں سوچ رہا تھا' میں نے ہوٹلنگ کے ٹھنڈے پڑتے ہوئے بزنس میں بڑی گرماگرمی پیدا کر دی ہے' بڑا دھماکا کر دیا ہے۔ لیکن یہ بم تو عین میرے سر پر ہی آن پھٹا ہے۔" بالآخر اس نے سر تھام ہی لیا۔

"وہ غائب کب سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! رات تو اس نے پروگرام پیش کیا ہے۔" وہ کراہ کر بولا "اور آج حسبِ معمول دن چڑھے میڈان کے سوئٹ میں گئی تو وہ اس طرح خالی پڑے تھے جیسے وہاں کئی دن سے کوئی داخل نہیں ہوا۔ کسی نے بھی پرنس یا اس کے اسٹاف کے کسی آدمی کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس وقت اور کس طرح غائب ہوئے ہیں۔ اس طرح کسی کی نظر میں آئے بغیر تو وہ دیواریں پھاند کر ہی باہر جا سکتے تھے۔" مائیکل پر ابھی تک بے یقینی طاری تھی۔

"کوئی بعید نہیں کہ انہوں نے ایسا ہی کیا ہو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"نہیں سر!" اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ کوئی کنگلے قسم کے مسافر تو نہیں تھے جو شرارتاً یا پھر دل کی حسرت نکالنے کے لئے کسی اونچے ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں اور موقع مناسب دیکھ کر اِدھر اُدھر سے کود پھاند کر بھاگ جاتے ہیں۔"

سگریٹ کا ایک کش لے کر وہ بولا "بات میری کھوپڑی میں بیٹھ نہیں رہی ہے سر! اس قبیل کے لوگ اس طرح کی حرکتیں نہیں کیا کرتے۔ چپکے سے غائب ہونا تو دور کی بات' وہ تو عام طور پر کنٹریکٹ کی خلاف ورزی بھی نہیں کرتے۔ انتہائی ناگزیر حالات میں کوئی اونچ نیچ ہوتی ہے۔ پرنس تمینہ کا ایک نام ہے۔ ایک ریپوٹیشن ہے۔"

"ویسے تم نے اتنی جلدی کیوں فرض کر لیا ہے کہ وہ غائب ہو گئی ہے اور واپس نہیں آئے گی؟" میں نے کہا "عین ممکن ہے' جس طرح اچانک وہ غائب ہوئی ہے اسی طرح اچانک عین شو کے وقت یا اس سے ذرا پہلے کہیں سے نمودار ہو جائے' واپس آجائے۔" میں دراصل مائیکل کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے لئے امید کی یہ کرن تخلیق کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہوگا سر!" وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔

"آخر کیوں؟" میں نے اسے کریدا۔

"اس لئے کہ جب میں نہایت غصے کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ مجھے پرنس کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہئے' اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے' مجھے دھوکا دیا ہے' مجھے پولیس میں رپٹ بھی درج کرانی چاہئے' عین اسی وقت ایک ٹیلیفون آیا اور میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔"

"کیا کسی بہت بڑے آدمی کا فون تھا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بڑا ہی سمجھ لیجئے سر!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ہماری سوسائٹی میں جو بھی لوگوں کو مروانے' کچلنے' ان کا حشر نشر کرنے کی طاقت رکھتا ہے وہ بڑا آدمی ہے۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہیں دور بیٹھا میرے خیالات پڑھ رہا تھا۔ اس نے کوئی فالتو بات نہیں کی۔ بس میرا نام جانتے ہی بولا' پرنس تمینہ کی گمشدگی کو اسکینڈل بنانے کی کوشش مت کرنا۔ بھول جاؤ کہ وہ کبھی تمہیں ملی تھی یا تمہارے ہوٹل میں اس نے کوئی پروگرام پیش کیا تھا۔ اس نے تم سے کوئی ایڈوانس نہیں لیا تھا۔ تمہارا کوئی مالی نقصان نہیں ہوا۔ اس لئے شور مچانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ایک معمولی واقعہ ہے اور اسے معمولی واقعے ہی کی طرح لینا۔ کوئی بھی مہذبانہ بہانہ کر کے کوئی متبادل انتظام کر لینا۔ زیادہ چونچ کھولنے کی ضرورت نہیں۔ جی ہاں چوہدری صاحب! بالکل یہی الفاظ تھے اس کے۔"

"تم نے کیا کہا؟"

"یہ باتیں میں نے کسی کو بھی نہیں بتائی ہیں۔ یہ صرف میرے اور آپ کے درمیان رہنی چاہئیں سر!" وہ لجاجت سے بولا' "یہ کوئی پُراسرار اور خطرناک معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ میری کسی دانستہ یا نادانستہ غلطی سے میری جان خطرے میں پڑ سکتی ہے" وہ بے چارہ دُبلا پتلا' مہذب اور شائستہ آدمی تھا۔ کافی خوف زدہ نظر آرہا تھا۔

"اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں مائیکل! ہوٹل کے بزنس میں ہر طرح کے آدمی سے واسطہ پڑتا ہے۔ فون پر دھمکیاں بھی ملتی رہتی ہیں۔ اتنی لمبی سروس کے بعد تمہیں تو اس طرح کی باتوں کا عادی ہو جانا چاہئے" میں نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"وہ جو کھوکھلی دھمکیاں ہوتی ہیں' ان کا مجھے اندازہ ہو جاتا ہے سر! اس شخص کا تو لہجہ ہی رگوں میں خون ٹھنڈا کر دینے والا تھا" وہ جھرجھری سی لے کر بولا "ابھی میں نے آپ کو پوری بات تو بتائی ہی نہیں۔ میں نے اپنے تمام تر خوف کے باوجود ہمت کر کے کہا کہ میں اس طرح گمنام لوگوں کی ہدایات کی پابندی نہیں کیا کرتا۔ اس پر وہ کسی بدروح کی طرح ہنسا۔ سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی اس کی ہنسی۔ وہ جیسے صرف فون پر مجھ سے بات ہی نہیں کر رہا تھا' مجھے دیکھ بھی رہا تھا۔ کہنے لگا' تم نے ابھی پانی پی کر میز پر جو گلاس رکھا ہے' ذرا اس کی طرف دیکھو۔ میں نے گلاس کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ میرے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا تھا۔"

"سائیلنسر لگی رائفل یا ریوالور کی گولی ہوگی؟" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"ریوالور استعمال کیا گیا تھا سر! اُس کھڑکی سے گولی چلائی گئی

تھی .... "اس نے دائیں طرف اشارہ کیا "اور گولی میز کی سطح کو چھوئے بغیر ادھر دیوار پر لکڑی کے پینل میں پیوست ہو گئی تھی ...." اس نے بائیں طرف اشارہ کیا "وہاں میں نے اسٹکر چسپاں کر دیا ہے۔ آپ چاہیں تو اسٹکر ہٹا کر لکڑی میں دھنسی ہوئی گولی کا معائنہ کر سکتے ہیں۔"

"اس کی اب نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ کوئی فائدہ" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اسے نشانی کے طور پر وہیں دھنسی رہنے دو۔ اس قسم کی شعبدہ بازیاں کچھ مشکل نہیں ہوتیں۔ ایک شخص کھڑکی پر موجود ہو گا۔ دوسرا تم سے فون پر بات کر رہا ہو گا اور ان دونوں کا آپس میں بھی رابطہ ہو گا کیوں کہ اس کھڑکی کے سامنے کوئی کمرا نہیں ہے جہاں سے کوئی بیک وقت تم سے فون پر بات بھی کر سکے اور تم پر نظر رکھتے ہوئے فائر بھی کر سکے۔"

"جی ہاں سر! وہ تو میں بھی سمجھ گیا تھا.... میرا مطلب ہے جب میرے ہوش ٹھکانے آئے تھے اور میں نے اٹھ کر کھڑکی وغیرہ کا جائزہ لیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ریسیور دوبارہ کان سے لگایا تو وہ شخص بولا "یہ گولی گلاس کے بجائے تمہاری کھوپڑی میں بھی اتر سکتی تھی۔ ذرا سا رخ بدلنے ہی کی بات تھی۔ لیکن ہم کیڑے کوڑوں کا شکار کرنے کے قائل نہیں۔ جب تک وہ ہمارے پیروں تلے کلبلانے نہ لگیں" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اور اس کے بعد سے میں نے اس کی ہدایات پر دل و جان سے عمل کیا ہے کیوں کہ میں ایک شریف آدمی ہوں اور ابھی مرنا بھی نہیں چاہتا۔"

اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے بولا "میری تو اس تصور سے روح فنا ہو رہی ہے کہ آج رات جب شو پرنسس تہمینہ کے بجائے نغمہ سلطانہ پیش کرے گی اور کل اخباروں میں اشتہارات آئیں گے کہ پرنسس کا اب کوئی شو ہو گا ہی نہیں۔ تو کیسا طوفان مچے گا۔ بڑی ہیوی ایڈوانس بکنگ تھی پرنسس کے شو کی۔ لوگ اگر صرف اپنے پیسے واپس لے کر مطمئن ہو گئے تو ان کی بڑی مہربانی ہو گی۔ انہیں جو کوفت ہو گی کہیں اس کا غصہ نہ وہ ہم پر نکالنے لگیں۔"

"نہیں۔ تمہارا واسطہ کرسیاں توڑنے والے طبقے سے نہیں ہے" میں نے اسے تسلی دی۔

وہ دوسری سگریٹ نکالتے ہوئے بولا "میں نے نغمہ سلطانہ کی منت سماجت کی ہے کہ وہ خوب محنت کرے اور پرنسس تہمینہ کی متبادل ثابت ہونے کی پوری پوری کوشش کرے لیکن نغمہ سلطانہ کے ہاں صرف جسم کی نمائش ہے۔ اس کے پاس وہ خوب صورتی' وہ آرٹ اور وہ "ٹچ آف کلاس" نہیں ہے۔ بہرحال بے چاری محنت بہت کر رہی ہے۔ دوپہر سے اپنے ڈانس کے استاد کے پاس ریہرسل میں لگی ہوئی ہے۔"

"قصہ مختصر یہ کہ تم نے پرنسس تہمینہ کو کھو دیا اور تم سے اس کا سراغ ملنے کی کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یس سر! مجھے اپنی اس نالائقی کا اعتراف ہے" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا "لیکن اب تو آپ بتا دیجئے کہ آپ کا منشا کیا ہے؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ غائب ہو چکی ہے؟"

"میں نے فون کیا تھا اسے۔ آپریٹر نے بتایا کہ اب تو اس سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ جا چکی ہے۔ میں دیکھنے آیا تھا کہ کیا چکر ہے۔ رہی یہ بات.... کہ میرا مسئلہ کیا ہے؟ تو صحیح طرح مجھے بھی نہیں معلوم" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے الجھن میں چھوڑ کر میں اس کے آفس سے نکل آیا۔

یکدم ہی مجھ پر احساسِ زیاں نے غلبہ پالیا تھا۔ میں ایک بار پھر وہیں کھڑا تھا جہاں عرصہ پہلے تھا۔ ہنی عرف پرنسس تہمینہ کے سہارے مجھے ریڈ ڈاٹ کے سلسلے میں کچھ آگے بڑھنے کی امید ہوئی تھی لیکن میں نے اپنی حماقت سے اسے کھو دیا تھا۔ میں اس کی طرف سے کچھ زیادہ ہی بے پروا ہو گیا تھا۔ خواہ مخواہ فرض کر لیا تھا کہ وہ کہیں نہیں جائے گی' ریڈ ڈاٹ والے اس مہرے کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹائیں گے۔ لیکن یہ سمجھنا میری غلطی تھی۔ مجھے کم از کم اس کی نگرانی کے لئے کسی کو ضرور تعینات رکھنا چاہئے تھا۔ اس کی نگرانی کرنے والے میرے دو آدمی اغوا ہوئے تھے تاہم انہیں چھڑا لیا گیا تھا لیکن اس کے بعد میں نے اس سلسلے کو بے فائدہ سمجھ کر ترک کر دیا تھا۔ لیکن اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ مجھے اس سے بہتر کوئی بندوبست کرنا چاہئے تھا۔

اب اپنی اس کوتاہی پر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ حالات اور شواہد سے میں جو اندازے لگا سکتا تھا وہ کچھ یہی تھے کہ کراچی میں منسٹر صاحب کے قتل کی سازش ناکام ہوتے ہی غالباً ریڈ ڈاٹ والوں کا شبہ ہنی پر ہی گیا تھا کہ اس سلسلے میں معلومات اسی کے ذریعے لیک ہوئی ہیں اور انہوں نے لاہور میں فوراً اسے اس کی جگہ سے ہٹا لیا تھا۔ میرے لئے اب یہ کوئی حیرت کی بات نہیں رہی تھی کہ ان لوگوں کا جال کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا تھا' ان کے رابطے کتنے تیز اور مؤثر تھے اور وہ لوگ چشم زدن میں کیسے کیسے انتظامات کر سکتے تھے۔ اب مجھے زیادہ تشویش اس بات کی تھی کہ اگر انہیں شبہ ہو گیا تھا کہ ہنی کی برین واشنگ مکمل طور پر کامیاب نہیں رہی تھی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا' نیز یہ کہ منسٹر صاحب کے بارے میں ان کی سازش کی بھنک کسی طرح ہنی کو پڑ گئی تھی اور اس نے مجھے خبردار کیا تھا۔ تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔

وہ ہنی پر ہولناک تشدد بھی کر سکتے تھے۔ اس معاملے میں وہ پولیس سے بھی آگے تھے۔ انسان پر عقوبت خانوں میں تشدد کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ قدیم بادشاہوں اور سرکاری اہل کاروں کے زمانے سے لے کر آج کے تفتیشی سیلوں وغیرہ کے نام پر قائم کئے گئے تاریک کیمپوں اور مافیا کے یہ خانوں والے زمانے تک بعض

لوگوں نے تو شاید "ریسرچ" ہی اس موضوع پر کی ہے کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچانے کے کون کون سے نئے اور ناقابلِ بیان طریقے ایجاد کئے جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف اسی دنیا میں وہ انسان بھی موجود ہیں جو راستے میں، کوئی زخمی یا بیمار بلی پڑی دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں' اسے اٹھا کر گھر لے آتے ہیں' اپنے ہاتھوں سے اس کا جسم صاف کرتے ہیں' اسے دوا لگاتے ہیں' اس کی تیمارداری کرتے ہیں۔ یہ دنیا اور انسانی زندگی شاید انہی تضادات سے عبارت رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

تشدد کے حوالے سے میں ریڈ ذات والوں کی بھیجی ہوئی ایک ایسی کیسٹ دیکھ چکا تھا جس نے مجھ جیسے آہنی اعصاب کے مالک کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال ستائے جا رہا تھا کہ اگر ہنی کو میری دوستی کی اتنی بھاری قیمت چکانا پڑی تو یہ بات زندگی بھر کے لئے میرے ضمیر پر ایک بوجھ بن جائے گی۔ میری عدم موجودگی میں اس نے مجھے فون کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ اسے خطرے کا احساس ہو چکا تھا ورنہ شاید وہ اس کی جرأت نہ کرتی۔ اس کا ٹیلی فون ٹیپ ہوتا تھا۔ اس کی ہر لمحے کی گفتگو اس کے لاکٹ میں پڑے ہوئے ٹرانسمیٹر کے ذریعے کہیں سنی جاتی تھی۔ صرف اسی پر بس نہیں تھی' دن رات کے بیشتر حصے میں کمال نے سن اور مشو سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے تھے۔

میں قدرے افسردہ اور دل گرفتہ سا گھر واپس آگیا۔ میرا کہیں جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب میں بستر پر نیم دراز تھا' میرے ڈائرکٹ نمبر والے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا لیکن دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سن کر میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ ایڈم عرف ایڈی تھا۔

"بہت پریشان ہو ہنی کے لئے؟" وہ اپنے مخصوص تیکھے سے لہجے میں بولا۔

میں سمجھ گیا کہ اسے میرے ائرکان جانے اور ہنی کے سوئٹ کی تلاشی لینے کی اطلاع مل چکی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کون سی خفیہ آنکھ تھی جو میری نگرانی کرتی تھی اور میری پل پل کی نقل و حرکت کی خبر ان لوگوں کو پہنچاتی تھی۔ عموماً میں اس بات کا بہت خیال رکھتا تھا کہ میرا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ اکثر مجھے اس کا جواب نفی میں ہی ملتا تھا۔ اس کے باوجود ایڈم عرف ایڈی جب بھی مجھے فون کرتا تھا' وہ میری تازہ ترین سرگرمی سے باخبر ہوتا تھا۔

"ہاں۔ پہلے تو صرف ہنی کے لئے ہی پریشان تھا' اب پرنس تہمینہ کے لئے بھی پریشان ہوں" میں نے کہا "اسے بھی تم لوگوں نے غائب کر دیا۔ کیا تمہیں اس بھری پُری دنیا میں اور لڑکیاں نظر نہیں آتیں؟ جس لڑکی سے مجھ غریب کی دوستی ہوتی ہے اسے ہی غائب کرتے ہو" میں اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس حقیقت سے لاعلم ہوں کہ ہنی اور پرنس تہمینہ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ لیکن میری یہ کوشش قطعی ناکام رہی۔

وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر بولا "ایک ہی لڑکی کے لئے دو دو مرتبہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان کو اتنا فضول خرچ بھی نہیں ہونا چاہئے۔ تھوڑی بہت پریشانی دوسرے موقعوں کے لئے بھی بچا کر رکھنی چاہئے۔ تم جیسے سرکش انسان کو تو ابھی نہ جانے کس کس موقع پر پریشان ہونے کی ضرورت پیش آسکتی ہے"

میں نے گویا اس کی باتی بکواس پر توجہ دئے بغیر کہا "یہ تم ایک ہی لڑکی والی کیا بات کر رہے ہو؟ میں سمجھ نہیں سکا۔"

"افضل چوہدری! اب تم ذہنی' جسمانی اور سماجی طور پر کافی بڑے ہو چکے ہو" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "یہ ننھے بچوں والی اداکاری اور صداکاری کرتے ہوئے تم اچھے نہیں لگتے۔ اس حقیقت سے انجان بننے کا اب کوئی فائدہ نہیں کہ ہنی اور پرنس تہمینہ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہو۔"

"یہ تو میں اب تمہاری زبانی ہی سن رہا ہوں اور بلاشبہ سخت حیرت زدہ ہوں۔" میں نے حیرت کی اداکاری یا صداکاری جاری رکھی۔

وہ اب میرے الفاظ پر توجہ دئے بغیر بولا "ہنی پر ہماری محنت ضائع گئی۔ اس کی برین واشنگ میں خامی رہ گئی۔ اس نے اپنی اصلیت کو یاد رکھا۔ نہ صرف یاد رکھا بلکہ تمہیں بھی یہ بات بتادی اور تم سے مل بھی گئی۔ در حقیقت وہ ذہنی اور اعصابی طور پر بہت ہی مضبوط لڑکی ہے۔ وہ ہماری جدید ترین ٹیکنیک اور جادو اثر دواؤں کو بھی شکست دے گئی۔ اس نے اپنے ذہن کا کوئی کونا ان کے اثرات سے بچالیا اور بعد میں اسی کے سہارے اس کی یادداشت لوٹ آئی۔ بالکل اسی طرح جیسے کنویں میں ڈوبتا ہوا انسان صرف ایک رسّی کے سہارے باہر آجاتا ہے۔ انسانی ذہن بھی ایک عجیب طلسم خانہ ہے....."

"تم مجھے انسانی ذہن کی پُراسرار پیچیدگیوں کے بارے میں بتانے کے بجائے یہ بتاؤ کیا' واقعی یہ ہنی اور پرنس تہمینہ والی بات درست ہے؟ یقین کرو مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی اور نہ ہی اس نے مجھے بتائی تھی..... بلکہ اس نے تو پرنس تہمینہ کے طور پر ہی مجھے بالکل اسی طرح گھیرنے کی کوشش بھی کی تھی جس طرح اس قبیل کی عورتیں موٹی اسامیوں کو گھیرتی ہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو افضل چوہدری؟" ایڈم بدمزگی سے بولا۔ "اب جب کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تو تم کیوں ضدی بچوں کی طرح ایک بات کی تکرار کئے جا رہے ہو۔"

"کس نے بتایا تمہیں سب کچھ؟" میں نے پوچھا۔

"خود ہنی نے" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ایک لمحے کے لئے میری سٹی گم ہو گئی۔

"چپ کیوں ہو گئے؟" اس نے استہزائیہ انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا "شاید تمہیں ہنی سے یہ امید نہیں تھی۔"

میرے خیال میں اب انجان بنے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ بولا "دل چھوٹا مت کرو۔ ویسے ہی تمہاری ہمت وقادار ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک ہمیں اور ہمارے طور طریقوں کو بھی جان گئی ہے۔ اگر وہ زبان بند رکھتی تو یقیناً ہمیں زبان کھلوانے کی کچھ ترکیبیں اس پر آزمانا پڑتیں۔ یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی۔ وہ ذہنی اور اعصابی طور پر بے پناہ مضبوط سہی لیکن جسمانی تشدد سہنے کا اب اس میں بالکل حوصلہ نہیں ہے۔ زندگی میں ایک بار وہ ایک خفیہ سرکاری ایجنسی کی "تفتیش" سہہ چکی ہے۔ اس کے جسم کی خوب صورتیاں بڑی مشکل سے واپس آئی ہیں۔ روح کے گھاؤ تو اب تک نہیں بھرے۔ اس لئے اس نے جب دیکھا کہ اس کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے تو اس نے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہیں کی۔"

وہ گویا اب میری خاموشی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس نے فوراً اعتراف کر لیا کہ وہ اپنی اصل شخصیت کو بھولی نہیں۔ اور یہ کہ تم بھی حیرت انگیز قوتِ مشاہدہ کا ثبوت دیتے ہوئے اسے پہچان چکے ہو۔ اس کی رپورٹ ہمیں کمال نے بن سے بھی مل چکی تھی لیکن اس کے سامنے تو وہ تمہاری اس بات کی تردید ہی کرتی رہی تھی۔ بعد میں وہ تم سے کسی طرح رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے سب کچھ ہمیں بتا دیا ہے۔ ہمیں اس کی یہ بات اچھی لگی۔ اس نے خود کو اور ہمیں زیادہ دردِ سر میں مبتلا نہیں کیا۔ جوں ہی اس نے محسوس کیا کہ بازی الٹ چکی ہے تو اس نے مزید مصیبت کو دعوت نہیں دی اور جو کچھ ہم نے پوچھا وہ بتا دیا۔ اگر وہ نہ بتاتی تب بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہمیں بہت سے طریقے آتے ہیں معلوم کرنے کے۔"

میں تصور کر سکتا تھا کہ ان لوگوں کی گرفت میں ہنی کے خوف اور دہشت کا کیا عالم ہو گا۔ مجھے اس پر غصہ نہیں تھا اور نہ ہی اس سے کوئی شکوہ تھا کہ اس نے زبان کھول دی تھی۔ اس نے اچھا ہی کیا تھا کہ ستم گروں کی ستم کوشی کے لئے اپنے آپ کو مزید تختۂ مشق نہیں بنایا تھا۔ وہ زندگی میں جو کچھ سہہ چکی تھی وہی بہت تھا۔ وہ زندگی کا قرض اتار چکی تھی۔ یہی بہت تھا کہ وہ اپنے وجود کی تمام تر دلکشی اور خوب صورتی کے ساتھ اب بھی زندہ تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں چین سے جینا اس کے مقدر میں نہیں لکھا تھا۔

"تمہیں اس پر شک کیسے ہوا؟" آخرکار میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا اور انجان بننے کی کوشش ترک کر دی۔

"حفیظ صاحب والا معاملہ جب عین وقت پر ناکام ہونے کی ہمیں رپورٹ ملی تو مجھ سے اوپر والا دماغ بھی چکرا گیا۔۔۔۔" وہ بولا۔

"تم سے اوپر والا دماغ۔۔۔۔؟" میں نے دُہرایا۔ یہ اصطلاح میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"میرا مطلب ہے 'میرا باس'" اس نے وضاحت کی۔ "ہمارے ہاں بعض لوگوں کی اہمیت صرف ان کے دماغ کے حوالے سے ہے۔ اس لئے کبھی کبھی ان کا تذکرہ صرف دماغ ہی کے نام سے کر جاتے ہیں۔ خیر۔۔۔۔ تو میں بتا رہا تھا کہ باس چکرا گیا۔ ہمارا نظام لیک پروف ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے باہر گئی ہے۔ پھر یکدم ہمارا ذہن ہنی پر گیا۔ ہمارے نظام میں اس سے کمزور پوائنٹ فی الحال اور کوئی نہیں تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہنی تو اس منصوبے میں شریک ہی نہیں تھی۔ وہ مخبری کیسے کر سکتی تھی؟"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "بہرحال ہم نے اسے فوراً اس کی جگہ سے ہٹا لیا اور جب پوچھ گچھ ہوئی تو سب پتا چل گیا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ذہنی طور پر وہ مکمل پرنسس تہمینہ نہیں بن سکی تھی اور یہ بھی پتا چل گیا کہ ہمارے دو ٹرانسیٹروں پر ہونے والی گفتگو کا کچھ حصہ فریکوئنسی کی غلطی کی وجہ سے اتفاقاً اس نے سُن لیا تھا اور نہایت مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً تمہیں مطلع کر دیا۔ تم حسبِ عادت رہ نہیں سکے۔ فوراً کود پڑے اس معاملے میں۔"

"تمہارے خیال میں مجھے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہئے تھا؟" میں نے ملامت سے پوچھا۔

"اس طرف تو خیر ہمارا ذہن ہی نہیں گیا تھا کہ تمہیں اس معاملے کی بھنک بھی پڑ سکتی ہے لیکن قسمت اکثر تمہارا ساتھ دیتی ہے۔ بلکہ اس معاملے میں تو شاید تمہاری ہی خوش قسمتی کا سایہ حفیظ صاحب پر بھی پڑ گیا جو وہ بچ گئے۔ بہرحال۔۔۔۔ اگر ہم یہ فرض بھی کرتے کہ تم اس چکر سے آگاہ ہو جاؤ گے تب بھی ہم تم سے اس مستعدی اور حاضر دماغی کی توقع نہ رکھتے۔ ہمارا خیال تھا کہ تم زیادہ تر معاملات میں مار دھاڑ کرتے ہوئے کودنے کے عادی ہو اور ذہین ہونے کے باوجود زیادہ جوڑ توڑ نہیں کرتے۔ ایسا کوئی قدم شاذونادر ہی اٹھاتے ہو جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ تم ذہنی ورزش بھی کرتے ہو۔ لیکن حفیظ صاحب والے معاملے میں تو تم نے کمال کر دیا۔ راتوں رات نہ صرف ان سے دوستی گانٹھ لی بلکہ اپنے جاسوسوں والے انداز میں بھیس بدل کر ویٹر کے روپ میں موقع پر بھی موجود رہے۔"

"تو تمہیں سب رپورٹ مل چکی ہے؟" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"مہم ناکام ہوتے ہی ہمیں یہاں لاہور میں مکمل رپورٹ مل گئی تھی۔ تمام تر جزئیات کے ساتھ" وہ طمانیت سے بولا "بلکہ ہمیں تقریباً ہر لمحے کی خبر مل رہی تھی۔ لیکن ہمارا خیال تھا کہ تم ہمارے طریقۂ واردات کو سمجھ نہیں سکو گے کیوں کہ حفیظ صاحب کو سگار کے ذریعے ہلاک کرنے کا فیصلہ ہم نے آخری لمحوں میں کیا تھا۔ اور یجنل پلان کچھ اور تھا جو تمہارے ٹانگ اڑانے کی وجہ سے ہم نے بدل دیا تھا۔ ہمیں اپنی مہم ناکام ہونے پر غم و غصہ تو بہت تھا لیکن ہم قدر شناس لوگ ہیں 'تمہاری ذہانت اور مستعدی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔"

"ذرہ نوازی ہے تمہاری۔ ویسے بندہ اس سے بھی زیادہ قابل ہے۔ امید ہے تم سے داد و تحسین وصول کرنے کے مواقع مجھے آئندہ بھی میسر آتے رہیں گے۔ غالباً مجھے تمہارا شکریہ بھی ادا کرنا چاہئے کہ تم نے اس بار بھی میری گستاخی پر مجھے بخش دیا" میں نے مصنوعی ممنونیت سے کہا۔

"بخشنا پڑتا ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "آخر دوست ہو ہمارے۔"

"یہ اچھی یک طرفہ دوستی ہے جس کا مجھے علم ہی نہیں۔ آخر میرے دل میں جواباً دوستی کے جذبات کیوں پیدا نہیں ہو رہے؟" میں نے بڑی حسرت سے کہا۔

"ہو جائیں گے۔ ہو جائیں گے" وہ نہایت مربیانہ لہجے میں بولا "اب وقت آ رہا ہے۔ اب ہماری تمہاری ملاقات ضروری ہو گئی ہے۔ امید ہے اس کے بعد تمہارے خیالات تبدیل ہو جائیں گے۔"

"کیا تمہارے ہاں اس قسم کا بھی کوئی آپریشن ہوتا ہے جس کے ذریعے دوسری طرح کے خیالات انسان کے دل میں یا کھوپڑی میں انڈیل دیئے جاتے ہیں؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"ارے ... ہمارے ہاں کیا کچھ ہوتا ہے اس کا تمہیں کہاں اندازہ ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "جب اندازہ ہو گا تو ہمارے ساتھ شامل ہونے کی تمنا کرو گے۔ ہم جلد ہی تمہارے ساتھ میٹنگ کو بھی اپنے کسی ایجنڈے میں رکھیں گے۔"

"میں بے تابی سے انتظار کروں گا" میں نے بڑے خلوص سے کہا "ہنی کے ساتھ تم نے کیا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں" وہ بے پروائی سے بولا "میں نے بتایا نا کہ اس نے نہایت عقل مندی کا مظاہرہ کیا کہ آسانی سے زبان کھول دی۔ اپنے لئے مصائب کو دعوت نہیں دی۔ اب ہمیں اس پر سختی کرنے کا شوق تھوڑا ہی تھا۔ ہمارا کوئی کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں کوئی اپنے بیمار ذہن کو تسکین دینے کے لئے یا محض اپنی نفرت کی آگ بجھانے کے لئے کسی پر تشدد نہیں کرتا۔ جب بھی ایسا کیا جاتا ہے' کسی ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے۔"

"شرفاء کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں۔ میں تو تم لوگوں کی شرافت کا قائل ہوتا جا رہا ہوں" میں نے خلوص سے کہا۔

"جلد ہی تم یہ استہزائیہ لہجہ ترک کر دو گے مائی ڈیئر افضل چوہدری!" وہ ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اور اس طرح کی باتیں سنجیدگی سے کرنے لگو گے۔"

"کیا تم نے واقعی ہنی کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا؟ اس کی 'غداری' پر اسے کوئی سزا نہیں دی؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ سزا کی مستحق تو تھی لیکن اب اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ ناکامی تو ہمارے سامنے آ ہی چکی تھی۔ فی الحال وہ کامیابی میں نہیں بدل سکتی تھی۔ میرے اوپر والے دماغ نے حکم دیا کہ فی الحال سب کچھ ڈراپ کر دیا جائے۔"

"ہنی ہے کہاں؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس سوال کا جواب ملے گا۔

"سردست ہم نے اسے غائب کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا اس کا کیا کریں" وہ بالکل اس طرح بات کر رہا تھا جیسے ہنی انسان نہیں' کوئی ایسی چیز تھی جو بازار سے سودے سلف کے ساتھ فاضل آ گئی تھی اور اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کیا جائے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس پر ہماری ایک ٹیم کی خاصی محنت ہوئی ہے۔ ہم اسے ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ وہ کام تو آ سکتی ہے لیکن شاید اس ملک میں نہیں۔ عین ممکن ہے ہم اسے کسی اور ایشیائی ملک میں بھیج دیں۔"

"مجھے صرف ہنی کی خیریت عزیز ہے اور فی الحال میرے لئے تمہاری بات پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"چندا ...!" وہ بڑے پیار سے بولا۔ وہ یقیناً غیر ملکی تھا مگر ہمارے روایتی الفاظ بھی ایسے شیریں اور منجھے ہوئے لہجے میں بولتا تھا کہ اہلِ زبان بھی شرما سکتے تھے "ہمیں جب کوئی بات بتانی نہیں ہوتی تو ہم سرے سے بتاتے ہی نہیں لیکن جو بتاتے ہیں بالکل ٹھیک بتاتے ہیں۔ اپنے رومانویت پسند دل کو تسلی دیئے رکھو۔ ہنی بالکل خیریت سے ہے۔ ہو سکا تو میں آج رات فون پر اس سے تمہاری بات کرا دوں گا۔"

"بڑی ہی نوازش ہو گی تمہاری" میں نے کہا "ویسے تم نے اتنی عجلت میں اسے پیش منظر سے ہٹانے کا فیصلہ کیوں کر لیا تھا؟"

"فی الحال ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری حکومت ہماری طرف متوجہ ہو جائے۔ حالانکہ اس سے ہمارے لئے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ پھر بھی غیر ضروری الجھنوں سے بچتے رہنا ہماری پالیسی ہے۔"

"حکومت تو پھر بھی تمہاری طرف متوجہ ہو سکتی تھی' اگر میں حفیظ صاحب کو تمہارے بارے میں بتا دیتا" میں نے کہا۔

"ہمیں تم سے عقل مندی کی توقع تھی اور تم نے عقل مندی ہی دکھائی۔ تم نے اپنے حق میں بہتر ہی کیا کہ ہمارے بارے میں زبان بند رکھی۔ اس سے تمہارا ہی نہیں' تمہارے بہت سے ہم وطنوں کا بھلا ہوا۔"

"کیا مطلب؟ میں تمہاری بات سمجھا نہیں" میں نے کہا۔

"فی الحال تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ وقت آنے پر دھیرے دھیرے تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا ... اور آثار بتاتے ہیں کہ وقت اب قریب آتا جا رہا ہے" وہ مبہم لہجے میں بولا۔

"حکومت کو تو میں اب بھی بتا سکتا ہوں۔ کچھ ذمے دار لوگوں کی توجہ تم لوگوں کی طرف مبذول کرا سکتا ہوں" میں نے کہا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا گویا میں نے اسے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

"کیا تمہیں اپنی' ستارہ کی اور ہنی کی جانیں عزیز نہیں ہیں؟" اس نے نہایت مشفقانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم نے میرے بارے میں اتنے بہت سے اندازے قائم کئے ہیں۔ کیا تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ میں بلیک میل ہونے والا آدمی نہیں ہوں؟" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"درست ہے۔ لیکن عقل سے کام لینے والے آدمی تو ہو" وہ بولا "اپنی اور اپنی حسین دوستوں کی جانیں محض ضائع ہی کرو گے۔ تمہاری اس قربانی سے بھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہیں ہمارے بارے میں معلوم ہی کیا ہے جو کسی کو بتاؤ گے۔ جنہیں معلوم تھا' ہمیں تو وہ بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔"

"حکومت اب بھی تمہاری راہ پر تو لگ سکتی ہے" میں نے کہا' "اکرام بیگ کو خفیہ ایجنٹوں نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ جس طرح تمہیں دعویٰ ہے کہ کسی سے بات اگلوانے میں تم لوگ بہت ماہر ہو اسی طرح ان لوگوں کی کارکردگی بھی بے مثال ہے۔ وہ تو ایسے جرائم کا اعتراف بھی کرا لیتے ہیں جو لوگوں نے کئے نہیں ہوتے۔ اکرام بیگ سے تفتیش ہو رہی ہوگی۔ وہ سب کچھ بتا دے گا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا "بے چارہ اکرام بیگ! وہ کیا بتائے گا۔ اسے تو خود کچھ معلوم نہیں۔ تم شاید اسے خفیہ ایجنسیوں کے سپرد کر کے بڑی خوشی اور اطمینان محسوس کر رہے ہو گے کہ تم نے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ اگر اسے کچھ معلوم ہوتا تو کیا ہم اسے اتنی آسانی سے ہاتھ سے جانے دیتے؟ اس سے زیادہ تو انہیں معلوم تھا جنہوں نے موقع پر ہی خودکشی کر لی۔"

مجھے اپنے ہوٹل میں ویٹر کی جگہ لینے والا وہ نوجوان اور سوئچ روم میں گھسنے والے وہ آدمی یاد آئے جن کے جسم چند لمحوں میں خشک مٹی کی طرح چٹخ گئے تھے اور دراڑوں سے گوشت کراہیت انگیز انداز میں جھانک رہا تھا۔ گوشت کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔

"تم نے حفیظ صاحب کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کیوں کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اوپر سے حکم ملا تھا" اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"تمہارا مطلب ہے تمہارے "اوپر والے دماغ" نے حکم دیا تھا؟" میں نے کریدا۔

"نہیں ..... نہیں" وہ جلدی سے بولا "میں اور مجھ سے اوپر والا دماغ ..... دونوں بہت ہی معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔ ہم تو چھوٹے موٹے معاملات نمٹاتے ہیں۔ حفیظ صاحب کا پتہ صاف کرنے کا حکم تو بہت اوپر سے آیا تھا۔"

"ان کا پتہ صاف کرنے سے تم لوگوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اب اتنے بڑے بڑے سوالات مت کرو جن کے جواب خود مجھے نہیں معلوم" وہ نیم بیزاری سے بولا "تمہیں جتنا بتا دیا جاتا ہے وہ کیا کم ہے؟ تم کوئی کام کی بات کرتے نہیں ہو۔ بس سوال پر سوال کرتے رہتے ہو۔"

"مجھے دراصل اپنی جنرل نالج بڑھانے کا بڑا شوق ہے۔ ویسے تمہارے نزدیک کام کی بات کیا ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "یعنی پھر بھی ایک سوال داغ دیا۔ بھئی کام کی بات یہی ہے کہ ہمارے بارے میں کچھ نیک خیالات کا اظہار کرو۔ ہماری طرف ذرا مختلف زاویۂ نظر سے کچھ توجہ دو۔"

"تم جیسے خبیثوں کے بارے میں کوئی نیک خیال دل میں آئے تبھی تو ظاہر کروں نا ....." میں نے اپنے لہجے سے بے بسی کا اظہار کیا۔

"عمر کے اعتبار سے اب تم لونڈے لپاڑے نہیں رہے افضل چودھری! اب تمہیں بالکل سنجیدہ لوگوں کے انداز میں سوچنا چاہئے اور جذباتی باتیں ترک کر دینی چاہئیں" وہ ناصحانہ لہجے میں بولا۔

"سنجیدہ لوگ کس طرح سوچتے ہیں؟" میں نے جاننا چاہا۔

"جب کوئی ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے تو وہ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ خواہ مخواہ کی دشمنیاں نہیں پالتے۔ جس کام میں فائدہ نظر آتا ہے اس کے بارے میں ضرور سوچ بچار کرتے ہیں۔ جو لوگ آج کی نہیں' سو سال آگے کی باتیں سوچتے ہیں وہ خود ہی نہیں' ان کی آنے والی نسلیں بھی فائدے میں رہتی ہیں۔ ہر دور میں ان کی طرف رشک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اتنی بلندیوں پر چلے جاتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کی حیثیت ان کے سامنے زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں کی سی ہو کر رہ جاتی ہے" وہ انتہائی دل نشین لہجے میں بولا۔

"ویسے تو قدرت جس کو ایسا بنانا چاہتی ہے' بنا دیتی ہے لیکن تم شاید سنجیدہ لوگوں کی نہیں' بے ضمیر لوگوں کی بات کر رہے ہو جو صرف فائدہ دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ فائدہ کس ذریعے سے ہو رہا ہے اور کس چیز کے عوض ہو رہا ہے۔ میں تو اس وقت بھی کسی حساب سے نقصان میں نہیں ہوں۔ دنیا کی ہر نعمت مجھے میسر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اَن گنت انسانوں سے بہتر بنایا ہے' بہتر حال میں رکھا ہے اور ابھی جدوجہد کے لئے میرے سامنے کھلا میدان پڑا ہے۔ زندگی نے جتنی مہلت دی شاید اتنا ہی مزید آگے چلا جاؤں۔ میں اپنی جگہ بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ تم مجھے کون سے فائدے نقصان کا فلسفہ سمجھانا چاہتے ہو؟"

"چہ ..... چہ ..... چچ .....!" وہ ترحم آمیز انداز میں بولا "بس وہی چھوٹی چھوٹی باتیں ..... وہی جذباتی باتیں ..... وہی بیکار باتیں .....!" پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "خیر ..... ہمیں امید ہے کہ جلد ہی مینڈک کنوئیں سے نکل آئے گا۔ ہمارے ساتھ میٹنگ کے بعد تمہارے خیالات میں انقلاب آ جائے گا ..... لیکن میں چاہ رہا تھا کہ میٹنگ سے پہلے ہی تمہارا ذہن کچھ ہموار ہو جائے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے میرے ذہن میں کہاں سے ناہمواری تلاش کرلی ہے" میں نے کچھ سوچ کر نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "بہرحال میں میٹنگ کا منتظر رہوں گا۔"

وہ بدبخت گویا میرا ذہن پڑھتے ہوئے بولا "وہ جو بعض پرانی کہانیوں میں ہوتا ہے نا .... کہ کوئی نیک' شریف یا قانون کے رکھوالے صاحب مصلحتاً ڈاکوؤں یا مجرموں کے ہمدرد اور ہم خیال بن کر ان کے گروہ میں شامل ہوگئے تاکہ سارے رازوں سے آگاہ ہوسکیں اور مناسب موقع ملتے ہی ان کا دھڑن تختہ کرسکیں.... جب ہمارے ساتھ میٹنگ ہوگی تو اس قسم کی کوئی کہانی ذہن میں مت رکھنا۔ ہمارے ہاں اس قسم کی کہانی بالکل نہیں چلے گی' فلاپ ہوجائے گی۔ کیوں کہ یہ کسی گروہ یا چھوٹی موٹی تنظیم کا معاملہ نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے ہاں ایسا نظام ہے کہ کوئی سارے رازوں سے آگاہ ہوسکے یا دھڑن تختہ کرسکے۔ ہمارا تو سیٹ اپ ہی بہت مختلف اور سمجھ میں نہ آنے والا ہے۔ اب تک خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حالاں کہ میرا خیال ہے شاید میں پیدا ہی ریڈ ڈاٹ میں ہوا تھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ جب تم ہمارے پاس آؤ گے تو بس ہمارے ہی ہوجاؤ گے۔ اس کے سوا تمہارے سامنے کوئی راستہ ہی نہیں ہوگا۔"

میں خاموش رہا۔ اسے گویا کچھ یاد آیا اور وہ قدرے چونکتے ہوئے بولا "ایک ضروری بات تو میں تمہیں بتانی بھول ہی گیا۔ آئندہ حفیظ صاحب والے معاملے میں ....یا کسی بھی ایسے معاملے میں جس کا تعلق ریڈ ڈاٹ سے ہو' ٹانگ اڑانے کی ہرگز کوشش مت کرنا۔ ریڈ ڈاٹ بار بار ناکامیاں برداشت کرنے کی عادی نہیں ہے۔ حفیظ صاحب والے معاملے کو بھی تم اپنی فتح اور ہماری ناکامی سمجھ کر زیادہ خوش مت ہونا۔ یہ صورتِ حال کی صرف عارضی تبدیلی ہے۔ حفیظ صاحب کو بہرحال جانا ہے۔ اپنا عہدہ یا یہ دنیا' دونوں میں سے ایک چیز ان کو بہرحال چھوڑنی ہوگی۔ ہم کوشش کریں گے کہ انہیں انتخاب کا حق دے سکیں کہ وہ کون سی چیز چھوڑنا چاہتے ہیں۔"

میں اس کی باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہتا تھا اور تھوڑا بہت مذاق بھی اڑاتا رہتا تھا' بظاہر اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کا لہجہ میرے لاشعور کے بند دروازوں پر کہیں دستک دیتا تھا' ذہن کے ان نامعلوم تاریک گوشوں میں سرد سی ہوائیں سرسرانے لگتی تھیں اور اعصاب میں خوف کی ہلکی سی گدگدی ہونے لگتی تھی مگر میں اس طرف سے توجہ ہٹائے رکھتا تھا۔ میں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں اس کی باتوں سے متاثر یا مرعوب نہیں ہوتا۔ انسان اپنی دانست میں کتنا ہی مضبوط' کتنا ہی طاقت ور بن جائے لیکن کہیں نہ کہیں اسے خود فریبی کی آغوش میں راحت تلاش کرنی پڑتی ہے۔

میں ایک لمحے کے لئے اپنے خیالات میں الجھ گیا تھا۔ اسی دوران میں نے ایڈم عرف ایڈی کو خدا حافظ کہتے سنا اور میرے کچھ بولنے کا انتظار کئے بغیر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ ریسیور رکھنے کے بعد میں ایک بار پھر بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ میری نظر سفید چھت پر جمی ہوئی تھی جو میرے لئے گویا اسکرین بن کر رہ گئی تھی اور اس پر میری یادوں کی پرچھائیاں بہت بری طرح ایک دوسرے میں گڈمڈ ہورہی تھیں۔ ہر بات گویا الجھتی جارہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زندگی کا سفر مجھے کہاں لئے جارہا ہے۔

میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کررہا تھا کہ ایڈم کی باتوں کو اب مجھے کچھ زیادہ سنجیدگی سے لینا ہوگا اور کچھ اضافی اقدامات بھی کرنے ہوں گے۔ میرے آدمی بہت منظم' بہت مستعد اور بہت جاں نثار تھے لیکن میں سوچ رہا تھا کیا میں انہیں مزید منظم کروں؟ کیا میں انہیں آگاہ کردوں کہ ہمیں شاید کسی وقت اچانک کسی ہولناک خطرے کا سامنا کرنا پڑجائے گا؟ میرے ساتھی ہیجان کا شکار ہونے والے تو نہیں تھے لیکن اس طرح وہ خواہ مخواہ اضطراب میں مبتلا ہوسکتے تھے جب کہ خطرے کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کب تک کچے دھاگے سے بندھی تلوار کی طرح ہمارے سروں پر ہی لٹکتا رہے؟

ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ میری قوت دو جگہ بٹی ہوئی تھی۔ میرے بہت سے بہترین ساتھی کراچی میں تھے اور باقی لاہور میں۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ان سب کو لاہور میں ہی جمع کرلوں۔ اس سے کراچی کے بزنس پر بہت برا اثر پڑسکتا تھا۔ لیکن انتہائی ناگزیر حالات میں میں ایسا بھی کرسکتا تھا۔ روپیہ بہرحال میری پہلی ترجیح نہیں تھا۔

ایک خیال مجھے یہ بھی آیا کہ مجھے اپنے ساتھیوں میں اضافہ کرنا چاہئے۔ لیکن محض افراد میں اضافہ کرنا میری نظر میں کبھی مفید نہیں رہا تھا۔ انتہائی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل اور انتہائی جاں نثار لوگ ہی میرے ساتھی بن سکتے تھے۔ یہ سب خوبیاں بیک وقت ایک ہی فرد میں شاذونادر جمع ہوتی تھیں۔ میرے بیشتر ساتھی نوخیزی کے دور سے میرے ساتھ چلے آرہے تھے اور کچھ حالات کے بہاؤ کے ساتھ ہم میں شامل ہوگئے تھے۔ وقت نے دھیرے دھیرے سب کو کچھ اور "پالش" کردیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ہیرا تھا۔ صلاحیتوں کے اعتبار سے ہر ایک اپنی جگہ گروہوں پر بھاری تھا۔ ایسے لوگ آسانی سے نہیں ملتے تھے اور ہر جگہ نہیں ملتے تھے۔

البتہ اب راحیلہ لاہور آرہی تھی اور ادھر نذیر خان سے اتفاقاً میری شناسائی بہت اچھی ڈگر پر آگئی تھی۔ ان دونوں کو میں اپنی ٹیم میں شامل کرسکتا تھا اور یہ ہر اعتبار سے اچھے ساتھی ثابت ہوسکتے تھے۔ طاہرہ خانم بھی کام کی عورت تھی لیکن وہ زیادہ بھروسے کے قابل نہیں تھی۔ ستارہ جاں نثار تھی لیکن وہ صرف جذبوں اور خلوتوں کی غیر معمولی ساتھی تھی۔ اس میں اور کوئی ایسی غیر معمولی صلاحیتیں نہیں تھیں کہ میں اس پر زیادہ انحصار کرسکتا۔

راحیلہ کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ نوخیزی کے دور میں وہ

کیسی باصلاحیت لڑکی تھی اور کیسی بے خوف و نڈر ہوا کرتی تھی لیکن اب وہ بجھ سی گئی تھی' اس کی صلاحیتوں پر گرد جم گئی تھی' ذہن کو کچھ زنگ سا لگ گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ لاہور میں وہ میرے قریب' میری رسائی میں رہے گی تو اس کی صلاحیتوں سے یہ زنگ اور گرد جلد صاف ہو جائے گی۔ اس کے کراچی رہنے کے دوران خواہ میں روزانہ جہاز سے اس کے پاس جاتا رہتا اور فون پر مستقل رابطہ رکھتا لیکن وہ بات پھر بھی نہ ہوتی جو ایک ہی شہر میں رہنے میں تھی۔ فاصلے بہرحال فاصلے تھے! انسان کی سائنسی ترقی رابطے آسان بنا سکتی ہے' فاصلے مٹا نہیں سکتی۔

میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ انٹرکام کا بزر بجا۔ گیٹ ہاؤس سے طارق بول رہا تھا "سر! وہ ہونق سا لڑکا وسیم احمد آیا ہے۔ بہت گھبرایا ہوا ہے۔ کہتا ہے اے نن کے بارے میں کوئی خبر ہے۔ میں اسے گیٹ سے باہر ہی کھڑا کر کے آیا ہوں۔ سر! میں جونہی چھوٹا گیٹ ذرا سا کھولتا ہوں وہ فوراً اندر گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جب بھی آتا ہے اس کا یہی انداز ہوتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کسی روز کوئی الٹی سیدھی حرکت کرتے وقت نادانستگی میں میرے ہاتھوں مارا نہ جائے۔"

میں تو اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے تیزی سے کہا "نہیں' نہیں۔ اس بے چارے کا خیال رکھا کرو۔ اور اس وقت تو اسے فوراً اندر بھیج دو۔ کسی سے کہو اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔"

میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہ بیٹھا نہیں تھا۔ کمرے کے وسط میں کھڑا سر اٹھائے فانوس کی طرف دیکھ کر یوں تیزی سے آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا جیسے فانوس نے اس کے کان میں کچھ کہہ دیا ہو۔ اس کی عینک پھسل کر ناک کی نوک پر آئی ہوئی تھی۔ بال پریشان تھے اور پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ لگتا تھا سانس بھی ابھی تک کچھ تیز ہی چل رہی تھی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ تقریباً اچھل کر قریب آتے ہوئے اور مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "سر! آپ کے گھر پہنچ کر بھی آپ سے ملاقات کی نوبت آنے میں بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ سر! میری آپ سے پُرزور اپیل ہے کہ یہ بادشاہوں والے طور طریقے ترک کر دیجئے۔ اپنے گھر کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے رکھئے۔ یہ سیکیورٹی...... یہ گارڈز...... یہ اونچے اونچے گیٹ...... یہ بجلی والی تاریں...... یہ سب ہٹا دیجئے سر" وہ بالکل کسی فلمی فریادی کی طرح گویا اس جذباتی اپیل کے ساتھ میرے پیروں میں گر جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن پھر سنبھل گیا۔ شاید اسے بروقت اپنی آمد کا اصل مقصد یاد آ گیا تھا۔

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں برادرم!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن اس کے لئے مجھے دوبارہ فاقہ مست بننا پڑے گا۔"

"سر! اس موضوع پر میں آپ سے پھر کبھی مذاکرہ کروں گا۔ اس وقت تو آپ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً میرے ساتھ چلئے۔ جتنے لمحے ضائع ہو چکے ہیں وہی بہت ہیں" اس نے قریب آ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور دروازے کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

"بات کیا ہے؟" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر اسے گھورا۔

"سر! آپ نے جو کام میرے سپرد کیا تھا وہ میں نے کر لیا ہے؟" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "میں نے اس شخص کو پکڑ لیا ہے جس کی تصویر آپ نے مجھے دی تھی.... جس کا نام آپ نے اے نن بتایا تھا۔"

میں ایک ٹک اسے گھورتا رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی سے مذاق کرنے کا اہل ہی نہیں ہے لیکن اس وقت مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ میرے ساتھ مذاق کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ٹونی جیسا عقاب صفت نوجوان اے نن کی تلاش میں تھا۔ میرے دفتر کا ایک نوجوان محسن علی جو سینے میں ایک برقِ تپاں چھپائے پھرتا تھا اور دنیا کا کوئی بھی کام کر گزرنے کے لئے تیار تھا' سر ہتھیلی پہ لئے پھر رہا تھا' وہ بھی اسی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ لیکن ان دونوں کو ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ جب سے میں نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا انہیں اے نن کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ چلیں یہ تو فرض کیا جا سکتا تھا کہ اس معاملے میں ہونق وسیم کی قسمت نے یاوری کی ہو گی یا محض اتفاقاً اسے اے نن کہیں نظر آ گیا ہو گا۔ لیکن وسیم نے اسے "پکڑ" لیا تھا' یہ میرے لئے ناقابلِ یقین سی بات تھی۔ میں نے محض جان چھڑانے کے لئے اسے یہ کام بتایا تھا۔ مجھے اس کی کامیابی کی امید تو در کنار' الٹا فکر لگی ہوئی تھی کہ کہیں وہ بے چارہ اے نن کے ہاتھوں مارا نہ جائے لیکن وہ تو کچھ اور ہی خبر لے کر آ گیا تھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا "کب اور کس طرح قابو میں کیا تم نے اسے؟"

"تفصیل میں آپ کو راستے میں بتا دوں گا۔ آپ وقت ضائع مت کیجئے۔ فوراً میرے ساتھ چلئے" وہ بے تابی سے بولا "میں چاہتا ہوں کہ آپ کی امانت آپ کے سپرد کر دوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اسے زیادہ دیر قابو میں نہیں رکھ سکوں گا۔"

اُس نے جس سنجیدگی سے لفظ "امانت" استعمال کیا اس پر مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ کچھ ایسا ہی تصور میرے ذہن میں آیا تھا جیسے اے نن کوئی پوٹلی وغیرہ تھی جو میں نے خود اس کے پاس رکھوائی تھی۔

میں نے اس کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے کہا "اگر ایسا ہی عجلت والا معاملہ تھا تو تم خود آنے کے بجائے مجھے فون کر دیتے۔ کچھ وقت تو بچتا۔"

"فون کیا تھا میں نے" وہ تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بولا "لیکن آپ گھر پر نہیں تھے۔ کم از کم مجھے یہی بتایا

گیا تھا۔ میں نے سوچا' چل کر آپ کے دروازے پر دھرنا مار کر ہی بیٹھ جاتا ہوں تاکہ آپ کے آتے ہی آپ کو پکڑ سکوں۔"

"کچھ دیر پہلے میں واقعی گھر پر نہیں تھا" میں نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی کہ اسے ٹرخایا نہیں گیا تھا "اور تھوڑی دیر بعد شاید میں دوبارہ نکل جاتا۔ اتفاق ہی ہے کہ ہماری ملاقات ہو گئی۔ میرا تو اس وقت گھر آنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔"

"یہ میری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں دل ہی دل میں کتنی دعائیں مانگتا آرہا تھا کہ آپ مجھے گھر پر ہی مل جائیں۔ کمزور آدمی کی دعائیں بڑی طاقتور ہوتی ہیں۔"

ڈرائیو وے میں پہنچ کر میں نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ بولا "میری گاڑی باہر ہی کھڑی ہے۔ اب گیٹ کھلنے اور گاڑی نکالنے میں مزید وقت ضائع ہو جائے گا۔ اسی میں آجایئے۔"

میں نے اسے اپنی گاڑی میں دھکیلتے ہوئے کہا "اب اتنے بھی وقت کے قدردان مت بنو۔ صرف چند سیکنڈ کا فرق پڑے گا۔ چند سیکنڈ کے فرق کے لئے میں تمہاری گاڑی میں جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر وہ کھٹارا راستے میں بند ہو گئی تو کہیں گھنٹوں کا فرق نہ پڑ جائے" یہ کہتے کہتے میں گاڑی اسٹارٹ بھی کر چکا تھا اور طارق خان نے گیٹ ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے بٹن دبا دیا تھا جس سے فرش میں پوشیدہ موٹر کے ذریعے گیٹ بھی کھل چکا تھا۔

اپنی گاڑی کے بارے میں ریمارکس سن کر وسیم کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے تکلیف کے آثار ابھرے۔ میں کچھ مذاق میں اور کچھ روانی میں اس کی گاڑی کو کھٹارا کہہ گیا تھا لیکن میرے دل میں حقارت یا تمسخر کے جذبات ہرگز نہیں تھے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے پچھتاوا ہوا کہ مذاق میں بھی ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔ وسیم جیسے آدمیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب بڑی سے بڑی بات کو نظرانداز کر دیں اور کب چھوٹی سے چھوٹی بات کو دل پر لے لیں۔

وہ گلی میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف ایک نظر دیکھ کر بولا "کسی بھی چیز کی ظاہری حالت ... دیکھ کر اس کے بارے میں حتمی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے ..." وہ میرے ہی چند پسندیدہ ترین اصولوں میں سے ایک اصول مجھے سمجھا رہا تھا لیکن چوں کہ میری زبان ذرا پھسل چکی تھی' اس لئے اب میں نے خاموشی سے اس کی نصیحت سننے میں ہی عافیت سمجھی۔

وہ عینک درست کرتے ہوئے بولا "اگر آج آپ میری گاڑی کو دوڑتے دیکھ لیتے تو اسے گراں پری ریس میں بھیجنے کی سفارش کرتے۔ اس کے کمالات دیکھ کر تو اے نن بھی چکرا گیا ہو گا۔"

"کمالات تو اصل میں چلانے والے کے ہوتے ہیں' گاڑی بے چاری خود تو کوئی کمال نہیں دکھا سکتی۔" میں نے وسیم کو مکھن کا ہلکا سا ہاتھ لگانے کی کوشش کی۔

"وہ تو درست ہے سر! لیکن جب تک گاڑی ساتھ نہ دے' ڈرائیور کچھ نہیں کر سکتا" وہ مدبّرانہ لہجے میں بولا۔ ہم مین بلیوارڈ پر پہنچ چکے تھے۔ اس نے مجھے ماڈل ٹاؤن کی طرف چلنے کی ہدایت کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ماڈل ٹاؤن سے آگے بھابڑہ کے علاقے میں اس کے ابا کے چپل بنانے کے کارخانے تھے اور ہمیں اس وقت وہیں جانا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کارخانوں کی طرف جانے کی کیا تک تھی۔ لیکن مجھے امید تھی کہ جب وہ اپنے کارنامے کی تفصیل سنائے گا تو وجہ سمجھ میں آجائے گی۔

مین بلیوارڈ پر اس وقت ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا "اب بتا بھی چکو' وہ بدبخت کس طرح تمہارے ہتھے چڑھ گیا؟"

"سر' میں نے اسے گھیرنے کی باقاعدہ پلاننگ کی ہوئی تھی۔ جب آپ نے یہ کام میرے سپرد کیا تھا' اسی وقت کر لی تھی پلاننگ۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا "صرف اس کے نظر آنے کی دیر تھی ... اور معلوم نہیں اب یہ آپ کی خوش قسمتی تھی یا میری۔ کہ آج وہ مجھے نظر آگیا۔"

"کہاں؟" میں نے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"چڑیا گھر میں" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ مجھے ایک بار پھر شبہ ہوا کہ وہ کہیں اپنی حماقت کا کوئی نمونہ مجھے دکھانے تو نہیں لے جا رہا تھا۔ میں نے اے نن کی تلاش کا کام جن کے ذمے لگایا تھا وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے کم از کم چڑیا گھر تو نہیں جا سکتے تھے۔

"تم کیا اس کی تلاش میں چڑیا گھر گئے تھے؟" میں نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔

"نہیں سر۔ سچی بات ہے میں تو اس کی تلاش میں تھا ہی نہیں" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا "میں نے تو ویسے ہی سوچا ہوا تھا کہ اگر کہیں نظر آگیا تو اپنی تدبیر پر عمل کرنے کی کوشش کر ڈالوں گا۔ چڑیا گھر تو میں ویسے ہی کبھی کبھار جاتا رہتا ہوں۔ بڑی دلچسپ جگہ ہے سر۔ میں تو غوروفکر کرنے کے لئے وہاں جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی رنگارنگ مخلوقات دیکھ کر اور ان کی حرکات دیکھ کر سوچ بچار کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ میری تو تمنا یہی ہے کہ ایک ایک کر کے میں ساری دنیا کے مشہور ترین چڑیا گھر دیکھوں۔"

"بہت خوب! اللہ تمہاری آرزو پوری فرمائے" میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر قدرے الجھن کے عالم میں کہا۔ مجھے بار بار یہی احساس ہوتا تھا کہ اگر وسیم کبھی مذاق کرتا تو شاید میں اس کا اندازہ لگانے سے بھی قاصر رہتا۔ اس کا چہرہ' اس کے متعلق تاثرات کچھ ایسے ہی تھے۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ سنجیدگی' غیرسنجیدگی اور رنجیدگی کے درمیان حدِّفاصل کہاں کہاں تھی۔

"آمین" اس نے نہایت خلوص اور عقیدت سے کہا اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "اے نن پر اچانک میری نظر پڑ گئی۔ وہ چمپینزیوں کے پنجرے کے پاس کھڑا تھا اور مجھ سے بھی زیادہ محویت سے ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید وہ بھی

سوچ بچار حاصل کرنے ہی چڑیا گھر جاتا ہو۔ میرا تو اس سے یہ کہنے کو بھی جی چاہا! "بھائی! تم پنجرے کے باہر کیا کر رہے ہو' تمہیں تو پنجرے کے اندر ہونا چاہئے" لیکن پھر مجھے فوراً اپنی زندگی کا سنہرا اصول یاد آگیا۔ کبھی کسی کا مذاق نہیں اُڑانا چاہئے۔ ویسے بھی میں ایک سنجیدہ نوجوان ہوں۔ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ مجھے غیر سنجیدہ گفتگو نہ کرنی پڑے....."

"خیر...... تو پھر ہوا کیا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ذرا بے تابی سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا سر! اس پر نظر پڑتے ہی میں نے اسے پہچان لیا تھا کہ یہ وہی پُراسرار اور خطرناک آدمی ہے جس کو قابو میں کرنے کا فریضہ چوہدری صاحب نے مجھے سونپا ہے۔ میں اب اس کام میں کوتاہی تو نہیں کر سکتا تھا نا۔ میں فوراً اس کے پیچھے لگ گیا....." اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میں فی الحال اسے داد دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"سب سے زیادہ وقت اس نے بندروں کے پنجروں کے پاس ہی صرف کیا لیکن باقی جانوروں کا معائنہ بھی اس نے خاصے اطمینان کے ساتھ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں تھا لیکن بہرحال میں اس کے پیچھے لگا رہا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے اسے احساس بھی دلا دیا کہ میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی یہ میں بھی کوئی فلسفہ کارفرما ہوگا۔

"یہ میری حکمتِ عملی کا ایک حصہ تھا" وہ اطمینان سے بولا۔ "ویسے بھی اگر میں اسے یہ احساس نہ ہونے دیتا تو شاید وہ گھنٹوں چڑیا گھر میں ہی ٹہلتا رہتا۔ پہلے اسے شبہ ہوا کہ میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ اپنی دانست میں تصدیق کے لئے اس نے اِدھر اُدھر چکر لگائے۔ میں سائے کی طرح اس کے پیچھے رہا۔ آخر کار اسے یقین ہوگیا کہ میں اس کا تعاقب کر رہا ہوں تو اس نے اچانک گھڑی دیکھی' جیسے اسے کوئی ضروری کام یاد آگیا ہو۔ پھر وہ چڑیا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہ اسپتال سے کینٹ کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ اِدھر اُدھر چکرانے کے بعد آخر کار وہ والٹن کی طرف مڑ گیا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس دوران اس نے کس طرح کی ڈرائیونگ کی اور کس طرح میں نے اپنے کھٹارے میں اس کا تعاقب جاری رکھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی میں نے اسے اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔"

"بھئی اگر میرے الفاظ سے تمہارے یا تمہاری گاڑی کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے تو میں انہیں واپس لیتا ہوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے اسے حقارت سے نہیں بلکہ یوں ہی روانی میں اور کچھ بے دھیانی میں کھٹارا کہا تھا۔ مجھے تو خود ایسی پرانی چیزوں سے بہت پیار ہے۔ بہت وفادار ہوتی ہیں۔ میرے اپنے پاس بھی کسی زمانے میں ایسی ہی ایک کھٹارا گاڑی تھی اور میں اس میں زندگی موت کی جنگ لڑا کرتا تھا۔ اس نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔"

"سر! آپ نے "گاڑی کے جذبات" والی بات شاید مذاق میں کی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے جان اشیا کے بھی جذبات ہوتے ہیں" وہ پُرجوش لہجے میں بولا "بلکہ سچ پوچھیں تو اس دنیا میں کوئی چیز بے جان ہے ہی نہیں۔ اس کائنات کی سب چیزیں جاندار ہیں اور وہ بھی انسان کی محبت کے جواب میں محبت اور نفرت کے جواب میں نفرت کرتی ہیں۔ اکثر اوقات ان کی محبت اور نفرت خاموش اور مجبور ہوتی ہے۔ انسان اسے محسوس نہیں کر سکتا۔ لیکن غیر معمولی حساس لوگ اسے محسوس کر سکتے ہیں اور وقت پڑنے پر یہ محبت یا نفرت اپنا اثر دکھاتی ہے۔"

مجھے اس احمق نوجوان سے اتنی گہری بات کی توقع نہیں تھی لیکن یہ موقع ایسی باتوں پر تبادلہ خیال کرنے کا نہیں تھا۔ میں نے نرمی سے اسے یاد دلایا "وہ اے ٹن کی بات ہو رہی تھی..."

"جی ہاں۔ میں وہی بتانے لگا تھا" وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا "گیلری گراؤنڈ سے آگے نکل کر جب وہ ویران سڑک پر پہنچا اور اس کی گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ اب وہ مجھے گھیرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میں نے سڑک تنگ ہونے کے باوجود گاڑی کو یوٹرن دے لیا اور واپس روانہ ہوگیا۔ آپ میرا مقصد سمجھے؟" اس نے چمکتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ میں اسی کی زبانی سب کچھ سننا چاہتا تھا۔

"یہ میری نفسیاتی چال تھی سر!" وہ فاتحانہ لہجے میں بولا "میں نے اس کے تجسس کو خوب ابھارا۔ اتنا ابھارا کہ اب وہ اس سوال کا جواب حاصل کئے بغیر گھر نہیں جا سکتا تھا کہ آخر میں کیوں اس کا تعاقب کر رہا تھا؟ یہ "کیوں؟" آدمی کو بڑا بے چین کرتی ہے سر۔ اب وہ میرے پیچھے لگ گیا۔ اب میرا کام صرف اتنا تھا کہ اس کے ہتھے نہ چڑھنے پاؤں۔ اور یہ بڑا مشکل کام تھا۔ کیوں کہ میں تو اپنے آپ کو ہی زبردست ڈرائیور سمجھتا ہوں لیکن وہ میرا بھی استاد تھا۔ بازی گر معلوم ہوتا تھا بالکل۔ بہرحال..... میری قسمت اچھی تھی اور کچھ حواس نے ساتھ دیا۔ ٹریفک کے سلسلے میں بھی خوش قسمتی سے کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا اور میں اسے اپنے پیچھے لگائے لگائے وہاں لے آیا جہاں لانا چاہتا تھا....." وہ اب گویا میرا تجسس ابھارنے کے لئے خاموش ہوگیا۔

"کہاں لے جانا چاہتے تھے تم اسے؟" مجھے پوچھنا ہی پڑا۔

"ہمارے کارخانوں کے پیچھے ایک گودام ہے۔ میرا اسے وہاں لے جانے کا پروگرام تھا۔ اور میں اس میں کامیاب ہوگیا" اس نے جواب دیا "میں یہی ظاہر کر رہا تھا کہ سخت خوفزدہ ہو چکا ہوں۔ گودام تک میں اس سے ذرا پہلے پہنچ گیا اور خوف زدہ انداز میں

گاڑی سے چھلانگ لگا کر گودام کا تالا کھول کر اندر گھس گیا۔ میں نے آوازوں وغیرہ سے تاثر یہی دیا کہ کسی پچھلے دروازے سے مزید اندر چلا گیا ہوں لیکن درحقیقت میں دروازے کے پیچھے ہی چھپا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ درست ہی رہا کہ وہ اندھا دھند میرے پیچھے آئے گا......"

یقیناً اسے خود بھی معلوم تھا کہ وہ شکل سے جتنا احمق نظر آتا ہے اتنا ہی اسے بے ضرر سمجھا جائے گا اور کوئی اس کے پیچھے آنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔ حتیٰ کہ اس کا تعاقب کرنے والا تو کسی احتیاط کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی مخصوص احمقانہ مسکراہٹ کے ساتھ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"وہ اندھا دھند گودام میں گھسا اور میں نہایت پھرتی سے دروازے کے پیچھے سے باہر نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کنڈی میں تالا لگا دیا۔"

میں قدرے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ کیا واقعی اس جیسا احمق نوجوان اے ٹی جیسے فتنے کو اتنے سیدھے سادے طریقے سے پکڑنے میں کامیاب ہو سکتا تھا؟ پھر میں نے ٹھنڈی سانس لے کر دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا کہ بعض ایسے مشکل کام جو بڑے بڑے شاطر لوگ تمام تر چالاکی کے ساتھ بھی انجام نہیں دے پاتے، وہ نہایت سیدھے سادے انداز میں ہو جاتے ہیں۔

"گودام کا دروازہ کیسا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"لکڑی کا ہے۔ جیسے عام طور پر پرانے مکانوں میں ہوتے ہیں۔ دو پٹ والا۔ کافی مضبوط ہے" اس نے جواب دیا۔

"کوئی اور دروازہ یا کھڑکی بھی ہے گودام میں؟"

"بالکل نہیں سر!" وہ فخریہ لہجے میں بولا "اسی لئے تو میں نے گودام کو منتخب کر رکھا تھا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں کچا کام کر کے نہیں آیا ہوں۔ ابھی تو میں نے آپ کو ان مزید احتیاطی اقدامات کے بارے میں نہیں بتایا جو میں کر کے آیا ہوں۔"

"اچھا.... تو تم نے مزید احتیاطی اقدامات بھی کئے ہیں" میں نے قدرے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ مجھے بار بار شبہ ہونے لگتا تھا کہ وسیم اتنا احمق نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ احمق نظر آنا شاید اس کی لاشعوری کوشش تھی۔ شاید اسے احساس تھا کہ احمق نظر آنے میں زیادہ فائدے پنہاں ہیں۔ قدرت نے اس کا چہرہ ایسا نہیں بنایا تھا۔ شاید وہ بڑی کوشش سے اپنے چہرے پر حماقت طاری کئے رکھتا تھا اور اب اس کام میں بہت ماہر ہو چکا تھا۔ قدرت نے اسے اچھا بھلا ہینڈسم چہرہ عطا کیا تھا لیکن اس نے شاید جان بوجھ کر اس پر کچھ اور ہی طرح کا رنگ چڑھا لیا تھا۔ یہ حوصلہ بھی ہر کسی میں نہیں ہوتا۔ لوگ تو احمق ہونے کے باوجود بہت بڑے دانشور اور مدبر نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرحال وسیم کے بارے میں ابھی تک میں کوئی یقینی اور حتمی رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔

وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا "ہمارے کارخانوں کو ایک نوجوان دکاندار کیمیکلز سپلائی کرتا ہے۔ اس سے میں نے خصوصی فرمائش کر کے اور اس کی منت سماجت کر کے ایک گیس کا چھوٹا سا سلنڈر تیار کروا کے اپنے آفس میں رکھا ہوا تھا۔"

"کیسی گیس کا سلنڈر؟" میں نے ذرا چونکتے ہوئے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" وہ سر کھجا کر بولا "اس نے مجھے اس کیمیکل کا نام بھی بتایا تھا لیکن میں بھول گیا ہوں۔ بہرحال وہ بے ہوش کرنے والی گیس تھی۔ میں جب اپنے آفس سے سلنڈر اٹھا کر دوبارہ گودام کے دروازے پر پہنچا تو وہ بن مانس کا بچہ اندر سے دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دور سے دوڑ لگاتا ہوا بار بار آکر دروازے سے ٹکرا رہا تھا۔ اور جس قوت سے ٹکرا رہا تھا اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں تھا۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے توپ کا گولا دروازے سے ٹکرا رہا تھا یا پھر کوئی بہت ہی پلا ہوا لڑاکا سانڈ بہت دور سے دوڑتا ہوا آکر دروازے پر ٹکر رسید کر رہا تھا۔ میں نے اسے زیادہ ٹکریں رسید کرنے کی مہلت نہیں دی۔ دروازے کے نیچے سے میں نے سلنڈر میں لگی ہوئی ربڑ کی نلکی اندر داخل کی اور والو دبا کر گیس کھول دی۔ شوں شوں کر کے گیس اندر جانے لگی۔ وہ چیخا چلایا، کھانسا، لیکن آخر کار میں نے اس کے دھپ سے گرنے کی آواز سنی اور اس کے بعد اندر خاموشی چھا گئی۔ وہ کیا بے ہوش ہوا، گویا ایک طوفان بدتمیزی تھم گیا۔"

"اور تم دوڑے دوڑے میرے پاس چلے آئے؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ میں کام مزید پکا کر کے آیا ہوں۔ دروازے پر اپنا ایک چوکیدار بھی بٹھا کر آیا ہوں۔ وہ بندوق لئے بیٹھا ہے.... دروازے کے سامنے ہی.... چارپائی پر۔ اب بتائیے.... کام پکا ہے یا نہیں؟" اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں..... محسوس تو یہی ہو رہا ہے" میں نے قدرے تذبذب کے عالم میں اثبات میں سر ہلایا "تم سے مجھے اتنی امید نہیں تھی۔"

"یہی تو میری زندگی کا المیہ ہے سر!" یکدم اس کے لہجے میں دنیا بھر کی اداسی سمٹ آئی "کبھی کسی نے مجھ سے میری صلاحیتوں کے مطابق کام ہی نہیں لیا۔ ورنہ معلوم نہیں آپ کا یہ خادم اب تک کیا کچھ کر کے دکھا چکا ہوتا۔"

میں اب سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ کیوں نہ اس نوجوان کو اپنے ساتھیوں میں شامل کر لوں؟ وہ یقیناً کوئی اور ہی چیز تھا۔ آنکھیں اس کے بارے میں دھوکا دیتی تھیں۔ اس کے باوجود اسے اپنے مطلب کی ٹریننگ دلوانا مجھے کچھ مشکل سا کام لگتا تھا۔

بھابڑہ پہنچ کر اس نے اس سمت میری رہنمائی کی جہاں ایک چھوٹا موٹا صنعتی سا علاقہ پھیلتا جا رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی سڑک اس طرف جا رہی تھی۔ ہم جب اس علاقے میں پہنچ کر جھاڑ جھنکاڑ کے

قریب سے گزرتے ہوئے ایک کچے راستے پر مڑ کر بڑی سی چار دیواری کے عقب میں پہنچے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ صورت حال اس سے کچھ مختلف نظر آرہی تھی جیسی وسیم چھوڑ کر گیا تھا۔

اس نے بھی گڑبڑ کو محسوس کرلیا تھا اور اس کا منہ ایک بار پھر ہونقوں والے انداز میں کھل گیا تھا۔ اس نے گاڑی رکوائی اور ہم دوڑتے ہوئے گودام تک پہنچے۔ مجھے وسیم کے بتانے سے پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ گودام کا دروازہ کون سا تھا کیوں کہ دروازہ چوکھٹ سمیت زمین پر پڑا ہوا تھا اور چوکیدار چارپائی پر اوندھا پڑا ہائے ہائے کررہا تھا لیکن غنیمت یہ تھا کہ وہ زندہ سلامت تھا۔ دو مزدور ٹائپ آدمی اس کی کمر دبارہے تھے۔ دو تین اس شگاف کے قریب کھڑے تھے جس میں اب دروازہ نہیں رہا تھا۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے گودام میں جھانکنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وسیم دوڑا دوڑا بن پٹ کے دروازے تک پہنچا اور اچھی طرح اندر کا جائزہ لے کر آیا گویا اسے توقع رہی ہو کہ کسی معجزے کے تحت اے ٹن اسے کہیں پڑا نظر آجائے گا۔ وہ جب چوکیدار کی طرف پلٹا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ چوکیدار اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر ذرا زیادہ زور سے ہائے ہائے کرنے لگا۔ اس کی پرانی سی تھری ناٹ تھری چارپائی کے سہارے کھڑی تھی۔

وسیم کے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ خود ہی صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں بولا۔ "وہ خانہ خراب کا بچی بھاگ گئی صاب!"

وسیم کی آنکھیں عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے عقب میں پہلے ہی کی طرح گول گول سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہ ادھیڑ عمر، بھاری بھرکم اور صاحب توند چوکیدار کو گھورتے ہوئے بولا۔ "کون بھاگ گئی؟" وہ گویا تحمل سے کام لینے کی کوشش کررہا تھا۔

"وئی دال خور کا بچی صاب! جس کو آپ اندر بند کرکے گیا۔" وہ کراہتے ہوئے بولا اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن پھر اس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے معذرت خواہانہ سی نظروں سے وسیم کی طرف دیکھا اور لیٹے لیٹے ہی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وہ طوفان میل تھی صاب! ام اپنی پوری زندگانی میں اتنا چھوٹے آدمی میں ایسا بلا کا مافق طاقت نئیں دیکھا۔"

"وہ کب ہوش میں آگیا تھا؟" وسیم نے بدستور اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے تو آپ کے جانے کے دو تین منٹ بعد ہی دوبارہ دروازے پہ ٹاکنگ شروع کردیا تھا صاب! ام اس کو بوت بولا کہ حرامخور کا بچہ! آرام سے بیٹھ..... مگر صاب! ذرا دیر بعد دروازہ ہمارے اوپر آگری۔ آپ امارا بات کا یقین کرو صاب! ہمارا تو کمر لخت لخت ہوگیا....." اس نے ایک بار پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر ہائے ہائے شروع کردی۔

"تم نے اس پر گولی نہیں چلائی؟" وسیم نے پوچھا۔

"بندوق امارا ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا صاحب! ام کو سنبھلنے کا موقع بھی نئیں ملا۔ وہ اور نظر آئی اور اور بجلی کا مافق گاڑی میں بیٹھ کر غائب ہوگئی..... اور پھر آپ ام کو بولا بھی نئیں تھا کہ گولی مارنا اے کہ نئیں مارنا اے..... ابی اگر ام کو خبر ہوتی کہ چوری ڈاکو اے تو ام ایک منٹ میں اس کو گولی مار کر لٹا دیتی..... ابی ام کو خبر نئیں تھی کہ وہ حرامخور کا بچی اے کون؟ ام سوچا کہ ام اس کو گولی مار دیتا اور آپ ام سے بولتا کہ ام کو تو وہ زندہ چاہئے..... تو ام کیا کرتی؟" اس نے گویا بہت اہم سوال اٹھاتے ہوئے جواب طلب نظروں سے وسیم کی طرف دیکھا۔

"چھوڑو یار! تم بالکل بے کار آدمی ہو۔" وسیم بدمزگی سے بولا۔

اب خان صاحب جوش میں اٹھ بیٹھے اور فرط جذبات سے وسیم کا ہاتھ زور سے پکڑتے ہوئے بولے۔ "امارا بے عزتی خراب مت کرو صاب! ابی ام کو بتاؤ..... جب سے ام اس کارخانے پر ملازم اے، کبھی تمارا کارخانہ یا گودام میں چوری ہوا؟ ڈاکا پڑا؟"

"نہیں۔ چوری وغیرہ تو نہیں ہوئی لیکن....."

"لیکن ویکن کو چھوڑو۔ چوکیدار کا کام اے جان مال کی حفاظت۔ وہ ام کرتی اے اور کرتی رہے گی۔ اس معاملے میں ام کو کچھ خبری نئیں تھا۔ تم اگر ام کو صحیح طرح بتاتا تو ام کچھ کوشش کرتا۔ ابی صبر کرو۔"

صبر تو واقعی صرف وسیم نے ہی نہیں، میں نے بھی کرلیا تھا۔ میں نے دروازے وغیرہ کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ چوکھٹ کچھ زیادہ مضبوطی سے دیوار میں نصب نہیں تھی۔ عام آدمی تو شاید دو تین بھی مل کر اسے دھکیل کر نہ اکھاڑ پاتے لیکن معاملہ اے ٹن کا تھا۔ اس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کیا کچھ کرسکتا تھا۔ ویسے اس چوکھٹ کو اکھاڑنا بہر حال ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ شاید میرے لئے بھی یہ کچھ ایسا مشکل کام نہ ہوتا۔ گودام میں رکھے ہوئے چپلوں اور ربڑ کے جوتوں کے بڑے بڑے کارٹن بھی تہ و بالا ہوچکے تھے، اِدھر اُدھر الٹے پڑے تھے۔

وسیم سر کھجاتے ہوئے بے چینی سے بولا۔ "تو کیا واقعی وہ میرے جانے کے بعد ہوش میں آگیا تھا؟ اور کیا واقعی یہ دروازہ اسی کی ٹکروں سے اکھڑا ہے؟"

"نہیں۔ شاید اس گودام میں رہنے والے کسی آسیب نے اس کی مدد کی ہو یا پھر وہ اپنی روحانی قوتوں سے کام لے کر نکل گیا ہو۔" میں نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔ "اب اس قسم کی باتیں کرکے اپنا اور میرا مزید دل نہ جلاؤ۔ مجھے اب اجازت دو۔" میں گودام سے نکل آیا۔

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں بولا۔ "سر! میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا لیکن پلیز آپ ناراض نہ ہوں۔ میں نے اپنی سی کوشش کی تھی....."

میں نے رک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "تم سے کس نے کہا کہ میں تم سے ناراض ہوں؟ تم نے جس حد تک کوشش کر ڈالی' مجھے تو تم سے اتنی بھی امید نہیں تھی۔ تم بہت باہمت اور باصلاحیت نوجوان ہو وسیم!" میں نے اس کا کندھا تھپکا۔

اس کا سینہ گویا کچھ چوڑا ہوگیا اور وہ ذرا تن کر کھڑا ہوگیا۔ قدرے بدلے بدلے سے لہجے میں بولا "سر! میری پہلی کوشش ناکام ہوگئی۔ کوئی بات نہیں۔ اس سے مجھے اس شخص کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ اب میں اس پر ہاتھ ڈالوں گا تو مار نہیں کھاؤں گا۔ آپ بے فکر.... یہ اطمینان رکھئے کہ یہ کام آپ اب میرے ہی ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچتے دیکھیں گے...." پھر وہ ذرا شرمیلے سے لہجے میں بولا۔ "اس موقع پر لفظ "پایۂ تکمیل" کا استعمال درست تھا نا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں.... میں خود کوئی ایسا زبان داں نہیں ہوں۔ میں نے تمہارا مطلب سمجھ لیا' بس یہی کافی ہے۔" میں نے پُرخیال نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم اس کام کو اب ذہن پر سوار رکھو۔ اب تو الٹا مجھے تمہاری جان کی فکر پڑ گئی ہے۔ وہ تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور تم اس کی نظر میں آگئے ہو۔ اب تو تم اپنی جان ہی بچائے رکھو تو میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔"

اس کے چہرے پر وہی بچوں جیسی حماقت آمیز معصومیت عود کر آئی اور وہ آنکھیں گھماتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ مجھے ڈرا کر اس کام سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں ڈرپوک نہیں ہوں۔ میں بہت بہادر ہوں۔ جس کام کا عہد کر لوں اسے کر کے چھوڑتا ہوں۔ موت سے نہیں ڈرتا میں۔ مجھے معلوم ہے زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

یہ بات کر کے اس نے مجھے لاجواب کردیا۔ اسی یقین کے سہارے تو میں خود ہر مصیبت سے ٹکرا جاتا تھا۔ میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وسیم! تم نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد تم میری زندگی میں ایک ایسے شخص آئے ہو جو بظاہر کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے ہے۔ اس کے باوجود میں تمہارے بارے میں فیصلہ نہیں کرسکا کہ تم کیا چیز ہو۔"

"سر! یہ فیصلہ تو میں خود بھی اپنے بارے میں نہیں کرسکا۔" وہ سر جھکا کر ذرا شرما کر بولا۔ "میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں خود بھی اپنی تلاش میں ہوں۔ میں آپ کے پیچھے اسی لئے زیادہ لگا رہتا ہوں کہ شاید آپ کی مدد سے میں اپنے آپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔"

"تم مجھے صرف یہ بتادو کہ کیا واقعی تم اتنے ہی بے وقوف ہو جتنے شکل سے نظر آتے ہو؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"سر! کوئی شخص بھلا خود اپنے بارے میں کیسے بتا سکتا ہے کہ وہ کتنا بے وقوف ہے؟" اس نے نہایت معصومیت سے سوال کیا۔ سوال واقعی معقول تھا۔ انسان کو گڑبڑا دینے والا تھا۔ پھر وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ "کون کہتا ہے میں بے وقوف ہوں یا شکل سے بے وقوف نظر آتا ہوں؟ آپ مجھ سے یقیناً مذاق کرتے ہیں سر! آپ یقیناً مجھے پیار سے بے وقوف کہتے ہیں۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ عقلمند نظر آنے کا دعویٰ کرنا بھی درحقیقت بے وقوف نظر آنے ہی کی ایک کوشش تھی۔ کیا وہ یہ کوشش شعوری طور پر کرتا تھا؟ کیا وہ اپنی عقلمندی کا دعویٰ کرتے وقت دل ہی دل میں کہہ رہا ہوتا تھا۔ "پلیز.... دیکھئے مجھ پر عقلمند ہونے کا شبہ مت کیجئے.... ساری دنیا کی طرح مجھے احمق ہی سمجھتے رہئے.... آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

مجھے خاموش دیکھ کر وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "میری امی تو کہتی ہیں میرے چہرے پر ذہانت برستی ہے۔ آنکھوں سے دانائی جھلکتی ہے۔ خصوصاً جب میں نے عینک لگائی ہوتی ہے۔"

"ماں کی بات چھوڑو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ماؤں کی تو نظر ہی دوسری ہوتی ہے۔ انہیں تو اپنے بدشکل بچے بھی حسین ترین نظر آتے ہیں۔ صورت سے چُغد دکھائی دینے والے بھی انہیں افلاطون معلوم ہوتے ہیں...." میں کہتے کہتے یکدم رک گیا۔ یہ تو ایک عام خیال' ایک مشہور نظریہ تھا۔ وسیم کے معاملے میں کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ جو کچھ وہ دنیا کی نظر سے چھپائے پھرتا تھا' ماں کی نظر اس تک پہنچتی ہو؟

مجھے نہیں معلوم' کیوں میں نے اس لمحے وسیم کو مزید کوئی نصیحت وغیرہ نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک طویل سانس لے کر میں نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "اچھا.... ٹھیک ہے۔ اگر اے نن تمہارے ہاتھ آتا ہے تو اسے ضرور پکڑنا۔ لیکن بس ذرا احتیاط رکھنا۔"

"یہ کی نا آپ نے ہمت بڑھانے والی بات۔" وہ باچھیں پھیلا کر بولا۔ "اب آپ جلد ہی اے نن کو اپنے قدموں میں دیکھیں گے اور امید ہے اس کے بعد آپ بڑے بڑے کام میرے سپرد کیا کریں گے۔"

مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا تاہم میں نے اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔ اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے سے پہلے میں نے چوکیدار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وسیم سے کہا۔ "اسے ذرا چیک اپ کے لئے ڈاکٹر کے پاس بھجوا دو۔ دروازہ اس کی کمر پر گرا ہے۔ کہیں زیادہ چوٹ نہ آئی ہو۔"

اس وقت تک چوکیدار کراہنا بند کرچکا تھا اور بڑی توجہ سے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ میری بات سنتے ہی اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ کراہنا شروع کردیا۔ وسیم سر ہلا کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "دیکھا آپ نے؟ یہ اصل میں چوٹ کا نہیں' شرمندگی کا درد ہے۔"

یہ چوکیدار اتنا ناکارہ نہیں ہے جتنا آج ثابت ہوا ہے۔ شاید اسے اپنے اس عظیم الشان جثے کو دیکھتے ہوئے یقین نہیں آرہا کہ وہ اتنا مختصر الوجود اور کسی بندر کا فرسٹ کزن نظر آنے والا شخص اس کے سامنے سے نکل گیا اور یہ کچھ بھی نہ کرسکا۔ اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لئے یہ ہائے ہائے کررہا ہے۔ اب میں اتنا احمق بھی نہیں کہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکوں۔"

"خیر۔ میرے خیال میں تو تم بڑے احمق ہو بھی نہیں۔" میں نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "لوگ میک اپ کرکے شکل بدلتے ہیں، تم نے اس طرح بدلی ہوئی ہے۔"

وہ خالص شاعرانہ انداز میں آداب بجالاتے ہوئے بولا۔ "ذرّہ نوازی اور بندہ شناسی ہے آپ کی۔ اگر آپ نے اسی طرح میری ہمت افزائی اور قدر شناسی جاری رکھی تو میں ضرور کچھ نہ کچھ بن جاؤں گا۔"

میں گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے گھر آگیا۔ اس کے بعد چند دن ذرا سکون سے گزر گئے۔ کاروباری مصروفیات کے علاوہ کوئی خاص مصروفیت نہ رہی۔ ایڈم عرف ایڈی نے بھی دوبارہ رابطہ قائم نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ وسیم نے اے ٹن کو پکڑنے کی جو کوشش کی تھی اس کے بارے میں ضرور وہ فون کرکے تصدیق کرنا چاہے گا کہ کیا یہ میری ہدایت پر ہوا تھا۔ لیکن اس کا فون نہیں آیا۔ خود اے ٹن نے بھی رابطہ قائم کرنے یا شکل دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری ہلچل زیرِ آب چلی گئی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔

ایڈم نے ہنی سے فون پر بات کرانے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس وعدے پر عمل نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس کے وعدے پر یقین بھی ذرا کم ہی تھا۔ مجھے ہنی کے بارے میں ذرا تشویش ضرور تھی لیکن ساتھ ہی نہ جانے کیوں امید سی تھی کہ وہ لوگ اس پر تشدد نہیں کریں گے۔ کم از کم اس حد تک ایڈم نے سچ ہی کہا تھا کہ غداری کے باوجود وہ ان کے لئے ایک قیمتی اثاثہ تھی۔ اس پر ان کی خاصی محنت ہو چکی تھی اور جن چیزوں پر وہ محنت کرچکے ہوتے تھے انہیں ضائع کرنے کے عادی معلوم نہیں ہوتے تھے۔

مجھے یہ سکوت اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ کاروباری مصروفیات اپنی جگہ تھیں لیکن ان کے دوران بھی ذہن بار بار دوسرے معاملات کی طرف چلا جاتا تھا۔ خصوصاً یہ احساس ایک بار پھر ستانے لگا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی سرا کسی صورت ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ پھر ایک روز مجھے اکرام بیگ یاد آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ خفیہ ایجنسیاں اس سے جو تفتیش کررہی تھیں اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ مجھ سے تو کسی نے کچھ پوچھنے کے لئے بھی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ فارن منسٹر حفیظ صاحب کے ذریعے اپنے آپ کو ہر معاملے سے بری الذمہ قرار دلوانے اور تفتیش سے مستثنیٰ رہنے کا فائدہ تو ہوا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ نقصان بھی تھا کہ مجھے اس معاملے سے بالکل لاتعلق کردیا گیا تھا۔

سرکاری ایجنسیوں کے وسائل بے شمار تھے۔ ان کے پاس بے پناہ تجربہ تھا، بیکراں اختیارات تھے۔ اگر میں ان کی تفتیش کے نتائج سے استفادہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو میری معلومات میں یقیناً کچھ نہ کچھ اضافہ ہو سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید انہوں نے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم کرلیا ہو۔ شاید وہ اس سلسلے میں صحیح راستے پر چل نکلے ہوں۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس ضمن میں سب سے پہلے اکرام بیگ سے ملاقات کرکے دیکھنا چاہئے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ میں نے اس کے لئے اِدھر اُدھر فون کئے تو پتا چلا کہ اسے ایک قلعے میں رکھا گیا ہے اور تفتیش جاری ہے۔ ڈی آئی جی صاحب بھی مجھے اس سے ملنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس کے لئے مجھے وزارتِ داخلہ سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا پڑے گا۔

یہ میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ حفیظ صاحب اس دوران غیر ملکی دورے سے واپس آچکے تھے اور اسلام آباد میں تھے۔ مجھے اسلام آباد فون کرکے ان سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔ پہلے میں نے ان سے پوچھا کہ انہیں سازش کی کوئی تفصیل معلوم ہوئی تھی یا نہیں؟

وہ عدم دلچسپی سے بولے۔ "برخوردار! میں آج ہی تو غیر ملکی دورے سے آیا ہوں۔ مجھے فرصت ہی نہیں ملی اس طرف توجہ دینے کی۔ ویسے بھی ابھی اس معاملے کو چند روز ہی تو ہوئے ہیں۔ سرکاری مشینری تو بعض اوقات ایسے معاملات میں برسوں الجھی رہتی ہے۔"

میں نے انہیں بتایا کہ میں اکرام بیگ سے ملنا چاہتا تھا اور اس کے لئے وزارتِ داخلہ کا خصوصی اجازت نامہ درکار تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "وہ میرا ڈیپارٹمنٹ تو نہیں ہے لیکن بہرحال میں اس منسٹری میں فون کردیتا ہوں۔ وہ بے چارے ہماری کوئی بات ٹالتے نہیں۔ تمہیں کل کوریئر سروس سے اجازت نامہ موصول ہو جائے گا۔ لیکن تم اس خبیث سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"سر! آپ تو اس معاملے میں کوئی دلچسپی لے نہیں رہے۔ میں نے سوچا، میں ہی جا کر دیکھ لوں کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم تو خود مجھے کوئی خفیہ ایجنسی معلوم ہونے لگے ہو۔" وہ بولے۔

"کیا کریں سر! ہم بے چارے عوام کو سرکار کے حصے کا بھی کچھ کام کرنا پڑتا ہے نا۔" میں نے جواب دیا۔

"چلو۔ تم اپنا شوق پورا کرلو۔" وہ خوشدلی سے بولے۔ "مجھے اپنے کچھ ضروری کوائف بتادو۔ تمہیں جو اجازت نامہ جاری کیا جائے گا اس میں وہ کوائف درج کئے جائیں گے۔" انہوں نے چند

باتیں پوچھیں جو میں نے انہیں بتادیں۔

دوسرے روز کوریئر سروس سے مجھے خط مل گیا اور میں اسی شام قلعے جا پہنچا۔ قلعے کا جو حصہ تفتیشی سیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا وہاں ایک دیو قامت اور سانولے سے ڈی ایس پی نے میرا استقبال کیا۔ اس کے آفس میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ سلاخوں والی کھڑکیوں سے بہت کم روشنی اندر آرہی تھی۔ اس کی میز کے گرد لکڑی کی بھاری بھرکم کرسیوں پر اسی جیسے سانولے اور کرخت صورت سے تین چار آدمی سر جھکائے کچھ پُراسرار سے انداز میں خاموش بیٹھے تھے۔

میرا اجازت نامہ دیکھ کر ڈی ایس پی سر اٹھاتے ہوئے ہلکی سی ناگواری سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اجازت نامہ آج سے ہی کارآمد ہے، پھر بھی اگر آپ ایک آدھ دن صبر کرلیتے اور ہمیں پیشگی اطلاع کردیتے کہ آپ فلاں قیدی سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، تو اچھا ہوتا۔ اس طرح اچانک ملاقات کے لئے چلے آنا تو اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کو معلوم ہے یہ خصوصی تفتیشی سنٹر ہے۔ ملک بھر میں مشہور ہے۔ ملزمان کے ساتھ اکثر تفتیش جاری رہتی ہے۔ بعض اوقات ملزم اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ اسے ملاقاتی کے سامنے پیش کیا جاسکے۔"

"اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ملاقات کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"نہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔" اس نے ایک لمحے توقف کیا۔ "آپ کوئی خاص ہی آدمی معلوم ہوتے ہیں جو آپ کو یہ اجازت نامہ جاری ہوا ہے۔"

"نہیں۔ میں تو بہت معمولی سا آدمی ہوں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

وہ ایک شخص کو اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ مجھے بس مختصر سی ملاقات ہی کرنی ہے۔ جہاں وہ ہے وہیں مل لوں گا۔"

ڈی ایس پی عجیب سے انداز میں مسکرا دیا۔ اس کی شخصیت کو ہیبت ناک حد تک بارعب کہا جاسکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ غیظ و غضب کی حالت میں کسی معمولی اور عام سے آدمی کی طرف دیکھ لیتا ہوگا تو اس کا پیشاب خطا ہوجاتا ہوگا۔

اس کے موٹے موٹے ہونٹ ایک لمحے کے لئے بھنچ گئے، پھر وہ میز پر ذرا جھکتے ہوئے بولا۔ "جہاں وہ ہے وہاں آپ نہ ہی جائیں تو اچھا ہے چوہدری صاحب۔ آپ سوٹ بوٹ پہننے والے معزز آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ مدتوں تک اپنے ملنے جلنے والوں کو افسانے سناتے رہیں گے۔ ویسے بھی اس اجازت نامے میں ہمیں اکرام بیگ سے صرف آپ کی ملاقات کرانے کا حکم دیا گیا ہے، آپ کو قلعے کی سیر کرانے کی ہدایت نہیں کی گئی۔ قلعے کے وہ حصے دوسرے ہیں جو سیر کرنے کے قابل ہیں اور عوام کے لئے کھلے ہیں۔ یہ ایک الگ دنیا ہے چوہدری صاحب! یہاں پہلو بہ پہلو دو الگ جہان آباد ہیں۔ یہ دوسری دنیا آپ کی نظر سے اوجھل ہی رہے تو بہتر ہے۔"

وہ اپنے ماتحت کے ساتھ باہر چلا گیا اور دیر تک واپس نہ آیا۔ اس دوران کمرے میں مختلف باوردی اور بے وردی لوگوں کی آمدورفت جاری رہی۔ بیشتر لوگوں کی صورتوں پر مجھے ایک عجیب سی کرختگی اور خشونت نمایاں محسوس ہوئی۔

ڈی ایس پی کمرے میں واپس نہیں آیا۔ کافی دیر بعد ڈھیلی ڈھالی ملیشیا کی شلوار قمیص والا ایک جلاد صورت سا آدمی اندر آیا اور سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "چوہدری محمد افضل آپ ہی ہیں نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ گویا میری آنے والی نسلوں پر احسان کرتے ہوئے بولا۔ "آیئے..... اکرام بیگ سے آپ کی ملاقات کرادیتے ہیں۔"

میں اس کی رہنمائی میں کمرے سے نکلا تو وہ مجھے ایک راہداری میں گھما کر اسی کمرے کے عقب میں ایک برآمدے میں لے گیا۔ وہاں دیواروں پر میل اور کائی سی جمی ہوئی تھی۔ نمی اس قدر تھی کہ کہیں کہیں پانی اوس کی طرح چمک رہا تھا۔ موسم ٹھنڈا نہیں تھا مگر

وہاں ایک عجیب سی نحوست، ایک عجیب سی یخ بستگی پھیلی ہوئی تھی جس کے اثر سے رگ وپے میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔
ملاقات کے لئے اکرام بیگ کسی خصوصی کمرے یا الگ جگہ پر نہیں، وہیں برآمدے میں ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے آس پاس بھی کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی جس پر بیٹھ کر میں اس سے بات کر سکتا۔ ملیشیا کی شلوار قمیص والا جلاد صورت سا آدمی چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیں جی..... کرلیں ملاقات..... زیادہ لمبی ملاقات مت کیجئے گا۔"
یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ میں اکرام بیگ کے سامنے دم بخود کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ چند ہی دن میں اس کی تو حالت بدل گئی تھی۔ پہلی نظر میں تو شاید اس کا کوئی پرانا شناسا بھی نہ جان پاتا کہ یہ وہی اکرام بیگ تھا جس کے وجود میں بجلیاں سی متقید محسوس ہوتی تھیں، جس سے عام آدمی کا آنکھ ملا کر بات کرنا مشکل تھا۔ جس کے لباس سے قیمتی فرانسیسی کلون کی مہک اٹھتی تھی۔
شاید اسے یہاں لانے سے پہلے تھوڑا بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کی کچھ صفائی ستھرائی کی گئی تھی لیکن اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کے بال گیلے تھے۔ چہرہ سوجا ہوا اور جگہ جگہ سے نیلا تھا۔ ہونٹ متورم اور کٹے پھٹے تھے۔ وہ اس طرح ٹانگیں پھیلائے، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا جیسے اس کے جسم میں جان نہ ہو۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہلنے کی کوشش کی لیکن بُری طرح کراہ کر رہ گیا۔
"میری ذلت کا تماشا دیکھنے آئے ہو چوہدری؟" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔
"بعض ذلتیں مقدر میں ہوتی ہیں لیکن میرا خیال ہے بعض خود بھی خریدی جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور میرے نظریئے کے مطابق موجودہ ذلت تم نے خود خریدی ہے۔ تم ایک نفیس انسان کے ساتھ بہترین عہدے پر کام کر رہے تھے۔ بہترین مراعات، سہولتیں اور دنیا بھر کی نعمتیں تمہیں حاصل تھیں۔ تم نے خود ان سب پہ لات ماردی۔"
"ہاں... مجھے یہ تسلیم ہے۔" اس کا لہجہ کچھ بدل گیا اور وہ مؤدبانہ کمر رو دینے والے انداز میں بولا۔ "میری حالت بہت خراب ہے..... مجھے یہاں سے چھڑا لیجئے چوہدری صاحب۔ آپ شاید تصور بھی نہیں کرسکتے کہ یہاں میرے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ میں زندہ کیسے ہوں! شاید بہت سخت جان تھا جو اب تک بچا ہوا ہوں۔ مجھے الٹا لٹکا کر نہ جانے کن کن چیزوں سے مارا گیا ہے۔ پلاس سے میرے ناخن کھینچے گئے ہیں..... جسم سے بال کھینچ کھینچ کر اکھاڑے گئے ہیں..... سگریٹوں سے داغا گیا ہے..... چھ چھ جگ پانی پلا کر موٹے موٹے آدمی جوتوں سمیت میرے پیٹ پر کودتے رہے ہیں اور وہ بھی اس انتظام کے ساتھ کہ پیشاب نہ نکلنے پائے۔ گھنٹوں مجھے برف کی سلوں پر لٹایا گیا..... میرے منہ پر غلاظت کے توبڑے باندھے گئے..... بجلی کے جھٹکے دیئے گئے..... اور بہت سی شرمناک باتیں ہیں جو میں آپ کو بتا نہیں سکتا..... میری ایک ٹانگ بھی ٹوٹ چکی ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ اگر مزید ایک دو دن مجھے صحیح طبی امداد نہ ملی تو میں عمر بھر کے لئے معذور ہو جاؤں گا..... شاید مر ہی جاؤں۔ کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں مر ہی چکا ہوں۔ نہ جانے آپ سے کس طرح باتیں کر رہا ہوں..... شاید صرف قوتِ ارادی کے سہارے۔ اب تو تکلیف کا احساس بھی مرچکا ہے۔ خدا کے لئے چوہدری صاحب.....!" وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔
شاید بصد کوشش اس نے بوجھل پپوٹے ذرا اٹھائے اور ایک بار پھر بہت ہی اذیت بھرے انداز میں کراہ اٹھا۔ میں سمجھتا تھا کہ غلط آدمیوں کے لئے میرا دل پتھر ہے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا اس پتھر کے کون کون سے گوشوں میں موم بھی دبا ہوا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کی لہر ابھری لیکن میں نے بہ دقت اسے دبادیا تاہم بات نرم لہجے میں ہی کی۔ "تمہیں جو کچھ معلوم ہے تم انہیں بتا کیوں نہیں دیتے؟"
"بتا چکا ہوں..... سب کچھ بتا چکا ہوں۔" اس کی آواز گویا کنویں کی گہرائی سے آرہی تھی۔ "لیکن شاید یہاں انسان کی بات کا اس وقت بھی یقین نہیں کیا جاتا جب وہ سسک سسک کر..... تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتا ہے۔ وہ فرمائش کرتے رہتے ہیں، اور بتاؤ ..... اور بتاؤ....."
"تم پولیس اور سی آئی اے وغیرہ میں نوکری کر چکے ہو۔ اب بھی تمہاری لائن کچھ ایسی ہی تھی۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "کئی بار یقیناً تمہاری وجہ سے..... تمہاری نشاندہی کی بنا پر کچھ نہ کچھ لوگ اسی طرح پکڑے گئے ہوں گے۔ ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہوگا۔ ان میں سے کچھ بے گناہ بھی ہوں گے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہوا ان پر اور ان کے لواحقین پر کیا گزری ہوگی؟ جبکہ تم تو بے قصور بھی نہیں ہو۔"
"آپ مجھے جو احساس دلانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ مجھے پہلے دن ہی ہو گیا تھا....." وہ کراہا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی جا رہی تھی۔ آواز اتنی مدّھم ہو چکی تھی کہ اس کی بات سننے کے لئے مجھے اکڑوں اس کے پاس بیٹھنا پڑا۔ وہ کربناک سی سرگوشی میں بولا۔ "مجھے ایسے ہی کسی بے گناہ کی بددعا لگی ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں بھی اس مشینری کے جبڑوں میں آسکتا ہوں جو انسانوں کو سڑک کے پتھر کی طرح پیس ڈالتی ہے۔ یہاں ایک آدمی ایسا بھی تھا جو کبھی میرے ماتحت کے طور پر کام کر چکا ہے۔ اس نے بھی میرا کوئی لحاظ نہیں کیا۔"
"تم نے انہیں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کیا بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ریڈ ڈاٹ ......؟ یہ کیا ہے؟" اس نے چونکنے کی کوشش کی مگر اس میں شاید اذیت کے سوا کوئی تاثر دینے کی سکت نہیں تھی۔

"کیا تمہیں واقعی ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں تو پہلی بار یہ نام سن رہا ہوں۔" اس نے کراہتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلانے کی کوشش کی۔ اس کی تین انگلیوں کے ناخن غائب تھے اور سوجا ہوا ہاتھ مُردوں کی طرح جھول رہا تھا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"مجھ میں اب جھوٹ بولنے کی سکت نہیں رہی۔" اس کی سرگوشی ابھری۔

"تو پھر تم نے کس کی ہدایت پر فارن منسٹر صاحب کو قتل کرنے کی سازش کی؟"

"سازش وغیرہ تو میں نے کوئی نہیں کی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ سازش کہاں تیار ہوئی۔ مجھے تو بس نوٹوں سے بھرے ایک بریف کیس نے مروادیا۔ ایک شخص نوٹوں سے بھرا بریف کیس لے کر میرے پاس آیا تھا۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ وہ سگار حفیظ صاحب تک پہنچنے دوں اور اگر وہ اسے پینے نہ پائیں تو میں کسی نہ کسی طرح ایسی صورتِ حال پیدا کروں کہ وہ پی ہی لیں۔ اس کے علاوہ میری ذمے داری صرف اتنی تھی کہ جو ویٹر سگار سرو کرے اسے خیرو عافیت سے وہاں سے نکل جانے دوں۔ بس صرف اس خدمت کے عوض نوٹوں سے بھرا وہ بریف کیس میرا تھا اور کام مکمل ہوجانے کے بعد اتنی ہی مزید رقم میرے لئے سوئٹزرلینڈ میں کھولے گئے ایک اکاؤنٹ میں منتقل ہوجانی تھی۔"

"لیکن ...... اکرام بیگ ......!" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری سروس کا ریکارڈ خاصا طویل ہونے کے باوجود بے داغ ہے۔ ایک عرصے سے تم حفیظ صاحب کے سیکیورٹی چیف ہو...... اور میری معلومات کے مطابق کچھ نہ کچھ عرصے کے لئے دوسری بڑی شخصیتوں کے سیکیورٹی کے عملے میں بھی شامل رہ چکے ہو۔ پہلے بھی تمہیں کبھی نہ کبھی ضرور اس قسم کی پیشکشوں کے ساتھ اپروچ کیا گیا ہوگا لیکن تم کبھی نہیں بکے۔"

"ہر آدمی کا بکنے کا ایک نہ ایک دن' ایک نہ ایک قیمت ہوتی ہے۔ جب وہ دن آتا ہے' وہ قیمت ملتی ہے' آدمی تبھی بکتا ہے......"

وہ دردناک سی آہ بھر کر بولا۔ "بعض لوگوں کی زندگی میں وہ دن کبھی نہیں آتا' وہ قیمت کبھی نہیں لگتی جس پر وہ بک سکتے ہیں۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے اور اس خوش قسمتی کی بدولت وہ "نہ بکنے والے لوگ" کہلاتے ہیں۔ قیمت اتنی بڑی تھی جتنا میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے سوئٹزرلینڈ میں بڑے لوگوں کے اکاؤنٹس کے صرف قصے سنے تھے...... نوٹوں سے بھرے بریف کیسوں کے تبادلے ہوتے دیکھے تھے...... لیکن اتنا بڑا کوئی بریف کیس بھر کر کبھی میرے سامنے نہیں رکھا گیا تھا...... سوئٹزرلینڈ میں کبھی میرے

"اکاؤنٹ" کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی...... اور پھر کام اتنا آسان تھا...... میں پھسل گیا...... میں نے اپنے آپ کو بیچ دیا...... حفیظ صاحب کو بیچ دیا جن کے مجھ پر کئی احسانات ہیں۔"

"اور پھسل کر تم کہاں پہنچے؟"

"تن ریزہ ریزہ لئے یہاں پڑا ہوں...... رگ رگ میں اذیتوں کے سمندر پھیل گئے ہیں...... رُواں رُواں ایک عجیب احساسِ ذلت میں جکڑا ہوا ہے۔ کاش میں مرہی جاتا۔"

"اور نوٹوں سے بھرا ہوا وہ بریف کیس کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں کس ایجنسی کے قبضے میں پہنچ چکا ہو...... اور معلوم نہیں کون کون اسے بانٹ کر کھا جائے۔ کاغذات میں نہ جانے اس کا ذکر آنے بھی پائے یا نہیں۔ شاید یہ کہانی کچھ اور ہی بن جائے۔ اگر ذکر آبھی گیا تو نہ جانے اس کی مالیت سکڑ کر کتنی رہ جائے۔ سروس کے دوران میں نے ایسے بہت سے تماشے دیکھے ہیں۔"

"تو پھر کیسا رہا تمہارا ایک جاتا؟" میں نے ملائمت سے دریافت کیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سر سینے پر جھکتا جا رہا تھا۔ اس سے زمین پر بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا اور پہلو بدلنے کی بھی اس میں کچھ زیادہ سکت نہیں تھی۔

ایک لمحے بعد اس نے بڑی ہی تکلیف کے سے عالم میں سر اٹھایا اور ورم زدہ نیلے حلقوں میں تقریباً چھپی ہوئی آنکھوں کو بہ مشکل ذرا سا کھولتے ہوئے بولا۔ "آپ کو میری کہانی پر یقین آگیا یا نہیں؟" اس کی آواز اب سرگوشی سے بھی مدھم تھی۔

"میں اس سلسلے میں ابھی اپنا فیصلہ محفوظ رکھوں گا۔" میں نے کوئی واضح جواب نہ دیا۔

"خدا کے لئے میری باتوں پر یقین کریجئے۔" وہ گویا سسک کر بولا۔ "مجھ میں اب مزید کوئی قسم کھانے کی سکت نہیں ہے۔ میں نے ٹارچر کے دوران اتنی قسمیں کھائی ہیں جو شاید زندگی بھر کے لئے کافی ہیں۔ بشرطیکہ میں زندہ بچ سکا۔"

"میں ایک بار پھر پوچھ رہا ہوں...... کیا تم واقعی ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟" میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے دریافت کیا۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے ہونٹ بھی زخمی تھے اور مسکراہٹ بھی۔ ڈوبتی سی آواز میں وہ بولا۔ "شاید آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا...... آپ بھی اس قلعے کے جلادوں کی طرح ہیں......"

"جب آدمی اپنا اعتبار کھودیتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بہرحال میں تمہاری باتوں پر یقین کرلیتا ہوں۔"

"تو پھر آپ میری رہائی کی کوشش کریں گے؟" اس کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں امید کی ایک موہوم سی کرن نمودار ہوئی۔ "میرے بیوی بچوں اور رشتے داروں کو تو معلوم بھی نہیں ہے کہ میں

ہوں کہاں۔ جب تک کسی کو پتا چل سکا.... اور جب تک میرے لئے قانونی یا طبی امداد کا کوئی بندوبست ہو سکا تب تک نہ جانے میرا کیا بن جائے....."

"یہ ایک مشکل کام ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں بہرحال اپنی سی کوشش کروں گا۔"

اسی لمحے اسے خون کی الٹی آگئی۔ اس میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ وہ کسی طرف کو جھک کر الٹی کر دیتا۔ اس کے کپڑے کچھ اور لتھڑ گئے۔ غلیظ خون گریبان میں چلا گیا۔ وہی کیم شیم اور سیاہ فام شخص جو مجھے وہاں چھوڑ کر گیا تھا' اچانک ہی نہ جانے کس طرف سے نمودار ہوا اور اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر ایک بچے کی طرح اسے جھٹکے سے' بیدردی کے ساتھ اٹھاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب آپ جائیں جی.... ملاقات کا وقت ختم ہو گیا...."

دوسری طرف سے اسی قبیل کا ایک اور شخص آیا۔ وہ دونوں اکرام بیگ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے اندر کی طرف لے گئے۔ آفس میں آکر میں نے ایک رجسٹر میں دستخط کئے' اپنے انگوٹھے کا نشان لگایا اور باہر آگیا۔ بوجھل دل کے ساتھ جب میں گاڑی میں بیٹھ کر قلعے کے عقب میں پہنچا تو ٹریفک معمول کے مطابق جاری تھا۔ وہی گاڑیوں اور انسانوں کا اژدہام تھا۔ وہی زندگی کی ہماہمی اور ہنگامہ خیزی تھی۔ بلند و بالا قلعے کی بن پٹ کی چھوٹی چھوٹی نیم تاریک کھڑکیوں اور کائی زدہ دیواروں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا کیونکہ وہ روز نظر آنے والی مانوس چیزوں میں شامل تھا۔ شاید کبھی کسی کو خیال بھی نہ آتا ہو کہ سیلن اور کائی زدہ ان دیواروں کے پیچھے' نیم تاریک کوٹھریوں اور یخ بستہ تہ خانوں میں کیسی دنیا آباد ہے۔

مجھے ڈیوس روڈ پر ایک آفس میں کچھ کام تھا۔ میرا ارادہ اسٹیشن کی طرف سے گھوم کر جانے کا تھا۔ دو موریہ پل کے قریب جب میں سگنل پر رکنے کے لئے گاڑی کی رفتار کم کر رہا تھا تو مجھے ایک خفیف سا جھٹکا لگا۔ سڑک کے کنارے کاؤ رائے کی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اے ٹن کسی فلمی ہیرو کے سے انداز میں کھڑا تھا۔ ظاہر ہے اس کی شخصیت کے ساتھ فلمی ہیرو والا انداز اپنے اندر ایک مضحکہ خیز تضاد رکھتا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ میں ادھر سے گزروں گا اور وہ میری گاڑی کے انتظار میں تھا۔ اس نے دور ہی سے مجھے دیکھ لیا اور ہاتھ ہلا کر رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ میں نے اس کی تلاش میں ہرکارے دوڑا رکھے تھے۔ اسے کسی نہ کسی طرح پکڑنے اور قابو میں کرنے کے احکامات جاری کر رکھے تھے اور وہ خود ایک پرہجوم سڑک پر' اڑتی ہوئی دھول میں کھڑا مجھے ہاتھ دے کر روک رہا تھا۔

میں نے گاڑی اس کے قریب لے جا کر روکی اور وہ کچھ اسی طرح دروازہ کھول کر میرے برابر آن بیٹھا جیسے ویران سڑک پر کھڑی کوئی مشکوک سی حسینہ کسی امیرزادے کی گاڑی میں بیٹھ گئی ہو۔

دروازہ بند کر کے اس نے ائرکنڈیشنڈ گاڑی کی خنکی میں گہری سانس لی اور پرسکون لہجے میں بولا۔ "شکر ہے یار چوہدری' تم جلدی ہی آگئے ورنہ میں سوچ رہا تھا' یہاں کی دھول مٹی پھانک پھانک کر میرا تو ناک منہ بند ہو جائے گا اور مجھے کانوں سے سانس لینا پڑے گا۔"

انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ میرا بے تکلف دوست تھا اور میں نے اسے وہاں ملنے کا ٹائم دیا ہوا تھا۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا لیکن وہ میری نظروں سے بے نیاز' اپنی جیب سے ایک نفیس سی کنگھی نکال کر اپنی لمبی لمبی زلفیں درست کرنے لگا۔

میں نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ کنگھی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے.... بہت چپ چپ ہو۔ کیا اکرام بیگ سے ملاقات خوشگوار نہیں رہی؟"

ایک لمحے کے لئے تو میری کھوپڑی گھوم گئی۔ آخر یہ لوگ کیا چیز تھے؟ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں اکرام بیگ سے ملاقات کے لئے گیا ہوں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں ادھر سے گزروں گا۔

"اکرام بیگ سے بہت کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں۔" میں نے یونہی کوئی خاص غور کئے بغیر ہوا میں تیر چھوڑا۔

وہ مجھے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے بولا۔ "اب تم جوان ہو چکے ہو۔ اب تمہیں اس طرح بچوں والے بلف نہیں کرنے چاہئیں۔ اکرام بیگ بے چارہ ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کسی کو کیا بتائے گا' جب اسے خود ہی کچھ معلوم نہیں۔ وہ تو قربانی کا بکرا تھا۔ سلاٹر ہاؤس پہنچ گیا۔"

میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اکرام بیگ نے مجھے جو کچھ بتایا ٹھیک ہی بتایا تھا۔ اے ٹن بالوں پر ہاتھ پھیر کر بڑی بے نیازی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دفع کرو اکرام بیگ کو۔ میں نے اس کے بارے میں جاننے کے لئے تم سے ملاقات کی زحمت نہیں کی۔"

"تو پھر کس لئے مجھے یہ اعزاز بخشا ہے؟" میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"اس چشمے والے بڈھے کو تم نے میرے پیچھے لگایا تھا؟" اس نے ہلکی سی خفگی سے پوچھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ وسیم احمد کی طرف تھا لیکن میں نے ایک بار پھر انجان بننے کی ہلکی پھلکی سی کوشش کر ڈالی حالانکہ مجھے معلوم تھا' اس مافوق الفطرت سے تودی کے سامنے اس قسم کی کوششیں بے کار ہی تھیں اور میں ان کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ کر ہلکی سی کھسیاہٹ بھی محسوس کرتا تھا۔ پھر بھی غیرارادی طور پر میں یکدم اعتراف نہیں کر پاتا تھا۔

"کون چشمے والا بُڈھا؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"ایک تو تمہیں غیر ضروری موقعوں پر انجان بننے کی بڑی عادت ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ اس نے تقریباً وہی بات کہہ دی تھی جو میں خود ہی محسوس کر رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس چُغد نے ایک لمحے کے لئے مجھے چکر دے دیا تھا۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ اس کی شکل چُغدوں جیسی تھی لیکن گودام میں بند ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں چوٹ کھا گیا ہوں۔ اس گدھے کو دیکھو.... بعد میں گودام میں گیس چھوڑ کر مجھے بے ہوش کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ یہ تم نے کس قسم کی چیزیں پال رکھی ہیں؟"

"پالنے والی اللہ کی ذات ہے.... میں کون ہوتا ہوں پالنے والا۔" میں نے درویشانہ لہجے میں کہا۔

"وہ تمہارے آدمیوں میں سے نہیں ہے؟" اے نن وثوق سے بولا۔ "تمہارے جو دو چار آدمی میں نے دیکھے ہیں وہ تو بڑی ٹھیک ٹھاک چیز لگتے ہیں۔ کام کے لوگ ہیں۔ لیکن اس بے چارے کو معلوم نہیں تم نے کس چکر میں میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ شکر کرو میرے ہاتھوں ضائع ہونے سے بچ گیا۔ آئندہ ایسی کسی مخلوق کو میرے پیچھے مت لگانا۔"

"تمہیں کیونکر خیال گزرا کہ اسے میں نے تمہارے پیچھے لگایا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمہارے سوا اس شہر میں اور کسے ہماری ذات سے اتنی دلچسپی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ چُغد مجھے گودام میں بند کرنے کے بعد دوڑا دوڑا تمہارے پاس ہی گیا تھا کیونکہ مجھے رپورٹ ملی ہے کہ بعد میں تم اسی جگہ اسی ہونق کے ساتھ دیکھے گئے تھے۔ میرا وہاں واپس جا کر اس چُغد کو اٹھا لینے کا ارادہ تھا لیکن جب مجھے پتا چلا کہ تم اس کے ساتھ دیکھے گئے ہو تو میں نے ایک سرد آہ بھر کر صبر کر لینا ہی بہتر سمجھا۔ میں ویسے بھی بلا ضرورت کسی کو ہلاک کرنا پسند نہیں کرتا اور وہ تو مخلوق ہی ایسی تھی کہ اسے ہلاک کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ترس آتا ہے۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ تمہارے حکم کا غلام دکھائی دیتا ہے تو اسے بالکل ہی بخشنا پڑا۔ آخر تم دوست ہو ہمارے۔ تمہاری حماقتیں ہم معاف نہیں کریں گے تو کون معاف کرے گا۔"

"آپ کا یہ احسان بندہ مرتے دم تک نہیں بھولے گا ظلِ الٰہی!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "بس یہی بتانے کے لئے آپ نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا تھا؟"

"نہیں۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ تم کیوں مجھ سے ملنے کے خواہشمند تھے اور اس کے لئے تمہیں ایسے الٹے سیدھے طریقے اختیار کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ تمہیں اگر اس خادم کی ضرورت ہو تو تم براہ راست مجھے طلب کر سکتے ہو۔ میں سر کے بل تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ بڑی محبت سے بولا۔

"پہلے کی طرح سب مشین گن سے گولیاں برساتے ہوئے آؤ گے یا رائفل کا بٹ مار کر کھوپڑی توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے؟" میں نے بدستور تلخی سے کہا۔

"ارے نہیں یار!" وہ ہنس کر بے تکلفی سے بولا۔ "اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ اب ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ وہ کچھ اور مراحل تھے۔ ان کا کچھ اور پس منظر تھا۔ تاہم اس وقت بھی تمہیں ہلاک کرنا مقصود نہیں تھا۔ اب حالات کچھ اور ہیں۔ اب تو تم ہی کچھ مار دھاڑ کرو گے تو کرو گے، ہمارا تو اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم ٹھنڈے دل سے ہمیں سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ ہم تو بڑے امن پسند لوگ ہیں۔"

"زیادہ اونچے درجے کے بدمعاش اور بین الاقوامی دہشت گرد اکثر یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ وہ بڑے امن پسند ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہماری امن پسندی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ آج تک تمہیں یا تمہارے کسی ساتھی کو ہمارے ہاتھوں کوئی گزند نہیں پہنچی۔"

"ابھی تم کہہ رہے تھے کہ اگر میں تمہاری ضرورت محسوس کروں تو تمہیں بلا سکتا ہوں۔ مگر کس طرح؟ میرے پاس تو تم سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ایڈم تو اکثر تمہیں فون کرتا رہتا ہے، اس سے کہہ دیا کرو کہ تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔ مجھے فوراً پیغام مل جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر تم مجھ سے ملنے جلنے میں زیادہ سنجیدہ دکھائی دیئے تو تمہیں ایسا ٹرانسیٹر بھی دیا جا سکتا ہے۔" اس نے اپنی جیکٹ کے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بٹن سائز میں ایک روپے کے سکے جتنا تھا۔ اے نن سے جب پہلی بار ٹکراؤ ہوا تھا تو ایسا ایک ٹرانسیٹر میرے ہاتھ لگ چکا تھا جسے میں نے کھول کھال کر دیکھنے میں خراب کر دیا تھا۔

اے نن کے انتہائی مکار ہونے میں تو مجھے کوئی شک ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ مجھے کوئی ایسی چیز نہیں دے سکتا تھا جس سے مجھے ان لوگوں کا سراغ پانے میں کوئی مدد مل سکتی۔ ایک بار ایڈم مجھ سے فون پر بات کر رہا تھا تو میں نے معلوم کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کس نمبر سے بول رہا ہے.... اور اس حیرت انگیز انکشاف نے مجھے چکرا دیا تھا کہ وہ کسی ایسے نمبر سے بول رہا تھا جس کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔

میں نے جلے کٹے سے انداز میں کہا۔ "بس رہنے دو۔ اب تم اتنے حسین بھی نہیں ہو کہ میں تم سے ملنے کی آرزو میں تڑپنے لگوں۔"

"وہ وقت آنے ہی والا ہے جب تم ہم سے ملنے کی آرزو میں تڑپنے لگو گے۔" وہ کسی بندر کی طرح مسکراتے ہوئے بولا۔

"خدا مجھے وہ وقت نہ دکھائے۔" میں نے بہ آواز بلند اور صدق دل سے دُعا کی۔ اسی دوران ڈیوس روڈ پر اس دفتر کی عمارت آگئی جس میں مجھے کام تھا۔ میں نے گاڑی اس کی طرف موڑنے سے پہلے رفتار بالکل کم کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس عمارت میں کام ہے۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

اس کا استخوانی ہاتھ کسی آہنی پنجے کی طرح اسٹیئرنگ وہیل پر آن جما اور وہ ہموار لہجے میں بولا۔ "سیدھے چلتے رہو۔ اپنا کام کسی اور وقت پہ اٹھا رکھو۔"

"تمہیں کیونکر یقین ہے کہ میں تمہاری بات مان لوں گا؟" میں نے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔

"میری بات ماننے کے سوا تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ تمہاری گاڑی کے نیچے ایک ریموٹ کنٹرول پلاسٹک بم چپکا ہوا ہے۔ ریموٹ کنٹرول جس جگہ موجود ہے وہاں تم کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں ہماری اس تمام گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا جا رہا ہے اور اگر اس گفتگو کا اختتام میرے بولے ہوئے ایک کوڈ ورڈ پر نہ ہوا تو بم پھٹ جائے گا۔ اگر اس بم کو وہاں سے الگ کرنے کی کوشش کی گئی تب بھی وہ پھٹ جائے گا۔ اسے وہاں سے بہ حفاظت الگ کرنے کا طریقہ صرف مجھے معلوم ہے۔ میرے کوڈ ورڈ کے بغیر اگر تم نے گاڑی سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی تب بھی بم پھٹ جائے گا۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ تم بھی تو مرو گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری تو کوئی بات نہیں۔ میں تو اپنی طبعی عمر پوری کر چکا ہوں۔ بونس میں جی رہا ہوں لیکن تمہاری اس نئی نئی اور کارآمد جوانی کے ضائع جانے کا تو ایک زمانے کو افسوس ہوگا۔" وہ تنبیہانہ لہجے میں بولا۔ "اور اس بات کو اپنے بلف کی طرح مت سمجھنا۔"

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ رسک نہیں لینا چاہئے۔ ذرا آگے جا کر میں نے کہا۔ "تم لوگ الیکٹرونکس میں بہت آگے ہو۔"

"ہم ہر چیز میں بہت آگے ہیں۔ میل جول بڑھے گا تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہم تمہیں بھی بہت آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ صرف تمہارا ذہن تھوڑا سا بدل جانے کا انتظار ہے۔"

"میں پہلے بھی کئی مرتبہ پوچھ چکا ہوں' آخر مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"بہت جلد ہمارے بڑے تم سے آمنے سامنے بیٹھ کر بات کریں گے اور بس اب وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔ میں یہ باتیں کرنے کا مجاز نہیں ہوں اور مجھے کچھ زیادہ معلومات بھی نہیں ہیں۔"

"تو پھر تم میری گاڑی میں سوار کیوں ہوئے تھے؟ محض کچھ دیر بکواس کرنے کے لئے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"یہ بکواس نہیں۔ یہ سب ضروری باتیں ہوتی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ اتنی فضول باتوں کے لئے تم اتنا اہتمام کرتے ہو۔ کہیں گاڑی کے نیچے ریموٹ کنٹرول بم لگاتا اور کہیں کوڈ ورڈ طے کرنا۔" میں نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔

"ہمارے لئے یہ تقریباً معمول کے کام ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "تم سے ملتے وقت تھوڑی بہت احتیاط تو رکھنی پڑتی ہے۔ تمہارے بارے میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ تم کب کیا کر گزرو۔"

"میری نقل و حرکت کے بارے میں باخبر رہنے کے لئے میرے خیال میں تم لوگ الیکٹرونکس سے ہی سب سے زیادہ مدد لیتے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اس کے علاوہ بھی بہت سے ذرائع ہیں۔" وہ بے نیازی سے بولا "ادھر موڑ لو۔" اس نے پی آئی اے آفس سے اپہال کی طرف مڑنے کا اشارہ کیا۔

"ارادے کیا ہیں؟ مجھے اغوا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ اس کی ہنسی میں بھی بندر کی خرخراہٹ کی جھلک تھی۔ "تمہیں ہم بقائمی ہوش و حواس اور جاگتی آنکھوں کے ساتھ اغوا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہمارے بھی نہ جانے کس کس توپ کو لے بیٹھو۔ اور خود کو بھی ہلاکت میں ڈالو گے۔"

پھر وہ تحسین آمیز لہجے میں بولا "تمہارے اعصاب کی مضبوطی کا تو میں شروع سے قائل ہوں۔ اس وقت کچھ اور قائل ہو گیا ہوں۔ تم ایک ایسی گاڑی میں سفر کر رہے ہو جس کے نیچے بہت طاقتور پلاسٹک بم فٹ ہے۔ تمہیں کوئی خوف یا بے چینی محسوس نہیں ہو رہی؟"

"خوف یا بے چینی کا کیا فائدہ؟" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "اوپر والے نے اگر موت لکھی ہوگی تو اسے میں روک نہیں سکتا۔ اور پھر میرے ساتھ تم بھی تو ہو۔ اگر مرا تو تمہیں ساتھ لے کر ہی مروں گا۔"

"بس یہیں روک دو۔" اچانک اس نے ایک جگہ سڑک کے کنارے موجود درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے گاڑی وہیں گھنے اندھیرے میں روک دی۔ ایک لمحے کے لئے ہم دونوں بالکل ساکت بیٹھے رہے۔ صرف انجن کی نہایت ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔

"تم پر کیا فالج گر گیا ہے؟" بالآخر میں نے پوچھا۔

وہ میرے الفاظ پر دھیان دیئے بغیر بولا "سیون کلر کی ایک کرولا ہمارے تعاقب میں تھی۔ لیکن وہ آگے نکلتی چلی گئی ہے اور غائب ہو چکی ہے۔ واپس بھی نہیں آئی اور آگے جا کر بھی کہیں

نہیں رکی۔ کیا اس میں تمہارا کوئی تھا؟"

"خطرات جوں جوں بڑھ رہے ہیں، میں نے حفاظتی انتظامات اتنے ہی کم کر دیئے ہیں۔" میں نے جواب دیا "میں نے اب اپنے آدمیوں کو اپنے تعاقب میں رہنے سے منع کر دیا ہے۔"

"بہت خوب۔ بالکل ٹھیک کیا تم نے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔"

"اگر وہ میوں کو لا غائب ہو چکی ہے تو تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہمارے تعاقب میں نہیں تھی۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"میں بھی اب اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا "میں اب تمہاری گاڑی کے نیچے گھس کر ازراہِ مہربانی وہ پلاسٹک بم اتاروں گا لیکن اس دوران تم دور جا کر گن وغیرہ سے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرنا۔ تم خود نقصان میں رہو گے۔ اس طرح کا ارادہ بھی مت کرنا۔ اگر تم گاڑی سے اترے تو میں بم اتارنے کا کام درمیان میں ہی چھوڑ دوں گا اور تمہارا خدا ہی حافظ ہو گا۔"

"وہ تو اب بھی ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کسی ناقابلِ فہم سی زبان میں چند الفاظ بولے۔ وہ غالباً اس کے کوڈ ورڈز تھے۔ پھر وہ اترا اور سانپ کی طرح گاڑی کے نیچے گھس گیا۔ کافی دیر تک وہ گاڑی کے نیچے سے نہ نکلا۔ یوں خالی بیٹھے بیٹھے مجھے تناؤ سا محسوس ہونے لگا۔ صورتِ حال مجھے کچھ مضحکہ خیز بھی لگ رہی تھی۔ میں کتنی سعادت مندی سے اے نن کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر ہنسی آگئی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے اس کی ہر بات پر یقین کرنا چاہئے تھا یا نہیں؟ لیکن فی الحال اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اب میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بم اتارنے کے بجائے درحقیقت اب بم نصب کر رہا ہو؟"

پھر میں نے اپنے آپ کو پہلے کی طرح تن بہ تقدیر چھوڑ دیا اور کھڑکی سے سر نکال کر ذرا بلند آواز میں شگفتگی سے پوچھا "اے نن! تم زندہ بھی ہو یا فوت ہو چکے ہو؟"

"بے صبری مت کرو یار!" اس کی گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ "یہ بڑا نازک معاملہ ہے اور یہاں روشنی بھی نہیں ہے۔ میں نے منہ سے ٹارچ پکڑی ہوئی ہے۔"

چند لمحے بعد بالآخر وہ گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں چپٹا سا ایک مستطیل ڈبا تھا جس کے ساتھ کچھ تاریں اور فیوز نما باریک سی چیزیں جھول رہی تھیں۔

"اب یہ بے ضرر ہو چکا ہے۔" وہ ڈبا ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے بولا۔ اس کا دوسرا ہاتھ پشت پر تھا۔ پھر اس نے وہ ڈبا کچھ دور نشیب میں بہتی ہوئی نہر میں پھینک دیا۔

"لیکن بم کے خطرے سے نجات پاتے ہی کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے پر مت تُل جانا۔" وہ فوراً ہی پیچھے کیا ہوا ہاتھ سامنے لاتے ہوئے بولا۔ اس ہاتھ میں عجیب سی ساخت کا ایک ریوالور تھا۔ جس کی نال بہت موٹی تھی۔

"بڑی خوفناک گن ہے یہ۔ اس کی گولی جسم میں بالشت بھر چوڑا سوراخ کر دیتی ہے۔ گولی چھو کر بھی گزر جائے تو موت یقینی ہو جاتی ہے۔" وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔

میں ساکت کھڑا رہا۔ جونہی اس نے ڈبا نہر میں پھینکا تھا، مجھے بلاشبہ ایک لمحے کے لئے خیال آیا تھا کہ مجھے کچھ کرنا چاہئے لیکن اس شخص سے کسی کچے پن کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

اسی اثنا میں مجھے درختوں کے عقب سے ایک شخص جھومتا ہوا سا اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ہیولے سے وہ دبلا پتلا ہی معلوم ہوتا تھا۔ درختوں کے عقب میں ڈھلوان کچی زمین تھی جو سرسبز گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اسی مختصر سی ڈھلان پر چڑھ کر وہ سڑک کے کنارے آگیا اور کچی مٹی پر چلتا ہوا بے پروائی سے سیٹی بجاتا ہوا ہماری طرف آنے لگا۔

اب میں اسے ذرا صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے۔ سر پر فلیٹ ہیٹ تھا اور آنکھوں پر کچھ ایسا ابھرا ہوا سا تاریک چشمہ تھا جیسے کولہو کے بیل کی آنکھوں پر کھوپے چڑھے ہوں۔ پتلی اور لٹکی ہوئی فوانچو کٹ مونچھیں تھیں۔ انہی سے میل کھاتی پتلی اور نوکیلی سی داڑھی تھی جو صرف ٹھوڑی تک محدود تھی۔ وہ سیاہ جیکٹ اور پتلون میں تھا۔ بغل میں چھڑی دبی ہوئی تھی جیسی عموماً پرانے زمانے میں شرفا چہل قدمی کے لئے جاتے وقت بغل میں دبا لیتے تھے۔ حالانکہ چلتے وقت اس سے سہارا لینا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ پرانی فلموں کا جوکر یا کامیڈین سی معلوم ہو رہا تھا۔

اے نن نے اسے آتے دیکھ کر گن جیب میں ڈال لی لیکن اس کا ہاتھ بھی اس کے ساتھ ہی جیب میں رہا۔ جوکر نما اس شخص کے ہونٹوں کے گوشے میں سگریٹ جھول رہی تھی جو سلگی ہوئی نہیں تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ سیٹی کس طرح بجا رہا تھا۔ ہونٹوں کے گوشے میں سگریٹ دبا کر سیٹی سے اچھی خاصی دُھن الاپنا ذرا مہارت کا کام تھا۔ اے نن شک زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ میری طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔ میں یقیناً اس کی جیب میں موجود گن کی زد پر تھا۔

قریب آکر جوکر نما شخص رک گیا اور خواہ مخواہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا "ماچس ہو گی آپ کے پاس؟" اس کی آواز عجیب سی تھی۔ کچھ بیٹھی بیٹھی سی۔ کچھ پھٹی پھٹی سی۔

میری جیب میں لائٹر موجود تھا حالانکہ میں سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن میں نے لائٹر نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ نہیں ڈالا۔ مبادا اے نن یہ نہ سمجھ لے کہ میں گن نکالنے لگا ہوں۔

"معاف کیجئے گا' میں سگریٹ نہیں پیتا۔" میں نے شائستگی سے کہا۔

"اور میں بھی..." اے نن نے فوراً کہا "لیکن دوسروں کی سگریٹ سلگانے کا بندوبست رکھتا ہوں۔" اس نے وہی بات کی تھی جو کبھی کبھار میں بھی کرتا تھا۔

اس نے بائیں ہاتھ سے جیب سے ایک خوبصورت لائٹر نکالا اور اجنبی کی سگریٹ کو شعلہ دکھایا۔ میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کا اصل مقصد سگریٹ سلگانا نہیں' اجنبی کے چہرے کا روشنی میں جائزہ لینا تھا۔ نہایت آہستگی سے وہ مجھ سے مزید ایک قدم دور کھسک گیا تھا تاکہ ایک ہی گن سے ہم دونوں کو کور کر سکے تاہم گن ابھی تک اس کی جیب میں ہی تھی۔

اجنبی کی سگریٹ سلگانے کے بعد اس نے لائٹر بجھاتے ہوئے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا "بہت ہی گھٹیا قسم کا میک اَپ ہے تمہارا۔"

میں بھی دیکھ چکا تھا کہ اجنبی کی داڑھی مونچھیں اور گال پر موٹا سا مَسا وغیرہ نقلی تھا لیکن میں نے فی الحال خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ صرف یہی نہیں ہیٹ اور عجیب سا تاریک چشمہ بھی تھا۔ کچھ صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ ان چیزوں کے بغیر اس کی صورت کیسی ہوگی۔

وہ اگر اے نن کی بات کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس کا مشکوک قرار پانا یقینی ہو جاتا لیکن اس نے پہلے ہی کی طرح باچھیں پھیلا دیں اور ذرا بھی چونکے یا نروس ہوئے بغیر اسی بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا "خیر ہو آپ کی..." اس کی آواز کچھ ایسی تھی جیسی عام طور پر ان لوگوں کی ہو جاتی ہے جنہیں زیادہ چیخ چیخ کر بولنا پڑتا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے تاثرات بدل گئے۔

وہ سگریٹ کا ایک کش لگا کر بے حد غمناک سے لہجے میں بولا "آپ تو خیر خاصے جہاندیدہ اور معزز سے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ میرے میک اَپ کو تو اگر دن میں دس سال کا بچہ بھی دیکھ لے تو وہ بھی پہچان لیتا ہے کہ یہ چیزیں نقلی ہیں..."

اے نن لائٹر جیب میں رکھ چکا تھا۔ بائیں ہاتھ سے یکدم وہ اجنبی کا بازو پکڑتے ہوئے پھنکارا۔ "کون ہو تم؟"

مجھے اندازہ تھا کہ اس کی گرفت میں اجنبی کے بازو کا کیا حال ہوگا۔ اجنبی یکدم سہم گیا۔ وہ گھگھیائی ہوئی سی آواز میں بولا "مائی باپ! آپ ایک دم کیوں غصے میں آگئے؟ آپ کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو گئی؟ میں تو خود آپ کو یہی بتانے لگا تھا کہ میں کون ہوں۔ حضور! آپ کے بچے جئیں... میں تو تھیٹر کا ایک معمولی سا... میں روپے دہاڑی والا ایکٹر ہوں..."

اب مجھے احساس ہوا کہ واقعی اس کی آواز اور لب و لہجہ تھیٹر کے روایتی سے ایکٹروں والا ہی تھا۔ وہ تقریباً گڑگڑاتے ہوئے بولا "سرجی! میں تو آپ کی تھوڑی سی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے رکا تھا... آپ تو الٹا مجھ پر گرم ہونے لگے..."

"تھیٹر کے ایکٹر نقلی داڑھی مونچھیں لگائے سڑکوں پر نہیں پھرتے۔" اے نن غرّایا لیکن اب اس کے لہجے میں پہلے جیسی سختی نہیں تھی۔

"یہی تو میں آپ کو بتانے لگا تھا جناب عالی! میں تو آپ کو اپنی مظلومیت کی کہانی سنانا چاہتا تھا۔" وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔

"ہمارے پاس کہانی سننے کا ٹائم نہیں ہے۔ مختصر بات کرو۔" اے نن نے حکم دیا اور ساتھ ہی اس کی جیبیں وغیرہ تھپتھپا کر دیکھیں۔ "کیا واقعی تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے؟"

"ہتھیار...؟" اجنبی کراہ کر بولا گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ اس بات پر ہنسے یا روئے۔ "بائی گاڈ! میری جیب میں روٹی کھانے کو پیسے نہیں ہیں' آپ ہتھیار کی بات کر رہے ہیں۔"

"جن کی جیب میں روٹی کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے' کبھی کبھار وہ بھی ہتھیار اٹھا لیا کرتے ہیں۔" اے نن بولا۔ اب اس کے لہجے میں سختی نہیں رہی تھی۔

"یہی تو میں آپ کو بتانے لگا تھا جی۔ ہم جیسے بے کار لوگوں میں اس کا بھی حوصلہ نہیں ہوتا۔" وہ اب گویا کچھ سنبھلتے ہوئے بولا' "پانچ سال ہو گئے ہیں جی تھیٹر کی... فن کی خدمت کرتے ہوئے۔ ابھی تک چار چھ لائنوں والے رول ملتے ہیں اور ان کے لئے بھی بعض اوقات میک اَپ مین کو ہمارا تو ٹیک اَپ کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ جس ڈرامے کی کاسٹ ذرا لمبی ہو' اس میں میک اَپ مین بڑے آرام سے کہہ دیتا ہے۔ یار! عمو بادشاہ! تم تو گھر سے ہی کوئی سی بھی داڑھی مونچھ لگا کر آجانا۔ تمہاری طرف کون سا کسی نے غور سے دیکھنا ہے' چنانچہ جناب... اکثر ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔"

پھر وہ اپنی فوانچوکٹ مونچھ درست کرتے ہوئے بولا "اب آج کل جو آرٹس کونسل میں ڈرامہ چل رہا ہے نا' چھ حوالے' اس کی کاسٹ پوری بارات جتنی لمبی ہے۔ میں اس میں تھانیدار کا رول کر رہا ہوں۔ چار لائن کا رول ہے... اب ذرا ملاحظہ فرمائیں یہ داڑھی مونچھیں میں تھانیدار کے رول کے لئے لگا کر جا رہا ہوں۔ تھانیداروں کی ایسی مونچھیں یا ایسی داڑھی آپ نے کبھی دیکھی ہے؟ لیکن میں کیا کروں... گھر میں کوئی بارعب قسم کی داڑھی مونچھیں موجود ہی نہیں تھیں۔ میں نے سوچا چلو یہی لگا لو... کچھ کامیڈی ہی پیدا ہو جائے گی۔ شکر ہے وردی تو پروڈکشن والوں سے مل جاتی ہے۔"

پھر اچانک اسے جیسے خیال آیا اور وہ ذرا چونک کر امید بھرے لہجے میں بولا "آپ لوگوں نے دیکھا ہے یہ ڈرامہ؟ چھ حوالے' میرا رول ہے تو چار لائن کا... لیکن بڑی جان ہے اس میں۔"

"نہیں بچہ! ہمارے پاس ڈرامے اور مسخروں کی اچھل کود وغیرہ دیکھنے کے لئے وقت نہیں ہے۔" اے نن نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور وہ اسے سہلانے لگا۔

"اگر آپ پسند فرمائیں اور میرے ساتھ چلیں تو میں دو پاس آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ مجھے ذرا آپ کی گاڑی میں لفٹ مل جائے گی۔ ورنہ ابھی مجھے مال تک پیدل جا کر کسی سے لفٹ لینی پڑے گی۔"

"ابے چل... اپنا کام کر۔" اے ون نے اسے دھکا دیا۔

"واہ میرے مولا...!" وہ آسمان کی طرف دیکھ کر فریادی سے انداز میں بولا "ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی زمانے میں فنکاروں کی یہ بے قدری ہوگی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر چھڑی لہراتا آگے چل دیا لیکن دوسرے ہی لمحے پھر پلٹ پڑا۔

"معاف کیجئے گا... باتوں باتوں میں سگریٹ ہی بجھ گئی۔ ذرا پھر زحمت کیجئے گا۔" اس نے بجھی ہوئی سگریٹ دکھائی۔

اے ون نے غالباً اسے ڈانٹ کر بھگانے کا ارادہ کیا لیکن پھر ہونٹ بھینچ کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب وہ اسٹیج آرٹسٹ کی طرف سے بالکل بے پروا ہو چکا تھا۔ اس کی زیادہ توجہ صرف مجھ پر تھی لیکن یہ میں بھی نہیں دیکھ سکا کہ کب اسٹیج آرٹسٹ کا ہاتھ بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور دوسرے ہی لمحے اے ون پٹ سے زمین پر پڑا تھا۔

اسٹیج آرٹسٹ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی اتنی پھرتی سے اس کے سر پر رسید کی تھی کہ میری آنکھیں بھی صحیح طور پر اس حرکت کو نہیں دیکھ سکی تھیں۔ اس حرکت کا ردِ عمل بھی میرے لئے ناقابلِ یقین تھا۔ میرے خیال میں اگر اے ون کی کھوپڑی پر چھڑی زیادہ زور سے رسید کی جاتی تو چھڑی ٹوٹ جانی چاہئے تھی اور اے ون کو زیادہ سے زیادہ کچھ لڑکھڑا جانا چاہئے تھا۔ اس کا یوں پٹ سے گر جانا میرے لئے ناقابلِ فہم تھا۔ میں تو خود یہ سوچ کر اب اس پر کچا ہاتھ نہیں ڈالتا تھا کہ اس سخت جان مخلوق پر اگر کوئی وار کیا جائے تو وہ پوری طرح کارگر ہونا چاہئے۔

"کمال کر دیا تم نے وسیم احمد!" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسا نپا تلا وار کر سکتے ہو... اور وہ بھی اے ون پر۔"

"تو آپ نے مجھے پہچان لیا؟" وہ اپنے بہروپ میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں" میں نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا "پہلے تو نہیں پہچانا تھا لیکن جب تم آگے روانہ ہوئے تو اپنی اصل چال چلنے لگے۔ میں نے تمہاری چال سے تمہیں پہچانا۔ لیکن ان چند معمولی سی چیزوں نے واقعی تمہاری صورت یکسر تبدیل کر کے رکھ دی ہے۔ آواز بھی تم نے بڑی عمدگی سے بدل لی تھی... لیکن سب سے زیادہ میں تمہارے نفسیاتی حربے سے متاثر ہوا ہوں۔ تم نے کمال یہ کیا کہ ایسی معمولی چیزوں سے مدد لی جو صاف طور پر نقلی نظر آ جائیں... اور فوراً ہی اس بات کو تسلیم بھی کر لیا۔ کہانی بھی اچھی گھڑی... اور لہجے میں بھی کمال کا اعتماد تھا... اگر تمہارا میک اَپ زیادہ عمدہ ہوتا اور تم زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرتے تو تمہاری ایک نہ چلتی۔ تم نے اپنی اصل شکل کی طرف توجہ جانے ہی نہیں دی۔ بعض اوقات سادہ ترین طریقۂ کار ہی عمدہ ترین طریقۂ کار ہوتا ہے۔"

"معلوم نہیں سر!" وہ شرمیلے سے لہجے میں بولا "میں تو زیادہ باریکیوں سے واقف نہیں ہوں۔ میں نے تو اس لئے ان چیزوں کی مدد لی تھی کہ میرے پاس ان کے سوا کچھ تھا ہی نہیں... احتیاطاً اپنے ساتھ صرف یہی لئے پھر رہا تھا۔ گاڑی بھی ایک دوست کی لی ہوئی تھی۔ کیونکہ یہ بندر کا بچہ میری گاڑی پہچاننے لگا تھا۔ اگر میں اس میں اس کا تعاقب کرتا تو یہ فوراً کھٹک جاتا۔"

"کھٹک تو اب بھی گیا تھا۔ لیکن تم نے اچھا کیا کہ بہت آگے نکل گئے۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔" میں نے کہا۔

"میں نے تو اتنی احتیاط کی کہ واپس بھی اس گاڑی میں نہیں آیا۔ لفٹ لے کر آیا ہوں... اور خاصی دور سے آپ کو دیکھ کر باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔"

"تم نے کہاں سے پڑے؟" میں نے پوچھا۔

"جب سے یہ میرے ہاتھ آ کر نکل گیا تھا' میرا ذہن اسی میں پھنسا ہوا تھا۔ میں تو پاگل سا ہو گیا تھا۔ شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ پتا نہیں میں نے کتنا پٹرول پھونک ڈالا' ٹائر گھسا ڈالے۔ بہرحال اتنی سچی طلب اور لگن کے ساتھ انسان کسی کو ڈھونڈ رہا ہو تو وہ مل ضرور جاتا ہے۔" وہ اپنے نظر کے چشمے پر سے وہ تاریک شیشے اتارنے لگا جو اس نے کلپ کے ذریعے لگائے ہوئے تھے۔ پھر اس نے داڑھی مونچھیں اور ہیٹ اتارا۔ یکدم ہی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی جگہ کوئی اور نوجوان آن کھڑا ہوا ہو۔ اب وہ وہی پہلے والا وسیم احمد تھا۔

میں نے اس کی بغل میں دبی ہوئی چھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جادو کی چھڑی معلوم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں تو اے ون کے سر پر چھڑی مار کر اسے نہیں لٹایا جا سکتا تھا۔"

"یہ چھڑی کہاں ہے سر!" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "یہ تو ٹھوس اسٹیل کی راڈ ہے۔ مجھے تو اے ون سے زیادہ واسطہ نہیں پڑا لیکن جب یہ گودام کا دروازہ توڑ کر بھاگا تھا تو مجھے بھی کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔"

"اسٹیل کی راڈ؟" میں نے دُہرایا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ بوڑھے نظر آنے والے' چھریرے جسم کے اس نوجوان کا وار بھی معمولی نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اے ون پر جھکتے ہوئے کہا' "میں تو تم سے باتوں میں لگ گیا۔ اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ کہیں دنیا سے گزر ہی نہ گیا ہو۔"

اس کی پیشانی سے کچھ خون بہہ کر بھنوؤں اور آنکھوں کے پاس جم گیا تھا۔ چند لمحوں میں ہی خون کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا۔ وہ زمین پر ترچھا پڑا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کا دل دھڑک

رہا تھا۔ نبض بھی ٹھیک سی چل رہی تھی۔

وسیم اس کی نبض وغیرہ دیکھے بغیر ہی یقین سے بولا "اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید مر چکا ہوتا۔ لیکن مجھے معلوم ہے اس کی کھوپڑی کی ہڈی صرف معمولی سی چٹخی ہوگی۔"

"کہیں یہ چوٹ اس کے لئے مہلک ثابت نہ ہو۔ میں اسے لے چلتا ہوں۔" میں نے اسے بازوؤں پر اٹھالیا۔ وہ مختصر الوجود تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں نے لوہے کے کسی ٹھوس مجسمے کو اٹھالیا ہو۔ اسے اٹھانے کا تجربہ ایک بار پہلے بھی ہوچکا تھا لیکن اس وقت وہ ہوش میں تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کا وزن پہلے سے بھی کچھ بڑھ گیا تھا۔

میں نے اسے گاڑی میں ڈالا۔ گاڑی کو نیچے سے چیک کیا۔ بونٹ کھول کر دیکھا۔ کم از کم مجھے کہیں کوئی بم دکھائی نہ دیا۔ میں نے وسیم کو ساتھ بٹھایا اور اللہ کا نام لے کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ خیریت ہی رہی' کوئی بم وغیرہ نہیں پھٹا۔ میں نے گیئر لگا دیا۔

پُل پر پہنچ کر میں نے وسیم سے پوچھا "تمہاری گاڑی کہاں کھڑی ہے؟"

"جھگانے سے ذرا آگے۔" اس نے بتایا۔

"میں تمہیں وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔ تم اپنی گاڑی میں ہی واپس جانا۔" میں نے کہا۔ میرا ارادہ اس وقت ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں جانے کا تھا اور وہ چونکہ میرا خفیہ ہیڈ کوارٹر تھا اس لئے میں وسیم کو فی الحال وہاں تک لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ جب وہ میرے خاص رفیقوں میں شامل ہو جاتا تو بات دوسری تھی۔ میں اب اس سلسلے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔

وسیم اپنی داڑھی مونچھیں اور عینک کے رنگین شیشے بڑی احتیاط سے جیبوں میں رکھتے ہوئے بولا "پھر کبھی کام آئیں گے۔" پھر وہ ایک نظر اے ٹن کی طرف دیکھ کر بولا "شکر ہے میں آپ کی امانت آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔"

میں اس کے انداز پر مسکرا دیا۔ وہ اے ٹن کے لئے امانت کا لفظ ایسے استعمال کر رہا تھا جیسے وہ کوئی چیز تھی جسے وہ مجھ تک پہنچانے کے لئے اٹھائے پھر رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "وسیم! تمہارے بارے میں میرا شبہ درست معلوم ہوتا ہے۔ تم ہو واقعی کوئی پہنچی ہوئی چیز۔"

وہ سر جھکا کر اپنے مخصوص شرمیلے سے انداز میں بولا "سر! میں تو بس یونہی سا آدمی ہوں۔۔۔ سوچتا ہوں' آپ کی صحبت اور رہنمائی میسر رہی تو کسی قابل ہو جاؤں گا۔"

"پالیسی بھی تمہاری اچھی ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا' "جب کوئی تمہیں احمق قرار دینے کی کوشش کرتا ہے تو تم سادہ لوح انسانوں والے انداز میں یہ بتانے کی کوشش کرتے ہو کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے' تم تو بڑے عقلمند ہو۔ اور جب کوئی اس شبے میں مبتلا ہوتا ہے کہ تم بہت ہوشیار' بہت باصلاحیت ہو تو تم شرمیلے انداز میں تردید شروع کر دیتے ہو کہ تم تو بالکل سیدھے اور معصوم ہو۔ تم ہر وقت دوسرے کو اپنے بارے میں کنفیوژ رکھتے ہو تاکہ کوئی تمہارے بارے میں فیصلہ نہ کر پائے کہ تم درحقیقت کیا چیز ہو۔"

"میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آتیں سر! بہرحال آپ مرضی کے مالک ہیں۔" وہ بدستور شرمیلے انداز میں مسکراتے ہوئے عاجزی سے بولا "میرے بارے میں آپ جو بھی کہتے ہیں' جو بھی کہتے ہیں' ٹھیک ہی ہوگا۔ ہم تو آنکھیں بند کر کے آپ کی ہر بات پر بھروسا کرتے ہیں۔"

چند منٹ میں ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک کے کنارے وسیم کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا "سر! اب آپ کوئی اور ایسا ہی ذرا مشکل سا۔۔۔ ذرا مزے دار سا کام میرے سپرد کیجئے گا تاکہ آپ میرے بارے میں کچھ اور اندازے لگا سکیں۔ مجھے تو اپنے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ آپ ہی میرا نفسیاتی تجزیہ کر کے میری معلومات میں اضافہ کرتے رہئے گا۔"

"میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

دوسری سڑک پر پہنچ کر میں نے گاڑی واپس موڑی اور کچھ فاصلہ طے کر کے جم خانہ آگیا۔ میں اب گاڑی کا ریڈیو بھی استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جم خانہ سے فون پر ٹونی سے رابطہ قائم کیا اور اسے فوراً جم خانہ پہنچنے کی ہدایت کی۔

فون کر کے میں واپس پارکنگ لاٹ میں گاڑی میں آبیٹھا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر ہی تھا لیکن میری نظر پچھلی سیٹ پر تھی جہاں میں نے اے ٹن کو لٹایا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک بے حس و حرکت تھا لیکن اس شیطان سی مخلوق کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کب اٹھ بیٹھے۔ پارکنگ لاٹ میں کہیں کہیں الیکٹرک پولز پر بلب لگے ہوئے تھے مگر ان میں سے ایک آدھ ہی روشن تھا۔ وہاں ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

ٹونی نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ اپنی گاڑی کچھ دور پارک کر کے میری گاڑی پہچان کر اس طرف آگیا۔ میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا "اپنی گاڑی یہیں لے آؤ۔" پھر میں نے اے ٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس شخص کو تمہاری گاڑی میں منتقل کرنا ہے اور میں ہی اسے دو نمبر لے کر جاؤں گا۔ تم میری گاڑی لے جاؤ اور اپنے کسی خاص الیکٹرونک انجینئر سے اسے بہت باریک بینی سے چیک کراؤ کہ اس میں کوئی مشکوک یا غیر متعلقہ آلہ۔۔۔ کسی بھی قسم کا کوئی فالتو الیکٹرونک ڈیوائس کہیں فٹ تو نہیں ہے۔ اس کی ایک ایک تار' ایک ایک پرزہ' ایک ایک نٹ بولٹ' غرضیکہ ہر چیز بہت ہی تفصیل سے چیک ہونی چاہئے۔ خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگ جائے۔"

"میں سمجھ گیا سر!" ٹونی نے جواب دیا۔ اس نے اپنی گاڑی میری گاڑی کے قریب لا کھڑی کی اور چند ہی لمحوں میں ہم نے اے ٹن کو اس کی گاڑی میں منتقل کر دیا۔ میں اسے لے کر روانہ ہو گیا

اور ٹونی میری گاڑی لے گیا۔

دو نمبر پہنچ کر میں نے اے نن کو مس ٹریپ کے حوالے کرتے ہوئے کہا "اسے گیسٹ روم' میں پہنچا دو اور ہمارے ڈاکٹر سے کہنا کہ اس کی ذرا توجہ سے دیکھ بھال اور علاج کریں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی کھوپڑی کی ہڈی چٹخ گئی ہوگی۔"

مس ٹریپ نے اس کے مختصر وجود کو دیکھتے ہوئے بے پروائی سے اسے اٹھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اوندھے منہ گرتے گرتے بچی۔ پھر اس نے سنبھل کر اسے بازوؤں پر اٹھایا۔ عام عورت تو شاید بے ہوش پڑے اے نن کو ہلا بھی نہ سکتی۔

"یہ اتنا بھاری کیوں ہے؟" مس ٹریپ نے حیرت سے پوچھا' "ایسا لگتا ہے جیسے گوشت پوست کا نہیں لوہے کا بنا ہوا ہے۔"

"یہ تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کیوں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "یہ بڑی عجوبۂ روزگار قسم کی مخلوق ہے۔ میڈیکل سائنس کے ماہرین اس کی جسمانی ساخت کا تجزیہ کریں تو شاید کچھ پتا چل سکے۔ اسے گیسٹ ہاؤس' میں رکھ کر اسی طرح اس کی حفاظت کرنا جیسے یہ کوئی جن ہے اور فرار ہونے کی فکر میں ہے۔"

گیسٹ ہاؤس' اس طویل و عریض کوٹھی کے تہ خانے میں واقع چند کمروں پر مشتمل تھا جہاں ان لوگوں کو ٹھہرایا جاتا تھا جنہیں خصوصی تحویل میں رکھنا مقصود ہوتا تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہونا کسی کے لئے تقریباً ناممکن ہی تھا۔ ہر طرح کے حفاظتی انتظامات موجود تھے۔ اگر کوئی ان حفاظتی انتظامات کے باوجود گیسٹ ہاؤس سے فرار ہونے میں اس حد تک کامیاب ہو جاتا کہ کمروں اور راہداریوں سے نکل آتا تب بھی وہ تہ خانے سے باہر آنے کا راستہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسٹیل اور کنکریٹ کی بہت بڑی قبر تھی جس میں ہر قسم کی آسائشیں موجود تھیں اور وقت پڑنے پر اذیتوں میں بھی تبدیل ہو سکتی تھیں۔ یہاں قدم قدم پر مختلف میکینزم موجود تھے۔ کچھ فرائض انجام دینے کے لئے وہاں دو تین افراد بھی موجود رہتے تھے۔ وہ کمانڈو تھے۔

مس ٹریپ کے تہ خانے کی طرف جاتے ہی میں وہاں سے لوٹ آیا۔ گھر آکر میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ لاشعوری طور پر مجھے ایڈم کے فون کا انتظار تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں کو اے نن کی گمشدگی سے آگاہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ پہلے تو عموماً ریڈ ڈاٹ سے متعلق کسی بھی واقعے کے کچھ دیر بعد ہی ایڈم کا فون آجاتا تھا لیکن اس رات بہت دیر تک انتظار کرنے کے باوجود فون نہیں آیا۔ حالانکہ میرا خیال تھا' اے نن کا میرے ہتھے چڑھ جانا ریڈ ڈاٹ کے لئے کافی اہم واقعہ ہوگا۔ انتظار کرتے کرتے بالآخر میں سو گیا۔

دوسرے روز میں معمول کے مطابق تیار ہو کر آفس گیا۔ آفس میں ہی ٹونی کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ گاڑی کا معائنہ جاری ہے۔ اس میں ابھی تک تو کوئی مشکوک چیز یا الیکٹرونک ڈیوائس نہیں ملا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شام تک معائنہ مکمل ہو جائے گا۔ میں نے گاڑی میں آلٹریشن کرا کے جو چند چیزیں اپنی ضرورت اور آڑے وقتوں کے استعمال کے لئے فٹ کر رکھی تھیں ان کا بھی معائنہ ہونا تھا۔

آفس میں ہی دوپہر کے قریب مس ٹریپ کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ اے نن کو ہوش آگیا تھا لیکن اس کی حالت کچھ عجیب سی تھی۔ وہ کچھ بول نہیں رہا تھا بس خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا' کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ ہمارے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ دماغی چوٹ آنے کے بعد اس قسم کی کیفیت غیر متوقع نہیں تھی۔ یہ عارضی بھی ہو سکتی تھی اور مستقل بھی۔ دماغی چوٹ کے بعد بعض لوگ ہمیشہ کے لئے یادداشت کھو بیٹھتے تھے جسے بنیاد بنا کر ہمارے ہاں نہ جانے کتنی فلموں کی کہانیاں لکھی گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے اسے مزید دوائیں وغیرہ دے کر سلا دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دُعا کی کہ اس کی یادداشت مستقل طور پر غائب نہ ہو' کہیں میری ساری تگ و دو اور بے چارے وسیم کی محنت ضائع ہی چلی جائے۔

اس روز بھی ایڈم کا فون نہیں آیا۔ شام کو میں گھر چلا گیا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں ڈائننگ روم میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کہ ملازم نے ایک بڑا سا ڈبل وزیٹنگ کارڈ لا کر دیا۔ کارڈ ملک ریاض راہی کا تھا جس کی چاروں سائڈز چھپی ہوئی تھیں۔ اس کے نام کے ساتھ اس کی پارٹی میں اس کا عہدہ اور نہ جانے کس کس انجمن میں اس کے کتنے عہدے درج تھے۔

کارڈ طارق خان نے میرے پاس بھجوایا تھا۔ ابھی میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ انٹرکام کا بزر بجا۔ گیٹ ہاؤس سے طارق خان ہی بول رہا تھا۔ "سر! یہ آدمی جس کا میں نے کارڈ بھجوایا ہے' ایک چھوٹے موٹے جلوس کی سی شکل میں آیا ہے۔ ایک لینڈ کروزر اور ایک مرسیڈیز آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ کل دس آدمی ہیں جن میں سے چار تو شکلوں سے ہی ڈاکو لگ رہے ہیں۔ ان کے پاس سیون ایم کی رائفلیں بھی ہیں.... ملک ریاض راہی کا کہنا ہے کہ وہ آپ کا دوست ہے اور آپ کو کسی تقریب کی دعوت دینے آیا ہے۔"

"اسے ڈرائنگ روم میں بھیج دو۔" میں نے ہنس کر کہا' "ایک ملاقات میں ہی اسے دوستی کا دعویٰ ہو گیا ہے۔ جہاں تک زیادہ آدمیوں اور اسلحے کا تعلق ہے تو بعض ملاقاتوں کے لئے جانے کا ان لوگوں کا یہی اسٹائل ہوتا ہے۔"

"ان کا اسلحہ گیٹ پر ہی رکھوا لوں؟" طارق خان نے پوچھا۔

"نہیں' بُرا مان جائیں گے۔ آنے دو... بس ویسے ہی ذرا الرٹ رہنا۔" میں نے کہا۔

میں نے ہال میں آکر کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھا۔ طارق

خان نے گیٹ ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے بٹن دبا دیا تھا اور گیٹ کھل رہا تھا۔ گیٹ پورا کھل چکا تو ایک بڑی لینڈ کروزر اور نیلی مرسڈیز آگے پیچھے ڈرائیو وے میں داخل ہوئیں۔ میرا ایک ملازم برآمدے میں ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

کافی ختم کر کے میں بھی ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ طویل و عریض ڈرائنگ روم میں بڑی رونق اور گہما گہمی سی دکھائی دینے لگی تھی۔ صوفوں پر وہ لوگ خوب چوڑے ہو ہو کر بیٹھے تھے۔ بلکہ بعض تو تقریباً لیٹے ہوئے تھے۔ سگریٹوں اور سگار کے دھوئیں سے کمرا بھر گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہی کرسٹل کی بڑی بڑی فرانسیسی ایش ٹریز میں راکھ بکھری نظر آنے لگی تھی۔

ملک ریاض راہی مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر آگے آیا اور یوں گرمجوشی سے گلے ملا جیسے میرا بڑا پرانا اور مدت کا بچھڑا ہوا دوست ہو۔ اس نے میری پیٹھ پر خوب تھپکیاں دیں، مصافحہ کیا پھر اپنے ساتھ آنے والوں سے میرا تعارف کرانے لگا۔ "بھئی۔۔ یہ ہیں اپنے چوہدری صاحب' جن کی میں تمہارے سامنے تعریفیں کر رہا تھا۔ ملک کے بہت بڑے آدمی ہیں۔۔۔ اور بڑے ہیرا آدمی ہیں۔۔۔ بڑے بندہ نواز ہیں۔۔۔ اپنے جگری یار ہیں اور آگے چل کر یہ یاری اور بھی مضبوط ہوگی۔ لوہے کی طرح۔" ایک لمحے کے لئے وہ یوں میرے کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے تصویر کھنچوا رہا ہو۔

اس کے ساتھ آنے والے سب لوگ باری باری اٹھ کر بڑی عقیدت اور احترام سے مجھ سے مصافحہ کرنے لگے گویا ملک ریاض راہی کی زبانی تعارف ہوتے ہی میں ان کی نظر میں بہت معتبر اور بزرگ ہستی بن گیا تھا۔

طارق خان نے درست کہا تھا۔ ان میں سے چار آدمی شکلوں سے ہی ڈاکو لگ رہے تھے۔ وہ چاروں ہی دراز قد' چوڑے چکلے اور سانولے تھے۔ ان کے چہروں پر خشونت' کرختگی اور کھردرا پن تھا جسے وہ اس وقت مہذبانہ مسکراہٹوں میں چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں درندگی اور سرخی تھی۔ ان کے ہاتھ بھی کھردرے اور فولادی تھے۔

انہوں نے اپنی رائفلیں صوفوں کے ساتھ ٹکا دی تھیں۔۔ وہ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیصوں میں تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ گولیوں کی پیٹیاں ان کی قمیصوں کے نیچے ان کے جسموں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ چاروں ہی ابھی ابھی سی گھنی داڑھیوں والے تھے۔ پکی عمر کا ایک شخص ان کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ ان کی ٹولی میں وہ سب سے نمایاں شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر کھردرا پن اور سفاکی دوسروں سے زیادہ تھی۔ ان میں سے دو مختصر پگڑیاں بھی باندھے ہوئے تھے۔ باقی دو ننگے سر تھے۔ ان کے بال لمبے تھے۔

سردار نے مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر بھی مجھے سلام کیا۔ "سلام مینڈا سائیں!" اس کی آواز کسی کھوہ میں غرانے والے بھیڑیئے سے مشابہ تھی۔

"وعلیکم السلام۔" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب! آپ نے اس شیر جوان کو پہچانا نہیں؟" ملک ریاض نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں ملک کی کسی انتہائی مشہور و معروف ہستی کو پہچاننے سے قاصر رہا ہوں۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بڑے پُرجوش لہجے میں بولا "بھئی یہ اپنا نورو ماچھی ہے۔ آج کے دور کا سب سے بڑا ڈکیت۔ اس کے سر کے لئے دس لاکھ روپے کا انعام مقرر ہے حکومت کی طرف سے۔ یوں سمجھیں ہم دس لاکھ کا چیک جیب میں ڈالے پھر رہے ہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھ خود نورو ماچھی بھی ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی بھی بھیڑیئے کی غراہٹ سے ہی مشابہ تھی۔

ملک ریاض راہی گویا اس کے قابلِ فخر اور عظیم "کارناموں" کی تفصیل جاری رکھتے ہوئے بولا "چھیالیس تو قتل ہیں اس کے کھاتے میں۔ جن کی ایف آئی آر درج نہیں ہو سکی ان میں وہ شامل نہیں ہیں۔"

اب اس کے تینوں ساتھیوں نے قہقہہ لگایا اور ڈرائنگ روم میں ان کی آوازیں گونج کر رہ گئیں۔ اب مجھے یاد آیا تھا کہ میں نے کچھ عرصہ پہلے واقعی کسی اخبار میں اشتہار پڑھا تھا جس میں نورو ماچھی کی زندہ یا مردہ حالت میں گرفتاری پر دس لاکھ کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ شاید میں نے کبھی اسی قسم کا کوئی پوسٹر بھی کہیں چسپاں دیکھا تھا لیکن جہاں تک مجھے یاد تھا' ان میں نورو ماچھی کی تصویر کافی مختلف معلوم ہو رہی تھی۔ وہ غالباً نورو کی نوجوانی کی تصویر تھی۔ پولیس کو شاید وہی میسر آسکی تھی۔ بہرحال یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے اشتہارات میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میرے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوا وہ شخص نورو ماچھی ہی تھا۔ اس کے ناک نقشے میں اس تصویر کی جھلک موجود تھی۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ اخبارات کے مطابق پورے صوبے کی پولیس جس کی تلاش میں تھی اور جس کے سر کے لئے دس لاکھ روپے کی خطیر رقم کا انعام مقرر تھا' وہ اپنے ساتھیوں اور اپنے اسلحے سمیت ایک "معزز" زمیندار اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ شہر کی نہ جانے کن کن بھری پُری شاہراہوں سے گزرتا ہوا ایک ممتاز شہری اور بزنس مین کے گھر آیا تھا اور اب ڈرائنگ روم میں کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ جہاں بھی وہ پایا جاتا ہو' اس جگہ کے سوا باقی ہر جگہ پولیس اسے تلاش کرتی پھرتی ہو۔ جنگلوں' بیابانوں اور پہاڑوں میں اس کی گرفتاری کے لئے محاصرے کرتی ہو۔

"بہت خوب۔۔۔ بہت خوب۔۔۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا'

"معزز صاحبان! آپ سب تشریف رکھئے۔" فقط "معزز" پر میں نے زور دیا تھا۔

وہ پہلے ہی کی طرح پھیل کر بیٹھ چکے تو میں نے پوچھا "آپ لوگ کیا کھانا پینا پسند کریں گے؟"

ملک ریاض نے سب کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا۔ "جس جس چیز کو دل چاہے منگوا لیجئے چوہدری صاحب! ہمیں تو کسی چیز سے انکاری نہیں ہے۔ کیوں نورو؟"

"بالکل ٹھیک بچے فرماندے او میڈا سائیں!" نورو ماچھی نے غراہٹ نما آواز میں جواب دیا اور ساتھ ہی وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیئے۔

میں نے ملازموں سے کہہ کر ان کی خاطر مدارت کا بندوبست کرایا۔ اس دوران خوش گپیوں، بلند آہنگ قہقہوں اور ہنسی مذاق کا سلسلہ چلتا رہا۔ کھانے پینے کی چیزوں پر انہوں نے جنات کی طرح ہاتھ صاف کیا۔

اسی دوران ملک ریاض گپ شپ جاری رکھتے ہوئے بولا، "میں آپ کی طرف آرہا تھا تو میں نے سوچا نورو کو بھی ساتھ لے چلوں۔ آپ سے ملاقات ہی ہو جائے گی۔ بڑا کام کا آدمی ہے۔ آپ کو ایسے لوگوں سے میل ملاقات رکھنی چاہئے۔"

میں بدستور مسکراتا رہا۔ میں ان کے انداز گفتگو سے بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ ملک ریاض، نورو کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے بولا، "تچّھے ہے اپنا۔۔۔ تچّھے بھی ہے، یار بھی ہے، تابعدار بھی ہے۔ آپ یوں سمجھیں، بہت بڑے علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ یہ جو تین جوان اس کے ساتھ ہیں۔۔۔ یوں سمجھ لیں یہ اس کی کابینہ ہے۔"

"لیکن آپ کا اور نورو کا ساتھ کیسے ہو گیا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"بس، کبھی کام کے لوگ ہمیں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کبھی ہم کام کے لوگوں کو ڈھونڈ لیتے ہیں۔" ملک ریاض شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "ہمارا فلسفہ ہے کہ سب کے ساتھ بنا کر رکھو۔۔۔ اور وہ سب لوگ جن سے ہماری ملاقات ہوتی ہے، انہیں ہماری نصیحت یہی ہوتی ہے کہ ہم تم سے بنا کر رکھ رہے ہیں، تم بھی ہم سے بنا کر رکھو۔ نورو ماچھی کو ہماری ضرورت پڑتی ہے تو ہم اس کے کام آتے ہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت پڑتی ہے تو یہ ہمارے کام آتا ہے۔ یونہی مل جل کر چلنا چاہئے جی۔ اس طرح زندگی میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چار دن کی زندگی ہے۔۔۔ اور کام انسان کو بہت سارے کرنے ہوتے ہیں۔۔۔ بڑے بڑے کام۔۔۔ اہم کام۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے گہری نظروں سے نورو ماچھی کا جائزہ لیتے ہوئے پُرخیال لہجے میں کہا۔ وہ بھی زیر لب۔۔۔ بلکہ زیر مونچھ مسکراتے ہوئے گہری نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

ملک ریاض مزید بولا "چالیس آدمی ہیں نورو کے گروہ میں۔۔۔ اور سب ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ ان میں ملاوٹ کوئی نہیں ہے۔" شاید وہ چاہ رہا تھا کہ نورو ماچھی کی اعلیٰ "کوالیفیکیشنز" کے بارے میں کوئی بات بتانے سے رہ نہ جائے۔

"بہت خوب!" میں نے کہا پھر مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔ "نورو ماچھی صاحب! پولیس آپ کو گرفتار نہیں کرتی؟ میں تو سمجھتا تھا، آپ کہیں جنگلوں، پہاڑوں، بیابانوں میں، کسی نامعلوم مقام پر غار یا کھوہ میں چھپے بیٹھے ہوں گے۔ لحظہ بہ لحظہ پولیس کا گھیرا آپ کے گرد تنگ ہو رہا ہو گا۔ آپ کے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں ہو گا۔ درختوں سے کچے پکے پھل توڑ کر کھاتے ہوں گے۔ جوہڑوں سے پانی پیتے ہوں گے۔ دنیا سے آپ کا رابطہ کٹا ہوا ہو گا۔ لیکن آپ تو بڑی شان سے، صاف ستھرے کپڑے پہنے، بہترین قسم کی گاڑیوں میں، بھرے پُرے شہر میں، معززین کے ساتھ گھوم رہے ہیں؟"

نورو ماچھی نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا۔ اس کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے جیسے کوئی بڑا دانشور کسی سادہ لوح دیہاتی کی بات سن کر محظوظ ہو رہا ہو۔ میں نے اپنے چہرے پر حتی الامکان سادہ لوحی طاری رکھنے ہی کی کوشش کی تھی۔

نورو ماچھی جھٹکے دار اردو میں بولا "پولیس اپنا کام کرتی رہتی ہے، ہم اپنا کام کرتے رہتے ہیں میڈا سائیں۔ کبھی کبھار گروہ کا کوئی ایک آدھ آدمی مارا جاتا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب کوئی واردات بہت ہی سنگین ہو جائے۔ پولیس اپنی کارروائی ڈال دیتی ہے۔ تصویریں کھنچوا لیتی ہے۔ پریس کانفرنس وغیرہ کر لیتی ہے۔ کچھ مالِ غنیمت آپس میں بانٹ لیتے ہیں، کچھ سامنے لے آتے ہیں۔ کچھ سارٹیفکیٹ شارٹیفکیٹ آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ ان کا بھی دل پشوری ہو جاتا ہے۔ ہمارے کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس میں بھی اپنے آدمی موجود ہیں۔ اگر کوئی زیادہ خر دماغ افسر آ جاوے اور لمبی چوڑی کارروائی کرنے کی کوشش بھی کرے تو ہم کو سب خبر ملتی رہتی ہے۔ ساڈی باغ بہاری نوں کوئی فرق نئیں پیندا میڈا سائیں!"

ملک ریاض ہنس کر بولا "چوہدری صاحب! یہ تو جب اور جہاں چاہے چلا جاتا ہے۔ ملک سے باہر بھی چلا جاتا ہے۔ اپنے خاص خاص لوگوں کے ہاں شادی بیاہ میں بھی شرکت کرتا ہے۔"

"واہ ملک صاحب!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "زمانہ واقعی بڑی ترقی کر گیا ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے چوہدری صاحب!" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "اب اصل کام بھی کر لیا جائے جس کے لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔"

اس نے اشارہ کیا اور اس کے ساتھ آنے والے ایک منشی ٹائپ آدمی نے جلدی سے ایک قیمتی بریف کیس کھول کر ایک بڑا سا سنہری لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ملک ریاض نے وہ لفافہ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر آگے بڑھ کر بڑے ادب سے میرے سامنے جھکتے ہوئے مجھے پیش کیا۔ اس پر میرا نام موٹے جلی الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہے ملک صاحب؟" میں نے لفافہ کھولے بغیر پوچھا۔

"دعوت نامہ ہے چوہدری صاحب!" اس نے واپس اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"کس تقریب کا؟" میں نے اب بھی لفافہ نہ کھولا۔

"بات یہ ہے چوہدری صاحب....." وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ بڑی منتوں مُرادوں سے ہوا تھا۔ وہ بھی دوسری بیوی سے۔ پہلی بیوی سے تو کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ دوسری شادی کی تو اس کے بھی کئی سال بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے فرزند سے نوازا۔ ماشاءاللہ بڑا ہو گیا ہے۔ اس سال اسے لندن میں بورڈنگ اسکول میں داخلہ مل گیا ہے..... بہت بڑا..... بہت اونچے درجے کا اسکول ہے جی..... وزیروں، سفیروں اور شہزادوں کے بچے ہی پڑھتے ہیں وہاں، جہاں میرے فرزند کو داخلہ ملا ہے۔ بس اس خوشی میں ہم نے اپنی شکرگڑھ والی حویلی میں ایک بہت بڑے جشن کا اہتمام کیا ہے۔"

"اوہ.....!" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بیٹے کو لندن کے اسکول میں داخلہ ملنے پر جشن منایا جا رہا تھا۔ خیر..... یہ تو ملک جیسے لوگوں کے لئے واقعی اعزاز کی بات تھی۔ دولت کی فراوانی ہو تو زکام سے صحت یاب ہونے پر بھی جشن منایا جا سکتا ہے۔

اب میں نے کارڈ کھول کر دیکھا۔ وہ تقریباً ایک فٹ لمبا کارڈ تھا۔ لفافے کی طرح اس کا بھی رنگ طلائی تھا۔ اس پر نہ جانے کیا کیا لفاظی کی گئی تھی۔ خلاصہ بس یہی تھا کہ ایک تقریب مسرت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تاریخ دوسرے روز ہی کی تھی۔ مقام تقریب شکرگڑھ والی وہی حویلی تھی جو کبھی ملک اسلم کی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ اس کی ساری زمینوں اور حویلی وغیرہ کا مالک بھی اب ملک ریاض ہی تھا۔

شکرگڑھ اور اس حویلی کی یاد آتے ہی ذہن میں یادوں کی ایک فلم سی چل پڑی۔ ایک لمحے کے لئے میں کھو سا گیا پھر جھرجھری لے کر چونکا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ملک صاحب! میں معذرت چاہوں گا۔ تاریخ بہت قریب کی ہے۔ یعنی کل ہی کی ہے۔ میری بہت سی مصروفیات پہلے سے طے ہیں۔"

"چوہدری صاحب! مجھے احساس ہے کہ مجھے کارڈ پہنچانے میں تاخیر ہو گئی ہے۔ لیکن ایسا صرف اس لئے ہوا کہ میں خود ذاتی طور پر کارڈ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا..... اور میں بڑے مان سے آیا ہوں۔ یہی سوچ کر آیا ہوں کہ خود جا رہا ہوں تو چوہدری صاحب سے "ہاں" کروا کے ہی آؤں گا۔ آپ میرا دل نہیں توڑ سکتے۔"

"لیکن ملک صاحب.....!"

"چھوڑیں جی۔ کاروباری مصروفیات تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ ملتوی کرنا چاہے تو انسان ہر مصروفیت کو ملتوی کر سکتا ہے۔ آدمی زیادہ کاروباری بن جاتا ہے تو اس کے ساتھ یہی مصیبت ہو جاتی ہے کہ وہ ہر مصروفیت کو سر پر سوار کر لیتا ہے۔ ہمارا مشورہ مانیں، تفریح کو بھی ضرور تھوڑی بہت اہمیت دیا کریں۔ اور پھر ہمارے جشن کوئی معمولی جشن نہیں ہوتے۔ لطف آ جائے گا آپ کو۔ مہینوں نشہ نہیں اترے گا۔ پوری رات جشن چلے گا۔ کھلے میدان میں مرغیاں اور بکرے روسٹ ہوں گے۔ شراب پانی کی طرح بہے گی۔ فلمی دنیا کی تمام ٹاپ کی ڈانسرز ہوں گی۔ بہت کھلا ڈلا جشن ہو گا۔ لمبی عیاشیاں ہوں گی۔ ہر طرح کی آزادیاں ہوں گی۔ ہم شہر کی گھٹن زدہ فضاؤں سے دور ہوں گے۔ بہت بڑے بڑے لوگ وہاں جمع ہوں گے۔ نورو ماچھی کے بھی خاص خاص آدمی ہوں گے۔ آپ کی جان پہچان کی بھی بہت سی بڑی بڑی ہستیاں ہوں گی۔ طبیعت خوش ہو جائے گی آپ کی۔"

"لیکن ان میں تو میری دلچسپی کی کوئی بھی چیز نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ کی دلچسپی کن چیزوں میں ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ میرا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ میں کب کس چیز میں دلچسپی لینے لگوں۔" میں نے کہا۔

"بس..... تو پھر آپ چلنے کی ہامی بھریئے۔ وہاں پہنچتے ہی آپ کی دلچسپی شروع ہو جائے گی اور آپ اپنے اس فیصلے پر خوش ہوں گے، پچھتائیں گے نہیں۔ یہ نہیں سوچیں گے کہ یار اتنی دور زمینوں پر جا کر وقت ضائع کیا۔ بس..... اب میں انکار نہیں سنوں گا۔ یوں سمجھیں کہ یہ تقریب تو ہے ہی آپ کے اعزاز میں۔ آپ ہی نہ ہوئے تو تقریب کا کیا لطف رہے گا؟ میں کل دن چڑھے آپ کو لینے کے لئے گاڑی بھیج دوں گا۔"

میں ایک لمحے کے لئے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محض ایک مختصر سفر کے دوران اتفاقاً مل جانے والا یہ شخص مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا؟ تقریباً کمبل ہی ہوا جا رہا تھا۔

دوسری طرف شکرگڑھ کے گلی کوچوں کی یادیں بھی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ بالآخر میں نے کہا "اچھا..... ٹھیک ہے ملک صاحب۔ لیکن میں اپنی ہی گاڑی میں چلوں گا۔ آپ صرف ویسے ہی ساتھ چلنے کے لئے اپنی گاڑی بھی بھجوا دیجئے گا۔ بہت مدتیں ہو گئی ہیں مجھے ان راستوں پر گئے ہوئے۔ ذرا راہنمائی رہے گی تو اچھا رہے گا۔"

"ضرور چوہدری صاحب! ایہہ تے گل ای کوئی نئیں۔ دل خوش کر دیا آپ نے۔" وہ اٹھ کر پُرجوش انداز میں مجھ سے معانقہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ بھی جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

زندگی کی کٹھن راہوں کے ایک سرکش مسافر کی یہ داستان ابھی جاری ہے۔ باقی واقعات آئندہ ماہ جاسوسی ڈائجسٹ میں پڑھئے

اس علاقے میں شاید ہیری کو صرف ہیری کہہ دینا کافی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شناخت کی خاطر اسے اس کے پورے نام سے پکارا جاتا تھا اور وہ پورا نام تھا ہیری بائیسویں گلی والا' ظاہر ہے یہ نام اس کے والدین نے نہیں رکھا تھا۔ اس کے نام کے ساتھ یہ شناختی دُم چھلا اس کے دوستوں نے لگایا تھا جن میں سے بیشتر اسی کی طرح چور اچکے اور نوسرباز تھے۔

ایک نوسرباز کا تذکرہ جو مستقبل کا راز فاش کرنے کا مرتکب ہوا تھا

کہتے ہیں کہ آدمی کے ذہن میں آنے والے خیالات بے بنیاد نہیں ہوتے۔ یہ ماضی کے واقعات کا پرتو ہوتے ہیں یا مستقبل میں رونما ہونے والے حالات کا دیباچہ۔ ”مستقبل“ اسی کہاوت کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ سائنس فکشن کو بکواس اور بے سروپا تخیل سمجھنے والوں کے لیے بطورِ خاص۔

مستقبل

عائشہ جمال

اس روز ہیری اپنے قریبی دوست فار مر براؤن کے ساتھ اس مخصوص کیفے میں بیٹھا تھا جہاں زیادہ تر اسی کی قبیل کے لوگوں کی نشست و برخاست رہتی تھی۔ فار مر براؤن کبھی کبھی کسی واردات میں اس کے نائب اور مددگار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اچانک ہی ہیری نے دبی دبی آواز میں ہنسنا شروع کردیا تھا گویا کسی خیال سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ فار مر براؤن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے ایک نیا فراڈ سوچا ہے۔" ہیری بائیسویں گلی والا بدستور ہنستے ہوئے بولا "بڑا عمدہ اور اچھوتا منصوبہ ہے۔"

فار مر براؤن فلسفیانہ انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "کوئی فراڈ نیا نہیں ہوتا میرے دوست! فراڈ کے سب طریقے پرانے ہیں جنہیں تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ ہر دور میں آزمایا جاتا ہے۔ بوتل وہی رہتی ہے لیبل بدل جاتا ہے۔ بہرحال...... تم نے کیا سوچا ہے؟ کسی دکان کا صفایا کرنے کا منصوبہ بنایا ہے؟ کیا تمہیں کسی مددگار کی ضرورت ہوگی؟"

فار مر براؤن پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ زیادہ پُراشتیاق نظر نہ آئے۔ پیشہ ورانہ وقار بھی آخر کوئی چیز تھی۔ عزتِ نفس کی حفاظت کرنا وہ ضروری خیال کرتا تھا۔ حالانکہ اس مخصوص حلقے میں سبھی کو معلوم تھا کہ ان دنوں اسے کام کی اشد ضرورت تھی۔ اس کی محبوبہ پچھلے ایک ماہ میں اس کی گزشتہ واردات کی ساری کمائی کھا کر کسی زیادہ خوش حال لفنگے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ زیادہ دل شکن انکشاف یہ تھا کہ جن دنوں وہ فار مر براؤن کی رقم پر عیش کر رہی تھی، ان دنوں بھی اس خوش حال لفنگے سے اس کی ملاقاتیں جاری تھیں۔

ہیری نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا "نہیں پیارے! اس منصوبے کی تفصیلات پر تبادلۂ خیال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اتنا عمدہ اور اچھوتا منصوبہ ہے کہ میں اس میں کسی اور کو شریک کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس کے ذریعے میں برسوں تک لوگوں کو بے وقوف بناؤں گا۔ اس کے بعد کہیں جاکر ہمارے حلقے میں اس کی تفصیلات عام ہوں گی۔ اس وقت تک میں لکھ پتی ہوجاؤں گا۔ منصوبے کا ایک خوب صورت پہلو یہ ہے کہ اس کے تحت کوئی احمق میرا شکار بننے کے بعد پولیس کو بھی اطلاع دینا پسند نہیں کرے گا۔ یہ خوب صورت منصوبہ صرف اور صرف میرا ہے۔ میں اب چلتا ہوں، تم سے پھر کبھی ملاقات ہوگی دوست!"

وہ اٹھا اور بوتھ سے نکل کر دروازے کی طرف چل دیا۔ راستے میں کہیں کسی تجوری شکن کو دیکھ کر وہ خوش خلقی سے مسکرایا، کسی میز پر رک کر کسی بینک ڈکیت کی خیرو عافیت دریافت کی۔ یوں وہ کیفے کے متقفل دروازے تک پہنچا۔ بعض میزوں پر اسے چند جیب کترے یا اسی قسم کی دوسری چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے والے بھی نظر آئے لیکن ہیری نے انہیں لائق التفات نہیں سمجھا۔ انہیں اس نے مسکراہٹ سے بھی نہیں نوازا۔ اس کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا، چھوٹے موٹے فنکاروں اور نوآموزوں کو منہ لگانا وہ اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد فار مر براؤن پُرخیال انداز میں اپنے لیمن اسکواش کے گھونٹ بھرنے لگا۔ کافی غوروخوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہیری اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا یا اس سے مذاق کر رہا تھا۔ ہیری اپنی نشست پر ایک رسالہ بھی بھول گیا تھا۔ غالباً سائنس فکشن کے موضوع پر کوئی رسالہ تھا کیونکہ اس کے سرورق پر ایک خلائی جہاز اور عجیب سے لباس میں ایک خوب صورت لڑکی نظر آرہی تھی۔ اس کے لباس کو عجیب اس لحاظ سے کہا جاسکتا تھا کہ اسے دیکھ کر فیصلہ کرنا مشکل تھا، اسے لباس کہا جائے یا لباس کا خلاصہ؟
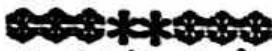
❀❀❀✱❀❀❀

"تو آپ ...... مجھے ایک فرنشڈ بنگلا مہیا ...... کرسکتے ہیں؟"
کلائنٹ نے ذرا محتاط سے انداز میں قدرے اٹک اٹک کر یہ الفاظ ادا کیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے انگریزی تو روانی سے بولنا آتی تھی لیکن بولتے وقت اسے ذرا شک سا رہتا تھا کہ اس نے الفاظ کا انتخاب اور استعمال درست کیا ہے یا نہیں۔ اس کا نام کلرگ تھا اور وہ کچھ دیر پہلے پراپرٹی ڈیلر والٹر شکن کے آفس میں پہنچا تھا۔ اسے کرائے پر کوئی معقول مکان درکار تھا۔

"جی ہاں۔ آپ کو فرنشڈ بنگلا مل جائے گا۔" والٹر شکن پیشہ ورانہ خوش خلقی اور خود اعتمادی سے بولا "اور مجھے امید ہے کہ وہ آپ کو پسند بھی آجائے گا۔ بیوی بچے ہیں آپ کے ساتھ؟"

"نہیں" کلرگ نے جواب دیا "وہ تو بہت دور رہتے ہیں۔" یہ بتاتے وقت وہ نہ جانے کیا سوچ کر مسکرا دیا، جیسے کسی تصور سے محظوظ ہو رہا ہو۔ وہ ابھی تک کھڑا ہی تھا۔

"آپ تشریف رکھیے نا۔" والٹر نے ایک بار پھر کہا۔ اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کلرگ جہاں کھڑا تھا پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر وہیں بیٹھ گیا اور دھپ سے فرش پر جا گرا کیونکہ کرسی اس کی پشت پر نہیں بلکہ دائیں طرف تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ شرمندہ کم اور حیرت زدہ زیادہ نظر آرہا تھا گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ وہ کیونکر گر گیا۔

تاہم اسے چوٹ نہیں لگی تھی۔ والٹر نے صدقِ دل سے معذرت کی۔ لیکن کلرگ گویا زوروشور سے اس کی معذرت کو مسترد کرتے ہوئے بولا "آپ کو معذرت کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ قصور تو میرا اپنا ہے۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا......"

لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا "ہاں تو...... آپ مجھے بنگلا...... میرا مطلب ہے بنگلے کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

کاروبار کی بات آئی تو والٹر اپنی ساری حیرت و الجھن بھول

گیا۔ اس نے اپنا رجسٹر نکالا اور اس کی ورق گردانی سے تصدیق ہو گئی کہ اس کے پاس کرائے پر اٹھانے کے لئے کئی فرنشڈ بنگلے موجود تھے۔

مختصراً ان سب کی خصوصیات بتانے کے بعد والٹر بولا "میرے خیال میں مسٹر کارسن والا بنگلہ ہر لحاظ سے سب سے اچھا ہے۔ خاص طور پر وہ علاقہ بہت اچھا ہے جہاں یہ بنگلہ واقع ہے۔ میں خود اسی گلی میں رہتا ہوں۔ اس میں رہائش اختیار کر کے آپ یقیناً خوش ہوں گے۔"

کلارک اس کی باتوں سے متاثر نظر آرہا تھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے میں یہی لے لیتا ہوں۔ اس کا زرِ کرایہ داری کتنا ہے؟"

والٹر اس لفظ سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ایک عرصے سے پراپرٹی کے کاروبار میں تھا۔ اس کے تجربے کے مطابق اس قسم کے الفاظ اب ڈکشنریوں میں ہی رہ گئے تھے۔ کوئی انہیں استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ کلارک غالباً غیر ملکی تھا۔

"کرایہ ڈیڑھ سو ڈالر ہے مسٹر کلارک!" والٹر نے جواب دیا۔ اور پھر خراج تحسین پیش کرنے کے سے انداز میں بولا "آپ انگریزی بہت عمدگی سے بولتے ہیں۔ آپ کے لہجے سے اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ غیر ملکی ہیں۔"

"شکریہ!" کلارک نے خوش ہوتے ہوئے کہا "میں نے اس سلسلے میں بہت محنت کی ہے۔ ہاں تو آپ کیا کرایہ بتا رہے تھے؟ ڈیڑھ سو ڈالر؟ یعنی یہ ہوئے ساڑھے بارہ درجن ڈالر۔"

وہ اپنے ساتھ چمڑے کے دو بڑے، خوب صورت اور چمکتے ہوئے سوٹ کیس لایا تھا۔ ان میں سے ایک سوٹ کیس کھول کر اس نے ایک سو چوالیس ڈالر تو بڑے نوٹوں کی شکل میں نکالے اور چھ ڈالر نقرئی سکوں کی شکل میں نکال کر والٹر کی میز پر رکھ دیے۔

وہ گویا کسی مشکل مرحلے سے بخیر و خوبی گزرنے کے بعد اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولا "یہ رہی میری رقم ۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کی رقم۔"

والٹر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ عام طور پر لوگ اسے پوری رقم نوٹوں کی صورت میں یا پھر چیک کے ذریعے ادا کرتے تھے۔ آج تک کسی نے رقم یا اس کا کچھ حصہ نقرئی سکوں کی صورت میں ادا نہیں کیا تھا۔ لیکن رقم بہرحال رقم تھی۔ خواہ وہ نوٹوں کی صورت میں ہوتی یا سکوں کی شکل میں۔ اگر کلارک پوری ہی رقم کی ادائیگی سکوں میں کرنا چاہتا تب بھی اسے منع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں تھا۔

والٹر نے رقم میز کی دراز میں ڈال کر اسے مقفل کیا اور اٹھتے ہوئے بولا "میں آپ کو اپنی ہی گاڑی میں لے چلتا ہوں۔ ویسے بھی میں اس وقت آفس بند ہی کرنے والا تھا۔"

اس رات کھانے کی میز پر والٹر اپنی بیوی ڈورس سے کہہ رہا تھا "ہمیں کسی روز اسے کھانے پر مدعو کرنا چاہئے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا' وہ کرۂ ارض کے کون سے گوشے سے آیا ہے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کوکنگ رینج کو کیسے آن کیا جاتا ہے۔ اور جب میں نے آن کر کے دکھایا تو وہ بولا 'اچھا یہ بجلی سے چلتا ہے' اور پھر نہ جانے کیوں وہ ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔ میں نے نہایت شائستگی سے اس سے پوچھا کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ میں نے یہ بھی جاننے کی کوشش کی کہ وہ کہاں سے آیا ہے لیکن اس قسم کے سوالات کو وہ بڑی صفائی سے ٹال گیا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی سیاسی پناہ گزین ہو۔"

"ممکن ہے۔" ڈورس نے خوابناک لہجے میں کہا "اور یہ بھی ممکن ہے ۔۔۔" مگر اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ والٹر ایک بار پھر اس کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ سائنس فکشن رسالے پڑھنے پر ہی اس کا بہت مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے تو ڈورس پر یہ بھی پابندی لگا دی تھی کہ وہ اس قسم کے رسالے قریبی بک اسٹال سے نہ خریدا کرے۔ محلے والوں نے دیکھ لیا تو وہ کیا سوچیں گے کہ اس کی بیوی کا ذوق کتنا بچکانہ ہے۔ چنانچہ ڈورس اب اپنے پسندیدہ رسالے اندرونِ شہر سے خرید کر لاتی تھی۔ اس کے شوہر کو محلے والوں کی نظر میں اپنے مقام کی کچھ زیادہ ہی فکر رہتی تھی۔ وہ ایک کامیاب اور عملی انسان تھا۔ جذباتیت اور خواب پرستی کو پسند نہیں کرتا تھا۔

اس رات جبکہ والٹر ٹی وی پر ایک ورائٹی شو دیکھ رہا تھا' ڈورس حسبِ معمول اپنا پسندیدہ سائنس فکشن میگزین لے کر بیٹھ گئی تھی۔ اپنے شوہر کی تنقید کے ڈر سے اس نے ٹائٹل پہلے ہی پھاڑ کر پھینک دیا تھا جو کچھ مناسب سا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک خلائی جہاز کے پاس ایک لڑکی بے حد ناکافی لباس میں کھڑی تھی۔

وہ ایک ایسے شخص کی کہانی پڑھ رہی تھی جو درحقیقت مستقبل میں رہتا تھا لیکن وقت کے دوش پر الٹا سفر کر کے موجودہ دنیا میں آگیا تھا

اور اپنے ساتھ کئی قسم کی حیرت انگیز ایجادات بھی لیتا آیا تھا۔

آخر میں ٹائم پولیس' اس کا سراغ لگاتی ہوئی ٹائم مشین کے ذریعے اس تک آن پہنچی اور اسے بلا اجازت ٹائم مشین کے ذریعے ماضی میں سفر کرنے پر سزا سنائی گئی۔ پولیس والے اسے مستقبل کی دنیا یعنی اپنی دنیا میں واپس لے گئے تھے۔

وہ خواب ناک سے انداز میں مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی' کیا ہی اچھا ہو' اگر کلرگ کوئی کسی قسم کا غیر ملکی ہونے کے بجائے مستقبل کی دنیا کا کوئی آدمی ہو' جس کے پاس سنانے کے لئے بے شمار انوکھی قسم کی داستانیں ہوں اور جو اپنی دنیا کی حیرت انگیز ایجادات ساتھ لے کر آیا ہو۔ ایسی ایجادات جو موجودہ دنیا میں لاکھوں ڈالرز میں فروخت ہو سکتی ہوں.....

❋❋❋✱❋❋❋

ایک ہفتے بعد انہوں نے کلرگ کو رات کے کھانے کے لئے مدعو کیا۔ اس موقعے پر بھی پہلے تو وہ پیچھے دیکھے بغیر جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ وہ سیدھا فرش پر گرا۔ اور جب والٹر اور اس کی بیوی مل کر محبت سے اس کے کپڑے جھاڑ رہے تھے تو وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا "میں ابھی تک اس بات کا عادی نہیں ہو سکا کہ ___" لیکن پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ڈورس نے کھانے کے سلسلے میں کافی اہتمام کیا تھا۔ اپنی ماں سے سیکھے ہوئے فارمولوں کے مطابق اس نے کئی ڈشیں تیار کی... تھیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی محنت ضائع ہی جا رہی تھی کیونکہ کلرگ بہت کم کھانے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ وہ سب چیزیں بس چکھ رہا تھا۔ وہ بھی گویا ڈرتے ڈرتے۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے آج پہلی بار کھانے کا طریقہ اس کی سمجھ میں آیا ہو۔ البتہ پنیر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ اسے کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا کر استعمال کرنے کے بجائے خوشی خوشی بہت سا کھا گیا' جیسے وہ بھی کوئی ڈش ہو۔

والٹر اور ڈورس خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پنیر ختم کر کے اس نے نہایت آسودہ سی سانس لی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ بہت اچھی چیز تھی۔ بالکل...... جیسی۔" جملے کے درمیان اس نے تشبیہ کے لئے جو لفظ استعمال کیا وہ والٹر اور ڈورس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ تلفظ سے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے کہا 'ہوسی مون جو۔'

کھانے کے بعد وہ شکریہ ادا کر کے فوراً ہی رخصت ہو گیا۔

ڈورس طویل سانس لے کر بولی "خدا کی پناہ.....!"

والٹر الجھن کے سے عالم میں بولا "سوری ہنی! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنا عجیب آدمی ثابت ہوگا۔ خیر...... کوئی کوئی غیر ملکی شاید اتنا ہی عجیب ہوتا ہو۔ وہ کیا لفظ بولا تھا اس نے؟"

"سی مون جو" ڈورس نے جلدی سے بتایا۔ والٹر نے یہ لفظ کاغذ پر لکھ لیا۔

جب وہ دونوں مل کر برتن دھو رہے تھے تو ڈورس بولی "میرا خیال ہے وہ نشے میں دھت تھا۔ اس لئے بیٹھتے وقت فرش پر گر جاتا تھا۔"

"نہیں' یہ بات نہیں۔" والٹر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جب وہ پہلی بار میرے پاس آفس میں آیا تب بھی یہی ہوا تھا۔ اصل میں وہ بالکل اس طرح بیٹھ جاتا ہے جیسے اسے توقع ہو کہ کرسی خود بخود اس کے نیچے آ جائے گی۔ بجائے اس کے کہ پہلے وہ کرسی اپنی طرف کھینچے یا یہ دیکھ کر بیٹھے کہ اس کے نیچے کرسی موجود ہے یا نہیں۔"

پھر والٹر قہقہہ لگا کر بولا "ہو سکتا ہے وہ شاہی خاندان کا فرد ہو۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ملکہ وکٹوریہ بھی بیٹھتے وقت یہ نہیں دیکھتی تھی کہ اس کے پیچھے کرسی موجود ہے یا نہیں۔ اسے یقین ہوتا تھا کہ وہ جہاں کھڑی ہے وہاں پہلے سے کرسی موجود ہے یا کسی نے لا کر رکھ دی ہے۔"

"اب ان ملکاؤں اور بادشاہوں کا زمانہ نہیں رہا۔" ڈورس ناگواری سے بولی۔

"آج ٹی وی پر کوئی خاص پروگرام ہے؟" والٹر نے پوچھا۔ لیکن جواب ملنے سے پہلے ہی اس نے گویا ارادہ بدل دیا اور بولا۔ "میرا خیال ہے آج میں ٹی وی دیکھنے کے بجائے کچھ پڑھ لیتا ہوں۔ تم اپنے وہ احمقانہ قسم کے رسالے کہاں رکھتی ہو؟ آج میں بھی ان میں سے کچھ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

ڈورس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا لیکن ایک رسالہ بہرحال لا دیا۔ وہ خود سبز جلد والی ایک کتاب لے کر بیٹھ گئی جسے اس نے برسوں سے کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ والٹر قدرے بے دلی سے رسالے کے اوراق پلٹنے لگا۔

چند منٹ بعد ڈورس ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولی "مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ "سی مون جو" کس زبان کا لفظ ہے۔"

والٹر فوراً چوکنا سا ہو گیا "کس زبان کا ہے؟"

"اسپرانٹو زبان کا" ڈورس نے لفظ کا صحیح تلفظ بھی ادا کر کے بتایا۔ پھر بولی "اس کا مطلب ہے عالمی خوراک۔"

"اسپرانٹو کس ملک کی زبان ہے؟" والٹر نے دریافت کیا۔

"یہ کسی ملک کی زبان نہیں۔ ساری دنیا کے لوگوں کے آپس میں رابطے اور سہولت کے لئے کچھ دانشوروں نے یہ زبان گھڑی تھی۔ اس کے پیچھے فلسفہ یہ تھا کہ پوری دنیا کے لوگوں میں اتفاق و یک جہتی پیدا کرنے کے لئے کوئی ایک زبان ہونی ضروری ہے۔ مختلف زبانیں لوگوں کے درمیان دوری پیدا کرتی ہیں۔ یہاں تک دعویٰ کیا جاتا تھا کہ پوری دنیا کی زبان ایک ہو جائے تو جنگیں بھی ختم ہو جائیں۔ میں بھی کسی زمانے میں اس فلسفے سے متاثر تھی اور اسپرانٹو سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے مستقبل کی زبان بھی کہا

جاتا ہے۔" کسی اندرونی جوش کے باعث ڈورس کی آواز میں ارتعاش تھا۔

والٹر فیصلہ کن لہجے میں گویا اپنے آپ سے مخاطب ہوا "میں اس معاملے کی تہ تک پہنچ کر رہوں گا۔"

دوسرے روز اس نے کلرگ کو علاقے کے سینما ہاؤس میں دیکھا۔ وہ میٹنی شو کے لئے ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے کم از کم تین گھنٹے کے لئے گھر سے باہر رہنا تھا۔ والٹر فوراً تیز تیز قدموں سے اس بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا جو اس نے کلرگ کو کرائے پر دلوایا تھا۔

اس کے پاس بنگلے کی فاضل چابی موجود تھی اور تالا کھولتے وقت اسے کوئی گھبراہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ علاقے کا ایک جانا پہچانا، معزز اور شریف آدمی تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اس کے پاس اکثر کئی مکانوں کی چابیاں موجود رہتی تھیں اور وہ مختلف ضروریات کے لئے انہیں کھول کر دیکھنے کے لئے جاتا رہتا تھا۔ تالا کھولتے ہوئے کوئی اسے دیکھ لیتا تب بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ کلرگ کے سوٹ کیسوں کے تالوں پر آزمانے کے لئے مختلف چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا بھی اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ لیکن اندر پہنچ کر اسے اس گچھے میں سے کوئی بھی چابی استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کپڑوں کی الماری میں دونوں سوٹ کیس غیر مقفل ہی رکھے ہوئے تھے۔

دونوں سوٹ کیسوں میں زیادہ تر عمدہ قسم کے نئے کپڑے ہی تھے جو اونچے درجے کی مقامی دکانوں سے خریدے گئے تھے۔ ایک بہترین قسم کی اسپورٹس جیکٹ کی جیب میں والٹر کو کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے وہ کاغذ نکالا۔

وہ کسی اخبار کا ایک ورق تھا۔ اخبار سے پھاڑ کر تہ کر کے جیب میں رکھ لیا گیا تھا۔ بعد میں غالباً جیکٹ کا مالک اسے بھول گیا تھا۔ اس کے کنارے، سادہ حصے پر کچھ عجیب سا حساب کتاب کیا گیا تھا۔ پنسل سے کچھ ہندسے اور عجیب عجیب سی علامتیں بنی ہوئی تھیں۔ اس حساب کتاب کی وجہ سے ہی غالباً اخبار کا وہ حصہ پھاڑ کر رکھا گیا تھا۔ اخبار پر تاریخ درج تھی۔ ۱۸ جولائی ۲۳۵۳ء۔

اس صفحے پر چھپی ہوئی خبریں وغیرہ پہلے تو والٹر کی سمجھ میں نہیں آئیں لیکن تھوڑی سی مغز ماری کے بعد اسے معلوم ہو گیا کہ چکر کیا تھا۔ دراصل الفاظ کے ہجے بہت زیادہ مختلف تھے لیکن اگر انہیں بہ آواز بلند پڑھا جاتا تو انگریزی الفاظ عام تلفظ کے مطابق ہی ادا ہوتے تھے۔ والٹر نے بہ آواز بلند پڑھا تو ایک خبر یوں اس کی سمجھ میں آئی۔

ٹائم پولیس کا آفیسر پکڑا گیا۔ سرکاری وکیل کی اس کے لئے سزائے موت کی درخواست۔

ٹائم پولیس کے پیٹرول مین آسکر گارتھ کو آج اس کے مکان نمبر چار ہزار تین سو پینسٹھ، واقع اسٹریٹ نمبر نو ہزار آٹھ سو ساٹھ سے گرفتار کر لیا گیا اور پولیس اسٹیشن نمبر نو ہزار سات سو تہتر کی حوالات میں ڈال دیا گیا۔ مذکورہ پولیس آفیسر کو ایک مفرور قیدی کے تعاقب میں اکیسویں صدی میں بھیجا گیا تھا جہاں اس نے اکیسویں صدی کے ایک شخص کے سامنے یہ راز فاش کر دیا کہ ٹائم پولیس کا وجود ہے۔ واضح رہے کہ چھبیسویں صدی کے بعض قیدی یا کبھی کبھار کوئی عام شہری فرار ہو کر اکیسویں صدی میں چلا جاتا ہے۔ ان کے تعاقب میں جس پولیس آفیسر کو بھیجا جاتا ہے، اسے بے پناہ محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ چھبیسویں صدی کے بارے میں راز فاش کرنے سے ہماری پوری موجودہ تہذیب کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں اور سماجی ڈھانچہ متزلزل ہو سکتا ہے۔ جرم کی سنگینی کو مدنظر رکھتے ہوئے پیٹرول مین آسکر گارتھ کے لئے سزائے موت کی درخواست کی جائے گی۔

اس ورق کے دوسری طرف ایک اشتہار جلی حروف میں چھپا ہوا تھا۔

پُرعزم نوجوان متوجہ ہوں۔

'اپنی صدی کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے نوجوان فوری طور پر ریزرو ٹائم پولیس میں بھرتی ہوں۔ یاد رکھیں کہ صرف ٹائم پولیس میں ملازمت کے دوران ہی آپ کو یہ موقع میسر آتا ہے کہ گزشتہ صدیوں کی مختلف تہذیبوں میں سفر کر سکیں اور اپنی تہذیب کو مختلف نوعیت کے خطرات سے تحفظ فراہم کر کے قوم کی خدمت کر سکیں۔ بے شک کوئی اور شعبہ نوجوانوں کے لئے ٹائم پولیس سے بہتر اور باوقار ملازمت کے مواقع فراہم نہیں کرتا۔'

اسی اشتہار کے نیچے ایک اور اشتہار کی سرخی اور عبارت کچھ یوں تھی۔

کیا آپ اپنی سفری کرسیوں سے پریشان ہیں ہم پرانے ماڈل کی ان سواریوں سے پیچھا چھڑائیے اور نئے ماڈل کی رول فاسٹ' خریدیے۔

رول فاسٹ سفری کرسیوں میں جدید ترین ماڈل کا نام ہے۔ یہ اب ہر جگہ دستیاب ہے۔ آپ کہیں بھی جانا چاہیں رول فاسٹ پر بیٹھیے' آپ پلک جھپکتے میں وہاں ہوں گے۔"

رول فاسٹ کے دھات والے حصے ٹھوس سونے سے تیار کیے گئے ہیں تاکہ ان پر پالش وغیرہ کی زحمت نہ کرنی پڑے۔ اس کے بال بیرنگ وغیرہ چھ انچ موٹے اعلیٰ ترین ہیرے سے تیار کیے گئے ہیں تاکہ جلد نہ گھسیں اور طویل عرصے تک کار آمد رہ سکیں۔ آج ہی قریبی اسٹور سے اپنے لیے رول فاسٹ کم قیمت پر خریدیے۔ یہ رعایت محدود مدت کے لیے ہے۔

یہ اشتہار پڑھتے ہوئے والٹر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ کیسی سواری ہوگی جس میں ٹھوس سونا اور چھ انچ موٹے ہیرے استعمال کیے جا رہے تھے! کلرک یقیناً ٹائم پولیس کا آدمی تھا۔ والٹر کو صحیح طور پر اندازہ تو نہیں ہو سکا تھا کہ ٹائم پولیس کے فرائض کیا تھے لیکن ایک بات اسے یقینی طور پر معلوم ہو گئی تھی کہ اکیسویں صدی میں آکر ان پولیس والوں کے لیے رازداری قائم رکھنا بہت ضروری تھا۔ اپنا راز افشا کرنا ان کے لیے ایک ایسا جرم تھا جس کی سزا موت بھی ہو سکتی تھی۔

گویا.... بیسویں صدی کا ٹائم پولیس والا اب بیسویں صدی کے آدمی کی مٹھی میں تھا۔ وہ بیسویں صدی جس میں سونا اور ہیرے اس طرح عام استعمال میں تھے جس طرح والٹر کی دنیا میں لوہا اور شیشہ۔

وہ اس وقت بھی وہیں موجود تھا جب کلرک بینٹی شو سے واپس آیا۔ وہ والٹر کو اپنے کمرے میں موجود پا کر قدرے حیران ہوا لیکن اسے زیادہ دیر حیران ہونے کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ والٹر نے اخبار کا وہ ورق کچھ فاتحانہ سے انداز میں اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

کلرک نے ورق تیزی سے اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ ایک نظر اسے دیکھا اور گولا سا بنا کر مٹھی میں بھینچ لیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں اور وہ کراہ کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اپنی دانست میں شاید وہ صوفے پر ڈھیر ہونے لگا تھا۔

"اب میری موت یقینی ہے۔" وہ رو دینے والی آواز میں گویا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

"سنو کلرک!" والٹر بولا "ضروری نہیں ہے کہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ معلوم ہو۔"

کلرک کی آنکھوں میں امید کی کرن نمودار ہوئی اور وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے تیزی سے بولا "تمہارا مطلب ہے کہ تم اپنی زبان بند رکھو گے؟ یہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔"

"لیکن زندگی کی کچھ نہ کچھ قیمت تو دینی پڑتی ہے۔" والٹر بلا تکلف اور بلا تمہید بولا۔ اس کے لہجے میں کاروباری سفاکی تھی۔ "مجھے سونے اور ہیروں کی ضرورت ہے۔ کیا تم یہ چیزیں اس صدی میں لا سکتے ہو؟"

"میری دنیا میں ان کی کمی محسوس کر لی جائے گی۔ جہاں میری املاک کا پورا حساب کتاب درج ہے وہاں فوراً فرق ظاہر ہو جائے گا جس پر مجھ سے جواب طلب کیا جا سکتا ہے۔" لیکن پھر گویا مسئلے کا حل اس کی سمجھ میں آ گیا اور وہ جلدی سے بولا "البتہ ایک اور طریقہ ہو سکتا ہے۔ میرے پاس ڈپلیکیٹنگ مشین موجود ہے۔ میں تمہارے لیے یہاں سونے اور ہیروں کی ڈپلی کیٹ کاپی تیار کر سکتا ہوں' وہ اصل ہی جیسی ہوگی۔ یہاں کے اخراجات کے لیے میں نے رقم کا بندوبست اسی طرح کیا تھا اور اسی میں سے تمہیں بھی زرِ کرایہ داری ادا کیا تھا۔"

اس نے اپنی جیب سے ایک تکہ نکالا جو پہلی نظر میں والٹر کو فاؤنٹین پین معلوم ہوا لیکن پھر اندازہ ہوا کہ وہ فاؤنٹین پین سے کچھ مختلف تھا۔ کلرک قدرے ندامت سے بولا "یہ ذرا کم طاقت کا ڈپلیکیٹر ہے۔ اس سے ایک وقت میں صرف پانچ کلوگرام وزن کی اشیا کاپی کی جا سکتی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اگر میں تمہیں پانچ کلوگرام سونا اور ہیرے لا دوں تو تم ان کی ڈپلی کیٹ تیار کر دو گے اور اصل جوں کا توں رہے گا' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ یہ مشین کیا میں اسے استعمال کر سکتا ہوں؟"

کلرک نے فاؤنٹین پین نما وہ چیز اسے تھما دی۔ والٹر نے دیکھا' اس کے اندر باریک باریک تاروں' چاول کے دانوں کے برابر پرزوں اور دال کے دانوں کے برابر بلب وغیرہ کا ایک پیچیدہ سا جال پھیلا ہوا تھا۔ والٹر کو وہ تکہ کچھ گرم سا محسوس ہوا۔ اس نے قدرے گھبرا کر جلدی سے وہ کلرک کو واپس تھما دیا۔

کلرک بولا "تم ٹھیک سمجھے۔ تم جتنے زیورات یا سونا اور ہیرے خرید کر لا سکتے ہو یا کسی سے مستعار لے سکتے ہو۔ میں ان کی ڈپلی کیٹ تیار کر دوں گا۔ اس کے بعد تم اصل واپس کر سکتے ہو اور کاپیاں رکھ سکتے ہو۔ لیکن تمہیں حلف اٹھانا ہوگا کہ تم میرے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گے۔"

والٹر کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ اپنی جائیداد اور کاروبار رہن رکھ کر' بینک سے اپنی تمام پونجی نکلوا کر انشورنس کی رقم نکلوا کر اور کچھ سرٹیفکیٹ وغیرہ کیش کروا کے وہ مجموعی طور پر تقریباً ساٹھ ہزار ڈالر کا بندوبست کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس ساری رقم کے ہیرے خرید لیتا اور راتوں رات وہ دُگنے ہو جاتے....!

"میں کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔" والٹر جلدی سے بولا "بشرطیکہ تم نے بھی اپنے وعدے پر عمل کیا۔" اس نے جھپٹ کر کلرک کے ہاتھ سے اخبار کا وہ مڑا تڑا ورق لے لیا "جب تک تم میرا کام نہیں کرتے یہ میرے پاس ضمانت کے طور پر محفوظ رہے گا۔ ہیرے ڈپلی کیٹ کرانے کے بعد میں اخبار کے اس ورق کو جلا

دوں گا اور اس واقعے کو بھول جاؤں گا۔ تب تک تم اس گھر سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ میں دو ایک دن میں رقم اکٹھی کر کے اور وہ چیزیں خرید کر تمہارے پاس آؤں گا جنہیں ڈپلی کیٹ کرنا ہو گا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے" کلرک نے مضمحل سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

لیکن ظاہر ہے' رازداری کے وعدے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ والٹر اپنی بیوی کو بھی کچھ نہ بتاتا۔ گھر پہنچ کر اس نے ڈورس کو سارے معاملے سے آگاہ کیا۔ اس کے حلق سے مسرت بھری چیخ نکل گئی۔ اس نے وہ اخبار دیکھنے کی فرمائش کی۔ والٹر نے اخبار اسے دیا اور اس نے نہایت اشتیاق و انہماک سے اسے پڑھنے کے بعد فوراً کلرک سے ملنے کی فرمائش کر ڈالی۔ اس کا اشتیاق دیدنی تھا۔

"میرے خیال میں وہ تمہارے سامنے زبان نہیں کھولے گا۔" والٹر پُر خیال انداز میں بولا "لیکن اگر تم ضد کر رہی ہو تو چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

وہ دونوں کلرک کے گھر پہنچے تو وہ گھر پر نہیں تھا' اس کا سامان بھی غائب تھا' وہاں اس کی موجودگی کا کوئی نشان باقی نہیں تھا۔ مکان پہلے کی طرح خالی پڑا تھا۔ اس کے باوجود وہ امید کے سہارے گھنٹوں وہاں بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ آخر ان کی امید مایوسی میں بدل گئی۔

آخر کار ڈورس بولی "وہ بھاگ گیا ہے۔ اپنی صدی میں واپس چلا گیا۔"

والٹر اس کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا "اس نے اچھا نہیں کیا' اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اب میں بھی اپنا وعدہ پورا کرنے کا پابند نہیں ہوں۔ آؤ..... ہم روزنامہ انٹرپرائز' کے دفتر چلتے ہیں اور ساری کہانی سناتے ہیں۔"

روزنامہ انٹرپرائز' مقامی اخبار تھا۔

اخبار کے دفتر میں ایک رپورٹر نے بڑی توجہ سے ان کی کہانی سنی اور خاصی توجہ سے پچیسویں صدی کے اخبار کا بھی جائزہ لیا۔ پھر بولا "میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کیا چکر چلانے کی کوشش کر رہے ہیں مسٹر والٹر! بہرحال یہ اپنے کاروبار کو پبلسٹی دینے کا بہترین طریقہ ہے اور اس قسم کی پبلسٹی ہم مفت نہیں دیتے۔ اس کا معاوضہ لیتے ہیں۔"

"لیکن....." والٹر نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کے چہرے پر سرخی آگئی تھی۔

رپورٹر اس کی بات سننے کے بجائے انٹرکام اٹھا کر اس کا ایک بٹن دبا چکا تھا۔ انٹرکام پر اس نے کسی سے کہا "سام! ذرا مورس کو تو میرے پاس بھیجو۔"

انٹرکام رکھ کر اس نے والٹر کو بتایا "مورس ہمارے پریس کا انچارج ہے۔ وہ اگر ذرا پچیسویں صدی' کے اس اخبار کو ایک نظر دیکھے گا اور آپ کو مفید معلومات فراہم کرے گا۔"

مورس سفید بالوں والا ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اس نے آکر اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھا' سونگھا اور مواد کو پڑھنے کی کوشش کیے بغیر بولا "یہ امریکن ٹائپ فاؤنڈری کے نو نمبر کے حروف سے چھپا ہوا ہے۔ ان کا رواج تقریباً دس سال پہلے ختم ہو چکا ہے۔ انہیں ہاتھ سے سیٹ کیا جاتا تھا۔ سیاہی اخباری نہیں ہے' ذرا مہنگی قسم کی ہے جو کتابوں میں استعمال ہوتی ہے۔ برانڈ کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ کاغذ فلاڈلفیا کا ہے اور اچھی قسم کا ہے۔"

رپورٹر' والٹر کی طرف دیکھ کر بولا "دیکھا آپ نے مسٹر والٹر؟ یہ اخبار جعلی ہے۔"

والٹر تب تک خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ ہواؤں میں اڑتے اڑتے اس کے قدم زمین پر آ گئے تھے۔ وہ مُردہ سے قدموں سے چلتا ہوا اخبار کے دفتر سے نکل آیا۔ ڈورس کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ جہاں انہیں مایوسی ہوئی تھی وہاں ایک بہت بڑی واردات سے بال بال بچ جانے کی خوشی بھی تھی۔ اگر کلرک ایک آدھ دن اور رک گیا ہوتا تو بڑی آسانی سے انہیں ساٹھ ستر ہزار ڈالر کے جواہرات سے محروم کر جاتا۔ دس پندرہ دن کی محنت اور تھوڑے سے اخراجات کے عوض یہ سودا بہت شاندار تھا۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کلرک اپنی واردات کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر کیوں غائب ہو گیا تھا؟ ابھی تو اس کا فراڈ کسی پر کھلنے کے آثار بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ کیا اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا؟

❋❋❋✱✱❋❋❋

ہیری بائیسویں گلی والا اس وقت ایک بہت ہی عجیب و غریب مقام پر کھڑا حیرت سے پلکیں جھپکا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ وہاں کیونکر پہنچ گیا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ اس کے پاؤں تقریباً ایک فٹ گہرائی میں شفاف پلاسٹک میں دھنسے ہوئے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے گرد عجیب سے لوگ جمع تھے۔

پھر ایک بھاری آواز گونجی "ملزم ہیری ہیوٹ عرف ہیری بائیسویں گلی والا عرف کلرک کو پچیسویں صدی کی عدالت عالیہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے اس شخص پر الزام ہے کہ اس نے پچیسویں صدی کے ایک ٹائم پولیس آفیسر کا روپ دھار کر جعلسازی کی کوشش کی اور یوں پچیسویں صدی کے بارے میں راز فاش کرنے کا مرتکب ہوا جس سے ہماری تہذیب کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں اور سماجی ڈھانچہ متزلزل ہو سکتا ہے۔ جرم کی سنگینی کو مدنظر رکھتے ہوئے ملزم کے لئے سزائے موت کی درخواست کی جاتی ہے۔"

دُختر کہسار

ظفر اعجاز

حصول دولت کے لیے مہم جوئی اور جاں کوشی ہر قرن اور ہر صدی میں ایک مشغلہ رہی ہے۔ سیم و زر اور ہیرے جواہرات کی خاطر لوگ جان ہتھیلیوں پر رکھے پہاڑوں، جنگلوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے ہیں۔ کبھی کامیابی نے اُن کے قدم چومے اور اُن کی قسمت چمک اُٹھی، کبھی ناکامی نے اُنھیں نیست و نابود کر ڈالا۔ آج کے دَور میں بھی دولت مند بننے کے لیے لوگ مہم جوئی کرتے ہیں۔ یہ ایسے ہی چند سرپھروں کا احوال ہے جو دولت کی طلب میں اپنی زندگی داؤ پر لگا بیٹھے تھے۔

دراز قد انگریز نے اپنے خنجر کی نوک سے زمین پر نقشہ بناتے ہوئے اپنے ساتھی کو راستہ سمجھانا شروع کیا "میں پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں نارمن کہ مغرب میں واقع یہی وہ چوٹی ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ تم اس نقشے کو ذہن نشین کر لو۔ یہ ہمارا خیمہ ہے اور یہ اس جانب کا راستہ چوٹی کو جاتا ہے۔ ہم نے اب تک شمال کی جانب سفر کیا ہے۔ لیکن اس جگہ سے ہمیں مغرب کی سمت مڑ جانا چاہیے۔ تم سمجھ گئے یا نہیں؟ اب ہمیں......"

"خاموش!" نارمن نے جلدی سے خبردار کیا "اس نقشے کو جلدی سے مٹا دو، برق آ رہا ہے۔"

بروک نے جلدی سے زمین پر بنا ہوا نقشہ مٹا دیا اور پھر کھڑے ہو کر اپنے پیروں سے زمین برابر کر دی۔ وہ دونوں ہنس ہنس کر اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے برق کی آمد سے بے خبر ہوں۔

برق اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں قد میں چھوٹا تھا لیکن اس کا جسم گٹھا ہوا اور فولاد کی طرح مضبوط تھا۔ اس کے ساتھی جانتے تھے کہ وہ دونوں مل کر بھی برق کو زیر نہیں کر سکتے۔ برق اپنے نام کی طرح پھرتیلا تھا اور اس کی تلوار بجلی کی طرح کاٹ رکھتی تھی۔ وہ قابلِ اعتماد دوست اور خطرناک دشمن تھا۔ ساری زندگی کی مہم جوئی نے اسے سخت حالات میں بھی اطمینان کی زندگی بسر کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ وہ پُرخطر لمحات میں بھی ذہنی توازن برقرار رکھتا تھا۔ وہ ایسا جنگجو تھا جو جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ ذہنی صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ اس لئے چالاک دشمن بھی اسے شکست نہیں دے سکتا تھا۔

برق کا باپ ترک اور ماں ہندوستانی تھی۔ زندگی کا بیشتر حصہ ترکستان اور ہندوکش کے پہاڑی علاقوں میں گزارنے کی بنا پر اسے ایشیائی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اس کا لباس اس وقت بھی اپنے ساتھیوں سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی پہاڑی علاقے کا چرواہا اپنی بھیڑیں چرانے کے لئے نکلا ہے۔ اس کی تیز چمکیلی

آنکھیں دونوں انگریز ساتھیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

"ہم دونوں اس چوٹی کے بارے میں غور کر رہے تھے۔" نارمن نے کہا "پتا نہیں اس کا کیا نام ہے۔" اس نے دور نظر آنے والے ایک پہاڑ کی چوٹی کی سمت اشارہ کیا جس پر جمی ہوئی برف چمک رہی تھی۔

"ان پہاڑوں کی ہر چوٹی کا کوئی نہ کوئی نام ضرور ہے۔" برق نے جواب دیا "تم جس چوٹی کی سمت اشارہ کر رہے ہو اس کا نام کوہ ارلک خان ہے۔ بہت کم سفید فام لوگوں کو یہ چوٹی دیکھنا نصیب ہوئی ہے۔"

"کم از کم میں نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا۔" بروک نے کہا۔ "اگر ہمیں بے چارے رینالڈ کی تلاش کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو اس خوب صورت چوٹی کو قریب سے دیکھتے۔"

"ہاں' بشرطیکہ وہاں تک زندہ پہنچ جاتے۔" برق نے کہا۔ "یہاں کے پہاڑی قبائل کسی غیر ملکی کو اپنے علاقے میں برداشت نہیں کرتے۔ یہ بہت خطرناک علاقہ ہے بروک۔"

"ہاں' سنا ہے یہاں کے لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور جادوگر کہلاتے ہیں۔ اسی علاقے میں کہیں اوٹکن کا شہر واقع ہے جہاں ان کی بہت بڑی خانقاہ ہے۔"

"تم نے جو کچھ سنا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ وہ لوگ شیطان کے پجاری ہیں۔"

"یہ سب بکواس معلوم ہوتی ہے۔"

"نہیں' یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔ وہ شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔" برق نے جواب دیا "ہم اس علاقے کی سرحد سے بالکل قریب ہیں۔ جس جگہ ہم اس وقت خیمہ زن ہیں' یہ مسلمان قبائل کا علاقہ ہے۔ یہ بڑے جیالے لوگ ہیں۔ اپنے علاقے میں کسی اجنبی کو نہیں آنے دیتے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ابھی تک انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا۔ ان لوگوں کو سفید فاموں سے بڑی نفرت ہے۔"

"لیکن اس ویران اور بنجر علاقے میں کیا رکھا ہے جو وہ اتنا ڈرتے ہیں۔"

"وہ ڈرتے کسی سے نہیں۔ ان کا تعلق اس قدیم قبائل سے ہے جو سکندرِ اعظم اور چنگیز خان کے دور سے آباد ہیں۔ مغل حملہ آوروں کے دور میں انہوں نے اسلام قبول کیا' اور انگریزوں کو اپنا بدترین دشمن تصور کرتے ہیں۔"

"پھر تو یہ علاقہ ہمارے لئے واقعی خطرناک ہے۔"

"ہاں' اسی لئے ہم یہاں سے اب شمال کی جانب سفر کریں گے تاکہ ان قبائل سے واسطہ نہ پڑے۔ امید ہے ایک ہفتے کے اندر ہم کشنا پہنچ جائیں گے۔ تمہیں یقین ہے کہ تمہارے دوست رینالڈ کو اسی جگہ اغوا کیا گیا تھا؟"

"ہاں' خدا کرے وہ اب تک زندہ ہو۔"

"تم نے جب میری خدمات حاصل کی تھیں' میں نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ ساری جدوجہد بیکار ہوگی۔" برق نے کہا "اگر اسے قبائلیوں نے اغوا کیا ہے تو اتنے عرصے تک اس کے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہیں۔ میں اس لئے بار بار خبردار کر رہا ہوں کہ بعد میں تم کو مایوسی نہ ہو۔"

"شکریہ برق۔" نارمن نے کہا "ہم جانتے تھے کہ تمہارے علاوہ اور کوئی ہمیں وہاں تک زندہ سلامت نہیں پہنچا سکتا۔"

"لیکن ابھی تک ہم وہاں نہیں پہنچے ہیں۔" برق نے یاد دلایا اور اپنی رائفل کندھے پر ڈال کر کھڑا ہو گیا "یہاں شکار کے آثار ہیں۔ میں جا کر دیکھتا ہوں شاید کچھ مل جائے۔ ممکن ہے کہ شام سے پہلے واپس نہ آسکوں۔"

"کیا پیدل جاؤ گے؟"

"ہاں۔ فکر نہ کرو گوشت لے کر آؤں گا۔" برق نے چلتے ہوئے کہا۔

برق جب ڈھلوان پر پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ دونوں آہستہ چلتے ہوئے بلند ٹیلے پر پہنچ کر اسے دیکھتے رہے اور پھر کیمپ کی سمت واپس روانہ ہو گئے۔ خیموں کے سامنے ان کے ملازم کام میں مصروف تھے۔ ان میں چار دراز قد تو ان کے ساتھ آئے تھے۔ ایک ترک احمد نام کا تھا جو برق کا ذاتی ملازم تھا۔ اس پہاڑی ویرانے میں دور دور تک کسی انسانی وجود کا نشان نظر نہ آتا تھا۔ ان کے خیموں کے علاوہ ہر سمت بلند پہاڑوں کے سلسلے تھے۔ مکمل سکوت تھا اور ہر جگہ ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف چمک رہی تھی۔ چھوٹی پہاڑیوں کی ڈھلوانوں پر سبزے کا فرش بچھا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ کہیں کہیں گھنے درختوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ لیکن دونوں فرنگیوں کی نگاہ کوہِ ارلک خان کی چوٹی پر جمی ہوئی تھی۔

"میرے خیمے میں آؤ۔" بروک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے خیمے کے اندر چلے گئے۔ ان دونوں کو پتا نہیں تھا کہ احمد کی تیز نگاہیں غور سے ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ خیمے کے اندر پہنچ کر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے اور بروک نے ایک کاغذ نکال کر اس پر پنسل سے پھر وہی نقشہ بنایا جو پہلے زمین پر کھینچا تھا۔

"رینالڈ سے ہمیں جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔" نارمن نے کہا "اور اب برق کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اسے یہاں تک ساتھ رکھنا ایک ایسا خطرہ تھا جسے ہمیں مجبوراً مول لینا پڑا کیونکہ ان قبائلی علاقوں سے اور کوئی ہم کو بحفاظت یہاں تک نہیں لا سکتا تھا۔ اس شخص کی وجہ سے مسلمان قبائل ہماری راہ میں حائل نہیں ہوئے' لیکن اب جن علاقوں سے گزرنا ہے وہاں کے قبائل پر برق کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔"

"تم کو یقین ہے؟"

"ہاں' یہ وہی چوٹی ہے جس کی ہمیں تلاش تھی' اور برق نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ اب اوگن تک پہنچنے کے لئے ہمیں برق کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے؟"

"یہ تو بہت آسان ہے۔" نارمن نے کہا "ہم اس سے کسی بات پر جھگڑا کئے لیتے ہیں اور اس کو بہانہ بنا کر صاف کہہ دیں گے کہ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ظاہر ہے وہ غصے میں ہمیں چھوڑ کر واپس چلا جائے گا۔"

"بہت خوب!" بروک نے کہا "لیکن اس سے جھگڑا کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ وہ وار کرنے اور گولی چلانے میں بہت پھرتیلا ہے۔ اور پھر ہم یہ نہیں چاہتے کہ اسے یہ اندازہ بھی ہو سکے کہ ہماری منزل اوگن ہے۔ برق علاقوں کے چپے چپے سے واقف ہے۔ وہ جلد یہ پتا چلا لے گا کہ ہم اوگن کی سمت گئے ہیں۔"

"تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں کسی اور طرح سے اس کو ٹھکانے لگانا ہوگا۔ لیکن اس کے لئے.... ہشت!" نارمن نے چونک کر کہا۔ "یہ آہٹ کیسی تھی؟" اس نے پھرتی کے ساتھ پستول نکالا۔

"اسی طرح باتیں کرتے رہو۔" بروک نے سرگوشی میں کہا' "کوئی خیمے کے باہر کھڑا ہماری باتیں سن رہا ہے۔" اس نے بلند آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ نارمن آہستہ سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے پھرتی کے ساتھ خیمے کا پردہ ہٹایا اور باہر نکلا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غراتا ہوا کسی پر جھپٹا اور پھر احمد کو دھکیلتا ہوا خیمے کے اندر لایا۔

"یہ بدمعاش چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا۔" اس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ احمد نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

"اب یہ سب کچھ برق کو بتا دے گا اور مصیبت آ جائے گی۔" بروک نے گھبرا کر کہا "اب کیا کیا جائے؟"

"فکر نہ کرو' ہم نے اتنی محنت اس لئے نہیں کی ہے کہ یہ چوہا اسے برباد کر دے۔" نارمن نے قہقہہ لگاتے ہوئے پستول لہرایا۔ "میں اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دوں گا۔"

احمد کا ہاتھ غیر اختیاری طور پر بلند ہوا "نہیں!" وہ چیخا' لیکن اس کی آواز گولی کے دھماکے میں دب کر رہ گئی۔

"اب ہمیں برق کو بھی ہلاک کرنا ہوگا۔" بروک نے ایک ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ صاف کیا اور مسکراتے ہوئے اپنے ساتھی کو دیکھا۔ ملازمین بھاگتے ہوئے خیمے کے باہر جمع ہو گئے تھے۔ وہ اپنی زبان میں زور زور سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ شاید گولی چلنے کی آواز نے ان کو خوف زدہ کر دیا تھا۔

"وہ خود ہمارے جال میں پھنس گیا ہے۔" نارمن نے کہا۔

"کیا مطلب؟" بروک نے پوچھا۔

"وہ پیدل گیا ہے۔ اس کے پاس صرف چند کارتوس ہیں۔ ہم ابھی یہاں سے سامان لاد کر اپنی منزل کی سمت روانہ ہو جائیں گے۔ اگر وہ پیدل ہمارا تعاقب کرتا ہے تو کرنے دو۔ اس ویران پہاڑی علاقے میں کھانے' گرم لباس اور کارتوسوں کے بغیر وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے گا۔ اب ہمیں اس کی منحوس شکل نظر نہ آئے گی۔"

●●●**●●●

برق جب کیمپ سے روانہ ہوا تو اس کے ذہن میں کسی غداری کا تصور بھی نہ تھا۔ اسے اپنے فرنگی ساتھیوں کی نیت پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ دونوں اپنے ساتھی رینالڈ کی تلاش میں جا رہے ہیں اور انہوں نے صرف اسی مقصد کے لئے اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک شکار کی تلاش میں گھومتا رہا۔ معاً اسے ایک بارہ سنگھا نظر آیا جو جھاڑیوں کی دوسری جانب چر رہا تھا۔ برق دبے پاؤں شکار کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ جھاڑیوں کی آڑ لے کر بڑھ رہا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کا اپنا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے اپنے عقب میں جھاڑیوں کو ہلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پھر اس نے کن انکھیوں سے کسی کو پھرتی کے ساتھ حرکت کرتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے گولی اس کے کان کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے بجلی کی طرح پلٹ کر فائر کیا اور کوئی کراہتا ہوا جھاڑی کے اندر گرا۔ برق تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔

جھاڑیوں میں پڑا ہوا شخص بالکل ساکت تھا۔ وہ دبلا پتا سا نوجوان تھا۔ حلیے سے برق نے پہچان لیا کہ وہ ترکمان تھا اور ڈاکو لگتا تھا۔ اس نے دل میں کہا کہ شاید اس کا گروہ کہیں قریب ہی ہوگا۔ اسے یہ اندازہ کرنے میں بھی دیر نہ لگی کہ اس ڈاکو کا گھوڑا بھی کہیں قریب ہی ہوگا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ پیدل کہیں نہیں جاتے۔ اس ڈاکو نے کسی بلند جگہ سے اسے دیکھ لیا ہوگا اور پھر تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا۔ برق آگے بڑھتا ہوا ڈھلوان کو طے کر کے اوپر پہنچ گیا اور فوراً ہی اسے گھوڑا نظر آ گیا' جس پر زین کسی ہوئی تھی۔ اس نے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر ہر سمت کا جائزہ لیا۔ جنوب کی طرف کچھ فاصلے پر دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ "یقیناً ڈاکو وہیں خیمہ زن ہوں گے" اس نے سوچا۔ تاریکی پھیل رہی تھی۔ برق کو اپنے کیمپ سے نکلے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اس لئے اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔

کیمپ کے قریب والے ٹیلے پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ہر سمت ویرانی تھی۔ نہ خیمے تھے نہ اس کے ساتھی اور نہ گھوڑے۔ اس نے گردوپیش کے ٹیلوں کا جائزہ لیا' کوئی مشکوک بات نظر نہ آئی۔ وہ اپنی رائفل سنبھالے چوکنا ہو کر آگے بڑھا جہاں بروک کا خیمہ تھا۔ وہاں اسے خون کے دھبے نظر آئے لیکن اس کے علاوہ کسی جدوجہد کے آثار نظر نہ آئے۔ اس کی تجربہ کار

نگاہوں نے جلد اندازہ کرلیا کہ اس کے ساتھی عجلت میں خیمے اکھاڑ کر سامان سمیت کہیں روانہ ہوگئے ہیں۔ لیکن کیوں؟ کسی حملے کے آثار نہیں تھے' پھر کس چیز سے وہ خوف زدہ ہوئے؟ لیکن احمد اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔

اس نے گھوڑوں کے چھوڑے ہوئے نشانات سے یہ بھی اندازہ کرلیا کہ اس کے ساتھی مغرب کے بجائے شمال کی سمت گئے ہیں جدھر کوہ ارلک واقع تھا۔ وہ حیران تھا کہ وہ لوگ اس خطرناک علاقے کی سمت کیوں گئے ہیں۔ گھاس پر نشانات دیکھنے سے پتا چلا کہ کسی بھاری چیز کو گھسیٹ کر لے جایا گیا ہے۔ وہ ان نشانات کے ساتھ چلتا ہوا اس جھاڑی کے پیچھے پہنچ گیا جہاں احمد کی لاش پڑی تھی۔ پہلی نظر میں وہ احمد کو مُردہ ہی سمجھا تھا۔ لیکن اس نے جھک کر دیکھا تو سانس چل رہی تھی۔ اس نے احمد کا سر زانو پر رکھ کر اس کے لبوں سے پانی کی بوتل لگائی۔ نیم بے ہوش احمد نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں نے اپنے آقا کو پہچان لیا۔

"یہ کس کی حرکت ہے احمد؟" برق نے غمزدہ لہجے میں پوچھا۔

"نارمن صاحب۔۔۔" احمد نے رک رک کر کہا "میں ان کے خیمے کے باہر چھپ کر ان کی بروک صاحب سے باتیں سن رہا تھا۔ مجھے شک تھا کہ۔۔ وہ آپ سے غداری کر رہے ہیں۔۔۔ انہوں نے مجھے گولی ماردی۔"

"وہ کیا کہہ رہے تھے؟" برق نے تشویش سے پوچھا۔

"وہ لوگ اولگن جارہے ہیں۔ ہم جس رینالڈ صاحب کی تلاش میں نکلے تھے اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انہوں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا تاکہ آپ کے ذریعے یہاں تک پہنچ سکیں۔"

"لیکن وہ اولگن کیوں گئے ہیں؟"

احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ برق نے جھک کر دیکھا تو وہ مرچکا تھا۔ وہ غصے میں بھر گیا "احمد! میں تمہارے خون کا انتقام ضرور لوں گا۔" اس نے غضب ناک ہو کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں واقعی خون اتر آیا تھا۔

برق نے پتھر جمع کرکے وہیں پر احمد کی قبر تیار کی۔ اس کی تدفین سے فارغ ہو کر وہ گھوڑے کے قریب آیا۔ اپنے وفادار ملازم کی موت کا اسے شدید صدمہ تھا لیکن اسے یہ بھی فکر تھی کہ اس پہاڑی علاقے میں رات کیسے بسر کرے گا؟ سردی بڑھتی جارہی تھی۔ اس کے پاس نہ بستر تھا نہ خیمہ اور نہ کھانے پینے کا سامان۔ خوش قسمتی سے سواری کے لئے اسے گھوڑا مل گیا تھا۔ وہ ان علاقوں سے واقف تھا۔ اسے امید تھی کہ جلد کسی نہ کسی آبادی کو تلاش کرلے گا۔ لیکن پھر اسے احمد سے کئے ہوئے وعدے کا خیال آیا۔ اس نے احمد کے خون کا انتقام لینے کا عہد کیا تھا۔ اسے یہ عہد پورا کرنا تھا۔ اسے حیرت بھی تھی کہ اس کے دشمن اولگن کی سمت کیوں گئے؟ یہ ممنوعہ علاقہ تھا۔ اس کی حدود میں کسی اجنبی کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی لیکن اسے بھی اب اپنے دشمنوں کے تعاقب میں اسی سمت جانا تھا۔

تاریکی پھیل چکی تھی لیکن آسمان پر نکلے ہوئے تارے چمکنے لگے تھے۔ ان کی مدھم سی روشنی میں اس کے لئے راستہ طے کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ گھوڑا تازہ دم تھا اس لئے وہ اتنا وقت گزرنے کے باوجود فرنگیوں کو پکڑ سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ لوگ تمام رات سفر کریں گے اور اس بات سے مطمئن ہوں گے کہ وہ پیدل کتنا ہی تیز کیوں نہ چلے ان تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس نے کوہ ارلک کی برف پوش چوٹی کی طرف دیکھا اور اپنے گھوڑے کا رخ اس سمت موڑ دیا جدھر اولگن واقع تھا۔ اسے راستہ معلوم تھا کیونکہ وہ ایک بار اس شہر میں جاچکا تھا۔ اسے وہاں کے گنجے پجاری اور بڑے مندر کے فلک شگاف ہیکل کی آواز اب تک یاد تھی۔ وہ مندر جو کبھی مہاتما بدھ کے راہبوں کی خانقاہ تھی اب شیطان کے پجاریوں کے قبضے میں تھا۔

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی جب اسے آگ کی روشنی نظر آئی۔ نشیب میں ایک چشمے کے کنارے آگ روشن تھی۔ اس نے دیکھتے ہی اندازہ کرلیا کہ یہ ان فرنگیوں کا کیمپ نہیں تھا جن کا وہ تعاقب کر رہا تھا۔ آگ بہت سی جگہوں پر روشن تھی۔ یہ ان خانہ بدوش قبائل کا پڑاؤ تھا جو اولگن کے قرب وجوار میں پہاڑیوں اور وادیوں میں گھومتے رہتے تھے۔ یہ بڑے خونخوار اور وحشی لوگ تھے۔ سفید فاموں نے ان سے دور رہنا ہی پسند کیا ہوگا۔ اس نے کافی فاصلے سے چشمے کو پار کرنے کا ارادہ کیا اور درختوں کی آڑ سے ہوتا ہوا نشیب میں اتر کر چشمے کے کنارے پہنچا۔ جھاڑیوں کے پیچھے سے اس کی تیز نگاہوں نے گھوڑے سوار پہرے داروں کو دیکھ لیا تھا جو پڑاؤ کے ہر سمت پھیلے ہوئے تھے۔ اچانک اس نے کچھ اور بھی دیکھا۔ پڑاؤ کے بیچ میں تین خیمے نصب تھے اور یہ ان ہی قاتل فرنگیوں کے تھے۔ اگر ان خانہ بدوشوں نے نارمن اور بروک کو ہلاک کردیا تھا تو وہ کس سے انتقام لے گا؟ زیر لب خانہ بدوشوں کو کوستا ہوا وہ آگے بڑھا تاکہ قریب جا کر اندازہ کرسکے۔

وہ بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا لیکن خانہ بدوشوں کے ایک شکاری کتے نے کھیل خراب کردیا۔ وہ تاریکی سے اچانک برق پر جھپٹا تھا۔ اس کی غراہٹ کی آواز سنتے ہی خیموں سے مسلح افراد نکلے۔ گھوڑوں پر سوار پہرے دار بھی اپنے تیر کمان سنبھال کر اس کی سمت دوڑے۔ برق ان کے تیروں کا نشانہ نہیں بننا چاہتا تھا' اس لئے جھاڑیوں سے نکل کر خود ان کے درمیان پہنچ گیا۔ اس سے قبل کہ وہ سنبھل سکتے' اس کی تلوار ان کے سروں پر بجلی بن کر گری۔ گھوڑے سواروں نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا تھا لیکن حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ گھبرا گئے تھے۔ تین سوار گر چکے تھے کہ اچانک برق کو نارمن اور بروک کی آواز سنائی دی۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو درمیان سے ہٹنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ اسے حیرت ہوئی

کہ فرنگی ان خانہ بدوشوں کے قیدی نہیں تھے۔اس کا مطلب تھا کہ وہ ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔اس کے لئے اتنے حملہ آوروں کی موجودگی میں دشمن کو ہلاک کرنا ممکن نہ تھا۔اس نے جھاڑیوں کے پیچھے چھلانگ لگائی اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔حملہ آوروں نے تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ چیختے چلاتے اپنے پڑاؤ کی سمت واپس ہونے لگے۔شاید ان کو ڈر تھا کہ اس ہنگامے کے بعد کوئی بڑا حملہ ہونے والا تھا۔برق جانتا تھا کہ اب وہ تمام رات نہیں سوئیں گے؟اس لئے فرنگیوں تک پہنچنے کی کوشش بے سود ہوگی۔اسے حیرت یہ بھی تھی کہ یہ سب او گن کس لئے جا رہے تھے۔

برق تیزی کے ساتھ چٹانوں کو پھلانگتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں گھوڑا بندھا ہوا تھا۔گھوڑے پر سوار ہو کر وہ پوری رفتار سے اس سمت روانہ ہوا جدھر سے آیا تھا۔اس کا خیال درست نکلا۔جس جگہ اس کے ساتھیوں کا کیمپ تھا اس سے کوئی دس میل مغرب میں ایک دوسرے کیمپ کے آثار نظر آ رہے تھے۔جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں اسے خیمے صاف نظر آ رہے تھے۔اس نے قریب جانے کی کوشش نہیں کی۔ایک بلند چٹان کی آڑ میں اس نے گھوڑے کو درخت سے باندھ دیا اور نرم نرم گھاس پر چٹان سے ٹیک لگا کر دراز ہو گیا۔اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن ذہن جاگ رہا تھا۔

صبح کا اُجالا ابھی پھیلا بھی نہیں تھا کہ کیمپ میں زندگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔آگ دوبارہ روشن ہو گئی اور کھانے کی خوشبو فضا میں پھیلنے لگی۔لوگوں کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں برق کو صاف سنائی دے رہی تھیں۔یہ ترکمانوں کا وہ قبیلہ تھا جو لوٹ مار اور ڈاکا زنی پر گزارا کرتا تھا۔ان کے ساتھ عورتیں نہیں ہوتی تھیں تاکہ بھاگتے وقت ان کی وجہ سے دشواری نہ ہو۔جلد ہی انہوں نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔گھوڑوں پر زین کسی جانے لگی۔ہتھیار باندھے جانے لگے۔برق نے ان کے پاس جانے کا یہی لمحہ مناسب سمجھا۔وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اطمینان کے ساتھ کیمپ کی طرف روانہ ہوا۔اس کا گھوڑا دیکھتے ہی کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں اور دوسرے ہی لمحے کئی ایک رائفلوں نے اسے زد میں لے لیا۔لیکن اس کا گھوڑا بغیر رکے آگے بڑھتا رہا اور اسی جرأت مندی کی وجہ سے ترکمانوں کو گولی چلانے کی ہمت نہ ہوئی۔ان کے سردار نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے پاس پہنچ گیا۔دونوں گھوڑے رک گئے۔ترکمانوں کا سردار خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگا۔جلد ہی اس نے برق کو پہچان لیا۔

"یوسف خان کیا تمہاری بینائی بھی کمزور ہو گئی ہے؟" برق نے کہا "دیکھو میں نے تمہیں ایک بار پھر تلاش کر لیا۔"

یوسف خان اپنی سرخ داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بھیڑیے کی طرح غرایا "تمہارا دماغ تو درست ہے برق؟"

اس کا نام سنتے ہی ترکمانوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔وہ اسے بھولے نہیں تھے۔وہ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ان کی آنکھوں کی خونخوار چمک ماند پڑ گئی تھی لیکن یوسف خان مطمئن نہیں ہوا تھا۔اس کی مشکوک نگاہیں بار بار اس سمت میں اُٹھ رہی تھیں جدھر سے برق آیا تھا۔وہ بڑا ظالم اور مکار شخص تھا۔اس کے دل میں نہ کسی کے لئے دوستی کا جذبہ تھا اور نہ اعتبار کا۔لوٹ مار کے پیشے نے اسے حد درجے خود غرض بنا دیا تھا۔

"گھبراؤ نہیں یوسف خان، میں اکیلا ہی آیا ہوں۔" برق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" یوسف خان نے غراتے ہوئے کہا۔ "جلدی بتاؤ ورنہ میرے آدمی تمہاری کھال اتار لیں گے۔"

"میں اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے نکلا ہوں لیکن وہ تم نہیں ہو۔"

"تم احمق ہو۔"

برق ذرا سا جھکا اور دوسرے ہی لمحے ایک بھرپور تھپڑ یوسف خان کے رخسار پر پڑا۔ضرب اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ گھوڑے کی پشت سے گرتے گرتے بچا۔اس کا ہاتھ پھرتی کے ساتھ کمر تک گیا لیکن وہیں رہ گیا۔اس نے تلوار نکالی نہ پستول۔وہ کشمکش میں پڑ گیا تھا۔برق چاہتا تو اتنی دیر میں اسے ڈھیر کر سکتا تھا۔

"خبردار جو کسی نے حرکت کی!" برق گرجا "تم سب سے میرا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔یہ معاملہ میرے اور یوسف خان کے درمیان ہے۔" کوئی اور ہوتا تو ترکمان اپنے سردار کی حمایت میں حملہ کر چکے ہوتے لیکن برق کی شہرت سے سب واقف تھے اس لئے اپنی جگہ کھڑے رہے۔

"دیکھتے کیا ہو، پکڑ لو اسے!" یوسف خان دہاڑا "میں اس کی کھال اتار لوں گا۔"

وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے۔برق نے زور کا قہقہہ لگایا "تم سب مجھے ہلاک کر کے بھی اپنے سردار کی بے عزتی کا بدلہ نہیں لے سکتے۔" اس نے بے پروائی سے کہا "کیا یوسف خان اتنا بزدل ہو گیا ہے کہ تنہا میرا مقابلہ نہیں کر سکتا؟"

بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔وہ اپنے سردار کی سمت دیکھ رہے تھے جس کے منہ سے غصے میں جھاگ نکل رہے تھے۔قبیلے کے اصول کے مطابق اب اسے اکیلے ہی اس چیلنج کا مقابلہ کرنا چاہئے تھا۔اگر اس نے اس چیلنج کا جواب نہیں دیا تو اپنے لوگوں کی نظروں میں ہمیشہ کے لئے گر جائے گا۔وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا۔برق نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اسے ذاتی مقابلے پر مجبور کر دیا تھا۔اور پھر اسے یہ بھی شک تھا کہ برق اکیلا نہیں ہوگا۔اس کے آدمی قریب ہی چھپے ہوئے ہوں گے۔اس کی خونی نظریں نفرت اور غصے سے برق کو گھور رہی تھیں۔

"کُتے!" اچانک وہ دہاڑا اور اپنی تلوار کھینچ کر برق پر جھپٹا۔ "تیری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔"

اس نے اچانک حملہ کیا تھا — اس کی تلوار برق کی تلوار سے ٹکرائی۔ سب لوگ دور ہٹ گئے۔ اب وہ اس لڑائی کے انجام کے منتظر تھے۔ دوسرے ہی لمحے دونوں کے درمیان خوفناک، جنگ شروع ہو گئی۔ یوسف خان کسی زخمی درندے کی طرح جھپٹ جھپٹ کر حملے کر رہا تھا۔ دونوں کے تربیت یافتہ گھوڑے اپنے سواروں کے اشاروں پر گھوم رہے تھے۔ برق صرف دفاع کر رہا تھا۔

"کُتے!" یوسف خان پھر دہاڑا "میں تیرا سر اپنے خیمے کے بانس پر نصب کروں گا۔"

دوسرے ہی لمحے برق کی تلوار بجلی کی طرح کوندی۔ یوسف خان کا سر کٹ کر دور جا گرا۔ اس کا گھوڑا خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا۔ برق اپنی جگہ کھڑا رہا۔ سب لوگ دم بخود کھڑے تھے۔ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"یوسف خان مر چکا ہے۔" برق دہاڑا "کوئی اور ہے جو اس کی جگہ لینا چاہتا ہو؟"

سب خاموش کھڑے اسے گھورتے رہے۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ آگے بڑھے۔ برق نے اطمینان کے ساتھ تلوار نیام میں ڈالی اور کہا "تو سنو، تم میں سے کون ہے جو میرے ساتھ چلنے کو تیار ہے؟ میں تمہاری جھولیوں میں اتنی دولت بھر دوں گا کہ جس کا تم نے تصور بھی نہ کیا ہو گا۔" دولت کے ذکر پر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ لیکن ابھی تک ان کا شبہ دور نہ ہوا تھا۔

"ثبوت۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو؟" ایک شخص نے چلّا کر کہا "جواب دو ورنہ ہم تم کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

برق نے جواب دینے کے بجائے اپنا گھوڑا اس شخص کی طرف گھمایا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ لیکن برق نے گھوڑے کی لگام اس کی طرف پھینکی اور اتر کر سیدھا اس جانب بڑھا جہاں کھانا پک رہا تھا۔ ایک پتھر پر بیٹھ کر اس نے ہانڈی اٹھائی اور اس طرح کھانے لگا جیسے کئی روز سے بھوکا ہو۔ اسے واقعی بہت زور کی بھوک لگی تھی۔

"کیا دن کے وقت کوئی تمہیں تارے دکھا سکتا ہے؟" اس نے ہڈی سے گوشت کو اُدھیڑتے ہوئے پوچھا "لیکن پھر بھی تارے اپنی جگہ موجود ہیں اور وقت آنے پر تم سب انہیں دیکھ لو گے۔ اگر وہ خزانہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، میرے پاس موجود ہوتا تو میں تمہیں اس میں حصہ بٹانے کی دعوت کیوں دیتا؟ اسے ہم سب مل کر ہی حاصل کر سکتے ہیں۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" ایک نوجوان نے غصے میں کہا۔ "اسے ختم کر دو تاکہ ہم خانہ بدوشوں کے کارواں کا تعاقب جاری رکھ سکیں۔"

"لیکن اب کون تمہاری رہنمائی کرے گا؟" برق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کئی ایک آوازیں بیک وقت بلند ہوئیں پھر خاموشی چھا گئی۔ سرداری کے لئے خواہش مند تو بہت سے تھے لیکن برق کے سامنے ان کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ علی خان کے گھوڑے پر سوار ہے۔" ایک آدمی چلّایا۔ یہ وہی جوان تھا جس نے برق پر چھپ کر حملہ کیا تھا۔

"ہاں۔ یہ گھوڑا بھی علی خان کا ہے اور تلوار بھی۔ اس نے مجھ پر بزدلوں کی طرح فائر کیا تھا اس لئے میں نے اسے ہلاک کر دیا۔"

سب خاموش کھڑے اسے غصے اور نفرت سے گھورتے رہے۔ پھر ایک بھاری بھرکم شخص نے آگے بڑھ کر پوچھا "تم ہمیں کہاں لے جاؤ گے؟ ایک بات یاد رکھنا کہ ہم کسی کے پابند نہیں ہوں گے۔"

"تم سب احمق بھی ہو اور بزدل بھی۔ نہ تمہارا کوئی گھر ہے اور نہ خاندان۔ ان ویرانوں میں بھٹکتے ہوئے جنگلی جانوروں کی طرح مر جاؤ گے۔ اگر تم سب جہنم میں ہی جانا چاہتے ہو تو میری بلا سے۔"

وہ خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگے۔ پھر بھاری بھرکم شخص نے دھیمے لہجے میں کہا "برق، ہم تم کو جانتے ہیں۔ تم نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔ تم وعدہ کرو کہ ہم کو اس خزانے تک لے چلو گے تو ہمیں تمہاری رہنمائی پر کوئی اعتراض نہیں۔"

"میں قسم کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ جو کچھ کہتا ہوں اس پر عمل کرتا ہوں۔" برق نے جواب دیا "میرے ساتھ چلو گے تو خطرات کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ تم میں سے بہت سے ہلاک بھی ہوں گے لیکن جو بچ جائیں گے ان کو اتنی دولت ملے گی جس کا کسی نے تصور بھی نہ کیا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمیں منظور ہے۔ بحث کرنے کے بجائے اب روانگی کی تیاری کرو۔" بیک وقت کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

"ایک بات یاد رکھو، ہم بڑی خطرناک جگہ چل رہے ہیں۔" برق نے کہا۔

"ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔ اپنے خدا پر بھروسہ کرتے ہیں۔ تم ہماری رہنمائی کرو۔"

"تو پھر بسم اللہ! میرے ساتھ چل پڑو۔" برق نے جواب دیا۔

ذرا دیر بعد جب وہ روانہ ہوئے تو برق ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اب وہ تنہا نہیں تھا لیکن وہ ان لالچی اور سنگدل ترکمانوں پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لوٹ مار کی عادت نے ان کو سنگدل اور خود غرض بنا دیا تھا۔

●●●**●●●

برق اس علاقے سے اتنی اچھی طرح واقف تھا کہ ترکمانوں کو

اس کی سربراہی تسلیم کرلینا ہی پڑی۔ جلدی وہ اس کی ہر ہدایت پر عمل کرنے لگے۔ وہ اپنی پیش قدمی کو ہر ممکن طرح سے خفیہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن سو سے زائد افراد کے کارواں کو پوشیدہ رکھنا آسان کام نہ تھا۔ برق کو معلوم تھا کہ ان کے اور اولگن کے درمیان صرف خانہ بدوشوں کا گروہ تھا جن کے ساتھ دونوں فرنگی سفر کر رہے تھے۔ سہ پہر تک وہ اس وادی کے پاس پہنچ گئے جہاں چشمے کے کنارے خانہ بدوش خیمہ زن تھے۔ برق نے اپنے ساتھیوں کو کافی فاصلے پر چٹانوں کی آڑ میں چھوڑ دیا اور صرف چھ سات آدمیوں کے ساتھ اس جگہ تک آیا۔ بلندی کی وجہ سے وہ نیچے کا منظر صاف دیکھ سکتے تھے۔ گھوڑے پڑاؤ کے قریب چر رہے تھے۔ ایک سمت ڈھلوان پر بھیڑوں کا ریوڑ جھاڑیوں کے پاس اپنی بھوک مٹانے میں مصروف تھا۔ کئی سوار مختلف سمتوں میں پہرہ دے رہے تھے۔ لیکن نارمن اور بروک کا خیمہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ برق حیران تھا کہ دونوں کہاں غائب ہو گئے۔ کیا خانہ بدوشوں نے انہیں ہلاک کر دیا؟ اس کے ساتھی ترکمانوں نے اپنے دیرینہ دشمن خانہ بدوش قبیلے کو دیکھا تو غرانے لگے۔

"ان کی تعداد میں ہم سے بہت کم ہیں۔" اوزن بے نے کہا "ہم آسانی سے ان کو ختم کرکے مال اسباب پر قبضہ کر سکتے ہیں۔"

"شاید عورتیں دیکھ کر تمہارے منہ میں پانی بھر آیا ہے۔" برق نے طنز کیا۔

"ان کی عورتیں بڑی خوب صورت ہوتی ہیں۔" اوزن بے نے اعتراف کیا "یہ لوگ کوہ ارلک سے سونا لے کر آتے ہیں جسے کشمیری تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔"

برق کو یاد آیا کہ روایت کے مطابق کوہ ارلک میں سونے کی کان تھی جہاں سے یہ لوگ سونے کے ڈلے لا کر کشمیر میں فروخت کرتے تھے "یہ سب محض کہانیاں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "جہاں میں تمہیں لے جا رہا ہوں وہاں مال و زر کے بیش بہا خزانے ہیں جو ساری زندگی کے لئے کافی ہوں گے۔ تم واپس جاؤ اور سب سے کہہ دو کہ وہ اپنی جگہ پوشیدہ رہیں۔" وہ چونک کر مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

"جاؤ اوزن بے۔ خبردار کوئی باہر نہ آئے اور تم سب میرے ساتھ آؤ۔" اس نے باقی پانچ ترکمانوں سے کہا۔

ان کا شبہ تو دور ہو گیا لیکن اوزن بے زیر لب بڑبڑاتا ہوا واپس ہوا۔ برق چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا نشیب کی سمت بڑھا۔ وہ کیمپ کے قریب پہنچ گئے۔ ایک بلند جگہ پر جھاڑیوں کی آڑ سے برق نے ایک بار پھر کیمپ کا جائزہ لیا۔ لیکن اسے اپنے فرنگی ساتھیوں کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ وہ کچھ دور اور آگے گئے' پھر ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کرکے برق اس بلند ٹیلے پر چڑھنے لگا جس سے وادی کی دوسری جانب دیکھنا ممکن تھا۔ بلندی پر پہنچ کر وہ ایک چٹان کی آڑ میں لیٹ گیا اور یوسف خان کی دوربین نکال کر ہر سمت دیکھنا شروع کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اچھل پڑا۔ اگر دوربین نہ ہوتی تو وہ انہیں ہرگز نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بہت دور اسے چند دھبے حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ اتنی دور تھے کہ شناخت کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن برق نے یہ اندازہ کرلیا کہ وہ بہت سے سوار تھے جو وادی کی سمت بڑھ رہے تھے۔ وہ پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے ہٹا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر اس مقام تک پہنچا جہاں سے نارمن اور بروک نے چشمے کو پار کیا تھا۔ گیلی زمین پر ان کے بوٹوں کے واضح نشان تھے۔ برق کو حیرت اس بات پر تھی کہ خانہ بدوشوں نے کیسے ان دونوں پر اتنا اعتبار کرلیا کہ انہیں تنہا جانے دیا' اور یہ لوگ اب تک چشمے کے کنارے کیوں مقیم تھے؟ ان لوگوں نے کبھی غیر ملکیوں کے ساتھ ایسا دوستانہ سلوک نہیں کیا تھا۔

دونوں فرنگی جا چکے تھے اور نامعلوم سواروں کا قافلہ وادی کی سمت بڑھ رہا تھا۔ برق ابھی صورت حال پر غور ہی کر رہا تھا کہ گولیاں چلنے کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بلندی پر چڑھنے لگا۔ پانچوں ترکمان اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ بلندی پر پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا وہ اس کے لئے حیران کن تھا۔ باقی دوسرے ترکمانوں نے وادی میں خیمہ زن خانہ بدوشوں پر حملہ کر دیا تھا۔ اچانک حملے سے خانہ بدوشوں کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا تھا اور ان کے بہت سے آدمی مارے گئے تھے لیکن باقی ماندہ خیموں اور گاڑیوں کی آڑ سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ترکمان بلندی سے فائر کر رہے تھے اور ان کے پاس رائفلیں تھیں اس لئے خانہ بدوشوں کا بھاری نقصان ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بھی بندوقوں سے مقابلہ کر رہے تھے۔ بعض اپنے تیر کمانوں سے نشانہ لے رہے تھے۔ ترکمان اپنی فتح کے جوش میں نشیب کی سمت لپکے۔ گولیوں کی باڑھ سے کئی سوار نیچے گرے لیکن باقی بھوکے درندوں کی طرح خانہ بدوشوں پر ٹوٹ پڑے۔

برق کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نشیب میں اتر کر چشمے کے کنارے کنارے اس قتل عام کی سمت جھپٹا۔ اس نے اپنی تلوار نکال لی تھی جو دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اس کے ساتھ پانچوں ترکمان بھی پوری رفتار سے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ فرنگیوں کے جانے کے بعد خانہ بدوشوں پر حملہ بیکار تھا۔ اس حملے نے اس کی ساری منصوبہ بندی پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ غیظ و غضب سے کانپ رہا تھا اور کسی طوفان کی طرح کیمپ کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ترکمانوں نے اسے تلوار لہراتے بڑھتے ہوئے دیکھا تو سمجھے کہ وہ ان پر حملہ کرنے آ رہا ہے اور مقابلے کے لئے تیار ہونے لگے۔ ادھر خانہ بدوش یہ سمجھے کہ ان پر دوسری سمت سے کوئی نیا حملہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے اپنی بندوقوں کا رخ برق اور اس کے ساتھیوں کی سمت پھیر دیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترکمانوں نے ان کے بچے کھچے ساتھیوں کا صفایا کرنا

شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ خانہ بدوش سنبھل سکتے وہ ہر سمت کی یلغار میں گھر چکے تھے۔

ترکمان بڑی سفاکی کے ساتھ قتلِ عام کر رہے تھے۔ عورتیں اور بچے بھی بیدردی کے ساتھ تہ تیغ ہو رہے تھے۔ برق کے غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ قریب پہنچتے ہی اس کی تلوار نے کئی ترکمانوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس نے اتنے قہر کے عالم میں حملہ کیا تھا کہ ترکمان بھاگنے لگے۔ اس دست بدست جنگ میں رائفلوں کے استعمال کا موقع نہ رہا تھا' اور پھر بیشتر کی گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ خانہ بدوش جانیں بچا کر مختلف سمتوں میں بھاگ رہے تھے اور ترکمانوں کی زد میں آ کر ہلاک بھی ہو رہے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد جنگ ختم ہو گئی۔ زندہ بچنے والی عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سے وادی گونج رہی تھی' ترکمان خوف زدہ ہو کر برق کی زد سے دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کس نے تم کو حملے کا حکم دیا تھا؟" برق دہاڑا۔ غصے میں وہ خونخوار شیر لگ رہا تھا۔

"ازن بے نے۔" کئی آوازیں ابھریں۔ "اس نے کہا تھا کہ تم ہمیں دھوکا دے کر بھاگ گئے ہو اور خانہ بدوش اچانک حملہ کرنے والے ہیں۔"

ایک غضب ناک دہاڑ کے ساتھ برق اس طرف جھپٹا جہاں ازن بے کھڑا اسے غصے سے گھور رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیام سے تلوار نکال سکتا' برق کی تلوار موت بن کر اس پر گری۔ ازن بے کی گردن دور جا کر گری۔

"درندو... وحشیو... خدا تمہیں غارت کرے۔" برق دہاڑا۔ "اس قتل عام سے تمہیں کیا مل گیا؟ کتنا سونا تمہارے ہاتھ لگا؟ بولو کتو کیا ملا تم کو؟"

"ان کے پاس سونا تھا ہی نہیں۔" ایک نے مایوس کن لہجے میں کہا۔ "ازن بے نے جھوٹ بولا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں تم کو یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ جاؤ تم سب جہنم میں۔"

"چلے جاؤ' لیکن تم اس طرح ہماری بے عزتی نہیں کر سکتے۔" ایک ترکمان نے چیخ کر کہا۔

"ہم تمہارے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔" دوسرے نے کہا۔ "چلو۔ ہمیں اس شخص کی ضرورت نہیں ہے۔"

برق نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "احمقو! اب تم بچ کر کہاں جاؤ گے؟ میں نے ابھی دوربین سے دیکھا ہے' قبائلیوں کا ایک بڑا گروہ اس سمت بڑھ رہا ہے۔ فرار ہونے والے خانہ بدوش تمہارے قتل عام سے انہیں آگاہ کر دیں گے۔ اس علاقے کے سارے قبائل تمہارے دشمن ہیں۔ تم بچ کر اب کدھر جاؤ گے؟"

ترکمان خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ان کی لوٹ مار کی بنا پر علاقے کے تمام قبائل ان کے دشمن تھے۔ وہ اس علاقے میں اسی لئے قدم نہیں رکھتے تھے اور برق کے ساتھ اتنی دور تک آ چکے تھے کہ فرار ہونا دشوار تھا۔

"احمقو... تم نے لالچ میں خود اپنی موت کو دعوت دی ہے۔" ایک باریش ترکمان نے کہا۔ "برق کے علاوہ کوئی اب تمہیں نہیں بچا سکتا۔ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے... ہم تمہاری ہر بات مانیں گے۔" کئی آوازیں ابھریں۔

برق نے تلوار صاف کر کے میان میں رکھی اور جلدی جلدی ان کو ہدایتیں دینے لگا۔ ترکمان اس کی ہدایت پر بلا تامل عمل کرنے لگے تھے۔ خانہ بدوشوں کے گھوڑے جلدی جلدی جمع کئے جانے لگے اور سورج غروب ہوتے ہی وہ اپنے زخمیوں کو لے کر وہاں سے تیزی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

●●●**●●●

برق نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جس پر نارمن اور بیوک گئے تھے' باوجود یکہ یہ ہموار راستہ تھا۔ اسے اولگن جانے کا دوسرا راستہ بھی معلوم تھا۔ برق کو اعتماد تھا کہ وہ دونوں فرنگیوں کو آسانی سے جا لے گا لیکن اس وقت اسے ان قبائلی لوگوں سے بچ کر نکل جانے کی فکر لگی ہوئی تھی جن کے گروہ کو اس نے اپنی سمت بڑھتے دیکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ان کا تعاقب ضرور کریں گے۔ بچے کھچے خانہ بدوشوں نے ان کو قتل عام کے متعلق ضرور بتا دیا ہو گا۔ خانہ بدوش بڑے غیظ و غضب کے عالم میں انتقام لینے کے لئے بڑھ رہے ہوں گے۔ اس لئے سیدھے اور ہموار راستے پر جانے کے بجائے برق نے مغرب کی سمت سے ایک دشوار گزار پہاڑی راستے پر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ تاریکی میں کسی شیطانی لشکر کی طرح تنگ دروں اور خطرناک گھاٹیوں کے درمیان ہوتے ہوئے سفر کر رہے تھے۔ صبح سے پہلے وہ چٹانوں کے درمیان بہنے والی ایک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ وہ پانی کے اندر سے ہوتے ہوئے تین چار میل تک آگے بڑھتے رہے' اس کے بعد کنارے پر آ گئے۔ برق کو معلوم تھا کہ قبائلی ان کے نشانات تلاش کرتے ہوئے تعاقب کریں گے' اس لئے اس نے دانستہ پانی میں سفر کیا تھا تاکہ دشمن ان کا سراغ نہ لگا سکے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ دشمن کو یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ اولگن کی سمت جا رہے ہیں۔

ندی کے کنارے کنارے کافی دور تک چلنے کے بعد انہوں نے پہاڑوں کا رخ کیا۔ سورج نکلا تو وہ خطرناک پہاڑیوں کے درمیان پہنچ چکے تھے۔ تکان سے ان سب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ برق نے وہاں قیام کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ تازہ دم ہو جائیں۔ ترکمان کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ برق ان کو چھوڑ کر ایک سب سے اونچی پہاڑی پر پہنچا اور دوربین کے ذریعے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ قبائلیوں کو ان کا سراغ نہیں مل سکا ہے تو اس نے نیچے آ کر اپنی بھوک مٹائی اور خود بھی آرام

کرنے کے لئے دراز ہوگیا۔ سورج چڑھتے ہی وہ پھر روانہ ہوگئے۔ یہاں سے راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ نوکدار چٹانوں سے گزرتے بلندیوں اور خطرناک ڈھلوانوں کو پار کرتے وہ مسلسل سفر کرتے رہے۔ ایسا سنسان پہاڑی علاقہ تھا کہ ترکمانوں کے چہروں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ انہیں قبائیلوں کے حملے کا بھی اتنا خوف تھا کہ وہ برق کے ہر حکم کی تعمیل بلا کسی تامل کے کر رہے تھے۔ برق نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے ایسا راستہ اختیار کیا تھا جس پر تعاقب کا امکان کم سے کم تھا۔ وہ جیسے جیسے مغرب کی سمت بڑھتے گئے' برق کو وہ نشانات ملتے گئے جو اولگن کے راستے کی رہنمائی کرتے تھے۔ ویسے بھی کوہ ارلک خان کی چوٹی سے وہ راستے کا اندازہ کرتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے وہ ایک چوڑی اور کشادہ وادی میں پہنچ گئے جس کی ڈھلوان سے اولگن کی فصیلیں نظر آرہی تھیں۔

اولگن کا شہر ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھا جہاں سے وہ وادی نظر آتی تھی۔ بیچ گھنے جنگلوں کے درمیان ایک ندی بہتی تھی۔ جنوب میں اونچے نیچے ناہموار پہاڑوں کا سلسلہ کوہ ارلک تک چلا گیا تھا۔ وادی کے شمال اور مغرب کا راستہ بلند پہاڑیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ مشرق کی سمت ایک ڈھلوان راستہ چٹانوں کے درمیان سے ہوتا ہوا شہر کے بڑے پھاٹک کی سمت جاتا تھا۔

برق نے بلندی پر چڑھ کر ہر سمت کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر پڑاؤ پر واپس آگیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک محفوظ گھاٹی میں پہنچا اور ان کو وہیں پوشیدہ رہنے کی تاکید کی۔ یہاں سے ایک ڈھلوان راستہ شہر کے بالکل قریب تک جاتا تھا اور جہاں پر ڈھلوان ختم ہوتی تھی وہ جگہ ہر سمت سے بلند چٹانوں سے گھری ہوئی تھی۔ فرار کی کوئی راہ نہ ہونے کی بنا پر یہ جگہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھی لیکن گھوڑے اتنے تھک چکے تھے کہ آرام کے بغیر ان کو استعمال کرنا دشوار تھا۔ اس کے ساتھی بھی تکان سے نڈھال تھے' اس لئے قیام کے علاوہ چارہ نہ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک گھاٹی تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا جو اس درّے سے باہر جاتی تھی۔ کچھ لوگوں کو وہاں نگرانی پر مامور کر کے وہ واپس آیا اور ان لوگوں کو بتایا کہ وہ تنہا جا کر پہلے صورت حال کا جائزہ لے گا تاکہ شہر میں داخلے کے لئے کوئی طریقہ سوچ سکے۔ ترکمانوں نے اسے شبہ بھری نگاہوں سے دیکھا لیکن خاموش رہے۔ برق پر انہیں اعتبار رہا ہو یا نہیں' اس کے بغیر وہ خود کو اس علاقے میں بے سہارا محسوس کرتے تھے۔ انہیں ہر لمحہ قبائیلوں کے حملے کا خدشہ لگا ہوا تھا' لیکن برق کو اب کوئی فکر نہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر قبائلی ان تک پہنچ بھی گئے تو اس پہاڑی علاقے میں مقابلہ دشوار نہ ہوگا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اولگن کے باشندے اپنی فصیلوں سے باہر بہت کم ہی نکلتے تھے' اس لئے ان کی جانب سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

برق خود بھی بہت تھکا ہوا تھا لیکن جب اس پر مہم جوئی کا جنون سوار ہوتا تھا تو وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بھوکا پیاسا ہونے کے باوجود چاق و چوبند نظر آرہا تھا۔ وہ گھاٹی سے باہر نکلا تو ہر سمت تاریکی پھیل چکی تھی۔ آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کی روشنی اس کی رہنمائی کے لئے کافی تھی۔ سیدھے جانے کے بجائے وہ چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور شاید اسی لئے اسے غار کا وہ دہانہ نظر آگیا جس کے اندر وہ چھپے ہوئے تھے۔ یہ غار دو بلند نوکیلی چٹانوں کی آڑ میں تھا۔ پہاڑی سے باہر نکلی ہوئی ایک چٹان نے چھجے کی طرح اس پر سایہ کر رکھا تھا۔ تمارس کی گھنی بیلوں نے دہانے کو تقریباً چھپا رکھا تھا۔ اگر اندر جلتی آگ کی روشنی کی جھلک نظر نہ آتی تو برق شاید اس پوشیدہ ٹھکانے کا پتا کبھی نہ لگا سکتا۔ وہ چٹانوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا اور گھنی بیلوں کی آڑ سے اس نے اندر جھانکا۔ باہر سے دہانہ چھوٹا تھا لیکن اندر جا کر غار بہت کشادہ ہوگیا تھا۔ آگ کے گرد تین آدمی بیٹھے تھے اور کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ برق نے فوراً انہیں پہچان لیا۔ یہ تینوں نارمن اور بروک کے ملازم تھے جنہیں وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ غار کے بالکل اندرونی حصے میں گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور دیگر سازوسامان رکھا ہوا تھا۔ ان کی باتیں صاف نہیں سنائی دے رہی تھیں کیونکہ فاصلہ زیادہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چوتھا ملازم اور دونوں فرنگی کہاں تھے۔

برق دہانے سے ہٹ کر جھاڑیوں میں انتظار کرنے لگا' اور یہ اچھا ہوا کیونکہ ذرا دیر بعد ہی چوتھا ملازم جلانے کی لکڑیوں کو دونوں ہاتھوں میں اٹھائے نمودار ہوا۔ غار کے دہانے کی سمت جاتے ہوئے وہ برق کے اتنے قریب سے گزرا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا۔ لیکن برق نے ہاتھ نہیں بڑھایا بلکہ چیتے کی طرح جست لگا کر اس کی پشت پر سوار ہوگیا اور اتنے زور سے اس کی گردن دبائی کہ لکڑیاں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑیں۔ ملازم نے دہشت زدہ ہو کر چیخنا چاہا لیکن حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ لکڑیاں جھاڑیوں پر گری تھیں اس لئے کوئی آواز نہیں ہوئی۔ برق کی گرفت اتنی سخت تھی کہ ملازم کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ جلد ہی برق اسے زمین پر گرا کے سینے پر سوار ہوگیا اور خنجر اس کی گردن پہ رکھ دیا۔ ملازم نے اسے پہچان لیا تھا اور اتنا دہشت زدہ ہوگیا تھا کہ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"وہ دونوں فرنگی کہاں ہیں؟" برق نے خونخوار لہجے میں سرگوشی کی۔ "جلدی بتا' ورنہ گردن کاٹ کے پھینک دوں گا۔"

"وہ اندھیرا ہوتے ہی شیطانوں کے شہر کی سمت چلے گئے۔" ملازم نے گھٹی ہوئی کانپتی آواز میں کہا۔

"کیا وہ تنہا تھے؟"

"نہیں... ایک گونگا پجاری ان کے ساتھ تھا۔ وہ اپنے ہتھیار بھی ساتھ لے گئے ہیں۔"

"وہ کس لئے اولگن گئے ہیں؟"

"میں قسم کھاتا ہوں مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"مجھے سب کچھ سچ سچ بتادو ورنہ جان سے ماردوں گا۔" برق نے دھمکی دی۔ "اور آہستہ بولنا' آواز نکال کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ شروع سے بتاؤ کہ میرے شکار پر جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"بتاتا ہوں... بتاتا ہوں۔" ملازم نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ "احمد کو ان فرنگیوں نے ہلاک کردیا تھا۔ وہ خیمے کے باہر کھڑا چھپ کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اچانک نارمن صاحب نے باہر نکل کر اسے پکڑلیا اور اندر لے جاکر ہلاک کردیا۔ گولی کی آواز سن کر ہم سب بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے تو احمد کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بعد صاحب لوگوں نے فوراً خیمے اکھاڑنے کا حکم دیا۔ ہم سب لاش کو جھاڑیوں میں ڈال کر وہاں سے جنوب کی سمت روانہ ہوگئے۔ رات کو ہمیں خانہ بدوشوں کا پڑاؤ نظر آیا۔ ہم ان وحشیوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہوگئے لیکن دونوں فرنگی بے خوف پڑاؤ کی سمت بڑھے۔ خانہ بدوشوں نے ہمیں گھیرلیا لیکن نارمن صاحب نے فوراً جیب سے ایک عجیب سا نشان نکال کر ان کو دکھادیا جو روشنی میں چمک رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کافر خانہ بدوش اپنے گھوڑوں سے اتر کر سجدے میں گر گئے۔ وہ رات ہم نے ان کے پڑاؤ میں بسر کی لیکن رات گئے کسی نے پڑاؤ پر حملہ کردیا۔ بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ لیکن حملہ آور واپس چلے گئے۔ صبح ہونے سے پہلے ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ نارمن صاحب نے بتایا کہ ترکمانوں کے جاسوسوں نے ہمارا سراغ لگالیا تھا اس لئے کیمپ میں رکنا خطرناک تھا۔ ہم تمام دن تیز رفتاری سے سفر کرتے رہے۔ رات ہونے پر بھی ہم نہیں رکے اور سفر جاری رکھا۔ نارمن صاحب پر جیسے جنون سوار ہوگیا ہو۔ وہ ذرا دیر کے لئے بھی رُکنے پر تیار نہ تھے۔ آدھی رات کے قریب ہم اس وادی میں پہنچ گئے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ہم اس غار میں آکر چھپ گئے۔ صبح کو ایک گنجا پجاری اپنی بھیڑیں لے کر ادھر سے گزر رہا تھا کہ نارمن صاحب نے اسے بلا کر وہ نشان اسے بھی دکھایا اور اس سے کہا کہ وہ بڑے پجاری سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پجاری چلا گیا اور پھر ایک اور پجاری کے ساتھ واپس آیا جو کشمیری زبان میں بات کررہا تھا۔ دونوں صاحب لوگ دیر تک اس سے بات کرتے رہے' لیکن ہم ان کی بات نہ سمجھ سکے۔ بعد میں نارمن صاحب نے اس پجاری کو ہلاک کردیا جو پہلے ان کا پیغام لے کر گیا تھا اور اس کی لاش پتھروں میں دبادی۔ جس کے بعد دوسرا پجاری چلا گیا۔ لیکن اندھیرا ہوتے ہی وہ پھر آیا۔ وہ بڑے بڑے بالوں والی اونی عبائیں ساتھ لے کر آیا تھا۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ کھانا کھانے کے بعد سامان گھوڑوں پر لاد کر ہم فوری روانگی کے لئے تیار رہیں۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں معلوم۔"

برق نے کوئی جواب نہیں دیا اور سوچتا رہا۔ اسے ملازم کی باتوں پر یقین آگیا تھا لیکن اس کے بیان سے وہ حیران تھا۔ وہ خیالات میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ ملازم پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ وہ پھرتی کے ساتھ برق کی گرفت سے نکل کر اچھلا اور کھڑے ہوتے ہی اس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو پکارا۔ دوسرے ہی لمحے کمر سے خنجر نکال کر اس نے برق پر حملہ کردیا لیکن برق نے بڑے اطمینان سے اس کے وار سے بچتے ہوئے جھپٹ کر اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔ اپنی فولادی گرفت میں لے کر اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ گردن چٹاخ سے ٹوٹ گئی۔ بے جان جسم کو ایک جانب پھینک کر وہ پھرتی سے جھاڑیوں کی آڑ میں ہوگیا۔ اسی لمحے غار کے دہانے پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ آنے والے ملازم نے ڈرتے ڈرتے اپنے ساتھی کو آواز دی اور تاریکی میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دوسرے ساتھیوں کو آواز دی۔ رائفلیں ہاتھ میں لئے ہوئے وہ باہر نکلے اور ہر سمت دیکھنے لگے۔ اچانک ان کی نظر اپنے ساتھی کی لاش پر پڑی۔ وہ لاش پر جھک کر خوف زدہ لہجے میں باتیں کرنے لگے۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ شیطانی جگہ ہے۔" ایک نے کہا۔ "انہوں نے آخرکار ہمارے ساتھی کی جان لے لی۔"

"وہ ہمیں بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔" دوسرے نے کہا۔

"یہ حرکت ان ہی شیطانی پجاریوں کی ہے۔" تیسرے نے کہا۔ "وہ صاحب لوگوں کو بھی مارڈالیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" پہلے نے کہا۔ "جانوروں پر سامان لدا ہوا ہے۔ چلو ہم فوراً بھاگ چلیں۔"

ذرا دیر بعد ہی وہ جانوروں پر لدے ہوئے سازوسامان کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ برق اپنی خوش قسمتی پر مسکرا رہا تھا۔

O...☆...O

برق کی نگاہیں اولگن کی روشنیوں پر مرکوز تھیں۔ وہ فرنگیوں کے خفیہ ٹھکانے سے نکل کر چلتا ہوا شہر کی فصیل کے سامنے پہنچ گیا تھا اور اندر داخلے والے بڑے پھاٹک کی سمت دیکھ رہا تھا۔ ہر سو تاریکی چھائی ہوئی تھی اور وہ گھنے درختوں کے درمیان چھپا ہوا تھا' اس لئے دیکھے جانے کا خدشہ نہ تھا۔ شہر میں داخلے کا بڑا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ مسلح پہرے دار نگرانی کے لئے مستعد کھڑے تھے۔ برق سوچ رہا تھا کہ اولگن پر کسی حملے کا خطرہ بظاہر نہیں تھا پھر مسلح پہرے داروں کی موجودگی کا سبب کیا ہو سکتا تھا! اس علاقے کے مسلمان قبائل' اولگن کو کافروں کا شیطانی شہر کہتے تھے اور ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔

اسے یقین تھا کہ نارمن اور بروک اس وقت شہر میں کسی جگہ موجود تھے۔ انہیں غار میں واپس بھی آنا تھا۔ لیکن وہ کس مقصد کے لئے اولگن گئے تھے' یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ البتہ اندازہ ضرور تھا۔ انتقام کا جنون اس پر سوار تھا' اس لئے وہ ہر قیمت پر فصیل کے
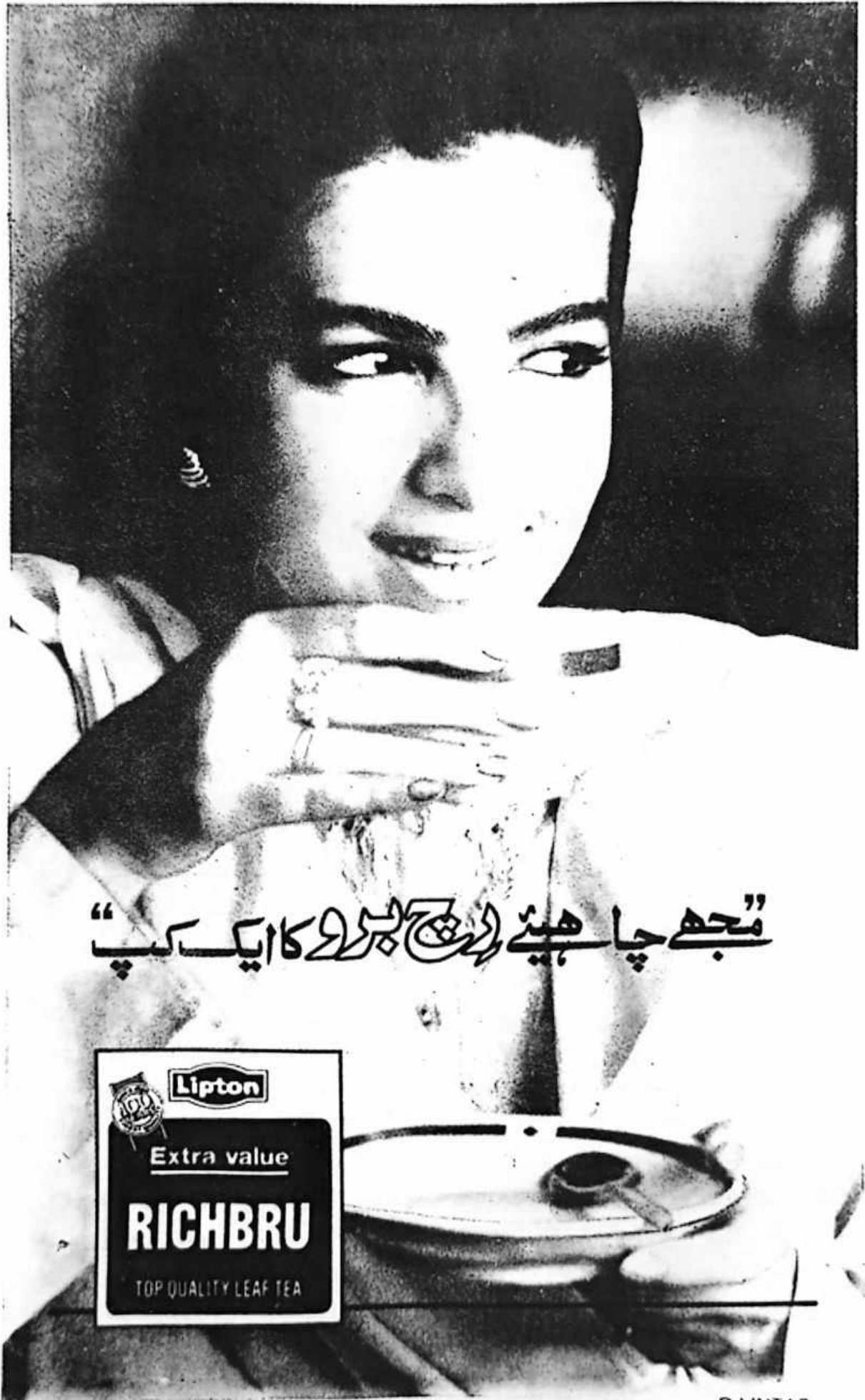
"مجھے چاہیئے رچ برو کا ایک کپ"
Lipton
Extra value
RICHBRU
TOP QUALITY LEAF TEA

اندر جانا چاہتا تھا۔ وہ ابھی تاریکی میں کھڑا اندر داخل ہونے کی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ مویشیوں کا ایک ریوڑ آتا ہوا نظر آیا۔ فوراً ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ جلدی سے اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے مویشیوں کے ریوڑ کو گزرنا تھا۔ ذرا دیر بعد سامان سے لدا ہوا خچروں کا ایک قافلہ آتا نظر آیا' جس کے آگے اور پیچھے بہت سے لوگ چل رہے تھے۔ تاریکی کے باوجود ان کے پاس مشعلیں نہیں تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ راستے سے بخوبی واقف ہیں۔ برق نے پہچان لیا کہ وہ اولگن کے باشندے تھے جنہوں نے لمبی عبائیں اور گول ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ موڑ پر واقع ایک چٹان کی آڑ میں کھڑا وہ منتظر رہا حتیٰ کہ خچروں کی قطار گزر گئی۔ اس کے پیچھے چلنے والے اس کے قریب سے گزرے تو ان کے لباس کی بُو اس کی ناک سے ٹکرائی۔

برق انتظار کرتا رہا۔ جب آخری آدمی اس کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے جھپٹ کر اپنی کلائی سے اس کی گردن دبوچ لی اور گھسیٹتا ہوا چٹان کی آڑ میں لے آیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک فولادی مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا جو بے ہوش کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس نے پھرتی کے ساتھ بے ہوش آدمی کا لباس اتار کر خود پہنا' اس کی کمر سے لگا ہوا پستول اور خنجر اپنی کمر میں لگایا اور آڑ سے باہر نکلا۔ تیز تیز قدم رکھتا ہوا وہ خچروں کے ساتھ جانے والے لوگوں کی سمت بڑھا جو شہر کے پھاٹک کے پاس پہنچ چکے تھے۔ وہ دانستہ ان لوگوں کے پیچھے چل رہا تھا تاکہ کوئی شناخت نہ کر سکے۔ وہ پھاٹک سے گزرے تو کسی نے برق کی طرف توجہ نہ دی۔ شہر کے اندر داخل ہو کر وہ سڑک کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ لباس کے لحاظ سے وہ بھیڑوں کا چرواہا لگ رہا تھا۔ اولگن کی روشن اور بارونق سڑکوں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ یہ شہر ہمالیہ کی ترائی کی ایک پرانی بستی تھی۔ یہاں کے باشندے مقامی اور منگول قوم کی مشترکہ تہذیب کے وارث تھے۔ روایت کے مطابق منگولوں کے دور میں کافر قبیلے کا ایک گروہ یہاں آکر آباد ہو گیا تھا۔ وہ شیطان کی پوجا کرتے تھے۔ مقامی بدھ راہبوں اور ان کافروں کے درمیان شروع میں بڑی کشیدگی رہی لیکن کافروں نے اپنی چالاکی کے ذریعے مقامی آبادی کو بہت جلد زیرِ اثر کر لیا۔ وہ لوگ جادو ٹونے کے ماہر تھے جس کی بنا پر مقامی باشندے ان سے ڈرتے بھی تھے۔ اب شہر میں ملی جلی آبادی تھی۔ برق نے بدھ راہبوں کو بازار میں گھومتے دیکھا' جن کے سر گنجے تھے لیکن شکل و صورت سے وہ تبتی نہ لگتے تھے۔ ان کا چہرہ و خدوخال منگولوں سے زیادہ مشابہ تھے۔ درحقیقت اب یہ لوگ بدھ مذہب کے پجاری بھی نہ تھے' راہبوں کا قدیم لباس انہوں نے اپنا لیا تھا لیکن خانقاہ اب بدھ کے بجائے شیطان کی پوجا کا مرکز بن چکی تھی اور انہوں نے خانقاہ کی عمارت کو بھی تبدیل کر کے مندر کی طرح بنا لیا تھا۔

برق نے وقت نہیں ضائع کیا بلکہ وہ تیز چلتا ہوا اس پرانی خانقاہ کے پاس پہنچا جو شہر سے کافی بلندی پر پہاڑی کے ایک جانب واقع تھی۔ اس خانقاہ تک پہاڑی کے کسی اور جانب سے پہنچنا ممکن نہ تھا کیوں کہ اولگن جس پہاڑی پر واقع تھا اس کی ڈھلوانیں سپاٹ دیواروں کی طرح تھیں۔ اس کے علاوہ شہر کے گرد مضبوط اور بلند فصیلیں تھیں۔ یہ شہر کسی ناقابلِ تسخیر قلعہ کے مانند بنا ہوا تھا۔ خانقاہ کی سیڑھیاں تقریباً سو فٹ چوڑی تھیں۔ برق کسی بوڑھے پجاری کی طرح آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا۔ خانقاہ کا کشادہ پھاٹک کھلا ہوا تھا اور وہاں داخلے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ برق نے اپنے جوتے اتار دیئے اور ننگے پاؤں اندر داخل ہوا۔ ایک بہت وسیع اور کشادہ ہال سامنے تھا جس میں جلتی ہوئی مشعلوں کی مدھم روشنی میں ہر سمت نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

گنجے پجاری خاموشی کے ساتھ ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ کسی نے اس کی سمت توجہ نہ دی۔ مندر میں دور دور سے بہت سے پجاری آتے تھے جو پردے میں چھپے ہوئے ارلک کے بڑے بُت کو تعظیم دیتے' اس لئے برق کی وہاں موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اسے جب اطمینان ہو گیا کہ کوئی اسے دیکھ نہیں رہا تھا تو وہ پھرتی سے ایک سمت نظر آتے ہوئے دروازے میں داخل ہو گیا۔ جس پر طلع کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ ایک تنگ گلی نما راستے سے ہوتا ہوا وہ دوسرے ہال میں پہنچا جو بالکل تاریک تھا۔ وہ ٹٹولتا ہوا ایک زینے تک پہنچا اور احتیاط کے ساتھ سیڑھیاں طے کر کے ایک غلام گردش میں پہنچا جو نیم تاریک تھی۔ دریچوں کے پیچھے جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی جالیوں سے چھن کر آرہی تھی۔ یہ چراغ ان کوٹھڑیوں میں جل رہے تھے جو پجاریوں کے آرام کرنے کے لئے بنی تھیں یا جہاں پر وہ طویل عرصہ تک مراقبہ کیا کرتے تھے تاکہ اپنی روحانی اور ساحرانہ قوتوں کو توانا بنا سکیں۔ اس غلام گردش کے آخر میں ایک اور زینہ تھا۔ برق اس پر چڑھتا ہوا زینے کے موڑ تک پہنچ گیا۔ یہاں وہ ایک لمحے کے لئے ٹھہر گیا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ زینے کے اختتام پر ایک مسلح پہرے دار موجود ہو گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ عموماً وہ اونگھتا یا سوتا رہتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ اس وقت بھی سو رہا ہو' اس لئے برق بڑی خاموشی اور احتیاط سے ایک ایک سیڑھی چڑھ کر اوپر پہنچا۔ پہرے دار موجود تھا۔ اس کا دیو قامت اور نیم عریاں جسم کسی گینڈے کی طرح مضبوط تھا۔ وہ گونگا تھا۔ اس کا تیز دھار تیغہ پیروں کے اوپر رکھا ہوا تھا اور وہ دیوار کا سہارا لئے بے خبر سو رہا تھا۔

برق ایک لمحے سانس روکے کھڑا رہا' پھر دبے پاؤں چلتا ہوا پہرے دار کے قریب سے گزر گیا۔ اب وہ ایک بالائی غلام گردش میں تھا جس میں تانبے کے بنے ہوئے لیمپ جگہ جگہ لٹک رہے تھے۔ ان میں روشن شمعوں کی ہلکی روشنی میں بڑھتا ہوا وہ ایک محراب دار دروازے کے قریب پہنچا۔ چند لمحے وہ کان لگا کر آہٹ لیتا رہا پھر دروازے پر آہستہ سے تین مرتبہ دستک دی۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ برق دم بخود کھڑا تھا۔ پھر کسی کے قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی اور دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا۔ سامنے کھڑی

ہوئی حسینہ کے حسن و جمال میں ایسا جاہ و جلال تھا جو کسی بھی شخص کو مبہوت کر دیتا۔ ہلکی روشنی میں اس کا خوبصورت اور سڈول جسم کسی مرمریں مجسمے کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کے آتشیں شباب میں ایک ساحرانہ کشش تھی۔ باریک ریشمی لباس اس کی دلکشی کو چھپانے کے بجائے اور نمایاں کر رہا تھا۔ بیش قیمت ہیرے اور جواہرات کی چمک اس کے حسن و شباب کی آب و تاب کے سامنے ماند نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک لمحے تک اسے غور سے دیکھتی رہی اور پھر فوراً ہی پہچان لیا۔

"برق..." اس نے خوشی سے بے تاب ہو کر بے اختیار کہا۔ "اوہ برق! مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے۔"

لیکن برق نے اس کی وارفتگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اندر داخل ہو کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا کہ کمرے میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ کمرے کے فرش پر بچھا ہوا دبیز ایرانی قالین اتنا ملائم تھا کہ پیر دھنس رہے تھے۔ ہر چیز کی سجاوٹ شاہانہ تھی۔ مخملی پردے چاروں سمت لٹک رہے تھے۔ چھت اور دیواروں پر لگے ہوئے جھاڑ اور فانوس کسی شاہی محل سے کم نہ تھے۔ سونے کے بنے ہوئے لیمپ ہر سمت روشن تھے۔ خانقاہ کے بیرونی حصوں کی سادگی کے بعد اس کمرے میں داخل ہو کر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خوابوں کی دنیا میں آ گیا ہو۔

"تم کو یہ کیسے معلوم تھا کہ میں ضرور آؤں گا چترا؟" برق نے پوچھا۔

"تم نے ضرورت کے وقت کسی دوست کو مایوس نہیں کیا ہے۔"

"اور کس کو میری ضرورت ہے؟"

"مجھے..."

"لیکن تم تو یہاں کی حکمران ہو۔ لوگ دیوی سمجھ کر تمہاری پوجا کرتے ہیں۔"

"میں نے یہ سب کچھ تم کو اپنے خط میں لکھ تو دیا تھا۔"

برق نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "خط! مجھے تو تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔"

چترا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "پھر تم یہاں کیسے آئے؟"

"یہ ایک طویل داستان ہے۔" اس نے جواب دیا "پہلے تم مجھے یہ بتلاؤ کہ تمہیں کس چیز کی کمی تھی جو اس منحوس جگہ آ کر پھنس گئیں اور ان شیطانوں کی دیوی بن کر ساری دنیا سے ناتا توڑ لیا؟ اس کے باوجود تم کو میری مدد کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟"

"تمہاری مدد کی اس وقت سے زیادہ ضرورت پہلے کبھی نہ تھی برق۔" چترا نے اداس لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں فکر و پریشانی کی جھلک تھی۔ برق نے محسوس کیا کہ وہ بے حد خوفزدہ ہے، پھر اسے فوراً ہی خیال آیا "میں بھی کتنی خود غرض ہوں۔ تم جانے کتنی دور سے سفر کر کے آ رہے ہو اور میں اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ گئی۔ ادھر آؤ، پہلے آرام سے بیٹھ کر کچھ کھا پی لو۔" اس نے دیوان کی سمت اسے کھینچتے ہوئے کہا، جس کے قریب ایک نیچی سی میز پر سونے کے ظروف میں کھانے کی چیزیں اور پھل رکھے ہوئے تھے۔

برق نے ذرا بھی تکلف نہ کیا اور دیوان پر بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا۔ وہ بہت بھوکا تھا۔ لذیذ کھانوں اور بھنے ہوئے گوشت نے اس کو بڑا لطف دیا۔ چترا قریب بیٹھی اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔

"میں راج نہیں کر رہی ہوں برق۔" چترا نے کہا "یہاں آ کر میں نے پناہ لی تھی۔ تبت کے راج محل کی زندگی اب خواب بن کر رہ گئی ہے۔ بابا کی موت کے بعد میرے بھائیوں نے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے میری شادی ایک کشمیری راجکمار سے کر دی۔ وہ آدمی نہیں بھیڑیا تھا۔ اس کے ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لئے میں ایک رات فرار ہو کر ہندوستان پہنچ گئی۔ وہاں مجھے انگریز حکومت نے پناہ دی۔ میرے بھائیوں نے مجھے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ راجکمار نے مجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بہت کوشش کی۔ پھر مجھے اغوا کرنے کے لئے بدمعاش بھیجے۔ اس نے میرے اغوا کے لئے بھاری رقم کے انعام کا لالچ دیا تھا۔ لیکن میں انگریزوں کے تحفظ میں تھی اس لئے راجکمار کامیاب نہیں ہو سکا۔ پھر اس نے مجھے قتل کرنے کی سازشیں شروع کر دیں۔ میں جانتی تھی کہ ایک دن وہ اس میں کامیاب ہو جائے گا۔" وہ خاموش ہو گئی۔

"پھر کیا ہوا چترا؟" برق نے اس کی سمت دیکھ کر پوچھا "تم یہاں کیسے پہنچ گئیں؟"

"میں زندگی سے عاجز آ گئی تھی۔ مرجانا چاہتی تھی۔" چترا نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا "میرے بابا اوگن کے متعلق اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے مذہبی آدمی تھے۔ اس علاقے میں یاترا کے لئے آئے تو بدھ مذہب اختیار کر لیا۔ پھر وہ اس خانقاہ کے بڑے لاما بن گئے۔ بچپن سے ہی میں ان کی... باتیں سنتی رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید من کی شانتی یہاں مل جائے۔ بابا ہمیشہ کہتے تھے کہ بدھ مت شانتی کا مذہب ہے۔ اس لئے میں اوگن کے لئے روانہ ہو گئی۔ میں یہاں کبھی نہ پہنچتی اگر راستے میں تم نہ مل جاتے۔"

برق مسکرانے لگا۔ اسے وہ واقعہ یاد آ گیا جب چترا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ لالچی کرخیز قبائل نے چترا کو اغوا کر لیا تھا اور زبردستی اپنے علاقے میں لے جا رہے تھے۔ برق ان دنوں اس علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس نے چترا کو ان وحشیوں سے رہائی دلا کر اوگن تک پہنچایا تھا۔ اور اسی وقت اسے پہلی بار یہ شہر دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ میری یہاں آمد پر بدھ راہب کتنے خوش ہوئے تھے۔ یہاں کے لوگ میرے بابا کو بھولے نہ تھے۔ وہ ان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور باوجودیکہ ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بابا کسی ریاست کے راجہ تھے اور ان کو اس بات پر دکھ بھی تھا

کہ وہ خانقاہ چھوڑ کر چلے گئے' پھر بھی انہوں نے میرا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ لیکن تم کو اس کا اصل سبب نہیں معلوم تھا۔ اس وقت میں بھی نہیں جانتی تھی۔ راہبوں کو اپنے بزرگوں کی ایک پیش گوئی یاد تھی کہ ایک عورت جس کے سینے پر چاند کا نشان ہوگا اس شہر میں آئے گی اور وہ ان کی دیوی کا اوتار ہوگی۔ ایک دن میری ملازمہ نے میرے جسم پر یہ نشان دیکھ لیا۔ یہ میرا پیدائشی نشان تھا۔ بابا کہتے تھے میں چاند کی راجکماری ہوں۔ لیکن راہبوں نے یہ جانتے ہی مجھے دیوی کا اوتار قرار دے دیا۔ اور مجھے اس خانقاہ میں دیوی بنا کر بٹھا دیا اور میری پوجا کرنے لگے۔"

"ہاں' میں نے یہ بات سُنی تھی۔ میں سمجھا تھا کہ تمہارے حسن نے ان پر جادو کردیا ہے۔" برق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے جانے کے بعد کچھ دن بڑے آرام سے گزرے۔ میں بھی دیوی بن کر عیش کرتی رہی۔ وہ میری پوجا کرتے ہیں۔ شروع میں تو پوجا کی رسمیں بڑی دلچسپ لگتی تھیں۔ کبھی کبھی میں واقعی خود کو دیوی سمجھنے لگتی تھی۔ یہ لوگ مجھے پوجتے رہے۔ میرے قدموں پر بھینٹ چڑھاتے رہے۔ وہ اپنی منتیں لے کر آتے' زروجواہر قدموں پر ڈھیر کردیتے۔ کبھی کبھی ان کی مُرادیں پوری بھی ہوجاتی تھیں لیکن جلد ہی حقیقت معلوم ہوگئی۔ یہ خانقاہ بدھ مت کے روحانی علوم کا مرکز نہیں رہی ۔۔۔۔ یہ شیطان کے پجاریوں کا اڈہ بن چکی ہے۔ وہ یہاں کے لوگوں کو بے وقوف بنا کر انہیں لوٹ رہے ہیں۔ ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ وہ یہاں خفیہ طور پر شیطان کی پوجا کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ شہر کے لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بناتے جا رہے ہیں۔ اب مجھے بھی اپنے راستے پر چلانا چاہتے ہیں۔"

"کیا یہ بات بدھ راہبوں کو نہیں معلوم؟"

"وہ سب جانتے ہیں لیکن ان کی تعداد برائے نام رہ گئی ہے۔ باقی سب کو بڑے پجاری یوگر نے اپنا ہمنوا بنا لیا ہے۔ مال وزر دے کر ان کے منہ بند کردیئے ہیں اور وہ بدھوں کا لباس تو پہنتے ہیں لیکن ہیں شیطان کے پجاری۔ عام لوگ مجھے دیوی کا اوتار مان کر خوش ہیں۔ فصلیں اچھی ہورہی ہیں' خوش حالی آگئی ہے' اس لئے وہ یہ سب کچھ دیوی کی برکت تصور کرتے ہیں لیکن دراصل اس ڈھونگ کی آڑ میں یوگر ان پر حکومت کر رہا ہے۔"

"میں نے پہلے ہی تم کو خبردار کیا تھا کہ یوگر مجھے بڑا مکار لگتا ہے۔" برق نے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا لیکن اس وقت مجھے اندازہ نہ تھا۔ میں یہاں شانتی کی تلاش میں آئی تھی لیکن یوگر نے مجھے اپنے شیطانی چکر میں پھانس لیا۔ اوہ برق' وہ بڑا مکار اور ظالم ہے۔ مجھے اس سے خوف آتا ہے۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔ یہاں کے لوگ اگر میری پرستش نہ کرتے ہوتے' اگر میری وجہ سے اس کو اتنی دولت نہ ملتی ہوتی تو وہ مجھے اب تک ہلاک کرچکا ہوتا۔ لیکن وہ ڈرتا ہے کہ اس طرح لوگ اس کے خلاف ہوجائیں گے۔"

"تم واقعی مصیبت میں ہو۔"

"مصیبت! میں بدترین قید میں ہوں' میں اس زندگی سے نجات چاہتی ہوں۔ یہاں سے ہر قیمت پر فرار ہونا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر تم نے اس جگہ کو چھوڑ کیوں نہیں دیا؟"

"میں مجبور ہوں' فرار کی تمام راہیں بند ہیں۔" چترا نے آنکھیں بند کرکے کہا "یوگر نے یہاں کے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اگر دیوی چلی گئی تو تمام برکتیں بھی چلی جائیں گی۔ یہاں ایسی تباہی آئے گی کہ کوئی باقی نہ رہے گا۔ اس نے مشہور کردیا ہے کہ دشمن' دیوی کو اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے یہ سب کچھ اس لئے کیا ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ مال و دولت کا نذرانہ دیتے رہیں اور اب وہ ڈرتا ہے کہ اگر میں فرار ہوگئی تو یہاں کے لوگ اسے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اسی لئے اس نے مجھے ہلاک نہیں کیا ورنہ وہ مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگا ہے کہ اب تک کبھی کا ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔"

"کیا تم اس کی قید میں ہو؟"

"ہاں قید بھی بڑی سخت۔ ہر لحہ نگرانی ہوتی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ میں فرار ہوجاؤں گی' اسی لئے میں نے تم کو خط لکھا تھا۔"

"تم بار بار کس خط کا ذکر کررہی ہو؟"

"ایک تاجک تاجر مجھے کچھ تحائف نذر کرنے آیا تھا۔ یہ لوگ کبھی کبھی خرید و فروخت کرنے اولگن آتے ہیں تو دیوی کو نذرانے دیتے ہیں۔ اس کے ذریعے میں نے تم کو مدد کے لئے خط لکھا تھا جس میں ساری باتیں تحریر کردی تھیں۔ میں نے اس کو اپنا مقدس نشان بھی دے دیا تھا۔ یہ سونے کا بنا ہوا ایک چاند ہے۔ جس پر جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ اس نشان کو دیکھ کر سب تعظیم میں جھک جاتے ہیں۔ اولگن کے باہر کے قبائل بھی اس نشان کی تعظیم کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ سُن رکھا ہے کہ اس کی بے ادبی کرنے والے پر دیوی کا قہر نازل ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس نشان کی مدد سے تم بلا کسی دشواری کے یہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"مجھے نہ تمہارا خط ملا اور نہ نشان۔" برق نے کہا "میں تو یہاں دو مکار انگریزوں کا تعاقب کرتا ہوا آیا ہوں' جنہوں نے میرے وفادار ملازم احمد کو قتل کردیا ہے۔ وہ مجھے دھوکا دے کر ازبکوں کے علاقے تک لائے تھے۔ لیکن پھر مجھے چھوڑ کر فرار ہوگئے اور اب اس شہر میں ہیں۔"

"سفید فام لوگ اور یہاں!" چترا نے حیران ہوکر کہا۔ "ناممکن۔ وہ یہاں تک زندہ نہیں پہنچ سکتے۔"

"مجھے ان کی یہاں آمد کا راز معلوم ہوچکا ہے۔" برق نے جواب دیا "کسی طرح تمہارا خط اور وہ مقدس نشان ان کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔ تمہارا نشان دکھا کر وہ بحفاظت یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں اغوا کرنے آئے ہیں تاکہ تمہیں کشمیری راجکمار کے حوالے کرکے دولت حاصل کریں۔"

چترا اچھل کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں "اس راکھشش کے پاس واپس جانے کے بجائے میں مرجانا پسند کروں گی۔ کہاں ہیں یہ دونوں کتے؟ میں ابھی

ان کے متعلق لوگوں کو بتادوں گی۔ اولگن کے لوگ ان کی بوٹیاں نوچ لیں گے۔"

"لیکن اس طرح تم بھی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔" برق نے کہا "ممکن ہے لوگ ان انگریزوں اور یوگر کو بھی ہلاک کردیں لیکن تمہارا خط ان کے ہاتھ لگ گیا تو ان کو معلوم ہوجائے گا کہ تم فرار کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ وہ تم کو بھی غدار قرار دیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" چترا نے فکرمند لہجے میں کہا "پھر کیا کروں؟"

"تم کو خانقاہ میں چلنے پھرنے کی آزادی تو ہے؟"

"ہاں۔ یہ سمجھو پجاری ہر لمحے چھپ کر میری نگرانی کرتے ہیں۔" چترا نے کہا "لیکن وہ یہاں نہیں آتے کیونکہ اس جگہ سے باہر جانے کا صرف ایک زینہ ہے جس پر ہر وقت ایک مسلح پہرے دار موجود رہتا ہے۔"

"اور وہ ایسا بے خبر ہوتا ہے کہ میں یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔" برق نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن اگر ان کو شبہ ہوگیا کہ تم فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہی ہو تو وہ تم کو کسی کوٹھری میں قید بھی کرسکتے ہیں۔"

"ہاں برق۔ میں کیا کروں؟" اس نے التجا کی "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے ساتھ تقریباً سو جنگجو ترکمان ہیں۔ جنہیں میں گھاٹی میں ایک خفیہ جگہ چھوڑ کر آیا ہوں۔ لیکن فی الحال ان سے کوئی مدد نہیں مل سکتی اور ان کا دیر تک چھپا رہنا ممکن نہیں۔ میں یہاں نارمن اور بروک نامی فرنگیوں کو قتل کرنے آیا تھا۔ لیکن یہ کام بعد میں بھی ہوسکتا ہے' پہلے تم کو یہاں سے نکالنا ضروری ہے۔ لیکن جب تک یہ معلوم نہ ہوجائے کہ یوگر اور دونوں فرنگی کہاں ہیں' میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اولگن میں کوئی ایسا آدمی ہے جس پر تم بھروسہ کرسکو؟"

"یہاں کا ہر شخص میرے لئے جان دے سکتا ہے لیکن وہ مجھے یہاں سے کسی قیمت پر جانے نہیں دیں گے۔"

"تم نے کہا تھا کہ نیچے جانے کا واحد راستہ اس زینے سے ہے۔"

"ہاں۔ یہ خانقاہ پہاڑ سے متصل بنائی گئی ہے اور ساری غلام گردشیں اور دالان پہاڑ کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ یہ خانقاہ کی سب سے اونچی منزل ہے اور صرف میرے لئے مخصوص ہے۔ میرے لئے محل سے گزر کر باہر جانے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے جہاں ہر وقت سیکڑوں پجاری موجود رہتے ہیں۔ میری صرف ایک ذاتی ملازمہ ہے جو قریب والی کوٹھری میں سو رہی ہے۔ اس نے آج بھی بھنگ پی رکھی ہوگی اور صبح تک مدہوش پڑی رہے گی۔"

"یہ اور بھی بہتر ہے۔ تم اس پستول کو اپنے پاس رکھو اور میرے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کرلینا۔ جب تک میں نہ آؤں کسی کے لئے دروازہ نہ کھولنا۔"

"لیکن تم کہاں جارہے ہو؟" چترا نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"جاسوسی کرنے۔" برق نے جواب دیا "یہ جاننا ضروری ہے کہ یوگر اور اس کے ساتھی کیا کررہے ہیں۔ اگر میں ابھی تم کو لے کر چلوں تو ممکن ہے ان سے مڈبھیڑ ہوجائے۔ اس طرح سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اگر میرا خیال درست ہے تو وہ آج ہی رات تم کو اغوا کرکے لے جانے کی کوشش کریں گے اور اگر ایسا ہوا تو ہم ان کو نہیں روکیں گے۔ جب وہ تمہیں لے کر شہر سے باہر نکلیں گے تو ہم ترکمانوں کے ساتھ حملہ کرکے تم کو آزاد کرالیں گے۔ لیکن مجھے یہ منصوبہ پسند نہیں ہے۔ فائرنگ کے تبادلے میں تم کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میں کوئی اور صورت نکالوں گا۔ اب دروازہ بند کرلو اور میری دستک کا انتظار کرنا۔"

●●●**●●●

پہرے دار ہنوز خراٹے لے رہا تھا۔ برق دبے پاؤں اس کے پاس سے گزر گیا۔ وہ نچلی منزل پر پہنچا تو ہر سمت تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ساری کوٹھریاں خالی ہوں گی کیونکہ تمام پجاری نیچے سوتے تھے۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ جلدی سے ایک کوٹھری میں داخل ہوگیا اور انتظار کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد ایک پجاری سامنے سے گزرا۔ برق نے آہستہ سے اسے ہشت کرکے اپنی طرف متوجہ کیا۔

پجاری نے اس کے قریب آکر تاریکی میں جھانکا "کون ہو تم؟"

"میں یوگر کا غلام ہوں۔" برق نے سرگوشی میں کہا "یہاں نگرانی پر مامور ہوں۔ کیا دونوں فرنگی آگئے؟"

"ہاں' یوگر انہیں خفیہ راستے سے لے آئے ہیں تاکہ کسی کو پتا نہ چلے۔ لیکن اگر یوگر نے تم کو پہرے پر لگایا ہے تو تم کو معلوم ہوگا کہ چکر کیا ہے۔"

"تم کو کیا معلوم ہے؟"

"یوگر بہت چالاک ہے' جب اس تاجک تاجر نے یوگر کو چترا دیوی کا خفیہ خط دکھایا تھا تو یوگر نے اسے خط لے جانے دیا تھا۔ اس سے کہا تھا کہ چترا دیوی نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جب وہ آدمی جسے چترا دیوی نے بلایا تھا انہیں لینے آئے گا تو دونوں کو ایک ساتھ ٹھکانے لگادیا جائے گا تاکہ لوگوں کو یہ بتلایا جاسکے کہ اس نے اس دیوی کو ہلاک کردیا۔"

"واقعی یوگر بہت چالاک ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ چترا دیوی اب ان کے لئے خطرہ بن چکی ہے۔" پجاری نے کہا۔

"پھر یہ فرنگی کیوں آئے ہیں؟"

"تم کو یہ بھی نہیں معلوم؟ چترا دیوی کا خط لے جانے والے لالچی تاجک نے وہ خط ان دونوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ یہاں آکر یوگر سے ملاقات کرلیں۔ وہ لوگ دیوی کو کسی راجکمار کے

پاس لے جا کر انعام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"
"لیکن اس سے یوگر کو کیا فائدہ ہو گا؟"
"ان کو دیوی سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔"
"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہیں۔ اب جاؤ، کسی کو یہ نہ بتلانا کہ میں یہاں پسہودے رہا ہوں۔"

برق کا اندیشہ درست نکلا تھا۔ یوگر ایک تیر سے دو شکار کر رہا تھا۔ اب چترا کو نارمن اور بروک کے ہمراہ جانے دینا درست نہیں تھا۔ اگر وہ کسی خفیہ راستے سے نکل گئے تو تلاش ممکن نہ ہوگی۔ اسے فوری طور پر کچھ کرنا ہو گا۔ پجاری ابھی اس کے پاس کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ برق نے ایک مدھم سی روشنی کو اسی سمت بڑھتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ تیز تیز قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔ وہ کوٹھری کے اور اندر ہو گیا۔ ذرا دیر بعد ایک دوسرا پجاری قریب آیا۔ اس نے سرپوش سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ پہلے پجاری کو دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ یوگر اُن سفید فاموں کو لے کر چترا دیوی کے کمرے میں گئے ہیں۔ دیوی کی ملازمہ نے ابھی آکر خبر دی تھی کہ برق اولگن میں داخل ہو چکا ہے اور کچھ دیر پہلے دیوی کے کمرے میں تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ یہ خبر دینے آئی تھی۔ یوگر بہت خوف زدہ تھے۔ وہ کہہ رہے تھے یہ برق بہت خطرناک ہے۔ ہم سب اس کو تلاش کر رہے ہیں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ اور تم بھی۔"

اچانک اس نے لیمپ بلند کیا جس کی روشنی برق کے چہرے پر پڑی جو کوٹھری کے اندر تھا۔ پجاری نے اس کا پجاریوں کے بجائے چھواہے کا لباس دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ منہ کھولتا، برق کا بھرپور مُکا اس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے گرا۔ لیمپ گرنے کی آواز کے ساتھ ہی برق نے دوسرے پجاری پر جست لگائی۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ تاریکی میں صرف ایک مرتبہ ہلکی سی آواز ابھری لیکن پھر حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ دوسرا پجاری طاقت ور تھا۔ کئی مرتبہ وہ برق کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن آخر کار برق نے اس کا سر اتنی زور سے دیوار پر ٹکرایا کہ وہ بے حس ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے برق پوری رفتار سے سیڑھیوں کی سمت بھاگ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس دوران کوئی اوپر نہیں گیا ہے۔ چترا نے کہا تھا کہ اوپر جانے کا یہ واحد راستہ ہے۔ اس کے باوجود اس پجاری نے کہا تھا کہ یوگر اُن فرنگیوں کو لے کر دیوی کے کمرے میں گیا ہے اور یہ کہ چترا کی غدار ملازمہ نے جاسوسی کر کے اس کی موجودگی کا راز افشا کر دیا تھا۔

وہ بے تحاشا بھاگتا ہوا سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر پہنچا۔ پہرے دار اب بھی دیوار سے ٹکا ہوا تھا لیکن اب وہ کبھی بیدار نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی پشت میں ایک خنجر دستے تک گھسا ہوا تھا۔ برق کو حیرت ہوئی کہ یوگر نے اپنے ہی آدمی کو کیوں ہلاک کر دیا۔ لیکن سوچنے کا موقع نہ تھا۔ اس کو خدشہ تھا کہ یہاں پہنچنے میں دیر ہو چکی تھی۔

اس نے چترا کے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور چترا کمرے میں موجود نہ تھی۔ کمرے میں کشن بکھرے ہوئے تھے۔ برق دم بخود کھڑا رہا۔ روشنی میں اس کی تیز دھار تلوار چمک رہی تھی۔ غصے سے اس کی آنکھیں قہر بار ہو رہی تھیں۔ وہ کمرے میں ہر سمت کا جائزہ لیتی رہیں پھر دیوار پر پڑے ہوئے پردے پر ایک جگہ مرکوز ہو گئیں۔ اگلے ہی لمحے وہ باہر جانے کے لئے دروازے کی سمت مڑا۔ لیکن دو قدم چل کر بجلی کی سی پھرتی سے مُڑا۔ اس کی تلوار اچانک پردے پر جا کر پڑی۔ وہ اتنی پھرتی کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا کہ پردے کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کو بچنے کا موقع نہ مل سکا۔ برق کی خون آلود تلوار کے ہٹتے ہی وہ پردے کے ساتھ فرش پر گرا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر تھا لیکن اب اسے استعمال کرنے کی سکت اس میں باقی نہ رہی تھی۔

"چترا کہاں ہے؟" برق اپنی تلوار کی نوک زخمی پجاری کے سینے پر رکھتا ہوا دہاڑا "جلدی بتاؤ ورنہ سر اُڑا دوں گا۔"

فرش پر پڑے گنجے پجاری نے جواب نہیں دیا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اسی عالم میں وہ مر گیا۔ وہ گونگا تھا۔ برق دیوار کی سمت لپکا اور پردوں کو کھینچ کر ہٹانے لگا۔ اسے یقین تھا کہ ان کے پیچھے دیوار میں کوئی خفیہ راستہ ضرور موجود تھا۔ لیکن دیواریں بالکل سپاٹ نظر آ رہی تھیں۔ کسی خفیہ دروازے کا سراغ نہ مل سکا۔ اور خفیہ راستہ معلوم کئے بغیر وہ چترا کو اغوا کرنے والوں کا تعاقب نہ کر سکتا تھا۔ غصے اور پریشانی سے اس کا جسم پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ اچانک اسے اپنے لباس کا خیال آیا۔ اس لباس میں وہ فوراً پہچان لیا جائے گا۔ بے ہوش پڑے پجاری کا لباس کار آمد ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ پھرتی کے ساتھ چترا کے کمرے سے باہر نکلا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا۔ لیکن اچانک اس کے قدم رک گئے۔ وہاں ہر سمت روشنیاں حرکت کرتی نظر آ رہی تھیں۔ ان گنت پجاری لیمپ ہاتھ میں لئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے اور سیڑھیوں کے نیچے ہال میں مشعلیں لئے پجاریوں کا ایک ہجوم کھڑا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ میں رائفلیں اور ننگی تلواریں تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بیک وقت کئی پجاری چلائے۔ اسی لمحے برق کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ ایک رسّی پکڑ رکھی تھی جو دیوار پر لٹک رہی تھی۔ برق نے جیسے ہی قدم آگے بڑھایا، لڑکی نے زور سے رسّی کو جھٹکا دیا۔ برق کو زمین پیروں کے نیچے سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بیک وقت کئی فائر ہوئے۔ پجاریوں نے ایک فاتحانہ نعرہ بلند کیا۔

❁❁❁**❁❁❁

برق کے جانے کے بعد چترا نے دروازے کو مضبوطی کے ساتھ بند کیا اور پھر دیوان پر دراز ہو کر سوچنے لگی۔ برق کا دیا ہوا پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ماضی کے اُن رنگین لمحات کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی جن میں اس کی ملاقات برق سے پہلی بار ہوئی تھی۔

وہ راجکماری تھی، ایک راجہ کی بیوی تھی۔ ان گنت لوگوں نے اس کی بارگاہِ حسن میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بری وہ پہلا شخص تھا جس نے اس پر فتح پائی تھی۔ جس کے بے باک اور کرخت رویے سے وہ متاثر ہوئی تھی۔ اس نے پستول ایک سمت ڈال دیا اور تکیے کے سہارے لیٹ کر سوچنے لگی۔ کیسا بہادر اور رعب دار تھا یہ شخص، کسی خطرے سے نہ ڈرتا تھا۔ وہ اسے ضرور یہاں سے بحفاظت نکال کر لے جائے گا۔ وہ اپنے خیالات میں اتنی کھو گئی کہ گرد و پیش کا کچھ ہوش نہ رہا۔ وہ اس وقت چونکی جب دیوار پر ٹنگا ہوا ریشمی پردہ اچانک ہٹا۔ اب تک وہ یہی سمجھتی تھی کہ کمرے کی دیواریں ٹھوس ہیں اور کمرے میں داخل ہونے کے لئے دروازے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ لیکن ایک لمحے کو وہ دم بخود رہ گئی۔

پردہ ہٹا کر سامنے آنے والا شخص کسی دیو کی طرح مضبوط تھا۔ گنجا سر اور لانبے کان، منگولوں کی طرح ترچھی آنکھیں اور چہرے سے نفرت و بربریت ٹپک رہی تھی۔ وہ اتنا بھیانک تھا کہ چترا خوف سے بالکل بے حس ہو کر رہ گئی۔ دیوار کا ایک حصہ اپنی جگہ سے

ہٹ گیا تھا اور اس خفیہ دروازے سے نمودار ہونے والا یہ خوف ناک شخص دونوں ہاتھ پھیلائے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو سفید فام شخص کھڑے اسے للچائی نظروں سے گھور رہے تھے۔ چترا اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اچانک وہ بستر پر پڑے پستول کی سمت جھپٹی لیکن وہ دیو قیامت بلا کا پھرتیلا تھا۔ بجلی کی طرح جست لگا کر اس نے چترا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نے خود کو آزاد کرانے کی ہر ممکن جدوجہد کی لیکن اس کی فولادی گرفت میں تڑپ کر رہ گئی۔ اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس وحشی نے اس کا منہ دبا دیا اور اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

"جلدی کرو' اس کے ہاتھ پیر باندھ کر منہ بند کردو۔" ایک سفید فام نے آہستہ سے کہا۔ ذرا دیر میں چترا بے بسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ "باہر اس کا گونگا پہرے دار ہوگا۔ اسے بھی ٹھکانے لگا دو۔" سفید فام نے کہا۔ گنجے منگول نے گردن ہلائی اور کمر سے تیز دھار خنجر نکال کر دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ ذرا دیر بعد وہ مسکراتا ہوا واپس آیا اور چترا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"احمق لڑکی" دیو قامت یوگر نے نفرت بھرے لہجے میں کہا "تو خود کو بہت چالاک سمجھتی تھی۔ تجھے تو نہ اس خفیہ دروازے کا پتا تھا نہ اس بات کا کہ تیری ملازمہ مجھے ایک ایک لمحے کے حالات سے باخبر رکھتی تھی۔ تو نے برق کو یہاں بلا کر یہ سمجھا تھا کہ میرے چنگل سے نکل جائے گی۔ اب دیکھ کیا ہوا! تیری مدد کو آنے والا وہ احمق برق اب تک جہنم رسید ہو چکا ہوگا۔" اس نے چترا پر جھکتے ہوئے ایک بھیانک قہقہہ لگایا! "ہم اس کی لاش لوگوں کو دکھا کر یہ کہیں گے کہ اس غدار نے تجھ کو فرار کرا دیا۔ اور یہ دونوں صاحب لوگ تجھے تیرے پتی کے پاس کشمیر پہنچا دیں گے۔ کیسا رہے گا میری دیوی؟"

"یوگر' وقت نہ برباد کرو۔" نارمن نے کہا "تم کو یقین ہے کہ پہاڑیوں کے درمیان پہنچنے کے بعد کوئی خطرہ نہ رہے گا؟"

"یوگر اس لڑکی کی طرح بے وقوف نہیں ہے۔" یوگر نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا "اس خفیہ راستے کا علم کسی کو نہیں ہے۔"

"تو پھر چلو۔ جب تک برق کے مرنے کی تصدیق نہ ہو جائے یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

یوگر نے چترا کو اپنے کاندھے پر لادا اور وہ خفیہ دروازے میں داخل ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ دیوار کے دونوں حصے برابر ہو گئے۔ وہ ایک تنگ ڈھلوان راستے پر چلنے لگے جو نیچے کی سمت جاتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک زینے پر پہنچ گئے جو پہاڑ کی چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ زینے کے خاتمے پر وہ ایک تنگ سرنگ میں داخل ہوئے اور آخر کار ایک ایسی جگہ آکر رک گئے جہاں سامنے دیوار تھی۔ یوگر نے اپنا بوجھ نارمن کے کاندھوں پر منتقل کیا اور دیوار کو دھکا دیا۔ چٹان گھوم کر ہٹی تو ایک اور خفیہ دروازہ نمودار ہوا جس کے گرد جنگلی بیلوں کی گھنی باڑھ تھی۔ یوگر نے لیپ بجھا دیا اور وہ ایک غار میں داخل ہوئے۔ اس سے گزر کر وہ کھلے آسمان کے نیچے پہنچ گئے۔ چترا نے دیکھا کہ غار کے سامنے بہنے والے چشمے کے کنارے گھنی جھاڑیاں تھیں' جنھوں نے غار کے دہانے کو چھپا رکھا تھا۔ چشمہ پار کر کے وہ درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے تو دائیں جانب فاصلے پر چترا کو روشنیوں کی جھلک نظر آئی۔ وہ اوگن کی آبادی سے دور ایک پہاڑی پر کھڑے تھے۔ یہاں سے شہر کا فاصلہ بمشکل نصف میل کا ہوگا۔ سامنے گھنا جنگل تھا اور بائیں طرف بلند پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔

آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کی ہلکی روشنی میں یوگر اور اس کے فرنگی ساتھیوں نے بڑھنا شروع کیا۔ ان کا رخ مغرب کی سمت والی اس چوٹی کی سمت تھا جو کچھ فاصلے پر نظر آرہی تھی۔ یہ فاصلہ انہوں نے بڑی خاموشی سے طے کیا۔ یوگر کی طرح دونوں سفید فام فرنگی بھی بڑی احتیاط سے چل رہے تھے اور گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔ ان کو یہ خوف تھا کہ اگر اوگن کے باشندوں کو خبر ہو گئی کہ ان کی دیوی کو اغوا کر کے لے جایا جا رہا ہے تو وہ انھیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔ لیکن فرنگیوں سے زیادہ یوگر خائف تھا۔ اس نے نارمن اور بوک کی آمد کی خبر لانے والے چرواہے کو قتل کردیا تھا۔ اوگن کے باشندوں نے اپنی دیوی کی حفاظت کے لئے جس گونگے محافظ کو مقرر کیا تھا اسے بھی ٹھکانے لگا دیا تھا اور امید تھی کہ اس کے آلۂ کار پجاریوں نے برق کا کام بھی تمام کردیا ہوگا۔ لیکن اگر برق کسی طرح بچ گیا تو پھر ان سب کی خیر نہ تھی۔

"اور تیز چلو۔۔۔ اور تیز چلو۔" اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"اتنا بھی گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟" نارمن نے کہا "برق کا کام تو تمام ہو چکا ہوگا نا؟"

"ہاں' ہاں" یوگر نے جلدی سے جواب دیا "لیکن تم لوگ جتنی جلدی یہاں سے نکل جاؤ بہتر ہے۔"

وہ خاموشی کے ساتھ خطرناک راستے پر چلتے رہے اور پھر ڈھلوان سے اتر کر ایک ہموار پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ وہ تینوں بری طرح ہانپ رہے تھے۔

"لو ہم غار کے پاس پہنچ گئے۔" نارمن نے کہا "ادھر دائیں سمت چلو' وہ رہا اس کا دہانہ۔"

وہ تینوں غار کے دہانے کی سمت بڑھے۔ دہانے پر لٹکی ہوئی بیلوں کو ہٹا کر نارمن نے آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے یوگر کی سمت دیکھا۔

"اسے یہیں پر ڈال دو۔" اس نے چترا کی سمت اشارہ کیا "میں اندر جا کر ملازموں کو بلاتا ہوں۔ انہوں نے سامان لاد کر گھوڑے تیار رکھے ہوں گے ہم فوراً ہی اس منحوس جگہ سے روانہ ہو جائیں گے۔"

اس نے پھر آواز دی۔ لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو تیزی کے ساتھ غار کے اندر داخل ہوا "کہاں مر گئے تم سب؟" وہ غصے میں

چلّایا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے خوفزدہ لہجے میں چیخ کر آواز دی‘ ”بروک! جلدی آؤ‘ غضب ہو گیا۔“

❁❁❁✱✱❁❁❁

برق کو ایسا لگا جیسے وہ جہنم کی تاریکی میں گرتا چلا جارہا تھا۔ اس نے ہر سمت ہاتھ پیر مارے لیکن کوئی سہارا نہ مل سکا۔ اور پھر اچانک وہ ٹھوس پتھریلے فرش پر جاکر گرا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہڈیاں سلامت نہ رہتیں لیکن وہ کوئی اور نہیں برق تھا۔ اس نے اندازہ کرلیا تھا اور اپنے پنجوں کے بل فرش سے ٹکرا کر اس طرح اچھلا تھا جیسے پیروں میں اسپرنگ لگے ہوں۔ اس کے باوجود اتنی بلندی سے گرنے کی بنا پر اس کا سارا جسم جھنجھنا اٹھا تھا۔ ایک لمحے تک وہ ساکت پڑا رہا۔ اس کو کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ کہاں پھنس گیا۔ اسے اپنی حماقت پر سخت غصہ آرہا تھا۔ حواس بجا ہوئے تو وہ آہستہ سے اٹھا۔ خوش قسمتی سے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے ٹٹول کر اپنی تلوار تلاش کی جو ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی تھی۔ وہ جس خفیہ راستے سے گرا تھا اس کا دہانہ بند ہوچکا تھا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں تھا۔ ذرا دیر کی کوشش کے بعد اسے تلوار مل گئی۔ ہر سمت گہری تاریکی تھی اور اسے کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کسی بہت گہرے تہ خانے یا غار میں... گرا تھا اور اس کے دشمنوں کو اس کی موت کا یقین ہوچکا ہوگا۔ وہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ ایک چوکور تہ خانہ تھا۔ اس میں صرف ایک دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا۔

وہ ابھی دروازے کو ٹٹول ہی رہا تھا کہ آہٹ سنائی دی۔ وہ ساکت کھڑا ہوگیا۔ کوئی باہر سے دروازے کو ٹٹول رہا تھا۔ برق جلدی سے ایک سمت ہٹ گیا۔ شاید وہ اس کی لاش دیکھنے اندر آرہے تھے۔ ان کو یقین ہوگا کہ برق مرچکا — اس کا دل زور زور سے اچھلنے لگا۔ تلوار کے قبضے پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا۔ اچانک روشنی سے برق کی آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ ایک شخص لیمپ ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا۔ برق نے پھرتی کے ساتھ وار کیا اور لپک کر لیمپ تھام لیا۔ اس کے قدموں میں ایک گنجے پجاری کی لاش پڑی تھی۔ دروازے کے باہر ایک طویل راستہ نظر آرہا تھا۔ وہ پھرتی کے ساتھ باہر نکلا۔ پتلا سا سرنگ نما راستہ نیچے چلا گیا تھا۔ وہ ڈھلوان راستے پر چلتا ہوا آگے بڑھا۔ بلندی پر جانے سے خدشہ یہ تھا کہ وہ پھر دشمنوں کے نرغے میں نہ پہنچ جائے۔ وہ بڑی احتیاط سے ڈھلوان راستے پر نیچے جارہا تھا۔ ذرا سی آہٹ دشمنوں کو خبردار کرسکتی تھی۔ اس کے دشمنوں کو شاید یقین آچکا تھا کہ اس کا جسم زخموں سے چھلنی ہوکر اس تہ خانے میں پڑا ہوا ہوگا اور یہ واحد پجاری شاید اسی بات کی تصدیق کرنے آیا تھا۔ ان کو ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ زندہ بچ گیا تھا تو یہ پجاری تنہا نہ آتا۔

ڈھلوان راستہ اچانک داہنی جانب مڑ گیا۔ یہاں دیوار کے ساتھ جلتی ہوئی مشعلیں لگی ہوئی تھیں۔ برق نے لیمپ بجھا کر زمین پر رکھا اور ایک مشعل نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ یہاں سے ڈھلوان اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ قدم جمانا مشکل تھا۔ احتیاط کے باوجود وہ تقریباً لڑکھڑاتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ یہاں تک کہ ہموار فرش پر پہنچ گیا۔ لیکن آگے راستہ بند تھا اور ایک ٹھوس دیوار درمیان میں حائل تھی۔ برق کو یقین آگیا کہ وہ پہاڑ کے اس زمیں دوز حصے میں کھڑا تھا جس پر خانقاہ کی عمارت واقع تھی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ ان خفیہ راستوں اور تہ خانوں کا علم خاص راہبوں کے علاوہ کسی اور کو نہ ہوگا اور چترا ان کے وجود سے لاعلم تھی۔ چترا کی یاد آتے ہی اس کے دل میں کسک سی ہوئی۔ جانے غریب کس حال میں ہوگی۔ برق اس کو یہاں سے نکال لے جانے کا وعدہ کرکے آیا تھا اور خود پھنس کر رہ گیا تھا۔ غصے میں اس نے پتھر کی دیوار پر لات ماری اور دم بخود رہ گیا۔ دیوار میں اچانک راستہ نمودار ہوگیا تھا۔ ایک حصہ بغیر کسی آواز کے گھوم کر دروازے کی طرح کھل گیا تھا۔ تازہ ہوا کا سرد جھونکا چہرے سے ٹکرایا۔ روشنی میں اس کو ایک کشادہ غار نظر آرہا تھا۔ خوشی سے اس کا دل اچھل پڑا۔ غار کے اندر داخل ہوکر جیسے ہی وہ آگے بڑھا اسے دہانہ نظر آگیا۔ اس نے جلدی سے مشعل بجھادی اور کچھ دیر کھڑا رہا تاکہ آنکھیں تاریکی کی عادی ہوجائیں۔ ذرا دیر بعد وہ آگے بڑھا اور غار سے باہر نکل آیا۔

آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں نے آزادی کا احساس دلایا۔ وہ بے پایاں مسرت کے ساتھ آگے بڑھا لیکن اچانک رک گیا۔ پانی میں چلنے والوں کے قدموں کی چھپاک چھپاک آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ برق پھرتی کے ساتھ جھاڑیوں کی آڑ میں ہوگیا۔ اگلے ہی لمحے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز قریب آئی اور پھر ہانپتا ہوا ایک بدشکل پجاری آگے بڑھا۔ یہ یوگر تھا۔ دوسرے ہی لمحے برق نے جست لگائی اور یوگر کو ساتھ لئے زمین پر گرا۔ اس نے پھرتی کے ساتھ تلوار اس کی گردن پر رکھی اور سینے پر سوار ہوگیا۔

”تت... تم؟“ یوگر کے حلق سے دہشت زدہ آواز نکلی ”تم زندہ ہو؟“

”نہیں‘ یہ میرا بھوت تم پر سوار ہے۔“ برق نے دانت پیستے ہوئے کہا ”جلدی بتا کہ چترا کہاں ہے ورنہ گردن جسم سے الگ کردوں گا۔“

”تم برق ہو؟“ یوگر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”شیطان کے بچے‘ بتاتا ہے یا...؟“

”بتاتا ہوں۔ ابھی بتاتا ہوں۔“ یوگر نے کانپ کر کہا ”وہ فرنگیوں کے قبضے میں ہے۔“

”کہاں ہیں وہ دونوں؟“

”ہم... مجھے نہیں معلوم۔ وہ اسے لے کر چلے گئے۔“

برق نے تلوار پر زور ڈالا ”تو تجھے بھی وہیں بھیجے دیتا ہوں۔“

”ٹھہرو... ٹھہرو‘ مجھے نہ مارو۔ بتاتا ہوں۔“ یوگر چیخ اٹھا ”ہم اسے لے کر اس غار تک گئے تھے جہاں وہ دونوں چھپے ہوئے تھے لیکن ان کے ملازم گھوڑے لے کر فرار ہوچکے تھے۔ فرنگیوں نے

مجھ پر غداری کا الزام لگایا۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے ان کے ملازموں کو قتل کروا دیا اور اب ان کو بھی ٹھکانے لگانے کی سازش کر رہا ہوں۔ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ میں ارلک کی قسم کھاتا ہوں' یہ الزام غلط ہے۔ مجھے پتا نہیں ان کے ملازم کہاں گئے۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میرا ایک پجاری درمیان میں آگیا اور میں وہاں سے فرار ہو گیا۔"

برق نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ برق نے کمر سے رسّی نکالی اور اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی کے ساتھ پشت پر باندھ دئیے "ہم وہیں واپس چل رہے ہیں۔" اس نے خونخوار لہجے میں کہا "تو نے ذرا بھی آواز نکالی تو گردن اڑا دوں گا۔ مجھے سیدھے اس غار کی سمت لے کر چل۔"

"نہیں۔" یوگر نے التجا کی "وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"تو نے ایک لمحے اور دیر کی تو میں تجھے قتل کر دوں گا۔" برق نے گرج کر کہا اور اسے آگے دھکا دیا۔

یوگر دیو قامت ہونے کے باوجود بڑا بزدل تھا۔ کانپتے ہوئے قدموں سے وہ آگے آگے چلنے لگا۔ ڈھلوان سے اتر کر وہ جیسے ہی ہموار جگہ پہنچے' برق نے کہا "میں یہ جگہ پہچانتا ہوں۔ اور مجھے اب معلوم ہے کہ غار کہاں ہے۔ اس لئے گڑبڑ نہ کرنا۔"

یوگر بے بسی کے عالم میں چلتا رہا۔ ننگی تلوار کی چمک سے اس کا دل لرز رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ غار کے سامنے پہنچ گئے لیکن وہاں ہر سمت خاموشی طاری تھی۔

"وہ چلے گئے۔" یوگر نے کانپتی آواز میں کہا۔

"مجھے پہلے ہی امید تھی۔ لیکن میں صرف تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

"سنو۔" یوگر نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ کسی کے کراہنے کی آواز تھی اور بلاشبہ غار کے اندر سے آئی تھی۔ برق نے پھرتی کے ساتھ تلوار کی نوک یوگر کے سینے پر رکھ دی "خبردار جو آواز نکالی۔" اس نے کہا اور پھر ایک تسمے سے اس کے پیروں کو بھی باندھ دیا تاکہ فرار نہ ہو سکے۔

یوگر کو چھوڑ کر وہ دبے پاؤں غار میں داخل ہوا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ کراہ پھر سنائی دی۔ وہ جو بھی تھا شدید اذیت میں تھا۔ احتیاط سے قدم رکھتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔ اچانک اس کا پیر کسی نرم چیز سے ٹکرایا اور کوئی زور سے کراہا۔ برق نے ٹٹول کر دیکھا' کسی انسان کا جسم تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پر نمی سی محسوس کی اور جیب سے ماچس نکال کر جلائی۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھ خون میں تر تھے اور بروک زمین پر پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

"بروک!" برق نے آہستہ سے کہا۔

لب مرگ بروک نے اپنا نام سن کر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو منہ سے خون آگیا۔

"تا... ر... من" اس نے کراہتے ہوئے کہا "تم واپس آگئے؟" وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

"میں تارمن نہیں برق ہوں بروک۔ چترا کہاں ہے؟"

بروک نے آنکھیں کھول دیں "وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ تارمن... ذلیل کمینہ... میں نے اسے بچانے کی کوشش کی تھی۔ یوگر کے پجاری نے مجھے زخمی کر دیا۔ ہم یہاں پہنچے تو ملازم فرار ہو چکے تھے۔ یوگر نے ہم سے غداری کی۔ تارمن اس کو ختم کر دیتا لیکن اس کے ساتھی پجاری نے حملہ کر دیا۔ یوگر بھاگ گیا۔ اور... تارمن... کمینہ تارمن مجھے مرتا چھوڑ کر اس لڑکی کے ساتھ فرار ہو گیا۔ اس نے رہنمائی کے لئے اس پجاری کو پکڑ لیا ہے۔ وہ پیدل اس پہاڑی کو پار کرنا چاہتا ہے۔ تم... میں اس کو..." اچانک اس کی گردن ڈھلک گئی۔ برق نے باہر آکر یوگر کو یہ سب بتایا اور اس کے پیر کھول دئیے۔ یوگر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"وہ کبھی اس پہاڑ کو پار نہ کر سکیں گے۔ راستے میں ہی مر جائیں گے۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ہم ان کا تعاقب کریں گے اور تم میری رہنمائی کرو گے۔" برق بولا۔

"انہیں مر جانے دو۔" یوگر نے غصے میں کہا۔

برق نے تلوار کی نوک اس کے حلق پر رکھ دی "کتے! اگر وہ مر گئے تو میں تجھے بھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔ کیا تو چاہتا ہے کہ میں تجھے گھسیٹ کر لے چلوں اور شہر کے لوگوں کو تیری غداری کی داستان سنا دوں؟ ان کو بتلا دوں کہ تو نے ان کی دیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہ تیری ایک ایک بوٹی نوچ ڈالیں گے۔"

"نہیں" یوگر خوف زدہ آواز میں چیخا "نہیں... میں تمہاری ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوں۔"

"تو پھر اٹھ۔ ان کو روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ اگر سورج نکلنے سے پہلے وہ مجھے نہ ملے تو میں سمجھ جاؤں گا کہ تو نے دھوکا دیا ہے اور پھر..."

یوگر گھبرا کر پیچھے ہٹا "نہیں' میں تم کو دھوکا نہیں دوں گا۔ چلو۔"

●●●**●●●

صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔ برق اس وقت ایک خطرناک پہاڑی راستے سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ وہ اس وقت اوگن کے جنوب والی پہاڑی پر تھے..... اس نے ترکمانوں کو جس گھاٹی میں چھوڑا تھا وہ اس جگہ سے نصف میل کے فاصلے پر مغرب میں رہ گئی تھی۔ تاریکی میں ذرا سی لغزش اسے موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی' پھر بھی وہ بار بار یوگر کو تیز چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "چترا ہر قدم پر مزاحمت کر رہی ہو گی' اس لئے وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔"

لیکن صبح کا اجالا پھیلنے تک وہ تارمن کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ اس وقت ایک خطرناک ٹکر پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور ایک ایک قدم دشوار گزار تھا۔ اچانک

بائیں جانب سے گولیاں چلنے کی آواز فضا میں گونج اٹھی۔ برق چونک کر مڑا۔ وہ اس وقت اتنی بلندی پر تھے کہ فاصلے کے باوجود پوری وادی کا منظر ان کے سامنے تھا۔ دور اولگن کی آبادی نظر آرہی تھی۔ برق نے اس گھاٹی کی سمت دیکھا جہاں ترکمان چھپے ہوئے تھے۔ چٹانوں کی آڑ میں اسے دھبے حرکت کرتے نظر آئے۔ رہ رہ کر دھواں اٹھتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ترکمان آڑ سے فائرنگ کررہے تھے۔ اس نے پھرتی کے ساتھ دوربین آنکھوں سے لگائی۔ اس کو اندازہ ہوگیا کہ خانہ بدوشوں نے آخر کار ترکمانوں کے ٹھکانے کا پتا لگالیا تھا اور گھاٹی ان کے محاصرے میں تھی۔ ادھر اولگن کے بڑے پھاٹک سے لوگ نکل کر باہر آرہے تھے۔ وہ شاید یہ پتا لگانے آرہے تھے کہ فائرنگ کہاں ہورہی تھی۔ اچانک فائر کی آواز ہوئی اور یوگر چیخ کر لیٹ گیا۔ گولی سے اس کے سر کی ٹوپی اڑ گئی تھی اور وہ بال بال بچا تھا۔ برق پھرتی کے ساتھ ایک چٹان کی آڑ میں ہوگیا۔ اس کی تیز نگاہیں حملہ آور کو تلاش کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد ایک بلند چٹان کے پیچھے سے ایک سر نمودار ہوا اور پھر رائفل کی نال نکلتی دکھائی دی۔ فائر ہوا اور گولی برق کے پاس والی چٹان سے ٹکرائی لیکن برق نے نارمن کو پہچان لیا تھا۔

نارمن واقعی ہر سمت سے مصیبت میں گھر گیا تھا۔ اور یہ دیکھ کر کہ برق بھی تعاقب کرتا ہوا سر پر آپہنچا اس نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے بلندی سے چیخ کر برق کو گالیاں دینا شروع کردیں۔ پھر دھمکیوں پر اتر آیا۔ یوگر اتنا دہشت زدہ ہوگیا تھا کہ چٹان کی آڑ میں دبک گیا۔ برق چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا دشمن کی سمت بڑھنے لگا۔ نارمن کو نہیں معلوم... تھا کہ اس کے پاس رائفل نہیں ہے۔ وہ اس خاموشی کو بھی کوئی چال سمجھ رہا تھا۔ سورج ابھی بلند نہیں ہوا تھا اس لئے چٹانوں اور جھاڑیوں کے سائے میں برق کی نقل و حرکت نارمن کو نظر نہ آسکی۔ لیکن جلد ہی یہ صورت حال بدل گئی۔ نارمن بہت چالاک تھا۔ اب اس نے برق کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے مسلسل فائرنگ شروع کردی۔ جب بھی برق ایک چٹان سے دوسری چٹان پر چھلانگ لگاتا گولی اس کا تعاقب کرتی' لیکن وہ برابر بڑھتا ہی رہا۔ گولیوں کی بوچھاڑ کے باوجود وہ ہر لمحہ نارمن سے قریب تر ہوتا جارہا تھا اور اس بات نے نارمن کو آخر کار بدحواس کردیا۔ برق کو چترا نظر نہیں آرہی تھی لیکن اچانک اسے گنجا پجاری نظر آگیا۔ جس وقت نارمن رائفل لوڈ کررہا تھا' پجاری نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود وہ جست لگا کر وہاں سے اچھلا اور خرگوش کی طرح چھلانگیں لگاتا بھاگنے لگا۔ نارمن نے طیش میں آکر کمر سے لگے ہوئے پستول کو نکال کر فائر کیا۔ گولی پجاری کے شانے پر لگی اور وہ چیخ مار کر لڑکھڑاتا ہوا دور جا کر گرا۔

سورج اچانک نکلا۔ اس کی تیز روشنی براہ راست نارمن کی آنکھوں پر پڑی۔ آنکھیں چکا چوند ہوئیں تو اس نے غصے میں ہاتھ کا سایہ کیا۔ لیکن اتنی دیر میں برق چھلانگیں مارتا کافی دور نکل آیا تھا۔ نارمن نے غصے میں چیخ کر اندھادھند فائرنگ شروع کردی لیکن برق اسی لمحے کا منتظر تھا۔ وہ مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ چٹانوں کی آڑ لیتا وہ ہر جست میں نارمن سے قریب تر ہوتا جارہا تھا۔ گولیاں اس کے پاس آکر چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ پتھر کے ٹکڑے اڑ کر اسے لگ رہے تھے لیکن وہ یہ موقع ضائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس کا ہر قدم بلندی کو طے کرکے دشمن کی سمت بڑھ رہا تھا۔ نارمن اتنا بدحواس ہوگیا تھا کہ نشانہ لئے بغیر مسلسل فائر کرتا رہا' یہاں تک کہ گولیاں ختم ہوگئیں۔ رائفل کا گھوڑا چٹ چٹ کرکے رہ گیا۔ برق اس دوران میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ رائفل دوبارہ لوڈ کرنے کا موقع باقی نہ رہا تھا۔ وہ غصے اور جنون میں دہاڑ کر چیخا "درندے! تو اب بھی مجھے نہ پکڑ سکے گا۔"

اس نے برق کی گرفت سے بچنے کے لئے اچانک دوسری جانب چھلانگ لگائی۔ لیکن گھبراہٹ میں پیر ایک پتھر سے ٹکرایا۔ ایک دلخراش چیخ بلند ہوئی اور وہ اس پتلی سی دراڑ کے اندر غائب ہوگیا جس کو پھلانگ کر وہ دوسری طرف جانا چاہتا تھا۔ گہرائی اتنی تھی کہ دیکھ کر خوف آتا تھا۔ برق نے جھانک کر دیکھا لیکن کچھ نظر نہ آسکا۔ اس کا دوسرا دشمن بھی انتقام لینے سے پہلے جہنم رسید ہوچکا تھا۔ مایوس ہوکر وہ پلٹا اور تب اس کی نظر چترا پر پڑی۔ جس چٹان کے پیچھے سے نارمن فائر کررہا تھا اسی کی آڑ میں وہ بندھی ہوئی پڑی تھی۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا' پاؤں ننگے تھے' چہرے پر جگہ جگہ خراشیں پڑی ہوئی تھیں لیکن اس کی آنکھوں سے خوف کے بجائے مسرت جھلک رہی تھی۔ برق نے جلدی سے اسے آزاد کیا۔

"یہ لوگ تو کہہ رہے تھے کہ تم مرچکے ہو۔" اس نے مسرت بھرے لہجے میں کہا "لیکن میرا دل کہتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"انہوں نے تو اپنی دانست میں مجھے مار ڈالا تھا۔" برق نے کہا۔

"تمہیں کوئی نہیں مار سکتا برق۔ تم میری محبت کی طرح امر ہو۔"

"کیا؟" برق نے چونک کر پوچھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ہاں برق' لیکن اب یہاں سے نکل چلو۔ یہ خانہ بدوش اور ترکمان جب تک ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں ہم بہ آسانی دور پہنچ سکتے ہیں۔"

"نہیں چترا' ان ترکمانوں کو میں یہاں لے کر آیا تھا۔ انہیں مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔"

"میں جانتی تھی تم یہی کہو گے۔" چترا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

نارمن کی رائفل قریب ہی پڑی تھی۔ برق نے اسے اور کارتوسوں کا تھیلا اٹھایا اور چترا کا ہاتھ پکڑ کر اس جگہ واپس پہنچ گیا جہاں یوگر خوف سے چھپا ہوا تھا۔

"کیا گھاٹی تک پہنچنے کا کوئی محفوظ راستہ ہے؟" برق نے اس

سے پوچھا "اپنی سلامتی چاہتے ہو تو سچ بولنا۔"

"ہاں' ایک خفیہ راستہ ہے۔" یوگر نے کہا "لیکن بہت خطرناک ہے۔ میں بندھے ہوئے ہاتھوں سے اس پر نہیں چل سکتا۔"

برق نے اس کے ہاتھ کھول دیئے لیکن اس کی کمر سے رسّی باندھ دی اور اس کا ایک سرا ہاتھ میں پکڑ لیا "اب چلو" اس نے حکم دیا۔

یوگر ان کو لے کر اسی راستے پر واپس چلنے لگا جس سے وہ آئے تھے۔ لیکن نصف کے قریب فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ انہیں لے کر ایک تنگ راستے میں داخل ہو گیا۔ یہ قدرتی نالے کی طرح کا تنگ درّہ نما راستہ پتھروں کے درمیان چلا گیا تھا۔ دونوں سمت خوف ناک گہرائی تھی۔ اس راستے پر احتیاط سے چلتے ہوئے آخر کار وہ ایک غار کے دہانے تک جا پہنچے۔ غار ڈھلوان تھا۔ وہ اس میں داخل ہو کر تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک جگہ بڑا سا شگاف نظر آیا۔ اس میں سے گزر کر وہ ایک دوسری پہاڑی کے کنارے نکل آئے۔ یہاں چٹانوں اور گھنے درختوں کی وجہ سے وہ دشمن کی نظر میں نہیں آسکتے تھے لیکن فائرنگ کی آواز قریب سے سن رہے تھے۔ جلد ہی وہ اس آڑ سے باہر نکلے تو ترکمانوں کی گھاٹی میں تھے۔ اس نے چٹانوں کی آڑ سے گولیاں برساتے ترکمانوں کو دیکھ کر آواز دی۔ بیک وقت کئی رائفلوں کا رخ اس کی سمت ہو گیا لیکن فوراً ہی انہوں نے اسے پہچان لیا اور حیرت زدہ نظروں سے ان دونوں کو گھورنے لگے۔ چترا کے خوب صورت لباس اور حسن نے ان کو مبہوت کر دیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر دشمن سے نبرد آزما ہو گئے۔ ایک ترکمان بھاگتا ہوا ان کی سمت آیا۔

"تاریکی میں وہ بالکل ہمارے سروں پر آ پہنچے تھے۔" طور خان نے کہا "انہوں نے گھاٹی کے دہانے کو ہر سمت سے گھیر لیا ہے لیکن ہمارے سنتریوں نے انہیں بروقت دیکھ لیا۔ اگلی چوٹی پر ہمارے سنتری کو انہوں نے بے خبری میں ہلاک کر دیا تھا ورنہ اتنے قریب نہیں آسکتے تھے۔ اب ہم کیا کریں برق؟"

برق نے ایک ترکمان سے کمبل لے کر چترا کے شانوں پر ڈال دیا "یوگر کی نگرانی کرنا۔" اس نے کہا "اگر یہ فرار کی کوشش کرے تو بے تامل ہلاک کر دینا۔"

"تم فکر نہ کرو برق۔ اس کو ہلاک کرنے کا تو میں صرف بہانہ چاہتی ہوں۔" چترا نے نفرت اور حقارت سے یوگر کو دیکھا۔

برق نے تین ترکمانوں کو ساتھ لیا اور گھاٹی کے دہانے کی سمت بڑھ گیا۔ خانہ بدوش آہستہ آہستہ ڈھلوانوں سے نیچے آنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ قریب سے ترکمانوں کو نشانہ بنا سکیں۔ ان کا بہت جانی نقصان ہو رہا تھا لیکن وہ ہر قیمت پر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ادھر اوگلن کے پھاٹک سے نکل کر لوگ درختوں کی آڑ میں آگے بڑھ رہے تھے۔

"اس سے پہلے کہ اوگلن کے پجاری بھی خانہ بدوشوں کے ساتھ شامل ہوں' ہمیں اس جال سے نکل جانا چاہئے۔" برق نے کہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اوگلن کے لوگ شور مچاتے آہستہ آہستہ پہاڑی کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے چند سواروں کو اشارہ کیا اور یوگر اور چترا کو دو خالی گھوڑوں پر سوار کرا کے حکم دیا کہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ غار کے ذریعے انہیں واپس لے جائے۔ ترکمانوں کو اس نے ہدایت کی کہ وہ چترا کے ہر حکم کی تعمیل کریں۔ اگر کسی نے خلاف ورزی کی تو وہ ان کی سلامتی کا ذمے دار نہ ہو گا۔ باقی لوگوں کو اس نے فائرنگ روک کر آڑ میں چلے جانے کا حکم دیا۔

ان سب کو روانہ کرنے کے بعد وہ صرف تین ترکمانوں کے ہمراہ گھاٹی میں ٹھہر گیا۔ وہ گھاٹی کے دہانے پر رک کر خانہ بدوشوں کی پیش قدمی کو روکنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ فوراً ہی انہوں نے دشمن پر فائرنگ شروع کر دی لیکن خانہ بدوشوں نے محسوس کر لیا تھا کہ دشمن پسپا ہو رہے تھے اس لئے وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر تیزی سے آگے بڑھے۔ برق نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور گولیوں کی باڑھ پہ باڑھ نے بہت سے دشمنوں کو ڈھیر کر دیا۔ دشمن اس اچانک حملے سے گھبرا کر بدحواسی کے عالم میں بھاگنے لگا' لیکن اب ہر طرف سے ان پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ جب خانہ بدوش نظروں سے اوجھل ہو گئے تو برق نے فائرنگ روکنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر سب کو جمع کر کے سرنگ والے خفیہ راستے کی سمت بھاگنے لگا۔ خانہ بدوشوں نے اچانک فائرنگ رُکنے کو چال سمجھا اور آڑ میں چھپے رہے۔ اس دوران میں برق اور اس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے خفیہ راستے سے دور نکل گئے۔ اس کے باقی ساتھی گھاٹی کے دوسری جانب پہنچ کر انتظار کر رہے تھے۔ برق نے انہیں آگے جانے کا حکم دیا۔ باقی لوگ غار کے دوسری جانب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اس گہری گھاٹی کے اوپر پہاڑی کی نکر کے پاس پہنچ چکے تھے۔ برق نے انہیں تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھنے کی ہدایت کی۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ وہ بیک وقت دو جگہ کس طرح موجود رہے۔ ترکمانوں کے آگے یوگر کو .... دھکیلتے رہنا بھی ضروری تھا اور تعاقب میں آنے والے دشمن کو روکنا بھی۔ چترا نے خنجر یوگر کی گردن پر رکھا ہوا تھا اور اسے آگے آگے لئے چل رہی تھی۔ پہاڑی کی خطرناک ڈھلوان کی نکر کے اوپر تنگ راستہ بہت خطرناک تھا۔ تقریباً نصف میل تک یہ قدرتی پگڈنڈی جیسا راستہ جاتا تھا۔ دونوں جانب چکنی سپاٹ ڈھلوان تھی جو تقریباً ایک ہزار فٹ کی تاریک گہرائی تک چلی گئی تھی۔ برق پہاڑی کی نکر کے کنارے کھڑا اپنے ساتھیوں کو اس خوف ناک راستے سے گزرتے دیکھتا رہا۔

ذرا دیر بعد اسے خانہ بدوشوں کا پہلا سوار بڑی تیز رفتاری سے نکر کی سمت جاتا نظر آیا۔ برق نے ایک بڑی چٹان کی آڑ میں اپنے گھوڑے کو کھڑا کیا اور نشانہ لے کر فائر کیا لیکن فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ گولی سوار کے بجائے گھوڑے کو لگی' زخمی گھوڑا بھڑک کر

دونوں پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ غار کے دہانے کے پاس گز بہت تنگ تھی۔ تکلیف سے ہنہناتا ہوا گھوڑا توازن قائم نہ رکھ سکا اور سوار سمیت موت کی گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔ اس حادثے نے پیچھے آنے والے تین اور سواروں کو بدحواس کردیا۔ انہوں نے اچانک اپنے گھوڑوں کی باگ کھینچی۔ ان کے پیچھے والے سوار ان سے آکر ٹکرائے۔ اس افراتفری میں کئی ایک سوار اور کام آگئے۔ باقی غار کے اندر واپس جاگھسے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے پھر باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن ایک ہی برسٹ نے ان کو پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔

برق نے گھوم کر دیکھا۔ اس کے ساتھی پہاڑی کے دوسرے سرے پر پہنچ چکے تھے۔ آخری چند سوار گھوڑوں سے اتر کر پیدل اس پگڈنڈی کو پار کررہے تھے۔ جیسے ہی وہ اس پل صراط کے پار پہنچے برق نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ راستہ پگڈنڈی کی طرح تنگ تھا۔ دونوں جانب گہری کھائی تھی۔ گھوڑے کا ایک بھی قدم غلط پڑتا تو وہ برق سمیت موت کے منہ میں جاگرتا۔ لیکن ان پہاڑی راستوں پر چلنے کا وہ عادی تھا۔ بے خوابی کے باعث برق کا سر چکرا رہا تھا۔ پھر بھی وہ رُکا نہیں۔ اس خطرناک راستے کو پار کرکے جب وہ اس چٹان کے پاس رُکا جہاں چترا کھڑی ہوئی تھی تو اس نے گھوم کر دیکھا۔ دشمن نے اب تک تعاقب نہیں کیا تھا۔ چترا کا چہرہ سفید ہورہا تھا۔ اس نے برق کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک اٹھا۔

"جتنی تیز ممکن ہو یہاں سے نکل چلو۔" چترا نے خوابیدہ لہجے میں کہا۔ نیند اور تکان سے اس کی آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں۔

وہ لوگ وہاں سے فوراً روانہ ہوگئے۔ ان کے پاس اب گھوڑے کم رہ گئے تھے۔ بلندی کی وجہ سے بہت سے ترکمانوں کو چکر آرہے تھے۔ خود برق کے لئے آنکھیں کھلی رکھنا دشوار ہورہا تھا۔ وہ سب یوگر کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھ رہے تھے۔ راستہ اتنا تنگ اور خطرناک تھا کہ تیز رفتاری سے چلنا ممکن نہ تھا۔ گہری گھاٹیوں اور تنگ دروں سے گزرتے ہوئے وہ مسلسل بڑھتے رہے۔ رہ رہ کر ان کو عقب سے خانہ بدوشوں کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ دشمن تعاقب میں مسلسل چلا آرہا تھا۔ کوہ ارلک کی برف پوش چوٹی نمایاں ہوتی جارہی تھی۔ یوگر نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ انہیں اس محفوظ راستے سے لے جارہا ہے جو پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ سفید ہورہا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ وہ راستہ اختیار کرے جس سے اس کی جان بچ جائے۔ وہ اس طرح چل رہے تھے جیسے پیروں میں جان نہ رہ گئی ہو۔ تکان سے سب بری طرح نڈھال ہورہے تھے۔ گھوڑے بھی آہستہ قدم ہوچکے تھے۔ سرد ہوا کے تیز جھونکے تیر کی طرح چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ تاریکی بڑھتی جارہی تھی۔ آخر کار وہ کوہ ارلک کے ڈھلوان پر واقع پہاڑی سلسلے میں داخل ہوگئے۔

کوہ ارلک ایک فلک بوس عفریت کی طرح ان کے سامنے تھا۔ اس کی برف پوش چوٹی دھند میں چھپی ہوئی تھی۔ دامن میں پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ چوٹیاں بلند و بالا کلس کی طرح کھڑی تھیں۔ سپاٹ ڈھلوانیں، تنگ گزر اور خطرناک گہرائیوں کے کنارے سے ہوکر وہ بڑھتے رہے۔ اور آخر کار ایک گھاٹی کے اوپر سے گزر کر بلند و بالا چوٹی کے قریب واقع پلیٹ فارم نما چوڑی چٹان کے اوپر پہنچے۔ پہاڑی کا یہ چوکور حصہ بہت کشادہ تھا اور سامنے پہاڑی کے اندر کانسی کا بہت بڑا اور مضبوط پھاٹک تھا جس پر نامعلوم زبان میں کچھ کندہ تھا۔ برق ان الفاظ کو نہیں پڑھ سکا۔ پھاٹک پہاڑ کی چٹانوں کو کاٹ کر لگایا گیا تھا اور اتنا مضبوط تھا کہ توپ کا گولہ بھی اسے نہیں ہلا سکتا تھا۔

"یہ ارلک کا مقدس دروازہ ہے۔" یوگر نے کہا "اس کو دھکا دو۔ نہیں ڈرو نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اس میں کوئی چال نہیں ہے۔"

"اگر چال ہوئی تو تم بھی زندہ نہ بچو گے۔" برق نے کہا اور پوری قوت سے دھکا دیا۔ دروازے کے ساتھ ہی وہ بھی اندر گرتا چلا گیا۔

وزنی پھاٹک کا پٹ اس طرح کھلتا چلا گیا جیسے اس کا کوئی وزن ہی نہ ہو۔ اس کے پرانے قبضوں میں حال ہی میں تیل لگایا گیا تھا۔ دیوار میں لگی ہوئی مشعل جلاتے ہی انہیں پہاڑ کاٹ کر بنائی ہوئی ایک کشادہ سرنگ کا دہانہ نظر آیا۔ کچھ دور جاکر بوتل کی گردن کی

طرح یہ دہانہ اتنا پھیل گیا تھا کہ اس کی بلندی اور چوڑائی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

"یہ سرنگ پہاڑ کے دوسرے سرے پر جا کر نکلتی ہے۔" یوگر نے بتایا "صبح تک ہم ان لوگوں سے بہت دور پہنچ چکے ہوں گے جو ہمارا تعاقب کر رہے ہیں کیونکہ اگر انہوں نے پہاڑ پر چڑھ کر دوسری سمت پہنچنے کی کوشش کی بھی تو پوری رات اور دوسرا دن ختم ہونے سے پہلے وہ اس پہاڑ کو پار نہیں کر سکتے۔ اگر وہ پہاڑ کے گرد سے سفر کرتے ہیں اور دروں اور گھاٹیوں کو پار کر کے دوسری جانب پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ وقت لگے گا۔ اور ظاہر ہے کہ ہماری طرح وہ اور ان کے گھوڑے بھی اتنے تھک چکے ہیں کہ تیز رفتاری سے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔"

"اس خفیہ راستے کا علم تم کو پہلے سے تھا تو ان فرنگیوں کو کیوں نہیں بتایا؟" برق نے پوچھا۔

"میں ان کو اسی راستے سے لے جاتا' پہاڑوں کے اوپر سے نہیں۔" یوگر نے جواب دیا "اس سرنگ میں کھانے پینے کا سامان بھی ہے اور آرام کرنے کے لئے کمرے بھی۔ سردیوں کے موسم میں خانقاہ کے پجاری یہاں کام کرتے ہیں۔"

برق کے لئے یوگر کی بات پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ خانہ بدوشوں کے پہنچنے سے پہلے وہ اپنے ساتھی ترکمانوں کو سرنگ کے اندر لا کر اس کے مضبوط پھاٹک کو بند کر دینا چاہتا تھا' اس لئے اس نے وہاں رکھے ہوئے چربی سے جلنے والے لیپ روشن کرنے کا حکم دیا۔ جب سارے ترکمان اندر آ گئے تو پھاٹک کو اندر سے بند کر دیا گیا۔ وزنی اور مضبوط کانسی کی سلاخیں آدمی کی ٹانگوں کی طرح موٹی تھیں اور ایک سلاخ چھ سات آدمیوں سے کم کے لئے اٹھانا ممکن نہ تھا۔ برق کو اطمینان تھا کہ اس پھاٹک کو توڑنا دشمن کے لئے ممکن نہ تھا۔ سرنگ میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے یوگر کے گھوڑے کو ہر سمت سے نرغے میں لے رکھا تھا اور خود اس کے برابر چل رہا تھا۔ لیپ کی روشنی میں وہ آگے بڑھتے رہے۔ بے پناہ قوت اور حوصلے کے باوجود برق تھکان سے نڈھال ہو رہا تھا۔

لیکن سرنگ میں رکھے ہوئے سامان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ پہاڑ کو کاٹ کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک اتنی کشادہ سرنگ بنائی جا سکتی ہے۔ سرنگ اتنی چوڑی تھی کہ تیس سوار ایک ساتھ اس میں چل سکتے تھے۔ چھت اتنی بلند تھی کہ روشنی میں بھی مشکل سے نظر آتی تھی۔ فرش اور دیواریں بالکل ہموار تھیں۔ جگہ جگہ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کئی جگہ اسے کدالوں سے کھدائی کے نشان نظر آئے۔ اور پھر اسے جگہ جگہ دھندلی زردی جھلکتی دکھائی دی۔ کچھ دیر بعد اچانک اس پر حقیقت کا انکشاف ہوا۔ کوہ ارلک کی داستانیں حقیقت تھیں۔ سرنگ کی دیواروں میں جھلکتی زردی سونے کی تھی۔ اس زیر زمین سرنگ میں سونے کی وافر مقدار موجود تھی۔ یہ حقیقت ترکمانوں سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔

اس کے برابر چلتے ہوئے سوار طور خان نے سرگوشی کی "یہ پجاری اسی جگہ سے سونا حاصل کرتے ہیں۔ یہ سرنگ سونے کی بہت بڑی کان ہے۔" اس کی آنکھیں روشنی میں چمک رہی تھیں۔ "آپ مجھے اجازت دیں تو اس گنجے سے اقبال کرا لوں کہ سونے کا ذخیرہ کہاں پوشیدہ ہے۔"

لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یوگر نے بلا تامل ایک وسیع اور کشادہ کمرے میں رکھے ہوئے بڑے بڑے ڈھیلوں کی سمت اشارہ کیا۔ یہ خام سونے کے ڈلے تھے۔ ایک دوسرے کمرے میں ان کو صاف کرنے کے لئے اور خالص سونا نکالنے کی بھٹی اور سامان تھا۔ اس نے بے پروائی سے کہا "تم کو جتنا سونا چاہئے لے جاؤ۔ یہاں اتنا ذخیرہ ہے کہ ہزار گھوڑے بھی اس کو لادنے کے لئے ناکافی ہوں گے۔ اور ابھی ہم نے کان کو پوری طرح ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔"

ترکمانوں کی نگاہوں میں حرص و ہوس کی چمک برق کے لئے پریشانی کا باعث ہونے لگی تھی۔ "جتنے گھوڑے فاضل ہیں ان پر لاد لو۔" برق نے کہا "یہی بہت کافی ہو گا۔"

اجازت ملتے ہی وہ سب بھوکے گدھ کی طرح ٹوٹ پڑے۔ ان کا بس چلتا تو سارا سونا لاد لیتے۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے تھیلوں کو بھر رہے تھے۔ برق نے ان سے خزانے تک لانے کا وعدہ کیا تھا اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب تک جو کچھ پیش آیا وہ برق کے منصوبے کا حصہ تھا۔ خوشی سے بے تاب ہو کر وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے' اب دوبارہ آئیں گے تو اپنے ساتھ اتنے گھوڑے لے کر آئیں گے کہ یہ سب اٹھا لے چلیں۔

"بس ختم کرو۔" برق غصے میں دہاڑا "تم نے اتنا سونا جمع کر لیا ہے جو تمہاری سات پشتوں کے لئے کافی ہو گا۔"

لیکن ترکمانوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی تھیلے بھر بھر کے لادتے رہے۔ برق نے تلوار کھینچی اور گرجتا ہوا ان کی سمت لپکا "کم بختو! اگر خانہ بدوشوں نے تم سے پہلے پہاڑ پار کر لیا تو کیا یہ سونا قبر میں لے جاؤ گے؟"

بڑی مشکل سے وہ روانہ ہوئے۔ سرنگ میں اناج کا وافر ذخیرہ تھا۔ برق کی ہدایت پر انہوں نے راستے کے لئے ضرورت کے مطابق اسے بھی لادا۔ نیند سے برق کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ چترا بھی گھوڑے کی پشت پر اونگھ رہی تھی لیکن وہ مسلسل بڑھتے رہے۔ اور آخر کار سرنگ کے دوسرے پھاٹک تک پہنچ گئے جو مقفل نہیں تھا۔ یوگر نے بتایا کہ خاص پجاریوں کے علاوہ اس سرنگ کا راز اور کسی کو نہیں معلوم تھا۔ انہوں نے بھاری دروازے کے پٹ کھولے۔ صبح کے اجالے سے ان کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ سامنے ایک چوڑی سی مخروطی چٹان چبوترے کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے آگے ایک تنگ سا راستہ پہاڑ کے کنارے کنارے چلا گیا تھا۔ پیچ و خم کھاتے ہوئے اس راستے کے ایک سمت بلند پہاڑ کی دیوار تھی اور دوسری جانب ہزاروں فٹ گہری

ڈھلوان، جس کے نیچے بہنے والی ندی کا پانی چاندی کی لکیر کی طرح چمک رہا تھا۔ بائیں جانب کا منظر چوٹیوں نے چھپا رکھا تھا لیکن دائیں سمت کوہ ارلک سے ملے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ حد نظر تک پھیلا ہوا تھا۔

"جان بچانے کا یہی ایک واحد راستہ ہے بیگ۔" یوگر نے درّے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہاں سے تین میل کے فاصلے پر یہ راستہ تم کو اس وادی میں پہنچا دے گا اور وہاں پانی اور شکار دونوں موجود ہے۔ تمہارے گھوڑوں کو چارہ بھی مل جائے گا۔ جنوب میں واقع درّے سے گزر کر تم تین دن کے سفر کے بعد اپنے جانے پہچانے علاقے میں پہنچ جاؤ گے۔ اس سے پہلے کہ خانہ بدوش پہاڑ کو پار کر کے یہاں پہنچیں، تمہارا نکل جانا بہتر ہوگا۔ اب مجھے واپس جانے دو۔"

"ابھی نہیں۔" برق نے کہا "میں تم کو درّے کے پاس پہنچ کر آزاد کروں گا۔ وہاں سے تم بہ آسانی واپس آسکتے ہو۔"

یوگر نے غصے میں اسے گھورا۔ برق کی آنکھیں مسلسل جاگنے سے خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ یوگر سہم کر خاموش ہو گیا۔ ترکمان اپنے سونے کا ذخیرہ لے کر نکل جانے کے لئے اتنے بے تاب ہو رہے تھے کہ چھ سات سوار دروازے سے نکل کر روانہ ہو گئے۔ برق نے ان کو جاتے دیکھا تو طور خان کو حکم دیا کہ یوگر کو ساتھ لے کر آئے اور اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا تاکہ حسب معمول وہ سب سے آگے پہنچ کر رہنمائی کرے۔ ایک ترکمان سب سے آگے نکل گیا تھا اور اب وہ نہ واپس آسکتا تھا نہ برق کو آگے نکلنے کا راستہ دے سکتا تھا۔ برق نے اسے آواز دے کر آگے چلنے کی ہدایت کی اور اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا۔ برق کا گھوڑا ابھی اس تنگ راستے پر پہنچا ہی تھا کہ اوپر سے چھوٹے بڑے پتھروں کا ریلا زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ آکر راستے پر گرا۔ آگے جانے والا بدقسمت ترکمان اس کی براہِ راست زد میں آیا اور وہ اس کو گھوڑے سمیت اس طرح بہا کر لے گیا جیسے جھاڑو جالے کو صاف کر کے لے جاتی ہے۔ ایک بڑا سا پتھر برق کے گھوڑے کی ٹانگ پر پڑا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ درد سے چیخ کر گرا اور گہری کھائی میں لڑھکتا چلا گیا۔ برق نے پھرتی کے ساتھ جست نہ لگائی ہوتی تو وہ بھی موت کے منہ میں چلا جاتا۔ وہ بھاگتا ہوا محفوظ جگہ پر پہنچ گیا۔ چرا کی دہشت ناک چیخ اور ترکمانوں کی چیخ پکار سے فضا گونج اٹھی۔ بلندی پر کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن پھر بھی کئی ترکمانوں نے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ جواب میں چوٹی کے اوپر سے فلک شگاف قہقہے سنائی دئے باوجود یکہ برق اس ہولناک حادثے سے دہل گیا تھا پھر بھی اس نے فوراً ہی حواس پر قابو پا کر اپنے ساتھیوں کو سرنگ کے اندر دھکیل دیا۔ وہ بری طرح جال میں پھنس گئے تھے۔ ان میں سے کئی تلوار سونت کر یوگر کی سمت لپکے۔

"اس کی گردن اڑا دو۔ اس غدار نے ہمیں دھوکے سے جال میں پھنسایا ہے۔" کئی یک زبان بولے۔

یوگر کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ترکمان اسے ہلاک کرتے برق چلایا "ٹھہرو۔ خبردار اسے نہیں مارنا۔"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے غداری نہیں کی۔ خانہ بدوش اتنی جلد پہاڑ نہیں پار کر سکتے۔" یوگر نے چیخ کر کہا۔

"کیا سرنگ میں پجاری موجود تھے؟" برق نے پوچھا "ممکن ہے ہماری آمد کے وقت وہ اس پھاٹک سے فرار ہو کر اوپر پہنچ گئے ہوں۔"

"نہیں۔ میں ارلک کی قسم کھاتا ہوں کہ سرنگ میں کوئی نہ تھا۔ ہم سال میں صرف تین ماہ سونا نکالتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم اوپر کون ہے۔"

برق دوبارہ باہر نکل کر چند قدم آگے بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے پھر پتھروں کا ریلا آکر راستے پر گرا اور وہ بال بال بچ کر پیچھے ہٹا۔ ایک زوردار قہقہہ بلندی سے گونجا۔

"مکار کتے! بھاگتا کیوں ہے؟ اب دیکھوں گا کہ تو بچ کر کیسے جاتا ہے۔ تو سمجھتا تھا کہ میں اس دراڑ میں گر کر مر گیا؟ لیکن میں ابھی زندہ ہوں۔ میں ایک درخت میں پھنس کر بچ گیا تھا اور تو مجھے مردہ سمجھ کر واپس چلا گیا۔ تیرے جانے کے بعد میں بہ آسانی اوپر چڑھ کر محفوظ جگہ پہنچ گیا تھا۔"

"تارسن!" برق نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"تو سمجھتا تھا کہ میں نے اس پجاری کو یونہی چھوڑ دیا تھا؟ اس نے مجھے سرنگ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ جب میں نے تم لوگوں کو یوگر کے ساتھ ادھر کا رخ کرتے دیکھا تو تم سے پہلے یہاں پہنچ گیا۔ میرا بس چلتا تو پھاٹک کو اندر سے بند کر دیتا اور خانہ بدوش تم کو کتوں کی طرح ہلاک کر دیتے۔ لیکن سلاخیں اتنی بھاری تھیں کہ میں انہیں تنہا نہیں اٹھا سکا اس لئے میں یہاں پہنچ گیا۔ اب تم میں سے ایک بھی زندہ باہر نہ نکل سکے گا۔ میں یہاں سے تم کو دیکھ رہا ہوں اور تم اتنی بلندی پر میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ کچھ دیر میں خانہ بدوش یہاں پہنچ جائیں گے اور تم اسی سرنگ میں سڑ کے مر جاؤ گے۔ میں اوگین کے لوگوں کو بتا دوں گا کہ بوڑھا یوگر چرا کو اغوا کر کے تمہارے حوالے کر رہا ہے۔ وہ اس کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

یوگر خوف سے کانپ رہا تھا۔ برق بھی پریشان ہو گیا تھا۔ تکان اور بے خوابی سے وہ پہلے ہی نڈھال تھا۔

"کیا اوپر جانے کا کوئی راستہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جس سے آدمی یا گھوڑا اوپر پہنچ سکے۔" یوگر نے دہشت زدہ لہجے میں جواب دیا "لیکن ....."

"لیکن کیا؟"

یوگر لیمپ اٹھا کر سرنگ کی دیوار کے ایک حصے کی سمت بڑھا جو دروازے کے قریب تھا۔ اس نے لیمپ اوپر اٹھایا تو روشنی دیوار پر پڑی۔ پتھر کی دیوار میں دھات کی موٹی کیلوں کے قبضوں کی قطار سی اوپر چلی گئی تھی "پہلے یہاں ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی۔" یوگر نے

بتایا "اس کے ذریعے سرنگ کی چھت تک پہنچا جاسکتا تھا جہاں ایک شگاف ہے۔ وہاں پر بیٹھ کر بنولی جیسے والے درّے پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی تاکہ اگر کوئی حملہ آور ادھر سے داخل ہو تو بروقت دیکھا جاسکے۔ لیکن مدّت سے ان قبضوں کو استعمال نہیں کیا گیا اور یہ زنگ لگ کر کمزور ہوچکے ہیں۔ اس شگاف کے ذریعے باہر نکلی ہوئی ایک چٹان پر پہنچا جاسکتا ہے لیکن میرا خیال ہے وہاں سے اوپر چڑھنا ممکن نہیں کیونکہ پہاڑی بالکل سپاٹ ہے۔"

"ممکن ہے نارمن تک پہنچنے کا کوئی راستہ تلاش کرلوں۔" برق نے کہا۔ حالانکہ اس کا سر چکرا رہا تھا۔

ترکمان خوف کے مارے زور زور سے باتیں کررہے تھے۔ چترا تشویش بھری نگاہوں سے برق کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دیوار کی سمت بڑھا تو چترا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ برق نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا "فکر نہ کرو چترا' میں یہ بازی بھی جیت کر دکھاؤں گا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

سر کو جھٹک کر اس نے نیند بھگائی۔ دیوار کے پاس پہنچا اور پھر قبضے کو پکڑ کر آزمایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک ایک قبضے پر قدم رکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ رائفل اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ پچاس فٹ کے بعد لیمپ کی روشنی بالکل غائب ہوگئی۔ زنگ آلود قبضوں پر پیر جماتے ہوئے ہر مرتبہ خوف لاحق ہوتا تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گیا تو موت یقینی تھی۔ کئی جگہ درمیانی قبضے غائب تھے لیکن ان کے درمیان فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ اس لئے برق کو زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ نیچے جلنے والے لیمپ جگنو کی طرح چمک رہے تھے۔ آخر کار اسے اوپر سے روشنی کی جھلک نظر آنے لگی۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ شگاف سے نکل کر اس چٹان پر پہنچ گیا۔۔ جو قدرتی چھجے کی طرح باہر کی سمت نکلی ہوئی تھی۔ یہ صرف چند گز چوڑی تھی۔ برق نے اس پر بیٹھ کر چند لمحے آرام کیا۔ تیز ہوا کے جھونکوں کے سبب کھڑے رہ کر توازن قائم رکھنا مشکل تھا لیکن برق نے پروا نہیں کی۔ وہ پتھروں کے سہارے چٹان کے کنارے تک پہنچا اور جھانک کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔

وہ پہاڑ کے بلند ترین حصے پر تھا۔ وہاں سے سرنگ کا دہانہ تو نظر نہ آتا تھا لیکن کوئی پندرہ بیس فٹ نیچے چٹانوں کی آڑ میں چھپا ہوا نارمن اسے صاف نظر آرہا تھا۔ فاصلہ اتنا تھا کہ برق اس کو بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا لیکن تیز ہوا اور مسلسل جاگنے سے آنکھوں سے اتنا پانی بہہ رہا تھا کہ نشانہ لینا ممکن نہ تھا۔ وہ رینگتا ہوا کچھ اور نیچے اتر کر ایک چٹان کی آڑ میں پہنچا۔ آنکھیں صاف کرکے اس نے رائفل کندھے سے لگائی۔ دھندلائی نظروں سے نشانہ لیا اور لبلبی دبادی۔ فائر کی تیز آواز پہاڑوں میں گونج اٹھی لیکن گولی نارمن کے سر سے ایک فٹ دور واقع چٹان سے ٹکرائی۔ دھندلائی آنکھوں سے اس نے نارمن کو اچھل کر چٹان کی آڑ میں چھپتے دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ نارمن کے پاس اب آتشیں اسلحہ نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے اترنا شروع کیا۔ وہ نارمن کو فرار ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اچانک اس نے نارمن کو آڑ سے نکلتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی جو شاید اسے سرنگ میں کہیں سے مل گئی تھی۔ جلدی میں برق کا پیر پھسلا اور توازن قائم رکھنے کی کوشش میں رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ کوشش کے باوجود پھسلتا ہوا ڈھلوان سطح سے ہوتا نیچے پہنچ گیا۔ قدم ٹھوس پتھر سے ٹکرائے۔ اتنی زور کا جھٹکا لگا کہ ساری ہڈیاں جھنجھنا اٹھی تھیں لیکن وہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچ گیا تھا۔ وہ پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو نارمن صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ اس کی آنکھوں سے جنون جھلک رہا تھا۔ برق نے پھرتی کے ساتھ تلوار کھینچی۔

"آؤ برق' ہماری تلوار اب قسمت کا فیصلہ کردے گی" اس نے کہا۔

نارمن نے اچانک جست لگا کر بھرپور وار کیا۔ برق نے جھکائی دے کر خود کو بچایا۔ نارمن اپنی جھونک میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ پلٹا تو برق نے وار کیا۔ تلواریں جھناکے کے ساتھ ٹکرائیں۔ دونوں میں زبردست مقابلہ شروع ہوگیا تھا۔ کچھ دیر تک برق مسلسل پیچھے ہٹتا رہا۔ نارمن فاتحانہ انداز میں بڑھ بڑھ کر وار کررہا تھا۔ پہاڑی کے بالکل کنارے پر پہنچ کر اچانک برق نے جھکائی دے کر ایک وار کیا اور بچنے کی کوشش میں نارمن گرتے گرتے بچا۔

"مکّار کتے!" نارمن نے دانت پیس کر جوابی وار کیا لیکن برق پھرتی کے ساتھ ایک سمت ہٹ گیا۔ وار خالی گیا۔

"یہ احمد کی طرف سے ہے۔" برق نے بجلی کی سی سرعت سے وار کیا۔

وار سر پر پڑا۔ خون کا فوارہ نکلا۔ نارمن لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔

"اور یہ میری طرف سے۔" برق نے دوسرا وار کیا۔

وار ہلکا تھا لیکن نارمن کا چہرہ خون سے تر ہوگیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور ڈھلوان پر لڑھکتا چلا گیا۔ ایک دلخراش چیخ فضا میں بلند ہوکر دور ہوتی چلی گئی۔ نارمن نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ برق بے دم ہوکر بیٹھ گیا۔ اب اس میں کھڑے رہنے کی سکت نہ تھی۔ نیچے سے ترکمانوں نے فاتحانہ نعرے بلند کئے تو شور سن کر وہ چونک اٹھا۔

اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کس طرح نیچے اترا۔ اس کی آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ اچانک کسی کے نرم و گداز بانہوں نے اسے سہارا دیا۔ خشک ہونٹوں پر تری محسوس ہوئی۔ اس نے ایسی مٹھاس پہلے کبھی نہیں چکھی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو گھوڑے پر تھا۔ ... وہ درّے سے باہر وادی میں سفر کررہے تھے۔ چترا نے پانی کا چھوٹا مشکیزہ اس کے لبوں سے لگا رکھا تھا۔

بلاوا

شگفتہ شام

صدیوں پرانے ایک شیطانی کھیل کی رُوداد ایک پُراسرار غار میں پوشیدہ اسرار کا انکشاف

سائنس کے اس دَور میں بھی جب کہ ہر روز نت نئی ایجادات ہو رہی ہیں، انسان ابھی علم کی اُس انتہا تک نہیں پہنچ سکا ہے کہ صدیوں قبل کے انسانوں کی تعمیر و ترقی کے تانے بانے کو سمجھ سکے۔ آج بھی جب کہیں قدیم زمانے کے کچھ آثار دریافت ہوتے ہیں تو انہیں سمجھنے کے لیے جدید علم کوئی رہنمائی نہیں کر پاتا اور بالآخر ہمیں قدیم علوم کے ماہرین ہی کی مدد درکار ہوتی ہے۔

"ڈیوڈ!" لزا نے پکارا..... اس کی آواز سے کچھ دیر پہلے کی چہکار اور سنسنی کا تاثر معدوم ہو چکا تھا۔ اب اس کی جگہ کشیدگی نے لے لی تھی۔

"کیا بات ہے؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔ غار میں اسے کئی بار اپنی آواز پلٹ کر اپنی طرف آتی سنائی دی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تاریکی میں لپٹی ہوئی گہرائی نے لزا کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ اس نے لزا کی آواز میں خوف کی جھلک محسوس کی تھی۔

"ٹارچ روشن کرو" نیچے سے لزا نے چیخ کر کہا "میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے غور سے دیکھو۔"

ڈیوڈ نے خطرناک ڈھلان پر خود کو متوازن کیا۔ ڈھلان پر ایسے بے شمار پتھر موجود تھے، جو پوری طرح جمے ہوئے نہیں تھے۔ وہ بڑی جدوجہد کے بعد یہاں تک پہنچا تھا۔ اسے یہ تجسس کھینچ لایا تھا کہ یہ نئی اور اُدھڑی چٹان کہاں سے آ گئی ہے۔ اس نے اپنے قدم مضبوطی سے جمائے اور ٹارچ روشن کی۔ ٹارچ کی روشنی میں لزا کا زرد بیضوی چہرہ نظر آیا۔ وہ گرد و پیش کی تاریکی میں عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف نہیں تھا۔ البتہ اس کی نگاہوں میں الجھن تھی۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی، جیسے تاریک رات میں تاروں بھرے آسمان پر ہوتی ہے "کیا بات ہے لزا؟" اس نے پکارا اور دیر تک اپنی آواز کی بازگشت سنتا رہا۔

چند لمحے خاموشی رہی' ایسا لگا جیسے وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے' اس کے لئے اسے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ڈیوڈ نے ٹارچ روشن رکھی۔ وہ لزا کی ہچکچاہٹ بھانپ گیا تھا مگر اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں لزا کے چہرے کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پہاڑ کا مُردہ اور خالی دل خاموش تھا۔

"ڈیوڈ... میرا مذاق نہ اڑانا" میں سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں۔ مجھے بتاؤ... کیا میں پہلے جیسی ہی لگ رہی ہوں؟"

ڈیوڈ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "بالکل۔ تم وہی لزا ہو۔ پہاڑی پھولوں کی طرح تروتازہ۔ میری لزا۔ مگر یہ بات کیوں پوچھ رہی ہو تم؟"

"اس لئے کہ میں خود کو مختلف لگ رہی ہوں..... بدلی بدلی۔" لزا نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ مگر اس کے لہجے میں عجیب سا اعتماد تھا۔

"تاریکی کی وجہ سے... اور زمین میں اتنی گہرائی میں اترنے کے احساس کی وجہ سے ایسا لگ رہا ہوگا" ڈیوڈ نے خیال ظاہر کیا۔ "تم اس وقت خود کو دنیا سے کٹا ہوا محسوس کر رہی ہو" اسے اپنی اس بات پر خود بھی یقین نہیں تھا مگر اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ اس اندھیرے میں اترنا' جس کا روشنی بھی کچھ نہ بگاڑ سکے ہنسی کھیل نہیں تھا۔ اسے ایسا لگا' جیسے لزا کی عجیب گفتگو درحقیقت اس وحشت کی نقاب ہے' جو وہ اس وقت محسوس کر رہی ہے۔ اب وہ یہ امید ہی کر سکتا تھا کہ وہ زیادہ خوف زدہ نہیں ہوگی.... کم از کم اتنی نہیں کہ باہر آنے کی فرمائش کر بیٹھے۔ کیوں کہ وہ ان غاروں کے بارے میں بے حد متجسس تھا۔ وہ اس بیکراں تاریک خالی پن کے اسرار جاننا چاہتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ اس گہری اور مہیب خاموشی میں نہ جانے کتنے خوف ناک امکان چھپے ہیں۔ لیکن اس کا تجسس اپنی جگہ' اسے لزا کے تحفظ کا بھی خیال تھا۔ اس خیال میں بڑی لذت تھی۔

"نہیں.... یہ بات نہیں" لزا نے نیچے سے پکارا "مجھے ایسا لگ رہا ہے' جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اس خواب میں' میں اس پہاڑی غار سے باہر ہوں۔ اور سو رہی ہوں۔ اور ڈیوڈ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں ... ہاں' کہو نا" ڈیوڈ نے چیخ کر کہا۔ وہ بری طرح الجھ رہا تھا۔

"ڈیوڈ... تمہیں معلوم ہے نا' کوئی خواب میں کیا کچھ محسوس کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے' جیسے تاریکی سے کوئی چیز ابھر رہی ہے۔ کوئی احساس...."

وہ یقینی طور پر خوف زدہ تھی "میں نیچے آرہا ہوں لزا!" ڈیوڈ نے پکارا "بس یہ معاملہ یہیں پر ختم" یہ کہہ کر اس نے نیچے کھسکنے کا ارادہ کیا۔

"رک جاؤ ڈیوڈ۔ میں خود اوپر آرہی ہوں۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں خواب دیکھ رہی تھی۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ جاگنے کے بعد تاریکی سے کیا کچھ ظہور میں آتا ہے۔"

وہ ٹارچ کی روشنی سے اسے مضبوطی سے جمے ہوئے پتھر دکھاتا رہا۔ وہ ان پر پاؤں رکھ کر اوپر آتی رہی۔ آخر کار وہ اوپر پہنچ گئی۔ ڈیوڈ نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔

"چلو۔ اب واپس چلیں"۔ ڈیوڈ نے کہا۔

"ابھی راستہ موجود ہے ڈیوڈ" لزا نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔

"اچھا" ڈیوڈ کا تجسس پھر بھڑک اٹھا "چلو... دیکھتے ہیں۔"

وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے' سنبھال کر قدم رکھتے غار میں اتر گئے۔ نیچے اتر کر ڈیوڈ کو وہ دراڑ نظر آئی "میرا خیال ہے' تم نے ایک نیا غار دریافت کر لیا ہے" اس نے کہا "لیکن یہ دراڑ بہت تنگ ہے۔ اس میں گھسنا ناممکن ہے۔"

"میں گھس سکتی ہوں ڈیوڈ۔ تم یہ ٹارچ مجھے دو۔ میں کوشش کروں گی" لزا بولی۔

"میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے" ڈیوڈ نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"دیکھو... میں تمہیں صاف صاف بتا رہی ہوں' میں خوف زدہ ہرگز نہیں ہوں" لزا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "وہ تو بس ایک خواب تھا۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تاریکی کے اُدھر کیا چیز ہماری منتظر ہے۔"

ڈیوڈ کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ تخیل تو اس کا بھی بے حد زرخیز تھا۔ بعض اوقات وہ انوکھی اور خوفناک باتیں سوچتا تھا۔ لیکن اسے تاریکی کو ٹٹولنے کی... نامعلوم باتیں جاننے کی خواہش کبھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو اپنے تخیل کی مدد سے خود ہی ہیولے تراش لیتا تھا۔ وہ حوصلہ مند اور نڈر تھا... مگر محض جسمانی طور پر۔ جبکہ لزا کا حوصلہ اور دلیری جسمانی نہیں تھی۔ نامعلوم باتیں جاننے کی خواہش کرنے کے لئے حوصلے سے کچھ سوا درکار ہوتا ہے۔

اسے تجسس ہونے لگا کہ دراڑ کے پیچھے کیا ہے۔

وہ ان سوچوں سے ابھرا تو پتا چلا کہ لزا نے اس سے ٹارچ لے لی ہے اور دراڑ میں داخل بھی ہو چکی ہے۔ اب وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر لزا نے اسے پکارا "ڈیوڈ! یہ تو بہت بڑا غار ہے۔ میں اس کا پھیلاؤ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"لزا! تم ٹھیک تو ہو؟" ڈیوڈ نے چیخ کر پوچھا۔

اس بار لزا کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی... کسی سسکی سے مشابہ "ڈیوڈ... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"وہاں ہے کیا؟" لرا کے بارے میں ڈیوڈ کی تشویش بھی اس کے تجسس کو نہ دبا سکی۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس یہ ایک غار ہے۔"

"تو پھر تم خوف زدہ کیوں ہو؟ اس کا مطلب ہے' وہاں کچھ نہ کچھ ضرور ہے' مجھے بتاؤ لرا۔"

"وہی ہے' جو میں نے کہا تھا۔ ڈیوڈ' میں واپس آنا چاہتی ہوں۔ مگر میں یہ بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ تاریک صدیوں میں کیا چھپا ہوا ہے۔ مجھے اچانک ہی ڈر لگا ہے ڈیوڈ۔ اب بتاؤ' میں کیا کروں؟"

لرا کے لہجے میں عجیب سا درد تھا۔ ڈیوڈ کو احساس ہو گیا کہ اس وقت وہ دو متضاد خواہشوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ خوف زدہ بھی تھی اور نامعلوم کو معلوم کرنے کی سعی بھی کرنا چاہتی تھی۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ خوف زدہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ کیا واقعی غار میں کوئی مافوق الفطرت شے موجود تھی؟ یہ روایت عام تھی کہ ان پہاڑوں میں ایسی گپھائیں موجود ہیں' جن میں قدیم.... بہت قدیم مدفن ہیں۔ کہیں لرا نے ایسی ہی کوئی گپھا تو دریافت نہیں کرلی۔

"بتاؤ نا.... غار میں کیا ہے؟" اس نے چلا کر پوچھا۔

دراز کی طرف سے آہٹیں ابھریں۔ لرا بہت تیزی سے واپس آرہی تھی۔ اس کے آتے ہی ڈیوڈ نے ٹارچ اس کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ بہت گم صم لگ رہی تھی' جیسے کسی تنویمی عمل کے زیر اثر ہو۔ کچھ دیر بعد اس کے لب ہلے "بہت بڑا غار ہے ڈیوڈ۔ بہت بڑا ہال ہے۔ ایک طرف اونچا ڈائس بنا ہے۔ ڈائس پر ایک بہت بڑا بالکل سیاہ پتھر ہے۔ ایسے پتھر پرانی قربان گاہوں پر ہوتے تھے۔ ان پر قربان ہونے والوں کی گردن رکھ کر ان کا سر قلم کیا جاتا تھا۔"

وہ خاموش ہو گئی' مگر ڈیوڈ کو معلوم تھا کہ اس کی بات پوری نہیں ہوئی ہے' تاہم وہ خاموش رہا۔ اس نے کچھ پوچھا نہیں۔

لرا نے اچانک ایک ہی سانس میں کہا "قربان گاہ کے پتھر کے اوپر ایک چھجا سا ہے۔ اس پر ایک لمبا' سیاہ ہکل رکھا ہے' قدیم طرز کا۔"

"اچھا' تو تم وہ ہکل لائی کیوں نہیں؟" ڈیوڈ نے بچکانی لہجے میں شکایت کی۔

لرا چند لمحے ہچکچائی' پھر اس نے سرگوشی میں کہا "ڈیوڈ۔ اس ہکل کا تعلق تاریکی سے ہے۔ میں اسے چھونا بھی نہیں چاہتی۔"

"کیسی باتیں کررہی ہو۔ وہ ہکل یقیناً قیمتی ہوگا۔ ذرا سوچو تو.... ہزاروں سال پرانا ہکل۔ جاؤ۔ جاکر ہکل لے آؤ۔"

"نہیں ڈیوڈ۔ نہیں۔"

"لرا' وہ محض ایک ہکل ہی تو ہے۔ وہ بھلا کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم' لیکن کوئی نامعلوم حس مجھے بتا رہی ہے کہ اسے ہاتھ لگانا بھی مناسب نہیں۔"

ازدواجیات

شادی کے ایک ہفتے بعد نئی نویلی دلہن سے اس کی سہیلی نے پوچھا "تمہارا شوہر سونے میں خراٹے تو نہیں لیتا؟"

"معلوم نہیں" دلہن نے شرماتے ہوئے کہا "ابھی ہماری شادی کو ایک ہی ہفتہ تو ہوا ہے۔"

○☆○

ایک صاحب نے اپنی بیوی کو چونکانے کے لئے دفتر سے چپراسی کے ہاتھ ایک خوب صورت پیکٹ تحفے کے طور پر بھجوادیا۔ بیوی کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت وہ گھر میں نہیں تھی جب وہ تحفہ پہنچا۔

ڈیوڈ سوچ میں پڑ گیا۔ لرا واپس جانا چاہتی تھی۔ الجھن یہ تھی کہ وہ لرا سے اس سلسلے میں اصرار کرے یا نہ کرے۔ بات صرف اتنی تھی کہ اندر کی تاریکی اور مہیب سناٹے نے لرا کو ڈرا دیا ہوگا۔ وہ توہمات میں پڑنے والی تو ہرگز نہیں تھی۔

"چلو' ٹھیک ہے" آخر کار اس نے لرا کو تسلی دینا ہی مناسب سمجھا "بھول جاؤ اس ہکل کو۔ ہم نہ سہی' اسے کوئی اور دریافت کرلے گا۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ہونا چاہئے؟" لرا پُرخیال لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ڈیوڈ اس کی تلوّن مزاجی پر حیران ہو گیا۔

"میں صرف خواب کی وجہ سے خوف زدہ ہوں۔ اور اپنے اندر کے اندھیرے سے' جس کے بارے میں' میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس ہکل کو کوئی اور دریافت کرے۔ ڈیوڈ۔ میں جاؤں گی اور وہ ہکل لے کر آؤں گی۔"

"لیکن لرا...."

"میں خوف زدہ ہوں ڈیوڈ۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں۔ خوف تو کسی کے اندر ہوتا ہے نا۔"

چند لمحے بعد وہ دراز میں داخل ہو چکی تھی۔

❋❋❋❋❋❋❋❋

وہ دس منٹ بعد واپس آئی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ آنکھیں یوں پھیلی ہوئی تھیں' جیسے اس نے پُراسرار تاریکی میں چھپے ہوئے تمام اسرار دیکھ لئے ہوں۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک لمبا ہکل تھا۔ دیکھنے میں وہ ان ہاروں جیسا تھا' جو پرانے زمانے میں بگھیوں اور بیل گاڑیوں میں لگے ہوتے تھے۔ وہ خاصا بھدا تھا پھر بھی اس میں عجیب سی شان اور دبدبہ تھا' جو انسانی

ہاتھ کی تراشی ہوئی چیزوں میں عموماً دیکھا جاتا ہے۔

زیوڈ نے ٹارچ روشن کی۔ ہکل کانسی کا بنا ہوا تھا۔ اس پر جابجا داغ پڑے تھے۔ ٹارچ کی روشنی نے اس میں وہ چمک پیدا کی' جو پرانے سبز شیشے میں دھوپ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

"کمال ہے' یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہ کتنا پرانا ہے" زیوڈ بڑبڑایا۔ ہکل کی ناقابلِ قیاس قدامت نے اسے مسحور کر دیا تھا۔

لرا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ زیوڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ لرا کی نظریں ہکل پر جمی تھیں۔ ان نگاہوں میں استعجاب بھی تھا اور شاید دہشت بھی۔ پھر وہ تاثر معدوم ہو گیا۔ اب وہ اس راہبہ کی طرح لگ رہی تھی' جس کے روبرو کوئی بے حد مقدس چیز رکھی ہو ۔۔۔ یا جسے اچانک کوئی مقدس راز معلوم ہو گیا ہو۔

زیوڈ نے بڑی نرمی سے ہکل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ہکل بہت بھاری تھا۔ اسے چھو کر سردی اور نمی کا احساس ہوتا تھا ۔۔۔ اور یہ بھی کہ جیسے وہ کوئی شیطانی چیز ہے۔ زیوڈ کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ہکل کے قریب کی ہوا بھی بے حد سرد اور نم لگ رہی تھی۔

"آؤ چلیں' ٹھنڈ بڑھ گئی ہے" اس نے لرا سے کہا۔

"ہاں" لرا نے منتشی لہجے میں تائید کی "سردی بڑھ گئی ہے ۔۔۔ موت جیسی سردی۔"

"کیا کہہ رہی ہو لرا؟" زیوڈ نے حیرانی سے کہا۔

لرا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے چڑھائی پر قدم رکھ دیا تھا۔ زیوڈ نے ٹارچ روشن کر کے اسے راستہ دکھایا اور خود بھی سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چل دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں غار میں ہر طرف سائے منڈلاتے نظر آ رہے تھے۔ زیوڈ کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے میں ہکل۔ خود کو متوازن رکھنا اس کے لئے دشوار ہو رہا تھا۔ البتہ لرا بے پروائی سے چل رہی تھی۔ اچانک زیوڈ کو احساس ہوا ۔۔۔ بلکہ یقین ہو گیا کہ اوپر کوئی عجیب اور خوف ناک چیز اس کی منتظر ہو گی۔

اوپر پہنچ کر پتا چلا کہ وہاں خاموشی اور سناٹے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

پہاڑ دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ سر پہلے کی طرح چمک دار نیلے آسمان کی چادر تنی ہوئی تھی۔ روشنی نے اس کے کچھ اوہام فوراً ہی مٹا دیئے۔ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے اس وقت تک بات نہیں کی' جب تک غار سے خاصی دور نہیں نکل آئے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو محبت آمیز نظروں سے دیکھا اور قہقہے لگائے۔

زیوڈ نے ہنستے ہوئے اپنا ہکل والا ہاتھ بلند کیا اور لبوں تک لے گیا "اب میں اپنی ملکۂ عالیہ لرا کی آمد کا اعلان کروں گا" یہ کہہ کر اس نے پوری قوت سے ہکل بجایا۔ آواز اتنی تیز اور بھیانک تھی کہ وہ خود بھی متعجب ہو گیا۔ ہکل کی پکار میں عجیب سا ہلا دینے والا تھا۔ وہ دیر تک حیران رہا۔ کیا اس قدیم ہکل میں پھونک مار کر میں نے اتنی

وحشیانہ آواز نکالی ہے؟ یا یہ دور کہیں ۔۔ بہت دور ۔۔۔ ماضی میں' بہت پیچھے کوئی انسان چیخا تھا ۔۔۔ پانچ ہزار سال پیچھے۔ وہ الجھے سے سوچتا رہا۔

"لرا ۔۔۔ تم نے سنا۔ کتنی عجیب آواز تھی" اس نے لرا سے کہا "مجھے تو یہ انسانی چیخ محسوس ہوئی ہے۔"

لیکن لرا پھٹی پھٹی آنکھوں سے پہاڑ کی چوٹی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے لب نیم وا تھے' جیسے ان کے بیچ کوئی خاموش چیخ دبی ہوئی ہو۔

"کیا ۔۔ کیا بات ہے لرا؟" زیوڈ نے پوچھا اور اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

لرا نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ اس کی پلکیں یوں متحرک ہوئیں' جیسے وہ اس کی کسی ان کہی بات کی تائید کر رہی ہو۔

اوپر ۔۔۔ پہاڑی کی چوٹی پر زیوڈ کو ایک طویل القامت شخص کھڑا نظر آیا۔ زیوڈ نے دھوپ سے بچنے کے لئے آنکھوں پر اپنے ہاتھ کا چھجا بنایا اور اسے غور سے دیکھا۔ وہ ساکت و صامت تھا مگر لگتا تھا کہ انہی کو دیکھ رہا ہے۔ وہ بے حد دبلا پتلا تھا' لیکن وہ تھا کون؟"

"زیوڈ! زیوڈ! چلو' واپس چلیں" لرا نے ہسٹریائی انداز میں کہا۔

زیوڈ نے پلٹ کر اسے دیکھا' اسے لرا کا چہرہ کسی نامعلوم وجہ سے چٹا محسوس ہوا۔

پھر لرا نے بغیر کچھ کہے پہاڑ کے دامن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ زیوڈ بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ لرا اندھا دھند بھاگ رہی تھی اور یہ خطرناک بات تھی۔ وہ کسی بھی لمحے کسی گہرے گڑھے میں گر سکتی تھی۔ آخر کار زیوڈ نے اسے پکڑ لیا۔ مگر وہ بری طرح مزاحمت کر رہی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہو۔ گر جاؤ گی' خود کو ہلاکت میں مت ڈالو" زیوڈ نے اسے سمجھایا۔

"نہیں" وہ دیوانہ وار چلائی "نہیں۔"

زیوڈ اسے اپنی بانہوں میں جکڑے کھڑا اس کی وحشت کا سبب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس خوف کا سبب کیا تھا۔ سایا' ہکل کی منحوس آواز؟ ماضی سے ابھرنے والی چیخ؟ ہاں' شاید آخری بات درست تھی۔

اچانک لرا نے مزاحمت ترک کی اور زیوڈ سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔

زیوڈ اس کی کمر تھپتھپاتا رہا "کیا بات ہے لرا؟ کیا ہوا؟"

"مجھے نہیں معلوم زیوڈ۔ میں نہیں جانتی' لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔"

زیوڈ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ اس کا رویّہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس کا موڈ اچانک کیوں تبدیل ہو گیا۔ ویسے وہ اب بھی پلٹ پلٹ کر چوٹی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ زیوڈ اسے

ہاتھوں میں لئے کھڑا تھا۔ لزا کے جسم میں ارتعاش تھا مگر اس کا سبب ہوا کی خنکی بھی ہو سکتی تھی۔

وہ نیچے اترنے لگے۔ ڈیوڈ نے لزا کو اس کے گھر چھوڑا اور پھر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ اپنے والدین سے غار، بگل اور لزا کے خوف کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے بگل کو بیڈ روم میں چھپا دیا۔

رات کو کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گیا اور کھڑکی کھول کر اس کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ وہ رات ان راتوں میں سے تھی، جب آدمی کو خواہ مخواہ اور بہت دور سے نرم چاپیں سنائی دیتی ہیں..... دل پر دستک دیتی ہوئی۔ جب چیڑوں کی سرسراہٹ دور بہتے ہوئے دریا سے سرگوشیاں کرتی محسوس ہوتی ہے۔ جب چاند کے پس منظر میں پہاڑیوں لگتے ہیں، جیسے اپنے کندھوں پر چاند کا فانوس اٹھائے کھڑے ہوں۔

اس وقت بھی پہاڑوں کی چوٹیاں واضح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔ انہی میں کالڈر کا وہ پہاڑ بھی تھا، جہاں انہوں نے سہ پہر کو وہ غار دریافت کیا، جس کی چوٹی پر انہوں نے دُبلے پتلے، طویل القامت آدمی کو نگرانی کرنے کے انداز میں کھڑے دیکھا تھا۔ ڈیوڈ نے نظریں گھما کر کوہِ کالڈر کی طرف دیکھا۔ دُبلا پتلا طویل القامت آدمی کچھ نیچے اتر آیا تھا۔ اب وہ چوٹی کے نیچے والی پہلی مسطح ڈھلان پر کھڑا تھا۔ وہ بہت زیادہ دور نہیں لگ رہا تھا مگر اتنا دور بہرحال تھا کہ اس کے نقوش دیکھنا ڈیوڈ کے لئے ممکن نہیں تھا۔ البتہ اس کا انداز اب بھی پہلے جیسا تھا..... اور وہ پہلے ہی کی طرح ساکت و صامت تھا۔

ڈیوڈ کو اس شخص کے ڈٹے رہنے پر حیرت ہوئی۔ آخر وہ کس چیز کا منتظر تھا..... کس بات کا منتظر تھا؟ کیا چاہتا تھا وہ؟

پھر ڈیوڈ کو محسوس ہوا کہ اس کا زرخیز تخیل اس کے ذہن میں چٹکیاں لے رہا ہے۔ اس نے سوچا، کہیں یہ شخص بھی میرے تخیل کا کرشمہ تو نہیں۔ ممکن ہے، یہ کوئی درخت ہو یا چاندنی کسی مختلف زاویے سے کوئی کرتب دکھا رہی ہو۔

وہ پلٹا اور بگل نکال لایا۔ چند لمحے وہ اسے ہاتھوں میں تولتا..... اور بغور دیکھتا رہا۔ اس نے کانسی کی سبزی مائل سیاہی پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس نے بگل کو لبوں سے لگا لیا..... لیکن بجایا نہیں۔

وہ کھڑکی کے پاس چلا آیا۔ بگل کا بیرونی حصہ کھڑکی کی چوکھٹ سے باہر رات کی تاریکی میں نکالتے ہوئے اس نے آہستگی سے بگل بجایا۔ بگل نے وہی جانی پہچانی سوگوار سی چیخ اگلی، جو وہ سہ پہر کے وقت پہاڑ پر سن چکا تھا۔ اس نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ اس کی سانسیں رک سی گئیں۔

پہلی مسطح ڈھلان پر اب ایک نہیں، دو آدمی کھڑے تھے۔

اس نے بگل پر اپنی پسندیدہ دُھن چھیڑی۔ ہر سُر کے ساتھ مسطح ڈھلان پر ایک سائے کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ان میں سے ہر ایک دُبلا پتلا اور طویل القامت تھا۔

وہ پلٹا اور بگل اپنے بیڈ پر رکھ دیا۔ پھر وہ کوہ کالڈر کی پہلی مسطح ڈھلان پر استادہ ہیولوں کو دیکھنے میں محو ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے! اس کا ذہن بس اسی ایک جملے کی تکرار کئے جا رہا تھا۔ ہر چیز ساکت و صامت تھی۔ وقت بھی جیسے ٹھہر گیا تھا۔ وہ ہیولوں کا انتظار محسوس کر سکتا تھا۔ وہ ساکت کھڑے دیکھ رہے تھے۔۔۔ اور منتظر تھے۔ سوال یہ تھا کہ وہ تھے کیا؟ درخت؟ سائے؟ تخیل کا کرشمہ؟

اس نے غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے اپنے تخیل کو زیر لب بُرا بھلا کہا اور شب خوابی کا لباس پہن کر بستر پر لیٹ گیا۔ مگر اس کی سوچوں پر اب بھی وہی ہیولے قابض تھے۔ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ صرف ایک بگل بجانے سے ہیولے ایک کے دو، دو کے تین اور تین کے چار کیسے ہو سکتے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔

وہ سو گیا لیکن پُرسکون نیند نہیں سو سکا۔ اس کے اعصاب کا ہر تار کھنچ رہا تھا..... یہ خواہش ابھار رہا تھا کہ وہ کھڑکی کی طرف..... کوہ کالڈر کی چوٹی کو دیکھے۔ مگر اس نے اس خواہش کی ایک نہ چلنے دی۔ وہ بستر پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ کچھ دیر وہ اونگھتا۔ پھر اس کی آنکھ کھل جاتی۔

✽✽✽✽✽✽✽

اگلی صبح قصبے کی مرکزی سڑک پر وہ لزا سے ملا۔ لزا کے چہرے

پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی آنکھوں کے تاثر نے بھی اسے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

"لزا۔۔۔ کیا بات ہے؟ تم بہت خوف زدہ لگ رہی ہو" اس نے پوچھا۔

"ڈیوڈ۔۔۔ میں واقعی خوف زدہ ہوں" لزا جیسے پھٹ پڑی "ڈیوڈ پلیز۔۔۔ ہل دوبارہ وہیں رکھ آؤ۔ مجھے اس ہل سے خوف آرہا ہے۔"

ڈیوڈ نے احتجاج کرنا چاہا مگر لزا نے اس کی بات کاٹ دی "چوٹی پر جہاں ہم نے کل ایک آدمی دیکھا تھا' وہاں اب بہت سارے آدمی ہیں' یہ چکر کیا ہے ڈیوڈ؟"

ڈیوڈ کو اپنا رات والا خوف یاد آگیا۔ پھر لزا کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایسی التجا تھی کہ ڈیوڈ کو اندازہ ہو گیا' منطق سے کام نہیں چل سکے گا بلکہ پریشانی اور خوف میں کچھ اضافہ ہی ہوگا۔ کچھ باتیں ایسی بھی تھیں' جن کی نہ وہ وضاحت کر سکتا تھا نہ لزا کر سکتی تھی۔

"تم یہیں ٹھہرو لزا۔ میں ابھی پانچ منٹ میں ہل لے کر آتا ہوں" اس نے کہا اور گھر کی طرف بھاگا۔ وہ واپس آیا تو لزا اسی طرح کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے پہاڑ کو تک رہی تھی۔ اس نے نرمی سے لزا کا ہاتھ تھاما اور بولا "چلو۔۔۔ جونز کے پاس چلتے ہیں۔ وہ ہل کا معائنہ کر کے شاید کچھ بتا سکے۔"

لزا نے بے دھیانی سے سر کو اقراریہ جنبش دی۔

وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے' عشق پیچاں کی بیل سے ڈھکے ہوئے اس کاٹیج کی طرف چل دیے' جہاں جونز رہتا تھا۔ جونز اتنا بوڑھا تھا کہ بیشتر لوگوں کے خیال میں اس کی عمر سو سال سے بھی زیادہ تھی' وہ ایک دانش مند کی حیثیت سے مشہور تھا۔ علاقے کی تاریخ پر اس کی گہری نظر تھی۔

ڈیوڈ نے ہل اسے دکھایا تو اس کی آنکھوں میں ہیجان کی چنگاری سی چمکی "یہ تو تم نے کمال کی چیز دریافت کی ہے۔ ادھر دو۔۔۔ ذرا میں اسے قریب سے دیکھوں" اس نے اپنے جھریوں بھرے ہاتھ میں ہل تھاما اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ ایسا لگتا تھا' جیسے اسے کسی خاص چیز کی تلاش ہے۔ آخرکار اس نے ہل کے لیور سے مس ہونے والے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر کچھ کندہ تھا۔ "اس پر لکھا ہے۔۔۔ تم پکارو' ہم آجائیں گے۔" اس نے ڈیوڈ کو بتایا۔

ڈیوڈ نے بغور دیکھا اور اعتراض کیا "یہ تو دو تصویریں ہیں۔ لکھا تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ہاں۔ انسان کی پہلی تحریری زبان تصویری ہی تھی" بڈھے جونز نے وضاحت کی۔

"یہ۔۔۔" ڈیوڈ نے ماؤتھ پیس کے بیرونی حصے کی تصویر کی طرف اشارہ کیا "یہ ہل بجاتے ہوئے ایک آدمی کی تصویر ہے" پھر اس نے انگلی دوسری تصویر کی طرف بڑھائی اور بولا "اور یہ ایسا لگتا ہے' جیسے کچھ لوگ بھاگ رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب کیا ہے مسٹر جونز؟" لزا نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

جونز نے لزا کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے "لزا بچی۔۔۔ اس کا مطلب تو صاف ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ اور میرا خیال ہے' تم جانتی بھی ہو" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ میں نہیں سمجھتی۔ میں نے غار میں ڈیوڈ سے کہا تھا کہ یہ میرے خواب کا حصہ ہے۔ مجھے سچ مچ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ میرے اندر کی تاریکی سے کیا کچھ برآمد ہو رہا ہے۔"

"تم جانتی ہو کہ تاریکی سے کیا کچھ برآمد ہوتا ہے" بڈھے جونز نے نرم لہجے میں کہا "ڈراؤنے خواب۔ اور کوئی خواہ نہیں پاتا ہے۔"

ڈیوڈ نے باری باری ان دونوں کو الجھن بھری نظروں سے دیکھا۔ نہ جانے وہ کس قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ اب لزا کے چہرے پر شکست اور تفہیم کا تاثر تھا۔

"ہاں۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ پہاڑ پر ان آدمیوں کو میں نے بلایا ہے" لزا بولی۔

ڈیوڈ اپنا خوف بھول گیا۔ اسے یہ سب کچھ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔۔۔ تخیل۔۔۔ صرف تخیل۔ اس نے مداخلت کی "یہ دور بعید ہیں۔"

انہوں نے اسے یوں نظر انداز کر دیا' جیسے وہ موجود ہی نہیں۔ وہ ایک دوسرے کو بے حد عجیب نظروں سے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہے تھے۔ ان کی خاموشی گفتگو کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈیوڈ کو اچانک احساس ہوا کہ انہوں نے درحقیقت اس کی بات سنی ہی نہیں ہے۔

"کیا بات ہے۔ آپ لوگ اتنے خاموش کیوں ہیں؟ کوئی بات نہیں کر سکتے کیا؟ لزا۔۔۔" اس نے چیخ کر کہا۔

بوڑھے جونز نے آہستہ سے سر گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسی سوگواری تھی' جیسے وہ ڈیوڈ کو کسی کی موت کی اطلاع دینے والا ہو "ڈیوڈ!" آخرکار اس نے سرگوشی میں کہا "تمہیں یہ ہل واپس لے جانا ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"ڈیوڈ بیٹے' یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ میرے اور لزا کے اندر کوئی حس ہے' جو ہمیں تنبیہہ کر رہی ہے کہ ہل کی واپسی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں نہ دلیل کام آئے گی نہ منطق۔"

"کیا مطلب؟"

"ڈیوڈ' اس ہل کو واپس لے جاؤ۔ یہ ماضی کی ایک بے حد تاریک رات سے آیا ہے۔ یہ جہالت اور وحشت کے گزرے دور کی یادگار ہے' جب تہذیب پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب انسان پر

شیطان کا غلبہ تھا۔ جب شیطانی قوتیں انسان کو سکھا رہی تھیں۔ معلومات فراہم کر رہی تھیں۔"

"کیسی معلومات؟"

"زندگی اور موت کی معلومات۔"

"میں نہیں مانتا" ڈیوڈ نے کہا اور بگل لبوں سے لگا کر اس پر وہی رات والی دُھن چھیڑ دی۔ اس بار اس کے انداز میں دیوانگی بھی تھی اور بربریت بھی۔

"ڈیوڈ!" لزا حلق کے بل چلائی۔

پھر لزا اور جونز دروازے کی طرف لپکے اور انہوں نے کوہِ کالنڈر کی سمت دیکھا۔ ڈیوڈ کی نظریں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔ کوہِ کالنڈر کی چوٹی پر اب ساکت ہیولوں کا اچھا خاصا جم غفیر تھا۔ وہ تمام کے تمام دُبلے پتلے اور طویل القامت تھے اور ساکت و صامت کھڑے تھے۔ ہیولوں کی نگاہیں ڈیوڈ کو اپنے وجود کو چیرتی محسوس ہوئیں۔

لزا کے دہشت زدہ چہرے کو دیکھ کر ڈیوڈ کو شرمندگی ہونے لگی۔ اس سے کس قدر خوف ناک حماقت سرزد ہوئی تھی۔ اس نے خواہ مخواہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ درحقیقت وہ بھی اس طرح اپنے اندر کے خوف سے اور جبلت کے اشاروں سے لڑ رہا تھا۔ جبکہ جونز اور لزا جانتے تھے کہ ہٹ دھرمی کے ہتھیار سے یہ جنگ نہیں لڑی جا سکتی "آئی ایم سوری لزا" وہ بڑبڑایا۔

"میں سمجھتا ہوں ڈیوڈ" بڈھے جونز نے نرم لہجے میں کہا "بیشتر مرد اسی طرح لڑتے ہیں' عورتوں کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ یہ بگل واپس پہنچا آؤ ڈیوڈ" اور کوئی صورت نہیں۔"

"ہم کل چلے جائیں گے مسٹر جونز۔ لیکن لزا کو لے جانا ہوگا۔ بگل میں تو اس دراڑ میں گھس نہیں سکتا۔ کل تک اس کی حالت کچھ سنبھل بھی چکی ہوگی۔"

"نہیں ڈیوڈ' تاخیر مناسب نہیں ہے" بڈھے جونز کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ڈیوڈ ٹھیک کہہ رہا ہے مسٹر جونز" لزا نے کہا "مجھے نہیں لگتا کہ آج میں جا سکوں گی۔"

بڈھے جونز نے شک آمیز انداز میں نفی میں سر ہلایا "کل؟ کل تو بہت دور ہے میرے بچے۔"

لزا مسکراتے ہوئے بولی "میں انتظار کر لوں گی' کل کچھ اتنی دور بھی نہیں ہے۔"

لزا کا لہجہ اس قدر عجیب اور خواب ناک تھا کہ جونز اور ڈیوڈ نے چونک کر اسے دیکھا' وہ یوں خوش نظر آ رہی تھی جیسے اس کا ہر خوف دُھل چکا ہو۔ ڈیوڈ ہنس دیا۔ اس نے معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹنے پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اس نے سوچا۔ کل ہم جا کر بگل غار میں واپس رکھ آئیں گے اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔

وضاحت

کافی رات گئے تھانے میں ایک پروفیسر صاحب کا فون موصول ہوا "دیکھئے جناب میرے ہاں چوری ہو گئی ہے۔ کسی نے میری کار کا بالکل صفایا کر دیا ہے۔ اس کا اسٹیئرنگ غائب ہے۔ گیئر' ڈیش بورڈ اور ایکسیلریٹر بھی نہیں ہے۔ آپ لوگ فوراً کچھ کریں۔"

تھوڑی دیر بعد پولیس آفیسران کے گھر پہنچ گیا۔ تو دیکھا' پروفیسر صاحب خاصے خوش بیٹھے ہیں۔

انسپکٹر کو دیکھ کر جلدی سے بولے "معافی چاہتا ہوں آفیسر کہ میں نے تمہیں اتنی رات میں زحمت دی۔ لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں۔ میری کار کی سب چیزیں موجود ہیں کوئی بھی چیز چوری نہیں ہوئی۔"

انسپکٹر نے انہیں تعجب سے دیکھا۔ تو پروفیسر نے اطمینان سے کہا "ہوا یہ تھا کہ میں غلطی سے کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔"

گاؤں کے لوگوں نے بھی پہاڑ کی چوٹی پر ہیولوں کے اس ہجوم کو دیکھا۔ انہوں نے سوچا کہ وہ پہاڑ کے اس طرف رہنے والے لوگ ہوں گے۔

****

وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ڈیوڈ نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے چوٹی پر موجود ہیولوں کو دیکھا اور خود کو باور کرانے کی کوشش کی کہ گاؤں والوں کا خیال درست ہے۔ لیکن اس خیال کے حق میں کوئی دلیل نہیں تھی جبکہ مخالفت میں بہت کچھ تھا۔ اگر وہ عام انسان تھے تو انہوں نے پہاڑ سے اتر کر قصبے کے شراب خانے کا رخ کیوں نہیں کیا؟ چاندنی رات میں اس قدر احمقانہ طریقے سے کھڑا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس نے بڑی احتیاط سے ان کی گنتی شروع کی۔ وہ یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک دو کی کمی و بیشی ممکن تھی۔ بہرحال ان کی تعداد ستائیس کے لگ بھگ تھی۔

اس نے بگل اٹھایا اور آہستگی سے اس پر رات والی دُھن چھیڑی۔ بگل نے نو جھٹکے لئے تھے۔ پھر اس نے بگل کو کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا اور ہیولوں کو دوبارہ گنا۔

چھتیس! اب ہیولوں کی تعداد چھتیس ہو چکی تھی۔

بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ لزا کے چہرے پر موجود خوشی کے تاثر سے دھوکا کھا گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا گزشتہ دو ہزار سال کے علم اور روشنی کے باوجود تاریک زمانے کی سچائیاں اس کی نگاہوں کے سامنے تھیں۔ صدیوں کا مُردہ ماضی حال میں چلا آیا تھا۔ گویا بگل کی واپسی بہت ضروری تھی۔ اسے اور لزا کو ایک بار پھر کوہِ کالنڈر کے غار میں اس ڈراؤنے خواب سے گزرنا تھا۔ خدا کی پناہ! لزا کو تھا موت کے اس غار میں جانا تھا۔ یہ خیال ہی اسے لرزا

دینے کے لئے کافی تھا اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ لزا کا تھا اس غار میں جانا ناگزیر تھا۔

اس نے بگل اٹھایا اور زینے سے بھاگتا ہوا اترا۔ساں اس سے پوچھتی رہ گئی کہ اس وقت وہ کہاں جارہا ہے۔مگر اس کے پاس جواب دینے کا وقت بھی نہیں تھا۔وہ سڑک پر دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔راہ گیر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔پھر اچانک اس نے بڈھے جونز کو بھی بھاگتے دیکھا۔

"ڈیوڈ۔۔۔ ڈیوڈ!" اس نے ڈیوڈ کو دیکھتے ہی پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا "میں لزا کے اطمینان سے دھوکا کھا گیا۔وہ غائب ہے'اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ہمیں فوری طور پر اس غار میں پہنچنا ہے' یہ بہت ضروری ہے۔"

"اور وہ پہاڑ پر موجود لوگ؟ وہ کون ہیں؟" ڈیوڈ نے بدستور بھاگتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے پہاڑ کے دوسری طرف رہنے والوں سے پچھوایا تھا۔پہاڑ پر موجود لوگ ان کے گاؤں کے نہیں ہیں۔اس طرف والے لوگ بھی یہاں آگئے ہیں۔وہ دراڑ کو چوڑا کرنے میں ہماری مدد کریں گے۔"

"اور پہاڑ پر موجود لوگ؟ وہ۔۔۔" دہشت کے مارے ڈیوڈ سے بولا نہیں گیا۔حقیقت کے اچانک ادراک نے اس سے حواس چھین لئے۔غضب خدا کا! لزا اس وقت اس دہشت کے درمیان تھی'جس کے تصور نے ہی اسے گنگ کردیا تھا۔

"وہ لوگ اب پہاڑ پر موجود نہیں ہیں ڈیوڈ" بڈھے جونز نے سوگوار لہجے میں بتایا۔

"نہیں۔۔۔ خدا کی پناہ۔۔۔ نہیں" ڈیوڈ حلق کے بل چیخا۔

"ہاں ڈیوڈ' آج پورا چاند ہے۔یہ یاد آنے کے بعد ہی تو مجھے احساس ہوا تھا۔میں لزا کی طرف بھاگا۔پتا چلا' وہ گھر پر موجود نہیں ہے' کسی کو کچھ بتا کر بھی نہیں گئی۔"

"تب تو۔۔۔ بہت دیر ہوچکی۔"

"نہیں ڈیوڈ' چاند ابھی اپنے شباب پر نہیں آیا ہے۔ابھی وقت ہے۔لیکن ہمیں بہت تیزی دکھانا ہوگی۔چرچ کے باہر لوگ منتظر ہیں۔تم جلدی سے بگل لے آؤ۔"

"بگل تو میرے ہاتھ میں ہے" ڈیوڈ نے بوکھلا کر کہا۔

بڈھا جونز جھینپ گیا۔دونوں ساتھ ساتھ چرچ کی طرف بھاگتے رہے۔چرچ کے قریب پہنچ کر ڈیوڈ نے جونز سے پوچھا "مسٹر جونز' میں نے بگل بجایا تھا تو کیا ہوا تھا۔کیا میں نے۔۔۔؟" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

جونز نے رک کر ہانپتے ہوئے کہا "ہاں ڈیوڈ' تم نے زمانۂ قدیم کے مُردوں کو جگا دیا۔کالا جادو کرنے والوں نے بگل کو یہ طاقت سونپی ہوگی۔ہم لوگ تو ٹھیک طور سے یہ باتیں سمجھ بھی نہیں سکتے۔"

چرچ کے پاس خاصی تعداد میں لوگ کھڑے تھے۔کسی کے پاس کدال تھا'کسی کے پاس پھاؤڑا'کسی کے پاس بوجھ اٹھانے والی سلاخ اور کسی کے پاس بیلچہ۔اس کے علاوہ ٹارچیں اور لیمپ بھی تھے۔سب کے لب مسکراہٹ سے محروم تھے اور چہروں سے لگتا تھا کہ صورتِ حال کی سنگینی سے پوری طرح واقف ہیں۔چاند کے مکمل ہونے میں چار گھنٹے باقی تھے۔گویا انہیں اتنی دیر میں موت کے غار کے اندر پہنچنا تھا۔

وہ سب خاموشی سے تیز قدم اٹھاتے پہاڑ کی سمت بڑھنے لگے۔

❋❋❋❋❋❋❋❋

وقت پر لگا کے اڑتا رہا۔دراڑ کو کشادہ کرنے والوں کے جسم پسینے میں نہا گئے لیکن دراڑ بے حد ضدی ثابت ہوئی۔آخر کار دوسری طرف کے گاؤں سے آنے والوں کے لیڈر نے کہا "اب ڈائنامائٹ کے سوا کوئی صورت نہیں رہی ہے۔"

"اس طرح تو غار بند بھی ہوسکتا ہے" ڈیوڈ نے چیخ کر کہا "میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا" وہ یہ سوچ کر پاگل ہوا جارہا تھا کہ اس وقت لزا موت کے غار میں ہے۔

کچھ دیر کے معائنے کے بعد چٹان میں ایک رخنہ تلاش کیا گیا۔تمام لوگ پوری قوت اور دل جمعی سے اس پر پل پڑے۔اچانک ایسا لگا' جیسے پورا کوہ کالنڈر لرز رہا ہے۔پتھروں کی بارش سی ہونے لگی۔چٹان پر حملہ کرنے والوں کو جان بچانے کے لئے ادھر ادھر دبکنا پڑا "ہٹو۔۔۔ پیچھے ہٹو" وہ چلائے "غار کی چھت گرنے والی ہے۔"

لیکن ڈیوڈ اور جونز صرف اتنا جانتے تھے کہ دراڑ چوڑی ہوگئی ہے۔انہیں جیسے اس کے علاوہ کسی بات سے غرض ہی نہیں تھی۔پتھروں اور گرد کی بارش میں ان کی ٹارچوں کی روشنی غیر مؤثر ہوگئی تھی۔جونز نے گھٹی گھٹی آواز میں ڈیوڈ کو آگے بڑھنے کی ہدایت کی "میں تمہارے پیچھے پیچھے آرہا ہوں" اس نے کہا۔

ڈیوڈ بے تابانہ آگے بڑھا۔گرد نے اسے کچھ دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔تاہم ٹٹول ٹٹول کر وہ دراڑ میں داخل ہوا اور آگے بڑھتا رہا۔اچانک اس نے خود کو ایک بالکل مختلف ماحول میں پایا۔وہ سب کچھ بے حد غیر یقینی لگ رہا تھا۔وہاں باہر کی چیخ و پکار کے برعکس خاموشی تھی۔شیطنت بھری خاموشی۔اس نے رک کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔وہ محض خوف نہیں تھا' جو اس پر حملہ آور ہوا تھا۔وہ تو چیخی' چنگھاڑتی' بپھری دہشت تھی' جس نے اس کے وجود کو جکڑ لیا تھا۔اس کے اندر کوئی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ یہاں سے بھاگ جاؤ' مگر لزا کی محبت اسے ڈٹا رہنے پر مجبور کررہی تھی۔لزا کی محبت نے ہی اسے حوصلہ دیا تھا۔ورنہ وہ وہاں ایک سیکنڈ بھی نہیں رک سکتا تھا۔

وہ ایک بہت کشادہ اور روشن غار میں تھا۔ایسا لگتا تھا' جیسے

وہاں کوئی جہنم دہک رہا ہے۔ غار کی دیواریں سرخ ہو رہی تھیں اور روشنی کا کوئی منبع کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر اس نے پتھر کی وہ بڑی سِل دیکھی' جس کا لزا نے تذکرہ کیا تھا۔ وہ سِل ایک بہت بڑے چٹانی ڈائس پر رکھی تھی۔ وہ واقعتاً قربان گاہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہاں یقیناً صدیوں پہلے انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی رہی ہوگی۔ سِل کے اوپر وہ چھپا تھا' جس پر سے لزا نے بگل اٹھایا ہوگا۔ غار کی چھت سے آہنی آنکڑے لٹک رہے تھے۔ مگر سب سے زیادہ دہشت غار میں موجود غیر متحرک ہیولوں کو دیکھ کر طاری ہوتی تھی۔ وہ کیا تھے؟ انسانی چیتھڑے۔ وہ موت' جسے زندگی میں تبدیل کرنے کا طلسم کانسی کے بگل میں چھپا ہوا تھا۔ وہ سب طویل القامت ڈھانچے تھے' جو ڈائس پر ایک قطار میں کھڑے تھے اور قربان گاہ کے پتھر پر لزا یوں لیٹی تھی جیسے مرچکی ہو۔

ڈیوڈ سحر زدہ سا کھڑا دیکھتا رہا۔ آخر کار منطق نے اسے سہارا دیا۔ وہ غار درحقیقت قبرستان تھا اور مُردہ انسانوں کے ڈھانچے اسے نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔

وہ اپنی ہمت مجتمع کر رہا تھا تاکہ موت کے اس غار میں پیش قدمی کر سکے۔ اسی وقت قربان گاہ کے پتھر کے قریب استادہ ہیولے کا ہاتھ دھیرے دھیرے اٹھا۔ وہ حرکت شاید کوئی اشارہ تھا۔ کیونکہ اس کے فوراً بعد جیسے ہر شے متحرک ہوگئی اور وہ تحرک بے آواز نہیں تھا۔ اب تو چٹانیں بھی بولتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ڈیوڈ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے غار کی چھت سے لٹکے ہوئے آنکڑوں کو نیچے آتے اور برف کے ہیولوں کو پگھلتے دیکھا۔ ہر چیز تبدیل ہو رہی تھی۔ شاید وقت اُلٹی چال چل رہا تھا۔ ماضی واپس آرہا تھا۔

پھر ڈھانچوں کی ہڈیوں میں بھی تحرک پیدا ہوا۔ ہڈیوں پر ریشہ ریشہ گوشت چڑھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھانچے جسموں میں تبدیل ہوگئے۔ پھر جسموں پر لباس نمودار ہوا' جانوروں کی کھالوں کا لباس' پھر لباس کی سرسراہٹیں' انسانی ہنہناہٹیں اور ہتھیاروں کی جھنکار ابھری۔

قربان گاہ پر استادہ موت کے ہیولے نے ایک شکل اختیار کرلی۔ اس کا لبادہ سفید تھا اور سر پر کانٹوں کا تاج تھا۔ اس کے ہاتھ اب بھی بلند تھے اور دھیرے دھیرے اس چھجے کی طرف بڑھ رہے تھے' جس پر بگل کو موجود ہونا چاہئے تھا۔

ڈیوڈ نے سانس روک لی۔ کیا ان ہاتھوں کو بگل کی تلاش تھی۔ دہشت نے اس کے حواسوں میں یوں پنجے گاڑے کہ وہ ہلنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اس نے دنیا کا خوفناک ترین منظر دیکھا تھا۔ اس نے ڈھانچوں پر گوشت چڑھتے' انہیں انسانی روپ دھارتے دیکھا تھا۔ اور اب۔۔۔

"ڈیوڈ۔۔۔ ڈیوڈ۔۔۔ خدا کے لئے لزا کی طرف دیکھو" جونز نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اس کا چہرہ فرطِ دہشت سے سیاہ ہو رہا تھا۔

ڈیوڈ نے دیکھا' لزا اب لزا نہیں تھی۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ غار نمودار ہو رہے تھے۔ وہ مر رہی تھی۔۔۔ مرنے والی تھی' اس میں موجود زندگی کی آخری رمق خود کو برقرار رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ سرہانے کھڑی ہوئی موت کے ہاتھ میں سنہرے دستے والا چاقو تھا۔

ہاں۔۔۔ موت کے ہاتھوں کو بگل کی نہیں' اس چاقو کی تلاش تھی' بگل کا کام پورا ہو چکا تھا۔ مُردوں کو بلاوا پہنچ چکا تھا۔ وہ آچکے تھے۔ اب ان کے لئے لزا کی۔۔۔ زندگی کی بھینٹ دینے کا مرحلہ باقی تھا۔ سنہرے دستے والا چاقو اس کی رگِ جاں سے بے حد قریب تھا۔ اب لزا کے جسم نے موت اوڑھ لی تھی' جیسے مُردہ ڈھانچوں نے زندگی اوڑھی تھی۔ اور ڈیوڈ۔۔۔ ڈیوڈ یوں ساکت و صامت کھڑا تھا' جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ ہو۔

پھر موت کے غار میں جونز کی آواز گونجی "موت عورت کے پیٹ سے جنم لیتا ہے۔۔۔ اور زندگی فانی ہے۔ جینے کے لئے ایک عرصہ مقرر کیا جاتا ہے۔"

ایسا لگا' جیسے کسی ان جانی قوت نے غار میں موت کے تحرک کو روک دیا ہو۔ عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ قربان گاہ پر کھڑے ہوئے موت کے ہیولے کی آنکھوں سے نفرت جھانکنے لگی لیکن سنہرے دستے والے چاقو کی چمک ماند نہیں پڑی تھی۔

"زندگی کے دوران ہم ہر لمحے موت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔"

جونز کی آواز پھر گونجی۔

ڈیوڈ نے فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ کانسی کی چمکتی ہوئی ڈھال پھر سبزی مائل سیاہی رنگت اختیار کر رہی تھی۔ چھت پر برف کے جالے پھر تن گئے تھے۔ آہنی آنکڑے پھر چھت سے جالگے تھے۔ صدیوں کی گرد پھر جمنے لگی تھی۔

"زمین کا پیوند زمین میں لگتا ہے' راکھ راکھ سے اور مٹی مٹی سے رجوع کرتی ہے" جونز نے بلند آواز میں کہا۔

مُردہ ڈھانچوں سے گوشت کے ریشے اترنے لگے۔ ہڈیاں پھر نمودار ہوگئیں۔ ان پر پہلے کی طرح چیتھڑے جھولتے نظر آئے۔

ڈیوڈ تیزی سے قربان گاہ کی طرف لپکا اور اس نے لزا کو ہاتھ پکڑ کر کھڑا کردیا۔ جیتی جاگتی لزا اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"جلدی کرو ڈیوڈ!" جونز نے دراڑ کے دہانے سے پکارا "ایسا لگتا ہے کہ پہاڑ گرنے والا ہے۔"

وہ دیوانہ وار دراڑ کی طرف بھاگے' لیکن پھر ڈیوڈ کو کچھ خیال آگیا۔ وہ ایک اہم کام بھول رہا تھا۔ وہ بگل ہاتھ میں لئے پلٹا اور ڈائس کی طرف بھاگا۔ اس نے بگل کو اس چھجے پر رکھ دیا' جہاں سے اسے اٹھایا گیا تھا۔ ایسی آواز آئی' جیسے کسی نے بہت طویل آہ بھری ہو۔ پھر وہ دراڑ کی طرف پلٹ گیا۔

TRUMPET CALL
G.E. FOX

نئی سوچ نیا رنگ نیا لہجہ نیا آہنگ
احمد اقبال کے نشترِ رہوار و شہنم فشاں قلم سے

قسط نمبر: ۱۰۹

شکاری

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بر دوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سُلگتی راتیں، آس و یاس، خوش و ہراس، تلخ حقائق، شیریں خواب۔

سکندر بخت میرا نام ہے۔ بچپن میں مجھے کبیر خان بھی کہا جاتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جب مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو میرے والد وزیر خان کے سوا تمام افراد خانہ شہید ہو گئے۔ والد نے لاہور میں معمولی کاروبار سے نئی زندگی کا آغاز کیا پھر ایک حصہ دار میر شرافت علی کے ساتھ وزیر اینڈ کمپنی قائم کی جو زرعی آلات بناتی تھی۔ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیجا گیا۔ چار سال بعد مجھے رُسوا کن حالات میں برطانیہ سے نکلنا پڑا۔ پاکستان پہنچ کر مجھے والد کی دردناک موت سے منسوب پُراسرار حالات کا علم ہوا۔ وہ بدستور صنعت کار تھے مگر انتہائی مفلسی کا شکار رہے اور انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ میرے پیچھے ان پر کیا گزری۔ پھر ان کا پارٹنر میر شرافت علی قتل ہوا اور اس جرم میں مجھے ملوث کر لیا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے والد کی کمپنی کا تیسرا حصے دار چوہدری دلاور ایک وطن دشمن اسمگلر ہے جو مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کو اسلحہ فراہم کرتا ہے۔ اس غدار کے دوسرے ساتھیوں میں ایک بدمعاش استاد پیٹرو، ایک بدعنوان ایس پی سراج، ایک بدکردار سابق نواب خسرو جمشید اور اس کا نوکر ڈی سلوا تھے۔ میری مدد میرے بچپن کے دوست محسن نے کی۔ پہلے عبدالودود مظہر نام کے ایک ایڈووکیٹ نے میرے مقدمے کی پیروی کی لیکن پھر رابعہ قادری ایڈووکیٹ نے قانونی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ رابعہ سے میرا تعلق ایک عشق بالآخر میں بدل گیا اور اس نے میرا ساتھ نبھانے کی بھاری قیمت ادا کی۔ ہماری ذاتی دشمنی اب وطن دشمن عناصر کے خلاف ایک جدوجہد بن چکی تھی۔ حالات تخت سے تختہ ہو گئے تھے اور ہمارا ساتھ دینے والوں میں ایک صحافی مرزا غالب، ایک لڑکی شہلا جو بعد میں محسن کی شریکِ حیات بنی، فرض شناسی کے جرم میں نکالا جانے والا ایک انسپکٹر اکرام شیخ اور اس کی فتنہ ساماں بہن ناز بھی شامل ہو گئے۔ ہم نے اپنی تنظیم کا نام ایم آر ایس (مائٹ از رائٹ سوسائٹی) رکھا کیونکہ ہمارے نزدیک معاشرے کے ان مجرموں کا علاج قانون کے پاس نہیں تھا۔ وہ خود کو بہت بڑا شکاری سمجھتے تھے لیکن ہم ان کو انہی کے طریقوں سے شکار کرنے لگے تھے۔ اس جنگ میں ہمارا ایک ساتھی ٹیڈی اور دوسرے بہت سے بے گناہ، سچے اور محب وطن لوگ مارے گئے تو ہم نے بھی وطن فروشوں کے بہت سے ٹھکانے تباہ کئے۔ خسرو جمشید اور ڈی سلوا کے علاوہ بھی ہم نے بہت سے غداروں اور غیر ملکی ایجنٹوں کو ٹھکانے لگایا۔ اب ہماری زندگی کا مقصد ہی ان معاشرے کے ناسوروں سے برسرِپیکار رہنا ٹھہرا، خواہ اس راستے میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

گذشتہ قسط کا خلاصہ

بتانے والے نے اپنا نام دلاور ہی بتایا تھا مگر یہ ہوٹل کے مالک دلاور سنگھ تھے۔ انہوں نے فون پر پولیس کو ہمارے بارے میں نہیں بلکہ ایک ڈاکو اگروال اور اس کی ساتھی عورت کے بارے میں اطلاع دی تھی جو ان کے ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ اگروال کو سزائے موت کا حکم سنایا جا چکا تھا۔ وہ جیل سے بھاگا ہوا مجرم تھا۔ اس کی ساتھی عورت نے نیپال فرار ہونے کے لئے ایک ہیلی کاپٹر کا بندوبست کر رکھا تھا مگر ہم نے انہیں اور پائلٹ کو مجبور کردیا کہ وہ نیپال کے بجائے کلکتہ چلے۔ ایک طویل سفر کے بعد 'بمعہ مشکلات اور خطرات سے گزر کے ہم کلکتہ' بنگال کی سرحد کے قریب پہنچ گئے۔ اگروال نے ہمارے ساتھ اترنے سے انکار کیا اور پائلٹ کو مجبور کیا کہ وہ اسے نیپال پہنچائے۔ پائلٹ نے مجبوراً اس کی بات مانی مگر کچھ ہی دیر بعد فوجی طیاروں نے شیل مار کے ہیلی کاپٹر کو تباہ کردیا۔ اس جگہ سے کچھ ہی دور واقع ایک کچی بستی میں ہم نے بستی کے ایک اہم آدمی کے گھر قیام کیا۔ وہ ایک بے ضمیر اور بردہ فروش شخص تھا۔ ایک موقع پر اس نے گل اور نازو کے حوالے سے ایسی بے ہودہ بات کہی کہ میرے جسم کا سارا خون کھنچ کر چہرے پر آگیا۔ اس کی بات کا مجھ پر وہی اثر ہوا جو غلیظ ترین گالی کا ہو سکتا تھا۔ مگر غالب کا ردِّعمل زیادہ شدید تھا۔ اس نے ایک دم ریوالور نکالا اور اسے شوٹ کردیا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں موجود لڑکیاں 'جنہیں بیچنے کے لئے یہاں رکھا گیا تھا' چیختی چلاتی ایک دم باہر نکل گئیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ کیجیے

کچھ دیر کے لئے ہم سب سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے رہے اور نورل کی خاک و خون میں غلطاں لاش کو دیکھتے رہے جس کی کھلی آنکھوں میں اب بھی ہمارے لئے کھلی دھمکی تھی کہ تم نے مجھے مار تو دیا مگر اب خود اس وحشی قبیلے کے غیظ و غضب اور انتقام کا نشانہ بننے سے کیسے بچو گے۔

میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا "غالب، یہ تم نے کیا کردیا؟"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "وہی جو تم نہ کر سکے۔ میری قوت برداشت اتنی نہیں ہے جتنی تمہاری۔"

میں نے بے بسی سے کہا "یار، تم عقل سے کام نہیں لے سکتے تھے؟"

غالب نے اسی سرد لہجے میں کہا "ایسی گالی سن کے تمہارے لئے عقل سے کام لینا ممکن تھا۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ میری عقل نے بھی یہی کہا تھا۔ اب نہ مجھے اس پر ندامت ہے اور نہ خوف کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"تم واقعی بہادر ہو" نازو نے کہا مگر اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا فخر کے جذبات تھے۔

غالب نے ممنون ہو کے اسے دیکھا "میں نے غلطی تو نہیں کی نازو؟"

نازو نے اس کا ہاتھ تھام لیا "مجھے فخر ہے تم پر۔"

میں نے کہا "اب تیار ہو جاؤ مقابلے کے لئے۔ خواہ ہمیں اس قبیلے کے ایک ایک فرد کو جان سے مار کے اپنا راستہ بنانا پڑے مگر اب ہمیں نکل جانا چاہئے۔"

باہر ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ نورل کے قتل ہوتے ہی اس کی زر خرید کنیزیں چیختی چلاتی فرار ہو گئی تھیں اور ہم باہر سے ان کا واویلا سن سکتے تھے۔ ان کی زبان سے ناواقفیت کے باوجود یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ سارے قبیلے کو ہمارے ہاتھوں نورل کے مارے جانے کی اطلاع دے چکی ہیں۔ ان کی فریاد و فغاں میں دوسری برہم آوازوں کا شور شامل ہو گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے نورل کے غلام' عقیدت مند اور پیروکار اپنے مالک' نجات دہندہ اور لیڈر کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے ہر طرف اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اپنی قوت کو مجتمع کر رہے ہیں تاکہ ہمارے جسموں سے کھال اور گوشت نوچ لیں اور ہماری ہڈیوں کو بھی چُور چُور کردیں۔

میرے اشارے پر غالب' گل اور نازو نے اٹھ کے ریوالور نکال لئے تھے اور اب وہ میرے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ مشتعل لوگوں کا ہجوم بھی باہر رُکا ہوا شاید اپنے سردار کے اشارے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے کہا "اس سے پہلے کہ یہ سب وحشی ہم پر ٹوٹ پڑیں' میں ان سے بات کر کے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

غالب نے کہا "کیسے سمجھاؤ گے انہیں؟ یہ تمہاری زبان کہاں سمجھیں گے۔"

نازو نے کہا "زبان سمجھتے تب بھی ان کے جذبات کی شدت پر قابو پانا مشکل ہوتا۔"

گل نے کہا "باہر مت جائیں بھائی سکندر۔ یہ لوگ مار ڈالیں گے آپ کو۔"

"بے وقوف! مارے تو ہم اندر بھی جائیں گے۔ یہ کوئی قلعہ نہیں ہے جس میں ہم مورچہ بند ہو کے بیٹھ جائیں۔ گھاس پھونس کی دیواریں کب تک پناہ دیں گی آخر۔ میں کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ غالب! تم میرے ساتھ آؤ۔ میرے پیچھے۔ نازو! تم کسی سوراخ سے ہجوم پر نظر رکھو۔ جو بھی حملے میں پہل کرے اسے بے دریغ گولی ماردینا۔ گل! تم پیچھے رہ کر ہم سب کو کور کرو۔ اچھا چھوڑو۔ تم دوسری طرف آجاؤ۔ کسی سوراخ میں سے تم بھی دیکھتی رہو۔"

میں نے دروازے سے سر نکالا ہی تھا کہ ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا گھاس پھونس کی دیوار میں پیوست ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے میرے وجود میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی لیکن میں نے اس خوف کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ریوالور ہاتھ میں لے کر میں ساٹھ ستّر افراد کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ان سب کی آنکھوں سے نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا اور ان پر خون سوار

تھا۔ ان کے نیم برہنہ جسم کی ساری ہڈیاں ناطاقتی کی مظہر تھیں مگر ان کے جارحانہ عزائم کی طاقت کم نہ تھی۔ ان کے پیٹ خالی تھے مگر دل عداوت کی آگ سے پُر تھے اور وہ جانتے تھے کہ خشک ٹہنی کمزور ہوتی ہے مگر وہ مل کے ایک گٹھا بن جائیں تو درخت کے تنے کی مضبوطی حاصل ہو جاتی ہے۔

میں نے تیر کو کھینچ کر نکالا اور چلا کے کہا "یہ کس کی حرکت تھی؟"

میرا سوال میرے لہجے اور میری صورت سے عیاں تھا چنانچہ الفاظ کے نہ سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ سب ایک دم چیخ چیخ کر اندر کی جانب اشارہ کرنے لگے اور ہوا میں مُکے لہرانے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے' لاٹھیاں' ڈنڈے اور لوہے کے سریے تھے۔ جس کو کچھ نہیں ملا تھا اس نے بھی پتھر اٹھا لیا تھا۔

میرے سوال کا عملی جواب ایک شخص نے یوں دیا کہ اپنا ہاتھ اٹھا کے اس نے پتھر کھینچ مارا۔ میں اس کے لئے تیار تھا۔ اپنا سر جھکا کے میں نے خود کو بچایا۔ پتھر دیوار پر لگا لیکن اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز آئی۔ وہ شخص اچھل کر زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔

ایک لمحے کے لئے مجمع ساکت ہوا۔ پھر ایک نوجوان چیخ مار کے نیزہ میرے سینے میں اتارنے کے لئے لپکا۔ اس نے کچھ فاصلے سے ہی نیزہ پھینک دیا تھا۔ نیزا میرے دائیں ہاتھ کو چھوتا ہوا گزرا۔ پھر دوسرا فائر ہوا اور وہ بھی پلٹ کے زمین پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔

اب مجمع کا جوش و خروش سرد پڑ گیا تھا۔ دو افراد کے خون نے جذبات کی آگ کو بجھا دیا تھا اور مرنے والوں کا کرب دیکھ کر جینے والوں کو ہوش آگیا تھا۔

میری نگاہیں سردار کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ سب سے پیچھے ساکت و صامت کھڑی ہوئی عورتوں کے مجمع کو چیرتا ہوا نمودار ہوا اور چیختا چلاتا میرے سامنے آگیا۔ وہ بار بار ہاتھ اٹھا کے دو لاشوں کی طرف اور اندر کی جانب اشارہ کر رہا تھا اور کچھ پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا "تورل نے ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں وہ خود مارا گیا۔"

سردار نے پھر چیخ کر کچھ کہا۔

میں نے کہا "یہ دونوں بھی اپنی موت کے خود ذمے دار ہیں۔ ہم کسی کو مارنا نہیں چاہتے تھے لیکن کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس غولِ بیابانی سے ڈر جائیں گے تو ......"

سردار نے میری بات کاٹ دی اور ہاتھ ہلا ہلا کے اپنے لوگوں سے کچھ کہنے لگا۔ ان سب نے نیزے' لاٹھیاں اور سریے اٹھا کے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔ غالباً سردار نے سوال کیا تھا کہ کیا میرے حکم پر تم ان قاتلوں پر ٹوٹ پڑو گے۔ ان سب نے ایک آواز میں اسے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا تھا۔

صورت حال خطرناک ہو گئی تھی۔ اس کا واحد علاج یہ تھا کہ سردار کو یرغمال بنا لیا جائے۔ میں نے ایک دم اسے دبوچ کے اپنے سامنے کر لیا اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"ان سے کہو واپس چلے جائیں" میں نے حکم دیا اور ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔

میرے بائیں بازو کے حلقے میں سردار کی گردن پھنس کے رہ گئی تھی اور وہ بری طرح تڑپ رہا تھا' لاتیں چلا رہا تھا اور سانس لینے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ کا اشارہ بہت واضح تھا۔ سردار نے بڑی مشکل سے کچھ کہا۔ اوپر اٹھے ہوئے تیر' نیزے اور لاٹھیاں نیچے ہو گئے۔ پیچھے سے اٹھارہ بیس سال کا لڑکا آگے بڑھا۔

"اپن بات کرے گا" اس نے قریب آنے کی اجازت طلب کی۔

میں نے کہا "آگے آجاؤ۔"

اس نے نزدیک آ کے کہا "سردار کو چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "سردار سے کہو' اپنے قبیلے کو واپس جانے کا حکم دے۔"

"سردار اپنا باپ ہوتی......" اس نے عاجزی سے کہا۔

"اچھا۔ تو تم سردار کے بیٹے ہو" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "تم حکم دو سب کو کہ واپس لوٹ جائیں ورنہ ہم سردار کو مار ڈالیں گے۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

لڑکے نے بے بسی سے مجمع کی طرف دیکھا اور ہمارے احکامات کی ترجمانی کر دی۔ لوگ اسی طرح کھڑے رہے۔ ان کے پیچھے عورتوں کا اور بچوں کا ہجوم مسلسل رونے پیٹنے میں مصروف تھا۔ میری نظر کو ان چھ عورتوں کی تلاش تھی جن کو تورل نے بطورِ خاص ہماری میزبانی کے لئے منتخب کیا تھا اور جو اس کے قتل کی عینی شاہد بن چکی تھیں مگر وہ مجھے اس حلقۂ غم گساراں میں دکھائی نہ دیں۔

"یہ باپ کا بات مانتی" لڑکے نے اپنی مجبوری بتائی۔

"پھر اپنے باپ صاحب سے کہو کہ ہم بات کرنے کے لئے تیار ہیں اور جرمانہ بھی دیں گے مگر پہلے ان سب سے کہو کہ اپنے اپنے گھر جائیں ورنہ ہم فائر کھول دیں گے اور بہت خون خرابہ ہوگا۔"

لڑکا کچھ دیر میری صورت تکتا رہا۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آئی اور اس نے اپنے والد محترم سے کچھ کہا۔ والد نے جانکنی کے عالم میں کچھ فرمایا۔ لڑکے نے اپنی رعایا سے پھر خطاب کیا اور ایک نعرہ لگایا جس کے جواب میں سردار نے سرہلا کے کہا کہ محاصرہ ختم کر دیا جائے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے مراجعت اختیار کی اور اپنے ساتھ وہ دونوں لاشیں بھی اٹھا کے لے گئے۔

اب میں نے سردار کو باعزت طور پر اندر تشریف لانے اور مذاکرات کے ذریعے معاملات طے کرنے کی پیش کش کی۔ اس کا بیٹا بطور مترجم شریک ہوا اور ہمارے درمیان کسی دشواری کے بغیر سمجھوتہ ہو گیا۔ انہیں تورل صرف اس لئے عزیز تھا کہ وہ ان کے

معاشی مفادات کا تحفظ کرتا تھا۔ نورل کے بغیر انہیں اقتصادی بحران کا خطرہ درپیش تھا اور وہ خود کو اتنا ہی غیر محفوظ سمجھتے تھے جتنا کوئی اندھا خود کو لاٹھی کے بغیر محسوس کرتا ہے۔

ناز و نے بڑی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سونے کے تمام زیورات کی پوٹلی آگے بڑھادی "نورل یہ سب چھین لینا چاہتا تھا۔ اس نے کل رات بھی چوری کرنی چاہی تھی۔"

سردار کی آنکھیں خالص سونے کے ڈھیر کو دیکھ کر پھٹی رہ گئیں جو اس نے اپنے ولی عہد کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ولی عہد نے اسے نازو کی بات کا مطلب سمجھادیا۔

"باپ صاحب بولتی نورل چور نہیں ہوتی۔" سردار کے بیٹے نے کہا۔

"وہ چور بھی تھا اور ڈاکو بھی" میں نے برہمی سے کہا "اس زیور کے لئے وہ ہماری جان لینا چاہتا تھا۔"

سردار نے اپنے سپوت کی معرفت کہا "آخر تم لوگوں کے پاس اتنا سونا کہاں سے آیا؟"

میں نے جواب دیا "تمہیں یہ سوال پوچھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ ہماری جائز ملکیت ہے۔"

اس نے کہا "تم اتنے امیر آدمی نہیں ہو۔ تم نے بھی یہ کسی سے چھینا ہوگا۔"

میں نے غصے کو پی کر کہا "اس بحث سے کیا حاصل ہوگا آخر؟ نورل کی موت سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تم لوگ سمجھتے ہو کہ تمہارا نقصان ہوا ہے تو ہم یہ زیور تمہیں دے سکتے ہیں۔"

ولی عہد نے ہماری فراخدلانہ پیشکش سے سردار کو آگاہ کیا تو اس کی جذباتی کیفیت ایک دم بدل گئی۔ وہ نورل کی موت پر جتنا مغموم اور مشتعل نظر آتا تھا اب اتنا ہی مطمئن اور مسرور نظر آنے لگا۔

"والد صاحب پوچھتے ہیں کہ یہ سب تم کس کو دوگے۔ سارے قبیلے کو؟"

میں نے کہا "والد صاحب کی خدمت میں عرض کرو کہ ہم یہ سب ان پر چھوڑتے ہیں۔ اس کی تقسیم وہ خود کریں۔ چاہیں تو سب اپنے پاس رکھیں۔ قبیلے کو محض حکم دیں کہ نورل کی مغفرت کے لئے دعا کی جائے کیوں کہ وہ گناہ گار اور دوزخی تھا۔ آدھا اپنے پاس رکھ کے باقی آدھا سب میں بانٹ دیں یا انصاف اور مساوات کے اصولوں کی پاسبانی مطلوب ہو تو سب کو برابر حصہ دیں۔"

ولی عہد نے جو صورت سے بھی اور فاتر العقل لگتا تھا' میری بات پر کافی دیر غور کیا اور مطلب سمجھ لینے کے بعد والد صاحب کو متن کا خلاصہ پیش کیا۔ والد صاحب کی بتیسی نظر آنے لگی اور انہوں نے سونے کے ڈھیر کو اپنے قبضے میں کرلیا۔

"مہمانوں سے کہو کہ وہ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ قبیلہ ہمارے حکم کے تابع ہے۔"

میں نے کہا "مجھے قبیلے کے نوجوانوں کا رویّہ خاصا باغیانہ لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری حمایت کے جرم میں سردار کا تختہ الٹ جائے۔"

یہ بات سمجھنا ولی عہد کے لئے دشوار ثابت ہوا کہ تختہ کیسے الٹا جاتا ہے مگر اس کے والد صاحب کی ناقص عقل میں تو یہ بات ہی نہیں آئی کہ بغاوت کا علم کیوں اور کیسے بلند کیا جاتا ہے اور سرداری کے منصب پر ان کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد ولی عہد کے سوا کوئی دوسرا شخص کیسے فائز ہوسکتا ہے۔

غالب نے کہا۔ "یار ان کو سب سمجھانے کی کیا ضرورت ہے؟"

نازو نے کہا "سردار کی ضمانت کافی ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک اندیشے کا اظہار کر رہا ہوں۔ ممکن ہے نوجوان' سرکش خون میں اطاعت کا موروثی جذبہ کمزور پڑ گیا ہو۔ جیسا کہ ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ غلام بھی اب سر اٹھا کے سوال کرتے ہیں اور اختلاف کا حق مانگتے ہیں۔ ساری دنیا میں......"

غالب نے کہا "دنیا کو گولی مارو۔ سردار سے صاف بات کرو کہ یہ جرمانہ ہی نہیں' معاوضہ بھی ہے۔ وہ ہمیں بہ حفاظت یہاں سے نکالنے کا پابند ہوگا اور اگر کسی قسم کی بدعہدی ہوئی تو عین ممکن ہے کہ قبیلے پر اس کے خاندان کی حکومت کا دور ختم ہو جائے اور رعایا جمہوری روایات کے مطابق اپنا سردار خود منتخب کرلے۔"

"جہاں بھی بادشاہت اور آمریت ہو وہاں حکمراں موت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا عوام کے جمہوری شعور سے ڈرتے ہیں۔" نازو نے ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت بیان کی۔

میں دنگ رہ گیا "نازو! یہ اچانک تمہارے وجود میں کس کی روح حلول کرگئی ہے! برٹرنڈ رسل کی۔ یہ تم بول رہی تھیں؟"

غالب نے کہا "پتا نہیں کب کالج کی کسی تقریب میں کوئی تقریر کی ہوگی۔ اس کا ایک جملہ یاد رہ گیا۔"

خلاف توقع نازو نے برا ماننے کے بجائے مسکرا کے کہا "ہاں۔ رات بھر جاگ کے تقریر یاد کی تھی۔ بڑی مشکل سے۔ اور پھر بھی عین وقت پر گڑبڑ ہوگئی تھی۔"

"کیا؟ مخالفت میں بولنا تھا اور موافقت میں دلائل دے دئے تھے۔"

نازو نے جھینپ کر کہا "کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔"

میں اور غالب ہنسنے لگے۔ سردار اور ان کا ہونہار بیٹا ہمیں بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہے۔ ان کے لئے اس صورت حالات میں لطیفے جیسی کوئی بات نہ تھی کہ ہم نے یکے بعد دیگرے تین قتل کر ڈالے تھے اور پھر ہنسی خوشی سونے کا ایک ڈھیر جرمانے کے طور پر پیش کردیا تھا۔ جب کہ ہمارے لئے کشتوں کے پشتے لگا کے لاشوں پر سے اپنا راستہ بنانا بھی مشکل نہ تھا۔ ہم ایسے مجرم ثابت ہوئے تھے کہ ہم نے جرم کی سزا بھی رضاکارانہ طور پر قبول کی تھی۔ وہ بھی خود

اپنی عدالت کے فیصلے پر۔

آخر کار تمام تصفیہ طلب امور پر اتفاق رائے ہوگیا اور سردار نے ہم سے معاہدہ کرلیا کہ وہ ہمیں اس لانچ تک پہنچا دے گا جو نورل کی ملکیت تھی۔

"ابا بولتی کہ ہم رات کو جاتی۔ کسی کو معلوم نہ ہوتی۔" ولی عہد نے کہا۔

"یعنی ہم خاموشی سے وہ لانچ لے کر فرار ہوجائیں۔ قبیلے کو کچھ پتا نہ چلے؟" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی "ہم آپ کو لے جاتی اور لانچ دکھاتی۔ لانچ چلاتی۔ واپس آتی۔"

میں نے سرہلا کے کہا "اللہ آپ کو جزا دیتی مگر یہ بھی بتادو کہ تم نے اور والد صاحب نے اس دولت کی تقسیم کے لئے کیا اصول وضع کیا ہے؟ مقتولین کے ورثاء کو بھی کچھ ملے گا یا نہیں؟"

غالب نے کہا "آخر آپ کیوں متفکر ہیں کہ ہمارے جانے کے بعد کیا ہوگا؟ حق اور انصاف کے معاملات پر غور مت فرمائیں۔ صرف اپنے بارے میں بات کریں۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "تم مجھے خود غرضی اور کمینگی سکھا رہے ہو دوست۔ مجھے اپنے جیسا بنانا چاہتے ہو۔"

"اس وقت یہ بقا کی جدوجہد ہے" غالب نے کہا "یہاں اصول' اخلاق پر کوئی مذاکرہ یا سیمینار نہیں ہوسکتا۔"

سردار سے مذاکرات ختم ہوئے تو صورت حال میں بڑی ڈرامائی تبدیلی رونما ہوئی۔ سردار نے پہلے تو ولی عہد کو زبانی ہدایات دے کر کہیں بھیجا۔ غالباً سونے کے زیورات کی پوٹلی کو چھپانے کے لئے اور عوامی جذبات کا رخ بدلنے کے لئے۔ سردار ایک کامیاب سیاست داں تھا اور اپنے ولی عہد کی تربیت اس طرح کررہا تھا کہ بعد میں وہ عنانِ حکومت سنبھالے تو اتنا ہی بااختیار ہو جتنا صدرِ امریکا ہوتا ہے۔ فرق صرف برسرِاقتدار آنے کے طریقے کا تھا لیکن سیاست کی بساط کے اصول وہی تھے۔ پیادے یہاں بھی آگے رہ کر مرتے تھے۔ وزیر سے فیل تک سب شاہ کی حفاظت کرتے تھے اور شاہ کے لئے صرف مات تھی۔ موت نہیں۔

سردار نے بڑی عیاری سے اپنی رعایا کو یقین دلایا کہ نورل درحقیقت ایک شیطان تھا جس نے فرشتے کا روپ دھار لیا تھا۔ سردار پہلے بھی جانتا تھا کہ نورل کس طرح ان جاہل اور غریب انسانوں کی محنت' جان و مال اور عزت کی سوداگری سے اپنے ہوس کے خزانے بھرتا ہے مگر وہ خود اس کا شریک کار تھا چناں چہ نورل کا کوئی جرم نہیں تھا مگر وہ نہیں رہا تو سردار نے اس کی لاش پر سیاست کی۔ اسے بدترین اخلاقی مجرم ثابت کردیا اور اس کو قتل کرنے پر ہمیں غیبی نجات دہندہ کی حیثیت عطا کردی۔

اس نے قبیلے کے لوگوں پر اپنی خطابت سے جادو کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب جو کچھ دیر پہلے ہماری جان کے درپے تھے' ہماری عقیدت میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ ہمارے ہاتھ چومنے لگے اور پیر پکڑنے لگے۔ گل اور نازو نے بھی یہ تماشائے حیرت بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ میں اور غالب' سردار کی ساحری اور قبیلے والوں کی سادگی پر حیرانی اور افسوس کے جذبات کا شکار رہے۔ حالاں کہ جو تماشا اس چھوٹے سے دور افتادہ نیم وحشی قبیلے میں ہوا تھا' وہی ترقی یافتہ' مہذب اور بڑے ممالک کی سیاست میں بھی ہوتا تھا۔

نورل کے اخلاقی جرائم کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کے لئے دنیاوی قوانین کے تحت دی جانے والی سخت ترین سزائیں بھی ناکافی تھیں مگر ان دو نوجوانوں کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ فرطِ جذبات میں وفاداری پر زندگی قربان کر بیٹھے تھے۔ اس کے باوجود انہیں کچھ نہ ملا۔ نہ کوئی شجاعت کا تمغہ' نہ وفاداری کا انعام' نہ ستائش اور نہ کوئی اعزاز۔ الٹا وہ مجرم کی حمایت کرنے والے ملعون اور بدبخت قرار دئے گئے۔ قبیلے کی روایات کے مطابق انہیں آخری رسوم سے محروم کرکے ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا اور زمین برابر کرکے اس جگہ ایک کانٹے دار پودا لگادیا گیا جس کے پھل کو چھونے سے بھی خارش ہوجاتی تھی۔ یہ گویا ان کی روح کے لئے بعد از مرگ آزار کا اہتمام تھا۔

نورل کے بغیر اس کا ایوانِ صدارت خالی خالی اور سونا محسوس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی بدروح اچانک کسی گوشے سے نمودار ہوجائے گی اور دیکھتے ہی دیکھتے حالات پھر پلٹا کھائیں گے تو قبیلہ ہمارے خون کا پیاسا ہوجائے گا۔ قبیلے کے محکوم و مجبور لوگ انسان سے زیادہ کٹھ پتلیاں تھے جو نورل کے' سردار کے' ہمارے' مافوق الفطرت طاقتوں کے اور سفلی قوتوں کے اشاروں پر چلتے تھے اور ان کی اطاعت کے جذبات کا رخ ایک سمت سے دوسری سمت اور پھر پہلی سمت میں ہوسکتا تھا۔

شام تک ہم نے عجیب سی اعصابی بے کلی میں وقت گزارا۔ گل اور نازو سونے کی کوشش کرتی رہیں یا خاموش بیٹھی خلا میں گھورتی رہیں' میں اور غالب باری باری پہرا دیتے رہے اور کسی نامعلوم خطرے سے مقابلے کے لئے مستعد رہے۔ میرا دل سکون سے محروم تھا اور تحفظ کا وقتی احساس میرے اطمینان کو خود فریبی کی طرح لگتا تھا۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے۔ کھانے کی خواہش کا اظہار کسی نے بھی نہیں کیا تھا ورنہ وہاں سب کچھ میسّر تھا۔

میں نے کہا "گل بانو! اتنی اداسی کس لئے؟"

وہ زبردستی مسکرائی "خوش ہونے کی بھی تو کوئی بات نہیں سکندر بھائی۔"

"خوشی کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ خوشی خیالوں کے سمندر کا موتی ہے" میں نے کہا "جیسے ہر سمندر میں ہر جگہ موتی نہیں ملتے ایسے ہی سب خیال خوشی نہیں دیتے مگر تم چاہو تو اداس کرنے والے خیالوں اور مایوسی کے سمندروں سے دور رہ سکتی ہو۔"

"صرف میں......؟"
"نہیں۔ ہم سب.... گمبات وہی ہے کہ گزرے ہوئے کل کو مت یاد کرو۔ آنے والے کل کے سنہرے سپنے دیکھو۔ خوش آئند مستقبل کی توقعات کا دامن امید سے اور امید کا یقین سے باندھو۔ خوب صورت خواب آنکھوں میں بسالو۔"
"اور کل جب آنکھ کھلے۔ اور تلخ حقیقت کا سامنا ہو؟" نازو نے کہا۔
غالب نے ہنس کے کہا "بابا' کل اگر نصیب میں رونا ہے تو پھر کل روئیں گے۔ آج ہی سے رونی صورت بنا کے کیا ملے گا۔ آج کی جھوٹی ہنسی بھی بہتر ہے۔"
میں نے کہا "نازو بی بی! چلو تم کچھ ثواب کماؤ۔ بزرگوں کی خدمت کرو۔ کافی بنا کے لاؤ۔"
گل مسکرائی "یہ بزرگی کا دعویٰ کیوں۔ کافی تو ویسے بھی مل جاتی۔"
غالب نے کہا۔ "بڑے تو ہم ہیں تم دونوں سے۔ پس تمہارے بزرگ ہوئے۔"
"ایسے بزرگوں کی تو خدمت نہیں' اچھی خاطر تواضع کرنی چاہئے" نازو نے اٹھے بغیر کہا "کبھی مرد بن کے حکم چلاتے ہیں کبھی بزرگ بن کے خدمت کراتے ہیں۔ چلو جاؤ خود کرو اپنا کام۔"
"کرلیں گے۔ تم کیا سمجھتی ہو' ہم محتاج ہیں تمہارے" غالب نے اٹھتے ہوئے کہا "تمہیں کمپلیکس ہے۔"
"کمپلیکس تمہیں ہے۔"
"ہم تو کل بھی کسی کے سرتاج' مجازی خدا وغیرہ ہوں گے۔ تم ہی رہوگی پاؤں کی جوتی۔ کنیز اور خادمہ۔ ہمارا کیا ہے بابا۔ چار رکھ سکتے ہیں" غالب نے دوسرے کمرے سے کہا
"ہاں۔ہاں۔ رکھ لینا۔ مجھے کیا سناتے ہو۔ چاروں کی غلامی کرنا۔ سب کے جوتے کھانا۔" نازو نے چلا کے کہا۔ "ہر ایک کے ہوں بارہ بچے تو اڑتالیس کو سنبھالنا۔"
"اڑتالیس کیوں؟ ہائے تنخری ہوگی۔ تم کر سکتی ہو؟ آئی ہیں ہمارا مقابلہ کرنے" غالب نے بھی چلا کے جواب دیا۔
گل کو بے اختیار ہنسی آئی۔ اس سے پہلے کہ نازو مزید گل افشانی کرتی' غالب نے ایک چیخ ماری۔ میرا خیال تھا کہ اس کا ہاتھ جل گیا ہوگا یا کوئی ایسی ہی بات ہوگی۔ میرے ساتھ نازو نے بھی دوڑ لگائی۔ لیکن غالب مزے سے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔
"یہ کیا حرکت فرمائی تھی؟" نازو نے کہا۔
"ایک کاکروچ آگیا تھا" غالب نے کہا
"کاکروچ دیکھ کے ایسے چیخ مارتے ہیں؟"
"پھر کیسے چیخ مارتے ہیں؟" غالب بولا "ہم نے تو کبھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ آپ نے چھپکلی دیکھ کے ایسی چیخ کیوں ماری یا ویسی چیخ کیوں ماری۔ اور مجھے کاکروچ دیکھے بغیر بھی چیخ مارنے کا حق حاصل ہے۔ یہاں۔" اس نے ایک اور چیخ ماری۔
باہر سے کسی نے بدحواسی میں چلا کے کہا "کیا ہوئی؟ آپ کاہے کو چلائی۔"
میں نے واپس جا کے دیکھا تو سردار کا بیٹا ہونق صورت بنائے کھڑا تھا "فکر کی کوئی بات نہیں۔"
اس نے اطمینان کا سانس لیا "ہم سمجھتی سانپ کاٹ لیتی۔ ہمارا باپ صاحب ادھر آئی۔"
میں نے کہا "تمہارا باپ۔ سانپ۔ کیا کہہ رہے ہو؟"
وہ جھینپ کر بولا "ہم پوچھتی آپ سردار کو دیکھتی؟"
میں نے کہا "نہیں۔ وہ تمہارے پیچھے ہی گیا تھا۔ اس کے بعد سے نظر نہیں آیا۔"
"ہم بہت دیکھتی۔ کہیں نظر نہیں آتی" وہ پریشانی سے سرہلا کے بولا۔
نہ جانے کیوں مجھے شک ہوا کہ اس کی پریشانی مصنوعی اور بے سبب ہے۔ سردار کا دو تین گھنٹے نظر نہ آنا کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ تشویش کا شکار ہو جائے۔ وہ ادھر اُدھر کہیں بھی جا سکتا تھا۔ جنگل دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور ابھی رات نہیں ہوئی تھی کہ اس کے بارے میں فکر کی جائے۔
میں نے کہا "ہو سکتا ہے وہ کسی کام سے چلا گیا ہو۔"
"کام سے جاتی؟" وہ چونکا۔
"ہاں۔ کیا سردار کبھی کسی کام سے نہیں جاتا؟"
غالب نے کہا "ممکن ہے وہ ہمارے ہی کام سے گیا ہو۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ نوبل کی کشتی اپنی جگہ پر ہے یا نہیں۔"
وہ مسکرانے لگا "آپ ٹھیک بولتی۔ وہ آپ کا کام کے لئے جاتی۔"
اس کے جانے کے بعد غالب نے مجھے کافی کا مگ تھما کے کہا۔
"یہ نوجوان آخر کیا ہے! حد سے زیادہ احمق یا عیار؟"
"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"
"اس کی بدحواسی دیکھی تم نے؟"
"وہ بہت خوف زدہ سا لگتا تھا۔ مگر خوف کو چھپانے کی کوشش بھی کر رہا تھا" نازو نے کہا۔
"بہت عجیب لگا مجھے اس کا رویہ" میں نے کہا "وہ نروس بھی تھا۔"
رات کو وہ پھر ذرا سی دیر کے لئے نمودار ہوا تو پہلے سے بھی زیادہ گھبرایا ہوا اور پریشان حال تھا۔
میں نے کہا "آپ کے والد ماجد کا کچھ پتہ نہیں ملا؟"
اس نے کہا "نہیں.... ہاں.... وہ جنگل میں جاتی۔ اس کو سانپ کاٹتی۔"
غالب بولا "کیا.... سردار کو سانپ نے کاٹ لیا؟"
میں نے کہا "سانپ زہریلا تھا؟ سردار کی حالت تو ٹھیک ہے

نا؟"

اس نے پھر کہا "نہیں ۔۔۔ ہاں۔ ابھی ہم تم کو لے جاتی تھوڑی دیر میں۔ تم تیار رہوتی۔ ہم ابھی آتی۔"

اس کا رویہ اتنا پُراسرار اور مشکوک ہوگیا تھا کہ میں متفکر ہوگیا۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی دبے پاؤں غائب ہوگیا۔ وہ ہمیں یہ بتانے آیا تھا کہ ہم تیار رہیں مگر خود ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھا جو میں نے اخلاقاً پوچھ لئے تھے۔ میرا مقصد نہ تفتیش تھا اور نہ مجھے سردار کی گمشدگی پر تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت تھی مگر سردار کے بیٹے نے بلا ارادہ انکار اور پھر اقرار سے میرے شکوک کو تقویت پہنچائی۔

"آخر یہ چکر کیا ہے؟" غالب کے ذہن میں بھی شاید وہی بات تھی جو میں سوچ رہا تھا "کیا ہوا ہے سردار کو؟"

"کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے" نازو نے کہا "سردار خیریت سے نہیں ہے۔"

"اس کا بیٹا ہم سے کیوں چھپا رہا ہے؟ کسی مملکت کے سربراہ' اہم سیاسی یا کاروباری شخصیت کی علالت کو بعض اوقات مصلحتاً چھپایا جاتا ہے" میں نے کہا "ملک کے اندر اور باہر کی صورت حال کو دیکھا جاتا ہے۔ موت کے اعلان سے پیشتر بھی انتظامی امور اور سیاسی لائحۂ عمل طے کر لئے جاتے ہیں۔ مگر ایک چھوٹے سے قبیلے کے سردار کی بیماری یا موت کو کیسے چھپایا جا سکتا ہے۔"

"اس کی ضرورت بھی کیا ہے ــ یہ تو ولی عہد کے لئے خوش خبری ہے کہ عزرائیل کی مدد سے وہ سرداری کے منصب پر فائز ہونے والا ہے ــ یا ہو چکا ہے" غالب نے کہا۔

"اتنی کم عمری میں قسمت نے اسے مرتبہ اور اختیار بخش دیا ورنہ باپ صاحب کا کیا تھا۔ سو سال زندہ رہتی تو ولی عہد صاحب اسی سال میں تخت نشین ہوتی۔"

"یا باپ صاحب سے پہلے ہی سردار بننے کی حسرت دل میں لئے دنیا سے جاتی" نازو نے کہا۔

"خیر ہمیں کیا' ہمارے جانے کے بعد کچھ بھی ہو۔ کوئی بھی سردار بنے" غالب بولا۔

"کہیں اس نے باپ صاحب کو قتل تو نہیں کر دیا؟" نازو نے اچانک کہا۔

میں نے کہا "یہ خیال کیسے آیا تمہیں مس نازو۔ اور کیوں؟"

"خیال پر کوئی قدغن نہیں۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرا خیال بے سروپا اور بے بنیاد ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "ولی عہد کے رویّے کو دیکھتے ہوئے میں تمہارے خیال کو منطقی سوچ کا نتیجہ قرار دے سکتا ہوں۔"

گل نے ڈر کے کہا۔ "آخر بیٹا کیوں قتل کرے گا؟"

غالب ہنسنے لگا "تم بہت بھولی ہو گل بانو۔ زر' زن اور زمین کے اسباب ہر دور اور ہر زمانے میں موجود رہے ہیں اور ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے خود ایک سبب فراہم کر دیا تھا۔ وہ اتنا سونا تھا کہ اس کے لئے مہذب اور دولت مند بیٹے بھی خون کے رشتوں کا خون کر سکتے ہیں۔"

گل نے سر ہلایا "شاید ایسا ہی ہو۔"

"لالچ کا یہ ہتھیار خود ہم نے اسے دیا تھا" نازو بولی۔

"ہتھیار خود کسی کو قتل نہیں کرتا" غالب نے برہمی سے کہا۔ "کوئی انسان کی جان نہیں لیتی' انسان لیتا ہے۔ ارادہ اس کے ذہن میں جنم لیتا ہے پھر اس کا ہاتھ ریوالور اٹھاتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا قبیلے والے اتنے بے وقوف ہیں سب کہ سردار کے قتل پر خاموش رہیں گے؛ اس کی موت کو طبعی سمجھ کے قبول کر لیں گے؛ ولی عہد پر کوئی شک نہیں کرے گا؟"

"چھپانا تو ناممکن ہے ۔۔۔" نازو بولی۔

غالب نے جھنجلا کے کہا "یہ کس الجھن اور بحث میں پڑ گئے ہیں ہم۔ نہ ہم اس قبیلے میں ہیں اور نہ ہمارا کوئی تعلق ان معاملات سے ہے۔ کچھ دیر میں ہم چلے جائیں گے اور سب بھول جائیں گے۔ پھر کیا فائدہ یہ سب سوچنے سے۔ ہمارے لئے اتنا کافی ہونا چاہئے کہ بخیر و عافیت یہاں سے نکل جائیں اور کلکتہ پہنچ جائیں۔"

"اور پھر ڈھاکا" گل نے کہا۔

میں نے کہا "اور پھر لاہور۔"

"ہم سب کو اپنی منزلِ مراد کو نظر میں رکھنا چاہئے" غالب نے کہا۔

'شاد باد منزلِ مراد۔ ہاں۔ میرا وطن' میں نے سوچا' میرا گھر۔ میری محبت۔ ان سب کے سوا مجھے اب کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ دنیا کے بکھیڑے بہت لمبے ہیں "کاروبارِ حیات میں الجھاؤ بہت ہیں اور فرصتِ زندگی بہت کم ہے۔ میری زندگی کا ہر لمحۂ گزراں تقاضا کرتا ہے کہ میں اپنی سوچ اور اپنی محبت کو اپنی استطاعت کی حد تک سمیٹ لوں۔ سارے جہاں کے درد کے لئے میرا جگر ہی کیوں۔ اور غمِ جہاں سے آگے فکرِ دو جہاں ہے۔ کائنات کی لامحدود وسعت ہے۔ ستاروں پر کمند ڈالنے کے لئے تو عمرِ خضر بھی کم ہے مگر وہ جو میری تقدیر کا ستارہ ہے۔ وہ مجھے بلاتا ہے۔ کوئی پکارو کہ اِک عمر ہونے آئی ہے۔ کہیں تو قافلۂ صبح و شام رک جائے۔

میرے منتشر' بے سمت خیالوں کا سفر یکلخت ختم ہوگیا۔ سردار کے بیٹے نے اندر آ کے کہا "ابھی سب چلتی۔"

میں نے گل اور نازو کی طرف دیکھا "کیا خیال ہے' چلیں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" گل نے کہا۔

"پوچھا اس لئے کہ شاید تمہیں تیاری کرنی ہو۔"

"گویا ہم مرے ہوئے چلنے کو یہاں سب تیار بیٹھے ہیں۔" غالب نے اٹھ کے اپنی بیلٹ ٹائٹ کی۔

"کیا ہم اسی لباس میں جائیں گے؟" میں نے سردار کے بیٹے سے سوال کیا۔

اس نے کچھ دیر سوچ کے نفی میں سر ہلایا "آپ امیر نظر آتی' راستے میں خطرہ ہوتی۔ کوئی لوٹ لیتی۔"

"ہم غریب کیسے نظر آتی؟" غالب نے کہا۔

ولی عہد نے ہمیں مفید مشوروں سے نوازا اور کہا کہ اگر ہم تلاش کریں تو ہمیں اسی گھر میں ایسے کپڑے مل جائیں گے جن میں ہم اجنبی نہیں لگیں گے۔

"چیف کے تو" غالب نے کہا "کیا یہ ہمیں مشورہ دے رہا ہے کہ ہم بھی صرف منی لنگی کا فیشن اختیار کرلیں؟"

"منی لنگی" گل ہنسنے لگی۔

"ہاں۔ لنگی کم سے کم ٹخنوں تک پہنچتی ہے۔ یہاں کمر سے شروع ہو کے گھٹنوں سے پہلے ختم ہو جاتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "سنگل پیس سوٹ۔"

"کیا خرابی ہے اس میں؟ ٹارزن بھی تو ایسے ہی سوٹ پہنتا ہے اور بہت اسمارٹ نظر آتا ہے" نازو نے کہا۔

میں نے کہا "مگر غالب اور ٹارزن میں بہت فرق ہے۔"

"چلو میں نہیں لوں گا منی لنگی۔ یہ بھی پہن سکتی ہیں یہاں کے فیشن کی منی ساری جس میں بلاؤز نہیں ہوتا" غالب نے کہا۔

نازو نے جھینپ کے کہا "فضول باتیں مت کرو۔"

گل نے مسکرا کے اپنی ریشمی ساری کو دیکھا "اس کی جگہ سوتی ساری البتہ باندھی جا سکتی ہے۔"

"ہمیں چاند نکلنے سے پہلے نکل جانا چاہئے" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا "ابھی اندھیرا ہوتی۔"

"ہمیں چوروں کی طرح تاریکی میں چھپ کر فرار ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" غالب نے کہا۔

"کیا ہر بات پر اختلاف بحث اور جرح کرنا لازمی ہے؟" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ آدمی کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے" غالب نے متانت سے کہا۔

میں نے کہا "اصولی طور پر یہ ٹھیک ہے مگر عملاً ہمارے پاس ہر مسئلے پر غور کرنے کے لئے وقت نہیں ہے' اس لئے فوراً تیار ہو جاؤ۔ یہ فیصلہ خود کرو کہ ہمیں کیسا نظر آنا چاہئے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

دس منٹ بعد سب اس حکم کی تعمیل کر چکے تھے اور ہمارے حلئے اس حد تک اطمینان بخش ہو گئے تھے کہ سردار کے بیٹے نے سر ہلا کے اطمینان کا اظہار کیا۔ ہمارا اسباب سفر دو میلی چادروں کی گٹھری پر مشتمل رہ گیا تھا۔ یہ گٹھریاں میں نے اور غالب نے اٹھا رکھی تھیں اور یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ ان گٹھریوں میں لاکھوں روپے نقد اور خطرناک اسلحہ ہوگا۔ ہم نے وہ کپڑے اوپر رکھ لئے تھے جو ابھی اتارے تھے۔ کلکتہ پہنچ کر ہم پھر معزز اور شریفانہ حلیہ اختیار کر سکتے تھے۔ گل اور نازو کے پاس بھی چھوٹی چھوٹی گٹھریاں تھیں مگر ان میں بسکٹ تھے اور کچھ دوائیں۔

ہم تورل کے ویران گھر کے عقبی حصے کو عبور کر کے بستی کے باہر سے گزرے۔ سردار کا بیٹا آگے آگے تھا اور بہت تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ گل اور نازو کے لئے اس تیز رفتاری کا ساتھ دینا مشکل تھا۔ چناں چہ ہم بھی بار بار رکنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ ہم سب نے چپل پہن رکھے تھے اور ہمارے قافلہ سالار کا اصرار تھا کہ آواز نہ پیدا ہو۔ ایک بار تو اس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ہم چپل اتار کے ہاتھوں میں پکڑ لیں اور اس کی طرح ننگے پیر چلیں مگر گل اور نازو سے پہلے ہی میں نے اور غالب نے اس مطالبے کو مسترد کر دیا۔ سردار کا بیٹا اسی جنگل میں پلا بڑھا تھا اور اس کی عمر گزری تھی اسی دشت کی سیاحی میں۔ اس کے پاؤں زمین کی سختی' کنکر پتھر' گھاس پھونس اور کانٹوں کی چبھن کے عادی تھے اور اتنے سخت ہو چکے تھے کہ پیروں کے تلوے بالکل جوتوں کے سول بن گئے تھے۔ ہمارے پاؤں اس راستے پر چالیس قدم چل کے لہولہان ہو جاتے۔ ان کیڑوں مکوڑوں یا سانپ بچھو کے کاٹنے کا خوف الگ تھا جو رات کے وقت جنگل میں آزادانہ پھر رہے تھے۔

قافلے کے لیڈر کو کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ اس نے کئی بار پاؤں زمین پر مارا اور جھٹکا اور کسی نہ معلوم' نظر نہ آنے والے کیڑے مکوڑے کو گالی دی جس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اسے کسی چیز نے کاٹا ہوگا۔

جنگل بہت گھنا تھا اور اس میں راستہ تلاش کرنے میں ولی عہد کا تجربہ اور اس کی حیوانی جبلت کام آ رہی تھی۔ میری نظر کے سامنے چھوٹے بڑے درختوں کی تاریک دیوار کے سوا کچھ نہ تھا اور اندھیرے میں زمین پر کسی پگڈنڈی کے آثار بھی نظر نہ آتے تھے۔

ایک جگہ میں نے اس کو روکا۔ "ذرا آہستہ چلو۔ لڑکیاں پیچھے رہ گئی ہیں۔"

اس نے رک کے اپنا توازن ایک پاؤں پر قائم کیا اور دوسرے پیر کی ایڑی سے کوئی کانٹا نوچ لیا۔ نہ جانے کتنی دیر سے وہ اس کانٹے کی اذیت کو برداشت کرتے ہوئے چل رہا تھا۔

میں نے کہا "تم کو ڈر نہیں لگتا کہ کوئی زہریلا جانور کاٹ لے گا؟"

اس نے دانت نکالے "سانپ کاٹتی۔ بچھو کاٹتی۔"

"سانپ بچھو کاٹتے رہتے ہیں؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

وہ پھر چل پڑا "بہوت کاٹتی۔ اب زہر اثر نہیں کرتی۔"

میں نے کہا "یہاں زہریلے سانپ ہوتے ہیں؟"

اس نے سر ہلایا "بہوت۔ ابھی ہم دیکھتی۔ تم کو دکھاتی۔"

میں نے جلدی سے کہا "نہیں۔ بڑی مہربانی۔ تم خود ہی دیکھو۔ ہمیں مت دکھاؤ۔"

"سانپ آدمی سے ڈرتی۔ اس پر پاؤں رکھتی تو کاٹتی۔" وہ بولا۔ "تم بچ کر چلتی۔"

میں نے کہا "مجھے سانپ نظر آئے گا تو بچ کے چلوں گا نا۔ یہاں سانپ بغیر ہیڈ لائٹ کے پھرتے ہوں گے۔ اندھیرے میں کالا سانپ کون دیکھ سکتا ہے۔"

اس نے ایک دم جھک کے ایک سانپ کی دُم پکڑلی اور اسے جھٹکے سے اوپر اٹھالیا "ہم دیکھتی۔"

گل اور نازو نے ایک چیخ ماری۔ وہ ہم سے چند قدم ہی پیچھے چل رہی تھیں۔ سانپ کو سردار کے بہادر بیٹے کے ہاتھ میں لہراتا بل کھاتا دیکھ کے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ ان کا دہشت زدہ ہونا بالکل جائز تھا۔

غالب نے کہا "یہ کیا حرکت ہے؟"

"یہ سانپ ہے" اس نے گویا غالب کی لاعلمی پر افسوس کا اظہار کیا اور پھر سانپ کو گھما کے پھینک دیا۔

ظاہر ہے اس کے بعد گل اور نازو کی رفتار میں مزید کمی واقع ہوگئی۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی تھیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نیچے دیکھنے کی ناکام کوشش میں بار بار رک جاتی تھیں۔ غالب اور میں بھی کم خوف زدہ نہ تھے مگر مجبور تھے کہ بے خوفی کا اظہار کریں اور ان کا حوصلہ بڑھائیں۔ گھاس کا پتہ بھی سرسراتا تھا تو کبھی گل چیخ مارتی تھی، کبھی نازو پیر کے نیچے کنکر بھی آتا تو وہ اچھل پڑتی تھی۔

غالب نے ان کے ذہن سے خوف دور کرنے کے لئے دوسری باتیں شروع کردیں "ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ اس ڈر کا۔"

"کیا مطلب۔ کیسا ناجائز فائدہ؟" نازو نے کہا۔

"اس بہانے تم بار بار میرے زیادہ قریب آنے کی کوشش کررہی ہو۔ ایسی حرکت میں کرتا تو تم فوراً الزام لگاتیں۔"

"بے ہودہ کہیں کے۔ تم الزام نہیں لگا رہے ہو؟"

"میں حقیقت بیان کررہا ہوں" غالب نے کہا "اندھیرے کا مطلب یہ نہیں کہ سب اندھے ہوگئے ہیں۔"

"غالب! کچھ شرم کرو۔" نازو بگڑ کے چلائی۔

"شرم میں کروں۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ جو کچھ تم کررہی ہو اس پر میں پانی پانی ہو رہا ہوں۔"

اس کے بعد یہ ہوا کہ نازو اپنا ڈر، خوف بھول گئی اور مشتعل ہو کے اس نے ایک دم غالب کو اٹھالیا۔ دوسرے ہی لمحے غالب ہوا میں اڑتا ہوا ہمارے قافلہ سالار پر گرا۔ پھر وہ دونوں نیچے گرے۔ غالب تو خیر کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہوگیا مگر سردار کے بیٹے پر تو جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ نازو کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اچانک اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

"تمہارا..... عورت تم کو مارتی؟" وہ اپنی حیرت پر قابو پا کے بولا۔

"کیا تمہاری عورت تمہیں نہیں مارتی؟ کمال ہے!" غالب نے بھی حیران ہو کے کہا "اس کا مطلب ہے وہ تم سے محبت نہیں کرتی۔"

اس کی حیرت مزید بڑھ گئی "جو عورت محبت کرتی وہ مارتی؟"

غالب نے آہ بھر کے کہا "جان لے لیتی ہے میاں یہ محبت تو۔ اور عشق میں کیا نہیں ہوتا۔ اب چلو۔ میں تمہیں قیس اور کوہ کن کے بارے میں بتاتا ہوں کہ وہ کیسے مارے گئے۔ غالب کا ایک شعر ہے......"

ظاہر ہے ہمارا لیڈر دم بخود وہ سب سننے پر مجبور تھا جو اس کی سات پشتوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ غالب کی باتوں پر مجھے بھی ہنسی آرہی تھی، نازو اور گل کا تو ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ غالب کی زبان بے لگام ہوگئی تھی اور وہ جو منہ میں آرہا تھا کہتا جارہا تھا۔ درمیان میں وہ کبھی اچانک اپنے مخاطب سے کوئی سوال کر بیٹھتا تھا یا کوئی فرمائش کہ تمہیں معلوم ہے شیکسپیئر میٹرک پاس بھی نہیں تھا۔ اچھا نہیں معلوم۔ تو شیخ سعدی کا کوئی شعر سناؤ۔ اس نے اپنا ایک خواب بیان کیا (ظاہر ہے اس میں نازو کا بہت اہم کردار تھا) اور ایک خاندانی شجاعت کا واقعہ جس میں اس کے پردادا کی ایک آدم خور شیر سے پنجہ آزمائی کا ذکر تھا۔ جب شیر ہار گیا تو غائب ہوگیا۔

"غائب ہوگئی؟ کیوں؟"

"شرم کے مارے۔ دراصل وہ ایک بھوت تھا" غالب بولا۔

"بھوت کون ہوتی؟"

"بھوت۔ ایک تو میرا سسر ہے۔ فادر ان لا بلکہ آؤٹ لا" غالب نے کہا۔

غالب اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ جنگل کا باقی راستہ ہنستے کھیلتے کٹ گیا تھا اور خوف جو سب کے اعصاب پر سوار تھا، ایسے ختم ہوگیا جیسے کسی عامل کے عمل سے جن اتر جاتا ہے۔ دروغ برگردن راوی۔ یہ تماشا میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

دریا یوں ہمارے سامنے آیا کہ ایک لمحے کے لئے ہم سب حیران رہ گئے۔ گھنے درختوں کا پردہ ہٹتے ہی ہم نے گدلے پانی کی دھندلی چمک دیکھی اور لہروں میں چاندنی کو جھلمل کرتا دیکھا۔ دریا کی روانی میں بڑا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دریا خوابیدہ ہے اور نیند سے بوجھل دھارا آنکھیں موندے بہہ رہا ہے۔

دریا کے کنارے، پانی کے اوپر قوس کی شکل میں جھکے ہوئے درخت کے ساتھ ایک کشتی بندھی ہوئی تھی۔ دیکھنے میں یہ بہت چھوٹی کشتی لگتی تھی مگر ہم قریب پہنچے تو اس کے ایک کنارے پر لگا ہوا چھوٹا سا انجن بھی نظر آگیا۔ یہ موٹر بوٹ تھی جس میں چھ سے آٹھ افراد بہ آسانی سفر کرسکتے تھے۔

میں نے پہلے کشتی میں چھلانگ لگائی اور اپنا توازن قائم کرکے کھڑا ہوگیا۔ غالب نے باری باری گل کو اور نازو کو ایک ہاتھ سے سہارا دے کر آگے بڑھایا۔ انہوں نے ڈرتے اور چیختے چلاتے دوسرا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں نے انہیں کھینچ لیا۔

نازو کی حالت دیکھ کے مجھے ہنسی آئی "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کانپ کیوں رہی ہو؟"

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے پانی سے۔"

"پہلے بھی تم ایک بحری جہاز پر رہی ہو۔"

"یہ بحری جہاز نہیں ہے۔ ڈوبنے والی کشتی ہے۔ دیکھو کیسے ڈول رہی ہے" نازو نے کہا۔

گل نے گھبرا کے کہا "یہ کشتی ڈوب جائے گی؟"

غالب نے جمپ لگائی تو کشتی کا توازن پھر بگڑا۔ نازو نے اور گل نے ایک ساتھ شور مچایا "دماغ خراب ہے کیا۔ ڈبو دو گے سب کو۔"

"ڈوبیں گے تمہیں تمہارے اعمال۔" غالب ہنس کے بولا۔ "اور جناب یہ تو ہے پانی۔ ہمیں تو اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ تمہارے ساتھ۔"

"تم ڈوبو شوق سے۔ چلو بھر پانی کافی نہیں تو یہاں موقع ہے۔" نازو نے کہا۔

"اس پر بھی عرض کیا ہے کہ ہم جو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ ویسے تمہارے ساتھ ڈوبنے سے زیادہ تیرنے میں مزہ ہے۔ اپنے گھر میں ایک سوئمنگ پول بنوائیں گے اور جب ایسی ہی چاندنی رات ہو گی نا....."

"غالب! میں پھینک دوں گی پانی میں۔"

"ذرا پھینک کے دکھاؤ۔ ساتھ لے کر نہ جاؤں تو غالب نام نہیں۔" غالب نے ڈھٹائی سے کہا۔

اسی وقت ہمیں یہاں تک لانے والے جوان لڑکے نے ساحل سے ایک سوٹ کیس اٹھا کے کشتی میں رکھا۔ پھر ایک پوٹلی اٹھا کے لایا۔ پوٹلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری تو میں نے اسے بری طرح بدحواس ہو کے چونکتے ہوئے دیکھا۔ وہ یوں میری طرف پلٹ کے دیکھ رہا تھا' جیسے رنگے ہاتھوں چوری کرتے ہوئے پکڑا جانے والا دیکھتا ہے۔ بظاہر ایسی کوئی بات نہ تھی مگر میرے ذہن میں نئے شکوک پیدا ہونے لگے۔ اس کا پُراسرار رویہ کسی مجرمانہ خوف کا غماز تھا۔

"ابھی..... ہم چلتی۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے کہا۔

"چابی.... چابی....."

"کیسی چابی؟ یہ انجن اسٹارٹ کرنے کیلئے کسی چابی کی ضرورت پڑتی ہے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا اور دیوانہ وار اپنی واسکٹ کی ہر جیب دیکھنے لگا۔ میں نے غور کیا تو مجھے موٹر بوٹ کے ساتھ منسلک زنجیر نظر آئی جو پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور زنگ لگنے کے باعث گدلے پانی میں دکھائی بھی نہ دیتی تھی۔ اس زنجیر کا ایک حصہ کشتی کے ساتھ ویلڈ کر دیا گیا تھا اور دوسرا حصہ درخت کے قریب شاید کسی ہک میں لگا ہوا تھا یا اس کے تنے پر لپیٹ دیا گیا تھا۔ چابی اس تالے کی تھی جو کنارے پر زنجیر کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ نورل نے کشتی کی حفاظت کے لئے صحیح انتظام کیا تھا۔

"چابی گر گئی۔ اب کیا ہوتی۔" وہ سخت پریشان ہو کے بولا۔

"تالا توڑ دو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"اتنا بڑا تالا ہوتی۔" اس نے اپنے بند ہاتھ کی مٹھی دکھا کے کہا۔ "اف۔ ہم اب مرجاتی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی چابی گر گئی ہے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ زنجیر توڑ دو۔ اکھاڑ لو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا۔ "آپ دیکھتی۔ کتنا موٹا زنجیر ہوتی۔ ہم اس کو....."

اچانک وہ خاموش ہو گیا اور ایک ہاتھ کان پر رکھ کے کچھ سننے لگا۔ اس کی صورت پر وحشت اور دیوانگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

"آپ کچھ کرتی۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "ورنہ وہ سب آجاتی۔ ہم کو مارتی۔ آپ کو مارتی۔"

"کون؟" میں نے کہا۔

"آپ سنتی؟ ادھر سے آواز آتی۔ یہ ظالم لوگ ہوتی۔"

میں نے رات کی خاموشی میں آوازوں کا ایک شور سا سنا جو آہستہ آہستہ واضح ہونے لگا تھا۔ "یہ..... تمہارے قبیلے کے لوگ ہیں۔؟"

"ہاں۔ یہ ہم کو مارتی۔ تم کو مارتی؟" وہ رونے پر آگیا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ "ادھر سے نہیں جاتی تو مرتی۔"

گل اور نازو کے علاوہ غالب کو بھی اس شور نے متوجہ کر لیا تھا۔ یہ کسی غول بیابانی کے چیخنے چلانے کی آوازیں تھیں۔ وہ برہم تھے اور ان کی پُراشتعال صداؤں میں غصہ تھا۔

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تمہارا قبیلہ کیسے ہمارے پیچھے آگیا؟" غالب نے کہا۔

"کیسے کی بات نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیوں؟ کیا اعتراض ہے ان کو ہمارے جانے پر؟ ہم ان کے قیدی تو نہیں تھے۔ اور اگر تم نے ہماری مدد کی ہے تو کوئی جرم نہیں کیا۔ تمہارے باپ نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں کلکتہ پہنچا دے گا۔ اس سے پہلے نورل نے یہی وعدہ کیا تھا۔ اب کون سی ایسی بات ہو گئی ہے؟"

"آپ جلدی کرتی۔ خدا کا واسطے۔ زنجیر توڑتی۔ ورنہ ہم' آپ' سب مرتی۔" وہ میرے قدموں میں گر گیا اور زار و قطار رونے لگا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا کر رہے ہو تم؟" میں نے کہا۔

غالب نے کہا۔ "یہ اس سے بعد میں پوچھیں گے کہ معاملہ کیا ہے۔ تم زنجیر توڑ دو۔"

"کیسے توڑوں یار؟ اتنی موٹی رسی ہوتی تو بھی مشکل تھا"

غالب نے کہا۔ "گولی مار کے توڑ دو۔ میں کب کہہ رہا ہوں کہ

خالی ہاتھوں سے توڑو۔ جلدی کرو۔ وہ وحشی قریب آگئے ہیں"

میں نے ریوالور نکالا۔ "فائر کی آواز پر وہ سیدھے ادھر آجائیں گے۔"

"وہ ویسے بھی سیدھے ادھر ہی آرہے ہیں۔" نازو نے کہا۔ "ایسا نہ ہو' ہم بچ بچ مارے جائیں۔"

گل نے کانپتے ہوئے کہا۔ "جتنا یہ خوفزدہ ہے' اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔"

میں نے نشانہ لے کر فائر کیا اور زنجیر اس جگہ سے الگ ہوگئی جہاں اسے کشتی کے ساتھ ویلڈ کیا گیا تھا۔ شور اب بہت قریب محسوس ہوتا تھا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی درختوں کے آشیانوں میں خوابیدہ پرندے سہم کر اٹھے اور چیختے چلاتے فضا میں پرواز کرنے لگے۔

"اب کیا ہے بے وقوف؟ انجن اسٹارٹ کرو۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "ورنہ ان کے زہریلے تیروں کا نشانہ بن جائیں گے سب"

"انجن۔۔۔۔ ہم نہیں چلاتی۔" وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں دوڑ کر انجن کی طرف گیا اور اس کی ڈوری پکڑ کر کھینچی۔ انجن خاموش رہا۔ میں نے پھر کوشش کی۔ بار بار کوشش کرنے سے میرا سانس پھولنے لگا۔ ادھر ہماری جان کے دشمن لوگوں کا ہجوم سر پر آپہنچا تھا۔ ادھر انجن اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اچانک سردار کا بیٹا میری طرف بڑھا۔ "یہ لیجئے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی ہتھیلی پر اسپارک پلگ کی کیپ رکھی ہوئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کے جھانپڑ ماروں۔ الو کا پٹھا وہ چیز مٹھی میں دبائے کھڑا تھا جس کے بغیر انجن اسٹارٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات وہ خود بھی جانتا تھا ورنہ وہ کیپ ساتھ لے کر کیوں آتا۔ اب اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ میں کیپ کو تار میں لگاؤں اور انجن کے اسپارک پلگ پر فٹ کروں۔ میں نے تار کو براہ راست پلگ سے جوڑا اور انجن اسٹارٹ ہوگیا۔

موٹر بوٹ مشکل سے بیس گز دور گئی ہوگی کہ قبیلے والے کنارے پر پہنچ گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ پتھر پھینک رہے تھے اور تیر چلا رہے تھے۔ ہمارے آس پاس پانی میں کئی پتھر گرے اور ایک تیر کشتی کی سائیڈ میں لگا۔ میں نے کشتی کے انجن کو ریس دی اور اسے سیدھا رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"سب اپنا سر جھکا کے لیٹ جاؤ۔" میں نے چلا کے کہا۔

"تم کشتی کو سنبھالو۔" ثاقب نے جواب دیا۔

یکلخت سردار کے بیٹے نے ایک بھیانک چیخ ماری "کیا ہوا؟" میں نے پلٹ کے دیکھا۔

"اس کے شانے میں تیر لگ گیا ہے۔" ثاقب نے کہا۔ "رفتار بڑھاؤ۔ وہ پانی میں اتر آئے ہیں۔"

نازو نے کہا۔ "وہ تیر کر ہم تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں"

میں نے کہا۔ "تم بدحواس کیوں ہو تم سب؟ ریوالور نکالو اور فائر کرو۔"

میرے ساتھ ثاقب نے اندھیرے میں نشانہ لے کر فائر کئے۔ کسی گولی کا تعاقب کرنے والوں کے لگنا محض اتفاق ہو سکتا تھا مگر ہم نے فائر جاری رکھے۔ پھر ہمارے ریوالور خالی ہوگئے اور ہم نے محسوس کیا کہ وہ شور بھی ختم ہوگیا ہے جو خون کے پیاسے لوگوں کی دیوانگی کا مظہر تھا۔ یہ عقدہ ابھی وا نہیں ہوا تھا کہ آخر ہم اچانک ان کی نظر میں پھر مجرم کیسے بن گئے تھے۔ سردار نے تو انہیں قائل کر لیا تھا کہ ہم نے نورل کو مار کے ان پر احسان کیا تھا اور وہ اپنی احسان مندی کے جذبات کا اظہار بھی کر چکے تھے۔

جواب بھی ایک دم مجھ پر وحی کی طرح نازل ہوا۔ قبیلے والے ہمارے نہیں' اس شخص کے دشمن ہو رہے تھے جو ان کے سردار کو قتل کر کے فرار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہم تھے تو انہوں نے ہمیں بھی صف مجرماں میں شامل کر لیا تھا۔ ولی عہد بہادر اپنی سلطنت سے بلا وجہ تو فرار نہیں ہو رہے تھے۔ وہ ہمیں چھوڑنے نہیں آیا تھا' اپنا قبیلہ ہی ہمیشہ کے لئے چھوڑ آیا تھا۔ اسی لئے وہ خوف زدہ تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں اسے اپنے قبیلے کی سرداری نہیں سزائے موت ملتی۔

کشتی اب ساحل سے بہت دور آچکی تھی۔ تعاقب کرنے والے بھی بہت پیچھے رہ گئے تھے اور ہم دریا کی روانی کے ساتھ ساتھ خاصی رفتار سے اپنی مسافت طے کر رہے تھے۔

سردار کا بیٹا بھی اب مطمئن اور پُر اعتماد نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر ہم سب کی نظروں کا مقابلہ کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔

آخر کار میں نے کہا "تمہارا قبیلہ بہت پیچھے رہ گیا ہے' اب تم بتا سکتے ہو کہ وہ تمہاری جان کے دشمن کیوں ہو رہے تھے۔ یقیناً اس کی وجہ ہم نہیں تھے۔ ہم انہیں مل کے اور خدا حافظ کہہ کے آتے تو انہیں قطعی اعتراض نہ ہوتا۔ شاید وہ جلوس کی صورت میں ہمیں ساحل تک چھوڑنے آتے اور ان کے جذبات بالکل مختلف ہوتے۔"

سردار کے بیٹے نے فقط سر کو اثبات میں جنبش دی مگر زبان سے کچھ کہنے کے لئے اس کے پاس نہ الفاظ تھے اور نہ ہمت۔

ثاقب نے کہا "تم اس قبیلے کی سرداری کو لات مار کے نکل آئے ہو۔ اس قبیلے سے آئندہ بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔"

"یا ہو گا تو وہی جو مفرور قاتل کا مقتول کے لواحقین سے ہوتا ہے" میں نے کہا "تم کبھی لوٹ کر گئے تو وہ تمہیں اسی طرح جان سے مار ڈالیں گے' جیسے تم نے ان کے سردار کو مارا تھا۔"

اس کا رنگ فق ہوگیا "سردار کو۔۔۔ سانپ کاٹی۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا بھرپور طمانچہ رسید کیا۔ "پھر قبیلے والے سانپ کے دشمن کیوں نہیں ہوئے؟ تمہارے

تعاقب میں کیوں آئے؟ تم کو ڈرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اسے سانپ نے کاٹا تھا تو کیا ہمیں چھوڑنے کے بعد تم سردار کی جگہ لینے واپس جاؤ گے؟" غالب نے اسے پھر کمزا کر دیا۔

میں نے اس کے دوسرا چانٹا مارا "کیا قبیلے والے اتنے بے وقوف ہیں کہ تم میں اور سانپ میں فرق ہی محسوس نہیں کر سکتے؟ تمہیں وہ سانپ سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہی سمجھتے ہیں۔ تم آستین کے سانپ ہو۔ انہیں اپنے سردار کی موت کا صدمہ ہے مگر تمہیں اپنے باپ کو مار کے پچھتاوا محسوس نہیں ہوتا۔"

وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی گرامر کے لحاظ سے مؤنث اردو میں اس نے اعترافِ جرم کر لیا۔ اس نے کہا۔ "میں وہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے باپ سے بھی نفرت تھی۔ جیسے وہ دوسروں کی عورتوں کو بیچ دیتا تھا ایسے ہی وہ میری ماں کو بھی بیچ چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم اسے کتنی دولت ملی تھی مگر مجھے اس دولت کا اندازہ ہے جو مجھ سے چھن گئی تھی۔ اس کو عورتوں کی کمی نہ تھی۔ ہر عورت اس کے لئے صرف عورت تھی مگر میری ماں کا بدل تو مجھے نہیں مل سکتا تھا۔ جس عورت نے مجھے جنم دیا تھا وہ کہیں کلکتہ میں اپنا جسم فروخت کر رہی تھی۔ شاید اب اس قابل بھی نہ رہی ہو کہ جسم بیچ کے پیٹ کی آگ بجھا سکے۔ جسم کی خوب صورتی کا خزانہ اگر مالِ غنیمت کی طرح خرچ کیا جائے اور اسے لُوٹنے والے سیکڑوں ہزاروں ہوں تو وہ زیادہ دن ساتھ نہیں دیتا۔ میں دس سال کا تھا جب وہ چلی گئی تھی۔ آٹھ سال بعد میں تصور نہیں کر سکتا کہ وہ کس حال میں ہوگی۔ کوئی لٹی پٹی روح اور جسم کے ناسوروں سے گلتی سڑتی عورت۔ جو عورت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ بھی سمجھی جاتی ہوگی، جس سے سب نفرت کرتے ہوں گے، دور دور رہتے ہوں گے۔ وہ بھی جو پانچ دس روپے میں اس کے جسم پر حقِ ملکیت حاصل کرنے آتے ہوں گے۔ پھر جب مال پرانا ہو گیا ہوگا تو بھاؤ گر گیا ہوگا۔ پرانی عورت۔ رعایتی ریٹ پر۔ کٹ پرائس سیل۔ تین روپے۔ دو روپے۔ اچھا ایک۔ اللہ کے نام پر آٹھ آنے۔ مگر ایسی ہی عورتیں ہوتی ہیں جن کے جسم غیروں سے ملنے والی شرمناک بیماریوں کو سمیٹتے ہیں اور یہی عورتیں اچھوت ہو جاتی ہیں۔ ان کے قریب جاتے ہوئے بھی لوگ منہ پر رومال رکھ لیتے ہیں۔ وہ سڑک کے کنارے کسی فٹ پاتھ پر پڑی رہتی ہیں۔ کسی کوڑے دان جیسی ریڑھی میں اپنے آتشک زدہ جسم کو داستانِ عبرت بنائے آنے جانے والوں سے رحم نہیں موت مانگتی رہتی ہیں مگر زندہ، صحت مند، پاک صاف انسان انہیں سکے دے کر اللہ سے اور بھگوان سے ثواب اور پُن، رحم اور دیا مانگتے ہیں کہ ان کا ایسا حال نہ ہو۔ جب میں یہ سب سوچتا ہوں تو میرا جسم اور میری روح انگاروں میں جلنے لگتے ہیں۔ میں نے بہت پہلے سوچ لیا تھا کہ پہلے میں اپنی ماں کو تلاش کروں گا اور جب وہ مل جائے گی تو اسے واپس اپنے باپ کے سامنے لاؤں گا پھر میں اپنی ماں کا انتقام لوں گا۔ اس کی نظروں کے سامنے۔ تاکہ کچھ قرار اسے بھی ملے۔ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔ کہتے ہیں دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں سب سے زیادہ انسان رہتے ہیں۔ کئی بار میں نے یہ سوچا کہ اب آٹھ سال بعد میں اسے کیسے تلاش کروں گا اور کیسے پہچانوں گا مگر اس کا جواب ہمیشہ ایک ہی آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خود مجھے نہ پہچانے اور میں اسے دیکھوں تو میرا دل خود پکار کے نہ کہے کہ یہی ہے وہ عورت جس کے وجود کا تو ایک حصہ ہے۔ جیسے چاند اس زمین کا حصہ ہے۔ وہ مجھے چاند ہی کہتی تھی۔ اگر میں چاند تھا تو وہ میری دھرتی ماتا تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے تلاش بھی کر لوں گا اور پہچان بھی لوں گا۔ مجھے کسی مناسب وقت کا انتظار تھا۔ کلکتہ جیسے شہر میں مجھے مزدوری نہیں کرنی تھی۔ کوئی بھی کام نہیں کرنا تھا، سوائے اپنی ماں کو تلاش کرنے کے۔ اگر میں صبح کسی مل یا کارخانے میں کام کرتا اور شام تک مزدوری کرتا تو میرے پاس سونے کے لئے رات کے آٹھ گھنٹے نکال کے کتنا وقت بچتا جس میں یہ کام ہوتا۔ نہیں۔ میں طے کر چکا تھا کہ صبح سے شام تک صرف ایک ہی کام کروں گا۔ رات کے اندھیرے میں صورتیں نظر نہیں آتیں۔ رات کو میں اس کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا تو پہچانتا کیسے۔ یہ صرف دن کے اُجالے میں کیا جانے والا کام تھا۔ لیکن کلکتہ میں کام کئے بغیر کمائے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ اس کام میں کئی مہینے بھی لگ سکتے تھے اور کئی سال بھی۔ اتنا عرصہ زندہ رہنے کے لئے میرے پاس بہت پیسہ ہونا ضروری تھا۔ یہ پیسہ مجھے اسی شخص سے وصول کرنا تھا جس نے میری ماں کے

بدلے میں پیسہ لے کر اپنے خزانے میں جمع کیا تھا۔ نورل جیسا شیطان اس کے ساتھ تھا' اس لئے میں ڈرتا تھا۔ پیسہ ہر وقت میری دسترس میں تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ نورل سے چھپ کر میں کلکتہ میں کہیں بھی نہیں رہ سکتا۔ وہ کسی نہ کسی ذریعے سے مجھے تلاش کر لے گا۔

"جب تم نے نورل کو مار دیا اور اس کے ساتھ ہی میرے باپ کو سونے کا ایک ڈھیر بھی دے دیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں جس وقت کا انتظار کر رہا تھا وہ آگیا ہے اور خدا میرے ساتھ ہے' میرا مددگار ہے۔ اس نے تمہیں میری مدد کے لئے بھیج دیا ہے۔ اس دن جب میرے باپ نے کہا کہ اس سونے کو میرے کمرے میں رکھ آؤ تو میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے وہ سونا دوسری جگہ چھپا دیا۔ میرے باپ کے کمرے میں زمین کے نیچے ایک لوہے کا صندوق دفن ہے۔ اس میں بہت دولت ہے۔ لیکن اس کی چابی نورل کے پاس رہتی تھی۔ خود نورل بھی اپنا پیسہ اسی میں رکھتا تھا۔ کئی بار میں نے دیکھا کہ وہ اس صندوق کو بغیر چابی کے کھول رہا ہے۔ وہ اس پر کوئی منتر پڑھتا تھا یا جادو کرتا تھا۔ وہ جھک کر اپنے ہاتھوں سے کچھ کرتا رہتا تھا اور تالا کھل جاتا تھا (ظاہر ہے وہ نمبر والے تالے کی بات کر رہا تھا جس کے کیمی نیشن کو سمجھنا اس کے لئے مشکل تھا)

"میں نے نورل کی لاش کی تلاشی لی تھی مگر اس کے پاس سے بھی مجھے کوئی چابی نہیں ملی ورنہ میں ان کا خزانہ خالی کر آتا۔ اب تو میں صرف وہی سونا اپنے ساتھ لایا ہوں جو تم نے اسے دیا تھا۔ یہ بھی کم نہیں ہے' اس کے میں مطمئن ہوں۔ میں اسے تھوڑا تھوڑا کر کے بیچوں گا تو شاید کئی سال چلے گا۔"

جب وہ خاموش ہوا تو خاموشی کا پُرافسوس وقفہ آیا۔ گل اور نازو کا دل اس کی داستانِ حیات سن کے پانی ہو گیا تھا اور یہ پانی ان کی آنکھوں میں اشک بن کے اتر آیا تھا۔ دکھ مجھے بھی ہوا تھا اور غالب کو بھی۔ وہ ایک بدبخت آدمی تھا جس کی ماں بک گئی تھی۔ وہ ان سے ہزار گنا بدبخت تھا جن کی مائیں مر جاتی ہیں۔ کئی لاکھ گنا بدبخت تھا کہ اس کی زندگی کی تصویر عبرت اپنے تصور میں دیکھتا تھا اور جینے پر مجبور تھا۔ اس تصور کو زندہ رکھنے پر مجبور تھا۔

آخر کار میں نے کہا "تم نے اپنے باپ کو کیسے مارا؟"

"اس کو مارنا کیا مشکل تھا" وہ بولا "جب وہ کمرے میں آیا اور اس نے صندوق کھول کے دیکھا تو اسے وہ سونا نظر نہیں آیا جو تم نے دیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا اور میں نے کہا کہ ہاں وہ سونا میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے اسے صندوق پھر بند کرنے کی مہلت دے دی۔ وہ بہت بھاری اور مضبوط لوہے کا ڈھکن ہے جس پر وہ سانپ کی طرح کنڈلی مار کے سوتا تھا۔ اس نے صندوق بند کیا اور مجھے گالیاں دینے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی اور اس سے پوچھا کہ تو نے میری ماں کو کتنے میں بیچا تھا؟ اگر تو بتا دے گا تو میں تجھے چھوڑ دوں گا ورنہ تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ جب اس نے میرے ارادے کو میری آنکھوں میں پڑھ لیا تو وہ ڈر گیا اور اس نے مجھے میری ماں کی قیمت بتا دی۔ معلوم ہے یہ قیمت کیا تھی؟ صرف سوا سو روپے۔ سوا سو روپے میں کون بیچ سکتا ہے اپنی ماں کو۔ سوا سو نہیں' سوا لاکھ' سوا کروڑ میں بھی کوئی مجھے میری ماں لا کر دے سکتا ہے؟ ویسے تو ہر عورت ایک ماں ہوتی ہے مگر اپنی ماں ایک ہی ہوتی ہے۔ یہ سن کے میں نے اسے مار دیا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اسے تسلی دی "چلو اب جو ہونا تھا ہو چکا۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔"

میں نے کہا "لیکن ..... یہ بات دوسرے لوگوں کو کس نے بتائی۔ کہ تم نے سردار کو مار دیا ہے؟"

اس نے اپنے آنسو پونچھے اور شانے پر ہاتھ رکھ کے کراہنے لگا "وہ ..... ایک لڑکی دیکھتی۔ اس وقت جب ہم باہر نکلی۔ ہم اس کو بولتی۔ ہم تیرا ساتھ شادی کرتی۔ تو ابھی خاموش رہتی۔"

"تم نے اس لڑکی سے شادی کرنے کا جھوٹا وعدہ کر لیا تھا' جو چشم دید گواہ تھی۔" میں نے کہا "پھر جب تم وہاں سے بھاگ آئے تو اس نے تمہارا راز فاش کر دیا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اب قبیلے کا سردار کون ہو گا؟" غالب بولا۔

"اپنا چاچا ہوتی۔ سردار کا چھوٹا بھائی۔"

گل نے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہاں۔ یہ تو بہت پہلے پوچھنا چاہئے تھا ہمیں" میں نے غالب کی طرف دیکھ کے کہا۔

"ہاں چاند بولتی۔ چندو بولتی" وہ نقاہت سے ہانپنے لگا۔

اس کے شانے سے تیر تو کھینچ کر نکال دیا گیا تھا مگر زخم سے بہنے والا خون ابھی تک بند نہیں ہوا تھا حالانکہ نازو نے اس پر ایک ساری پھاڑ کے مضبوطی سے پٹی باندھ دی تھی۔ اب اس پر کمزوری غالب آ رہی تھی۔ شاید یہ بہت دیر بولنے کا نتیجہ بھی تھا۔ میں نے اسے کشتی میں آرام سے لٹا دیا۔

"ہم راستے میں مر جاتی۔ ماں سے کبھی نہیں ملتی" اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

میں نے کہا "ایسی باتیں مت کرو چندو۔ یہ معمولی زخم ہے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"نہیں۔ ہم مر جاتی۔ تیر میں زہر ہوتی۔"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا کہ تیر کی نوک زہر میں بجھی ہوئی ہو گی۔ معلوم نہیں کیسا زہر تھا اور اس کے اثرات کتنی دیر میں ہلاکت کا سبب بنتے تھے۔ ابھی ہمارے پاس ان چند دواؤں کے سوا کچھ نہیں تھا جو گل نے چلتے ہوئے احتیاطاً رکھ لی تھیں۔ ان میں اینٹی بائیوٹک گولیاں بھی تھیں۔ زخم کو گلنے سے

بچانے کے لئے میں نے اسے ڈبل ڈوز دے دی مگر اس کے باوجود میری تشویش کم نہ ہوئی۔

"چندو! ہم کلکتہ کب تک پہنچ جائیں گے؟"

"صبح۔ اگر کشتی اسی طرح چلتی رہی" نازو نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"چندو نے بتایا تھا مجھے۔ لیکن موٹر بوٹ میں تیل کم ہے۔ نورل تیل کے ڈبے بھر کے ساتھ رکھتا تھا" نازو نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے... ہم آدھے راستے میں کہیں بھی پھنس جائیں گے اور کشتی صرف بہاؤ کے آسرے پر چلے گی۔"

"اس میں چپو بھی تو نہیں ہیں" غالب نے کہا۔

آہستہ آہستہ رات کے ساتھ ستاروں کا قافلہ بھی چلتا گیا۔ چاند ڈھلنے لگا۔ ہم سب جاگتے رہے اور خاموش بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ اس لمحے کا جب تیل ختم ہوگا اور کشتی کا انجن دم توڑ دے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ ہم صبح ہونے تک ایسے ہی بیٹھے رہیں گے؟ صبح شاید کوئی اور موٹر بوٹ یا لانچ ادھر سے گزرے تو ہماری مدد کرے۔

چندو پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کا جسم بخار میں تپ رہا تھا اور ہم اسے خاموشی سے مرتا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کسی ہسپتال میں اس کی جان بچ سکتی تھی مگر ہسپتال کلکتہ میں تھے۔ کسی ڈاکٹر کے اعجاز مسیحائی یا قدرت کی معجزنمائی سے وہ پھر زندگی کی راہ پر گامزن ہو سکتا تھا اور اپنی حسرتوں کی تکمیل اور اپنے مقصد کے حصول کی جدوجہد جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اور اس کے پاس قوتِ ارادی کا سرمایہ بھی تھا مگر شانے کے زخم سے جسم میں اتر جانے والا زہر اس کے عزائم کی ناکامی کا سبب بن رہا تھا۔ اس زخم سے اس کی مدافعت اور مزاحمت یوں ختم ہو رہی تھی جیسے کسی ٹیوب کے پنکچر سے ٹائر کی ہوا ختم ہوتی جاتی ہے۔ پھر وہ ٹائر باقی ٹائروں کی جادہ پیمائی کا ساتھ نہیں دے سکتا اور گاڑی رک جاتی ہے۔

موٹر بوٹ رات ایک بج کر بیس منٹ پر رک گئی۔ اس کے انجن نے چند جھٹکے لئے اور آخری ہچکی کے بعد خاموش ہو گیا۔ ہم سب آدھی رات کے سناٹے میں بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے رہے۔ سبک رفتار دریا کی لہروں پر کشتی یوں بہنے لگی جیسے کوئی لاش سطح آب پر تیرتی ہے۔

غالب نے کہا "یہ بڑی بے وقوفی ہے۔ کشتی میں کم سے کم ایک چپو ہونا چاہئے۔ ایک انجن کا کیا ہے۔ کہیں خراب بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ہونا تو بہت کچھ چاہئے، مثلاً تیل کا فاضل ذخیرہ۔ مگر ہمیں ان مسائل کا اندازہ کہاں تھا۔"

"اس الو کے پٹھے کو تو ہوگا۔ یہ جانتا تھا کہ جتنا تیل موٹر بوٹ کے ٹینک میں ہے وہ ناکافی ہوگا۔"

"اس کی عقل مفلوج تھی۔ اس کے ذہن پر خوف اور اندیشے سوار تھے" میں نے کہا۔

"اب اس بحث سے کیا فائدہ۔ یہ سوچو کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے" نازو نے کہا۔

"ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے اپنی بے چارگی پر جلنے کڑھنے کے سوا اور مجبوری کو صبر کا نام دینے کے سوا اور ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

گل نے سادگی سے کہا "ہم دعا کر سکتے ہیں اور خدا سے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہم سب کو خیروعافیت کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچائے گا۔"

اس نے سب کو خاموش کر دیا اور شرمندہ کر دیا۔ بحث کرنے، لڑنے اور اندیشوں کا شکار ہونے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ ہم پُرسکون رہیں اور اپنے معاملات خدا کو سونپ دیں۔ اس نے آزمائش کی ہر گھڑی میں ہمیں حوصلہ دیا تھا اور ہماری مشکلات کو آسان بنا دیا تھا۔

"اس کا بخار بڑھتا جا رہا ہے" نازو نے چندو کا ہاتھ تھام کے کہا۔

"اور اسپرین دے دو" میں نے کہا "بخار کا ہمارے پاس یہی علاج ہے۔"

نازو کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ یہ اسپرین سے اترنے والا بخار نہیں ہے مگر اپنے محدود وسائل کے ساتھ ہم موت سے نبرد آزما رہ سکتے تھے۔ اس نے چندو کا منہ کھولا اور اسے سہارا دے کر اوپر اٹھایا۔ پھر دریا کے پانی کے ساتھ اسپرین کی دو گولیاں چندو کے حلق سے اتار دیں۔

کشتی بہت سست رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ صبح ہونے میں کم سے کم بھی چار گھنٹے باقی تھے۔ خشک بسکٹ کھاتے ہوئے اور دریا کا پانی پیتے ہوئے میں نے اور غالب نے رات کے تاریک صحرا میں روشنی کے سراب کی جستجو جاری رکھی۔ کہیں کوئی چراغ جھلملائے، کسی لالٹین یا ٹارچ کا اجالا نظر آئے، آگے یا پیچھے سے کوئی کشتی یا لانچ گزرے۔ ساحل پر کہیں آبادی کا نشان ملے تو مدد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اب سردی بھی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ کنارے پر کسی گھر کی چار دیواری میں بڑی پُر تحفظ، آسودگی بخش حرارت ہوگی، نرم بستروں اور گرم لحافوں میں صرف راحت ہوگی۔ یہاں کھلے آسمان کے نیچے اور پانی کی سرد چادر پر سردی کی شدت انتہا پر تھی۔

گل اور نازو نے سب فاضل کپڑے چندو پر ڈال دیے تھے اور خود سردی میں ٹھٹھر رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر وہ گھٹنے سمیٹے اور ہاتھوں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹے سردی کو برداشت کر رہی تھیں۔ ایسی بے سروسامانی میں سفر کی صعوبت کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ پھر بھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم بھوکے پیاسے نہیں ہیں اور کسی سمندر کی بے کراں وپُرخطر وسعت میں نہیں بھٹک رہے

ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ صبح کوئی ہماری مدد کرنے ضرور آئے گا اور ہمیں دریا کے اس پار پہنچا دے گا۔ اس کے بعد کلکتہ کی باقی مسافت بھی طے ہو جائے گی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت میرے ذہن میں اور کوئی خیال نہیں تھا۔ نہ اس شکست کا جو سیاسی سازش گروں نے ہماری کوتاہیوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کے دی تھی۔ ہماری قومی شناخت کے تصور پر کاری ضرب لگی تھی اور وقتی طور پر ہم اس یقین سے بھی محروم ہو گئے تھے جو اس ملک کے وجود کی بنیاد بنا تھا۔ مجھے دلاور جیسے غداروں کے خون سے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کا خیال نہ تھا۔ دلاور نے مالی نقصانات کے صدمے برداشت کئے تھے اور اپنی ہار کو اپنی نادانی کی سزا سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ وہ واپس جا چکا تھا اور شاید اپنے نقصان کی تلافی کے لئے دولت کمانے کے نئے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا یا نئے پروگرام پر عمل پیرا ہو چکا تھا۔ یہ اس کے نزدیک غیر اہم تھا کہ دولت کے حصول کا کوئی ذریعہ غیر قانونی یا غیر اخلاقی ہے۔ مگر ہم اس دشت کی ویرانی میں سرگرداں تھے اور ناامیدی سے بچنے کے لئے دست غیب کی امداد کے انتظار میں تھے۔ مجھے رابعہ کا خیال بھی نہ تھا جو اپنے اکیلے پن کی سزا کاٹ رہی تھی۔ میرے سامنے صرف کالی رات تھی۔ گل اور نازو کے افسردہ چہرے تھے۔ غالب تھا جو اپنی مایوسی کو چھپانے میں ناکام تھا۔ دریا پر بہنے والی کشتی لہروں کے رحم و کرم پر تھی اور چندو کی زندگی کے چراغ کی لو تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ میں صرف اجالا چاہتا تھا اور مدد چاہتا تھا۔ ساحل پر اترنے اور چندو کے مرنے سے پہلے کلکتہ پہنچ جانے کی آرزو کے سوا میرے دل میں کوئی آرزو نہ تھی۔ مجھے محسن کا خیال تک نہ تھا جو ڈھاکا میں ہمارے لئے چشم براہ تھا۔

اچانک غالب نے کہا "سکندر! وہ کیا ہے؟"

میں نے چونک کر دیکھا "روشنی؟ دریا کی سطح پر!"

"ہاں۔ اس کا عکس پانی میں پڑ رہا ہے۔"

"کہیں یہ سراب نہ ہو" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "کوئی لانچ آ رہی ہے۔"

گل نے بھی خوش ہو کے کہا "ہاں۔ ہماری طرف ہی آ رہی ہے۔"

غالب نے کہا "میں اس کے انجن کی آواز سن رہا ہوں۔"

"آواز مجھے بھی سنائی دے رہی ہے" نازو بولی۔

لانچ بڑی تیزی سے آ رہی تھی۔ اب میں بھی اس کی آواز سن رہا تھا اور دور سے جھلملانے والی روشنی بھی واضح ہو گئی تھی۔

"کہیں یہ فوجی نہ ہوں" نازو نے کہا۔

"کون سے فوجی؟" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "اس سرحد پر ہمارے فوجی نہیں ہو سکتے۔"

"میں نے رات بھر میں نہ کوئی فائر کی آواز سنی' نہ کوئی جنگی ہوائی جہاز اوپر سے گزرا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہم محاذِ جنگ سے دور ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "یہ پولیس بھی ہو سکتی ہے۔ اسمگلر بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اب جو بھی ہو۔ ہم ان سے مدد کی درخواست کریں گے اور خدانخواستہ مشکل میں پڑ گئے تو پھر مقابلہ کریں گے۔ ضروری نہیں کہ ان کا رویہ دوستانہ ہو ہمارے ساتھ۔ ہمیں مقابلے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

لانچ ہمارے بہت قریب آ گئی۔ ہماری لانچ کے مقابلے میں یہ کسی بحری جہاز سے کم نہ تھی۔ اس کے عرشے پر کھڑے ہوئے کسی شخص نے ہم پر تیز ٹارچ لائٹ ڈالی۔ میں نے اور غالب نے ہاتھ ہلا ہلا کے انہیں اپنی طرف بلایا۔ ٹارچ کی روشنی کا دائرہ گل اور نازو پر گیا لیکن لانچ کی رفتار میں کمی نہیں آئی۔

میں نے چلا کے کہا "رکو۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔"

غالب نے بھی چیخ کر یہی بات انگریزی میں دہرائی۔

"ہمارے ساتھ ایک بیمار ہے" میں نے چلا کے کہا "اسے طبی امداد نہ ملی تو وہ مر جائے گا۔"

"ہمارے پاس تیل ختم ہو گیا ہے" غالب چلایا۔

لیکن لانچ ہماری چیخ و پکار سے بے نیاز گزرتی گئی۔ ٹارچ لائٹ سے موٹر بوٹ کا جائزہ لینے والا مطمئن ہو گیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ لائٹ بجھا کے وہیں کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا لیکن ہماری آواز جیسے اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔

"کیا انہوں نے سنا نہیں؟" غالب بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"پھر کیا وہ سمجھے نہیں؟"

"اس میں سمجھنے کی کون سی بات تھی۔ ہم انہیں بلا رہے تھے۔ وہ اشارہ دیکھ سکتے تھے" میں نے کہا "رک کر یہ تو پوچھ سکتے تھے کہ کیا بات ہے۔"

لانچ والوں کی بے نیازی اور بے حسی نے مجھے غصے سے پاگل کر دیا۔ میں نے چیخ چیخ کر انہیں گالیاں دیں۔ غالب نے مجھ سے زیادہ شور مچایا مگر جواب میں ان کی طرف سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا۔

یہ طیش کی انتہا تھی کہ میں نے نازو سے ریوالور چھین کر ان پر گولی چلا دی۔

غالب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "سکندر!"

میں نے کہا "میں انہیں مار دوں گا۔ یہ انسان نہیں ہیں۔"

غالب نے کہا "اور جواب میں انہوں نے بھی فائر کھول دیا تو کیا ہو گا؟ ہم سب مارے جائیں گے۔ یہیں غرق ہو جائیں گے۔"

لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ لانچ کی رفتار میں کمی آ گئی۔ کسی نے چلا کے کچھ کہا اور لانچ رک گئی۔ آہستہ آہستہ ہماری کشتی لانچ کے قریب پہنچ گئی۔

لانچ پر سے کسی نے ایک رسی پھینکی جو میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دوسری جانب سے کوئی رسی کو کھینچنے لگا۔ کشتی مین لانچ کے نیچے پہنچ گئی۔

اوپر سے کسی نے ٹارچ کی روشنی ڈال کے پھر ہمارا جائزہ لیا اور انگریزی میں کہا "کیا تم پاگل ہو؟ گولی کیوں چلائی تھی؟"

میں نے چلّا کے کہا "اور ہم کیا کرتے؟ تمہارے کان ہماری آواز جو نہیں سن رہے تھے۔"

"بے وقوف! تم سب مارے جاتے۔۔۔"

"ہم سب ویسے بھی مر رہے تھے۔ تم سے مدد مانگی تھی ہم نے لیکن تم نے ایسی بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔"

"اوکے۔ کیا چاہئے تمہیں؟"

میں نے کہا "یا تو نیچے آکے بات کرو۔ یا مجھے اوپر آنے دو۔"

اس نے اپنے دو ساتھیوں سے مشورہ کیا "رسّی پکڑ کے اوپر آسکتے ہو؟"

دو منٹ بعد میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ صورت سے کوئی دولت مند' عیاش' مغرور اور بد دماغ آدمی لگتا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں کے ہاتھوں میں خود کار اسلحہ تھا۔ وہ اس کے باڈی گارڈ تھے جو مجھے خوں آشام کتوں کی طرح گھور رہے تھے۔ مجھے شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اپنی مشین گن سے ایک برسٹ مار کے وہ ہمیں بوٹ سمیت دریا کی تہ میں پہنچا سکتے تھے۔ لیکن تقدیر مہربان ہو تو آدمی کی حماقت بھی اس کے لئے فائدہ مند بن جاتی ہے۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس نے بڑی رعونت سے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا' ایک عورت کی نیند یا نشے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "ڈارلنگ۔۔۔۔ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا۔ تم نیچے جاؤ" اس نے عورت کو سخت لہجے میں حکم دیا "تم ہوش میں نہیں ہو۔"

عورت کو واقعی اپنا ہوش نہ تھا ورنہ وہ اوپر آنے سے پہلے اپنے جسم کی بے لباسی کو ضرور دیکھتی۔ وہ برائے نام شفاف نائٹ گاؤن میں تھی جو ہر طرف سے کھلا ہوا تھا۔

"اسے نیچے لے جاؤ" اس نے اپنے ایک محافظ سے کہا کیوں کہ عورت اس کے حکم کی پروا کئے بغیر آگے چلتی آرہی تھی۔

اب میں سمجھ چکا تھا کہ ہماری فریاد و فغاں کو انہوں نے کیوں درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ یہ ایک دولت مند کا سطح آب پر تیرتا ہوا عشرت کدہ تھا۔ ان کی جگہ پولیس کی لانچ ہوتی یا ماہی گیروں کی' وہ ہماری چیخ و پکار کو ایسے نظر انداز نہ کرتے مگر ایک عیش پرست آدمی کو کسی بھی مصیبت زدہ کے چکر میں پڑ کے اپنے لطف کی ساعتوں کو مکدر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب میں نے اس پر گولی چلائی تو اس کی بے حس انا کے شیشے پر ضرب پڑی۔ وہ کوئی عام قسم کا بدمعاش یا کم ظرف ہوتا تو فوراً حکم دیتا کہ جوابی کارروائی کی جائے اور جس نے بھی یہ گستاخی کی ہے اسے عبرت ناک سزا دی جائے مگر وہ ہماری فریاد و فغاں بھی دیکھ چکا تھا۔ جذباتی طور پر وہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ میرے فائر کرنے سے اس نے اندازہ کیا کہ ہم نے یہ قدم انتہائی مایوسی کے باعث اٹھایا اور اسے صورت حال کی سنگینی کے خیال نے رکنے پر مجبور کر دیا۔

جب محافظ' عورت کو زبردستی نیچے لے گئے تو اس نے اپنا سوال دُہرایا۔

میں نے اتنی دیر میں ایک گول مول جواب سوچ لیا تھا "ہم بڑی مشکل میں ہیں جناب۔ پٹرول ختم ہو گیا ہے۔"

"اتنے لمبے سفر پر کیوں نکلے تھے؟" اس نے اپنی عقابی نظریں مجھ پر جما کے کہا۔

"مجبوری میں سر۔ جان بچانے کے لئے۔"

اس نے سوچ کے کہا "ہوں۔ کہاں جا رہے ہو اب؟"

میں نے کہا "کلکتہ سر۔ عورتوں کا ساتھ ہے۔ چھوٹا بھائی بخار میں تپ رہا ہے۔ پانی میں اترا تھا' شاید کسی سانپ نے کاٹ لیا۔ کلکتہ نہ پہنچے تو وہ دوا دارو سے پہلے ہی مر جائے گا۔"

"لیکن میں تمہیں کیسے کلکتہ پہنچا سکتا ہوں؟" اس کے لہجے میں کچھ نرمی اور تاسف کے جذبات آگئے "ابھی واپسی بھی ممکن نہیں۔"

"آپ ہمیں ساحل پر چھوڑ دیں سر۔"

"ساحل پر! یہاں؟ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے کہا "یہاں ہر طرف جنگل ہی جنگل ہے۔"

"کسی سڑک تک پہنچ جائیں گے۔"

"بے وقوف آدمی! دس میل تک کچھ نہیں ہے۔ کیسے جاؤ گے؟ عورتیں جنگل سے پیدل گزر سکتی ہیں؟ اور وہ جو بھائی ہے تمہارا' اسے لاد کے چل سکتے ہو تم؟ راستے میں ہی مر جائے گا وہ۔ تم بھی مارے جاؤ گے۔ ہاں ایک صورت ہے" اس نے چٹکی بجائی' "میں تمہیں پٹرول دے سکتا ہوں۔ اتنا کہ تم صبح تک کلکتہ پہنچ جاؤ گے۔"

میں نے کہا "حضور کو خدا اس نیکی کا اجر دے۔"

وہ چونکا "تم مسلمان ہو؟"

اب انکار سے کچھ حاصل نہ ہوتا "جی سر۔۔۔"

"بنگال سے فرار ہوئے ہو؟" وہ بولا۔

"جی سر۔۔۔ جنگ میں سب تباہ ہو گیا۔"

اس نے کہا "تو کلکتہ کیوں جا رہے ہو؟ پاکستان جاؤ۔"

میں نے اس کے لہجے میں طنز کو محسوس کیا اور سمجھ گیا کہ وہ ہندو ہے "کلکتہ میں اپنے عزیز ہیں جناب۔ ابھی ان کے پاس ٹھہر جائیں گے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد واپس گھر لوٹیں گے۔"

"جنگ تو ختم ہو گئی۔ بنگلہ دیش بن گیا اور تمہارے پاکستان کی فوج کو شکست ہو گئی" اس نے مسکرا کے کہا۔

میں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا "ہمیں کیا لینا سیاست سے حضور۔ آپ ہمیں پٹرول دے دیں۔"

"اُردو انگریزی بہت صاف بولتے ہو تم۔ کیا کرتے تھے ڈھاکا میں؟" وہ بولا۔

"پڑھاتے تھے کالج میں" میں نے کہا۔

"جو کچھ تم پڑھاتے رہے۔ اب نہیں پڑھا سکو گے۔ خیر۔ مجھے کیا" اس نے ایک محافظ کی طرف رخ کر کے کہا "دیکھو ان کو دے دو بیس لیٹر...."

"بیس لیٹر... ہمیں کم نہ پڑ جائے سر۔"

"جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو" اس نے بگڑ کے کہا "دفع ہو جاؤ۔"

محافظ فوراً دفع ہو گیا اور کچھ دیر بعد بیس لیٹر پٹرول کا جیری کین اٹھائے نمودار ہوا۔

"بیس روپے نکال بھک منگے" اس نے آہستہ سے کہا۔

میں نے چلا کے کہا "بیس روپے کس بات کے؟ سیٹھ صاحب نے پٹرول بیچنے کی بات تو نہیں کی تھی۔"

سیٹھ پیچھے جاتے جاتے رک گیا "کیا بات ہے؟"

محافظ نے فوراً کہا "کچھ نہیں سر۔ میں نے کہا کہ جیری کین خالی کر دو تو شور کر رہا ہے۔"

"سارا پٹرول کیسے ڈال دوں۔ اتنا بڑا ٹینک نہیں ہے کشتی کا" میں نے کہا۔

سیٹھ نے ہاتھ ہلایا "دے دو جیری کین بھی" اور پیچھے غائب ہو گیا۔

محافظ نے دانت پیس کے کہا "لے۔ دفع ہو"

میں اس کی گالی کو پی گیا اور اس سے جیری کین لے لیا "ایک سگریٹ تو پلا دے یار۔"

"اب جاتا ہے یا..."

میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکالا "لو۔ پٹرول کے بیس کاٹ کے باقی واپس کر دو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "ابے تو پاگل ہے کیا؟"

میں نے کہا "کُھلا نہیں ہے تو باقی کے سگریٹ دے دو۔ اور کیا ہے تمہاری دُکان میں؟ چائے ملے گی؟"

اس نے سو کا نوٹ اچک لیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکال کے مجھے تھمائے اور بولا "اب زیادہ سر مت چڑھو۔ شکر کرو جان بچ گئی۔ سیٹھ اچھا آدمی ہے ورنہ میں تو چھلنی کر دیتا سب کو۔"

میں نے جیری کین سمیت رسّی پر پھسلتے ہوئے کہا "چھلنی کے بچے! اتنا ہمت والا ہے تو یہ جا کے بتا سیٹھ کو.... کہ مجھ سے سو کا نوٹ لیا ہے تو نے بھک منگے۔ مجھے سیٹھ کا لحاظ نہ ہوتا تو میں تیری ایسی کی تیسی کر دیتا۔"

ظاہر ہے وہ تلملانے اور جواب میں گالیاں بکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ گالیاں بکتے ہوئے اپنی آواز بھی کم رکھنے پر مجبور تھا۔ کشتی میں پہنچ کر میں نے مزید اشتعال انگیزی کی اور اس کی بے بسی پر ہنسا۔ اچانک ہم سب کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ پلک جھپکتے میں ناامیدی کا گھپ اندھیرا دور ہو گیا تھا اور امید کے سورج کی روشنی بڑی آب و تاب سے سب کے دلوں میں اتر آئی تھی۔

"سب ہندو شیطان نہیں ہوتے" غالب نے انجن کے فیول ٹینک میں پٹرول ڈالتے ہوئے کہا۔

"جیسے سب مسلمان فرشتے نہیں ہوتے" میں نے دور جاتی ہوئی لانچ کو دیکھ کے کہا "ان میں دلاور جیسے بھی ہوتے ہیں اور حاجی عبداللہ جیسے پاپی بھی۔"

"اچھائی اور برائی آدمی کی ذات سے منسوب ہے کسی مذہب سے نہیں" تازو نے کہا "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔"

میں ہنس پڑا "یہ بھی کسی تقریر کا حصہ تھا؟"

وہ بھی ہنس پڑی "اسی تقریر کا۔"

موٹر بوٹ کا انجن پھر اسٹارٹ ہوا اور دو بج کر چالیس منٹ پر سو فیصد تائید ایزدی سے ہم نے دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کیا۔ چندو کی حالت بدستور تشویش ناک تھی اور یقین کے ساتھ کچھ نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کلکتہ پہنچنے تک زندہ رہے گا یا مر جائے گا۔ سیٹھ نے بھی کہا تھا کہ ہم صبح تک کلکتہ پہنچ جائیں گے۔ میں تھوڑا سا پُر امید اس لئے بھی تھا کہ چندو زہر کے خلاف ایک فطری قوتِ مدافعت رکھتا تھا۔ اس نے خود ہی راستے میں بتایا تھا کہ سانپ بچھو کے کاٹنے سے اس کو کچھ نہیں ہوتا۔ بچپن سے اب تک اسے زہریلے جانوروں نے اتنی بار کاٹا تھا کہ اس کے خون میں زہر شامل ہو گیا تھا۔

چندو کی جگہ یہ تیر ہم میں سے کسی کو لگ جاتا تو شاید وہ بہت پہلے مر چکا ہوتا مگر چندو میں جو قوتِ مدافعت پیدا ہو چکی تھی وہی اس کو زہر کے مہلک اثرات سے بچا رہی تھی۔ اس کے شانے سے اب خون نہیں بہہ رہا تھا مگر جتنا خون بہا تھا اس کے ساتھ ہی کافی زہر بھی فوراً خارج ہو گیا تھا۔

غالب نے چندو کی نبض دیکھتے ہوئے سر ہلایا "بیچارا!"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا ابھی تک تو۔ مگر....."

"بری بات مت نکالو منہ سے" تازو نے بگڑ کے کہا۔

گل نے اس کی تائید کی "اللہ اچھا کرے۔ یہی کہنا چاہئے۔"

غالب مسئلۂ قضا و قدر کے حوالے سے کوئی جواب دیتا تو بلاوجہ بحث چھڑ جاتی۔ میں نے کہا "مرزا جی! یہ قبیلے والے تیروں اور نیزوں کی انی پر کس قسم کا زہر لگاتے ہوں گے؟"

"ایسے قبیلوں کو جڑی بوٹیوں کے خواص کا علم ہوتا ہے۔ کسی پودے کا عرق استعمال کرتے ہوں گے یا ممکن ہے سانپ کے حلق سے زہر برآمد کر لیتے ہوں" غالب نے کہا۔

"سانپ اس علاقے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ سانپ کا زہر ہوا تو شاید چندو بچ جائے۔"

"مگر ہم سردی سے اکڑ کے مر جائیں گے صبح تک" نازو نے کہا' "سردی بڑھتی جا رہی ہے۔"

"صبح تک اور بڑھے گی" گل نے کہا۔

"افسوس کہ ہم اپنی کھال اتار کے آپ کو نہیں پہنا سکتے۔ صرف مفید مشورے دے سکتے ہیں سردی سے بچنے کے لئے۔ وہ بھی بالکل مفت" غالب نے کہا "پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ سردی کو بھول جاؤ۔"

"یہ فرض کرلیں کہ جون کا مہینہ ہے اور دوپہر کا سورج سر پر ہے؟" نازو نے طنز سے کہا۔

"نہیں۔ ساری بات احساس کی ہے۔ احساس نہ ہو تو گرمی سردی دکھ درد کسی چیز کا پتا نہیں چلتا۔ جیسے بے ہوش آدمی کو بالکل پتا نہیں چلتا کہ اس کے جسم کو کہاں سے کاٹا جا رہا ہے۔ میرا دوسرا مفید مشورہ یہ ہے کہ بے ہوش ہو جاؤ" غالب نے کہا "تم عورتوں کے لئے تو یہ معمولی کام ہے۔ اچھی خبر سنی تو بے ہوش۔ بری خبر سنی تو بے ہوش۔"

"میں کردوں تمہیں بے ہوش؟" نازو نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

"نہ کی۔ ابھی بہت سے مشورے باقی ہیں۔ اتنے بے صبرے پن کا مظاہرہ مت کرو۔" غالب نے کہا "تیسرا مشورہ تو بہت ہی آسان ہے۔ جسم کو گرم رکھنے کے لئے ورزش کرو۔ چھلانگیں لگاؤ۔ رسی کودو۔ باکسنگ کرو آپس میں۔ کشتی کے اندر ہی دوڑ لگاؤ۔ قسم خدا کی سردی میں پسینہ نہ آجائے تو کہنا۔"

خوشی کا ایک اور وقفہ صبح ساڑھے چار بجے آیا جب میں کشتی کے انجن کی ٹنکی میں پھر پٹرول ڈال رہا تھا۔ اینٹی بایوٹک گولیوں کی دوسری خوراک چندو کو کچھ دیر پہلے ہی دی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اسپرین بھی۔ شفا کی کوشش اور توقع ہم انہی دو دواؤں سے وابستہ کرسکتے تھے۔ شفا دینے والا بہرحال وہ مالکِ ارض و سما تھا جس کے قبضے میں چندو کی اور ہماری جان تھی۔

اچانک میں نے چندو کے کراہنے کی آواز سنی۔ پھر نازو اور گل نے ایک ساتھ خوشی سے چلّا کے کہا "اسے ہوش آگیا۔"

میرے ہاتھ سے پٹرول کا جیری کین گرتے گرتے بچا۔ پٹرول ٹینک کا ڈھکن بند کر کے اور جیری کین میں بچا ہوا پٹرول سنبھال کر رکھنے کے بعد میں چندو کے قریب بیٹھ گیا۔

"اس کا بخار بھی کچھ کم ہوا ہے۔" گل نے کہا۔

نازو اس کے حلق میں پانی ٹپکا رہی تھی اور چندو پھر بھی پانی مانگ رہا تھا۔ غالب نے اس کے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور نازو نے وہ سلور کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا جس میں دریا کا گدلا پانی تھا۔ چندو کی آنکھیں بند تھیں اور نقاہت کے باعث وہ بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا مگر اس نے ہاتھوں سے گلاس پکڑ لیا۔ نازو اسے روکتی ہی رہ گئی اور وہ سارا پانی غٹاغٹ پی گیا۔

پانی پینے کے ساتھ ہی اسے الٹی آئی۔ وہ پھر پانی مانگنے لگا اور یوں ہاتھ پیر چلانے لگا جیسے شدید اذیت میں ہو۔

گل ڈر گئی "بھائی سکندر.... یہ کیا ہو رہا ہے اسے؟"

میں نے اس کا برف جیسا سرد ہاتھ تھام کے کہا "یہ اچھا ہو رہا ہے۔ بخار کی وجہ سے پیاس لگ رہی ہے۔ یا شاید یہ بھی زہر کا اثر ہوگا۔ ممکن ہے اس کے ہاتھ پاؤں جل رہے ہوں اور اندر آگ سی لگی ہوئی محسوس ہوتی ہو۔"

اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے کئی بار پانی پیا اور الٹی کی۔ اس کے بخار میں نمایاں کمی واقع ہوگئی تھی مگر اس کا جسم سرخ پڑ گیا تھا اور ہم اسے نہ روکتے تو وہ کھرچ کھرچ کے اپنی کھال زخمی کرلیتا۔ یہ واضح طور پر زہر کے اثرات تھے۔

آہستہ آہستہ افق کی سیاہ لکیر مٹنے لگی اور صبح کاذب کے ہراول دستے نے صبح صادق کی نوید دی۔ آسمان پر اجالا پھیلنے لگا اور اس کے ساتھ ہی سردی میں اضافہ ہوا۔ گل اور نازو سردی سے کانپ رہی تھیں مگر ہم انہیں برداشت کی تلقین کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ چندو کو سردی سے بچانا زیادہ ضروری تھا۔ اگر وہ بیمار نہ ہوتا تو ہم سب کے اضافی کپڑے خواتین کو سردی سے خاصا تحفظ فراہم کرتے۔

نازو نے کہا "یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ہم کلکتہ پہنچ گئے ہیں؟"

غالب ہنسنے لگا "یہ کیسے معلوم ہوگا کہ سورج نکل آیا ہے۔"

نازو نے خفا ہو کے کہا "یہ کیا بات ہوئی؟"

"احمقانہ بات خود کرتی ہو' پھر مجھ سے پوچھتی ہو یہ کیا بات ہوئی۔ بابا کلکتہ کوئی رسالہ خورد ہے کہ گزر جائے گا اور پتا نہیں چلے گا۔ دنیا کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے۔"

نازو نے کہا "مگر ہم رات بھر ایک ہی سمت میں چلتے رہے ہیں۔"

"سب دریا ایک ہی سمت میں بہتے ہیں۔ ایسا دریا میں نے آج تک نہیں دیکھا جو کبھی الٹا بہتا ہو کبھی سیدھا۔"

"الٹی کھوپڑی ہے تمہاری" نازو جھلا کے بولی۔

"چلو الٹی ہے تو الٹی ہی سہی۔ یہ تو نہیں ہے نا تمہاری طرح کہ کبھی الٹی کبھی سیدھی" غالب نے کہا "گھڑی میں تولہ تو گھڑی میں ماشہ۔ جب جی چاہا۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔"

اب میں نے نازو کا دفاع کیا "یار کیوں پریشان کرتا ہے اسے۔ اس کا مطلب تھا کہ کہیں ہم غلط سمت میں تو سفر نہیں کر رہے تھے۔ اندھیرے میں کیا پتا چلتا ہے۔"

نازو نے ممنونیت سے مجھے دیکھا۔ لیکن غالب نے قہقہہ مارا اور بولا "یہ لو۔ یک نہ شد دو شد۔ فرماتے ہیں اندھیرے میں سمت کا کیا پتا چلتا ہے۔"

"کون سی ایسی بات ہے اس میں ہنسنے کی؟"

"میرے بھائی، آدمی سمت بھول سکتا ہے' دریا نہیں۔ ہمارے سب دریا ایک ہی سمت میں بہتے ہیں۔ شمال سے جنوب کی سمت۔ بھارت کے بھی اور پاکستان کے بھی۔ کچھ سمجھے آپ یا نقشے کی مدد سے سمجھاؤں کہ دریا ہمالیہ سے نکلتے ہیں جو شمال میں ہے اور سمندر میں گرتے ہیں جو نیچے جنوب میں ہے" غالب نے کہا۔

میں نے سر کھجا کے کہا "اچھا؟ یہ ہمالیہ پہاڑ کو شمال میں کس نے کر دیا۔ جب ہم جغرافیہ پڑھتے تھے تو شاید جنوب میں تھا۔"

"آپ نقشہ الٹا دیکھتے ہوں گے۔ ممکن ہے کتاب بھی الٹی پکڑ کے دیکھتے ہوں جغرافیہ کے پیریڈ میں" غالب نے کہا۔

"مرزا جی! تم واقعی ماہر جغرافیہ داں ہو۔ کولمبس ہو بلکہ واسکوڈی گاما ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ آخر یہ دریا کون سا ہے؟"

غالب نے سوچ کے کہا "یہ ہگلی ہو سکتا ہے یا اس کی ذیلی شاخ۔ کوئی چھوٹا دریا جو آخر کار ہگلی سے جاملتا ہو' معلوم ہو جائے گا۔"

روشنی پھیلی تو ہمارا اشتیاق بڑھ گیا۔ غالب کا خیال بالکل ٹھیک ثابت ہو رہا تھا۔ دریا پھیل رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ گھوم کے سمندر میں شامل ہو جائے گا مگر وہ سمندر نہیں دوسرا بہت بڑا دریا تھا اور ہم دونوں دریاؤں کے سنگم پر تھے۔ بہت دور بائیں طرف آبادی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے اور آسمان پر اٹھنے والا دھواں کسی صنعتی شہر کی نشان دہی کرتا تھا۔

غالب کے مشورے پر میں نے موٹر بوٹ کو موڑا اور ساحل کے رخ کر دیا۔ یہ چھوٹی سی موٹر بوٹ بے حد وفادار ثابت ہو رہی تھی اور کسی حادثے کا شکار ہوئے بغیر ہمیں منزل تک لے آئی تھی۔

گل اور نازو بہت خوش تھیں اور بار بار بچوں کی طرح پوچھ رہی تھیں "یہ کلکتہ ہے نا؟"

"تنگ آ کے غالب نے کہا "اتنی بار تو یقین دلا دیا میں نے۔ اب تم خود پوچھ لینا کلکتہ ہے۔ حد ہو گئی یار۔ بھلا اس راستے پر کانا کاچھا یا چھانگا مانگا آ سکتا ہے۔"

"اب ہم ڈھاکا بھی پہنچ جائیں گے نا؟" گل نے کہا۔

"دیکھو نیک بیبیو! سارے احمقانہ سوالات مجھ سے مت کرو۔ اپنے سکندر صاحب بھی تو ہیں اور مشن کمانڈو وہی ہیں۔ کچھ ان سے بھی پوچھو" غالب نے بھنا کے کہا۔

ساحل تک پہنچتے پہنچتے دھوپ پھیل گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی سردی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے رات بھر کشتی چلائی تھی اور اس کا رخ سیدھا رکھا تھا۔ یہ مشکل کام نہیں تھا مگر میں تھک گیا تھا۔ آخری لمحات میں کسی مناسب جگہ کی تلاش کرنا مجھے زیادہ دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

آخر کار میں نے ایک ہموار کنارا دیکھا اور موٹر بوٹ کی رفتار بڑھا کے اسے سیدھا لے گیا۔ جہاں تک پانی تھا کشتی چلتی گئی۔ پھر کیچڑ سے گزری اور کنارے پر پھنس گئی۔ انجن نے واجبی سا زور لگایا اور ناکام ہو کے رک گیا۔

میں نے اطمینان کی گہری سانس لی "خدا کا شکر ہے کہ یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔"

غالب نے کہا "اصل مرحلہ تو اب درپیش ہو گا۔"

میں نے کہا "اس کی ابھی سے فکر مت کرو۔ پہلے نیچے اترو۔ چندو کو اتارو۔"

گل اور نازو پہلے ہی کنارے تک پہنچ کے کنکروں پر دھوپ میں سیدھی لیٹ گئی تھیں اور آنکھیں بند کئے سورج کی حرارت سے توانائی حاصل کر رہی تھیں۔ میں نے اور غالب نے چندو کو سہارا دے کر اٹھایا اور ان کے قریب لٹا دیا۔ وہ اب پوری طرح ہوش میں تھا مگر اس کا بخار کم ہو کے پھر بڑھ گیا تھا۔ ہم نے دوسرا پھیرا لگایا اور اپنا اسباب کشتی سے اتار لائے۔

ہمارے چاروں طرف وہی گھنا جنگل تھا اور ویرانی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ آبادی اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہو سکتی۔ میں نے چند بسکٹ کھائے اور ایک سگریٹ جلا کے خالی ڈبیا پھینک دی۔

"اب میں جاتا ہوں سروے کرنے" غالب نے کہا "یہ دیکھتا ہوں کہ قریب ترین آبادی کہاں ہے۔"

میں نے کہا "نہیں' ہم سب ساتھ چلیں گے۔ ہم یہ رسک نہیں لے سکتے کہ کوئی اکیلا جائے تو راستہ بھولنے کی صورت میں باقی سب سے بچھڑ جائے یا خدا نخواستہ کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو دوسرے انتظار ہی کرتے رہ جائیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ اکیلا کوئی کہیں نہیں جائے گا۔" نازو نے میری تائید کی۔

"چندو کا کیا ہو گا؟" غالب نے کہا۔

"اسے ہم اٹھالیں گے باری باری" میں نے کہا "آخر کتنی دور جانا پڑے گا ہمیں؟ دو میل۔ چار میل۔ اس کے بعد کوئی سواری ضرور مل جائے گی۔ اب یہ مضحکہ خیز لباس بدلو۔ لیڈیز' آپ اگر چاہیں تو منہ دھولیں۔ اس کے بعد وہی ساریاں باندھ لیں جو نورل کے گھر میں باندھ رکھی تھیں۔ ہم بھی قمیص پتلون اور جوتے پہن کے چلتے ہیں۔ کلکتے میں ہم دیہاتی نہیں' معزز شہری بن کے داخل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں اتنے بڑے شہر میں ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ ہم خطرے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہاں ہمیں پہچاننے والا کوئی نہیں ہو گا اور ہم پوری کوشش کریں گے کہ گمنام رہیں۔ بمبئی کی طرح ہمارے کلکتہ پہنچتے ہی کوئی ایڈونچر نہ ہو۔"

"اب کیا ایڈونچر ہو گا؟" غالب نے تو بھر کے کہا۔

یہاں میں مرادہ وہ سب کچھ دہرانا نہیں چاہتا جو آپ بھی جانتے ہیں۔ ہماری قومی تاریخ کا وہ المیہ اب ماضی کا حصہ ہے اور اس کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور لکھا گیا ہے۔ سیاست دانوں سے جنرلوں تک اور اخباری تجزیہ نگاروں سے حمود الرحمن

کمیشن تک مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کے اسباب اور واقعات پر ہر رُخ سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ابھی تک ہم سب پورا سچ نہیں جانتے یا جان ہی نہیں سکتے۔ سچ ایک آئینے کی طرح تھا جس کو سنگسار کر دیا گیا اور اس سچ کے ریزے' چھوٹے بڑے ٹکڑے انہوں نے چن لئے جو سچ کو عزیز رکھتے تھے مگر ان لوگوں کے پاس صرف ٹکڑے ہیں' مکمل سچ نہیں ہے۔ ان ٹکڑوں کو جوڑ کے پھر وہ آئینہ کون بنا سکتا ہے جس میں پورا سچ نظر آئے۔ میں فقط داستان گو ہوں۔ آپ بیتی کہتا ہوں۔ جگ بیتی میں میری آپ بیتی شامل ہے مگر میری آپ بیتی کسی طرح بھی جگ بیتی نہیں۔ نہ میں نے سب دیکھا' نہ سنا' نہ پڑھا اور نہ سمجھا۔ پھر مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی پر حرف زنی کروں۔ کوئی رائے دوں اور اسے صائب جانوں۔ بہت سے حقائق کے چہرے میں نے تب دیکھے جب وہ مسخ ہو چکے تھے۔ ان گنت تاریخ کے ٹکڑے میری نگاہ سے اوجھل رہے۔ پھر میں کوئی فیصلہ کس حوالے سے صادر کروں۔ یہ بہت متنازعہ بڑا دل آزار اور تلخ موضوع ہے۔ پس میں صرف کہانی کہتا ہوں۔ سیاست میں ہر طرف کیا تھا۔ کیا ہو رہا تھا اور کیا نہیں ہو رہا تھا۔ کیا ہونا چاہئے تھا اور کیا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ سب میں حذف کرتا ہوں اور یہ بتاتا ہوں کہ سکندر بخت نے کیا کیا۔ کیوں کہ یہ بہرحال اسی کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں اب سکندر بخت کے سیاسی ردِ عمل' نظریات اور عقائد کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ آج بھی خبروں اور بیانوں کے بین السطور اصل تاریخ کا معلوم چہرہ کون نہیں دیکھ سکتا۔ ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔ تو اس کہانی میں جو سکندر بخت کی آپ بیتی ہے وہ سب نظر آجائے گا جو کہانی نہیں ہے۔

دریا کے کنارے سے پہلی انسانی آبادی تک ہمارا سفر قوتِ ارادی کی آزمائش کا سخت ترین مرحلہ ثابت ہوا۔ کوئی ہمیں راستہ بتانے والا نہ تھا چنانچہ ہم اندازے کو بنیاد بنا کے چلتے گئے۔ چندو کو اٹھا کے ان دشوار گزار راستوں پر سفر کرنا مشکل سے مشکل ہوتا گیا۔

گل اور نازو نے بھی پوری رات جاگ کے کاٹی تھی اور اس کے ساتھ شدید اعصابی دباؤ برداشت کیا تھا۔ دن نکلنے کے ساتھ ہی ایک سفر کے اختتام نے انہیں حوصلہ عطا کر دیا تھا مگر رفتہ رفتہ جسمانی تھکن غالب آ رہی تھی۔ وہ بسکٹ بھی ختم ہو چکے تھے جو گل ساتھ لے آئی تھی۔ دھوپ چڑھتے ہی جنگل میں حبس بڑھ گیا اور ہمارے جسموں کی توانائی پسینہ بن کے خارج ہونے لگی تھی۔

میں نے اور غالب نے گل اور نازو کو تھک کر بیٹھنے نہیں دیا اور انہیں اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے چلتے گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ قدم ایک بار رک گئے تو دوبارہ اٹھنا مشکل ہو گا۔ میں اس وقت جب خود میرا حوصلہ ختم ہو رہا تھا اور میرے قدم لڑکھڑانے لگے تھے' جنگل ختم ہو گیا اور ہم نے خود کو ایک دیوار کے مقابل دیکھا۔

یہ کسی قلعے کی فصیل جیسی بارہ چودہ فٹ بلند دیوار تھی جس کے اوپر کانٹے دار تاروں کی باڑھ تھی۔ دیوار کے اوپر ہر دس فٹ کے فاصلے پر ایک فولادی کھمبا تھا جو اوپر سے باہر کی طرف مڑا ہوا تھا۔ اس میں چھ چھ انچ کی دوری سے کانٹے دار تاروں کی پانچ متوازی لائنیں تھیں۔ دیوار سے پہلے ہی تقریباً دس فٹ چوڑی خندق تھی جس میں خاردار تاروں کے ڈھیر گول لچھوں کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔

کچھ دیر اس ممنوعہ علاقے کا جائزہ لینے کے بعد میں نے کہا "یہ کیا جگہ ہو سکتی ہے؟ کوئی ملٹری کیمپ؟"

غالب نے کہا "خاموشی سے تو لگتا ہے کہ یہاں کوئی بھی نہیں رہتا۔"

میں نے دونوں جانب نظر دوڑائی "اس خندق کو عبور کرنے کا بھی کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"راستہ ہوتا تب بھی ہم دیوار کے دوسری طرف کیسے جاتے؟" غالب نے کہا۔

"ان تاروں میں کرنٹ بھی ہو سکتا ہے" میں نے خندق میں جھانک کر اور اوپر دیکھ کے کہا۔

نازو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

"کس خیال کو؟" میں نے کہا۔

"کہ تم یہاں سے دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "اگر میں اس قابل ہوتا تو ایسا ضرور سوچتا۔ لیکن اس وقت تو یہ کام میرے لئے کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی کو سر کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔"

غالب نے کہا "ہم چکر لگا کے دیکھ سکتے ہیں۔ اندر جانے کا کوئی راستہ ضرور ہو گا۔"

"اندر جانے کا راستہ تو مل جائے گا۔ باہر آنے کا راستہ ملے گا یا نہیں" نازو نے کہا۔

"میں غیب کا علم نہیں رکھتا" غالب نے چڑ کے کہا۔

ہم نے پھر چلنا شروع کیا۔ دیوار کی لمبائی دو سو گز کے قریب ہو گی۔ اس وقت یہ فاصلہ ہمیں دو سو میل محسوس ہوا۔ پہلا موڑ کاٹتے ہی میں نے خندق پر بنے ہوئے پل اور فصیل کے دروازے کو دیکھا۔ لکڑی کے بنے ہوئے پل پر فولادی جنگلا تھا اور اس کے دونوں طرف دو فوجی جدید خود کار بندوقیں لئے کھڑے تھے۔

ہم پر نظر پڑتے ہی انہوں نے بندوقوں کا رخ ہماری طرف کر دیا اور چلا کے کچھ کہا۔

میں نے غالب سے کہا "ایسے ہی چلتے رہو۔"

"مگر انہوں نے گولی چلا دی؟"

"میں نے چندو کو اٹھا رکھا ہے۔ تم ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ تاکہ انہیں شک نہ ہو کہ ہم جارحانہ عزائم رکھتے ہیں" میں نے کہا۔

لکڑی کے پل تک پہنچنے والی پتلی سی سڑک پر ایک ٹرک نمودار

ہوا۔ دونوں فوجی مستعد ہوگئے۔ ان میں سے ایک دوڑ کر ہماری طرف آیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے ہمیں وہیں بیٹھ جانے کا حکم دیا۔

میں نے چندو کو زمین پر ڈال دیا اور سب کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔ فوجی بنگالی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ہماری سمجھ میں ایک لفظ نہیں آرہا تھا۔ پھر ہم کسی سوال کا انکار یا اقرار میں کیسے جواب دیتے۔

اس وقت چندو نے ہماری مدد کی۔ وہ ہمت کرکے اٹھ بیٹھا اور اس نے بنگالی میں بات کی۔ فوجی کے لہجے اور چہرے کی کرختگی قدرے کم ہوئی اور وہ چندو سے سوالات کرنے لگا۔ میں نے لکڑی کے پل پر سے گزرنے والے ٹرک کو دیکھا۔ یہ ہر طرف سے بند ویسا ہی ٹرک تھا جیسا زیر سماعت مجرموں کو جیل سے عدالت لے جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ٹرک جب گیٹ میں داخل ہوگیا تو فوجی نے ہمیں اٹھنے کی اجازت دی۔

چندو شاید اسے مطمئن کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ فوجی نے پیچھے رہتے ہوئے ہمیں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ میں نے پھر چندو کو اٹھالیا اور ہم دونوں فوجیوں کی نگرانی میں گیٹ تک پہنچے۔ گیٹ پر متعین فوجیوں نے باہر والوں سے نہ جانے کیا پوچھا اور معلوم نہیں انہوں نے کیا جواب دیا۔ چند منٹ بعد بھاری بھرکم فولادی گیٹ میں ایک کھڑکی سی کھل گئی اور ہم سر جھکا کے باری باری اندر داخل ہوئے۔

غالب نے آہستہ سے کہا "یار کہیں ہم جنگی قیدی تو نہیں بن گئے ہیں؟"

"یہ مجھے فوجی نہیں لگتے" میں نے کہا۔

"پھر کیا لگتے ہیں؟"

"ان کی وردی پر مت جاؤ۔ چال ڈھال دیکھو۔ فوجی ایسے نہیں چلتے۔ ان کے قدم۔۔۔"

ایک فوجی نے بندوق کا کندا مار کے غالب کو خاموش کردیا۔ "بات نہیں کرے گا۔ شٹ اپ کرے گا۔"

غالب لڑکھڑا کے گرا اور پھر کھڑا ہوگیا۔ اندر وسیع میدان کے وسط میں ایک مربع عمارت نظر آرہی تھی۔ ایک منزلہ عمارت کی تعمیر جیل کے انداز میں ہوئی تھی۔ سپاٹ دیواروں میں اوپر صرف ایک روشن دان تھا جس میں مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اندر جانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہاں بھی خطرناک ہتھیاروں والے فوجی پہرا دے رہے تھے۔

مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکے ہیں اور کسی وجہ کے بغیر جیل میں ٹھونسے جارہے ہیں۔ اس جیل سے کب نکلنا ہوگا اور کیسے۔ یہ سوچنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی جیل کی فصیل ہے تو ہم ادھر کا رخ ہی کیوں کرتے۔ جیل کے قریب سے گزرنا کوئی جرم نہیں تھا۔ ہمارا جرم یہ تھا کہ ہم بنگالی نہیں بول سکتے تھے۔

اندر کا منظر دیکھ کے مجھے یقین آگیا کہ نہ یہ جیل خانہ ہے اور نہ کوئی فوجی علاقہ۔ یہ کوئی دہشت گردوں کا عقوبت خانہ تھا جہاں سیاسی مجرم لائے جارہے تھے۔ جو ٹرک میرے سامنے سے گزر کے اندر آیا تھا اس میں سے چیختے چلاتے مرد عورتیں برآمد کئے جارہے تھے۔ انہیں ٹرک میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسا گیا تھا اور اب زبردستی کھینچ کر باہر نکالا جارہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ سب جوان لوگ تھے۔

ہمیں برآمدے کی طرف موڑ دیا گیا اور پھر ایک کمرے میں دھکیل کر دروازے کو باہر سے بند کردیا گیا۔

گل اور نازو دہشت سے بے ہوش ہونے کو تھیں۔ وہ فرش پر ڈھیر ہوگئیں اور سسکیاں لے کر رونے لگیں۔

"یہ ہم کہاں پھنس گئے؟" غالب بولا۔

میں نے چندو سے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں اور یہ کیا جگہ ہے؟ تم سے کیا بات ہوئی تھی ان کی؟"

چندو نے رک رک کر ہانپتے ہوئے کہا "ہم بولتی۔ ہم راستہ بھول جاتی۔ کشتی میں جاتی شکار کا واسطے۔ کشتی خراب ہوتی۔ ادھر سے ہم پیدل آتی۔ سب کلکتہ میں رہتی۔"

"ہمارے بارے میں تم نے کیا بتایا؟"

"ہم بولتی۔ صاب لوگ بوہت امیر ہوتی۔۔۔ ادھر بوہت بڑا کاروبار ہوتی" چندو نے کہا "یہ ان کا بی بی ہوتی۔ ہم نوکر ہوتی۔"

"اور انہوں نے یقین کرلیا؟" غالب نے کہا۔

میں نے کہا۔ "یہ نہیں پوچھا کہ ہم ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"ہم آپ کو ہندو بولتی۔"

"مگر یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے پھر کہا۔

"ہم نہیں جانتی۔ وہ نہیں بتاتی۔ کہتی سب کو بڑا افسر کا سامنے پیش کرتی۔"

میں نے کہا "بڑا افسر۔۔۔ خیر۔۔۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور مشین گن والے دو فوجی ٹائپ شخص اندر آگئے۔ انہوں نے ہم سب کو گردن سے دبوچ کر سجدے میں گرنے پر مجبور کردیا۔ پھر وہ ہمارے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ میں نے تیسرے شخص کے بھاری متوازن قدموں کی آواز سنی اور اس کے جوتوں کو اپنے چہرے سے ایک فٹ دور دیکھا۔

"تم بنگال سے بھاگ کر آئے ہو؟" اس نے انگریزی میں کہا۔

"یہ غلط ہے" میں نے انگریزی میں جواب دیا "ہم کلکتہ میں رہتے ہیں۔ یہاں ہمارا پرانا بزنس ہے۔"

بوٹ کی ٹھوکر میرے شانے پر لگی "جھوٹ بکتے ہو تم۔ کلکتہ میں پرانا بزنس ہے مگر تم بنگالی نہیں جانتے۔"

میں نے درد کی ٹیس کو دبا کے کہا "سر! میں کمپنی کا ملازم ہوں۔ پہلے میری پوسٹنگ دہلی میں تھی۔ اس سے پہلے میں سنگاپور میں۔ یہ ایک انٹرنیشنل فرم ہے۔"

"کیا نام ہے فرم کا؟"

"گریوز کاٹن۔۔۔" میں نے ذہن میں آنے والا پہلا نام کسی تذبذب کے بغیر بتا دیا۔

"کیا کرتی ہے یہ فرم؟"

"پاور جنریشن۔ انڈسٹریل ائر کنڈیشننگ۔"

"تم کیا کرتے ہو؟"

"میں ڈائریکٹر مارکیٹ ریسرچ ہوں۔ سوبھاش چندر۔ یہ میرے ساتھ چیف اکاؤنٹ آفیسر ہے ڈی سوزا۔۔۔ اگر تم اجازت دو تو میں باقی سوالات کا جواب کھڑے ہو کر دوں؟"

"او کے کھڑے ہو جاؤ۔ تم سب" اس نے کہا۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "تھینک یو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟"

میری بات پوری ہونے سے پہلے میرے منہ پر اس کا بھرپور مکا پڑا "تم نے جواب دینے کے لئے کھڑے ہونے کی اجازت مانگی تھی' سوال تم نہیں کر سکتے۔"

وہ چالیس سال کا ہٹا کٹا' پستہ قد' بھاری بدن والا سیاہ فام شخص تھا۔ صورت سے وہ خطرناک ذہنی مریض نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنون اور وحشت کے آثار تھے اور اس کے اطوار میں کسی خونی درندے کی جبلت کار فرما محسوس ہوتی تھی۔

مکا لگنے سے میں ایک قدم پیچھے ہو گیا تھا۔ پیچھے کھڑے ہوئے محافظ نے مجھے آگے دھکا دے کر پھر قطار میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں بلا ارادہ اس سے ٹکرا گیا جو افسر اعلیٰ کی حیثیت سے تفتیش کرنے آیا تھا۔

وہ ایک ایسا لمحہ تھا جب میں نے جان کی بازی لگا دی۔ نہ جانے کیسے میرے جسم میں اتنی قوت آ گئی کہ میں نے ایک سیکنڈ میں اس کی گردن کے گرد اپنے ایک ہاتھ کو شکنجے کی طرح کس لیا اور اس کے دوسرے ہاتھ کو موڑ کے کمر کے پیچھے کر دیا۔ خود گھوم کر اس کے پیچھے ہو گیا اور اسے ڈھال بنا کے دیوار سے لگ گیا۔ میرا ایک گھٹنا اس کی کمر پر تھا اور دوسرا پاؤں زمین پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔

وہ سخت اذیت میں چیخ رہا تھا اور محافظوں کو حکم دے رہا تھا کہ مجھے شوٹ کر دیں مگر محافظ پتھر کا بت بنے کھڑے تھے۔ اگر وہ گولی چلاتے تو اپنے افسر کے جسم کو چھلنی کرتے۔ اس کے جسم سے گزرے بغیر کوئی گولی مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"ان سے کہو ہتھیار ڈال دیں" میں نے اسے حکم دیا "جلدی کرو۔ میں صرف تین تک گنوں گا۔ پھر تمہاری گردن توڑ دوں گا۔"

میری گرفت سے اس نے اتنا اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ یہ کسی اناڑی کی گرفت نہیں ہے اور میں اپنی دھمکی پر عمل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں تین تک گنتا' ایک اور نوجوان بڑی افسرانہ شان سے کمرے میں داخل ہوا۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رکا اور کسی سے کچھ پوچھے بغیر اس نے صورت حال کو سمجھ لیا۔

اس نے ریوالور نکالنے میں دیر نہیں کی لیکن ایک ایسی غلطی کر بیٹھا جو آج سے پہلے بھی اکثر لوگوں نے کی تھی۔ اس نے نازو کو کھینچ لیا تھا اور اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا "کرنل کو چھوڑ دو۔۔۔"

اس سے زیادہ کہنے کی اسے مہلت ہی نہ ملی۔ نازو نے اس کے ساتھ وہی کیا جو میں نے کرنل کے ساتھ کیا تھا۔ نازو ایک جوان مرد کو جسمانی طاقت کے بل پر قابو میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس نے زیادہ آسان نسخہ استعمال کیا اور نوجوان افسر سے ایک سیکنڈ میں ریوالور چھین لیا۔ دوسرے سیکنڈ میں وہ اس افسر کے پیچھے چلی گئی اور وہی ریوالور اس کی گدی سے لگا دیا۔

میں نے چلا کے کہا "ایک۔۔۔ دو۔۔۔"

کرنل صاحب کے حلق سے ایک چیخ سی برآمد ہوئی۔ دونوں مسلح محافظ پہلے ہی بے بسی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ اشارہ پاتے ہی انہوں نے اپنی خودکار رائفلیں زمین پر ڈال دیں۔

"کیا ایسے تم۔۔۔ یہاں سے نکل سکتے ہو؟" کرنل نے کراہ کے کہا۔

میں نے اس کی کمر پر گھٹنا مارا "تمہارا سوالات کرنے کا اختیار باقی نہیں رہا۔"

کرنل درد سے بلبلایا اور میں نے اسے جھٹکا دے کر آگے جھکا دیا۔ نوجوان افسر جتنا حاضر دماغ ثابت ہوا تھا اتنا ہی جذباتی بھی ثابت ہوا۔ یہ اس کی عمر کا تقاضا اور گرم خون کی تاثیر تھی۔ ایک کمزور اور دھان پان سی عورت کے ہاتھوں مار کھا کے اس کی حالت زخم خوردہ سانپ کی طرح ہو رہی تھی۔ وہ خود کو سخت بے عزت اور بے غیرت محسوس کر رہا تھا۔

جب نازو نے اسے بھی سجدے میں گرنے کا حکم دیا تو اس کی قوت برداشت کا فیوز اڑ گیا۔ اس نے پلٹ کے نازو کو گالی دی اور اس کے ریوالور کی زد سے بچتے ہوئے جھک کر نازو کو ٹکر ماری۔ وہ نازو کو دیوار سے ٹکرا کے گرانا چاہتا تھا مگر اس وقت نازو بھی بجلی بن گئی تھی۔ وہ ایسے درمیان سے ہٹ گئی جیسے وہاں تھی ہی نہیں اور اس نے پیچھے سے نوجوان افسر کو ایسے لات ماری کہ اس کی رفتار بڑھ گئی۔ اس کا سر بڑی آواز کے ساتھ دیوار پر لگا۔ ابھی وہ گرا بھی نہ تھا کہ نازو کی دوسری لات حرکت میں آئی اور اس کی گردن پر پڑی۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر مر گیا۔ آخری آواز جو وہاں سب نے سنی اس کی گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی تھی۔ اس کا جسم بھی کچھ دیر پھڑکتا رہا اور پھر ساکت ہو گیا۔

اب کرنل کی سب خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دونوں محافظ بھی سجدہ ریز ہو گئے۔ میں نے اور غالب نے خودکار ہتھیار اٹھا لئے۔

"کم آن کرنل۔ اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں ہمت سے

سوالوں کے جواب دینے ہوں گے" میں نے کہا "مگر ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا آفس کہاں ہے؟"

"اسی برآمدے کے آخری حصے میں" وہ بولا۔

میں نے غالب سے کہا "اس کی جامہ تلاشی لو۔ دیکھو اس کے پاس بھی کوئی ریوالور ضرور ہو گا۔"

غالب نے اس کی وردی کی ایک جیب سے ریوالور برآمد کر لیا اور گل کی طرف بڑھا دیا۔

میں نے کہا "تمہارے علاوہ یہاں کتنے افسر ہیں؟"

"دو باقی ہیں اب۔ تین تھے" وہ بولا۔

"ان کو تم اپنے آفس میں طلب کرو گے۔ ہم یہاں سے تمہارے آفس جائیں گے۔ میں اور تم۔ وہاں تم زندہ رہتے ہو یا مُردہ اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ سب کو بھون کے رکھ دیں۔ جو بھی مزاحمت کرے......"

"مزاحمت کوئی نہیں کرے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم جہاں چاہو گے وہاں پہنچا دیئے جاؤ گے" کرنل بولا "کیا اب میں اٹھ سکتا ہوں؟"

"چلیں" میں نے اس کے شانے پر جوابی ٹھوکر مار کے کہا اور نازو کو اشارہ کیا "تم میرے ساتھ چلو۔ ان دونوں کے لئے ہمارے دو آدمی کافی ہیں۔"

"تم چاہو تو اسے بھی لے جاؤ" غالب نے گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم انہیں لے کر پانچ منٹ بعد نکلو گے" میں نے کہا "اور ہمارے پیچھے آؤ گے۔ کوئی معمولی غلطی کرے تو تمہیں احکامات کی ضرورت نہیں۔ کِل دیم لائک ڈاگس۔ تم آفس کے باہر ٹھہرو گے۔"

کرنل کے ساتھ برآمدے میں چلتے ہوئے میں نے بہت سی خالی کوٹھڑیاں دیکھیں۔ پہلے یہ یقیناً کوئی جیل خانہ تھا جو اب ان لوگوں کے قبضے میں آگیا تھا۔

کرنل کا آفس بہت وسیع اور شاندار تھا۔ میں نے باہر بھی ایک محافظ کو مسلح کھڑا دیکھا۔ اس کی مشکوک نظریں مجھ پر پہلے سے تھیں۔

میں نے اسے حکم دیا "دروازہ کھولو اور اندر چلو۔"

"کیا......؟ تم......"

کرنل نے اسے ہاتھ اٹھا کے خاموش کر دیا "دروازہ کھولو اور اندر چلو۔ خاموشی سے۔ کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا۔"

اندر داخل ہوتے ہی میں نے کرنل کو مزید احکامات جاری کئے۔ "اپنی جگہ پر بیٹھو۔ یہ کیا ہے۔ انٹرکام؟ اپنے باقی دو افسروں کو طلب کرو۔ اس محافظ سے کہو کہ ہتھیار یہاں رکھ کے خود باہر بیٹھے۔ جب افسران تشریف لائیں تو انہیں کچھ نہ بتائے۔ نہ زبان سے نہ اشارے سے نہ رویے سے۔ ورنہ باہر بھی ہمارے آدمی موجود ہوں گے۔"

کرنل نے تعمیل کی اور دونوں افسروں کو اپنے آفس پہنچنے کی ہدایت کی۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ خود کار رائفل کا رخ کرنل کی جانب رہا۔

"یہاں کوئی ڈاکٹر ہے؟" میں نے کہا۔

"ان افسروں میں سے...... ایک ڈاکٹر ہے" کرنل نے کہا۔

"ہمارے ایک ساتھی کو فوراً طبی امداد کی ضرورت ہے اور ہمیں بھی کھانے پینے کو کچھ چاہئے" میں نے کہا "جو بھی مل جائے۔"

"سب کچھ ملے گا" کرنل نے کہا "جو تم چاہو گے۔ کیا اس کے بعد تم چلے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "یو ایڈیٹ! کیمپ اب ہمارے قبضے میں ہے اور تم خود بھی ایک قیدی ہو۔ صرف اپنی زندگی کی دعا مانگو۔ سوال مت کرو ہم سے۔"

چند منٹ بعد دونوں افسران آئے اور اندر آتے ہی منجمد ہو گئے۔ کسی مزاحمت کے بغیر انہوں نے اپنے ہتھیار نازو کے حوالے کر دئے۔ میں نے غالب اور گل کو بھی اندر بلا لیا۔ سارے قیدی دیوار کے ساتھ کھڑے کر دئے گئے۔ تین ماتحت اور تین افسر۔ ان سب کی حالت غیر تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ کیمپ پر کسی نے قبضہ کر لیا ہے مگر یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہمارا تعلق کس گروہ سے ہے اور ہم اچانک کہاں سے نازل ہو گئے۔

آدھے گھنٹے بعد جب ہم چائے کافی' سینڈوچ اور بسکٹ وغیرہ کھا پی کے تازہ دم ہو گئے اور چندو کو ڈاکٹر نے انجکشن لگانے کے بعد شانے کے زخم پر مرہم پٹی سے فارغ کر دیا تو میں نے کہا۔

"کرنل۔ اب مقدمے کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔"

"مقدمہ!...... کیسا مقدمہ؟" کرنل کا رنگ فق ہو گیا۔

"تمہیں ایم آر ایس کی عدالت کے سامنے پیش ہو کے استغاثہ کے سوالات کے جواب دینے ہوں گے۔ اپنی صفائی میں تم جو کہو گے وہ بھی سنا جائے گا۔"

"واٹ دا ہیل از ایم آر ایس؟" کرنل نے کہا۔

میں نے اسے کرسی سے گھسیٹ لیا اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔

"یہ ہماری عدالتِ انصاف ہے۔ جہاں ہم اپنے قوانین کے مطابق اپنی سزا دیتے ہیں۔ ہم مُدعی' منصف اور سزا پر عمل درآمد کرنے والے سب خود ہیں۔ ایم آر ایس کا مطلب ہے مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔ یہ تم بھی جانتے ہو گے کہ اس وقت ساری دنیا میں اسی نظریے پر سیاست بھی ہو رہی ہے اور انصاف کا بھی یہی اصول ہے۔"

"میں نہیں مانتا ایسی کسی عدالت کو" کرنل چلّایا۔

"عدالت سے تعاون کر کے تم رعایت حاصل کر سکتے ہو۔

بصورتِ دیگر تم سے تعاون حاصل کرنے کا پُر اذیت مرحلہ پہلے آئے گا، سزا اس کے بعد زیادہ ملے گی۔ تم سے جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔ یہاں تمہاری نہیں ہماری مرضی چلے گی" میں نے کہا۔
"ہمارے لئے کوئی سوال کئے بغیر تمہیں گولی مار دینا کیا مشکل تھا مگر ہم تمہیں ایک موقع دینا چاہتے ہیں۔"

"او کے ... پوچھو۔ کیا پوچھنا ہے" کرنل نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"یہ کیا جگہ ہے۔ کوئی جیل خانہ؟"

"یہ پہلے پاگل خانہ تھا۔"

"پاگل کہاں گئے؟"

"کرنل نے کہا "مر گئے۔"

"کیسے مر گئے؟" میں نے کہا "تم نے مار دیا سب کو۔"

کرنل نے مجبوراً اقرار میں سر ہلایا "وہ سب خطرناک پاگل تھے۔"

"خطرناک پاگلوں کو دنیا میں کہیں قتل نہیں کیا جاتا۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"ہمیں... ان کے خون کی ضرورت تھی" کرنل نے کہا۔

میں نے چیخ کر کہا "خون کی؟ ان کے جسم سے خون کشید کر لیا تم نے! کس لئے، کس کے لئے؟"

"زخمیوں کے لئے" کرنل نے کہا۔

"کون سے زخمی؟" میں نے کہا "جو بنگال میں لڑ رہے تھے۔ پاکستان کی فوج سے؟ بھارت کے فوجی۔"

"اس نے کہا "ان کے علاوہ۔ بنگالی۔ جو اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔"

میرے وجود میں غصے کی آگ ایک دم بھڑک اٹھی تھی مگر میں نے ضبط اور برداشت سے کام لیا۔ میں ان قاتلوں کی فوج کے ناپاک جسم کا آخری قطرۂ خون بھی نچوڑ لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے میں ان کی زبانی اس انسانیت سوز ظلم کی پوری تفصیل جاننا چاہتا تھا۔

"کتنے پاگل قتل کئے تم نے اس طرح؟"

"تقریباً دو سو" کرنل نے کہا۔

"اور ان کی لاشیں کہاں گئیں؟"

"ہم نے یہاں دفنا دیں۔ اسی احاطے میں" کرنل نے کہا۔

"کیا یہ سب حکومت کے علم میں نہیں ہے؟ تم کون ہو؟"

"ہم شیو سینا کے رضاکار ہیں۔ ہم نے دو ہفتے پہلے اس جگہ پر قبضہ کیا تھا۔ ابھی تک یہ بات عام نہیں ہوئی۔ صرف ہم جانتے ہیں اور ہمارے کچھ ساتھی۔"

"اس عرصے میں کسی پاگل کا کوئی عزیز ملنے نہیں آیا؟"

"خطرناک پاگلوں کا کوئی دوست یا عزیز نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "اور یہاں کی انتظامیہ ؟"

"اسے بھی ہم نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ ان کا خون بھی کام آگیا تھا" کرنل نے کہا۔

"تم کو اندازہ ہے کچھ اپنے جرم کی سنگینی کا؟ اگر یہ بات حکومت کو معلوم ہو جائے۔ دنیا کو پتا چل جائے تو کیا ہوگا؟"

کرنل نے کہا "اس سے پہلے ہی ہم بھاگ جاتے۔ فوری طور پر اس کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہمیں سپلائی مل رہی تھی، راشن فراہم ہو رہا تھا۔"

"اگر ہم تمہیں مغلوب نہ کرتے۔ تو تم ہمارا خون بھی نکال لیتے؟" میں نے کہا۔

کمرے میں ایک بھیانک خاموشی تھی۔ گل اور ناند پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان جنونی قاتلوں کو دیکھ رہی تھیں اور خون ریزی کی ایسی لرزہ خیز کہانی سن رہی تھیں جو اس سے پہلے صرف جرمن نازی کیمپوں کے بارے میں مشہور ہوئی تھیں۔ اگر یہ بات مہذب دنیا تک پہنچ جاتی تو ساری انسانیت چیخ اٹھتی مگر اب اس کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ قدرت نے ہمیں ان بے گناہوں کے خون کا بدلہ لینے بھیج دیا تھا جو شیو سینا کے ان درندہ صفت قاتلوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ میں اب پُر سکون تھا اور فیصلہ سنانے سے پہلے مزید تفتیش کے خیال سے رُکا ہوا تھا ورنہ انہیں سزائے موت دینے کے لئے ان کا اعترافِ جرم کافی تھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ایک ٹرک میں جو نوجوان مرد اور عورتیں یہاں لائے گئے تھے، وہ کون تھے؟" میں نے کہا۔

"وہ سب مجرم تھے۔ قیدی بنا کے لائے گئے تھے بنگال سے۔"

کرنل نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ تم معاف کرنے والے نہیں ہو۔ تم بہت پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہو کہ ہمیں قتل کر دو گے مگر ہم اب موت سے نہیں ڈرتے۔ ہم نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ اپنا فرض سمجھ کے کیا۔ دشمن کے ساتھ جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جرمنوں اور جاپانیوں نے جنگِ عظیم میں جو کچھ کیا تھا ساری دنیا جانتی ہے۔ کوریا اور ویت نام میں مہذب جمہوریت پسند امریکی افواج نے کیا سلوک کیا تھا۔ اب میں نے تمہیں پہچان بھی لیا ہے۔ مجھے تمہارا نام یاد نہیں آرہا ہے مگر مجھے سب معلوم ہے کہ تم نے کیا کارنامے سر انجام دئے ہیں۔ یہ میرے لئے واقعی حیرانی کی بات ہے کہ تم یہاں کیسے آپہنچے۔ یوں سمجھ لو کہ ادھر ہم بھی وہی ہیں جو سرحد پار پاکستان میں تم تھے۔"

میں نے کرنل کو گولی ماری۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے جھکا تو میں نے کہا "یہ گولی اس الزام کے جواب میں ہے جو تم نے ہم پر عائد کیا۔ ہم نے کبھی کسی بے گناہ کا خون نہیں بہایا۔ صرف اسی کو مارا جو ہمارا دشمن تھا ہمارے وطن کا دشمن تھا۔"

کرنل نیچے گرا تو میں نے اسے ایک اور گولی ماری جو اس کے سینے میں دوسری طرف لگی "اور یہ گولی اس سزا کے طور پر جو تمہیں دو سو قابلِ رحم انسانوں کو بے رحمی سے ہلاک کرنے کے جرم پر دی

گئی۔ اور یہ آخری گولی اس ظلم کی سزا جو تم نے مشرقی پاکستان کے لوگوں پر کیا۔ وہ سب ہمارے ساتھی تھے۔"

تیسری گولی اس کے سر پر لگی تو وہ آخری بار تڑپا اور ساکت ہوگیا۔ اس کا خون فرش پر پھیل گیا تھا اور اس خون کے چھینٹے دیواروں تک پہنچے تھے۔ میری آخری گولی کے ساتھ ہی نازو نے نیم دیوانگی کے عالم میں چیختے ہوئے باقی لوگوں پر فائر کھول دیا۔ وہ سب وہیں دیوار کے ساتھ گر کے ایڑیاں رگڑنے لگے۔ نازو ان پر فائر کرتی رہی۔

غالب نے اس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی مگر اس پر جنون کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے غالب کو اٹھا کے پھینک دیا اور دوبارہ رائفل حاصل کرلی۔ گل نے ایک دہشت ناک چیخ ماری۔

"بھائی سکندر! اسے روک لیں۔"

نازو دروازے سے باہر جانے کے لئے لپکی تو میں نے دوڑ کر اسے قابو کیا۔ اس نے میری گرفت سے نکلنے کی دیوانہ وار کوشش کی مگر ناکام رہی۔ میں نے ایک ہاتھ مار کے اسے ناک آؤٹ کردیا اور وہیں میز پر لٹا دیا۔

فائرنگ کی آواز پر کیمپ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ میں اور غالب باہر نکلے تو ایک ساتھ چار محافظ دوڑتے نظر آئے۔ ایک ستون کی اوٹ سے غالب نے ان چاروں کو نشانہ بنالیا۔

"ابھی باہر والے باقی ہیں" میں نے کہا۔

"انہیں میں باہر جا کے ٹھکانے لگاتا ہوں" غالب نے کہا۔ اور میرے منع کرنے کے باوجود برآمدے میں دوڑتا چلا گیا۔ خود اس پر جنون کی کیفیت طاری تھی اور میرے لئے ضروری ہوگیا تھا کہ اسے تحفظ فراہم کروں۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔

گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے غالب کو پکڑ لیا اور اسی کمرے میں گھسیٹ لیا جس میں ہم اندر آنے کے بعد کچھ دیر قید رہے تھے "ہوش میں آؤ مرزا۔ ایسے سامنے جا کے کیوں خودکشی کرنا چاہتے ہو۔ ہماری ساری جدوجہد زندگی کے لئے ہے۔ موت کے لئے نہیں۔"

غالب نے ایک گہری سانس لی "آئی ایم سوری۔ میرے جذبات قابو میں نہیں رہے تھے۔ اس حرام زادے کی بات سن کر۔"

"آخر میں نے بھی تو وہ سب سنا تھا۔"

"اسی لئے تم مشن کمانڈر ہو۔ چیف کے ٹو" وہ مسکرایا "یہ بات ہم مذاق میں ضرور کہتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ تمہاری قائدانہ خوبیوں میں سب سے اہم یہی ہے۔ ہنگامی صورت حال میں جذبات پر کنٹرول رکھنا اور دوسروں کو بچانا۔"

اسی وقت باہر کے محافظ دوڑتے ہوئے ہمارے سامنے سے گزرے۔ میں نے غالب کو آہستہ آہستہ دبے پاؤں آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہم سے چند قدم دور ہی گئے تھے کہ پیچھے سے ہم دونوں نے فائر کئے اور وہ برآمدے میں ہی لیٹ گئے۔

"اب کون بچا ہے؟" میں نے ایک کی مشین گن اٹھا کے کہا جو لوڈڈ تھی۔

"شاید کوئی نہیں" غالب نے بھی اپنی رائفل پھینک دی اور ایک مشین گن اٹھالی "ہوگا تو اس سے بھی نمٹ لیں گے۔"

لیکن وہ اس خونی کیمپ میں شیو سینا کے آخری محافظ تھے۔

میں اور غالب لاشوں کے اوپر سے چھلانگ لگاتے ہوئے اس آفس تک پہنچے جہاں اس خود ساختہ کرنل کی اور اس کے باقی ساتھیوں کی لاشیں خون کے بہتے ہوئے ایک تالاب میں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرا تازہ خون اور بارود کی بو سے بھرا ہوا تھا۔

گل بڑی بہادری سے میز پر لیٹی ہوئی نازو کو ہوش میں لانے کی کوشش کررہی تھی اور کسی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو چکی تھی۔

"نازو۔ اٹھو۔ آنکھیں کھولو" گل نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے کہا۔ پھر غالب نے اس کے گالوں پر آہستہ آہستہ تھپڑ مارے اور نازو نے ایک دو بار اوں آں کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور پھر اٹھ بیٹھی۔ اسے کچھ دیر صورت حال کا اندازہ کرنے میں لگی اور وہ سوچتی رہی کہ آخر وہ میز پر کیوں بیٹھی ہے۔ پھر اسے سب یاد آگیا۔

اس نے انگلیوں سے بال سنوارے۔ ساڑی کو درست کیا اور میز سے اتر آئی۔ گل نے کہا "طبیعت کیسی ہے اب؟"

نازو شرمندگی سے مسکرائی "ٹھیک ہوں۔ پتا نہیں ایک دم کیا ہوگیا تھا مجھے۔"

"تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا تھا" غالب نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا "آؤ اب چلیں۔"

باہر سے اب بھی شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر یہ شور مخالف سمت کے کمروں سے اٹھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم دونوں گیٹ پر رکو" میں نے گل اور نازو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں اور غالب ابھی آتے ہیں' قیدیوں کو رہا کرکے۔"

غالب نے کہا "راستے میں بھی چار لاشیں پڑی ہیں۔ دو کی مشین گنیں ہم نے لے لی تھیں۔ تم چاہو تو باقی دو اٹھالینا۔"

وہ سیدھی برآمدے میں بڑھ گئیں۔ میں اور غالب درمیانی صحن کو عبور کرکے قیدیوں کی طرف گئے۔ وہ ٹرک ابھی صحن میں کھڑا ہوا تھا جس میں جوان' صحت مند انسانوں کا تازہ ریوڑ لایا گیا تھا کہ ان کے بدن سے قطرہ قطرہ خون نچوڑ کے بے مصرف جسم کو کہیں گاڑ دیا جائے۔

میں نے کہا "غالب' یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جسے یہ لوگ دشمن قرار دیتے تھے انہی کا لہو دے کر اپنوں کی زندگی بچاتے تھے۔ لوگ خون کا عطیہ دیتے ہیں انسانی ہمدردی کی بنا پر۔ نیکی کرنے کے لئے اور ثواب کمانے کے لئے۔ عداوت اور نفرت کے جذبات سے مغلوب ہوکے نہیں۔ جب کسی کی رگوں میں آپ کا لہو دوڑ رہا ہو

PHOSPHATE FREE

Jinni®

STAIN REMOVER

جِنی کا زمانہ آیا جِنی نے جادو جگایا

جدید کیمیکل ٹیکنالوجی سے تیار شدہ طاقتور جِنی سٹین ریموور (STAIN REMOVER) سینکڑوں دھبے بآسانی مٹاتا ہے۔

لاہور/کراچی، راولپنڈی/اسلام آباد میں تمام بڑے سٹورز پر دستیاب ہے۔

ٹیٹراگون ٹریڈرز

پی او بکس ۱۰۰۵۵، لاہور، پاکستان

NLAXON

اور اسے آپ کے خون سے زندگی ملی ہو' پھر وہ دشمن کہاں رہا۔ اس سے تو خون کا رشتہ استوار ہو گیا۔"

"یہ سب کچھ انسان سوچتے ہیں۔" غالب نے کہا "شیطان نہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت تو یہ تھی کہ اگر بس چلتا تو یہ خون سے محروم کرنے کے بعد جسموں کو مٹی میں نہ گاڑتے۔ اپنے کتوں کو کھلا دیتے۔"

دو طویل برآمدوں کی قطار میں تمیں کوٹھریاں تھیں اور ہر کوٹھری میں دو دو آدمی جانوروں کی طرح بند تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں ان کے جسم سے خون کشید کیا جائے گا۔ مگر وہ دیوانوں کی طرح چلا چلا کے رو رہے تھے۔ سلاخوں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ اپنے کپڑے پھاڑ رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔

"یہ سب دروازے تو مقفل ہیں" میں نے کہا۔

غالب نے کہا "چابیاں کسی کی جیب میں ہوں گی۔ میں لاتا ہوں۔"

غالب کے آنے تک میں نے ان لوگوں کو تسلی دی۔ اور انہیں سمجھایا کہ ہم انہیں رہا کر رہے ہیں۔ وہ میری بات تو نہیں سمجھے مگر میرے دوستانہ رویے اور محبت بھرے انداز نے انہیں کچھ حوصلہ دیا۔ پھر ایک کوٹھری میں مجھے ایک اُردو بولنے والا مل گیا۔ اس نے روتے روتے مجھے بتایا کہ وہ سرحدی علاقے کے رہنے والے لوگ ہیں۔ جنگ میں ان کے گھر بار تو تباہ ہوئے ہی تھے۔ انہیں ریلیف کیمپ میں پہنچانے کے بہانے یہاں پہنچا دیا گیا۔

میں نے کہا "آپ سب ایک ہی علاقے کے لوگ ہیں؟"

"ایک ہی گاؤں کے" وہ بولا "پورے پورے خاندان۔۔۔"

میں نے کہا "بوڑھے اور بچے کہاں ہیں؟"

اس نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ جب چلے تھے تو سب ساتھ تھے۔ دو ٹرک تھے۔ ایک میں بوڑھے اور بچے تھے۔"

میں سمجھ گیا کہ دوسرے ٹرک والوں پر کیا بیتی ہوگی۔ بوڑھوں کو یقینی طور پر ہلاک کر دیا گیا ہوگا۔ وہ کسی کام کے نہیں تھے۔ نہ خون دے سکتے تھے اور نہ غلاموں کی منڈی میں بیچے جا سکتے تھے۔ بچوں کو غلاموں کے تاجر لے گئے ہوں گے۔ لاوارث بچوں کی ضرورت رہتی ہے۔ یہ سب کچھ اسی بیسویں صدی کے مہذب' ترقی یافتہ کہلانے والے معزز معاشرے میں ہوتا تھا جس میں ہم زندہ تھے۔ غالب چابیاں لے کر آیا تو میں نے باری باری قفل کھول کے انہیں آزاد کیا۔ انہیں قید کرنے والوں نے کسی درجہ بندی کے بغیر الگ الگ کوٹھریوں میں رکھا تھا۔ ایک کی بیوی کسی کے ساتھ تھی تو بہن کسی اور کے ساتھ۔ وہ سب درمیان میں اکٹھے ہو کے اور آپس میں گلے مل مل کے رونے لگے۔

میں نے تین افراد کو منتخب کیا جو اُردو سمجھ سکتے تھے "انہیں سمجھاؤ کہ حوصلے اور صبر سے کام لیں۔ ہم انہیں یہاں سے نکال کے آزاد کر دیں گے۔ آگے یہ جہاں چاہیں جائیں۔ خود فیصلہ کریں۔ ہم اس سے زیادہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

"یہ لوگ خالی ہاتھ کہاں جائیں گے؟" ان میں سے ایک بولا۔

میں نے کہا "اچھا ہم تھوڑی بہت مالی مدد بھی کریں گے۔ بس تم انہیں خاموش کرا دو۔ اور ان کو ٹرک میں سوار کرا دو۔"

"میں ٹرک کی چابیاں بھی لے آیا ہوں" غالب نے کہا۔

"ہم ان سب کو اسی ٹرک میں بھریں گے" میں نے کہا "اور خود بھی اسی میں جائیں گے"

میرے سوال کا جواب اس شخص نے دیا جو لوگوں کو یہ سمجھانے گیا تھا کہ ہم انہیں باہر لے جا کے چھوڑ دیں گے۔

"جناب۔ کچھ لوگ میری نہیں مان رہے ہیں۔ کسی کی سننے پر تیار نہیں" وہ واپس آ کے بولا۔

"کیا مطلب۔ کیا وہ آزادی نہیں چاہتے؟"

"نہیں۔ وہ ٹرک میں سوار ہونے پر راضی نہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ انہیں دھوکے سے کسی دوسری جگہ لے جایا جا رہا ہے۔"

"اچھا" میں نے سوچ کے کہا "پھر یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ صرف آزادی؟ ٹھیک ہے۔ جانے دو انہیں جو جانا چاہیں۔"

اس شخص نے واپس جا کے اعلان کیا تو لوگ ایک دم خاموش ہو گئے۔ اب ان کی نظریں بند گیٹ پر تھیں جہاں گل اور نانڈ مسلح کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں مشین گن دیکھ کر کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

مجھے ان ستم گزیدہ لوگوں پر ترس بھی آیا اور ان کی اس ذہنی کیفیت پر دُکھ بھی ہوا "اب شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہیں گیٹ سے گزرتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بنایا جائے گا۔ چلو۔ ہم ان کا خوف دور کر دیں۔"

غالب کے ساتھ میں پہلے کمرے میں گیا جہاں ابھی تک ہمارا سامان ویسا ہی رکھا ہوا تھا۔ کسی نے ان پوٹلیوں کو کھول کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان میں میلے کپڑوں' جوتوں یا باسی کھانے کے سوا کیا ہوگا۔ اگر ہمارے ہاتھوں میں جدید وضع کے سوٹ کیس اور قیمتی بریف کیس ہوتے تو وہ سب دولت محفوظ نہ رہتی جو ان گٹھریوں میں بندھی پڑی تھی۔

میں نے ایک گٹھری کھولی جس میں ڈاکو اگروال کا مال تھا۔ میں نے غلطی سے اسی کا نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس بھی بجلی کا پھٹر سے گرا دیا تھا۔ یہ غلطی بھی شاید غیب کا اشارہ تھی کیوں کہ چند منٹ کے بعد وہ بجلی کا پھٹر گرا دیا گیا تھا۔ سوٹ کیس اگروال کے پاس رہ جاتا تو یہ دولت اس کے کام بھی نہ آتی۔

جب گیٹ کھولا گیا اور لوگوں نے ایک ایک دو دو کر کے گزرنا شروع کیا تو میں نے شمار کیے بغیر ان کے ہاتھوں میں نوٹوں کے بنڈل تھما دیئے۔ یہ ملے جلے نوٹ تھے چنانچہ نہ مجھے اندازہ تھا کہ میں کس کو کتنی رقم دے رہا ہوں اور نہ لینے والوں کو۔ وہ میرے لئے

طمانیتِ قلب کا اور احساسِ مسرت کا انوکھا تجربہ تھا۔ آزادی پا کے بھی جو لوگ شکوک اور اندیشوں کا شکار تھے اور اسے بھی تقدیر کا دھوکا سمجھ رہے تھے، اچانک اپنے ہاتھوں میں نوٹ دیکھتے تھے تو ان کا چہرہ ناقابلِ یقین خوشی، احسان مندی کے جذبات اور امید سے دمکنے لگتا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھا کے ہمارے حق میں دعائیں کرتے تھے۔ ہمارے پاؤں چھونے کی کوشش کرتے تھے اور پھر چیخیں مارتے ہوئے گیٹ سے باہر بھاگ جاتے تھے۔ انہیں اندازہ نہ تھا کہ ہم کو خدا یہاں نہ بھیجتا تو ان کے ساتھ کیا ہوتا مگر وہ اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ ہم نے ان کو نئی زندگی بخشی ہے۔

بہت سے لوگ پیسے وصول کرنے کے بعد واپس ٹرک کی طرف چلے گئے۔ ہم نے ان کا اعتماد حاصل کرلیا تھا اور وہ ہمارے ساتھ ہی جانے پر تیار ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود نصف سے زائد یوں فرار ہوئے جیسے اچانک زنجیریں کٹ جائیں، دیواریں گر جائیں اور زنداں کے دروازے کھل جائیں تو سزائے موت کے منتظر قیدی دیوانہ وار نکل جائیں۔ کوئی سمت دیکھے بغیر اور راستے کی پروا کیے بغیر جلد از جلد اس جگہ سے دور جانے کے لئے دوڑتے جائیں جہاں وہ دستِ اجل کے اسیر تھے۔

غالب نے کہا "اب ہمیں بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کوئی آجائے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اب یہاں وہی آئے گا جس کی قضا لائے گی۔ اور کوئی دو بجے تک نہیں آیا تو اب کیوں آئے گا۔ میں ذرا وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کون سی جگہ؟" غالب نے کہا۔

"جہاں یہ زندہ انسانوں کے جسموں سے خون کشید کرتے تھے" میں نے کہا۔

غالب نے مجھے روک لیا "مت جاؤ ادھر۔ ورنہ تمہاری آنکھیں وہ منظر نہ دیکھ لیں جو تمہارے خیالوں کا آسیب بن جائے۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے مرزا۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ وہاں کچھ لوگ بند رہ جائیں۔ وہ جن کی باری آگئی تھی یا آنے والی تھی۔ بعد میں انہیں کون بچانے آئے گا۔" میں نے کہا۔

غالب نے کچھ دیر سوچا اور پھر میرے ساتھ چل دیا۔ ہم نے سارے احاطے کا چکر لگا کے ہر کوٹھری میں جھانکا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ گیٹ کے قریب آخری کمرے کا دروازہ کھولتے ہی میرے دماغ کو شدید جھٹکا لگا۔ یوں جیسے میرے سر سے چار سو چالیس وولٹ کرنٹ کا تار چھو گیا ہو۔ اندر سے اٹھنے والی بُو ویسی ہی تھی جیسے کسی کمیلے کی متعفن فضا میں محسوس ہوتی ہے۔ یہ خون کی بو تھی جو فرش پر جما ہوا تھا۔ سیاہ دھبوں کی صورت میں اور دیوار پر سرخ پینٹ کی طرح۔

میں نے دل کڑا کر کے کمرے میں قدم رکھا اور بائیں طرف والے دروازے کی طرف بڑھا جو بند تھا۔ یہ پاگلوں کے علاج کا کمرا تھا جہاں شاید انہیں الیکٹرک شاک بھی دیے جاتے ہوں گے مگر اب یہ ایک مذبح خانہ تھا۔

دوسرے کمرے میں آٹھ نو فٹ کی بلندی پر لوہے کا ایک پائپ چوڑائی کے رخ لگا ہوا تھا اور اس کے دونوں کنارے مخالف دیواروں میں پیوست تھے۔ اس پائپ کے ساتھ لوہے کے دو ہک لٹکے ہوئے تھے اور نائلون کی خون آلود رسیاں پڑی تھیں۔ فرش پر دو ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر میری روح تک لرز اٹھی۔ چشمِ تصور سے میں نے دیکھ لیا کہ دو زندہ انسانوں کے پاؤں رسی سے باندھ کے انہیں ہک سے لٹکا دیا گیا ہے۔ ذبح کیے جانے والے بکروں کی طرح۔ پھر ان کی گردن کی ایک رگ کاٹ دی گئی ہے اور اس میں سے بہنے والا تازہ خون تھیلیوں میں بھرا جا رہا ہے۔ ڈرم صرف اس لئے تھا کہ ایک تھیلی بھرنے کے بعد دوسری لگانے تک بہتا خون گرے اس میں گرے۔

مجھے سخت متلی محسوس ہوئی اور میں ابکائیاں لیتا ہوا باہر بھاگا۔ غالب مجھ سے پہلے واپس چلا گیا تھا مگر مجھے پتا نہیں چلا تھا۔ اسے میں نے برآمدے کے فرش پر چت پڑا دیکھا۔ میں وہاں بیٹھ کے اُلٹیاں کرنے لگا۔ مجھے سخت کمزوری محسوس ہوئی اور ذرا سی دیر کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔

گل اور نازو ہماری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں اور گیٹ کی پہرداری بھول کے ہمیں سنبھال رہی تھیں۔ میں نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے محسوس کئے تب مجھے پتا چلا کہ میں بھی بے ہوش ہو گیا تھا۔ غالب میرے قریب ہی لیٹا ہوا تھا۔

چند منٹ بعد میں اٹھ بیٹھا "غالب!"

غالب نے آہستہ سے کہا "میں نے منع کیا تھا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "مجھے کیا معلوم تھا۔ خیر۔ اٹھو ہم اس منحوس جگہ سے نکل جائیں۔"

"میں یہ منظر کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔" غالب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ نازو کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس نے ایک گھونٹ لیا اور گلاس مجھے تھما دیا۔ پانی پی کر میں نے اپنی حالت بہت بہتر محسوس کی۔

"یہ کیا ہو گیا تھا تم دونوں کو ایک ساتھ؟" نازو نے تشویش سے پوچھا۔

"یہ نہ پوچھو تو اچھا ہے" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ جو ہم نے دیکھ لیا، وہ تم نے نہیں دیکھا۔ ورنہ تم پاگل ہو جاتیں" غالب نے کہا۔

ہم سے کچھ فاصلے پر وہ سب قیدی خاموش کھڑے تھے جن کو ہم نے قید سے رہائی دلا کے اپنا بنا لیا تھا۔ وہ ہمارے دکھ پر اتنے دکھی تھے کہ اپنا دکھ بھول گئے تھے۔

"چلو۔ سب ٹرک میں" میں نے کہا "راستے میں جس کو جہاں اترنا ہو بتا دے۔ ایک کوئی جو راستے سے واقف ہو آگے ہمارے

ساتھ بیٹھ جائے۔"

دس منٹ بعد ٹرک اس پاگل خانے سے نکلا تو میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک میاں بیوی بیٹھے تھے۔ بیوی نرس تھی اور اس کا شوہر ٹیچر تھا۔ وہ کلکتہ کے راستوں سے واقف تھے اور میری رہنمائی کر رہے تھے۔

یہ کلکتہ کے مضافات تھے۔ پاگل خانہ ضرورت کے تحت شہر سے بہت فاصلے پر بنایا گیا تھا۔ مگر صنعتی شہر کا کینسر وہاں تک پھیل گیا تھا۔ آس پاس نئے کارخانوں کی بنیادیں کھودی جا رہی تھیں یا تعمیرات جاری تھیں۔ بہت سے لوگ پاگل خانے کی گاڑی دیکھ کر ہنستے نظر آئے۔ انہیں کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ دیوانے وہ خود ہیں جو حقیقت سے بے خبر ہیں اور اپنی بے خبری پر ہنس رہے ہیں۔ اس گاڑی میں ان سے زیادہ ذی عقل، باہمت اور ہوشیار لوگ تھے۔

کلکتہ تک ایک طویل مسافت تھی۔ مضافات، کارخانے، نئی آبادیاں، کچی بستیاں، جھونپڑیاں اور محلات گزرتے جا رہے تھے۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا جس کی وسعت کا اندازہ کرنا ممکن نہیں تھا تاہم ایک فرق جو میں نے بمبئی اور کلکتہ میں محسوس کیا افلاس زدہ انسانوں کے تناسب کا تھا۔ بمبئی میں کچھ خوشحالی نظر آتی تھی اور ایک گلیمر تھا۔ یہاں غربت کی انتہا نے آبادی کی اکثریت کے چہروں پر پریشانی اور دکھ، تنگی اور خرابی کی چھاپ لگا رکھی تھی۔ یہ فرق یوں بھی زیادہ نظر آتا تھا کہ جنوبی ہند کے رہنے والے دوسری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جسم گٹھے ہوئے، مضبوط اور جفاکش لگتے تھے۔ بنگالی نسلاً لاغر، کمزور تھے اور لباس بھی کم پہنتے تھے چناں چہ ان کے استخوانی بدن اور کوتاہ قد فاقہ کشی کے تاثر کو ابھارتے تھے۔

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ٹیچر نے مجھے بہت سی خون رُلانے والی کہانیاں سنائی تھیں جو حقیقت پر مبنی تھیں مگر۔ رنج کا خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔ میں سب کچھ سن رہا تھا اور کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ میں نے جنگ کے نتائج کی ہولناکی اور تباہی کو منطقی انداز میں قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری یہ بے حسی بالکل فطری تھی۔ آپریشن ٹیبل پر مریض مر جائے تو ڈاکٹر ہاتھ دھو کے باہر نکل جاتا ہے اور سگریٹ جلا کے اپنے کسی ساتھی سے شام کی پارٹی یا فلم کے بارے میں بات کرنے لگتا ہے۔ گورکن قبر کھودنے اور مُردے کو دفنانے کے بعد اپنی کمائی پر خوش ہو کے سکون سے سوجاتا ہے۔ اجنبی سڑکوں اور پُرہجوم شاہراہوں پر ہر قسم کی ٹریفک کے درمیان کوئی اس گاڑی کو دیکھ کر ہنس بھی نہیں رہا تھا جس پر مینٹل ہاسپٹل کا نام لکھا ہوا تھا۔ کسی کو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ کسی اور کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔

میں گاڑی چلاتے چلاتے تھک گیا تھا۔ رات بھر کے سفر اور اس کے بعد ایک پُر اذیت تجربے نے میرے جسم اور اعصاب کی ساری توانائی ختم کر دی تھی۔ یہ صرف قوت ارادی کی آخری رمق تھی جو مجھے رواں دواں رکھنے میں کام آ رہی تھی۔ اس کے ختم ہونے سے پہلے میں رک جانا چاہتا تھا۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ ٹرک میرے قابو میں نہیں رہے گا اور میں کسی بس یا ٹرام سے ٹکرا جاؤں گا۔

ایک مصروف چوک سے گزرتے ہی میرا سر اسٹیئرنگ پر لگا اور ٹرک تھوڑا سا لہرایا۔ مجھے نرس کی چیخ نے بیدار کر دیا۔ میں نے عین وقت پر آنکھیں کھول کے بریک لگائے مگر اس کے باوجود ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھ گیا اور پھر اتر کے سڑک کے کنارے رک گیا۔

"اب تم لوگ جاؤ" میں نے کہا "ان سب سے کہہ دو کہ یہ بھی جائیں۔ جہاں ان کا دل چاہے۔"

پیچھے سے غالب اتر کے آگے آیا "یہ کیا ہوا تھا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ سب کو یہاں اتار دو۔"

"پیچھے تو اب کوئی نہیں ہے۔"

"کیوں؟ وہ سب لوگ...." میں نے نیچے اتر کے کہا۔

"وہ راستے میں اتر گئے۔ باری باری۔ جہاں بھی ٹرک کی رفتار کم ہوتی تھی۔ کسی موڑ پر یا چوراہے پر۔ میں دو چار افراد کو اتار دیتا تھا۔" غالب نے کہا۔

"گڈ۔ یہ تم نے عقل مندی کی۔ انہیں سمجھا دیا تھا اچھی طرح کہ وہ آج کے دن کو اپنی زندگی سے خارج کر دیں۔ یہ سمجھ لیں کہ صبح اب ہوئی ہے۔"

"ہاں۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ وہ آج کے واقعات کو بالکل بھول جائیں۔ نہ کبھی خود یاد کریں نہ کسی کو بتائیں۔ اسی میں ان کی بہتری ہے" غالب نے کہا

"اچھا تم آگے آ جاؤ۔ ٹرک چلاؤ" میں نے کہا۔

نرس اور ٹیچر نیچے اتر گئے تھے۔ انہوں نے کہا "آپ کی بہت مہربانی۔ آپ کا بہت احسان۔"

میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور ٹرک میں ان کی جگہ بیٹھ گیا۔ غالب نے ٹرک کو آگے بڑھا دیا۔

"اب کہاں چلیں؟"

میں نے کہا "پہلے اس ٹرک سے نجات حاصل کرنی ضروری ہے۔ اس کے بعد کسی ہوٹل میں چلو۔"

دو بجے ہم نے ٹرک کو ایک ریلوے اسٹیشن کے سامنے روک دیا۔ وہ کلکتہ کے بہت سے لوکل اسٹیشنوں میں سے ایک تھا۔ کسی نے ہمیں شک کی نظروں سے یا غور سے نہیں دیکھا۔ ہم میں ایسی کوئی بات ہی نہ تھی۔ ہم جیسے ہزاروں تھے۔ ہم سے بھی زیادہ عجیب حلیوں میں اور زیادہ مضحکہ خیز نظر آنے والے۔

چندو کی حالت پھر خراب ہو رہی تھی۔ مسلسل بیماری اور مناسب علاج نہ ملنے سے وہ قریب المرگ ہو رہا تھا۔ میں نے اور غالب نے اسے سہارا دے کر اتارا اور ہم کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے جہاں بہت سے قلی مزدور چادر تانے سو رہے تھے۔ ہمارے سامنے اور ہمارے پیچھے لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو دکانوں اور ریستورانوں میں بیٹھے تھے۔ خریداری

کر رہے تھے۔ آپس میں لین دین کر رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے اور لڑ رہے تھے۔ زندگی اپنی پوری گہما گہمی کے ساتھ وقت اور پیسے کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ وقت دولت ہے' دولت وقت ہے۔ انسان کی تمام مصروفیت کا محور اور کچھ نہیں۔ ایک روٹی کا مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہو جاتا ہے جتنا ایک نایاب ہیرے کے حصول کا مسئلہ۔

غالب نے کہا۔ "چندو! تم کلکتہ پہنچ گئے۔"

"ہاں! ابھی تم جاتی۔ ہم کو ادھر چھوڑ دیتی۔" وہ غالب کی بات سمجھ کے بولا۔

نازو نے احتجاج کیا "ابھی تمہاری حالت ایسی نہیں ہے چندو۔ ٹھیک ہو جاؤ تو چلے جانا۔"

میں نے کہا "ہم چندو کے ٹھیک ہونے تک یہاں نہیں رک سکتے۔ اس کی امانت اسے لوٹا دو۔"

گل نے سونے کے زیورات کی پوٹلی چندو کی طرف کھسکا دی۔

"اس کی حفاظت کر سکو گے تم؟"

"کسی کو پتا چل گیا تو وہ تمہارا سر بھی کاٹ کے ساتھ ہی لے جائے گا" غالب نے کہا۔

وہ کچھ متفکر نظر آنے لگا "ابھی یہ آپ رکھتی۔"

"نہیں۔ ہم یہ ذمے داری قبول نہیں کر سکتے۔ ہمارا کچھ پتا نہیں' کل کہاں ہوں" میں نے کہا۔

نازو نے کہا "کل تک تو چندو ہمارے ساتھ رہ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ہمارے ساتھ؟ نہیں۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اسے کسی ہسپتال میں داخل کرا دیں۔ اس کے علاج معالجے کے اخراجات ادا کر دیں اور جب تک یہاں ہیں اسے دیکھنے جاتے رہیں۔ اسے ہم اپنے ساتھ ہوٹل میں نہیں رکھ سکتے۔"

میری تجویز سے سب نے اتفاق کیا۔ پھر غالب نے وہیں کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی کے ڈرائیور سے بات کی۔ بیشتر ٹیکسی ڈرائیور فر فر انگریزی بولتے تھے۔ ایک جوشیلے نوجوان نے کہا۔

"آپ لوگ اجنبی ہیں۔ بمبئی سے آئے ہیں؟"

غالب نے فوراً تردید کی "ہم دہلی سے آئے ہیں۔ گھومنے پھرنے۔"

"اچھا تو پھر میں آپ کو کلکتہ کی سیر کراؤں گا۔ میں خود اس ٹیکسی کا مالک ہوں۔ دوسرے ڈرائیوروں کے پاس اپنی ٹیکسی نہیں ہے۔ وہ آٹھ گھنٹے کی شفٹ لیتے ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کو پرابلم ہوگی۔ میں چوبیس گھنٹے آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ میرا کوئی گھربار نہیں۔ بیوی بچے نہیں ــــ میں گریجویٹ ہوں۔ پروفیشنل گائیڈ رہا ہوں۔ آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کا ہر کام کر سکتا ہوں" اس نے ایک سانس میں کہا۔

میں نے کہا "اگر تم پھر اتنی لمبی تقریر نہ کرنے کا وعدہ کرو تو ہم تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔"

وہ مسکرایا "اب کیا رہ گیا ہے بتانے کو۔ میں وہ سب پہلے ہی بتا دیتا ہوں جو لوگ مجھ سے بعد میں پوچھتے ہیں۔ اگر آپ کہیں گے تو میں ہونٹ سی لوں گا۔"

نازو اور گل اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے سامان ڈکی میں رکھا اور چندو کو پیچھے بٹھا دیا۔

"پانچ آدمی۔ دس روپے زیادہ ہوں گے۔"

"تم نے ابھی سے گڑبڑ شروع کر دی" میں نے کہا۔

"یہ میری جیب میں نہیں جائیں گے۔ راستے میں پولیس لے گی" وہ بولا "میرے تو لگے بندھے سو روپے روز کے ہیں۔"

"اچھا پہلے ہمیں کسی درمیانے درجے کے اچھے ہسپتال میں لے چلو" میں نے کہا "ہمارا یہ دوست بیمار ہے اور زخمی ہے۔"

اس نے کہا "گولی کا زخم ہے یا خنجر کا؟"

میں نے کہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے۔ خیر۔ میں آپ کو وہاں لے جاؤں گا جہاں آپ سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔ بھروسے کے لوگ ہیں اور ایک لیڈی ڈاکٹر ہے جو ایسے کیس کے دو سو روپے زیادہ لیتی ہے۔ سو پولیس کے سو اس کے اپنے۔"

"تم جانتے ہو اسے؟"

"وہ میری چھوٹی بہن ہے۔ اسے میں نے ہی ڈاکٹر بنایا تھا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بہت بدمعاش ہو تم؟"

"بہن کو ڈاکٹر بنانے میں کیا بدمعاشی ہے؟"

میں نے کہا "تم خود اس کے لئے کیس لے جاتے ہو۔"

"پھر کون لے جائے گا؟ اور لے جانے والے تو بہن کے لئے گاہک بھی لے جاتے ہیں۔ شاید دہلی میں ایسا نہ ہو مگر کلکتہ میں ہوتا ہے۔ تم کو تجربہ ہو جائے گا۔ یہاں صرف پیسہ چلتا ہے۔ کوئی اصول قانون نہیں۔"

"تم کمال کے آدمی ہو۔ ٹیکسی کیوں چلاتے ہو آخر؟ اپنی بہن کے ساتھ مل کے ہسپتال کیوں نہیں چلاتے؟"

"چھوٹی بہن کی کمائی کیوں کھاؤں میں۔ اسے میں نے اس لئے تو ڈاکٹر نہیں بنایا تھا کہ وہ کمانے لگے تو میں وہ سب وصول کروں جو اس پر انوسٹ کیا تھا۔ میں خود کما سکتا ہوں۔ اس کے برابر نہ سہی' اس سے آدھا ضرور کما لیتا ہوں اور ٹیکسی چلانا کیا جوئے کے اڈے' شراب خانے یا چکلے چلانے سے بہتر نہیں ہے؟"

مجھے اس کی دوٹوک' بے باک باتیں پسند آئیں۔ وہ حد سے زیادہ صاف گو اور خوددار آدمی تھا۔ ایسے لوگ ایماندار' دل کے کھرے اور بااصول ہوتے ہیں۔

غالب نے کہا "تمہارے یہ جذبات واقعی قابل تعریف ہیں۔ مگر دوست' اس دنیا میں تم کیسے گزارا کرتے ہو' جہاں لوٹ کھسوٹ' بے ایمانی' منافقت اور دھوکے بازی ہے....."

"میری دنیا سب سے الگ ہے۔ اور میں اس دنیا میں بہت خوش اور مطمئن ہوں" اس نے غالب کی بات کاٹ دی۔

"ہم کسی ہوٹل میں قیام کریں گے" میں نے کہا "ہوٹل بھی

اوسط درجے کا اور شریفانہ ہو۔ اگر ہسپتال کے قریب ہو تو سب سے بہتر۔"

"قریب اور دور سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بڑے شہر کے فاصلے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ دلوں کے فاصلے اور گھروں کے فاصلے۔ آبادیوں کے فاصلے، انسانوں کے فاصلے..."

"تم تو فلاسفر ہو یار" غالب نے کہا۔

اس نے ٹیکسی کو ایک دم موڑ دیا "یہ ہسپتال ہے، دس روپے روز والا کمرا لے لو۔ ایک ہزار ایڈوانس جمع کرا دو۔ اور پیسہ کم ہے تو دو روپے روز کا بیڈ لے لو جنرل وارڈ میں۔ رکنی نام ہے میری بہن کا۔ اسے بولنا کمار نے بھیجا ہے۔"

"تم ساتھ نہیں چلو گے؟"

"نہیں۔ میری اس سے لڑائی ہے۔ بات چیت بند ہے۔"

"کس بات پر؟" نازو نے حیرانی سے کہا۔

"ہوتی رہتی ہے۔ میرے پیچھے پڑی رہتی ہے کہ میرے ساتھ رہو اور شادی کرو۔ میں دونوں کام نہیں کر سکتا۔"

"آخر کیوں؟"

"میری مرضی دیوی جی، آپ یہ مت پوچھیں۔"

چندو کا داخلہ کسی دشواری کے بغیر ہو گیا۔ رکنی بڑی نازک اور پیاری سی لڑکی تھی۔ بھائی کا نام سنتے ہی وہ چونکی۔

"کمار کہاں ملا تھا تمہیں؟ وہ خود لایا ہوگا تم کو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ ہمیں چھوڑ کے واپس چلا گیا۔"

غالب نے کہا "ہمارا دوست ٹھیک ہو جائے گا نا؟"

"ٹھیک کیوں نہیں ہوگا۔ لاؤ بارہ سو روپے نکالو" اس نے کہا، "اپنا نام پتا بولو۔"

میں نے کہا "ہم کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔"

اس نے چین دانتوں میں دبا کے کہا "اچھا جاؤ، میں لکھ لوں گی جو بھی لکھنا ہوگا۔ یہ خنجر کا زخم ہے۔ کم سے کم بارہ گھنٹے پراتا۔ مگر تم فکر مت کرو۔ پولیس کو کچھ نہیں معلوم ہوگا تمہارے بارے میں۔"

میں اور غالب واپس آئے تو کمار نے کہا "اس نے میرے بارے میں پوچھا تو ہوگا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ تمہارا نام لینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔"

اس کا چہرہ اتر گیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں ہنس پڑا "عجیب چیز ہو تم بھائی بہن۔ اسے تو یہ بھی یقین تھا کہ ہمیں تم ہی لائے ہو۔ میں نے جھوٹ بول دیا کہ تم ہمیں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی ایسے ہی اتر گیا تھا۔"

نازو نے کہا "کب تک چلے گی یہ لڑائی؟"

اس نے ٹیکسی چلاتے ہوئے کہا "ابھی چلے گی۔ ورنہ وہ بھی یقین نہ کرتی تم پر۔ باہر آ کے مجھے پکڑ لیتی۔"

"اس کی شادی ہو گئی ہے؟"

"نہیں۔ ضد پر اڑی ہوئی ہے کہ پہلے میں شادی کروں۔ اس کا جو پکا ہے، ڈاکٹر ہے وہ بھی۔ بچارا مجھے اور اسے مناتا رہتا ہے اور صبر کیے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے پچاس سال تو انتظار کروں گا۔ اس کے بعد نہیں۔ ابھی بتیس سال کا ہے، بیاسی کا ہو جائے گا۔"

"اس کے بعد شادی کرے گا" نازو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس کے بعد خودکشی کرے گا۔"

"مجھے تو تم سب پاگل لگتے ہو" نازو کا ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا۔

غالب نے کہا "ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک ہی دن دونوں شادی کر لو۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا "رکنی کا تو گھر ہوگا۔ میرے پاس ابھی رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ پہلے گھر بساؤں گا پھر بساؤں گا۔ شادی کے بعد بہن کے گھر میں رہوں، یہ ناممکن ہے۔ رکنی کو عقل سے کام لینا چاہیے۔"

"یہ مسئلہ ہی جذبات کا ہے۔ عقل کیا کرے گی" میں نے کہا۔

اس نے ٹیکسی روک لی "ایک تو یہ ہوٹل ہے۔"

میں نے پانچ منزلہ وسیع و عریض عمارت کو دیکھا جس کے باہر والے گیٹ پر "ہوٹل وائسرائے" لکھا ہوا تھا اور اندر پارکنگ ایریا میں سیکڑوں کاریں کھڑی تھیں۔ یہ فائیو اسٹار تو نہیں مگر فور یا تھری اسٹار ہوٹل یقیناً تھا۔

"ہم وائسرائے تو نہیں ہیں یار" غالب نے کہا۔

نازو نے بھی کہا "اس کا کرایہ بہت ہوگا۔"

لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم ایسے ہی ہوٹل میں زیادہ محفوظ ہوں گے۔ اگرچہ ہمارا سامان اور حلیہ انتہائی مضحکہ خیز تھا مگر اصل چیز پیسہ تھی جو ہمارے پاس کم نہ تھا۔

"ٹھیک ہے مسٹر کمار۔ ہم یہاں قیام کریں گے۔ تم یہ سو روپے رکھو۔ ایڈوانس۔"

اس نے کہا "تھینکس۔ میں اسی جگہ موجود رہوں گا۔"

"کل صبح تک شاید تمہاری ضرورت نہ پڑے۔"

"پھر بھی میں کہیں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو آپ کسی ویٹر کے ذریعے مجھے طلب کر سکتے ہیں" کمار نے کہا۔

ہوٹل کے دربان اور پورٹر نے ہمارا استقبال کرتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی۔ یہاں آنے والے کاروں سے اترتے تھے اور ان کے پاس غیر ملکی سوٹ کیس ہوتے تھے۔

میں نے کاؤنٹر پر جا کے کہا "ہمیں رو ڈبل روم چاہئیں۔"

کلرک نے مجھے غور سے دیکھا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "تم کو معلوم ہے کرایہ..."

میں نے اتنے زور سے کاؤنٹر پر مکا مارا کہ وہ اچھل پڑا "تم کو جرأت کیسے ہوئی یہ پوچھنے کی؟ کیا میں حقیر نظر آتا ہوں تمہیں؟ یا کوئی جاہل۔ میں دنیا کے ہر بڑے شہر کے ہر بڑے ہوٹل میں ٹھہرا

ہوں مگر ایسی بدتمیزی سے کسی نے بات نہیں کی۔ آخر تم سمجھتے کیا ہو خود کو۔ اپنے منیجر کو بلاؤ۔"

شور نے دوسرے مسافروں کو متوجہ کر لیا تھا جو وہاں بکنگ لے چکے تھے یا اس انتظار میں تھے کہ پورٹر ان کا سامان اٹھائے۔ ان میں سے کچھ مسکرائے۔ ایک غیر ملکی نے فرنچ میں ساتھی عورت سے کہا "یہ پُراسرار لوگ ہیں۔"

میں اس پر برس پڑا "کیا پُراسراریت ہے مجھ میں؟" میں نے فرانسیسی کی ساری مہارت بروئے کار لاتے ہوئے کہا "میرے سر پر سینگ ہیں۔ جب میں پیرس کے کسی ہوٹل میں جاتا تھا تو وہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ مجھ پر ایک تمسخری نگاہ بھی ڈال سکے۔"

فرانسیسی بری طرح بوکھلا گیا "موسیو۔ میں ـــ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مطلب میں خوب سمجھتا ہوں۔ پُراسرار تو مجھے تم لگتے ہو۔ ضرور یہاں جاسوسی کرنے آئے ہو گے" میں نے کہا۔

"تم حد سے بڑھ رہے ہو" وہ گرم ہو گیا۔

اتنے شور کے بعد منیجر کا باہر آنا یقینی تھا۔ جب اسے ساری بات معلوم ہوئی تو ظاہر ہے کہ شامت غریب کلرک کی آئی۔ زلہ بر عضو ضعیف۔ منیجر نے بہت معذرت کے بعد خود ہمیں کمروں کی چابیاں دیں اور رجسٹر میرے سامنے رکھ دیا کہ اس میں ناموں کا اندراج کروں۔ میں بھی چاہتا تھا کہ بلاوجہ کی پوچھ گچھ اور تصدیق کا مسئلہ درپیش نہ ہو۔ میں نے ایک نام "مسٹر اور مسز آفریدی" اور پتا "بائیس راج بلڈنگ' اجمل خان روڈ' قرول باغ دہلی" لکھا۔ دوسرا نام میں نے "مسٹر اینڈ مسز ڈی سوزا لکھا۔ پانچ ہزار روپے ایڈوانس دینے کے بعد ہم معتبر ہو گئے۔

اس وقت تک دوپہر کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا لیکن کھانا ضروری تھا۔ روم سروس سے کافی' چائے اور سینڈوچ منگوا کے کھاتے ہی ہم نے باہر "ڈونوٹ ڈسٹرب" کا بورڈ سیدھا لٹکایا اور کمرے اندر سے بند کر کے سو گئے۔ ایک کمرے میں گل اور نازو تھیں اور ساتھ والے میں' میں اور غالب۔ یہ بے ہوشی کی ایسی نیند تھی کہ زلزلہ بھی آجاتا تو مجھے خبر نہ ہوتی۔

جب میری آنکھ کھلی تو گھڑی میں آٹھ بج رہے تھے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ میں صرف چار گھنٹے سویا۔ لیکن پردوں کے پیچھے کھڑکی کے شیشے تاریک نہیں تھے۔ رات ہوتی تو کمرا بھی اتنا روشن نہ ہوتا۔

میں اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور پردے ہٹا کے باہر دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ اس وقت صبح کے آٹھ بجے ہیں اور میں سولہ گھنٹے بعد جاگا ہوں۔ غالب ابھی تک سو رہا تھا اور ساتھ والے کمرے کی خاموشی بھی بتاتی تھی کہ گل اور نازو کی آنکھ بھی نہیں کھلی ہے۔

میری ساری تھکن دور ہو گئی تھی لیکن جسم کا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ مجھے گرم پانی سے غسل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے میں نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیا تو دھواں خالی پیٹ میں گھونسے کی طرح لگا۔ میں نے سگریٹ بجھا کے روم سروس سے کافی منگوانے کا سوچا' ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھینچ لیا۔ کیوں نہ پہلے میں اپنا حلیہ درست کر لوں۔ یہ جھاڑ جھنکاڑ صاف کرا دوں۔ داڑھی اور سر کے بال آپس میں یوں مل گئے تھے کہ میں حلیے سے پہاڑوں کی گپھا میں رہنے والا جوگی نظر آتا تھا۔ یہی حال مرزا غالب کا بھی تھا۔ اس ہیئت کذائی کے ساتھ ہوٹل والوں سے ہمارا جو استقبال ہوا تھا وہ غلط بھی نہ تھا۔ ایسے حلیے کے لوگ یہاں آتے بھی ہوں گے تو باہر سے ہی دھتکار دیئے جاتے ہوں گے۔ ہمارے ساتھ گل اور نازو نہ ہوتیں تو شاید دربان ہمیں بھی "معاف کرو بابا" کہہ کے روک دیتا۔ ہوٹل والے غلط قسم کے افراد کو روکنے کے لئے "حقوق داخلہ محفوظ ہیں" کا بورڈ تو ہر جا رکھتے ہیں۔ اگر میں انگریزی اور پھر فرانسیسی نہ بولتا تو عین ممکن تھا کہ منیجر بھی مجھے کمرا دینے سے انکار کر دیتا۔

حلیہ بدلنا مشکل اور لمبا کام تھا۔ میں نے فون اٹھا کے روم سروس سے بات کی "کیا یہاں ہیئرڈریسر ہے۔"

"یس سر۔ بیسمنٹ میں سیلون ہے۔"

"میں اسے یہاں مانگتا ہوں" میں نے کہا۔

"سوری سر۔ ہیئر ڈریسنگ کے لئے روم سروس نہیں ہے' آپ کو زحمت کرنی پڑے گی۔"

"او کے۔ ہم زحمت کریں گے بعد میں۔ ابھی ہمارے لئے دو بلیک کافی بھیجو" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔

دوسری کافی میں نے غالب کے لئے منگوائی تھی جو میری آواز سن کے جاگ گیا تھا۔

"میں بہت دیر سے سوچ رہا تھا کہ پہلے کیا کروں۔ نہاؤں' کافی پیوں یا انسانوں کی شکل میں آنے کے لئے بالوں کا یہ جنگل صاف کراؤں" میں نے کہا۔

غالب نے گھڑی دیکھی اور انگڑائی لے کر بولا "وہ ابھی سو رہی ہیں۔ خیر سونے دو۔"

میں نے کہا "آج میں سکندر بخت کا چہرہ دیکھوں گا۔ بہت عرصے بعد..."

غالب نے کہا "میں تو بھول گیا ہوں کہ میں کیسا تھا اور کیا تھا۔ اب تو یقین نہیں آتا کہ میں ایک صحافی تھا۔"

"ہم ایسا کرتے ہیں کہ کافی پی کے باہر چلتے ہیں" میں نے کہا' "کیمرا کو ساتھ لیتے ہیں۔ پہلے اسی حلیے میں تصویریں بنوائیں گے یادگار رکھنے کے لئے۔ پھر کہیں سے بال کٹوائیں گے اور ریڈی میڈ کپڑے خریدیں گے۔"

"گل اور نازو پریشان ہوں گی کہ ہم بغیر بتائے کہاں نکل گئے" غالب نے کہا۔

"ان کے لئے دروازے کے نیچے سے پیغام چھوڑ جائیں گے کہ بازار جا رہے ہیں۔ وہ نہا دھو کے ناشتا کر لیں۔"

غالب نے مجھ سے اتفاق کیا اور کافی ختم کرتے ہی ہم ہوٹل سے نکل گئے۔ ہمارا کمرا تیسرے فلور پر تھا چنانچہ جب ہم زینے سے

اتر رہے تھے تو بہت سے اوپر آنے والوں نے ہمیں حیرانی اور دلچسپی سے دیکھا۔ ہم ہال سے گزرے تب بھی لوگوں نے ہمارے بارے میں مختلف تبصرے کیے۔ ہمیں خبطی' ہپی' جوگی وغیرہ قرار دیا گیا۔ ایک خاتون نے تو یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ہمارے بال اصلی نہیں ہیں اور ہم نے بھیس بدل رکھا ہے۔

کمار اپنی ٹیکسی کو صاف کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ تیر کی طرح آیا "گڈ مارننگ سر۔"

میں نے کہا "تم رات کو کہاں تھے؟"

"وہ.... دراصل.... رکنی لے گئی تھی مجھے کان سے پکڑ کے' کیا آپ نے تلاش کیا تھا مجھے؟" وہ خفت سے بولا۔

"نہیں۔ مگر رکنی یہاں کیسے آگئی تھی؟"

"وہ بہت چالاک ہے۔ اس نے یقین کب کیا تھا آپ کی بات کا۔ گاڑی لے کر پیچھے چل پڑی تھی" کمار نے کہا "آپ کے دوست کی حالت بہت اچھی ہے اب۔"

میں نے کہا "یہ اچھی خبر سنائی تم نے۔ اب فوری طور پر ہسپتال جانا ضروری نہیں رہا۔"

"پھر کہاں جانا ہے پہلے؟"

میں نے اسے اپنا پروگرام بتا دیا۔ ٹیکسی روانہ ہوگئی۔

اس نے کہا "ایک مشورہ دوں۔ برا تو نہیں مانیں گے؟"

میں نے کہا "مفت کچھ بھی ملے' ہم لے کر خوش ہوتے ہیں۔"

اس نے کہا "آپ بال ضرور کٹوائیں۔ مگر فرنچ کٹ داڑھی رہنے دیں۔ آپ پر اچھی لگے گی۔"

میں نے حیرانی سے غالب کی طرف دیکھا "یہ لڑکا تو بہت ہی سمجھ دار ہے۔ ہم سے بھی زیادہ۔"

"تم سے زیادہ' مجھ سے کم" غالب نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد ہم پھر ہوٹل میں داخل ہوئے تو بہترین سوٹ' ٹائی' سلیقے سے بنے ہوئے بالوں اور نفاست سے تراشی ہوئی فرنچ کٹ داڑھی کے ساتھ ہماری شخصیت بالکل بدل چکی تھی۔ دربان نے ہمیں سیلوٹ کیا اور ہمارے گزر جانے کے بعد ہمیں پہچانا۔ کاؤنٹر کلرک نے استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "یس سر۔" پھر جیسے الیکٹرک شاک لگا۔ وہ دم بخود کھڑا ہمیں اوپر جاتا دیکھتا رہا۔

لیکن جتنی حیرت گل اور نازو کو ہوئی اس سے کہیں زیادہ ان کی خوشی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو وہ جاگ رہی تھیں۔ ان کے باتیں کرنے کی آواز باہر سنائی دے رہی تھی۔ گل نے دروازے کے قریب آ کے کہا "کون...."

میں نے کہا "مسٹر اکندی اور مسٹر ڈی سوزا۔"

گل نے دروازہ کھولا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے بار بار ہمیں دیکھا اور خوشی سے ایک چیخ ماری۔

"بھائی سکندر.... آپ.... غالب.... یہ.... اف کتنے اچھے لگ رہے ہیں آپ دونوں" اس نے معصومیت سے دمکتے چہرے اور بھرپور ہنسی کے ساتھ کہا۔

میں نے ان کے کپڑوں کے پیکٹ بیڈ پر ڈال دیے۔ نازو بالکل سحر زدہ سی کھڑی تھی اور رونے کے قریب ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا' تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" غالب نے کہا۔

نازو کے آنسو چھلک پڑے "خوشی... مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری کھوئی ہوئی خوشیاں مجھے واپس مل گئی ہیں۔ کہیں یہ خواب نہ ہو۔"

میں نے کہا "ابھی یہ خواب ہی ہے نازو۔ حقیقی خوشی کے لئے ابھی کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی تو صرف ہمارے چہرے واپس ملے ہیں۔ وہ زندگی نہیں ملی جس سے ہم بچھڑ گئے تھے۔"

"وہ بھی مل جائے گی اب" غالب نے کہا۔

"جب محسن ملے گا" گل نے کہا اور پھر ایک دم رو پڑی۔

میں نے اسے گلے لگا کر تسلی دی "پاگل۔ روتی کیوں ہے۔ محسن بھی مل جائے گا۔ چند دن کی بات ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم آج ہی ڈھاکا روانہ ہو جائیں گے کسی وقت۔ آج نہ جا سکے تو کل بہرحال چلیں گے۔ ڈھاکا کون سا بہت دور ہے۔ بس وہاں پہنچنے کا تھوڑا سا مشکل مسئلہ ہے۔ حالات کی وجہ سے۔ وہ ہمارا منتظر ہوگا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ہر روز شاہ باغ ہوٹل کے سامنے خود موجود رہے گا یا اپنا پیغام چھوڑ جائے گا۔ اس کا پتا ہے ہمارے پاس۔ اسے تلاش کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ بس اس کے ملتے ہی ہم واپس جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا' چلو اب یہ رونا دھونا چھوڑو۔"

"ہاں۔ تمہارے لئے بھی کپڑے لائے ہیں ہم۔ کپڑے بدلو پھر بات کرتے ہیں" غالب نے کہا "ہم بھی نہا دھو لیں۔"

"تم نے ناشتا کیا؟" میں نے کہا۔

گل نے نفی میں سر ہلایا "ابھی نہیں۔ آپ کا انتظار تھا۔"

"اچھا۔ ہم ابھی اکٹھے ناشتا کرتے ہیں" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھتا' دروازہ کھلا اور پولیس اندر آگئی۔ ایک انسپکٹر کے ساتھ چار مسلح پولیس والوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ ان کے ساتھ ہوٹل کا منیجر بھی تھا۔

"یہی ہیں وہ انسپکٹر۔ انہوں نے حلیے بدل لئے ہیں آج صبح ہوتے ہی" منیجر نے کہا۔

انسپکٹر نے کہا "یہ لوگ حلیے بدلتے رہتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں انہیں۔ اچھا اب آپ جائیں۔"

منیجر نے کہا "میرے ہوٹل کی نیک نامی کا خیال رکھیے گا۔ میں نے آپ سے پورا تعاون کیا ہے۔"

وہ دروازہ بند کر کے نکل گیا۔ انسپکٹر نے حکم دیا کہ ہم ہاتھ اوپر اٹھالیں اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔

شکاری کا ہوش کے اسرار شکنجے۔ شکاری۔ شکار بالی واقعات آئندہ ماہ جاسوسی ڈائجسٹ میں پڑھیے

شراب خانے کو لُوٹنے والا نوجوان، سراغرساں ہو مرکی گولی کھا کر منہ کے بل فٹ پاتھ پر گر گیا۔ اس نے کریم کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا، جسے خاصی نغاست سے استری کیا گیا تھا۔ اس کے سیاہ شوز پالش سے چمک رہے تھے۔

اسے گرتے دیکھ کر آٹھویں ایونیو پر گاڑیاں رکنا شروع ہو گئی تھیں اور لاش کے گرد ایک چھوٹا سا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔

رات ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ اتنے خوبصورت موسم میں کسی کا خاک و خون میں نہا جانا بہت ہی برا شگون تھا۔

قانون کے ایک محافظ کا قصہ جو مجرم کو دوست سمجھ رہا تھا

خوش قسمت

خالدہ شاد

مقتول ایک مجرم اور قاتل قانون کا محافظ تھا۔ مگر وہ اپنے کارنامے پر خوش نہ تھا۔ اپنے فرض کی یہ ادائیگی اُسے ظالمانہ محسوس ہو رہی تھی۔ مقتول مجرم کی آخری مسکراہٹ نے اُسے بے چین کر رکھا تھا۔ آں جہانی کے بیوی بچوں کے بے سہارا ہونے کی وجہ سے وہ پریشان تھا۔

"بہت خوب جارج۔" دوسرے سراغرساں نے جارج ہومر سے کہا۔ "تم نے بہت مستعدی اور تیزی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کوئی غلطی نہیں کی۔ اسے کہتے ہیں پُر اعتماد اور بے داغ نشانہ۔"

"شکریہ مارلی۔" ہومر نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ اپنے بے داغ نشانے پر خوش نہیں تھا۔

"مجھے امید ہے کہ اب تمہاری جلد ترقی ہوجائے گی۔" مارلی نے کہا۔ "تم عنقریب سارجنٹ بن جاؤ گے۔"

ہومر کچھ نہیں بولا۔ اس کے سانس کی رفتار ہنوز بے ترتیب تھی۔ وہ اکڑوں بیٹھ کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

دونوں پولیس کی بے نشان کار پر گشت کرتے ہوئے وہاں سے گزر رہے تھے' جسے سراغرساں مارلی چلا رہا تھا۔

ہومر نے نوجوان کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا' اس کی عمر میرے برابر ہوگی۔ یعنی تیس سال۔ یا ہوسکتا ہے کہ اکتیس یا بتیس سال کے لگ بھگ ہو۔ یہ شکل و صورت سے مجرم نہیں لگتا۔ اور یہ اوباش تو ہرگز نہیں تھا۔ اس کا لباس اور وضع قطع اوباشوں جیسی ہرگز نہیں ہے۔ اس کے سرخی مائل بھورے بال صفائی سے کٹے ہوئے ہیں اور شکل و صورت سے یہ آرٹسٹ لگتا ہے۔

شراب خانے کی کھڑکی سے آنے والی تیز روشنی متوفی نوجوان کے عین اوپر پڑ رہی تھی۔ اس روشنی میں اس کے ہاتھ کی لکیریں تک نمایاں تھیں۔

سراغرساں ہومر اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا' کیوں کہ وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ لیکن جب وہ شراب خانے سے دوڑتا ہوا باہر آیا تھا تو ہومر نے بڑی وضاحت سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اور وہ اس چہرے کو اور اس مسکراہٹ کو جو گولی لگنے سے لمحہ بھر پہلے اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی' کبھی نہیں بھلا سکتا تھا۔ اس مسکراہٹ میں ایک التجا سی پائی جاتی تھی۔

چند منٹوں کے بعد کئی اسکواڈ کاریں موقع پر پہنچ گئیں۔ ان کے سائرن کی آوازوں سے پورا علاقہ گونج رہا تھا۔

سراغرساں مارلی نے متوفی کی بیک پاکٹ سے بٹوا نکالا اور اس کے کاغذات چیک کرنے لگا۔

"یہ کوئی اناڑی ڈاکو تھا۔" اس نے کہا۔ "احمق اپنے پورے شناختی کاغذات کے ساتھ واردات کرنے آیا تھا۔"

"اس کا نام کیا ہے؟" ہومر نے پوچھا۔

"اس ڈرائیونگ لائسنس کے مطابق اس کا نام ٹم میکائے ہے۔ اور اس لائسنس کی دو سال سے تجدید نہیں کرائی گئی۔ یہاں اس کا پتا بھی موجود ہے۔ یہ ایمسٹرڈیم ایونیو کا رہنے والا ہے۔ نمبر ٹھیک سے پڑھا نہیں جا رہا۔ صرف بیالیس پڑھا جاتا ہے اور یہ چند تصویریں بھی ہیں۔"

پہلی تصویر ایک خوبصورت عورت اور دو سرخ بالوں والے بچوں کی تھی۔ عورت نوجوان اور پُرکشش تھی۔

"یہ اس کے بیوی بچے معلوم ہوتے ہیں۔" مارلی نے کہا' پھر ہومر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے جارج۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہم... میں ٹھیک ہوں۔" ہومر نے جواب دیا۔ "دراصل اس سے پہلے کبھی کوئی آدمی میرے ہاتھ سے نہیں مارا گیا۔"

اس اثنا میں ہجوم کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی اور باوردی پولیس والوں نے انہیں پیچھے ہٹانا شروع کردیا تھا۔

متوفی میکائے کے بائیں ہاتھ میں ہنوز وہ نوٹ دبے ہوئے تھے جو اس نے شراب خانے سے لوٹے تھے۔

مارلی نے اس کی مٹھی سے نوٹ نکال کر گنے اور بولا۔ "فقط ایک سو اکیس ڈالر! میرا خیال ہے کہ اس نے پہلی دفعہ واردات کی ہے۔"

قریب ہی ایک لفافہ اور ایک چھوٹا سا آٹومیٹک پستول بھی پڑا تھا۔ لفافہ غالباً میکائے کی جیب سے نکل گرا تھا۔ مارلی نے یہ دونوں چیزیں بھی اٹھالیں اور ان پر نمبر لگا کر انہیں ایک تھیلی میں رکھ لیا۔ پھر دونوں مزید کارروائی کے لئے ماہرین کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

مارلی نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ہومر کی طرف بڑھایا' بولا۔ "سگریٹ؟"

"شکریہ مارلی۔" ہومر نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے سگریٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اوپر سے خاصا پُرسکون نظر آرہا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کے اندر ایک عجیب سا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ ٹم میکائے کا چہرہ اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ شاید وہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ دروازہ کھلتے ہی ہوا کا ایک جھونکا بھی اندر داخل ہوا اور پردوں میں سرسراہٹ پیدا کرتا چلا گیا۔ ہومر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی بادبانی کشتی میں سفر کر رہا ہو۔ وہ دبے پاؤں اپنے بچوں کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ کمرے میں مدھم روشنی ہو رہی تھی اور بستر پر دو خوبصورت بچے محوِ خواب تھے۔ ان کے کمرے کی کھڑکی بند تھی۔ کیوں کہ جولائی کے مہینے میں جنوب کی طرف سے خاصی تیز ہوا چلتی تھی۔

ہومر نے دونوں بچوں کو پیار کیا اور بے آواز چلتا ہوا کچن میں چلا گیا' جہاں فریج کے اندر سے مدھم گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے لئے مشروب کا ایک گلاس بنایا اور سوچنے لگا کہ میکائے کے بچے بھی ایسے ہی کسی اپارٹمنٹ میں سو رہے ہوں گے۔ انہیں یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ تھوڑی دیر پہلے ان کے باپ کی لاش ٹھنڈے اور سخت فٹ پاتھ پر پڑی تھی۔

"جارج؟" دوسری خواب گاہ سے ہومر کی بیوی لورا کی آواز سنائی دی۔

ہومر اپنا گلاس لئے ہوئے خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ لورا نے

ٹیبل لیمپ آن کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ہومر بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا اور ہولے ہولے مشروب کی چسکیاں لینے لگا۔

لزا نے بھویں سکیڑ کر شوہر کو گھورا' پھر بولی۔ "کیا بات ہے جارج۔ آج تم اتنے چپ چپ کیوں ہو؟"

"کام کا دباؤ۔" ہومر نے گہرا سانس لیا۔

"کام کا دباؤ تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔"

"آج ہمیں ایک واردات سے نمٹنا پڑا۔"

لزا کے چہرے پر فکر مندی نظر آنے لگی۔ وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟"

"آٹھویں ایونیو پر ایک شخص' جو شراب خانہ لوٹ کر فرار ہو رہا تھا' میری گولی سے ہلاک ہو گیا۔"

"اوہ' میرے خدا!" لزا اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"اس کے ایک ہاتھ میں کرنسی نوٹ اور دوسرے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔ جب ہماری گاڑی شراب خانے کے سامنے پہنچی تو وہ دوڑتا ہوا باہر آ رہا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کی گولی کا نشانہ بھی بن سکتے تھے۔"

"لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بڑی آسانی سے میری گولی کا نشانہ بن گیا۔ اور... پتا ہے کیا' اس کی شکل تمہارے بھائی فرینک سے بہت ملتی تھی۔ اور تمہیں پتا ہی ہے کہ میں فرینک کو بہت پسند کرتا ہوں۔"

لزا فکر مندی سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ گئی کہ جارج اپنے فعل پر صرف نادم ہی نہیں سخت پریشان بھی تھا۔

"جارج' مجھے شروع سے آخر تک ساری بات بتاؤ۔" اس نے کہا۔ وہ جانتی تھی باتوں سے اس کے شوہر کے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ "لیکن یہاں نہیں' آؤ کچن میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے کافی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

دونوں کچن میں جا بیٹھے۔ لزا نے کافی بنائی اور ایک کپ ہومر کے سامنے رکھ کر اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

"سب کچھ بالکل اچانک ہی ہو گیا۔" ہومر نے کافی کا سپ لینے کے بعد کہا۔ "مارٹی گاڑی چلا رہا تھا اور ہم باتیں کرتے ہوئے آس پاس کا جائزہ لے رہے تھے۔ کار کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ جب ہم اس شراب خانے کے قریب پہنچے تو اندر سے شور کی آواز سنائی دی۔ مارٹی نے گاڑی روک دی۔ میں نے اپنا ریوالور نکالا اور تیزی سے باہر نکلا۔ تب ہی وہ شخص شراب خانے کے دروازے سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں آٹومیٹک پستول اور بائیں ہاتھ میں چند کرنسی نوٹ دبے ہوئے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ شاید وہ رحم کی اپیل کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت سوچنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فائر کر دیا اور وہ منہ کے بل فٹ پاتھ پر گر گیا۔"

"جارج' اس میں پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر تم فائر کرنے میں پہل نہ کرتے تو اس ڈاکو کی جگہ تم فٹ پاتھ پر پڑے ہوتے۔"

"یہ شخص عمدہ لباس میں ملبوس تھا اور شکل و صورت سے شریف آدمی لگتا تھا۔" ہومر نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اگر میں فائر کرنے میں جلدی نہ کرتا تو شاید وہ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیتا۔"

"یا شاید فائر کر دیتا۔" لزا نے کہا "جارج' اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ تم نے وہی کیا جس کی تمہیں ٹریننگ دی گئی ہے۔ تمہارے سامنے کوئی شریف آدمی نہیں' ایک مسلح ڈاکو تھا۔"

"منطقی طور پر تمہاری بات ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بات پھر بھی مجھے پریشان کر رہی ہے۔ وہ مسلح ضرور تھا' اس نے شراب خانہ بھی لوٹا تھا' مگر اس کی وضع قطع مجرموں جیسی نہیں تھی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ مجھے اچھا لگا تھا۔"

لزا حیرت سے اسے گھورنے لگی۔ ایک طویل توقف کے بعد اس نے کہا۔ "جارج' وہ شخص شراب خانہ لوٹ کر باہر آ رہا تھا' تم نے ایک لمحے کے اندر کیسے فیصلہ کر لیا کہ وہ اچھا آدمی ہے۔"

"یہ فیصلے کی نہیں تاثر کی بات ہے۔ جب وہ فٹ پاتھ پر مُردہ پڑا تھا اور ہم اس کا معائنہ کر رہے تھے' تو مجھے اس کے چہرے کے تاثرات یاد آ گئے۔ اس کی مسکراہٹ یاد آ گئی اور مجھے اچانک افسوس ہونے لگا۔ پھر جب مارٹی نے اس کے کاغذات اور تصویریں چیک کیں تو مجھے مزید افسوس ہوا۔ اس کا نام ٹم میکائے تھا اور ایمسٹرڈیم ایونیو کا رہنے والا تھا۔ تصویر سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے تھے۔ ہماری طرح!"

"تم ان باتوں کو خوامخواہ اپنے اوپر مسلط کر رہے ہو۔ لزا نے کہا۔ "ہر شخص کے بیوی بچے ہو سکتے ہیں اور ہر شخص خود اپنے بیوی بچوں کا ذمے دار ہوتا ہے۔ اگر اس... ٹم میکائے کو اپنے بیوی بچوں کا احساس ہوتا تو وہ گن جیب میں ڈال کر ڈکیتی کی نیت سے گھر سے نہ نکلتا۔ اسے ڈکیتی سے وابستہ خطرے کا یقیناً اندازہ ہو گا۔"

ہومر نے بیوی کی بات پر غور کیا' مگر مطمئن نہیں ہوا' بولا۔ "پولیس اسٹیشن پہنچ کر ہم نے ٹم کے بارے میں چھان بین کی تو پتا چلا کہ اس کا پولیس میں کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ اس نے اس سے پہلے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ ایک خوش پوش شخص تھا۔ یقین کرو' اگر وہ زندہ ہوتا تو مجھ سے اور مارٹی سے زیادہ معزز لگتا۔ اس کے بٹوے میں ایک سینٹ نہیں تھا۔ اس کی جیب سے ایک لفافہ برآمد ہوا تھا' جس میں چند بل رکھے تھے۔ یہ بل دو مہینے اور تین مہینے سے واجب الادا تھے۔ اور اس کے چہرے پر

میں نے جو مسکراہٹ دیکھی تھی ' وہ تمہارے بھائی فریک کی مسکراہٹ جیسی تھی۔ کھسیانی سی مسکراہٹ! جیسے کوئی بچہ مٹھائی چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے۔"

"جارج! کیا تم اس کے بیوی بچوں سے ملے ہو؟"

"نہیں۔ پتا نہیں میں اس کے بیوی بچوں کا سامنا بھی کر سکوں گا یا نہیں۔ کسی دوسرے آفیسر نے اس بارے میں پتا کیا تھا۔ لیکن مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جو کچھ ہوا وہ اچھا نہیں ہوا۔ یہ بات مجھے اندر ہی اندر ملامت کر رہی ہے کہ......"

"کون سی بات؟" لزا نے اسے چپ ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ مجھ پر فائر نہیں کرنا چاہتا تھا۔" ہومر نے آہستہ سے کہا۔ "اگر میں تھوڑا سا توقف کرتا تو وہ پستول اور نقدی فٹ پاتھ پر پھینک دیتا اور ہاتھ اٹھا دیتا۔"

"پلیز... جارج' بہت ہو چکا۔" لزا نے چیخ کر کہا۔ "تمہاری تمام باتیں اندازے پر مبنی ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ تم نے ایک ڈاکو پر اس وقت گولی چلائی جب وہ واردات کر کے بھاگ رہا تھا۔ اور یہی تمہارا فرض تھا۔ اگر تم گولی نہ چلاتے تو غلط کرتے۔"

ہومر کچھ دیر کے لئے چپ ہو گیا' پھر بولا۔ "کل میری چھٹی ہے۔ اور میں ذاتی طور پر اس بارے میں کچھ چھان بین کروں گا۔"

"تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا کر رہے ہو۔"

"میں ان سوالوں کا جواب حاصل کرنا چاہتا ہوں' جو مجھے پریشان کر رہے ہیں۔"

"مجھے ڈر ہے کہ تم خود کو کسی نئی مصیبت میں نہ پھنسا لو۔"

○———□———○

ٹم میکائے کی جیب سے جو پتا حاصل ہوا تھا وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ کا تھا۔ عمارت کے گراؤنڈ فلور پر سبزی اور پھلوں کی دکانیں تھیں۔ نیچے لابی میں چند لیٹر باکس لگے ہوئے تھے۔ ہر لیٹر باکس کے ساتھ اطلاعی گھنٹی اور انٹرکام لگا ہوا تھا۔

ہومر نے ٹم میکائے کے لیٹر باکس کی اطلاعی گھنٹی بجائی اور انتظار کرنے لگا۔ لیکن اوپر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دیکھا کہ سیڑھیوں کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پس وہ پہلی منزل پر پہنچا اور ٹم کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ واضح طور پر اندر کوئی نہیں تھا۔

ہومر نے ساتھ والے فلیٹ پر دستک دی' جس کا نمبر اے تھا۔ چند لمحوں کے بعد ایک معمر عورت نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔ "کس سے ملنا ہے؟"

وہ ڈھیلے ڈھالے ہاؤس ڈریس میں ملبوس تھی اور اس کے سفید بال بے ترتیب ہو رہے تھے۔

"میں مسز میکائے سے ملنا چاہتا ہوں۔" ہومر نے کہا۔ "مگر اس کے فلیٹ میں شاید کوئی نہیں ہے۔"

عورت نے بھویں سکیڑ کر ہومر کا جائزہ لیا' پھر بولی۔ "میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم کون ہو؟"

"میں پولیس آفیسر ہوں۔" ہومر نے اپنا بیج دکھایا۔

"میں پولیس والوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔" عورت نے ناگواری سے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

ہومر نے دروازے میں پیر اڑانے کا ارادہ کیا' لیکن کچھ سوچ کر ایسا کرنے سے باز رہا۔ عورت شور بھی مچا سکتی تھی۔ اور اس سے اس کی پوزیشن خراب ہو جاتی۔ وہ ذاتی حیثیت میں وہاں آیا تھا اور اس کے لئے محتاط رہنا بہت ضروری تھا۔

صبح اس نے پولیس اسٹیشن فون کر کے میکائے کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ میکائے کی بیوی کا نام مارجوری تھا اور وہ ہائیڈ پیلس نامی ریستوران میں کام کرتی تھی۔

ہومر مزید دروازے کھٹکھٹائے بغیر عمارت سے باہر نکل گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے مڑ کر عمارت کی طرف دیکھا۔ معمر عورت اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت پائی جاتی تھی۔

ہومر پھلوں کی دکانوں کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھا تو اسے کونے پر ایک ریستوران نظر آیا۔ سائن بورڈ پر "بریڈی بار اینڈ ریستوران" لکھا تھا۔ اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے اور موسم خاصا گرم تھا۔ ہومر کوئی کولڈ ڈرنک پینے کے ارادے سے ریستوران کے اندر چلا گیا۔ اس نے سوچا' شاید وہاں سے میکائے کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل ہو جائیں۔

"ایک اورنج جوس' پلیز۔" اس نے اسٹول پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

بارٹینڈر نے جوس کا گلاس بھر کر اس کے سامنے رکھا اور کاروباری خوش اخلاقی سے بولا۔ "موسم کے لحاظ سے یہ بہت عمدہ مشروب ہے۔"

ہومر نے اثبات میں سر ہلایا اور جوس کا گھونٹ لینے کے بعد ریستوران کا جائزہ لیا۔ وہ درمیانے درجے کا ایک صاف ستھرا ریستوران تھا۔ اس میں ائرکنڈیشنر نہیں تھا مگر چھت گیر پنکھے چل رہے تھے اور اندرونی فضا خوشگوار تھی۔ وہاں نصف درجن کے قریب گاہک موجود تھے۔ ہومر کے قریب بیٹھے ہوئے دو گاہک' جو کسی خبر پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے' اسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں صبح کا ایک اخبار تھا۔

ہومر نے گلاس خالی کرنے کے بعد جوس کا ایک گلاس اور طلب کیا' پھر سرسری انداز میں بارٹینڈر سے پوچھا۔ "تم میکائے فیملی کو جانتے ہو؟"

"ٹم میکائے؟" بارٹینڈر نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی ریستوران میں بیٹھے ہوئے تمام گاہک

خاموش ہو گئے اور ہومر کی طرف دیکھنے لگے۔ بارٹینڈر کچھ اس طرح اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگا جیسے وہ کوئی عجیب چیز ہوں۔

"تم پولیس کے آدمی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں" ہومر نے اثبات میں سرہلایا۔ "میں ٹم کے بارے میں چھان بین کر رہا ہوں۔ وہ اسی عمارت میں رہتا تھا۔ مجھے امید ہے کہ تم اسے جانتے ہو گے۔"

"ٹم کو کون نہیں جانتا۔" بارٹینڈر نے تلخ مسکراہٹ سے گاہکوں کی طرف دیکھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے پیارا اور خوش گفتار شخص تھا۔ ہم برسوں اس کی کمی محسوس کرتے رہیں گے۔"

ہومر کو اسی بات کا خدشہ تھا۔ اس نے ایک پیارے اور خوش گفتار شخص کو قتل کر دیا تھا۔ اچانک وہ سخت مایوسی محسوس کرنے لگا۔ اسے وہاں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اس نے جوس کا دوسرا گلاس بھی خالی کر دیا اور جیب سے دس ڈالر کا نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ بارٹینڈر نے نوٹ اٹھا کر کیش رجسٹر میں رکھا، چند بٹن دبائے اور چھ ڈالر نکال کے ہومر کے سامنے رکھ دیئے۔

"بات سنو۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "تم نے میرے اس دوست کے بارے میں پوچھا ہے، جو گزشتہ رات پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن کر ہلاک ہو چکا ہے۔ پتا نہیں، میں نے تمہیں اٹھا کر باہر کیوں نہیں پھینک دیا۔ اور مجھے اس بات پر کوئی افسوس نہ ہوتا۔ کیوں کہ تم جیسا کوئی پولیس والا میرے دوست کا قاتل ہے۔"

"پولیس والے شوقیہ گولیاں نہیں چلاتے۔" ہومر نے کہا۔ "تمہارا دوست مسلح تھا اور ایک شراب خانہ لوٹ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ویسے مجھے تمہارے جذبات کا بخوبی احساس ہے۔ تم ٹم کو کب سے جانتے ہو؟"

"تقریباً چھ سات مہینے سے۔" بارٹینڈر نے جواب دیا۔ "وہ نیو انگلینڈ سے بہتر ملازمت کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ لیکن بے چارہ اپنی صلاحیتوں سمیت چل بسا۔"

"کیسی صلاحیتیں؟"

"وہ ایک مزاح کار تھا۔ اس کی باتیں سن کر ہر شخص ہنسنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ہے بل....." بارٹینڈر نے ایک گاہک کو مخاطب کیا۔ "ٹم میکائے کیسا خوش گفتار اور ہنسنے ہنسانے والا شخص تھا؟"

بارٹینڈر نے جس شخص کو بل کے نام سے مخاطب کیا تھا، وہ ادھیڑ عمر کا بھاری بھرکم شخص تھا۔ اس کی ٹی شرٹ کا ایک حصہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے اسٹول کو پیچھے سرکایا اور کاؤنٹر کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر سب سے زیادہ ناگواری پائی جاتی تھی۔ اس نے ہومر کا سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ پھر پوچھا، "آفیسر، تمہیں پیانو بجانا آتا ہے؟"

"نہیں۔" ہومر نے جواب دیا۔

"اور گانا؟"

"میں سوالوں کے جواب دینے کا عادی نہیں ہوں۔"

"تم نے ٹم کی صلاحیتوں کے بارے میں پوچھا ہے نا؟"

"تم میرا سوال سن چکے ہو۔" ہومر نے کہا۔

بل کونے میں رکھے ہوئے پیانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ٹم اس پیانو پر ہر قسم کی دھن بجا سکتا تھا۔ وہ گانا بھی خوب گاتا تھا۔ اور جب وہ قصے کہانیاں سنانے پر آتا تو محفل کو زعفران بنا دیتا، اس کی باتیں سن کر تمہارے جیسے کند ذہن سپاہی بھی ہنسنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔"

ایک اور شخص بولا۔ "بے چارہ ٹم جن توقعات کے ساتھ یہاں آیا تھا وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اسے ملازمت نہیں ملی۔ وہ آخر وقت تک تنگ دستی کا شکار رہا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ مسکراتا ہوا نظر آتا تھا۔ اچھے حالات میں بھی اور برے حالات میں بھی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" ہومر نے کہا۔ "ٹم یقیناً اچھا آدمی ہو گا۔ لیکن....."

بل اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "تمہیں ٹم کی صلاحیتوں کا ذکر اچھا نہیں لگ رہا؟"

"میں تم لوگوں کی بات سمجھ گیا ہوں۔" ہومر نے کہا..... "ٹم میکائے، چارلی چپلن کے بعد سب سے بڑا مزاح کار تھا۔ لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ وہ کتنا بڑا کامیڈین تھا اور کتنا عمدہ پیانو بجاتا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ گزشتہ رات اس نے کن بواعث پر شراب خانہ کیوں لوٹا؟ یا یہ بھی اس کی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت تھی؟"

اس بات پر سب چپ ہو گئے۔
ہومر نے بل سے پوچھا۔ "ٹم کام کیا کرتا تھا؟ یعنی اس کا ذریعۂ آمدنی کیا تھا؟"
"ٹم شو بزنس میں کام کرتا تھا۔" بارٹینڈر نے کہا۔ "کم از کم وہ سب کو یہی جواب دیا کرتا تھا۔ اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔"
"اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹم کا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں تھا۔ اس کے بیوی بچوں کا خرچہ کیسے پورا ہوتا تھا؟"
"یہ بات اس کی روح سے پوچھو۔" بل نے فلمی انداز میں کہا۔ "یا اس سپاہی سے پوچھو جس نے اسے گولی ماری تھی۔"
ہومر کو وہ منہ پھٹ موٹا ایک دم بُرا لگنے لگا۔ وہ اس بات کو بالکل نظر انداز کر رہا تھا کہ ٹم نے گن پوائنٹ پر شراب خانہ لُوٹنے کی کوشش کی تھی۔
"تم ٹم کی بیوی کو جانتے ہو؟" ہومر نے بارٹینڈر سے پوچھا۔
اسے فضا میں پیدا ہونے والی تلخی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔
"میں نے اسے کئی دفعہ آتے جاتے دیکھا ہے' مگر وہ میرے ریستوران میں کبھی نہیں آئی۔ ٹم نے بھی کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ وہ دوسروں کے سامنے اپنے گھریلو معاملات کا ذکر کرنے کا عادی نہیں تھا۔ اس کی بیوی حسین اور دلکش عورت ہے۔ اور خاصے مضبوط جسم کی مالک بھی۔ اگر وہ دیوار کو ٹکر مار دے تو دیوار ٹوٹ جائے۔"
بل نے فرش پر کوئی چیز تھوکتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس نے کبھی ٹم کی ترقی میں دلچسپی نہیں لی۔"
ہومر کو بل کا لب و لہجہ پسند نہیں آرہا تھا۔ اس لئے وہ اس سے بات کرنے سے پرہیز کر رہا تھا۔ اس نے بدستور بارٹینڈر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "میں ٹم کے فلیٹ پر گیا تھا۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ ٹم کے بیوی بچے اس وقت کہاں ہوں گے؟"
"بوڑھی عورت سے پتا کرو۔"
"کون سی بوڑھی عورت؟"
"ٹم کی ساس۔ اس کا نام ڈیلانی ہے۔ وہ اس کونے میں فرسٹ فلور پر رہتی ہے۔ اس کے فلیٹ کے عین نیچے درزی کی دُکان ہے۔"
ہومر ریستوران سے باہر نکل کر بارٹینڈر کے بتائے ہوئے کونے کی طرف بڑھا۔ سورج عین سر پر چمک رہا تھا اور گرمی میں تیزی پیدا ہو گئی تھی۔ تب ہی سڑک کے کنارے پر ایک ٹرک رکا۔ وہ نصف تک بیئر کی پیٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈرائیور انجن بند کرکے باہر آیا اور ٹرک کی دوسری جانب چلا گیا۔ ہومر نے اسے پہچان لیا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے تک پولیس کانسٹیبل تھا۔
ہومر عمارت کی سیڑھیوں میں داخل ہوا اور مسز ڈیلانی کے دروازے پر دستک دی۔ لمحہ بھر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی عورت نے پریشان نظروں سے باہر دیکھا۔
"مسز ڈیلانی؟" ہومر نے کہا۔ "میں سراغرساں' جارج ہومر ہوں۔"
مسز ڈیلانی پست قد اور خوش شکل عورت تھی۔ اس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ "کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔
"مسز ڈیلانی' میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"
عورت نے دونوں ہاتھ ملے اور چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔ "اندر آجاؤ۔" اس نے ہومر کے داخل ہونے کے لئے دروازہ کھول دیا۔
وہ ایک کمرے کا چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ ایک کمرا' کچن اور باتھ روم وغیرہ۔ ہومر کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ دو بچے' جن کے بال سرخ تھے' کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی عمریں چار اور چھ سال کے لگ بھگ تھیں۔ دونوں خوبصورت اور صحت مند بچے تھے۔ انہوں نے صرف نیکریں پہن رکھی تھیں۔ دونوں دلچسپی سے ہومر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں ابھی تک باپ کی موت کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔
انہیں دیکھ کر ہومر کی اداسی پلٹ آئی اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔
فرش پر پرانا سا قالین بچھا ہوا تھا اور کمرے کے وسط میں بلوط کی پالش شدہ میز رکھی تھی۔ دیوار پر ایک چھوٹی سی تختی لٹک رہی تھی جس پر لکھا تھا۔ "خدا ہمارے گھر پر اپنی رحمت نازل کرے۔"
"بیٹھو آفیسر۔" عورت نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
ہومر پرانے صوفے پر بیٹھ گیا اور بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تمہارے نواسے ہیں؟"
"ہاں۔" عورت نے اثبات میں سر ہلایا۔
"میں گزشتہ رات والے سانحے کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"میں اخبار میں سب کچھ پڑھ چکی ہوں۔" عورت نے کہا۔ پھر بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم دونوں بالکونی میں چلے جاؤ۔ یہاں گرمی ہے۔"
بچے خاموشی سے بالکونی میں چلے گئے۔
"آفیسر' بچوں کو گزشتہ رات والے سانحے کا علم نہیں ہے۔" عورت نے مزید کہا۔ "اس لئے کوئی ایسی بات نہ کرنا جو بچوں کے لئے مناسب نہ ہو۔"
"او کے میڈم۔" ہومر نے کہا۔ "دراصل میں بچوں کی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔"
عورت نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ایک اجنبی کو یہ بات یقیناً عجیب لگے گی کہ ماریَا اس افسوسناک سانحے کے باوجود بچوں کو تنہا چھوڑ کر کام پر چلی گئی۔"
"یہ بات تو واقعی عجیب ہے۔" ہومر نے کہا اور رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے بالکونی کی طرف دیکھا۔ "اگر تم بچوں کو دوسرے

کمرے میں بھیج دو تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

"اس فلیٹ میں ایک ہی کمرا ہے۔ اور ایک کچن ہے۔"

"تو پھر انہیں تھوڑی دیر کے لئے باہر بھیج دو۔"

عورت نے نفی میں سر ہلایا بولی۔ "گلی میں؟ جہاں لوگ گزشتہ رات ہونے والے واقعے کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ان باتوں سے بچوں کے ذہنوں پر بہت برا اثر ہوگا۔"

ہومر نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ "مسز ڈیلانی! تمہاری بیٹی کہاں ہے؟"

"وہ اپنے کام پر گئی ہوئی ہے۔"

"کام پر! آج تو اسے چھٹی کرنی چاہئے تھی۔"

"چھٹی کرنے سے کیا فرق پڑتا! گھر میں بیٹھی پریشان ہوتی رہتی۔"

"کیا وہ ہائیڈ پیلس ریستوران میں کام کرتی ہے؟"

"ہاں، وہ اسی ریستوران میں کام کرتی ہے۔" عورت نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے بھی یہ جگہ نہیں دیکھی۔ لیکن سنا ہے کہ وہ کام کے لئے اچھی جگہ نہیں ہے۔ میری بیٹی مجبوری کے باعث وہاں کام کرتی ہے۔ اس کے بارے میں کوئی غلط خیال دل میں نہ لانا۔"

ہومر نے دیکھا کہ دونوں بچے کمرے میں واپس آگئے... اور اپنی نانی کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ دونوں خوبصورت اور بھولے بھالے بچے تھے۔ ہومر کو وہ لزا کے بھائی فرینک کے بچوں کی طرح معلوم ہوئے۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ معاندانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اصل بات سے غافل بھی نہیں تھے۔

"میرے ڈیڈی کہاں ہیں؟" بڑے لڑکے نے پوچھا۔

"جیری ..." مسز ڈیلانی نے کہا۔ "تمہیں بتایا تو ہے کہ تمہارے ڈیڈی ایک حادثے میں زخمی ہوگئے ہیں۔ وہ اسپتال میں ہیں۔ تم دونوں بالکونی میں جا کر کھیلو۔"

"میرے ڈیڈی بہادر آدمی ہیں۔" جیری نے کہا۔ "وہ گانا بھی گا سکتے ہیں اور فائیٹ بھی کر سکتے ہیں۔"

ہومر کو لفظ 'فائیٹ' عجیب لگا۔ وہ چند لمحوں تک جیری کو گھورتا رہا، پھر مسکرایا اور کندھے اچکاتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ ہر بچہ اپنے باپ کو ہیرو سمجھتا ہے۔ اور جیری بھی اپنے باپ کے بارے میں ایسے ہی جذبات رکھتا تھا۔

مسز ڈیلانی، ہومر کو سیڑھیوں تک چھوڑنے آئی۔

ہومر جاتے جاتے رکا اور پوچھا۔ "مسز ڈیلانی، تمہارا داماد کیسا آدمی تھا؟"

مسز ڈیلانی نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا، جہاں اس کے دونوں نواسے کھڑے ان کی طرف دیکھ رہے تھے، پھر بولی۔ "تم بہادر آدمی ہے۔"

واضح طور پر اس نے یہ بات بچوں کو سنانے کے لئے کی تھی۔

○———□———○

ہومر سیڑھیاں طے کر کے سڑک پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بیئر کا ٹرک روانہ ہو رہا تھا۔ اس کی آدھی سے زیادہ بیئر کی پیٹیاں کم ہو چکی تھیں۔ وہ دوبارہ بریڈی ریستوران میں گھس گیا اور بار ٹینڈر سے ایک فون کرنے کی اجازت مانگی۔ اندر بیٹھے ہوئے گاہک ایک دم چپ ہو گئے اور غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر پہلے سے زیادہ غصہ تھا۔

ہومر کو اس تبدیلی کی وجہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ واضح طور پر ڈرائیور نے انہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ انہیں یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ ٹم اسی کی گولی سے ہلاک ہوا تھا۔

بھاری جسم والا بل اٹھ کر اس کے سامنے آیا اور بولا۔ "مسٹر ہیم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں تھا۔ کیا تم ہی وہ ہیرو ہو، جس کی گولی سے ٹم ہلاک ہوا تھا؟"

"میں اس وقت ڈیوٹی پر تھا۔" ہومر اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ "میں نے وہی کچھ کیا جو میری ڈیوٹی کا تقاضا تھا۔"

"ہاہ... مین آف دی ویک..." بل نے نفرت سے کہا۔ "عظیم ہیرو... جس نے ایک برے آدمی کو ٹھکانے لگا دیا۔"

"بکواس بند کرو۔" ہومر نے کہا۔

بل نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار کاؤنٹر پر پھینک دیا اور آستینیں چڑھانے لگا۔ "ہم تمام ٹم کے دوست ہیں سارجنٹ ہومر۔" اس نے دوسروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور جو کچھ تم نے کیا ہے وہ ہم میں سے کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ ہم تمہارے جیسے بدمعاش افسروں کا حساب چکانا خوب جانتے ہیں۔"

وہ آگے بڑھا اور مکا بلند کیا۔

ہومر کا ہاتھ خود کار طریقے پر حرکت میں آگیا۔ بالکل گزشتہ رات کی طرح۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُس وقت اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا، اِس وقت اس کا ہاتھ خالی تھا۔ تو بھی اس نے کوئی کمزوری محسوس نہیں کی اور بل کے جبڑے پر ایک بھرپور گھونسا رسید کیا۔ بل لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا اور ایک کرسی سے ٹکرا کر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اٹھا اور مغلظات بکتا ہوا ہومر پر چڑھ دوڑا۔ ہومر کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اپنے دائیں پاؤں پر گھوما۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بایاں پاؤں کسی آہنی ہتھوڑے کی طرح بل کے سینے سے ٹکرایا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ بل فرش پر چت ہوگیا اور یوں چھت کو گھورنے لگا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔

'یا اللہ! میری لاج رکھ لینا،' ہومر نے دل میں کہا، 'اگر ان تمام لوگوں نے مجھ پر حملہ کر دیا تو میں اپنے پیروں پر چل کر نہیں جا سکوں

گا، جھگڑے کی صورت میں اس کی پوزیشن بھی خراب ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ ذاتی حیثیت میں وہاں آیا تھا۔ تاہم اس کی قسمت اچھی تھی۔ کوئی شخص بل کی مدد کے لئے نہیں اٹھا۔

O———□———O
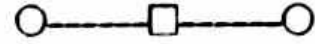
ہائیڈ پیلس اعلیٰ درجے کا ریستوران تھا اور وہاں صرف دولت مند لوگ ہی جاتے تھے۔ ریستوران کے دروازے کے عین سامنے ایک کھلا کولڈ ڈرنک اسٹینڈ تھا۔ ہومر نے اس اسٹینڈ سے ایک ٹھنڈی بوتل لی اور ہائیڈ پیلس کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اسے ٹم کی بیوی سے ملنا چاہئے یا نہیں۔ اب تک وہ اپنی پوزیشن کافی خراب کرچکا تھا۔ اور مارجوری سے ملنا اس کے لئے مزید پریشانی کا باعث بن سکتا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کی الجھن دور نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کیا گزشتہ رات اس نے ایک شریف آدمی کو قتل کر دیا تھا؟ اگر وہ گولی چلانے میں کچھ توقف کرتا تو کیا ٹم اس پر فائر کردیتا؟

ہومر کی نظریں ہائیڈ پیلس کے آرائشی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ جب بھی کوئی گاہک اندر جاتا، یا باہر آتا تو گلی میں موسیقی کی خوشگوار آواز پھیل جاتی۔

ہومر نے ٹھنڈی بوتل خالی کی اور گلی پار کرکے ہائیڈ پیلس میں داخل ہو گیا۔ خوابیدہ روشنیوں میں ڈوبا ہوا ائر کنڈیشنڈ ہال تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی ہومر نے خوشگوار ٹھنڈک محسوس کی تھی۔

"کیا آپ اپنا ہیٹ میرے سپرد کرنا پسند کریں گے؟" اس کے کانوں میں ایک مترنم آواز آئی۔ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولنے والی کی طرف دیکھا۔

ناٹے قد کی وہ حسینہ سنہری وگ اور ٹاپ لیس بکنی میں ملبوس تھی۔ وہ اپنے سرخ ہونٹوں کے درمیان سفید دانتوں کی نمائش کر رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر ہومر کو بوڑھی مسز ڈیلان کے الفاظ یاد آگئے۔ "..... میری بچی مجبوری کے باعث وہاں کام کرتی ہے۔ اس کے بارے میں کوئی غلط خیال دل میں نہ لانا....."

ہومر نے آنکھیں جھپکائیں اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "میرے سر پر کوئی ہیٹ نہیں ہے۔ اور میں صحیح معنوں میں گاہک بھی نہیں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" حسینہ نے کہا۔ "میں خدمت کے لئے یہاں کھڑی ہوں۔ آپ میرا مطلب سمجھ ہی گئے ہوں گے!"

ہومر سمجھ گیا کہ وہ ٹپ کی توقع کر رہی تھی۔ "اور میں صحیح معنوں میں دولت مند بھی نہیں ہوں۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اس اثنا میں اس کی آنکھیں اندر کی مدھم روشنیوں سے مانوس ہو چکی تھیں۔

کشادہ ہال میں چند درجن افراد لنچ کرنے میں مصروف تھے۔ ہال کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹا سا اسٹیج تھا، جہاں ایک اسٹرپ، موسیقی کی دھن پر دھیما رقص کر رہی تھی۔ اس کے بدن پر پھولوں کے ایک ہار کے سوا کوئی کپڑا نہیں تھا۔

ہومر نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ بھورے بالوں والی ایک دراز قامت حسینہ، دو گاہکوں سے بل کی رقم وصول کر رہی تھی۔ دونوں گاہک جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ بھورے بالوں والی ٹاپ لیس ویٹرس ان سے پیسے لے کر کاؤنٹر پر گئی اور ریزگاری لے کر فوراً میز پر واپس پہنچ گئی۔ دونوں گاہکوں میں سے ایک نے پلیٹ سے کچھ نوٹ اٹھالئے اور دونوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

ہومر اس کے قریب پہنچا اور کہا "مسز میکائے؟"

ویٹرس ٹیبل سے خالی گلاس اٹھاتے ہوئے لمحہ بھر کے لئے رکی اور ہومر کی طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس کے چہرے پر تھوڑی دیر پہلے جو خوشگواری نظر آرہی تھی، وہ اچانک تھکن میں تبدیل ہو گئی۔ وہ سوگوار بیوہ نظر آنے لگی۔

"تم پولیس کے آدمی ہو؟" وہ ٹرے اٹھا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

ہومر اس کے جسم کی طرف دیکھنے سے احتراز کرتے ہوئے بولا۔ "میں ذاتی حیثیت میں یہاں آیا ہوں۔ کیا میں تمہارے ساتھ چند باتیں کر سکتا ہوں؟"

"اب کیا چاہئے تم لوگوں کو؟" مارجوری نے افسردگی سے کہا۔ "مرنے والا مر گیا! میں تو وہاں موجود نہیں تھی۔ خیر.... ادھر ہی بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

ہومر ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد مارجوری واپس آگئی۔ اب اس نے ایپرن باندھ رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر ہومر نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سوالات کے دوران اس کی نظریں بھٹکتی رہیں۔

"مسز میکائے، مجھے تمہارے شوہر کی موت پر افسوس ہے۔" اس نے کہا۔

"اوہ.... بہت خوب! کیا یہ معذرت محکمے کی طرف سے ہے؟" مارجوری نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"میں نے افسوس کا اظہار کیا ہے اور افسوس کا اظہار کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔"

"تم محکمے میں نئے معلوم ہوتے ہو۔" مارجوری نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ تمہیں کافی کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ شکریہ۔"

مارجوری نے ایک ویٹرس کو اشارے سے قریب بلایا اور اسے دو کافی لانے کے لئے کہا۔

"مسز میکائے، بات یہ ہے کہ گزشتہ رات میں اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ آٹھویں ایونیو پر گشت کر رہا تھا....."

"اوہ.... تو یہ تم تھے! اسی لئے تم معذرت کرنے کی کوشش کر رہے ہو!"

ہومر نے اثبات میں سرہلا دیا۔ "میرا نام جارج ہومر ہے۔"
مارجوری نے دائیں بائیں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "تم واقعی بہت مسکین آدمی ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔"
ویٹرس ان کی میز پر پہنچی اور کافی، کریم اور چینی رکھ کر واپس چلی گئی۔
"کیا تم مجھ سے نفرت کا اظہار کر رہی ہو؟"
"نفرت! کیا تم یہ جاننے کے لئے آئے یہاں ہو؟"
"ہاں۔" ہومر نے کہا۔ "میں یہ بات بھی جاننا چاہتا ہوں، اور اس کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی۔"
اور کیا باتیں؟"
"مجھے تمہارے شوہر کے آخری تاثرات بہت پریشان کر رہے ہیں۔ یہ بات میں اپنی بیوی کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں اور اس کا خیال ہے کہ میرا دماغ الٹ گیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ٹم اچھا آدمی تھا۔"
یہ سن کر مارجوری کے چہرے پر تلخی نمودار ہوگئی، بولی۔ "یقیناً..... کیوں نہیں۔ ٹم خوش شکل آدمی تھا۔ ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔ ہر شخص اس کی مسکراہٹ پسند کرتا تھا۔"
"یہ تو میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ اس کی مسکراہٹ واقعی بہت اچھی تھی۔ وہ یقیناً ایک خوش مزاج اور زندہ دل آدمی تھا۔"
"سب یہی کہتے ہیں۔" مارجوری نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔
ہومر نے آنکھیں جھپکائیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ استہزا کس کے لئے تھا۔
"میں بریڈی ریستوران میں بھی گیا تھا اور وہاں ٹم کے چند دوستوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سب ٹم کی زندہ دلی کی تعریف کر رہے تھے۔ وہ جس محفل میں بیٹھتا تھا اسے زعفران بنا دیتا تھا۔"
"ٹم کی مسکراہٹ لائٹ سوئچ جیسی تھی۔" مارجوری نے دھیمی آواز میں کہا۔ "وہ جب چاہتا تھا اپنی مسکراہٹ کا سوئچ آن کر لیتا تھا۔ خصوصاً جب وہ خوفزدہ ہوتا تھا۔"
"تمہارا مشاہدہ بالکل صحیح ہے۔"
مارجوری تلخی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اسے دوست بنانے کا فن بھی خوب آتا تھا۔ وہ غیروں کے سامنے کتے کی طرح دُم ہلاتا تھا اور..... صرف اس ہاتھ کو کاٹتا تھا جو اسے کھلاتا تھا۔ یعنی میرے ہاتھ کو....."
ہومر نے آنکھیں پھیلائیں۔ وہ سمجھ گیا کہ مارجوری کی ساری تلخی اور استہزا اپنے مرحوم شوہر کے لئے تھا۔ یہ پہلی بات تھی جسے سن کر اس نے کچھ اطمینان محسوس کیا..... تاہم وہ مزید باتیں سننا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کے ضمیر کی خلش کم ہو۔
"ٹم کے دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک باصلاحیت فنکار تھا۔" اس نے مارجوری کو ٹم کے خلاف بولنے کی ترغیب دی۔ "اور اچھا شوہر بھی تھا۔"
"ہاں..... اس کی صلاحیتوں کا کیا کہنا! وہ بہترین پیانو نواز تھا۔ بہت اچھا گلوکار تھا، ٹاپ کلاس مزاح کار تھا۔ اس کا سارا دن بریڈی کے بھٹ میں گزرتا تھا، جہاں وہ گاہکوں کو مفت تفریح فراہم کرتا تھا۔ اس کے بدلے شاید اسے کافی کا ایک آدھ کپ مل جاتا تھا۔"
"یہ تو خاصی عجیب بات ہے۔"
"میرا خیال ہے کہ میں تمہارے لئے ایک ڈرنک لے کر آتی ہوں۔ اصلی ڈرنک....." مارجوری اٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا پسند کرو گے؟"
"کوئی ہلکی چیز۔"
مارجوری نے کافی کے خالی کپ اٹھائے اور بار کی طرف چلی گئی۔ ہومر نے دیکھا کہ وہ کئی مردوں سے زیادہ دراز قد تھی۔
چند لمحوں کے بعد وہ واپس آئی اور ہومر کے سامنے بیئر کا گلاس رکھ دیا۔ اپنے لئے وہ ڈبل اسکاچ لائی تھی۔
"ہم کیا بات کر رہے تھے؟" اس نے اسکاچ کا سپ لینے کے بعد کہا۔
"بریڈی ریستوران کے علاوہ میں تمہاری ماں سے بھی ملا تھا۔ وہاں میں نے تمہارے بیٹوں کو بھی دیکھا تھا۔ بلکہ بڑے بیٹے نے میرے ساتھ بات بھی کی تھی۔"
"جیری نے کیا کہا تھا؟"
"وہ اپنے باپ کی تعریف کر رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کا باپ اچھا گلوکار اور اچھا فائٹر ہے۔"
مارجوری نے چند لمبے لمبے گھونٹ لئے اور آدھے سے زیادہ جام خالی کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر تھکن کے بجائے تلخی نظر آنے لگی۔
"ہاں، وہ بچوں کو ایسی ہی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ بقول اس کے، جب وہ بوسٹن میں رہتا تھا تو باکسنگ کے مقابلے کیا کرتا تھا۔ اور اچھے اچھے باکسروں کو ناک آؤٹ کر دیا کرتا تھا۔ اور جب بچے سو جاتے تھے تو وہ اپنی کہانیوں کو سچا ثابت کرنے کے لئے مجھ پر مکے برسایا کرتا تھا۔ پستہ قد کمینہ! میں مضبوط اور توانا جسم کی عورت ہوں۔ اس لئے اس کے مکوں سے مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی تھی۔"
"یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ ٹم کے دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک باصلاحیت فنکار تھا۔ تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انتہائی کمینہ شخص تھا۔"

"صرف پیانو بجا لینے یا گانا گا لینے سے کوئی شخص فنکار نہیں بن جاتا۔ ٹم خود کو شوبزنس کا آدمی سمجھتا تھا۔ اس کے خود غرض دوستوں نے اسے مزید غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کبھی ملازمت کے لئے کوشش نہیں کی۔ معمولی کام کو تو وہ ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس سے اس کے کپڑے میلے ہوتے تھے۔ لیکن جہاں تک شوبزنس کا تعلق تھا' اس میں وہ ناکام ہو چکا تھا۔ اسے نیویارک کے ایک کامیڈی کلب میں کام ملا تھا۔ لیکن دس منٹ تک وہ پورے ہال میں ایک بچے کو بھی ہنسانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ لوگوں نے ہوٹنگ شروع کر دی اور کلب کے مالک نے اسے دس ڈالر دے کر گھر بھیج دیا۔ وہ صرف برڈی کے بعث میں اکٹھے ہونے والے مفت خوروں کو ہی ہنسا سکتا تھا۔ اور یہ اس کی پہلی ناکامی نہیں تھی۔ وہ کئی کلبوں اور تھیلوں میں کوشش کر کے دیکھ چکا تھا۔ میں نے اسے کئی دفعہ ملازمت کرنے کے لئے کہا۔ مگر نہیں' اتنا بڑا فنکار' اپنے خوبصورت چہرے اور خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ کیسے ملازمت کر سکتا تھا!"

"وہ اپنے جیب خرچ کے لئے کیا کرتا تھا؟"

"اس کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں کس لئے کماتی تھی۔ کھانا مفت..... رہائش مفت..... اور جیب خرچ کے لئے میرا پرس موجود....."

"اگر یہ سب سہولتیں موجود تھیں تو اس کے ذہن میں ڈکیتی کا خیال کیوں آیا؟"

مارجوری نے اپنا جام خالی کر دیا اور ایک گزرتی ہوئی ویٹرس سے ایک اور اسکاچ لانے کے لئے کہا۔

"دو ہفتے پہلے میں نے اس کا جیب خرچ بند کر دیا تھا۔ اس کے لوفر دوستوں میں سے کسی نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اس جیسے باکمال فنکار کے لئے شراب خانہ لوٹنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ گزشتہ رات جو آفیسر میرے فلیٹ پر آیا تھا' اس نے بتایا کہ ٹم اپنے تمام شناختی کاغذات جیب میں رکھ کر شراب خانہ لوٹنے گیا تھا۔"

ویٹرس نے اسکاچ کا ایک اور جام لا کر مارجوری کے سامنے رکھ دیا اور خالی جام اٹھا کر لے گئی۔

تب ہی ہومر کو کاؤنٹر کے پاس مارٹی کھڑا دکھائی دیا۔ وہ بیئر کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہومر نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

"مسٹر ہومر' تم یقیناً مجھے ایک گھٹیا عورت سمجھ رہے ہو گے۔" مارجوری نے اسکاچ کا ایک گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ "کیوں کہ میں تمہارے جیسے نفیس آدمی کے سامنے اپنے مرحوم شوہر کی برائیاں کر رہی ہوں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے ٹم کی موت پر خوشی ہوئی ہے۔ اس کی موت سے میں خود کو آزاد محسوس کر رہی ہوں۔"

"نہیں مسز میکائے' میں تمہیں گھٹیا عورت نہیں سمجھتا۔"

"اوہ شکریہ....." مارجوری کی آنکھوں میں نمی نظر آنے لگی۔ "میرے کندھوں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔" ہومر نے کہا اور جیب سے سو ڈالر والے تین نوٹ نکال کر اس اداس بیوہ کے سامنے رکھ دیئے۔ "کافی اور ڈارک میری طرف سے..... مجھے امید ہے کہ تم اور تمہارے دونوں بچے خوش حال زندگی گزاریں گے۔"

اس نے مارجوری کا ہاتھ تھپتھپایا اور اٹھ کر رخصت ہو گیا۔

O——□——O

باہر گلی میں پہنچ کر ہومر نے مارٹی سے پوچھا "تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟"

"ٹرا نے مجھے فون پر تمہارے ارادے سے آگاہ کیا تھا۔ وہ تمہارے بارے میں فکر مند تھی۔" مارٹی نے جواب دیا۔ "میں پہلے ایمسٹرڈیم ایونیو پہنچا اور وہاں سے پوچھتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔"

کچھ دور تک دونوں خاموش چلتے رہے۔ پھر مارٹی نے پوچھا۔ "تم میکائے کے بارے میں کیا پتا چلا؟"

"وہ بسوپیا تھا۔ دوستوں کے لئے بہت اچھا اور بیوی کے لئے بہت برا آدمی تھا۔"

"خوب! اب تمہاری الجھن دور ہو گئی ہو گی۔"

"کسی حد تک۔ لیکن میرا خیال ہے کہ گزشتہ رات میں نے گولی چلانے میں عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔"

مارٹی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی' بولا۔ "تم خوش قسمت ہو جارج۔"

"کیا مطلب؟"

"تقریباً ایک گھنٹا پہلے میری ہومی سائڈ والوں سے بات ہوئی تھی۔ انہیں تھوڑی دیر پہلے ٹم کے پستول کے بارے میں رپورٹ موصول ہوئی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق ٹم تم سے زیادہ تیز ثابت ہوا تھا۔ وہ تم سے پہلے ٹریگر دبا چکا تھا۔ لیکن تمہاری خوش قسمتی کہ اس کا پستول جام ہو گیا تھا۔"

"واقعی!"

"تم خوش قسمت اور وہ بد قسمت ثابت ہوا۔ ورنہ اگر اس کا پستول جام نہ ہوتا تو اس وقت تمہاری تدفین کی تیاری ہو رہی ہوتی۔"

"اوہ' میرے خدا۔" ہومر نے گہرا سانس لیا۔ "اسی وجہ سے وہ مسکرایا تھا۔ کیوں کہ وہ پستول نہ چلنے کی وجہ سے گھبرا گیا تھا۔"

"وہ تمہیں دھوکا دینے کے لئے مسکرایا تھا۔" مارٹی نے کہا "اگر وہ شریف آدمی ہوتا تو اول۔ شراب خانہ لوٹنے کا ارادہ نہ کرتا اور دوم۔ تمہیں دیکھتے ہی پستول پھینک دیتا اور دونوں ہاتھ اوپر کر لیتا۔"

ہومر کی ساری الجھن دور ہو گئی اور وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

A COOL, CLEAN SHOT
THOMAS ADCOCK

تلاش

نجمہ مسعودی

وہ سمجھتا تھا کہ اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل نہیں۔ وہ محض احکامات کی تعمیل کرنے والی ایک مشین ہے۔ لیکن ایک رات اس پر سوچ کے نئے دروازے کھل گئے۔ سود وزیاں کے نئے پہلو اسے دکھائی دینے لگے۔

ایک جنا پیشہ کی داستان جو کسی سے سب کچھ چھیننے نکلا تھا

دور تک پھیلے ہوئے ساحل کی ریت چاندنی میں سفید سفید سی دکھائی دے رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ خلیج کے پانی کی مدھم سی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک چکور چاند کی طرف محوپرواز تھا۔ کبھی کبھی وہ قلابازیاں کھا کر کرتب سے دکھانے لگتا۔ میرے سوا اس کی اس سعیٔ لاحاصل کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی بہت بڑے ایٹمی دھماکے کے بعد کرۂ ارض سے نسلِ انسانی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ میرے اور اس چکور کے سوا کوئی ذی روح نہیں بچا تھا۔

نقشے میں اس جگہ کا جو نام درج تھا اس کا مطلب تھا ’سانپوں کا مسکن‘ لیکن کم از کم مجھے دور دور تک کوئی سانپ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید ریت کے ٹیلوں تلے کہیں سانپ پائے جاتے ہوں۔

بالآخر بہت دور میں نے اس عورت کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اتنے فاصلے سے اسے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ریت کی سفید چادر پر وہ محض ایک دھبے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ دھبا بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اس عورت کو ہلاک کرنے کے احکامات ہیرل نے براہِ راست خود مجھے دیے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ اگر میں نے اس سلسلے میں کوئی پشیمانی محسوس کی یا پیچھے ہٹنے کی

کوشش کی تو میں ان لوگوں کے انجام کے بارے میں ضرور ایک بار سوچ لوں جنہوں نے بیرل کے احکامات سے روگردانی کی تھی۔

میں ایسے لوگوں کے انجام سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے باوجود سوچوں میں گرفتار تھا۔ کسی بدمعاش کا پتہ صاف کرنا اور بات ہے لیکن کسی عورت کو ہلاک کرنا ایک بالکل مختلف معاملہ ہے۔

میں نے ڈائنا آرتھر کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صرف اس کی تصویر دیکھی تھی۔ اس کے اداس حسن میں بڑی کشش تھی۔ اب میں اسے روبرو دیکھنے والا تھا۔ وہ ٹیلوں کے درمیان سے گزرتی چلی آرہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کوئی اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ انتظار کی وجہ بھی اسے معلوم ہوگی۔ اس کے باوجود وہ چلی آرہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے مکھی کسی مکڑی کے جال میں چلی آتی ہے۔

میں اس کی جرأت کی داد دئیے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے یقیناً معلوم تھا کہ بیرل کے ساتھ ناخوشگوار انداز میں قطع تعلق یا اس کی مرضی کے خلاف اس سے فرار حاصل کرنے کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ جلد یا بدیر اس کا انجام سامنے آنا ہی تھا۔ اس سے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اب وہ تقریباً سو گز دور رہ گئی تھی۔ چاندنی تیز تھی اور پانی سے بھی منعکس ہو رہی تھی۔ میں اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ دراز قد تھی اور اپنی تصویر سے زیادہ خوبصورت تھی۔ ہلکی ہوا میں اس کا لباس اور سرخی مائل بال لہرا رہے تھے۔ وہ تن کر چل رہی تھی اور اس کی چال میں ذرا بھی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔

میرا ریوالور ابھی تک میری جیب میں ہی تھا۔ اس کے استعمال کے لئے ابھی بہت وقت پڑا تھا۔ میں تو ڈائنا سے چند باتیں کرنے کے امکانات پر بھی غور کر رہا تھا اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ہو سکا تو میں اسے باتوں میں لگا کر بے خبری میں گولی کا نشانہ بناؤں گا تاکہ موت اس کے لئے ایک حیرت کی طرح آئے، اذیت کی طرح نہیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کسی خوبصورت عورت کو قتل نہیں کیا تھا۔ یہ میرے لئے ایک آزمائش سے کم نہیں تھا۔ لیکن مسئلہ بیرل کا تھا! بڑی بات تو یہ تھی کہ میں نے اس سے پہلے کسی بدمعاش کو بھی قتل نہیں کیا تھا۔

ریت پر بیٹھے بیٹھے میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ مجھ جیسے لوگ کس طرح بیرل جیسے بدمعاشوں کے گروہوں میں شامل ہو جاتے ہیں؟ میں تو اس روز چمڑے کی پیاری سی جیکٹ پہنے کالج سے نکلا تھا۔ دنیا کیسی حسین دکھائی دے رہی تھی لیکن ایک بار میں بیٹھ کر اپنے ظرف سے زیادہ پی جانے کے بعد سب کچھ بدل گیا تھا۔ اس وقت حواس پر خمار کا غلبہ تھا اور ایک اجنبی حسینہ نے مجھے اپنے لئے ایک کام کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ میں نے اس کا کام کر دیا اور اس کے بعد میں گویا ایک دائرے میں پھنس گیا۔ میرے لئے کوئی راہ فرار نہ رہی۔

ڈائنا اب مجھ سے بہ مشکل چالیس گز کے فاصلے پر تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس نے ریت میں صحیح طور پر چلنے کے لئے سہارے کی غرض سے کوئی چھڑی تھام رکھی ہے۔ میں اپنے خیالات اور اس کے سراپا میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ بہت تاخیر سے سمجھ پایا وہ چھڑی نہیں تھی۔ درحقیقت مجھے گمان تک نہیں تھا کہ اس کے پاس چھڑی کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

رائفل کی گولی میرے سر سے بہ مشکل دو تین انچ کے فاصلے سے گزری۔ اس کی سنسناہٹ نے ایک لمحے کے لئے میرا لہو سرد کر دیا۔

"میرے پاس رائفل ہے۔" وہ بہ آواز بلند بولی "اور میرے نشانے کا تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا۔ میں چاہتی تو یہ پہلی ہی گولی تمہاری کھوپڑی اڑا دیتی۔ جبکہ تمہارے پاس یقیناً صرف ریوالور ہوگا جس کی گولی یہاں مجھ تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ اندازہ تمہیں بھی ہوگا۔"

میرا ہاتھ جیب کی طرف جاتے جاتے رہ گیا۔ اگر میرے ریوالور کی گولی اس تک پہنچنے کا امکان تھا تب بھی وہ میرا ہاتھ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی فائر کر سکتی تھی۔ چاند اس کے عقب میں تھا اور جس حد تک میں اسے دیکھ رہا تھا وہ مجھے اس سے بہتر طور پر دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ میں ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں نروس نہیں ہوں۔

"اب ہم کیا کریں؟" میں نے دریافت کیا۔ غنیمت تھا کہ میرے لہجے میں ارتعاش نہیں تھا۔

وہ اب بھی مجھ پر رائفل تانے ہوئے تھی۔ بہ آواز بلند بولی۔ "سودے بازی کی بات کرنا چاہتے ہو؟"

"بیرل کے ساتھ سودے بازی کون کر سکتا ہے!" میں نے کہا۔

"یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔" وہ بولی۔

"بہتر یہی ہے کہ تم مجھے گولی مار دو تاکہ جلد یہ قصہ تمام ہو۔" میں نے کہا "بیرل نے جو کام میرے سپرد کیا تھا وہ میری بے وقوفی سے خراب ہو گیا ہے۔ اب مجھے اپنے آپ کو مردہ ہی سمجھنا چاہئے۔ میں اب مرجاؤں یا ایک دو دن بعد، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گولی تم چلاؤ یا کوئی اور... اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تمہارا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔" وہ بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے جاننا چاہا۔

"فرض کرو تم اور میں دونوں ہی زندہ رہیں اور درمیان میں بیرل کا مسئلہ ہی نہ رہے۔"

"تم بات کرو۔ میں سن رہا ہوں۔" میں نے تفصیل جاننا چاہی۔

"ٹھیک ہے... پہلے ایسا کرو کہ اپنا ریوالور نکال کر درخت کے اس کٹے ہوئے تنے پر رکھ دو جو تمہارے دائیں ہاتھ پر نظر آرہا

ہے۔" وہ بولی "یاد رکھنا میں صاف طور پر تمہاری حرکات و سکنات دیکھ سکتی ہوں۔ مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا۔ ریوالور رکھنے کے بعد آہستگی سے میری طرف آجاؤ۔"

"اور اگر میں ایسا نہ کروں؟" میں نے پوچھا۔

"تو پھر مجبوراً مجھے تم کو قتل کرنا پڑے گا۔ پھر اس بدمعاش کو بھی جسے ہیرل تمہارے بعد بھیجے گا۔۔۔ پھر اس بدمعاش کو جو اس کے بعد آئے گا۔ میں جب تک بھی زندہ رہ سکی تب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولی۔

میں نے ریوالور نکال کر اس کی ہدایت کے مطابق درخت کے تنے پر رکھ دیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔

"مجھے امید ہے کہ تم کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہیں کرو گے۔" اس نے ایک بار پھر خبردار کیا "مجھے خونریزی پسند نہیں ہے۔"

"تم اپنی انگلی ٹریگر سے ہٹالو۔ میں کوئی چالاکی نہیں دکھاؤں گا۔" میں نے کہا۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ اب بہ مشکل پچیس گز رہ گیا تھا۔ وہ بدستور رائفل تانے کھڑی تھی۔ ہوا اس کے بالوں سے کھیل رہی تھی۔ وہ تقریباً مجھ جتنی ہی لمبی تھی اور میرا قد چھ فٹ سے ذرا ہی کم ہے۔ لیکن اس میں نسوانیت کی کمی نہیں تھی۔ ہاتھوں میں صرف رائفل کی موجودگی کی وجہ سے اس کی نسوانیت کچھ مجروح سی ہو رہی تھی ورنہ وہ سرتاپا عورت تھی۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال ہوگی۔

"تمہیں مجھ کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" وہ بولی۔

"میرا خیال ہے اگر میں اس کی تردید کروں تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اس لئے فی الحال میں کچھ بھی نہیں کہوں گا خاتون!"

"تم مجھے ڈانا کہہ سکتے ہو۔" میرا نام ڈانا ہیرل ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا۔"

"لیکن مجھے تو تمہارا نام ڈانا آرتھر بتایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ میرا شادی سے پہلے کا نام ہے۔ میں نے دوبارہ یہی نام اختیار کرلیا ہے۔ لیکن میں بہرحال اب بھی مسز ہیرل ہوں۔"

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ہاس نے کیا مجھے اپنی ہی بیوی کو قتل کرانے کے لئے بھیج دیا تھا؟ لیکن خیر۔۔۔ یہ درست بھی ہو سکتا تھا۔ اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کیا بات تھی؟

میں اس کے سامنے ریت پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ رائفل اس کی گود میں تھی۔ میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور ایک اس کی طرف بڑھائی۔

"سگریٹ سلگانا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" وہ بولی۔ "لائٹر کا شعلہ بہت دور سے بھی کسی کو نظر آسکتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہماری نگرانی کی جارہی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"یقین ممکن ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کسی کی توجہ ہماری طرف مبذول کرانے کے لئے تو اس گولی کی آواز بھی کافی تھی جو تم نے مجھ پر چلائی تھی۔" میں نے کہا۔

وہ ہنس دی۔ اس کی ہنسی ویرانے میں بکھرنے والی موسیقی کی طرح تھی۔ "دھماکا تو موقع کی مناسبت سے درست تھا۔ اس کا تو یہی مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے منصوبے کے مطابق تم نے مجھے ہلاک کردیا ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

صورت حال میری نظر میں زیادہ مشکوک ہوتی جارہی تھی۔ وہ دوست بھی ہو سکتی تھی اور دشمن بھی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ سچ بول رہی ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ میری وفاداریاں آزمانے کے لئے اسے استعمال کیا جارہا ہو۔ میں بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تمہارے بارے میں کل رات تک مجھے ہیرل کو رپورٹ دینی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ہمارے پاس خاصی مہلت ہے۔" پھر وہ بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "میں تمہیں پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔ تم ہیرل کے دستِ راست ہو۔ تمہارا نام جو ٹیل وارنر ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

"تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا کام تمام کرنے کے لئے تمہیں کتنا معاوضہ دیا گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کوٹ کی جیب تھپتھپاتے ہوئے کہا "دس ہزار ڈالر میری جیب میں ہیں اور دس ہزار مجھے اس وقت مل جائیں گے جب میں واپس جاکر ثابت کردوں گا کہ میں تمہارا کام تمام کر آیا ہوں۔"

"رقم تو خاصی بڑی ہے۔" وہ بولی۔

"ہاں۔ اس میں ساؤتھ افریقہ کے دو ٹکٹ بھی آسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ قریب آگئی۔ وہ بدستور میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ معلوم نہیں یہ چاندنی کا سحر تھا یا وہ واقعی اتنی خوبصورت تھی جتنی میری آنکھوں کو نظر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ کسی بہت ہی خاص مٹی سے کسی بہت ہی خاص سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔ اور اس میں بے پناہ نسوانیت گوندھی گئی تھی۔ بہت مشکل تھا کہ کوئی مرد اس کی طرف دیکھتا اور اس کی رگوں میں لہو کی گردش تیز نہ ہوتی۔

"اگر میں معاوضہ بڑھادوں تو کیا تم صورت حال کو الٹ دینے کے بارے میں غور کروگے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنی گن کا رخ تمہارے بجائے ہیرل کی طرف کردوں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ میرا مقصد کچھ ایسا ہی تھا۔" وہ بولی۔

میں استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا "خاتون! اس قسم کی کوشش کرنے والا چوبیس گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"تمہارا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔" وہ بولی۔ "میں سات سال ہیرل کی بیوی رہی ہوں۔ تم ہیرل کو مجھ سے بہتر نہیں جانتے ہو گے۔" وہ کچھ اور آگے جھک گئی۔ میرے حواس پر دھند سی چھانے لگی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "ہیرل کا گروہ درحقیقت ان لوگوں کے سر پر قائم ہے جنہیں وہ سب سے اونچی ہستیاں کہتا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

"بالکل" میں نے تائید کی۔

"اونچی ہستیوں سے مراد صرف تین آدمیوں کی مثلث ہے۔ ان میں سے ایک تو ہیرل خود ہے۔ دوسرا سباسٹن کونچو ہے اور تیسرے تم۔" وہ بولی۔

"یہاں تک بھی تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر تم ہیرل اور کونچو کا صفایا کر دیتے ہو تو کیا ہو گا؟" اس نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے گروہ ٹوٹ جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے اپنے رسیلے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سرگوشی کے سے لہجے میں کہا "دو گولیاں چلا کر اگر تمہیں چار لاکھ ڈالر مل جائیں تو کیا سودا برا ہے؟"

اس کے انداز سے مجھے دھچکا سا لگا۔ لاس ویگاس کے کچھ خاص حلقوں میں یہ اندازِ گفتگو سننے میں آتا ہے۔ میں نے یونہی محض تصدیق برائے تصدیق چاہی۔ "ان گولیوں کا نشانہ یقیناً ہیرل اور کونچو ہوں گے؟"

"بے شک!"

"خاتون! یہ دونوں معززین اس وقت یہاں سے سات سو میل دور موجود ہیں۔"

"کیا تم اس بات پر شرط لگانا پسند کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"آج صبح تو میں انہیں وہیں چھوڑ کر روانہ ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"شاید تم نے کبھی ہوائی جہاز کے بارے میں نہیں سنا؟" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولی۔ "اس کے ذریعے لوگ اس سے بھی کہیں کم وقت میں اس سے کہیں زیادہ فاصلے طے کر لیتے ہیں۔"

اس نے ایک بار پھر مجھے الجھا دیا تھا۔ "وہ بھلا اس خلیج کے دور افتادہ علاقے میں ..... اس ویرانے میں آنے کی زحمت کیوں کریں گے؟"

"ایک تو اس لئے کہ میں یہاں قریب ہی ایک دوسری کھاڑی کے عقب میں رہتی ہوں۔ اس جگہ کا نام کاردوے ہے....."

میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا "تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ یہاں دیکھنے آئیں گے کہ میں نے کام مکمل کیا ہے یا نہیں؟"

"یقیناً۔" اس نے وثوق سے جواب دیا۔

میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ پہلے اس کی وجہ وہ خود تھی لیکن اب اس کے الفاظ بھی میرا بلڈ پریشر بڑھا رہے تھے۔ یہ سوچ کر ہی میں اپنے آپ کو غصے سے پاگل ہوتا محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک کام میرے سپرد کرنے کے بعد تصدیق کرنے بھی آ رہے تھے، آیا میں نے وہ کام کیا ہے یا نہیں۔ اگر انہیں اتنی ہی بے اعتباری تھی تو یہ کام انہوں نے خود کیوں نہیں کر لیا؟ مجھے بھیجنے اور اتنی رقم خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

"میں تمہارے ذہن کو پڑھ رہی ہوں۔" وہ ملامت سے بولی، "تمہیں حیرت ہو رہی ہے کہ میرا صفایا کرنے کے لئے انہوں نے تمہیں کیوں بھیجا ہے؟ ہیرل نے خود یہ کام کیوں نہیں کر لیا یا کونچو کے سپرد کیوں نہیں کر دیا؟"

وہ دھیرے سے ہنسی اور اس ہنسی نے یوں میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑا دی جیسے وہاں الاسکا کی سرد ہوائیں چلنے لگی ہوں۔ پھر وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی "میں تمہیں بتاتی ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی گن مین نہیں ہے۔ دونوں گولی نہیں چلا سکتے اور خونریزی اپنی آنکھوں سے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے۔ ہیرل خون بہتے نہیں دیکھ سکتا۔ اسے تو اگر شیو بناتے ہوئے ذرا سا چرکا لگ جائے اور وہ تھوڑا سا خون بہتے دیکھ لے تو اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ کونچو بھی اسی کی طرح کمزور دل ہے۔"

"میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ صرف نظر آنے کی حد تک سخت دل ہیں۔ سخت گیر نظر آنے کی اداکاری کرتے ہیں لیکن کیا کبھی تم نے انہیں خود اپنے ہاتھوں سے کوئی مار دھاڑ والا کام کرتے دیکھا ہے؟"

میں نے سوچا تو احساس ہوا کہ واقعی میری یادداشت میں ایسا کوئی واقعہ محفوظ نہیں تھا جب میں نے انہیں کچھ کرتے دیکھا ہو۔ ہیرل کے تو خیر یہ شایانِ شان بھی نہیں تھا۔ وہ تو باس تھا۔ اس کا کام صرف احکام دینا تھا۔ کونچو اس کا دستِ راست تھا اس لئے اگر وہ بھی اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں کرتا تھا تو یہ بات ہمیں کبھی تعجب کا باعث محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جو کام گن سے انجام دئے جاتے تھے وہ صرف میرے ذمے ہوتے تھے۔

وہ رائفل بلند کرتے ہوئے بولی "کیا میں اب تم پر اعتماد کر سکتی ہوں؟ اسے ایک طرف رکھ سکتی ہوں؟"

میں رائفل کی طرف نہیں، اس کے سراپا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے رائفل ایک طرف رکھ دی اور مزید آگے کھسک آئی۔ اس کے وجود کی خوشبو میرے حواس پر سحر سا طاری کئے دے رہی تھی۔

"تمہارے خیال میں ہیرل جن منشیات کا دھندا کرتا ہے وہ اس کے پاس کہاں سے آتی ہیں؟" اس نے دریافت کیا۔

"میرے خیال میں اسے شمال کے علاقے سے مال سپلائی ہوتا

ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"درست ہے... اور مال موٹر بوٹ کے ذریعے آتا ہے۔" وہ بولی۔

"تم میری معلومات میں اضافہ کرتی رہو۔ میں توجہ سے سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے جسم کی زبان میں باتیں شروع کر دیں اور میرے حواس جو پہلے ہی دھندلائے ہوئے تھے، گویا یکدم آندھیوں کی زد میں آ گئے۔ لیکن چند لمحے بعد یہ خواب ٹوٹ گیا۔ وہ مجھے پیچھے دھکیل کر اپنے لہجے کے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے بولی "میں تمہیں بیرل اور کونچو کے یہاں آنے کی دوسری وجہ بتانے لگی تھی۔ آج صبح تین بجے وہ دونوں پوائنٹ فورشے کے علاقے میں ایک موٹر بوٹ کی آمد کے منتظر ہوں گے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟" میں نے اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں پوچھا۔

وہ دہکتی سی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تمہیں اپنی زندگی کی وہ شام یاد ہے جب تم جزیرہ شہر میں تھے اور اپنی دانست میں مصیبت میں پھنس گئے تھے؟ بیرل نے تمہیں مصیبت سے نکالا تھا اور یوں تم گروہ میں شامل ہوئے تھے۔ وہ سب سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ پہلے سے تیار شدہ ڈراما تھا جس میں اس نے مجھے بھی استعمال کیا تھا اور اس وقت اس سے میری شادی ہوئے صرف تین ہفتے گزرے تھے۔"

اس دور کی پرچھائیاں سی میری نظروں کے سامنے سے گزرتی چلی گئیں۔ اس ایک شام نے میری زندگی کا رخ بدل دیا تھا۔ میرے سامنے ایک خوبصورت اور معززانہ زندگی کے جو خواب بکھرے ہوئے تھے ان کی جگہ بس دھندلکے میں ڈوبا ہوا ایک ویرانہ رہ گیا تھا۔ سب خواب اُجڑ گئے تھے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تمہیں معلوم ہے میں کیوں بیرل کو چھوڑ کر اپنے اس پرانے آبائی گھر میں واپس آ گئی؟ اس لئے کہ وہ مجھے زندہ چھوڑنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے بارے میں ہر بات جانتی ہوں۔ میں بہت زیادہ جان گئی تھی۔ اس لئے اس نے مجھے ہلاک کرنے کے لئے تمہیں بھیجا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "لیکن ایک بات اسے نہیں معلوم، وہ یہ کہ اس سے علیحدگی کے بعد بھی مجھے اس کے بارے میں ہر اطلاع ملتی رہی ہے۔ اس نے ایک اور معصوم سی لڑکی کو گروہ میں کھینچا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ یہ اس کی غلطی تھی۔ چند ہفتے پہلے تک وہ لڑکی اس کے گروہ میں میری مخبر کے طور پر کام کر رہی تھی۔ حال ہی میں اس نے خودکشی کر لی ہے۔ اس کی موت کے ساتھ ہی میرے لئے اطلاعات کا سلسلہ رک گیا۔"

"میں نے تو یہ پوچھا تھا کہ تمہیں موٹر بوٹ کے بارے میں کیونکر معلوم ہے؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"کیا اب میں پورا نقشہ کھینچ کر تمہارے سامنے رکھوں؟" وہ تیزی سے بولی "کیا میرا یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ بیرل اور کونچو پوائنٹ فورشے کے مقام پر اس موٹر بوٹ کا استقبال کریں گے اور موٹر بوٹ میں آنے والے کو روئی کی چند گانٹھوں کے عوض چار لاکھ ڈالر ادا کریں گے؟"

"روئی کی گانٹھوں کے عوض؟" میں نے دُہرایا۔

"ہاں... روئی بہت نایاب ہو گئی ہے نا؟" وہ استہزائیہ لہجے میں بولی "اور روئی کی بعض قسمیں ایسی ہوتی ہیں جن میں دوسری چیزیں بھی لپٹی چلی آتی ہیں۔"

میں سوچ رہا تھا کہ کسی بھی طرف ہو جانے میں میرا کوئی نقصان نہیں تھا البتہ ایک طرف ہونے میں منافع کم تھا۔ وہ میرے اتنے قریب تھی کہ میں چاہتا تو اسے قتل کر سکتا تھا لیکن اسے قتل کرنے کی صورت میں مجھے صرف دس ہزار ڈالر ملتے لیکن اگر میں اس کی طرف ہو جاتا، اس کا ساتھ دیتا تو چار لاکھ ڈالر بھی ہاتھ آ سکتے تھے اور وہ خود بھی میری بن سکتی تھی۔ اس جیسی عورت کو پانے کے اب تک میں نے صرف خواب ہی دیکھے تھے۔

میں تمام امکانات کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا اس میں ڈبل کراس کا امکان ہو سکتا تھا؟ اس نے کم از کم یہ تو درست کہا تھا کہ کچھ عرصہ قبل ایک نوخیز اور معصوم لڑکی کو گروہ میں کھینچا گیا تھا۔ یہ بھی درست تھا کہ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کا مطلب ہے یہ بھی درست ہو سکتا تھا کہ وہ لڑکی اس کے لئے مخبری

کر آ رہی ہو۔
اس لڑکی کی یادیں ایک تیز رفتار فلم کی طرح میری نظروں میں گھومیں اور پلک جھپکتے میں معدوم ہو گئیں۔ گزشتہ موسم بہار کے دوران ہم نیو آرلینز میں تھے جہاں ہیرل نے اس کم عمر اور اسمارٹ لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ اس پر لٹو ہو گیا تھا۔ اس نے اس پر ڈورے ڈالنے کی بڑی کوشش کی' اسے بڑے اونچے خواب دکھائے لیکن لڑکی جال میں نہ آئی۔
بالآخر اس نے میری ڈیوٹی لگائی کہ لڑکی کو ہر حال میں گروہ میں آنا چاہئے۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔ میں نے ایک ہفتہ صرف کیا اور بالآخر ایک رات وہ میرے ساتھ تفریح اور کھانے وغیرہ کے لئے باہر جانے پر آمادہ ہو گئی۔ کچھ تو باہر بھی میں نے بڑے حساب سے اسے بہت سی پلادی اور پھر واپسی پر میرے موٹیل کے کمرے میں ڈرنکس میں بھی مجھے کچھ ہاتھ کی صفائی دکھانی پڑی۔ دوسری صبح جب وہ بیدار ہوئی تو اس نے مجھے بہت برا بھلا کہا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر اسے گروہ میں شامل ہونا پڑا۔
ڈائنا اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تن کر کھڑی تھی۔ چاندنی میں اسے یوں سرتاپا دیکھنا ایک صبر آزما کام تھا۔ اس نے خلیج میں ایک طرف اشارہ کیا۔۔۔ دور۔۔۔۔ بہت دور کسی موٹر بوٹ کی بتیاں چنگاریوں کی طرح جھلملاتی نظر آ رہی تھیں۔
"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا جوئیل؟" اس نے پوچھا۔
میں نے ایک بار پھر غور کیا۔ رائفل اس کے عقب میں تقریباً تین فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میرا ریوالور زیادہ دور تھا۔ لیکن مسئلہ یہی نہیں تھا۔ مسئلہ خواہشوں اور محسوسات کا بھی تھا۔ میرے سامنے دو راستے تھے۔ دونوں ہی برائی کی طرف جاتے تھے۔ لیکن جس راستے پر مجھے اس کی رفاقت میسر آ سکتی تھی' میرے خیال میں وہ چھوٹی برائی کی طرف جاتا تھا۔
"میں تمہارے ساتھ ہوں۔" بالآخر میں نے کہا۔
"بہت خوب۔۔۔" اس نے کہا اور پلٹ کر اپنی رائفل اٹھائی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرا ریوالور بھی اٹھا لیا۔ رائفل اس نے مجھے دے دی اور میرا ریوالور اپنی نیکر کی بیلٹ میں اڑس لیا۔
وہ مسکراتے ہوئے بولی "رائفل میں نے اس لئے تمہیں دی ہے کہ یہ ہاتھی کے شکار کے لئے بھی کافی ہے۔ بہت دور سے بھی اس پر تمہارا نشانہ خطا نہیں ہو سکتا۔"
میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ چند منٹ بعد ہم ایک موٹر بوٹ میں تھے۔ ڈائنا نے وھیل سنبھالا اور ہم جنوب کی طرف روانہ ہو گئے۔ پانی میں جھاگ اڑاتی اس خوبصورت کشتی میں سفر کسی خواب کا ایک حصہ محسوس ہو رہا تھا۔ صرف ایک بدصورت حقیقت میرے ساتھ تھی۔ اور وہ تھی میری گود میں رکھی ہوئی رائفل۔
میں ڈائنا کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس پر سے نظر ہٹانا جیسے میرے اختیار میں ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ہاتھ بھی ہلاتی تھی تو میرا دل اوپر نیچے ہونے لگتا تھا۔ کافی دیر تک ہم جنوب کی طرف محو سفر رہے پھر ہمارا رخ جنوب مغرب کی طرف ہو گیا۔ بالآخر اس نے انجن بند کر دیا اور بوٹ خاموشی سے آگے پھسلنے لگی۔
ڈائنا نے گھڑی دیکھی۔ ہلکے اندھیرے میں سامنے ساحل نظر آ رہا تھا۔ چاروں طرف ویرانی اور سکوتِ شب کا راج تھا۔ ساحل پر صرف پام کے درختوں کی چند قطاریں گویا انجانے مسافروں کی منتظر کھڑی تھیں۔
"یہ پوائنٹ فورشے ہے۔" اس نے بتایا "اور ہمارے پاس ابھی خاصا وقت ہے۔"
"یہ تو اچھی بات ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ جو کچھ ہو سکتا تھا اور جو کچھ نہیں ہو سکتا تھا اس سب کے تصور سے میرے اعصاب پر تناؤ طاری تھا۔ میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بوٹ کو لنگر انداز کرنے کے بعد ہم ساحل پر جا لیٹے۔ میں نے ایک بار نہیں' کئی بار اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ہر بار اس نے میرا ہاتھ روک دیا۔ "بعد میں۔" اور اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی غیر متزلزل قوتِ فیصلہ بھی رکھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آگ تھی۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا' ہیرل کے ہتھے چڑھنے سے پہلے وہ کیسی لڑکی رہی ہو گی؟
بہت دیر تک ہم دونوں بالکل خاموش رہے۔ ایک بار پھر مجھے یہی محسوس ہونے لگا جیسے کرۂ ارض پر ہم دونوں کے سوا کوئی انسان موجود نہیں۔ آخر کار اس سکوت میں کچھ ارتعاش پیدا ہوا۔ بہت دور کہیں سے کسی موٹر بوٹ کی نہایت مدھم سی پُھٹ پُھٹ' سنائی دینے لگی جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔
وہ یکدم اٹھ بیٹھی اور اپنی گھڑی دیکھنے لگی۔ گھڑی دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بوٹ کی طرف دوڑی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ بوٹ پر پہنچ کر وہ قطعی غیر جذباتی اور کاروباری سے لہجے میں بولی' "سنو۔۔۔ ہیرل اور کونچو نے بھی یہ بوٹ نہیں دیکھی جس پر ہم سوار ہیں۔ وہ اب کسی بھی لمحے یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ملاقات کی جگہ یہی ہے۔ وہ سمجھیں گے کہ یہی ان کی مطلوبہ کشتی ہے۔ اور تم وہ کیپٹن ہو جسے اس کے لئے مال لے کر آنا تھا۔"
"لیکن اگر اصل کیپٹن آن پہنچا؟" میں نے کہا۔
"یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" وہ بولی "ویسے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہیرل وقت سے کچھ پہلے آن پہنچا ہے۔ جس سمت سے یہ موٹر بوٹ آ رہی ہے اس طرف سے صرف ہیرل ہی آ سکتا ہے۔"
میں بوٹ کی آواز سن رہا تھا اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہیرل اور کونچو نے میرے ساتھ کیا کچھ کیا تھا۔ کس طرح میرے

خوابوں کو اُجاڑا تھا۔ نیو آرلینز والی لڑکی اور اس جیسی دوسری بہت سی لڑکیوں کو کس طرح برباد کیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ یہ سب باتیں اچھی طرح یاد کرنے کے بعد میرے لئے ہیرل اور کونچو کو قتل کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ ٹریگر دبانا میرے لئے ایک آزمائش نہیں بلکہ ذریعۂ مسرت اور نجات کا پیش خیمہ بن جائے گا۔

اس کے علاوہ میں اس عورت کے بارے میں سوچنے کی کوشش کر رہا تھا جو میرے سامنے موجود تھی۔ یہ اس منحوس موٹے کی سابق بیوی تھی۔ آئندہ زندگی میں وہ میری پارٹنر بننے والی تھی۔ اس کا وعدۂ فردا میرے لئے زندگی کی سب سے بڑی کشش بن گیا تھا اور اس وعدے کی تکمیل کی شرط اس نے واضح کردی تھی۔

دوسری موٹر بوٹ لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ ڈانا ڈیک پر کھڑی تھی۔ دوسری بوٹ سے تین مرتبہ بتی جلا بجھا کر سگنل دیا گیا۔ ڈانا نے اسی انداز میں بتی جلا بجھا کر جواب دیا۔ دوسری بوٹ ہمارے عین قریب آگئی۔

"وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔" ڈانا نے نیچی آواز میں مجھ سے کہا "اس لئے جیسے ہی وہ ہماری بوٹ پر قدم رکھیں، انہیں اڑا دینا۔"

رائفل پر میری گرفت سخت ہوگئی۔ میری ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ ڈانا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ انہیں شبہ ہوتا وہ کسی جال میں پھنس رہے ہیں، انہیں ختم کردینا ضروری تھا۔

دونوں کشتیاں آہستگی سے ٹکرائیں اور تقریباً جُڑ گئیں۔ پہلے موٹا ہیرل ہماری بوٹ پر آیا۔ وہ جتنا موٹا تھا اتنا ہی بدصورت بھی تھا۔ اس کے پیچھے لومڑی کی شکل والا کونچو تھا۔ اس کی بٹن جیسی آنکھیں مضطربانہ انداز میں حرکت کر رہی تھیں۔

میں نے رائفل بلند کی اور دوسرے ہی لمحے فضا تڑتڑاہٹ کی آوازوں سے مرتعش ہوگئی۔ ہیرل کا چہرہ سرخ ملغوبے میں تبدیل ہوگیا۔ کونچو الٹے قدموں بھاگا لیکن اسے تاخیر ہوچکی تھی۔ پلٹنے سے پہلے گولی اس کے پیٹ میں اتر چکی تھی۔ میں نے دوبارہ ٹریگر دبایا لیکن رائفل خالی ہوچکی تھی۔

ڈانا کی سرد مہری کا جواب نہیں تھا۔ ہیجان سے میرے جسم پر کپکپی طاری تھی لیکن وہ بالکل پُرسکون اور ساکت تھی حتیٰ کہ مسکرا بھی رہی تھی۔ میں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ مجھے خوشی تھی کہ کام بالآخر مکمل ہوگیا تھا۔ اب میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

اچانک میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میرا اپنا ریوالور۔ دوسرے ہی لمحے ریوالور نے شعلہ اگلا اور آگ میرے معدے میں منتقل ہوگئی۔ میں نے سہارے کے لئے ریلنگ کو پکڑنا چاہا لیکن نہ پکڑ سکا اور گر پڑا۔ اسے شاید مجھ پر رحم آگیا تھا کہ اس نے مزید فائر نہیں کئے۔ یا پھر شاید اس کے خیال میں میرے لئے ایک ہی گولی کافی تھی۔ موت کا اندھیرا میری آنکھوں میں اترنے لگا

شگوفے

ایک شخص اپنی بیوی کو علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے بیوی کو دیکھ کر کہا "ایک مہینہ کام کاج نہ کرو، اور تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے کشمیر چلی جاؤ یا زیارت۔"

شوہر خاموش رہا تو بیوی نے پوچھا۔ "بتاؤنا ہم کہاں جائیں گے؟"

"شوہر نے کہا "کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس۔"

●●● ** ●●●

ایک ٹیچر نے ایک لڑکے کی رپورٹ بک پر لکھا "یہ بچہ نہ صرف یہ کہ اسکول کا سب سے بدتمیز بچہ ہے بلکہ کبھی غیر حاضر بھی نہیں ہوتا۔"

تھا۔ وہ میرے سر پہ کھڑی تھی۔ اپنے اسی حسین جسم کے ساتھ، جسے چھونے کی مجھے حسرت ہی رہ گئی تھی۔ اس نے نیچے بیٹھ کر میری جیبیں ٹٹولیں۔ مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اس کا ہاتھ روک سکتا۔ اس نے میری جیب سے دس ہزار ڈالر نکال لئے۔ اس کے چہرے پر نہ جانے کتنے متضاد تاثرات تھے لیکن نفرت ان سب پر غالب تھی۔

"شکریہ جو ئیل۔" وہ بولی "میرے لئے کرائے کا قاتل کے فرائض انجام دینے کا شکریہ۔ تمہارے ساتھ زندگی شاید بہت اچھی گزرتی۔ حسین ساحلوں پر..... چاندنی راتوں میں ہم رفاقتوں کی ان گنت، حسین کہانیاں رقم کرتے..... لیکن تم ایک بات نہیں جان سکے..... نیو آرلینز کی وہ کنواری اور معصوم لڑکی جسے تم نے شکار کرکے بھیڑیوں کے سامنے پھینکا تھا وہ میری چھوٹی بہن تھی....."

یہ کہہ کر اس نے ٹھوکر مار کر مجھے بوٹ سے نیچے پانی میں پھینک دیا۔

●●●●**●●●

بس یہی میری کُل کہانی ہے آفیسر! میرے خیال میں یہ ایک معجزے سے کم نہیں کہ مجھے دن چڑھے مدد میسر آگئی۔ مجھے پانی سے نکال لیا گیا اور میں زندہ بھی بچ گیا۔ گو کہ مجھے اس زندگی کی کوئی خوشی نہیں ہے جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی۔ لیکن میں نے بہتر یہی سمجھا کہ سب کچھ بلا کم و کاست بتا دیا جائے۔ مجھے نہیں معلوم ڈانا آر تھراپ کہاں ہے۔ تمہاری مرضی ہے اسے میرا اقبالِ جرم سمجھو یا اظہارِ ندامت۔ لیکن میرا خیال ہے اس تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے کم از کم یہ ایک ڈھنگ کا کام کیا ہے کہ سچ بول دیا ہے.....!"

"SPARE HER FOR PASSION
GROVER BRINKMAN

پہلا رنگ

سلسلہ ہائے خواہشات

عبدالقیوم شاد

انساں کو مات دے گیا سلسلۂ ہائے خواہشات
سلسلۂ ہائے خواہشات، قاتلِ حیاتِ بے ثبات

خواہشات کے دریا میں جب طغیانی آجائے تو پھر انسان کو خود پر کوئی اختیار نہیں رہتا، وہ بُرے بھلے کی ہر تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ اُس کے قدم ہر خطرے اور نقصان کی پروا کیے بغیر اُس سمت میں اُٹھنے لگتے ہیں جہاں اُس کے خیال میں منزلِ مقصود ہوتی ہے محرومیوں کا شکار یہ نوجوان بھی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ایک ایسے چکنے دمکتے راستے کے فریب میں آگیا جس کے اختتام پر مایوسیوں کے اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔

یک ہی جست میں اوجِ ثریا تک پہنچنے کی کوشش کا شاخسانہ

کراچی سینٹرل جیل سے رہا ہونے کے بعد فرخ شیخ نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، مگر کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ اسے اس بات کی امید بھی نہیں تھی کیوں کہ اسے ڈکیتی کے الزام میں سزا ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا قیدی بھی رہا ہوا تھا، جس کا نام امیر علی عرف میبو تھا۔ میبو عادی مجرم تھا اور ایک دفعہ پہلے بھی سزا بھگت چکا تھا۔ جبکہ فرخ شیخ کو پہلی دفعہ سزا ہوئی تھی۔ اور اب وہ

اس کی مگری سے دوری رہنا چاہتا تھا۔ جیل کے اندر اس نے جو دوست بنائے تھے ان میں سے ایک میو بھی تھا۔ لیکن اب وہ میو کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کرنا چاہتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور شریف خاندان کا فرد تھا۔ اور کسی عادی مجرم سے دوستی کرنا اس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔

لیکن امیر علی عرف میو دوستی قائم رکھنا چاہتا تھا کیونکہ وہ فرخ شیخ کو اچھا دوست اور اچھا ساتھی سمجھتا تھا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے جیل کے بیرونی گیٹ پر پہنچ گئے۔

"اچھا بھئی میو۔۔۔" فرخ رخصت ہونے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "تمہارے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ اب اجازت دو۔"

میو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا' بولا "کیا بات ہے شیخ' اتنی جلدی کس بات کی ہے؟"

"جلدی تو خیر کوئی نہیں۔" فرخ اس کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا "لیکن ظاہر ہے کہ تم بھی اپنے گھر والوں اور دوستوں سے ملنے کے لئے بے چین ہو گے۔"

"دیکھو' میں تم کو ایک پتے کی بات بتاتا ہوں۔" میو نے کہا "اگر ہم نے کسی سیاسی چکر میں جیل کاٹی ہوتی تو ادھر ایک جلوس ہمارے استقبال کو موجود ہوتا۔ رشتے دار اور دوست بھی آتے۔ لیکن ہم قانونی مجرم ہیں اس لئے ہمارا استقبال کوئی نہیں کرے گا۔ نہ ادھر کوئی استقبال کرے گا اور نہ گھر پر! آؤ کسی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔"

فرخ نے اس چورنگی کی طرف دیکھا' جو کشمیر روڈ اور شہید ملت روڈ کے سنگم پر واقع تھی' پھر بولا "میں کچھ دیر کے لئے اس چورنگی پر بیٹھوں گا۔"

"ادھر کیا کرو گے بیٹھ کر؟"

"جیل کی دیواروں کو دیکھوں گا۔"

"کیا؟" میو نے فکر مندی سے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا بابا؟ جیل کی دیواروں کو دیکھ کر کیا کرو گے؟"

"تم میری بات نہیں سمجھو گے۔"

"سمجھوں گا کیسے نہیں! میٹرک پاس ہوں اور عمر میں تم سے سات سال بڑا بھی ہوں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے میں نے۔ اچھا۔۔۔ تم ادھر چل کر بیٹھو۔ میں کسی اچھے سے ہوٹل سے کھانا لے کر آتا ہوں۔ دونوں بھائی ادھر بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور دیواروں کو بھی دیکھیں گے۔ اور دیکھو' چلے نہیں جانا۔"

فرخ نے پشت پر ہاتھ باندھے اور رواں ٹریفک کو دیکھتے ہوئے چورنگی کی طرف چل پڑا۔ اسے وہ حالات اور واقعات یاد آرہے تھے' جو اسے قدم بہ قدم جیل کے اندر لے گئے تھے۔

O———□———O

سات سال قبل جب اس نے بی اے پاس کیا تو اس کی ماں پڑوسیوں اور عزیزوں میں مٹھائی تقسیم کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اللہ نے چاہا تو اب ہمارے دن پھر جائیں گے۔ میرے فرخ بیٹے نے بی اے پاس کر لیا ہے۔ اب ہمیں کرائے کے مکان سے بھی نجات مل جائے گی اور میں بیٹیوں کی شادیاں بھی دھوم دھام سے کروں گی۔"

فرخ نے جب ماں کی ان سادہ سی خواہشات پر غور کیا تو وہ اندر سے کانپ گیا۔ ماں نے اس پر تین ذمے داریاں ڈال دی تھیں۔ اول' آسائش کی زندگی۔ دوم' نیا مکان اور سوم' دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں۔ اس نے حساب لگایا کہ ان تین کاموں کے لئے کم از کم دس بارہ لاکھ روپے کی ضرورت تھی اور نوکری سے اتنی بڑی رقم تو شاید وہ بیس سال میں بھی جمع نہیں کر سکتا تھا۔

اس کا بوڑھا باپ سرکاری ملازم تھا اور اس کی تنخواہ سے خط گھر کا گزارہ چل رہا تھا۔

فرخ کو دوسرا جھٹکا اس وقت لگا جب وہ خالہ زینت کے گھر اپنے پاس ہونے کی مٹھائی دینے گیا۔ خالہ زینت کی بیٹی عمرانہ اس کی منگیتر تھی اور دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔

زینت بیگم نے مٹھائی کا ڈبہ الماری میں رکھتے ہوئے کہا "فرخ بیٹے' ملازمت ملتے ہی دو ہزار روپے کی کمیٹی ڈال دینا۔"

"کمیٹی کس لئے؟"

"ارے بیٹا' کمیٹی نہیں ڈالو گے تو شادی کیسے ہوگی!" خالہ زینت نے ہاتھ نچایا۔ "میرا بڑا داماد اکیس تولے سونا لایا تھا۔ تمہیں ایک آدھ تولہ زیادہ ہی لانا پڑے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بہن کے بیٹے کی طرف کوئی انگلی اٹھائے۔"

فرخ نے حساب لگایا تو پتا چلا کہ ستر اسی ہزار کا صرف زیور ہی بنتا تھا۔ اس کے علاوہ کپڑے' ولیمہ اور بہت ساری رسمیں بھی نبھانا پڑتی تھیں۔ گویا یہ کم از کم ڈیڑھ دو لاکھ کا نسخہ تھا۔

چند ہفتوں کی خوشیوں کے بعد جب اس نے نوکری کی تلاش شروع کی تو اسے اپنی اور اپنی ڈگری کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہو گئی۔ سرکاری ملازمت رشوت اور سفارش کے بغیر ملنی مشکل تھی۔ پرائیوٹ ملازمتوں کے لئے ٹیسٹ اور انٹرویو دینے کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اور جانتا بھی کیسے' سارے امتحان نقل مار کر پاس کئے تھے۔ پرائیوٹ دفتروں میں کوئی اسے قاصد رکھنے پر بھی تیار نہیں تھا۔ ایک دو جگہ پر کلرکی کی آفر ہوئی۔ مگر تنخواہ اتنی کم تھی کہ اس کے جیب خرچ کے لئے بھی کافی نہیں تھی۔

چھ مہینے کی خواری کے بعد اس نے کاریں کرائے پر دینے والی ایک فرم میں ڈرائیور کی حیثیت سے نوکری کر لی۔ گھر میں کسی کو اس کی وہ نوکری پسند نہیں آئی۔ انہوں نے کہا "اگر ڈرائیوری ہی کرنا تھی تو تعلیم حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

فرخ نے جواب دیا کہ اسے اچھی نوکری نہیں' اچھی تنخواہ چاہئے۔ اس ملازمت میں تنخواہ تین ہزار روپے ماہانہ تھی' اور اتنی ہی رقم اوور ٹائم اور ٹپ وغیرہ سے بن جاتی تھی۔

کمپنی کی گاڑیاں زیادہ تر غیر ملکی کرائے پر لیتے تھے اور وہ پڑھے لکھے ڈرائیور کو ترجیح دیتے تھے۔

ایک صبح منیجر نے فرخ کو کلفٹن کے علاقے کا ایڈریس دیا اور کہا "اس پتے پر چلے جاؤ۔ یہاں ایرک زیگلر نامی ایک غیر ملکی رہتا ہے۔ غالباً جرمن ہے۔ اسے پورے دن کے لئے گاڑی چاہئے' سفید بشو بشی لے جاؤ۔ واپسی میں کرایہ بھی لیتے آنا۔ اگر وہ بل مانگے تو کہنا کہ بل بائی پوسٹ بھیج دیا جائے گا۔"

فرخ نے گاڑی نکالی اور مذکورہ پتے پر پہنچ گیا۔ گیٹ پر ایک مسلح محافظ موجود تھا۔

"میں ایسٹرن کار سروس سے آیا ہوں۔" فرخ نے محافظ سے کہا "تھوڑی دیر پہلے اس بنگلے سے مسٹر ایرک زیگلر نے کار کے لئے فون کیا تھا۔"

محافظ نے فرخ سے نام پوچھا اور انٹرکام پر کسی سے بات کرنے کے بعد گیٹ کھول دیا' بولا "سیدھے اندر چلے جاؤ اور بنگلے کے سامنے جا کر انتظار کرو۔ صاحب ابھی مصروف ہے۔"

فرخ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

بنگلہ خاصا وسیع تھا اور سامنے کے حصے میں ایک کشادہ لان بنا ہوا تھا۔ فرخ نے ڈرائیو وے میں گاڑی کھڑی کر دی اور باہر نکل کر انتظار کرنے لگا۔ اس وقت وہ سفید یونیفارم میں ملبوس تھا اور سر پر سفید پی کیپ پہن رکھی تھی۔ برآمدے کے سامنے ایک سلیٹی رنگ کی ٹویوٹا کار کھڑی تھی۔

چند ساعتوں کے بعد اس کے کانوں میں ایک تیز نسوانی چیخ کی آواز آئی۔ اس آواز میں خوف کے بجائے تحکم پایا جاتا تھا۔ فرخ نے تیزی سے گھوم کر آواز کی سمت میں نظر دوڑائی۔

لان کے اس کونے میں جہاں عمارت کا سایہ پڑ رہا تھا' ایک غیر ملکی لڑکی ایک پاکستانی نوجوان کے ساتھ جوڈو کراٹے کی پریکٹس کر رہی تھی۔ اس نے کراٹے کی مخصوص سفید یونیفارم کے اوپر سرخ بیلٹ باندھ رکھا تھا۔ فرخ دلچسپی سے یہ فری شو دیکھنے لگا۔

پاکستانی نوجوان نے بھی سفید یونیفارم پہن رکھی تھی' تاہم اس کے بیلٹ کا رنگ سفید تھا۔ فرخ نے اندازہ لگایا کہ نوجوان زیادہ تر دفاع ہی کر رہا تھا جب کہ لڑکی پینترے بدل بدل کر وار کر رہی تھی۔ نوجوان پیچھے ہٹتے ہٹتے اچانک کسی بیلے ڈانسر کی طرح ایک پیر پر گھوما اور اس کا دوسرا پیر اڑتا ہوا لڑکی کی گدی پر پڑا۔ چوٹ کی آواز دور تک سنائی دی تھی۔

لڑکی لڑکھڑائی اور لان پر ڈھیر ہو گئی۔ نوجوان جلدی سے آگے بڑھا اور زمین پر بیٹھ کر لڑکی کی گردن سہلانے لگا۔

فرخ نے بھویں اچکائیں اور سوچنے لگا' شاید اس اصلی چوٹ کا یہی مقصد تھا۔

چند منٹوں کے بعد لڑکی ہوش میں آگئی اور غصیلی نظروں سے نوجوان کو گھورنے لگی لیکن نوجوان کے چہرے پر ندامت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے سہارا دے کر لڑکی کو کھڑا کرنا چاہا مگر لڑکی خود ہی کھڑی ہو گئی اور اچانک نوجوان کی گردن پر کراٹے کا ہاتھ جڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے تحاشا ہنسنا شروع ہو گئی۔ نوجوان اپنی گردن سہلاتے ہوئے اسے گھورنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے' ایک دوسرے کو فرشی سلام کیا' قریبی بینچ پر رکھے ہوئے تولیے اٹھائے اور پسینہ پونچھتے ہوئے برآمدے کی طرف چل پڑے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی فرخ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد برآمدے میں دو آدمی نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک غیر ملکی اور دوسرا پاکستانی تھا۔ پاکستانی نوجوان تھا اور غیر ملکی کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

غیر ملکی انگریزی میں کہہ رہا تھا "مسٹر مرتضیٰ' تم میرے لئے اجنبی ہو' میں تم پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ مال لے آؤ اور پیسے لے جاؤ۔ میں تمہیں زیادہ سے زیادہ تین دن کی مہلت دے سکتا ہوں۔"

"مسٹر ایرک صرف تین چار گھنٹے کی بات ہے۔" مرتضیٰ نامی نوجوان نے انگریزی میں کہا "تم ہمیں پچاس فی صد ایڈوانس دے دو' ہم تین گھنٹے کے اندر مال پہنچا دیں گے۔ آج کل ہمارا ہاتھ ذرا تنگ ہے اور پارٹی کیش مانگتی ہے۔"

"تم پارٹی کو میرے پاس کیوں نہیں لے آتے؟" ایرک نے کہا۔

فرخ نے دیکھا کہ مرتضیٰ کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا۔ تینوں برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس رک گئے

مرتضیٰ نے اپنے ساتھی سے اردو میں پوچھا "کیا خیال ہے سلطان' پارٹی کی اس سے براہ راست ملاقات کروا دیں؟"

"ہرگز نہیں" سلطان نے کہا "اگر ہم نے پارٹی کو اس سے ملوا دیا تو ہمارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ دونوں براہ راست سودا کر لیں گے۔ بات بنے یا نہ بنے ہم اپنا اصول نہیں توڑیں گے۔"

"پارٹی کراچی نہیں آسکتی۔" مرتضیٰ نے ایرک سے انگریزی میں کہا "کراچی مال پہنچانا مشکل کام ہے۔ یہ کام ہم ہی کر سکتے ہیں۔"

"میں تمہیں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی مہلت دے سکتا ہوں۔" ایرک نے کہا۔ تب ہی اس کی نظر سفید بشو بشی پر پڑی' وہ برآمدے کی تین سیڑھیاں طے کر کے باہر آیا اور فرخ کی طرف دیکھنے لگا' جو بظاہر لاتعلق سا کھڑا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کے کان باتوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔

ایرک نے اس سے اردو میں پوچھا "تم ایسٹرن کار سروس سے

آیا؟"

فرخ نے پہلے انگریزی میں جواب دینے کا ارادہ کیا مگر پھر مناسب نہیں سمجھا اور اردو میں کہا "ہاں صاحب' میں آپ کے لئے گاڑی لے کر آیا ہوں۔"

"اوکے' ابھی انتظار کرو۔" ایرک نے کہا' پھر مرتضیٰ اور سلطان کو خدا حافظ کہہ کر واپس چلا گیا۔

"تم اپنے باپ سے کیوں نہیں بات کرتے؟" مرتضیٰ نے سلطان سے کہا "دس لاکھ روپے ان کے لئے کوئی بڑی رقم نہیں ہے"

"ان کی دولت ناخلف اولاد کے لئے نہیں ہے۔" سلطان نے کہا "بقول ان کے میں پہلے ہی بہت رقم برباد کر چکا ہوں۔ اگر میں نے دس لاکھ روپے مانگ لئے تو کم از کم ایک گھنٹے تک لیکچر سننا پڑے گا۔ پھر یہ بتانا پڑے گا کہ رقم کیوں چاہئے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے سلیٹی رنگ کی ٹویوٹا کار کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔

"میں بابا جان کی نصیحتوں سے تنگ آچکا ہوں سلطان بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہر وقت ایک جیسی گھسی پٹی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنی محنت سے یہ ساری دولت کمائی ہے۔ اب تم بھی کچھ کر کے دکھاؤ۔ اس لئے اب میں کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔ بابا جان کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں بھی دولت کما سکتا ہوں۔"

مرتضیٰ نے انگریزی میں کہا "اگر اس شخص کے ساتھ لائن بن گئی تو ایک ہی سودے میں چالیس پچاس لاکھ روپے ہاتھ لگ جائیں گے۔ لیکن رقم کا انتظام ایک ہفتے کے اندر ہو جانا چاہئے۔" قدرے توقف کے بعد اس نے دھیمی آواز میں پوچھا "بینک کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تم تو اس لائن کے ماہر ہو۔"

"اب میرا پرانے ساتھیوں سے رابطہ نہیں رہا۔" سلطان نے کہا "کم از کم دو آدمی اور ہونے چاہئیں۔"

"آدمیوں کا انتظام کرنا مشکل نہیں ہے۔ ایک تو یہ بلیک بیلٹر تیار ہو جائے گا۔ دو تین ملاقاتوں میں خاصا بے تکلف ہو چکا ہے اور اپنی خدمات بھی پیش کر چکا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اتنا بڑا خطرہ مول لینے پر تیار نہیں ہو گا۔"

"اگر دو تین لاکھ روپے ملنے کی امید ہو تو ہر خطرے کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔" مرتضیٰ نے کہا "کمل بلیک بیلٹ ہے اور خاصا دلیر آدمی ہے۔ ایک دو آدمیوں کو تو آنکھ جھپکتے میں ڈھیر کر سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے' بات کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے اندر جاتے دیکھا تھا۔"

فرخ بڑے غور سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ دو تین لاکھ روپے کا ذکر سن کر اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ وہ گلا صاف کرتے ہوئے آگے

بڑھا اور دونوں سے مخاطب ہو کر بولا "میں اس دخل اندازی پر معافی چاہتا ہوں۔ اتفاق سے گریجویٹ ہوں اور تھوڑی بہت انگریزی سمجھ لیتا ہوں۔ میں نے غیر ارادی طور پر آپ کی باتیں سن لی ہیں۔"

سلطان نے اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا' بولا "تم گریجویٹ ہونے کے باوجود ڈرائیوری کر رہے ہو' کوئی اچھا کام کیوں نہیں کرتے؟"

"اچھا کام ملتا ہی نہیں۔"

مرتضیٰ نے پوچھا "ہماری باتوں سے کیا سمجھے ہو؟"

"میں صرف اتنا سمجھا ہوں کہ آپ کو کسی مشکل کام کے لئے ایک دلیر آدمی کی ضرورت ہے اور اس کام میں لاکھوں روپے ملنے کی امید ہے۔" فرخ نے کہا۔ پھر تامل کرتے ہوئے بولا "میں دلیر آدمی ہوں اور مجھے لاکھوں روپے کی بہت سخت ضرورت ہے۔"

مرتضیٰ اور سلطان نے بے اختیار قہقہہ لگایا' مرتضیٰ بولا "یہ کون سی نئی بات ہے' لاکھوں روپے کی آج کل کس کو ضرورت نہیں!"

سلطان اس کے بازو ٹٹولتے ہوئے بولا "تم شریف آدمی لگتے ہو' جو کام ہم کروانا چاہتے ہیں وہ تمہارے بس کا نہیں ہے۔"

فرخ نے کہا "اگر دو تین لاکھ ملنے کی امید ہو تو میں سر دھڑ کی بازی لگا سکتا ہوں۔ آپ آزما کر تو دیکھیں۔"

سلطان نے مرتضیٰ سے مشورہ کرنے کے بعد فرخ کو ڈیفنس سوسائٹی کے ایک اپارٹمنٹ کا پتا دیا اور رات کے آٹھ بجے وہاں ملنے کے لئے کہا۔

اتنے میں ایرک ڈیگلز برآمدے میں نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ کراٹے کی پریکٹس کرنے والی لڑکی اور اس کا انسٹرکٹر بھی تھا۔ لڑکی اب نیلے اسکرٹ اور سفید بلاؤز میں ملبوس تھی اور ایک بار عب حسینہ لگ رہی تھی۔

ایرک نے قدرے ناگواری سے مرتضیٰ کی طرف دیکھا اور بولا "تم ابھی تک یہیں ہو!"

"ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" مرتضیٰ نے انگریزی میں جواب دیا "ہم زیادہ سے زیادہ چار دن کے اندر ۔۔۔ اس نے کن انکھیوں سے اکمل نامی انسٹرکٹر کی طرف دیکھا ۔۔۔ "اپنا کام مکمل کرلیں گے۔"

ایرک' فرخ سے مخاطب ہو کر بولا "ڈرائیور' اندر کچھ سامان رکھا ہے۔ مس نورینا کے ساتھ اندر آجاؤ اور سامان لے کر آؤ۔"

فرخ' مس نورینا کے ساتھ اندر چلا گیا۔ کمرے میں گتے کے چار مضبوط ڈبے رکھے تھے۔ ہر ڈبے کا سائز تقریباً ڈیڑھ کیوب فٹ تھا۔ ان کے گرد سرخ رنگ کی مضبوط ٹیپ لپٹی ہوئی تھی۔ فرخ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ان ڈبوں پر غیر ملکی سفارت خانے کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ یعنی وہ ایسا سامان تھا جسے کسٹم والے چیک نہیں کر سکتے تھے۔

فرخ نے وہ چاروں ڈبے اٹھا کر ڈکی میں رکھ دیئے اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ مرتضیٰ اور سلطان کی گاڑی وہاں سے جا چکی تھی اور بلیک بیلٹ اکمل بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

فرخ نے انجن اسٹارٹ کرنے کے بعد انگریزی میں پوچھا "سر' کہاں جانا ہے؟"

"طفیل روڈ" ایرک نے جواب دیا۔ پھر چونک کر پوچھا "تم انگریزی بھی جانتے ہو؟"

"یس سر' میں گریجویٹ ہوں۔"

ایرک نے آنکھیں پھیلا کر نورینا کی طرف دیکھا۔

فرخ نے کار کو گیئر میں ڈالا اور گیٹ سے نکل کر مین روڈ پر پہنچ گیا۔ اس کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ ایرک' سفارتی بیگ کے ذریعے کوئی غیر قانونی مال پاکستان سے اسمگل کر رہا تھا۔ جبھی مرتضیٰ اور سلطان دس لاکھ روپے کے پچاس لاکھ بنانے کی بات کر رہے تھے۔

راستے میں ایرک نے ایک سفارت خانے میں گاڑی رکوائی اور چاروں ڈبے اندر رکھوا دیئے۔ ایک گھنٹے کے بعد ان کی گاڑی ائرپورٹ کی طرف جا رہی تھی۔ بارہ بجے انہوں نے ایک غیر ملکی مسافر کو' جو یورپ کے کسی ملک سے آیا تھا' ہوٹل پرل کانٹی نینٹل پہنچایا۔

ایرک نے فرخ کو انتظار کرنے کے لئے کہا اور تینوں ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ فرخ نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اخبار پڑھنے لگا۔ اس نے سیٹ کو تھوڑا سا پیچھے کر لیا اور پیر پھیلا لئے۔

چند منٹوں کے بعد کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گیا اور سر گھما کر بائیں جانب دیکھا۔ وہ یہی سمجھا کہ اس کا کوئی دوست وہاں وارد ہو گیا تھا۔ لیکن جب اس کی نظر نورینا کے مسکراتے ہوئے چہرے پر پڑی تو اس نے آنکھیں جھپکائیں۔

نورینا پینجر سیٹ پر بیٹھی دوستانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فرخ کو بالکل پتا نہیں چلا تھا کہ وہ کب دروازہ کھول کر سیٹ پر آبیٹھی تھی۔

"یس مس؟" فرخ نے اخبار تہ کیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہمیں یہاں کچھ دیر ہو جائے گی" نورینا نے انگریزی میں کہا۔ "تم لنچ کر کے آجاؤ" اس نے اپنے پرس سے سو روپے والے دو نوٹ نکال کر فرخ کی طرف بڑھائے "یہ لنچ کے لئے رکھ لو۔ اور تین بجے تک واپس آجانا۔"

"لنچ کے لئے دو سو روپے!" فرخ نے انگریزی میں کہا۔

"ہاں' دو سو روپے۔ یہ میری طرف سے ہیں۔ اگر کچھ پیسے بچ جائیں تو رکھ لینا اور دیکھو "تکلف" نہیں کرو۔"

لفظ تکلف اس نے اردو ہی میں کہا تھا۔

"تمہیں اردو بھی آتی ہے؟" فرخ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں' تھوڑی تھوڑی۔ تکلف اچھا لفظ ہے۔ پاکستانی یہ لفظ بہت استعمال کرتے ہیں۔ مجھے اس کی انگلش نہیں آتی۔"

"اس کی انگلش فارمل ہے۔ ڈونٹ بی فارمل۔"

"شکریہ' میں یہ لفظ یاد رکھوں گی" نوریتا نے کہا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ تم لوگ کسی یورپین کو اردو بولتے دیکھ کر حیران کیوں ہوتے ہو؟ حالانکہ حیران تو ہم لوگوں کو ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہاں تقریباً ہر شخص انگلش بولتا نظر آتا ہے۔ سیلز مین' ویٹر' ٹیکسی ڈرائیور اور کوچوان وغیرہ۔"

"یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ ہمیں انگریزوں کی غلامی سے تو نجات مل گئی۔ مگر انگریزی کی غلامی سے ابھی تک نجات نہیں ملی۔"

نوریتا نے جانے کے لئے دروازہ کھولا' پھر یوں رکی جیسے اچانک کوئی بات یاد آگئی ہو۔

"مرتضٰی تم سے کیا بات کر رہا تھا؟" اس نے پوچھا۔

فرخ نے محسوس کیا کہ درحقیقت اصل بات ہی یہ تھی۔ باقی سب باتیں ضمنی تھیں۔ واضح طور پر اریک اسے مرتضٰی سے باتیں کرتے دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ اس پریشانی کی یہ معلوم ہوتی تھی کہ وہ انگریزی بھی جانتا تھا۔

"مرتضٰی مجھ سے... ہماری کمپنی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" اس نے چالاکی سے کہا "گاڑیوں کے کرائے وغیرہ کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔"

"یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس سے محتاط رہنا" نوریتا نے کہا اور گاڑی سے اتر کر ہوٹل کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

فرخ نے دل میں کہا۔ اگر یہ اچھا آدمی نہیں ہے تو تم لوگ اس سے کیوں لین دین کرنا چاہتے ہو؟

○☆○

سلطان نے جس اپارٹمنٹ کا پتا دیا تھا' وہ مین کورنگی روڈ پر واقع ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا۔

فرخ کی دستک کے جواب میں مرتضٰی نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر بولا "مجھے امید نہیں تھی کہ تم آؤ گے۔ اندر آجاؤ۔"

نشست گاہ میں مرتضٰی کے علاوہ کرائے ماسٹر اکمل بھی موجود تھا۔ میز پر شراب کی بوتل' چند گلاس اور بھنا ہوا گوشت رکھا تھا۔ مرتضٰی ایک جی تھری رائفل چیک کر رہا تھا۔ فضا میں شراب اور سگریٹ کے دھوئیں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

کچن سے برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اندر کوئی عورت بھی موجود تھی۔

فرخ کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ غلط جگہ پر آگیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے واپس چلا جانا چاہئے۔

"تو بھئی استاد' یہ اپنا ڈرائیور بھی آگیا" مرتضٰی نے کہا

"آدمی واقعی ہمت والا معلوم ہوتا ہے" سلطان نے کہا اور صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "بیٹھو' یہ تکے تکے کھاؤ۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"میرا نام فرخ ہے' فرخ شیخ۔"

"کتنے پیسوں کی ضرورت ہے تمہیں؟"

فرخ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا "دراصل بات یہ ہے کہ میں ضرورت مند آدمی ہوں۔ ہمارے مالی حالات بہت خراب ہیں۔ ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں اور میرے والد کی تنخواہ..."

سلطان اس کے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "یہ پرانی فلمی اسٹوری ہے برادر' بوڑھا باپ' ہیرو بیٹا' مکان کا چھ مہینے کا کرایہ سر پر' مالک مکان کی دھمکیاں' لڑکیاں بن بیاہی اور سنگدل جاگیردار ایک شرط پر قرضہ دینے کو تیار ہے۔ اور جاگیردار کی شرط سن کر ہیرو بیٹے کی سوئی ہوئی غیرت جاگ اٹھتی ہے اور وہ... ڈاکو بن جاتا ہے۔"

اس نے اپنی بات پر دل کھول کر قہقہہ لگایا' دوسرے بھی ہنسنے لگے۔

"واہ' سلطان بادشاہ' واہ..." مرتضٰی نے کہا "تم نے تو چار جملوں میں پوری فلمی اسٹوری بیان کردی۔ کیوں نہ ایک فلم کمپنی کھول لی جائے۔ کاروبار بھی اور دیوی درشن بھی..."

سلطان' فرخ کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "تمہارا نام کچھ عورتوں جیسا نہیں ہے؟ میں فرخ بیگم نامی ایک عورت کو جانتا ہوں۔ بڑی رنگ برنگی عورت ہے" تو کھاؤ نا۔"

فرخ ایک کباب اٹھا کر کھانے لگا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا "نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عورتیں مردوں والے نام رکھ لیتی ہیں اور مرد عورتوں والے نام رکھ لیتے ہیں۔"

"دیکھو دوست' میں تمہیں ایک کام کی بات بتاتا ہوں۔" مرتضٰی نے اس سے کہا "آدمی کو کبھی محتاج بن کر بات نہیں کرنی چاہئے۔ اس سے اس کی ہوا نکل جاتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ خودی نہ بیچ غریبی میں دام پیدا کر۔"

"دام نہیں نام" اکمل نے تصحیح کی "خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر۔"

"یہ سو سال پرانی بات ہے" مرتضٰی نے کہا "آج کل غریبی میں نام پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ دام پیدا کرنے کا زمانہ ہے۔ پہلے دام پیدا کرو۔ پھر الیکشن میں کھڑے ہو جاؤ۔ وزیر مشیر بن جاؤ۔ یہ نہ بن سکو تو وزیروں مشیروں کی ٹانگیں کھینچنا شروع کردو۔ نام خود بخود پیدا ہو جائے گا۔"

سلطان نے فرخ سے کہا "شربت بھی پیو۔"

"شکریہ' میں پانی پی لوں گا۔"

"اب ذرا کام کی بات ہو جائے" مرتضٰی نے کہا "یہ کام ہم مجبوری کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ ہمیں اچانک دس لاکھ روپے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ دس لاکھ سے اوپر جو مال ہاتھ لگے گا وہ تم

دونوں کا ہو گا۔ تمہارا اور کرائے ماسٹر کا۔"

اکمل نے کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اگر دس لاکھ سے کم مال ہاتھ آیا تو؟"

"یہ تو پھر بڑی بد قسمتی کی بات ہو گی" سلطان نے کہا "ایسی صورت میں تم دونوں کا دس دس فیصد ہو گا۔ مثلاً اگر کل رقم دس لاکھ ہوئی تو تم دونوں کو ایک ایک لاکھ روپے ملیں گے۔"

"لیکن اس طرح فارمولا غلط ہو جائے گا" اکمل نے کہا "اگر کل رقم گیارہ لاکھ ہوئی تو تمہارے دوسرے حساب کے مطابق ہمیں صرف ایک لاکھ روپے ملیں گے۔"

"تم مجھے کافی ذہین آدمی لگتے ہو" سلطان گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "ہم اس کو وکیلوں کی زبان میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ دس لاکھ یا دس لاکھ سے زیادہ کی صورت میں تمہارا حصہ دس لاکھ سے زائد رقم ہو گا' جس کی کم از کم مالیت دو لاکھ روپے ہو گی' اب ٹھیک ہے؟"

"ہاں' تقریباً ٹھیک ہی ہے" اکمل نے کہا۔

"کیا بات ہے' کرائے ماسٹر؟ تم مطمئن نظر نہیں آتے۔"

"یہ حساب کتاب بھی بڑی عجیب چیز ہے" اکمل نے کہا "مثلاً اگر ایک آدمی کو سو روپے پر پچیس فیصد منافع ہو' اور وہ کل رقم پر پچیس فیصد ٹیکس ادا کرے تو بہ ظاہر حساب برابر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے سوا چھ روپے اصل زر میں سے دینے پڑیں گے۔"

"ہمیں گنجلک مسئلوں میں نہیں الجھاؤ' سیدھی بات کرو۔"

"سیدھی بات یہ ہے کہ اگر کل رقم دس لاکھ روپے ہوئی تو آپ کو آٹھ لاکھ روپے ملیں گے۔ اور اگر کل رقم پونے دس لاکھ روپے ہوئی تو آپ کو آٹھ لاکھ ستر ہزار پانچ سو روپے اور ہمیں ستانوے ہزار پانچ سو روپے ملیں گے۔"

"تو پھر دعا کرو کہ رقم دس لاکھ سے بہت زیادہ ہو۔"

"خیر چھوڑیں' جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔"

فرخ یہ باتیں سن کر پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا "یہ رقم آئے گی کہاں سے؟"

"بینک سے' اور کہاں سے۔"

"کیا ہم بینک لوٹنے کی بات کر رہے ہیں؟"

"بہت آسان کام ہے" سلطان نے کہا "اور تمہیں ہم نے سب سے آسان کام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم باہر گاڑی میں بیٹھے رہو گے۔ اصل کام ہم کریں گے' پندرہ منٹ میں سارا کام ہو جائے گا۔"

اکمل' فرخ کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "پیارے' تمہیں تو مفت میں حصہ مل جائے گا۔ ہاتھ ہلائے بغیر۔"

یہ سن کر فرخ نے انکار کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے حصے میں جو کام آیا تھا وہ واقعی بہت آسان تھا۔ ایک طرف ضرورت تھی اور دوسری طرف ان لوگوں کی پُراعتماد گفتگو تھی۔ وہ یوں باتیں کر رہے تھے جیسے بینک لوٹنے نہیں چیک کیش کروانے جا رہے تھے۔

"کل ہم مختلف بینکوں کا سروے کریں گے اور اپنی پسندیدہ برانچ کا انتخاب کریں گے۔" سلطان نے کہا "اور پرسوں ریہرسل کریں گے۔"

"بینک لوٹنے کی ریہرسل!" فرخ نے گھبرا کر پوچھا۔

"فرار کی ریہرسل۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ بینک لوٹ کر ہم کن کن راستوں سے واپس آئیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ بینک سے نکلتے ہی کسی ٹریفک جام میں پھنس جائیں یا اسپیڈ بریکروں پر اچھلتے رہیں۔"

"ویسے پیچھا کوئی نہیں کرتا۔" مرتضیٰ نے کہا "سب کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ یاد ہے' ایک دفعہ ہم بینک لوٹ کر فرار ہو گئے تھے۔ کسی نے ہمارا راستہ نہیں روکا۔ اللہ کا شکر ہے' عوام آج کل بہت تعاون کرتے ہیں۔ اگر گاڑی بند ہو جائے تو بڑے پیار سے اپنی گاڑی پیش کر دیتے ہیں۔" اس نے رائفل پر ہاتھ پھیرا۔ "اس چیز کے سامنے کوئی شخص چوں چرا نہیں کرتا۔"

فرخ نے کہا "رقم دس لاکھ سے دگنی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایسی صورت میں تم ہمیں دو تین لاکھ پر ٹرخا دو۔"

"برادر' جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔" سلطان نے کہا "ہمیں صرف دس لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ ہمارا اصل کام کچھ اور ہے۔"

ان کی باتوں سے فرخ کو دولت بہت قریب محسوس ہو رہی تھی۔ بس ہاتھ بڑھا کر اٹھانے کی دیر تھی۔

○—□—○
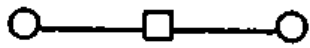
اگلے روز چاروں نے پانچ گھنٹے تک مختلف بینکوں کا سروے کیا اور ایک ایسی برانچ کا انتخاب کر لیا' جو ایک کاروباری مگر کم ہجوم والے علاقے میں واقع تھی۔

تیسرے روز انہوں نے دو گھنٹے تک فرار کی ریہرسل کی اور ایک موزوں روٹ فرار کے لئے منتخب کر لیا۔

چوتھے روز چاروں ٹھیک پونے ایک بجے ایک چوری کی کار میں بینک کے سامنے پہنچے اور منصوبے کے مطابق کام شروع کر دیا۔ گزشتہ روز انہوں نے بینک کے باہر ایک سپاہی کو دیکھا تھا' مگر آج وہاں سپاہی موجود نہیں تھا۔ البتہ وہ کرسی موجود تھی' جہاں انہوں نے سپاہی کو دیکھا تھا۔

مرتضیٰ نے اکمل سے کہا "تم دروازے کے اندرونی جانب کھڑے ہو جانا اور باہر بھی نظر رکھنا۔ اگر سپاہی واپس آئے تو اس سے گن چھین کر اسے اندر لے آنا۔"

بینک کے اندر اس وقت صرف دو گاہک تھے۔ بینک اسٹاف گن مین سمیت سات افراد پر مشتمل تھا۔ گن مین کاؤنٹر کی دوسری جانب منیجر کے کیوبیکل کے قریب کھڑا تھا۔

پروگرام کے مطابق سب سے پہلے مرتضیٰ اندر داخل ہوا اور

پُراعتماد انداز میں منیجر کے کیوبیکل کی طرف بڑھا۔ اس کے بعد سلطان اندر داخل ہوا اور کاؤنٹر پر جاکر ایک ڈرافٹ فارم طلب کیا۔ تیسرے نمبر پر کرانے ماسٹر اندر داخل ہوا اور شیشے کے دروازے کے پاس رک گیا۔ دراصل سپاہی پر قابو پانے کا کام اسی کے سپرد کیا گیا تھا مگر سپاہی وہاں موجود ہی نہیں تھا۔

مرتضیٰ منیجر کے کیوبیکل کے قریب پہنچ کر تیزی سے گن مین کے عقب میں پہنچا' واسکٹ کی اندرونی جیب سے ریوالور نکالا اور گن مین کے سر پر زور سے وار کیا۔ دوسرے ہی لمحے گن مین کی رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔

اس کے ساتھ ہی سلطان نے کپڑے کے تھیلے سے جی تھری رائفل نکال لی اور چیخ کر بولا "کوئی شخص اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ جس نے حرکت کی وہ اپنی جان کا خود ذمے دار ہوگا۔"

اکمل نے دروازے کی چٹخنی لگادی اور ایک جست میں کاؤنٹر کی دوسری جانب پہنچ گیا۔

"سب لوگ ہاتھ سروں پر رکھ کر کھڑے ہو جاؤ اور منیجر کے کمرے میں چلو۔" اس نے کہا "اور ذرا جلدی۔۔۔"

چند لمحوں کے اندر دو گاہکوں سمیت بینک کا پورا اسٹاف منیجر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مرتضیٰ نے ان کو دیوار کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا اور بے ہوش گن مین کو بھی گھسیٹ کر اندر کردیا۔

اس اثنا میں اکمل اور سلطان نے درازوں میں بھرے ہوئے نوٹ تھیلے میں منتقل کردیے۔

سارا کام بڑی صفائی سے مکمل ہوگیا۔ اور تینوں بینک اسٹاف کو ڈرانے دھمکانے کے بعد دروازے کی طرف بڑھے۔ لیکن ان سے ایک غلطی ہوچکی تھی۔ انہوں نے باہر ڈیوٹی دینے والے سپاہی کو نظر انداز کردیا تھا۔

سپاہی ان کی آمد سے صرف دو منٹ پہلے ہی میڈیکل اسٹور پر اخبار واپس کرنے گیا تھا' یہ اخبار اس نے ایک گھنٹا پہلے پڑھنے کے لئے لیا تھا۔ اخبار واپس کرنے کے بعد وہ سیلزمین سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

پانچ چھ منٹ کے بعد ایک اُدھیڑ عمر شخص میڈیکل اسٹور میں داخل ہوا اور پوچھا "تم بینک پر ڈیوٹی دے رہے ہو؟"

"ہاں' کیا بات ہے؟" سپاہی نے رعب سے پوچھا۔

"تو پھر سمجھ لو کہ تمہاری پیٹی بھی گئی اور نوکری بھی۔" اُدھیڑ عمر شخص نے حکمانہ لہجے میں کہا "بینک کے اندر کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے اور میں تمہارے ایس پی کو فون کرنے جارہا ہوں۔"

"او بھائی صاحب' کیا گڑبڑ ہے؟"

"اس وقت ایک بجنے میں ابھی آٹھ منٹ باقی ہیں اور بینک کا دروازہ بند ہوچکا ہے۔ اندر سے مشکوک قسم کی آوازیں بھی آرہی ہیں۔"

"بینک والوں کی گھڑی تیز ہوگی۔" سپاہی نے کہا اور اپنی رائفل بغل میں دبا کر بینک کی طرف بڑھا۔

تب ہی اس نے دو مشکوک آدمیوں کو بینک سے نکلتے دیکھا۔ ایک کے ہاتھ میں بڑا سا تھیلا بھی تھا۔ وہ اکمل اور سلطان تھے۔

سپاہی نے انہیں للکارا اور رکنے کا حکم دیا۔

سلطان نے تھیلا اکمل کو تھمایا اور رائفل نکال کر سپاہی کی طرف فائر کیا لیکن سپاہی لوہے کی چمک دیکھتے ہی کاروں کی اوٹ میں چلا گیا اور جوابی فائر کیا۔

اس کے ساتھ ہی آس پاس بھگدڑ مچ گئی۔

اکمل اور سلطان فائرنگ کرتے ہوئے کار میں جا بیٹھے۔

یہ صورتِ حال دیکھتے ہی مرتضیٰ ایک سوزوکی ہائی روف کی اوٹ میں ہوگیا اور سپاہی کا نشانہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے اپنا ریوالور اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ آس پاس سے نظر نہیں آتا تھا۔

ادھر فرخ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سلطان سے مرتضیٰ کے بارے میں پوچھا۔

"نکل چلو۔" سلطان نے کہا "مرتضیٰ کی فکر نہیں کرو۔"

ساتھ ہی اس نے سپاہی کی سمت میں مزید فائر کئے تاکہ وہ سامنے آکر ان پر فائر نہ کرسکے۔ لیکن سپاہی کو اپنی نوکری کی فکر پڑی ہوئی تھی اس نے پوزیشن لیتی ہوئی گاڑی کے ٹائروں پر فائر کیا۔ اس کا نشانہ کارگر ثابت ہوا اور گاڑی کا پیچھے والا دایاں ٹائر برسٹ ہوگیا۔ گاڑی لہراتی ہوئی ایک ہنڈا کار سے ٹکرا گئی۔

"نکلو۔" سلطان چیخا اور دروازہ کھول کر سپاہی کی طرف فائر کیا۔

ہنڈا کے ڈرائیور نے انجن بند کردیا اور فائرنگ سے بچنے کے لئے سیٹ پر لیٹ گیا۔

سلطان نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر باہر کھینچا اور تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اکمل نے رقم کا تھیلا اگلی سیٹ پر پھینکا اور دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ مگر دروازہ لاک تھا۔ اس نے لاک کھولنے کے لئے اندر ہاتھ ڈالا۔ عین اس وقت ایک گولی آکر اس کی کمر پر لگی اور پسلیاں چیرتی ہوئی آرپار ہوگئی۔

یہ دیکھ کر سپاہی کا حوصلہ بڑھا اور وہ سلطان پر فائر کرنے کے لئے گاڑی کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگیا۔

مرتضیٰ اسی موقعے کے انتظار میں تھا۔ اس کے ریوالور نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اگلے اور سپاہی سڑک پر ڈھیر ہوگیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کی وردی خون سے سرخ ہونے لگی۔

سلطان نے مرتضیٰ کو فائر کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جلدی سے کار اس کے قریب لے گیا۔ مرتضیٰ دروازہ کھول کر جلدی سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور فرخ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"میرا خیال ہے اسے بھی گولی لگ چکی ہے۔" سلطان نے کار

آگے بڑھاتے ہوئے کہا "میں نے اس کے چہرے پر خون دیکھا تھا۔"

لیکن حقیقت یہ تھی کہ فرخ کو گولی نہیں لگی تھی' اس کا سر اسٹیئرنگ وھیل سے ٹکرا کر زخمی ہوا تھا۔ اور وہ وقتی طور پر بے ہوش ہو گیا تھا۔

مرتضیٰ اور سلطان ہنڈا کار میں فرار ہو گئے۔

چند لمحوں کے بعد فرخ کو ہوش آیا تو یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ کار کو مشتعل ہجوم نے گھیر رکھا ہے۔ وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔

بعد میں اس پر مقدمہ چلا اور اسے سات سال کی سزا ہو گئی۔ اسے پولیس کی زبانی یہ معلوم ہوا تھا کہ بینک سے لوٹی ہوئی رقم کی مالیت سترہ لاکھ سے زیادہ تھی۔

O———□———O

انہی خیالات میں الجھا ہوا وہ چورنگی میں جا بیٹھا اور جیل کی بلند دیوار کو گھورنے لگا۔ یہ وہ دیوار تھی جس نے اس کی زندگی کے چھ سال اور تین مہینے نگل لئے تھے۔ اسے سزا سات سال کی ہوئی تھی لیکن اچھے چال چلن کی وجہ سے کچھ تخفیف ہو گئی تھی۔

چند لمحوں کے بعد امیر علی کھانا لے کر چورنگی میں پہنچ گیا۔ اور فرخ کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے دوست تم تو اس طرح جیل کی دیواروں کو گھور رہے ہو جس طرح کوئی ناکام عاشق اپنی محبوبہ کے گھر کی دیواروں کو گھورتا ہے۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ کتنے ہی شریف لوگ ان دیواروں کے اندر برباد ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کے بہترین سال انسانوں کے اس کثرا خیمہ میں غرق ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے ساتھ بدبو اور سڑاند لئے ہوئے باہر آتے ہیں۔"

"قانون اندھا ہوتا ہے بابا۔" میمو نے کہا "اور ہم کون سے شریف آدمی ہیں۔ ان باتوں کو چھوڑو اور لو' کھانا کھاؤ۔ بھنا گوشت اور چکن مسالہ لے کر آیا ہوں۔"

کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو سے فرخ کی بھوک چمک اٹھی اور وہ میمو کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ ایک عرصے تک جیل کے بدمزہ کھانے' کھانے کی وجہ سے اسے وہ معمولی ہوٹل کا کھانا بھی اچھا لگ رہا تھا۔

کچھ دیر دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ چورنگی کے اردگرد سڑکوں پر گاڑیوں کا ایک دریا رواں دواں تھا۔ فرخ ان گاڑیوں کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ ہر شخص کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ جیل کی بور اور ٹھہری ہوئی زندگی سے باہر آنے کے بعد اسے وہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ جیسے قیامت آگئی تھی اور وہ لوگ کسی جائے پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چھ سال پہلے جب وہ جیل میں داخل ہوا تھا تو اس وقت سڑکوں پر اتنی گاڑیاں نہیں تھیں۔

"میمو' یہ جو چم چم کرتی کاریں اِدھر اُدھر دوڑ رہی ہیں' ان میں بیٹھے ہوئے لوگ جیل کی اس بلند دیوار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔" فرخ نے کہا "انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ ان دیواروں کے اندر ان جیسے کچھ لوگ جانوروں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ کوئی ڈنڈا بیڑی میں جکڑا ہوا ہے' کوئی آڑا بیڑی پہنے زمانۂ جاہلیت کی یاد تازہ کر رہا ہے' کوئی بند وارڈ میں اپنی قسمت کو رو رہا ہے' کوئی چھوٹا وارڈ میں بند ہے اور کوئی جیلروں کے تشدد کی وجہ سے کسی کونے میں بیٹھا اپنی جوئیں گن رہا ہے۔ یہ کیسی زندگی ہے میمو؟ اس ظلم کا کب حساب لیا جائے گا؟"

"جب ہم جیسے چور' ڈاکو توبہ کر لیں گے۔" میمو نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے بولا "ان باتوں کو چھوڑو۔ کھانا کھاؤ۔"

"تمہیں وہ پھانسی گھاٹ والی لڑکی یاد ہے' جو حاملہ ہو گئی تھی۔ ذرا سوچو' ذلیل انسانوں نے سزائے موت پانے والی لڑکی پر بھی رحم نہیں کیا۔ بخدا' اگر حکومت میرے ہاتھ میں ہوتی تو میں جیل کے پورے عملے کو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیتا۔ لیکن دیکھ لو' کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔"

"کبھی تم نے کتوں اور گدھوں کو مردار کھاتے دیکھا ہے؟" میمو نے کہا "نہیں دیکھا ہو گا۔ کتا سارے مردار خود ہی کھا جانا چاہتا ہے' خواہ وہ مردار کی ران بھی پوری نہ کھا سکتا ہو۔ لیکن وہ گدھ کو اپنے پاس نہیں آنے دیتا۔ لیکن اگر گدھ تعداد میں زیادہ ہوں تو وہ کتے کو بھگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم نہ تو کتے کو برا کہہ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی گدھ کو۔ کیونکہ دونوں ہی مردار خور جانور ہیں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟"

"مطلب یہ ہے جب ظالم بھی مردار خور ہو اور مظلوم بھی مردار خور ہو تو کسی کو برا کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جس لڑکی کی تم بات کر رہے ہو اس نے شادی کی پہلی رات اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ برے کی ماں نے خصم کیا' برا کیا۔ اور کر کے چھوڑ دیا تو اور بھی برا کیا۔ چھوڑو ان باتوں کو' کھانا کھاؤ۔"

"یہ بھی عجیب سلسلہ ہے۔ اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"تم اپنا قصہ سناؤ۔" میمو نے کہا "تم آج تک اپنے آپ کو بے گناہ ہی کہتے ہو۔ اصل معاملہ کیا تھا۔ اگر تم ڈاکوؤں کے ساتھی نہیں تھے تو بینک کے سامنے چوری کی گاڑی میں کیا کر رہے تھے؟"

فرخ نے عدالت میں یہ بیان دیا تھا کہ دو صاحبِ حیثیت آدمی اسے ڈرائیور کے طور پر ساتھ لے کر گئے تھے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ دونوں بینک لوٹنا چاہتے تھے۔ نہ ہی یہ معلوم تھا کہ وہ گاڑی' جسے وہ ڈرائیو کر رہا تھا' چوری کی تھی۔ بعد میں قید کے دوران بھی وہ یہی کہتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے خود بھی اپنی اس بات پر یقین آنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ جھوٹ وہ ایک ڈر کی وجہ سے بولتا رہا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ اگر جیل حکام کو اصل بات معلوم ہو گئی تو وہ اسے دوبارہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کریں گے۔ لیکن آج اس بات کا ڈر نہیں تھا۔

"بات یہ تھی کہ میں لالچ میں آ گیا تھا۔" اس نے تامل کرتے ہوئے کہا اور مختصراً ساری بات میو کو بتادی۔

"کمال ہے' تم تو چھپے رستم نکلے۔" میو نے کہا "تم نے پولیس کو مرتضیٰ اور سلطان کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟"

"دونوں میری گرفتاری کے دو گھنٹے بعد تھانے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے پولیس کو رشوت دے کر ایف آئی آر میں اپنا نام درج نہیں ہونے دیا۔ سلطان نے مجھے تھانیدار کے کمرے میں بلا کر کہا۔ "فرخ' ہم نے شاہ صاحب کو خرچہ پانی دے دیا ہے۔ تم ان کی مرضی کے مطابق بیان دینا۔ یہاں تمہیں کوئی انگلی بھی نہیں لگائے گا۔ ہم تمہارے لئے بہترین وکیل کا انتظام کر رہے ہیں۔ گھبرانا نہیں۔ بعد میں' میں نے عدالت میں بھی یہی بیان دیا۔ میں نے سلطان کی ہدایت کے مطابق' ان دونوں کے نام غلط بتائے تھے۔ پولیس ان کی تلاش میں جعلی چھاپے مارتی رہی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی عادی مجرموں کو گرفتار بھی کیا تھا۔ مگر اصل مجرموں کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔"

ساری بات سن کر میو کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اس نے پرجوش لہجے میں کہا "ارے بابا' تم تو بڑی موٹی اسامی ہو۔ ان بدمعاشوں سے اپنا حصہ وصول نہیں کرو گے؟"

"کون سا حصہ؟"

"ان لوگوں نے سترہ لاکھ سے اوپر کی رقم لوٹی تھی۔ اور کیا انہوں نے تمہیں یہی نہیں کہا تھا کہ دس لاکھ سے زائد رقم تمہاری اور کرانے ماسٹر کی ہو گی؟"

"کہا تو تھا...... مگر یہ تو پرانی بات ہو چکی ہے اور کرانے ماسٹر بے چارہ مر چکا ہے۔"

اس لحاظ سے تم پورے سات لاکھ کے حقدار ہو۔"

"انہوں نے میرے لئے وکیل بھی کیا تھا۔"

"ایک لاکھ روپے وکیل کے نکال لو۔ پھر بھی تم چھ لاکھ کے حقدار ہو' چھ سال کی قید کے چھ لاکھ روپے۔"

فرخ نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا "میرے والدین اور رشتے دار میری اس حرکت کی وجہ سے مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ چھ سالوں کے دوران ان میں سے کوئی بھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ میں ان سے معافی تلافی کے بعد عزت کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"ایک کام کی بات بتاتا ہوں۔ برا مت ماننا۔ اگر تمہاری جیب میں دو چار لاکھ روپے ہوں گے تو معافی جلدی مل جائے گی۔ خالی ہاتھ جاؤ گے تو صرف دھکے ملیں گے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میرے گھر والے ایماندار لوگ ہیں۔ وہ حرام مال کو ہاتھ لگانا پسند نہیں کریں گے۔"

"گھر جاؤ گے تو اس بات کا بھی پتا چل جائے گا۔ خیر' میں تمہیں اپنا ٹھکانا دکھا دیتا ہوں' اگر میری ضرورت محسوس کرو تو ادھر آ جانا۔ سلطان سے پیسہ نکلوانے میں' میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ اور حصہ ایک تین کے حساب سے ہو گا۔ یعنی جو مال نکلے گا اس میں سے تین حصے تمہارے اور ایک حصہ میرا ہو گا۔"

فرخ نے فقط سر ہلا دیا۔ اچانک اسے اپنی منگیتر عمرانہ یاد آنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ عمرانہ اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ ایک بار عمرانہ نے اس سے کہا تھا۔ فرخ' میری محبت سورج مکھی کے پھول کی طرح ہے' جس کا کھو سدا سورج کی طرف رہتا ہے۔ اور جب سورج غروب ہو جاتا ہے تو وہ ساری رات اس کے انتظار میں گزار دیتا ہے۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ میں ساری زندگی تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔

کھانے کے بعد میو' فرخ کو اپنے ساتھ گھر لے گیا جو جونا مارکیٹ کی ایک تنگ و تاریک گلی میں تھا۔ گھر کیا' ایک چھوٹی سی کھولی تھی' جہاں ایک مدقوق سی عورت تین دبلے پتلے بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔

"ہائے' میرے نصیب!" عورت نے میو کو دیکھ کر ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "آ گئے اپنی منحوس صورت لے کر! اتنی جلدی کیسے چھوٹ گئے؟"

"فرخ' یہ میری بیوی جیناں ہے۔" میو نے تعارف کرایا۔ "زبان کی ذرا تیز ہے' پر دل کی بری نہیں ہے۔ جیناں' یہ میرا دوست فرخ ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے۔ کوئی چائے وائے مل جائے گی؟"

بچوں کی عمریں سات سے دس سال کے درمیان تھیں۔ دو لڑکیاں تھیں' ایک لڑکا۔ وہ یوں خالی خالی نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی اجنبی ہو۔

"تم لوگ کیسے ہو؟ گڈو' شمو' نمو......" میو نے تینوں کے کندھے تھپتھپائے۔ "مجھے پتا ہے' ماں تمہاری خوب دھنائی کرتی ہو گی۔ جبھی سوکھی لکڑیوں کی طرح لگ رہے ہو۔"

"ہٹ پیچھے' بچوں کو ہاتھ مت لگانا۔" جیناں نے کہا "یہ میرے بچے ہیں۔ میں نے ان کو پالا ہے۔"

"اب تو کوئی فکر نہ کر۔" میو نے کہا "اب ایک ہی دفعہ بڑا ہاتھ ماروں گا۔ پھر وارے نیارے ہو جائیں گے۔ سوسائٹی میں بنگلا لے دوں گا تجھے۔"

او نہہ...... بنگلا لے دوں گا! بڑا آیا رئیس جادہ! تیرے سر پر کوئی انعام بھی نہیں ہے۔ ورنہ میں خود تجھ کو پولیس کے حوالے کر دیتی۔ چار پیسے ہی ہاتھ آ جاتے۔ تین سال کے بعد آیا ہاتھ لٹکاتا ہوا۔ کیا لایا ہے' ان بچوں کے لئے؟"

"دو چار دن آرام کر لینے دے' پھر دھندے پر نکلوں گا۔ چائے

تو پیدا ہو رہا ہے۔ میرا یار بڑی دور سے آیا ہے۔"

"یا اللہ! اس منحوس کے نام کی کوئی کلی بھی نہیں ہے۔" جیناں نے چھت کی طرف دیکھا۔ "دیکھ لینا' کسی دن تیرے سر پہ چھت گر پڑے گی اور ادھر مار بنے گا تیرا۔"

"چھت گرے گی تو تو بھی مرے گی۔"

"ارے' میرے کو کیا مارتا ہے۔ میں تو روز ہی مرتی ہوں۔" جیناں نے فرخ کی طرف دیکھا۔ "بابو' یہ حرامی' بچے پیدا کر کے ایک طرف ہو گیا ہے۔ میں صبح سے شام تک محنت مزدوری کر کے بچے پالتی ہوں۔ ارے' جندگی کے سارے لفڑے میرے سر پہ ہیں۔ اب یہ بھی میری کمائی کھائے گا۔ مفت کی روٹیاں کھا کر اوپر نیچے سے ڈکار مارے گا اور لمبا پڑ کر سو جائے گا۔ حرام کی کمائی ہاتھ میں آئے گی تو جوئے اور نشے میں اڑا دے گا۔"

"میرو میں تو تجھے ایسا نہیں سمجھتا تھا۔" فرخ نے کہا "تمہیں اپنے بیوی' بچوں کا خیال رکھنا چاہئے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میرو نے کہا "آج ہی تو جیل سے چھوٹا ہوں۔ دو چار روز آرام کے بعد کام پر نکلوں گا۔ مولا کے کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے جیب سے چند نوٹ نکال کر بیوی کو دیے۔ بولا "لے' رکھ لے۔ یہ محنت کی کمائی ہے۔ جیل میں کام کرتا رہا ہوں۔ یہ اس کام کی مزدوری ہے۔"

جیناں نے اس کے ہاتھ سے پیسے جھپٹ لئے اور بڑبڑاتے ہوئے چائے بنانے لگی۔

O———□———O

دن کے تین بجے فرخ نے اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے دل میں امید و بیم کی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ پتا نہیں گھر والے اسے دیکھ کر خوش ہوں گے یا ناراض! اسے قبول کر لیں گے یا دھتکار دیں گے!

دروازہ ایک بوڑھی عورت نے کھولا۔ اس کا چہرہ فرخ کو کچھ جانا پہچانا سا لگا' لیکن وہ ان کے گھر کی فرد نہیں تھی۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہو کر مکان کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ "شیخ ظفر احمد یہیں پر رہتے ہیں؟"

"نہیں' وہ یہاں نہیں رہتے۔" عورت نے تیوری چڑھائی۔ "ہم نے ان سے مکان خالی کروا لیا تھا۔"

یہ سن کر فرخ کو اندازہ ہوا کہ وہ عورت غالباً مالک مکان کی بیوی تھی۔ اس نے پوچھا "وہ لوگ آج کل کہاں رہتے ہیں؟"

"ہم کیا جانیں' کہاں رہتے ہیں۔" عورت نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "بھلا ڈاکوؤں کا بھی کوئی ٹھکانا ہوتا ہے!"

فرخ کا چہرہ غصے اور ندامت سے سرخ ہو گیا۔ وہ چند لمحوں تک بند دروازے کو گھورتا رہا' پھر پڑوسیوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بارے میں سوچنے لگا' لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی۔ بلکہ اچانک اس کے دل میں منہ چھپانے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔ کیونکہ اس محلے میں وہ ڈاکو مشہور تھا۔ اور لوگوں نے غائبانہ طور پر اس سے نفرت کرنا شروع کر دی تھی۔ اس نے پشت پر ہاتھ باندھ لئے اور آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھا۔ تب ہی پڑوس کی ایک عورت شاپنگ بیگ ہاتھ میں لئے ہوئے گلی میں داخل ہوئی۔

فرخ ڈرتا ڈرتا اس کے قریب گیا اور سلام کرنے کے بعد اپنے گھر والوں کے بارے میں پوچھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی عورت نے زور سے سانس کھینچا اور ایک طرف ہوتی ہوئی جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

فرخ نے گہرا سانس لیا اور آگے بڑھ گیا۔ جب وہ گلی کے کونے پر پہنچا تو کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اور کہا "کب چھوٹے' فرخ بھائی؟"

فرخ نے گھوم کر متکلم کی طرف دیکھا۔ وہ ان کے محلے کا ایک بدنام نوجوان تھا۔ اس کا نام شہباز تھا۔ لڑکیوں کو چھیڑنا اور شریف لوگوں سے ادھار لے کر بھول جانا اس کی عادت تھی۔ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ اور اس کی شکل و صورت بھی اوباشوں جیسی تھی۔ بکھرے ہوئے بال' کھلا ہوا گریبان' گلے میں اسٹیل کی زنجیر اور ہاتھ میں سگریٹ۔ فرخ نے کبھی اس کو منہ لگانا پسند نہیں کیا تھا۔

"کیا حال ہے شہباز؟" فرخ نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ابے یار' تم تو اپنے بھی گرو نکلے۔" شہباز نے اس کے کندھے پر ایک ہاتھ مارا۔ "کتنا مال حصے میں آیا؟"

"میں اس معاملے میں شامل نہیں تھا۔" فرخ نے نظریں چراتے ہوئے کہا "میں صرف ڈرائیور کی حیثیت سے ان کے ساتھ گیا تھا۔"

"ابے گولی کسی اور کو دیجیو۔ میں نے اخبار میں ساری خبر پڑھی تھی۔ تم لوگ چوری کی کار میں بینک لوٹنے گئے تھے۔ سنا' کتنا حصہ ملا؟"

"کون سا حصہ؟"

"تم لوگوں نے سترہ لاکھ روپے لوٹے تھے۔ چار پانچ لاکھ تو تمہیں بھی ضرور ملے ہوں گے۔"

"مجھے کچھ نہیں ملا۔" فرخ نے دو ٹوک جواب دیا۔ "تمہیں میرے گھر والوں کے بارے میں کچھ پتا ہے؟"

"وہ آج کل دو نمبر کولیمار میں رہتے ہیں۔ مالک مکان نے انہیں ذلیل کر کے گھر سے نکالا تھا۔ چار کرائے کے غنڈوں کے ذریعے سارا سامان گلی میں پھکوا دیا۔"

فرخ کو یہ سن کر دکھ ہوا۔ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس نے کہا "میرے ماں باپ کا کوئی قصور نہیں تھا' محلے والوں نے ان کو روکا نہیں؟"

"بات یہ ہے فرخ بھائی' محلے والے ہمیشہ مالک مکان کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیوں کہ اس نے ہمیشہ وہاں رہنا ہوتا ہے۔ کرائے دار کا کیا ہے۔ آج ہے' کل نہیں ہے۔ لیکن میں نے تمہارے باپ کا ساتھ دیا تھا۔ مالک مکان کو خوب سنائی تھیں۔ یقین نہ آئے تو محلے والوں سے پوچھ لو۔ میں اتنا برا نہیں ہوں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔"

فرخ کو وہ اوباش نوجوان اچانک اچھا لگنے لگا۔ اس نے اُس سے اپنے گھر کا پتا پوچھ کر ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا اور شکریہ ادا کر کے جانے لگا۔

شہباز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور رازدارانہ لہجے میں بولا "یار' دوبارہ کوئی پروگرام بنے تو مجھے بھی شامل کر لینا۔ یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں۔ بس ایک چیز کی کمی ہے۔"

"کون سا کام؟" فرخ نے پوچھا "کس چیز کی کمی؟"

"یہی..... بینک لوٹنے والا کام" شہباز نے اس کے کان میں کہا "کہیں سے ایک ریوالور یا کلاشن کوف مل جائے تو بینک لوٹنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

"میری یہ لائن نہیں ہے۔"

"نہیں ہے تو بناؤ' ایک دو ساتھی اور بھی ہیں اپنے۔ آج کل یہی لائن کامیاب جا رہی ہے۔ اپن کو ایک دو لاکھ روپیہ مل جائے تو اپنے لئے بہت ہے۔ اس کے بعد تکے کباب کا دھندا شروع کروں گا۔"

فرخ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

O———□———O

گولیمار میں مکان تلاش کرنے میں فرخ کو زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ دستک کے جواب میں ایک ویران چہرے والی عورت نے دروازہ کھولا۔ اس نے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔

فرخ نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو اس پر حیرت ٹوٹ پڑی۔ وہ اُس کی بہن عذرا تھی۔ اس پر وقت سے بہت پہلے بڑھاپے نے حملہ کر دیا تھا۔

"عذرا..... میں فرخ ہوں۔"

عذرا نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور دروازہ بند کر کے واپس چلی گئی۔ تاہم اس نے چٹخنی نہیں لگائی تھی۔ فرخ دروازہ کھول کر مجرموں کی طرح اندر داخل ہوا اور دروازے کے قریب ہی رک گیا۔

وہ چھوٹا سا کمرا آدھا بیڈ روم اور آدھا ڈرائنگ روم تھا۔ وہاں اس کی ماں آمنہ بیگم اور چھوٹی بہن فوزیہ بھی موجود تھی۔ ان کے چہروں پر فرخ کو نفرت کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے دیکھا کہ ماں کے چہرے پر مکڑی کے جال کی طرح جھریاں ابھر آئی تھیں اور فوزیہ بھی اپنی عمر سے بڑی لگ رہی تھی۔

"اس سے کہو' یہاں سے نکل جائے۔" ماں نے بیٹیوں سے مخاطب ہو کر کہا "میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

فرخ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "امی' مجھے معاف کر دو۔ میں....."

آمنہ بیگم نے بیٹیوں کو ساتھ لیا اور کمرے سے نکل گئی۔ فرخ وہیں دروازے کے پاس بیٹھ کر رونے لگا۔

اگر ماں اسے خوب ڈانٹتی تو اسے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا اس ایک جملے سے ہوا تھا۔ لیکن آج ماں نے اسے ڈانٹ کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ اسے براہ راست مخاطب بھی نہیں کیا تھا۔

تقریباً پونے گھنٹے تک کمرے میں کوئی نہیں آیا۔ فرخ نے اندازہ لگایا کہ مکان میں تین کمرے تھے۔ جس کمرے میں وہ بیٹھا تھا اس کو باہر سے کنڈی لگا دی گئی تھی۔ دوسری طرف سے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد فرخ نے اپنے باپ کی آواز سنی۔ واضح طور پر وہ عقبی دروازے سے گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں آمنہ بیگم سے بات کر رہا تھا۔ فرخ کان لگا کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے ماں کو کہتے سنا۔

"میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ نہ ہی پیسوں کے بارے میں پوچھا ہے۔ اس گھر میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"اس کے ساتھی آج تک نہیں پکڑے گئے۔ نہ ہی رقم برآمد ہوئی تھی..... ہو سکتا ہے کہ.." باپ کہہ رہا تھا۔

"ہمیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہئے۔"

ظفر احمد نے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ فرخ پوری بات نہ سن سکا۔ لیکن مفہوم یہ سمجھ میں آیا کہ اس کا باپ اپنی تکلیفوں کے ازالے یا معاوضے کی بات کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ شاید امیر علی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

لمحہ بھر کے بعد دروازہ کھلا اور شیخ ظفر احمد کمرے میں داخل ہوا۔ فرخ نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

"کیا منہ لے کر یہاں آئے ہو؟" ظفر احمد نے اس کے سلام کا جواب دیے بغیر کہا۔ "لوٹ کے مال میں سے کتنی دولت تمہارے حصے میں آئی ہے؟"

"نہیں..... لوٹ میں شامل نہیں تھا میں....."

"بکواس کرتے ہو تم" ظفر احمد نے گرج کر کہا "اگر تم لوٹ میں شامل نہیں تھے تو بینک کے سامنے کیا کر رہے تھے؟ وہ ڈاکو تمہاری گاڑی میں کیوں سوار ہوئے تھے؟ عدالت نے تمہیں سزا کیوں دی؟"

"میں..... میں ڈرائیور کے طور پر ان کی گاڑی چلا رہا تھا۔ مجھ سے جو غلطی ہوئی اس کی مجھے بہت سزا مل چکی ہے۔ آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔"

"معاف کر دیں! واہ خوب! تم نے ہمارے منہ پر جو کالک مل

ہے' وہ کیسے صاف ہوگی؟ ذرا اپنی بہنوں کو دیکھو' کیا حال ہو گیا ہے ان کا۔ کوئی شخص ایک ڈاکو کی بہنوں کے رشتے لینے پر تیار نہیں ہے۔ اور ہمارے پاس اتنی دولت بھی نہیں ہے' جس کے سہارے ہم بدنامی کا یہ داغ چھپالیں۔"

اشارہ بہت واضح تھا۔ فرخ سمجھ گیا کہ اس کا باپ لوٹ کے مال کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ وہ صاف کہہ رہا ہے کہ دولت سے بدنامی کا داغ چھپایا جا سکتا ہے۔

"ابا' آپ اسی سے اندازہ لگا لیں کہ میں ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں تھا۔ اگر میں ڈاکوؤں کا ساتھی ہوتا تو گھر آنے سے پہلے اپنے حصے کی رقم لے کر آتا۔"

"نکل جاؤ......" باپ نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "نکل جاؤ' میرے گھر سے۔ اس گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"توبہ کرنے والے کو تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے......"

"میں کہتا ہوں' فوراً نکل جاؤ۔ اس گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے......"

فرخ نے سر اٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ پھر ماں اور بہنوں کی طرف دیکھا' جو پیچھے دروازے میں کھڑی تھیں۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ دو چار لاکھ روپے ساتھ لے کر جاتا تو یقیناً اس کے سارے جرم معاف ہو جاتے۔ دولت کئی عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کے ذہن میں کئی سوال پیدا ہو رہے تھے۔ کیا ماں باپ نے اسے خالی ہاتھ دیکھ کر گھر سے نکال دیا تھا؟ اگر ایسا تھا تو اخلاقی اصولوں کی کیا اہمیت تھی؟ یہ کیسی مجبوری تھی کہ لوٹ کی رقم جیب میں ہوتی تو معافی مل جاتی اور لوٹ کی رقم نہ ہونے کی وجہ سے اصول سامنے آ گئے؟

انہی خیالوں میں الجھا ہوا وہ مین روڈ پر پہنچا اور ایک طرف چلنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس کی نظر ایک عامل کامل کے بورڈ پر پڑی۔ سائن بورڈ کے مطابق وہ عامل کامل ماضی' حال اور مستقبل کا احوال بتانے کے علاوہ سچی خوشی حاصل کرنے کے گر بھی بتاتا تھا۔

فرخ پردہ ہٹا کر دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دکان کے دو حصے تھے۔ درمیان میں ہارڈ بورڈ کی فولڈنگ پارٹیشن رکھی تھی۔ دائیں طرف اسپرنگ والا نصف دروازہ تھا۔ بائیں طرف چھ انچ قطر کا ایک روزن بنا ہوا تھا۔ اس روزن میں سے ایک مخروطی داڑھی والا چہرہ نمودار ہوا۔

"تشریف رکھیں۔" اس چہرے نے فرخ سے کہا "میں ابھی آپ کو اندر بلاتا ہوں۔"

فرخ دروازے پر آویزاں ایک چارٹ کو گھورنے لگا' جس پر خوفناک قسم کے جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

"شوہر سے ناچاقی کچھ دن اور چلے گی......" فرخ کے کانوں میں عامل کامل کی آواز آئی "ن سے شروع ہونے والے نام کی ایک عورت تمہارے شوہر پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تمہارا شوہر وقتی طور پر اس کے دام میں بھی آجائے گا' مگر اس کا یہ فریب عارضی ثابت ہوگا۔ تمہارا شوہر دوبارہ تمہارے حسن کا گرویدہ ہو جائے گا......"

تھوڑی دیر کے بعد ایک نوجوان عورت ویٹنگ روم میں نمودار ہوئی اور فرخ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"تشریف لائیے۔" فرخ نے عامل کی آواز سنی اور اندر چلا گیا۔ اندر ایک چھوٹی سی میز تھی۔ جس کے سامنے بغیر بازوؤں والی ایک کرسی رکھی تھی۔ عامل سبز رنگ کے چغے میں ملبوس تھا اور سر پر بغیر پھندنے والی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس نے فرخ سے نام' تاریخ پیدائش' جائے پیدائش' تعلیم' ولدیت وغیرہ پوچھنے کے بعد کہا "میں صاحب حیثیت گاہکوں سے زیادہ فیس لیتا ہوں۔ لیکن تم چونکہ بے روزگار ہو' اس لئے تم سے صرف پچاس روپے لوں گا۔"

فرخ اس کی پہلی ہی بات پر چونک گیا۔ پوچھا "آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں بے روزگار ہوں؟"

"یہ میرے علم نے مجھے بتایا ہے۔" عامل نے کہا "میں انسان کے مستقبل اور ماضی میں جھانک سکتا ہوں۔"

فرخ کی جیب میں کچھ رقم موجود تھی۔ کچھ پیسے تو وہ تھے جو گرفتاری کے وقت اس کی جیب میں تھے اور کچھ جیل میں کام کرنے کا معاوضہ ملا تھا۔ اس نے پچاس روپے عامل کی میز پر رکھ دیے۔

عامل نے نوٹ میز کی دراز میں رکھنے کے بعد ایک بلوریں گولہ سامنے رکھ لیا اور اس میں جھانکتے ہوئے بولا "کچھ عرصہ پہلے حالات میں جو خرابی پیدا ہوئی تھی اس کے اثرات ابھی کچھ عرصہ اور چلیں گے۔ دوستوں اور رشتے داروں سے تکلیف پہنچے گی۔ پسندیدہ جگہ پر شادی نہیں ہو سکے گی۔ تنہائی کا احساس بڑھے گا۔ دوستوں پر اعتماد سودمند ثابت نہیں ہوگا۔ الجھنوں میں اضافہ ہوگا۔ یہاں تک کہ خودکشی کرنے کو جی چاہے گا۔ ناپسندیدہ عناصر سے لین دین تکلیف کا باعث ہوگا اور اچانک کسی بڑے صدمے کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"کمال ہے' آپ نے تو ایک بھی اچھی بات نہیں بتائی۔" فرخ نے کہا "میری قسمت میں دولت بھی ہے کہ نہیں؟"

عامل نے بلوریں گولے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میں وہی کچھ بتا رہا ہوں جو مجھے نظر آ رہا ہے۔ اگر تم شر سے بچنے اور خیر حاصل کرنے کے طریقے جاننا چاہتے ہو تو اس کی فیس الگ ہوگی۔ دولت کے بارے میں تم نے جو سوال کیا ہے' اس کا جواب بہت دلچسپ نظر آ رہا ہے۔ دولت مچھلی کی طرح تمہارے ہاتھوں سے پھسلتی نظر آ رہی ہے۔ جس طرح زندہ مچھلی ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتی ہے' اسی طرح دولت بھی تمہارے ہاتھوں میں پھسلے گی۔

کبھی وہ تمہارے قابو میں آجائے گی اور کبھی پھسل کر نکل جائے گی۔"

"اس کو ہمیشہ قابو میں رکھنے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

"گردن..." عامل بلوریں شیشے میں گھورتے ہوئے بولا۔

"نہیں... سر! سر یا گردن... تمہیں دولت کے منبع کو سر سے قابو کرنا ہوگا۔ مضبوطی کے ساتھ۔ مچھلی کو دُم والے حصے سے پکڑیں تو وہ پھسل جاتی ہے۔ سر سے پکڑیں تو وہ قابو میں آجاتی ہے۔ تمہیں بھی یہی کرنا پڑے گا۔ سخت رویّہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

فرخ کا دھیان مرتضیٰ اور سلطان کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ دونوں دُم سے قابو میں نہیں آئیں گے۔ ان کو گردن یا سر سے قابو کرنا پڑے گا۔

"دوستوں اور رشتے داروں سے کب تک تکلیف پہنچتی رہے گی؟" اس نے پوچھا۔

"تمہاری مفلسی ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔" عامل نے جواب دیا اور بلوریں گلوب ایک طرف کردیا۔ "مزید سوال جواب کے لئے دوبارہ فیس دینی پڑے گی۔"

فرخ اٹھا اور سلام کئے بغیر دکان سے نکل گیا۔ اسے یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ اس کے مسئلے کا حل کیا ہے۔ لیکن پہلے وہ خالہ سے ملنا چاہتا تھا۔ عامل کی اس بات نے اسے پریشان کردیا تھا کہ پسندیدہ جگہ پر شادی نہیں ہوسکے گی۔

پندرہ منٹ کے بعد وہ زینت خالہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ عمرانہ کے چھوٹے بھائی انور نے کھولا اور متذبذب نظروں سے فرخ کو گھورنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ راستہ دینے پر تیار نہیں تھا۔

"ابے! کیا ٹکر ٹکر منہ دیکھ رہے ہو۔" فرخ اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس نے عامل کے مشورے کے مطابق ہر جگہ سخت رویّہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اور یہ اس کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا کیونکہ اس نے پورے چھ سال چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے درمیان گزارے تھے۔ "میں تمہارا کزن فرخ ہوں۔ کیا نظر کمزور ہوگئی ہے تمہاری؟"

"وہ... فرخ بھائی! بات یہ ہے کہ... اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے۔ آپ پھر کسی وقت آجائیں۔"

"ابے! کیا بکی بکی باتیں کررہا ہے۔ تو میرے سامنے موجود ہے! اندر سے مشین چلنے کی آواز آرہی ہے۔"

"م... میرا مطلب ہے کہ امی۔"

فرخ اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا، جس میں سے سلائی مشین چلنے کی آواز آرہی تھی۔ کمرے میں عمرانہ کپڑے سینے میں مصروف تھی۔ اس کے آس پاس بھڑکدار ریشمی کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔

"آداب..." فرخ نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

عمرانہ نے سلائی سے ہاتھ روک کر فرخ کی طرف دیکھا تو بری طرح بوکھلا گئی۔ "آ... آداب۔" اس نے اٹک اٹک کر کہا "آپ... کب آئے فرخ بھائی؟"

"فرخ بھائی! کیا گھاس چر گئی ہو، منگیتر کو فرخ بھائی کہہ رہی ہو؟"

"ج... جی، وہ... آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں آپ کے لئے چائے... بنا کر لاتی ہوں۔"

"تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔ میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔"

"فرخ بھائی! آئیں ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔" انور بھی کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ "باجی! آج کل بہت پریشان ہیں۔"

"پریشان تو میں بھی بہت ہوں۔" فرخ نے عمرانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر دو قدم آگے بڑھا اور دھیمی آواز میں پوچھا۔ "تمہیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟"

"نک... کیوں نہیں، بہت خوشی ہوئی ہے۔" عمرانہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کیسے ہیں آپ؟"

"چھ سال تک لمحہ لمحہ تمہیں یاد کرتا رہا ہوں۔ لیکن آج یہ سورج مکھی کا پھول اتنا مرجھایا ہوا کیوں ہے؟"

"فرخ بھائی! آپ سمجھ دار آدمی ہیں، آپ کو خود ہی ساری بات کا اندازہ کرلینا چاہئے۔"

"کس بات کا اندازہ؟"

تب ہی کسی کے تیز تیز چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر زینت خالہ کمرے میں داخل ہوئی اور تیز لہجے میں بولی "فرخ! تمہیں اس طرح ہمارے گھر میں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"اس طرح کس طرح؟ پہلے تو آپ نے کبھی یہ بات نہیں کہی تھی۔"

"اب پہلے جیسے حالات نہیں رہے، انسان کو اپنی عزت کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں آپ کا بھانجا اور ہونے والا داماد ہوں۔"

"وہ پرانی بات ہوچکی ہے۔ اگلے مہینے عمرانہ کی شادی ہورہی ہے۔ تمہارا یہاں آنا جانا اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

فرخ کا دماغ الٹنے لگا۔ ماں باپ کے سامنے وہ کچھ نہیں بولا تھا مگر یہاں چپ رہنا مشکل ہورہا تھا۔

"خالہ! یہ تو پتا چلے کہ منگنی کب ٹوٹی اور کس وجہ سے ٹوٹی؟" اس نے کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ گھر بیٹھے ایک جگہ سے منگنی توڑ دی اور دوسری جگہ کردی۔"

خالہ غصے سے بولی "کیا ڈاکو سے اپنی بیٹی کی شادی کردوں؟"

"میں بے گناہ پکڑا گیا تھا۔" فرخ نے حسبِ معمول جھوٹ بولا۔ "جو دو آدمی مجھے ڈرائیور کی حیثیت سے ساتھ لے گئے تھے، وہ شکل سے ڈاکو نہیں لگتے تھے۔ اور مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ ڈکیتی کی نیت سے بینک کے اندر گئے تھے۔"

"تم ڈاکو کی حیثیت سے سزا بھگت کر آ رہے ہو۔ ہم لوگوں کی زبانیں نہیں پکڑ سکتے۔"

"آپ اپنی زبان تو پکڑ سکتی ہیں۔ اگر آپ لوگ میرے مقدمے میں دلچسپی لیتے تو میں یقیناً بری ہو جاتا۔ مگر آپ نے تو عدالت کے فیصلے سے پہلے ہی مجھے ڈاکو قرار دے دیا تھا۔ میں نہ پہلے ڈاکو تھا' نہ اب ڈاکو ہوں۔ لیکن اگر میرے ساتھ ڈاکوؤں جیسا سلوک کیا گیا تو میں ضرور ڈاکو بن جاؤں گا۔"

"تم جو چاہو بنو' ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

"خالہ' ایک بات اچھی طرح سن لو۔" فرخ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا "آپ شریف آدمی سے منگنی توڑ سکتی ہیں' ڈاکو سے نہیں توڑ سکتیں۔ اگر میں ڈاکو بن گیا تو پھر عمرانہ کی شادی میرے سوا کسی سے نہیں ہوگی۔"

زینت بیگم کے چہرے پر خوف نظر آنے لگا' نرم لہجے میں بولی۔ "شرافت کا دعویٰ بھی کرتے ہو اور ڈاکوؤں جیسی زبان بھی استعمال کرتے ہو!"

"میں تو ابھی تک شریف آدمی ہوں' مگر آپ مجھے شریف آدمی تسلیم نہیں کر رہی ہیں۔"

"تو میں نے تمہیں کب ڈاکو کہا ہے۔" زینت بیگم اور نرم پڑ گئی۔ "میں تو لوگوں کی بات کر رہی ہوں۔"

"آپ تو مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال رہی تھیں! کیا شریف آدمی کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟"

عمرانہ' جو دروازے کی اوٹ میں چلی گئی تھی' فرخ کی بات سن کر سخت گھبرا رہی تھی۔ اس نے ماں کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی "امی' اس کو کسی طریقے سے ٹالنے کی کوشش کریں۔ اگر یہ بگڑ گیا تو بہت خرابی ہو جائے گی۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ساجد کے گھر جا کر بات خراب کر دے۔"

ساجد' عمرانہ کا ہونے والا شوہر تھا۔ اس کے گھر والوں کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ عمرانہ کی فرخ سے منگنی ہو چکی تھی۔ زینت اس وجہ سے بھی مطمئن تھی کہ فرخ کو سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ جلدی بھی رہا ہو سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" اس نے عمرانہ سے کہا "تم چائے بنا کر نور کے ہاتھ بھیج دو۔ میں فرخ کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتی ہوں۔" وہ واپس کمرے میں گئی اور فرخ سے بولی "آؤ' ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ میں نے تمہارے لئے چائے بنوائی ہے۔"

خالہ کے بدلے ہوئے رویے سے فرخ نے یہ نتیجہ نکالا کہ شرافت کی زبان کوئی نہیں سمجھتا۔ یعنی پچھلی سرے ہی قابو میں آئی ہے۔

"خالہ' مجھے منگنی ٹوٹنے کا کوئی علم نہیں ہے۔" وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا "اگر آپ نے منگنی توڑنی ہی تھی تو مجھے اس بات کی اطلاع دینا آپ کا فرض تھا۔ اور چونکہ آپ نے اطلاع نہیں دی' اس لئے دوسری منگنی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"وہ بات یہ ہے کہ یہ فیصلہ میں نے تمہاری امی کے مشورے سے کیا تھا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ لڑکیاں زیادہ انتظار نہیں کر سکتیں۔ تمہارے پاس شادی کے لئے اخراجات بھی تو نہیں ہیں۔ نہ ہی تمہارے پاس کوئی ملازمت ہے۔"

"آپ کو کس نے بتایا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں جیل میں چھ سال تک کام کرتا رہا ہوں۔ چھ سال کی تنخواہ ساتھ لے کر آیا ہوں۔"

"میں کل کسی وقت تمہارے گھر آؤں گی اور تمہاری امی سے بات کروں گی۔ ویسے تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟"

"تین چار لاکھ میں کام بن جائے گا؟" فرخ نے فخریہ لہجے میں پوچھا۔ یہ بات اس نے اس امید پر کی تھی کہ اسے لوٹ کے مال سے حصہ مل جائے گا۔

"تین چار لاکھ روپے!" زینت نے حیرت سے کہا "اتنی دولت کہاں سے آگئی تمہارے پاس؟"

"کہیں سے بھی آگئی۔ آپ کو اس سے کیا۔" فرخ نے کہا۔ پھر اپنی بات کو مزید یقینی بنانے کے لئے کہا "میں نے گھر میں کسی کو اس رقم کے بارے میں نہیں بتایا۔ آپ بھی ذکر نہ کریں۔"

زینت بیگم سوچنے لگی کہ چار لاکھ کا مطلب یہ ہے کہ اس کا بھانجا لازماً ڈکیتی میں شامل تھا۔

○—□—○

کورنگی روڈ والا وہ فلیٹ مقفل پڑا تھا جس میں سلطان اور مرتضیٰ رہتے تھے۔ فرخ نے ساتھ والے فلیٹ کی گھنٹی بجائی اور انتظار کرنے لگا۔ لمحہ بھر کے بعد دوسری طرف قدموں کی چاپ سنائی دی اور کسی نے سوراخ سے باہر جھانکا۔

"کس سے ملنا ہے' آپ کو؟" اندر سے کسی عورت نے پوچھا۔

"یہ ساتھ والے فلیٹ میں جو لوگ رہتے تھے' وہ آج کل کہاں ہوتے ہیں؟" فرخ نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" عورت نے جواب دیا۔ "یہ فلیٹ کافی عرصے سے بند پڑا ہے۔ کبھی کبھی رات کو کچھ لوگ رہنے کے لئے آجاتے ہیں۔"

فرخ نیچے اترا تو عمارت کے چوکیدار سے سامنا ہو گیا۔

"آپ کس کو تلاش کر رہے ہو؟" چوکیدار نے پوچھا۔

"تم کو کیسے پتا چلا کہ میں کسی کو تلاش کر رہا ہوں؟" فرخ نے سوال پر سوال کر ڈالا۔

"ہم اس بلڈنگ کا ایک ایک آدمی کو پہچانتا ہے۔" چوکیدار نے جواب دیا "جب آپ رکشا سے اترا تھا تو ہم اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ آپ کسی کا مہمان ہے۔"

"میں مرتضیٰ اور سلطان صاحب کو ملنے آیا تھا۔ وہ ادھر

دوسری منزل پر رہتے تھے۔ میں چند سال پہلے یہاں آیا تھا۔"

"ٹھیک ہے' ام سمجھ گیا۔ سلطان صیب کا بنگلا دوسری جگہ پر ہے۔ ادھران کا دوسرا بی بی رہتا ہے۔ مگر وہ بھی آج کل اپنے ماں باپ کے گھر میں ہوتا ہے۔ دونوں میں کچھ جھگڑا مگڑا ہو گیا تھا۔ سلطان صیب بھی بھی دوستوں موستوں کے ساتھ ادھر آتا ہے' گپ شپ کرتا ہے' کچھ کھاتا پیتا ہے۔ پھر چلا جاتا ہے۔ لیکن کوئی پکا بات نہیں ہے۔ بھی روزانہ آتا ہے۔ بھی ہفتہ دس دن میں آتا ہے۔ اس کا مرضی کا بات ہے۔ آپ کو اس سے کیا کام ہے؟"

"وہ میرا دوست ہے۔ میں اس سے ملنے آیا تھا۔"

"آپ ایک کاغذ پر اپنا نام اور فون نمبر لکھ دو۔ ام اس کو بتادے گا۔ کاغذ بھی دے گا۔"

"میں باہر سے آیا ہوں۔" فرخ نے کہا اور یہ سوچ کر دل میں ہنسا کہ وہ درحقیقت "اندر" سے آیا تھا۔ "میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اگر تمہیں بنگلے کا پتا معلوم ہو تو وہ بتادو۔"

"ام کو اس کا بی بی کے والدین کا گھر مالوم ہے۔ بنگلے کا پتا مالوم نہیں ہے۔"

"چلو' بی بی کے گھر کا پتا ہی بتادو۔"

چوکیدار نے جیب سے ایک پرانی سی نوٹ بک نکالی اور صفحہ کھول کر فرخ کے سامنے کردیا "یہ اس کا پتا ہے۔"

فرخ نے پتے پر نظر ڈالی اور اسے ذہن میں محفوظ کرلیا۔ وہ خداداد کالونی کا پتا تھا۔ سلطان کی بیوی کا نام شاہدہ تھا۔

O———□———O

فرخ نے رکشا پکڑا اور خداداد کالونی پہنچ گیا۔ شاہدہ کے باپ کا مکان تلاش کرنے میں دس منٹ لگے۔ وہ ایک نیم پختہ مکان تھا' جس کے دروازے پر سرخ رنگ کا سستا سا پینٹ کیا ہوا تھا۔ قریبی مکان کے سامنے دو دنبے بندھے ہوئے تھے۔

فرخ نے دروازے پر دستک دی اور مکان کا جائزہ لیتے ہوئے شاہدہ کی حیثیت کے بارے میں سوچنے لگا۔ واضح طور پر وہ غریب گھرانے کی حسین لڑکی تھی' جو دولت کی تلاش میں گھر سے نکلی تھی اور سلطان کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔

"جی' فرمایئے؟" ایک [illegible] بوڑھا دروازے میں کھڑا فرخ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "کس سے ملنا ہے' آپ کو؟"

"شاہدہ سلطان یہیں رہتی ہیں؟" فرخ نے پوچھا۔

"ہاں' یہیں رہتی ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا "وہ میری بیٹی ہے۔ کیا آپ بھی سلطان کی طرف سے صلح کا پیغام لائے ہیں؟"

یہ بات سن کر فرخ سمجھ گیا کہ ناراضی شاہدہ کی طرف سے ہے اور سلطان پہلے بھی صلح کے لئے کچھ لوگوں کو اس کے پاس بھیج چکا ہے۔ لہٰذا اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں سلطان کی طرف سے نہیں' اپنی طرف سے صلح کا پیغام لے کر آیا ہوں۔"

بوڑھا اسے ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں لے گیا اور بیٹھنے کا کہہ کر اندر سے اپنی بیٹی کو بلا لایا۔

فرخ نے دیکھا کہ شاہدہ واقعی ایک حسین اور پرکشش خاتون تھی۔ اس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کڑھا ہوا ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا اور خاصی بنی سنوری ہوئی تھی۔ شاید کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

اس نے بھویں سکیڑ کر فرخ کو گھورا' بولی "میرا خیال ہے کہ میں آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں۔"

"آپ نے مجھے اپنے فلیٹ میں دیکھا ہوگا۔" فرخ نے کہا۔ "لیکن یہ بہت پرانی بات ہے۔ میں کچھ عرصے کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو پتا چلا کہ آپ کی سلطان سے کچھ ان بن ہو گئی ہے۔" شاہدہ کا بوڑھا باپ کھانستا ہوا واپس چلا گیا۔

شاہدہ بدستور فرخ کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی' اچانک سمجھداری سے سرہلانے لگی' بولی "آپ باہر نہیں اندر چلے گئے تھے۔ میں نے اخبار میں ساری خبریں پڑھی تھیں۔"

"آپ کی یادداشت خاصی تیز ہے۔" فرخ نے کھسیانی مسکراہٹ سے کہا "انسان کو پردہ تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

"کیا آپ سلطان سے مل کر آرہے ہیں؟"

"ابھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ چوکیدار کا کہنا ہے کہ سلطان آج کل فلیٹ پر بہت کم آتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ اپنا حصہ وصول کرنے کے لئے سلطان سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"آپ کو کافی باتیں معلوم ہیں؟"

"میاں بیوی میں کسی بات کا پردہ نہیں ہوتا۔ واردات کے بعد سلطان بہت خوش تھا۔ اس نے ہنگامے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا ایک مرگیا' دوسرا جیل چلا گیا۔ اللہ اللہ خیر صلا! مجھے امید نہیں ہے کہ وہ آپ کو ڈکیتی کے مال سے حصہ دے۔ اول تو مالی حالات ہی ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ کی گرفتاری کے چند روز بعد اس کا مال پکڑا گیا تھا۔"

"حصہ تو اس کو ضرور دینا پڑے گا۔" فرخ نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ "میں نے چھ سال کی سزا کاٹی ہے اور بدنامی الگ مول لی ہے۔ ماں باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے اور رشتے داروں نے میرا سوشل بائیکاٹ کر دیا ہے۔ یہ رقم ہی میرا آخری سہارا ہے۔ اس سے میں عزت کی زندگی گزارنے کے قابل بن سکتا ہوں۔ لیکن اگر سلطان نے انکار کردیا تو پھر مجھے [illegible] ڈاکو بننا پڑے گا۔ اور میں ڈاکو بننے کے سارے گر سیکھ کر باہر آیا ہوں۔" اچانک وہ چپ ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بول گیا ہے۔

لیکن شاہدہ دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے

پوچھا "کیا آپ سنجیدہ ہیں؟"

"ہاں' بالکل سنجیدہ ہوں۔"

شاہدہ نے تنقیدی نظروں سے فرخ کا جائزہ لیا' پھر بولی۔

"سلطان نے بتایا تھا کہ آپ پڑھے لکھے ہیں۔"

"میں بی اے ہوں۔"

"شادی شدہ؟"

"نہیں۔" فرخ نے جواب دیا۔ اس نے محسوس کیا شاہدہ اس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگی تھی۔ "اس ہنگامے سے پہلے میری منگنی ہو چکی تھی۔ لیکن اب وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ لڑکی میری خالہ کی بیٹی ہے اور خالہ ایک اشتہاری ڈاکو کو اپنی بیٹی دینے پر تیار نہیں۔ کل اس نے مجھے دھکے دے کر گھر سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب میں نے ڈاکوؤں والے لب و لہجے میں بات کی تو اس کا رویّہ تبدیل ہو گیا۔"

شاہدہ کچھ دیر تک سوچتی رہی' پھر بولی "اگر آپ میرا ساتھ دینے کا وعدہ کریں تو میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔"

فرخ نے شوخ نظروں سے شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا ساتھ دینے سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔"

شاہدہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے اندر سے ایک بزنس کارڈ لا کر فرخ کو دیا اور بولی۔ "سلطان آج کل اپنے باپ کے دفتر میں بیٹھتا ہے۔ اس کارڈ پر اس کے دفتر کا پتا بھی ہے اور گھر کا بھی۔"

"سلطان ظمیر' ڈائریکٹر مارکیٹنگ۔۔۔" فرخ نے کارڈ پر لکھا ہوا نام پڑھا۔ "لگتا ہے سلطان شریف آدمی بن گیا ہے!"

"آج کل باپ نے اس کو شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ جب اس کا مال پکڑا گیا تھا تو باپ ہی اس کے کام آیا تھا۔"

"اس زمانے میں یہ مسٹر ایرک نامی ایک جرمن کے ساتھ کوئی۔۔۔ خفیہ کاروبار کر رہا تھا۔"

"آپ مسٹر زیگلر کو کیسے جانتے ہیں؟"

"ان دنوں میں ایک کار رینٹ کمپنی میں کام کرتا تھا اور مسٹر ایرک کے بنگلے پر کار لے کر گیا تھا۔ وہیں پر سلطان اور مرتضیٰ سے ملاقات ہوئی تھی۔ بنگلے میں اکمل نامی کراٹے ماسٹر بھی تھا' جو زیگلر کی بیٹی کو کراٹے سکھاتا تھا۔"

"غالباً آپ نورینا کی بات کر رہے ہیں۔ وہ ایرک کی بیٹی نہیں' کوئی آوارہ لڑکی ہے' جو منشیات کی اسمگلنگ کے شوق میں پاکستان آئی تھی اور گرفتار ہوتے ہوتے بچی تھی۔ آج کل وہ مرتضیٰ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ ایرک واپس جرمنی جا چکا ہے۔"

"میں تو اسے ایک غیر ملکی سفارت خانے کا کارکن سمجھا تھا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ وہ کسی سفارت خانے کا کارکن نہیں تھا۔ لیکن سلطان نے بتایا تھا کہ اسے ایک سفارت خانے کے بعض کارکنوں کی حمایت حاصل تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج وہ جیل میں بند ہوتا۔"

"آپ کے پاس مرتضیٰ کا پتا بھی ہے؟"

"وہ نرسری کے قریب ایک فلیٹ میں رہتا ہے۔"

فرخ نے مرتضیٰ کا پتا کارڈ کی پشت پر نوٹ کر لیا اور پوچھا۔

"آپ کو مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہئے؟"

"آپ پہلے سلطان سے مل لیں' پھر میرے پاس آ جائیں۔ ویسے آپ کی رہائش کہاں ہے؟"

"کہیں بھی نہیں۔ کل کی رات میں نے جونا مارکیٹ کی ایک کھولی میں گزاری تھی۔ سلطان سے ملنے کے بعد مجھے رہائش کا انتظام بھی کرنا ہے۔"

شاہدہ اس کے لئے چائے بنا لائی اور تاکید کی کہ وہ سلطان سے اس ملاقات کا ذکر نہ کرے۔

○———□———○

سلطان کا دفتر ایک کمرشل بلڈنگ کی تیسری منزل پر تھا۔ خاصا شاندار دفتر تھا۔ ہال اور اس سے ملحقہ شیشے کی پارٹیشنز والے کمروں میں دو درجن سے زیادہ افراد کام کر رہے تھے۔ سلطان کا کمرا دائیں کونے میں تھا۔ پہلے کمرے میں ایک فیشن ایبل اور مستعد سیکریٹری کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔

فرخ نے اپنے شکستہ لباس پر نظر ڈالی اور قدرے جھجکتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنے بڑے صنعتکار کے بیٹے کو بینک لوٹنے کی کیا ضرورت تھی۔

"اے بھائی' کدھر جا رہے ہو؟" باوردی چپڑاسی نے اس کا راستہ روکا "کس سے ملنا ہے؟"

"سلطان ظمیر سے۔" فرخ نے جیب سے کارڈ نکال کر اس پر نظر ڈالی "پرائیویٹ کام ہے۔"

کارڈ دیکھ کر چپڑاسی نے راستہ دے دیا۔

خوبرو سیکریٹری نے مشین سے ہاتھ روک کر فرخ کا جائزہ لیا اور پوچھا "آپ کس سلسلے میں سلطان صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"پرائیویٹ کام ہے۔" فرخ نے کہا "میرا نام فرخ شیخ ہے۔"

سیکریٹری نے انٹرکام پر سلطان سے بات کی' پھر صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ صاحب بہت بزی ہیں۔ یا آپ کل آ جائیں۔"

"میں انتظار کر سکتا ہوں۔" فرخ نے کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ فرخ نے ایک رسالہ اٹھا لیا اور یونہی اس کے اوراق پلٹنے لگا۔ انتظار کرتے کرتے سوا گھنٹا گزر گیا۔ اس دوران میں کئی لوگ سلطان کے کمرے میں گئے اور واپس چلے گئے۔ سیکریٹری بھی دو تین دفعہ اندر گئی۔ مگر فرخ کی باری

نہیں آئی۔

ساڑھے بارہ بجے سیکریٹری' سلطان کے کمرے سے باہر آئی اور فرخ سے کہا "جایئے' صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔"

فرخ کمرے میں داخل ہوا اور دفتر کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تاہم وہ مرعوب نہیں ہوا۔

"سلطان صاحب' آپ نے بہت جلد باریابی کا موقع عنایت کر دیا۔" فرخ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "آپ کا دفتر تو بہت شاندار ہے۔"

"کام کی بات کرو۔" سلطان نے تیوری چڑھائی۔ "میں بہت مصروف ہوں۔"

"میں اپنا حصہ لینے آیا ہوں۔"

"وہ بات ختم ہو چکی ہے۔ تم کسی کام کے آدمی ثابت نہیں ہوئے تھے۔ اگر ہم حاضر دماغی سے کام نہ لیتے تو تمہارے ساتھ ہی پکڑے جاتے۔"

فرخ کا جسم تن گیا۔ وہ سخت نظروں سے سلطان کو گھورتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ "میرے بولنے کی کچھ گنجائش ہے یا جاؤں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" سلطان کے چہرے پر برہمی نمودار ہو گئی۔

"سلطان' یہ افسر اور ملازم کے درمیان بات چیت نہیں ہو رہی۔" فرخ اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا "ایک ڈاکو کی دوسرے ڈاکو سے بات ہو رہی ہے۔"

"او شٹ اپ......"

"تمہارے باپ نے تمہیں شاندار کرسی پر بٹھا دیا ہے۔" فرخ نے اس کے جوش کی پروا کیے بغیر کیا۔ "لیکن میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ میرے سامنے اب کوئی فیوچر نہیں ہے۔ میں خودکشی کے بجائے تمہارے ہاتھوں قتل ہونا زیادہ پسند کروں گا۔ اس لئے اگر مجھے شٹ اپ کرنا چاہتے ہو تو گن نکالو اور میرے سینے میں گولی مار دو یا میری بات سنو۔ ورنہ میں یہاں بھی بولوں گا' ہال کمرے میں بھی بولوں گا' پوری بلڈنگ میں بولوں گا۔ تمہارے بنگلے پر جا کر بولوں گا اور اس وقت تک بولتا رہوں گا جب تک میری بات نہیں سنی جائے گی۔"

سلطان قدرے نرم پڑ گیا' بولا۔ "بیٹھ کر بات کرو۔ جو کچھ کہنا ہے' ایک ہی دفعہ کہہ دو۔ اور آہستہ بولو۔"

"ٹھیک ہے۔" فرخ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میں ایک ہی دفعہ بات کروں گا۔ اس لئے غور سے میری بات سننا۔ تم نے میرے ذمے جو ڈیوٹی لگائی تھی' اس میں' میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ غلطی تم لوگوں کی تھی۔ تم باہر ڈیوٹی دینے والے سپاہی کا انتظار کیے بغیر اندر چلے گئے تھے۔ جب سپاہی نے تم لوگوں کو للکارا تھا' اس وقت میں گاڑی بھگا لے جا سکتا تھا لیکن میں نے تمہارا انتظار کیا۔ پھر فائرنگ کی وجہ سے دوسری گاڑی اچانک سامنے آ گئی اور ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میرا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا' تم لوگ جا چکے تھے اور میں پبلک کے گھیرے میں تھا۔ پھر میں نے وفاداری نبھاتے ہوئے نہ پولیس کے سامنے اور نہ ہی عدالت میں تمہارا نام لیا۔ تم لوگ رقم لے کر گھر چلے گئے اور مجھے سزا ہو گئی۔ اکمل اپنی جان سے گیا۔ تم دونوں کا بال بھی ٹیڑھا نہیں ہوا۔ اخبار کے مطابق تم لوگوں نے سترہ لاکھ سے زیادہ رقم لوٹی تھی۔ دس لاکھ تمہارے ہوئے اور سات لاکھ روپے میرے۔"

"اکمل کا حصہ بھی تم لوگے؟"

"ظاہر ہے۔ اگر مرتضیٰ مرجاتا تو اس کا حصہ تمہیں ملتا۔"

"اکمل ہمارا آدمی تھا۔ اس کے حصے کے حقدار ہم ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے پولیس کو اور وکیل کو بھی پیسے دیے تھے۔"

"پولیس کو تم نے اپنی جان بچانے کے لئے پیسے دیے تھے۔ اس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ہاں' وکیل کو جو پیسے دیے تھے۔ وہ اکمل کے حصے میں سے کاٹے جا سکتے ہیں۔"

"بات سنو فرخ شیخ' اس شاندار دفتر کو مت دیکھو۔ یہ سب کچھ میرے باپ کا ہے۔ مجھے کلی بندھی تنخواہ ملتی ہے۔ اور جس رقم کا تم ذکر کر رہے ہو' وہ خرچ ہو چکی ہے۔" اس نے دراز سے ہزار روپے والے چند نوٹ نکالے اور بیس نوٹ گن کر فرخ کی طرف بڑھائے۔ "یہ بیس ہزار روپے رکھ لو اور پرانی بات بھول جاؤ۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

فرخ نے چند لمحے سوچا۔ اس وقت وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ اس نے سلطان کے ہاتھ سے نوٹ کھینچ لئے اور اٹھتے ہوئے بولا "سلطان' تم نے ایک مایوس آدمی کو بیس ہزار روپے دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ یا پوری رقم دیتے' یا کچھ نہ دیتے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"اگر مجھے پوری رقم مل جاتی تو میں کوئی شریفانہ کاروبار کر لیتا۔ اگر کچھ نہ ملتا تو خودکشی کر لیتا۔ لیکن اب میں ایک ریوالور خریدوں گا اور کسی صبح تمہیں اچانک قتل کر دوں گا۔ بھرے بازار میں قتل کروں گا۔ کیوں کہ مجھے زندگی سے کوئی پیار نہیں رہا۔ ماں باپ نے گھر سے نکال دیا ہے۔ رشتے داروں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے اور خالہ نے منگنی توڑ کر عمرانہ کا دوسری جگہ رشتہ طے کر دیا ہے۔ عمرانہ میری منگیتر بھی تھی اور محبوبہ بھی۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" سلطان نے کہا "میں تمہیں جیل میں بند کروا دوں گا۔ میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

"تمہارے ہاتھ لمبے ہیں تو میری زبان بہت لمبی ہے۔ میں اپنی آواز بہت دور تک پہنچا سکتا ہوں۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو میرا حصہ مجھے دے دو۔ میں تمہیں سات دن کی مہلت دے سکتا ہوں۔"

سلطان نے انٹر کام کا بٹن دبایا۔ یہ دیکھ کر فرخ تیزی سے

دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ سلطان کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

سلطان نے انٹرکام بند کر دیا اور فون پر ایک نمبر ملایا۔ رابطہ ملنے کے بعد اس نے پوچھا "جلال؟"

"بندہ حاضر ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "کون بول رہا ہے؟"

"سلطان ظہیر۔ سارے کام چھوڑ کر فوراً میرے پاس پہنچو۔ ایک ارجنٹ کام نکل آیا ہے۔ میں دفتر میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"یس سر۔۔۔ تیس منٹ کے اندر پہنچ رہا ہوں۔"

سلطان نے فون بند کر دیا اور انٹرکام پر اپنی سیکریٹری سے کہا۔ "تھوڑی دیر بعد جلال نامی ایک صاحب آئیں گے' انہیں اندر بھیج دینا۔"

رابطہ منقطع کرنے کے بعد وہ اپنی کنپٹیاں سہلانے لگا۔ فرخ کی باتوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس کا باپ ایک بزنس مین ہی نہیں' سیاستدان بھی تھا۔ اگر فرخ بولنا شروع ہو گیا تو اچھا خاصا اسکینڈل بن جائے گا۔ اور اس کی باتیں اخباروں تک بھی پہنچ سکتی تھیں۔

سلطان نے جوانی کے ابتدائی سالوں میں خوب ہنگامے کیے تھے لیکن اب اس کے اندر سنجیدگی اور متانت پیدا ہو گئی تھی۔

تقریباً پچیس منٹ کے بعد ایک قوی الجثہ شخص کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے بال چھوٹے تھے اور چوڑے کندھوں کی وجہ سے سر چھوٹا لگتا تھا۔

"جناب' خادم حاضر ہے۔" اس نے پہلے فرشی سلام کیا' پھر سلطان سے ہاتھ ملایا۔ "حکم کریں' کون سا ارجنٹ کام ہے؟"

"جلال' ایک گیدڑ کو ٹھکانے لگانا ہے۔" سلطان نے دس ہزار روپے نکال کر جلال کے سامنے رکھے۔ "باقی پیسے کام کے بعد۔ اور کام دو تین دن کے اندر ہو جانا چاہیے۔"

"ہو جائے گا۔" جلال نے نوٹ واسکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا "گیدڑ کا نام پتا کیا ہے؟"

سلطان نے فرخ کا نام اور حلیہ مختصراً بتانے کے بعد کہا "ہاں! ایک بات مجھے ابھی یاد آئی ہے۔ فرخ نے کہا تھا کہ ماں باپ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس کا ٹھکانا تمہیں خود تلاش کرنا پڑے گا۔"

"یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ اتنے بڑے شہر میں ایک گمنام آدمی کو تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ خیر' کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ آپ مجھے اس کی تصویر اور اس کے باپ کا پتا دے دیں۔ میں آج ہی آدمی دوڑاتا ہوں۔"

O———□———O

فرخ' سلطان کے دفتر سے نکل کر سیدھا نرسری پہنچا اور مرتضیٰ کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ اتفاق سے مرتضیٰ گھر میں ہی تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور فرخ کو دیکھ کر آنکھیں جھپکائیں۔

"تم اتنی جلدی کیسے چھوٹ گئے؟" اس نے حیرانی سے کہا۔ "سات سال پورے ہو گئے؟"

"ابھی چھ سال تین ماہ ہوئے ہیں۔" فرخ نے جواب دیا۔ "نیک چلنی کی وجہ سے جلدی چھوٹ گیا ہوں۔ اندر نہیں بٹھاؤ گے؟"

"میں۔۔۔ کام سے جا رہا تھا۔" مرتضیٰ نے بہانہ کیا۔ "ویسے آ جاؤ۔ یونہی ملنے آئے ہو یا کوئی کام ہے؟"

فرخ نے دیکھا کہ مرتضیٰ کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی اور وہ بھی سلطان کی طرح سنجیدہ لگ رہا تھا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے آراستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ تب ہی دوسرے دروازے سے لوبنا کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے پیروں تک لمبا پھول دار ڈریس پہن رکھا تھا اور پہلے سے خاصی مختلف لگ رہی تھی۔

"خاتون کا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگ رہا ہے۔" فرخ نے انجان بنتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ۔۔۔"

"خاتون کو بھول جاؤ۔" مرتضیٰ نے تیوری چڑھائی۔ "ہم لوگ باہر کے لوگوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر پسند نہیں کرتے۔ مطلب کی بات کرو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"میرا خیال تھا کہ تم بتائے بغیر ہی میری آمد کا مقصد سمجھ جاؤ گے۔ بہرحال' وقت کے ساتھ آدمی بہت ساری باتیں بھول جاتا ہے۔ مختصراً یہ ہے کہ میں اپنا حصہ لینے آیا ہوں۔"

"حصہ!" مرتضیٰ کے نصف ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "دماغ تو ٹھیک ہے نا تمہارا؟"

"نہیں۔" فرخ نے بڑے اطمینان سے کہا "دماغ ٹھیک ہوتا تو تمہارے پاس نہ آتا۔"

مرتضیٰ نے ہونٹ بھینچے اور ہولے ہولے سر ہلانے لگا۔ ایک طویل توقف کے بعد اس نے اپنی دانست میں دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم اخباری خبروں کو سچ سمجھ کر یہاں آئے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے دس لاکھ سے کم رقم لوٹی تھی۔"

"سائیں' جھوٹ بولنے سے پہلے تمہیں اپنے پارٹنر سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے ستر لاکھ روپے لوٹنے کا اقرار کیا ہے۔ مگر یہ کہہ کر حصہ دینے سے انکار کیا ہے کہ ساری رقم خرچ ہو چکی ہے۔"

"اوہ۔۔۔ تو تم اس سے مل کر آ رہے ہو۔ کیا اس نے تمہیں کچھ بھی نہیں دیا؟"

"زکواۃ دے کر ٹرخانے کی کوشش کی ہے۔" فرخ نے کہا۔ اچانک اس کی نظر ریوالور کے اس دستے پر پڑی' جو کشن کے نیچے

نظر آرہا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور مغموم لہجے میں بولا "میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اور اس وقت مجھے جو بھی مل جائے وہ میرے لئے غنیمت ہوگا۔"

نورینا بڑے غور سے فرخ کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی باتیں سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس نے پوچھا "تم وہی ڈرائیور ہو جو چند سال پہلے ہمارے لئے کرائے کی کار لے کر آئے تھے؟"

"ہاں' میں وہی بدقسمت ڈرائیور ہوں۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر واردات کی تھی اور پکڑا گیا تھا۔ میں چھ سال کی جیل کاٹ کر باہر آیا ہوں اور یہ لوگ میرا حصہ دینے سے انکار کررہے ہیں۔"

"تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔" مرتضیٰ نے کہا اور جیب سے چند نوٹ نکال کر فرخ کی طرف پھینکے۔ "یہ رکھ لو اور دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

فرخ نے بایاں ہاتھ گھٹنے پر رکھا اور اٹھنے کا پوز بناتے ہوئے اچانک ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ پھر وہ پھرتی سے اٹھا اور دونوں کو کور کرتے ہوئے بولا "مسٹر مرتضیٰ' میں چھ سال جیل میں گزار کر آیا ہوں اور غنڈہ گردی کا ہر طریقہ جانتا ہوں۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ میں ایک مایوس انسان ہوں اور دو چار آدمیوں کو آسانی سے قتل کرسکتا ہوں۔ مجھے میرا حصہ چاہئے۔ پورے سات لاکھ روپے۔ ورنہ میں تم دونوں کو قتل کردوں گا۔"

"دیکھو' جذبات میں مت آؤ اور ریوالور ہاتھ سے رکھ کر بات کرو۔"

"مرتضیٰ' بات لمبی مت کرو۔" فرخ نے ریوالور دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ "میں تمہیں ابھی اور اسی وقت قتل کردوں گا۔ جو کچھ گھر میں موجود ہے وہ نکال دو اور باقی رقم کا ایک ہفتے کے اندر انتظام کرنے کا وعدہ کرو۔ اور دیکھو' میں اکیلا نہیں ہوں۔ ڈاکوؤں کا ایک گروہ میری پشت پر ہے۔ لیکن میں ان میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر تم اور سلطان میرے ساتھ ناانصافی کروگے تو میں تم دونوں کو قتل کرنے کے لئے ڈاکو بن جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" مرتضیٰ نے کہا "میں دیکھتا ہوں کہ اس وقت گھر میں کتنی رقم موجود ہے۔" وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔

"رک جاؤ۔" فرخ نے تحکمانہ لہجے میں کہا "دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو۔ مس تم بھی کھڑی ہوجاؤ۔ دونوں ایک ساتھ اندر چلو۔ مجھے پتا ہے کہ تمہارے پاس ایک آدھ کلاشن کوف بھی ہوگی۔ اگر تم نے ہتھیار نکالنے کی کوشش کی تو میں فائر کرنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

دونوں نے ہاتھ بلند کرلئے اور آگے پیچھے خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ مرتضیٰ نے الماری کے لاکر سے پانچ سو روپے والے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور اسے بستر پر پھینک کر فرخ کی ہدایت کے مطابق ایک طرف ہوگیا۔

فرخ نے دونوں کو قالین پر اوندھے منہ لیٹنے کا حکم دیا اور نوٹوں کی گڈی جیب میں ٹھونسنے کے بعد بولا "باقی رقم کے لئے صرف ایک ہفتے کی مہلت دے رہا ہوں۔ اگر ایک ہفتے کے اندر رقم نہ ملی تو تمہیں اور سلطان کو سرِعام قتل کردوں گا۔"

بات ختم کرتے ہی وہ فلیٹ سے باہر نکلا' دروازے کو بولٹ لگایا اور ریوالور کو نیفے میں اڑس کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

○———□———○
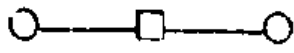
جیناں نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر نوٹوں کی طرف دیکھا' بولی "یہ کیا ہے بابو؟"

"یہ پیسے ہیں۔" فرخ نے کہا "میں ادھر سوتا ہوں' کھاتا پیتا ہوں' پیسے تو خرچ ہوتے ہی ہیں۔ رکھ لو۔"

جیناں نے نوٹ لے کر گنے' بولی "یہ تو دس ہزار روپے ہیں۔ اتنے پیسے کہاں سے آئے ہیں تمہارے پاس؟"

"ایک دوست سے پرانا قرض وصول کیا ہے۔"

"رکھ لے' رکھ لے۔" میو نے کہا "فرخ میرا بھائی ہے۔ اس نے دیے میں نے دیے' ایک ہی بات ہے۔ آج فرخ بھائی کے لئے بمبئی کی بریانی پکالے۔ کچھ میں بھی چکھ لوں گا۔"

"تیرے کو تو میں کڑچھے کا مزا چکھاؤں گی۔" جیناں نے ہاتھ جھٹکا۔ "تیرے لئے دال روٹی پکے گی۔ بابو' اللہ تیرے کو بہت دولت دے گا۔ تم نے غریب جیناں کا خیال کیا ہے' اللہ تیرے کو گھر کا سکھ دے گا۔"

جیناں' فرخ کو دعائیں دیتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

فرخ نے جیب سے پانچ ہزار روپے نکال کر میو کو دیے۔ بولا۔ "یہ تم رکھ لو۔ لیکن دیکھو' نشے اور جوئے کے قریب مت جانا۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ آج تم نے کوئی لمبا ہی ہاتھ مارا ہے۔" میو نوٹوں کو چومتے ہوئے بولا "تم تو اپنے بھی استاد نکلے۔"

فرخ نے اسے سلطان اور مرتضیٰ سے ملاقات کا احوال سنانے کے بعد کہا "ان دونوں سے مجھے اور پیسے ملنے کی امید نہیں ہے اور میں ان دونوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔"

"اپنے استاد نے بتایا تھا کہ اور سب کچھ کرو' مگر قتل نہ کرو۔" میو نے کہا "اس لئے تھوڑا اور سوچ لو۔"

"سوچے تو وہ جس کو زندگی سے پیار ہو۔" فرخ نے کہا اور گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ "آؤ چلیں۔"

"کہاں؟"

"پہلے تو یہ ریوالور سنبھال کر رکھ لو۔" فرخ نے ریوالور نکال کر میو کو دیا۔ "اس میں جو گولیاں ہیں' ان پر میں نے مرتضیٰ اور سلطان کے نام لکھ دیے ہیں۔ میں کچھ کپڑے اور جوتے خریدنا چاہتا ہوں۔ کچھ اپنے لئے' کچھ تمہارے لئے۔"

"تم نے ہمیں بہت کچھ دے دیا ہے۔ مجھے کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے لئے بے شک خرید لو۔"

"ضرورت تو مجھے بھی نہیں ہے' مگر میں ایسے کپڑے خریدنا چاہتا ہوں' جن میں یہ ریوالور چھپ جائے اور دوسری بات یہ ہے کہ میں ان پیسوں کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی وجہ سے میرے دل میں جینے کی خواہش پیدا ہونے لگی ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو فرخ بھائی۔ جینے کی خواہش تو اچھی بات ہے۔"

"غالب نے کہا تھا۔ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید۔ ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے۔ میرے لئے زندگی میں کوئی مزہ نہیں رہا۔ میرے ماں باپ' بہنیں اور رشتے دار مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اور میں نفرت کے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتا۔"

O—□—O

زینت بیگم نے فرخ کو دروازے پر دیکھا تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ دو روز پہلے اس نے اپنی بہن اور بہنوئی سے فرخ کے بارے میں بات کی تھی۔ مگر انہوں نے یہ کہتے ہوئے بات ختم کر دی تھی کہ وہ فرخ کو گھر سے نکال چکے ہیں اور اس کے کسی فعل کے ذمے دار نہیں۔

اس وقت زینت بیگم کا شوہر محسن علی بھی گھر پر تھا۔ اس نے فرخ کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مدبرانہ انداز میں اسے یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ ڈکیتی میں ملوث ہونے کی وجہ سے اس کی پوزیشن بہت خراب ہو چکی ہے۔

"خالو' میں نے جیل میں بہت کچھ سیکھا ہے۔" فرخ نے پاٹ دار آواز میں کہا "ہم اور آپ غریب اور مسکین لوگ ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کو اپنی عزت قائم رکھنے کے لئے تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا ہے۔ ذرا سا ادھر ادھر ہوئے' عزت بھی گئی اور بندہ بھی۔"

"برخوردار' یہی بات تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں......"

"اس لئے......" فرخ نے خالو کی بات کاٹی۔ "اس لئے ہمیں تلوار کی دھار سے نیچے اتر آنا چاہئے۔ تاکہ گرنے کا خطرہ ہی باقی نہ رہے۔ ہم گھٹیا ہیں' کمین ہیں' رذیل ہیں' کچھ بھی ہیں' اپنی محنت کا کھاتے ہیں۔ اس ملک میں بڑے بڑے ڈاکو اور قاتل بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ لوگ سب کچھ جاننے کے باوجود ان کی عزت کرتے ہیں۔ لیکن......"

"ان کے پاس دولت اور اختیار ہے۔" خالو نے کہا۔

"تو کیا ثابت ہوا کہ اصل چیز امیری اور غریبی ہے۔ غریب آدمی بینک لوٹنے سے بے عزت ہو جاتا ہے اور امیر آدمی ملک لوٹنے سے بھی بے عزت نہیں ہوتا۔ سو سال کے بعد آج کے بدنام اور نیک نام سب قبروں میں پڑے ہوں گے۔ چھوڑیں ان باتوں کو' یہ لیں......" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپنگ بیگ خالہ کی طرف بڑھایا۔ "یہ میں عمرانہ کے لئے لایا ہوں۔"

"یہ کیا ہے؟" خالہ نے پوچھا۔

"خود ہی دیکھ لیں۔" فرخ نے شاپنگ بیگ خالہ کے ہاتھ میں دیا اور جیبیں چیک کرنے لگا۔ "اس کی رسید بھی آپ کے پاس ہونی چاہئے۔" اس نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا اور جیبوں کی تلاشی کے دوران ریوالور نکال کر میز پر رکھ دیا۔ یہ حرکت اس نے دانستہ کی تھی۔

ریوالور کو دیکھ کر محسن علی ذرا سہم گیا۔ زینت بیگم کا رنگ اُڑ گیا۔

فرخ نے جیب سے ایک رسید نکال کر خالہ کی طرف بڑھائی۔ "یہ زیور کی رسید ہے۔ یہ بھی آپ رکھ لیں۔" اس نے کہا اور ریوالور اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

شاپنگ بیگ میں ایک کامدانی ساڑی اور ایک سونے کا سیٹ تھا۔ زینت بیگم نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر دونوں چیزوں کو دیکھا اور بولی "ہم یہ چیزیں نہیں رکھ سکتے۔"

فرخ اٹھتے ہوئے بولا "میں اس سے پہلے بھی عمرانہ کو اور آپ کو تحفے دے چکا ہوں۔ اگر آپ یہ چیزیں نہیں رکھ سکتیں تو انہیں گلی میں پھینک دیں۔ میں دوبارہ آؤں گا۔" بات ختم کرتے ہی وہ گھر سے نکل گیا۔

کچھ فاصلے پر میمو کرائے کی گاڑی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ فرخ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

پندرہ منٹ کے بعد ان کی کار اُس گلی میں داخل ہوئی جس میں اس کے والدین کا گھر تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر اس نے کار روک دی اور میمو سے کہا۔ "اس سے آگے تمہارا کام ہے۔ میری ماں کو کچھ پیسے دے آؤ۔ وہ دیکھو' وہ سامنے جو سبزی کا ٹھیلا کھڑا ہے' اس کے دائیں طرف جو دروازہ نظر آ رہا ہے' وہ ہمارا گھر ہے۔"

ابھی وہ یہ بات ہی کر رہا تھا کہ ایک موٹر سائیکل ان کے دروازے کے سامنے رکی۔ موٹر سائیکل پر دو آدمی سوار تھے۔ ایک قوی الجثہ شخص تھا' جو شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے کندھے خاصے چوڑے تھے' جس کی وجہ سے اس کا سر چھوٹا لگتا تھا۔ دوسرے شخص کی شکل دلیپ کمار سے ملتی جلتی تھی۔ اس کے سفید اور بھورے بالوں کا اسٹائل بھی دلیپ کمار جیسا تھا۔

واسکٹ پوش نے دروازے پر دستک دی۔

میمو جو بڑے غور سے دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا' چونک کر بولا۔ "اس واسکٹ والے کو جانتے ہو؟ یہ جلال عرف جلاد ہے۔ اور اس کے ساتھی کا نام خاطر خان ہے۔ یہ تمہارے دروازے پر کیا کر رہے ہیں۔ یہ دونوں تو پیشہ ور قاتل ہیں۔ بڑے اونچے شکاری ہیں۔"

"ان کی یہاں آمد کا ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے۔" فرخ کا ہاتھ جیکٹ کی اندرونی جیب میں پہنچ گیا' جس میں ریوالور رکھا تھا۔ "ان

کو سلطان یا مرتضیٰ نے میرے پیچھے لگایا ہے۔" اس نے کار کو گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا "آؤ پہلے ان سے نمٹ لیں۔"

"ٹھہر جاؤ۔" میو نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "جلدی مت کرو۔ اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کارروائی کرو گے تو تمہارے باپ کے لئے مشکلات پیدا ہوں گی۔"

یہ بات فرخ کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے گاڑی روک دی اور جلال کے روانہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ دروازہ جس کسی نے بھی کھولا تھا' وہ سامنے نہیں آیا تھا۔ جلال کچھ دیر تک بات کرتا رہا' پھر موٹر سائیکل پر جا بیٹھا۔ فرخ اس کی آواز نہیں سن سکا تھا۔ تاہم اس نے اندازہ لگایا کہ اس کا لہجہ جارحانہ اور دھمکی آمیز تھا۔

موٹر سائیکل روانہ ہوئی تو فرخ نے اپنی کار اس کے پیچھے لگادی۔ موٹر سائیکل پاک کالونی اور بڑا بورڈ سے ہوتی ہوئی سندھ انڈسٹریل ایریا میں پہنچ گئی۔

ایک سنسان جگہ پر پہنچ کر فرخ نے کار کی رفتار بڑھائی اور آناً فاناً موٹر سائیکل کو سائیڈ ماردی۔ موٹر سائیکل سڑک کے کنارے پر اگی ہوئی جھاڑیوں میں قلابازیاں کھانے لگی۔

"فرخ بھائی' یہ کیا کیا تم نے!" میو نے گھبرا کر کہا۔ "یہ جلال بڑا اونچا قسم کا دادا ہے۔ بڑے بڑے بدمعاش اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ یہ ہمارے پورے خاندان کو تہس نہس کر دے گا۔"

فرخ نے گاڑی روکی' انجن بند کیا' باہر نکلا اور ریوالور نکال کر جلال کے سر پر پہنچ گیا۔

خاطر خان اور جلال کو اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ دونوں گالیاں نکالتے ہوئے اور کراہتے ہوئے جھاڑیوں سے نکل رہے تھے۔ میو نے سڑک کے کنارے پر پڑا ہوا ایک ڈنڈا اٹھالیا۔ ابھی تک اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ فرخ کا ارادہ کیا تھا۔

خاطر خان کی پیشانی اور بایاں گال زخمی ہوگیا تھا۔ اس نے فرخ کو دیکھا تو اچانک ہنسنا شروع کردیا۔

"استاد' یہ تو وہی ہے' جس کی تلاش میں ہم نکلے تھے۔" اس نے کہا "یہ تو الٹا کام ہوگیا۔"

جلال نے فرخ کو گالی نکالی اور بولا "کتے کے بچے' ریوالور جیب میں رکھ لے۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو تیرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ یہ مت بھول کہ تیری دو جوان بہنیں بھی ہیں۔"

"جنگلی سور' آج تیرے حساب کتاب کا دن ہے۔" فرخ اس کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے بولا "اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے۔"

جلال ریوالور نکالنے اور فائر کرنے میں بہت ماہر تھا۔ اور کئی خطرناک مواقع پر محض اس مہارت کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ مگر آج اس کی یہ مہارت بروئے کار نہیں آرہی تھی۔ جب اس نے اپنے داہنے ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی تو کندھے میں شدید ٹیس اٹھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

"دیکھو بچہ' حساب کتاب کو چھوڑو اور ہمارے ساتھ سمجھوتا کرلے۔" اس نے اپنی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے کہا۔ "جلال خان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے' اور اکیلا بھی نہیں ہے۔"

"صرف ایک بات کا جواب دے۔" فرخ نے کہا "تجھے کس نے میرے پیچھے بھیجا ہے۔ اور کتنی رقم دی ہے؟"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم جلال خان کی ہیبت سے واقف نہیں ہو۔" خاطر خان نے کہا "ورنہ ایسا سوال نہ کرتے۔"

"جواب دو۔" فرخ نے جلال کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ "اور جلدی۔۔۔"

خاطر خان استاد کی مدد کے لئے آگے بڑھا۔ تب ہی میو نے ڈنڈا گھما کر اس کے سر پر ضرب لگائی اور یہ ضرب کچھ زیادہ ہی زوردار ثابت ہوئی۔ خاطر خان کا سر کھل گیا اور وہ لہراتا ہوا زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

یہ دیکھ کر جلال کے چہرے پر پہلی بار خوف نظر آنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ فرخ اور میو بہت معمولی قسم کے اچکے تھے۔ اس لئے وہ قتل کرنے کی ہمت نہیں کرپائیں گے۔ لیکن خاطر خان کا سر کھلتے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ اب اس کی جان بھی خطرے میں ہے۔ خاطر خان کے سر سے جس انداز سے خون بہہ رہا تھا اس سے اس کے بچنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اور قتل کے عینی گواہ کو کوئی احمق ہی زندہ چھوڑ سکتا تھا۔

"بات سنو احمقو' اگر اس کو فوراً اسپتال نہ پہنچایا گیا تو یہ مرجائے گا۔"

"شٹ اپ!" فرخ نے چیخ کر کہا "تم اپنی فکر کرو۔ مجھے اپنے سوال کا جواب چاہئے۔"

"مجھے سلطان نے تمہارے پیچھے لگایا تھا۔" جلال نے کہا۔ "اس نے مجھے دس ہزار روپے ایڈوانس دیے تھے۔"

"میں نے سنا ہے کہ تم پیشہ ور قاتل ہو اور تم نے کئی انسانوں کو اجرت لے کر قتل کیا ہے۔" فرخ نے کہا اور سڑک پر نظر ڈالی' جو ہنوز سنسان پڑی تھی۔

جلال نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا قتل کار ثواب ہے۔" فرخ نے کہا اور قریب سے جلال کے سر میں ایک فائر کیا۔ "تمہارے مقدر میں کتے کی موت لکھی تھی۔"

جلال ڈگمگایا اور کسی بت کی طرح زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

فرخ نے ریوالور جیب میں رکھا اور میو کے ہمراہ کار میں جا بیٹھا۔ چند لمحوں کے بعد ان کی کار مین روڈ پر دوڑ رہی تھی۔

O—□—O

شاہدہ نے مسکراتے ہوئے فرخ کا استقبال کیا اور اسے

ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ "مجھے بہت شدت سے آپ کا انتظار تھا۔" اس نے کہا "میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ آپ اپنا وعدہ بھول گئے ہیں۔"

"میں کچھ مصروف ہو گیا تھا۔"

"سلطان سے کیا بات ہوئی؟"

"آپ کی بات صحیح نکلی۔ اس نے حصہ دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ ہاں، تھوڑی سی خیرات ضرور دی ہے۔"

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" فرخ نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ وہ عورت اس کے لئے اجنبی تھی اور اس کے سامنے دل کے راز کھولنا مناسب نہیں تھا۔

"میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" شاہدہ اٹھتے ہوئے بولی "پھر تفصیل سے بات ہوگی۔"

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ فرخ ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھنے لگا۔ مکان کے دوسرے حصے سے شاہدہ کے باپ کے کھانسنے کی آواز کے علاوہ کبھی کبھی دو عورتوں کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ دس منٹ کے بعد شاہدہ چائے لے کر آئی اور فرخ کے قریب بیٹھ گئی۔ فرخ کو اس کی یہ ادا عجیب سی لگی۔

شاہدہ اس کے نئے کپڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "لگتا ہے، جیسے تم عید پڑھ کر آ رہے ہو!" وہ آپ سے تم پر آ گئی۔

"دو روز پہلے کچھ نئے کپڑے خریدے ہیں۔" فرخ نے اس کے قرب سے متاثر ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جیل سے رہا ہونے کے بعد میرے پاس ایک ہی جوڑا تھا۔"

"سلطان کے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"میں نے اسے سات دن کی مہلت دی ہے۔"

"وہ ایسی باتوں کی پروا کرنے والا آدمی نہیں ہے۔" شاہدہ کپ میں چائے ڈالتے ہوئے بولی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "میں تمہیں رقم نکلوانے کا ایک عمدہ طریقہ بتا سکتی ہوں۔"

فرخ نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے پوچھا۔ "کون سا طریقہ؟"

"سلطان نے میرا پانچ سالہ بیٹا، جس کا نام عدنان ہے، مجھ سے چھین لیا ہے۔"

"بیٹا!" فرخ نے حیرانی سے کہا "میں تو سمجھا تھا کہ تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔" اس نے بھی تکلف ترک کر دیا۔

"میرے بیٹے کی عمر تمہاری جیل کی عمر سے ایک سال کم ہے۔" شاہدہ نے ہنس کر کہا "عدنان ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھتا ہے۔ اگر تم اسے اغوا کر کے میرے حوالے کر دو تو۔"

"اغوا بہت سنگین جرم ہے۔" فرخ نے کہا "اور میں نے سنا ہے کہ اس جرم کی انتہائی سزا موت ہے۔"

"درحقیقت یہ اغوا نہیں ہوگا کیونکہ بچہ اپنی ماں کے پاس ہوگا۔ اول تو تمہارے پکڑے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن اگر ایسی کوئی صورت پیش آ گئی تو میرا بیان تمہیں صاف بری کرا دے گا۔ میں صاف کہہ دوں گی کہ عدنان میرے پاس تھا۔"

فرخ کو اس تجویز میں کچھ دلچسپی محسوس ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ "بچے کو اغوا کس طرح کیا جائے گا؟"

"میں تمہیں عدنان کا اسکول، بنگلا اور وہ گاڑی دکھا دوں گی جس میں وہ اسکول جاتا ہے۔ تم چند روز تک اس گاڑی کی نگرانی کرو اور دیکھو کہ یہ گاڑی کتنے بجے بنگلے سے روانہ ہوتی ہے، کتنے بجے اسکول پہنچتی ہے، چھٹی کے وقت کتنے بجے عدنان کو لینے آتی ہے۔ اور کس راستے سے گزرتی ہے۔ اس نگرانی کے دوران تمہیں بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ کون سی جگہ اور کون سا وقت عدنان کے اغوا کے لئے موزوں ہوگا۔"

"اغوا کے بعد کیا ہوگا؟"

"میں عدنان کو لے کر کراچی سے باہر چلی جاؤں گی۔ تم اطمینان سے تاوان وصول کر لینا۔ مجھے یقین ہے کہ سلطان بچے کی خاطر کم از کم پچیس لاکھ روپے تاوان دینے پر راضی ہو جائے گا۔"

اتنی بڑی رقم کے تصور سے فرخ کے دل میں ایک بار پھر جینے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔ اس نے پوچھا "کیا تم بھی حصہ لو گی؟"

"ففٹی پرسنٹ۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم بے ایمانی نہیں کرو گے۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا" تاوان وصول کرنے کے بعد بچہ واپس بھی کرنا پڑے گا؟"

"یہ ضروری نہیں۔ تاوان کی وصولی کے چند روز بعد میں عدنان کے سلسلے میں عدالت سے حکم امتناعی حاصل کر لوں گی۔"

"کیا عدالت یہ سوال نہیں کرے گی کہ بچہ تمہارے پاس کیسے پہنچا؟"

"میرا جواب بہت سادہ ہوگا۔ میں عدالت میں بیان دوں گی کہ میں عدنان کو اسکول سے ساتھ لے گئی تھی۔ اور عدنان بھی میرے بیان کی تائید کرے گا۔"

"ہم عملی طور پر بھی ایسا ہی کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس رنگین شیشوں والی کار ہوگی۔ میں ڈرائیور کی وردی میں ہوں گا۔ آپ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوں گی۔ عدنان آپ کو دیکھتے ہی آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔"

شاہدہ نے تعریفی نظروں سے فرخ کی طرف دیکھا بولی "ترکیب تو اچھی ہے، لیکن ہم سلطان کے ڈرائیور کی نظروں سے کیسے بچیں گے؟"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میرا ایک آدمی اس کو راستے میں رکنے پر مجبور کر دے گا۔"

شاہدہ کو یہ ترکیب بھی پسند آئی۔ لیکن فرخ منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے محمود سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ نیز ایک بار

سلطان سے بھی ملنا چاہتا تھا۔

O----□----O
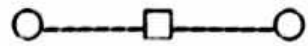
جلال اور خاطر خان کی موت کی خبر سن کر سلطان کو اچھا خاصا جھٹکا لگا تھا۔ پولیس کا خیال یہ تھا کہ اس قتل میں کسی حریف گروپ کا ہاتھ تھا۔ اور سلطان اس خیال سے پوری طرح متفق تھا۔ یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ جرائم کی دنیا کے اس دیو کے قتل میں فرخ کا ہاتھ تھا۔

فرخ کی وارننگ کے چھٹے روز، تقریباً چھ بجے وہ دفتر سے نکل کر نیچے پہنچا اور اپنی کار کی طرف بڑھا۔ اس وقت دفتروں میں کام کرنے والے زیادہ تر لوگ چھٹی کر چکے تھے اور پارکنگ لاٹ سنسان پڑا تھا۔ سلطان نے جیسے ہی تالے کے سوراخ میں چابی ڈالی، ایک شخص جو قریب ہی کہیں چھپا ہوا تھا۔ آواز کئے بغیر اس کے عقب میں پہنچا اور کوئی سخت چیز اس کی پسلیوں سے لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی کلک...... کلک کی دو آوازیں سنائی دیں اور سلطان کے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ وہ یہی سمجھا کہ اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر گن مس فائر ہو گئی تھی۔ وہ دلیر آدمی ضرور تھا مگر چھپ کر وار کرنے والے دشمن سے بہت ڈرتا تھا۔

کلک کلک کی آواز سنتے ہی وہ تیزی سے گھوما اور حملہ آور کے جبڑے پر گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی۔ مگر حملہ آور کے لئے یہ وار غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ تیزی سے جھکائی دے کر وار بچا گیا۔

سلطان نے دیکھا وہ فرخ تھا، جو لنڈے کے اوور کوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور کوٹ کی اوٹ میں تھا۔

"دوسری کوشش نہ کرنا سلطان۔" اس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "ریوالور کے اگلے چیمبر میں اصلی گولی موجود ہے۔"

"یہ کیا ذلیل حرکت ہے؟" سلطان نے برہمی سے کہا۔

"اس ذلیل حرکت کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں قتل بھی کر سکتا تھا۔ تمہیں اس بات پر یقین آجانا چاہئے کہ میں ایسا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہوں۔" فرخ نے ریوالور کوٹ کی جیب میں رکھ لیا، مگر ہاتھ باہر نہیں نکالا۔ "آج میری مہلت کا آخری دن ہے۔ رقم کا انتظام ہو گیا؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ......"

"خزانے کی کنجی تمہارے باپ کے پاس ہے۔" فرخ نے اس کی بات پوری کرتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں۔ میں صرف حجت پوری کرنے آیا تھا۔ اگر تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تو خود اس زندگی سے تنگ آیا ہوا ہوں۔ مرتضیٰ کو بھی بتا دینا کہ مہلت ختم ہو رہی ہے۔"

"تم مرتضیٰ سے ریوالور اور پچاس ہزار روپے چھین کر لے گئے تھے۔"

"زندگی سے بیزار انسان کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔" فرخ الٹے پاؤں اپنی کرائے کی کار کی طرف بڑھا۔ "اگلی ملاقات میں تم میرا چہرہ نہیں دیکھ سکو گے۔"

"ایک منٹ۔" سلطان نے کہا "میں تھوڑے بہت پیسوں کا انتظام کر سکتا ہوں۔ اپنا پتا یا فون نمبر بتا دو تاکہ میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکوں۔"

"میں اتنا احمق نہیں ہوں۔" فرخ نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "دشمن کو کبھی ٹھکانا نہیں بتانا چاہئے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ آج کل میرا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ جب سے باپ نے گھر سے نکالا ہے، میں در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ صبح کہیں اور شام کہیں......"

تب ہی سلطان نے دیکھا کہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک شخص پہلے سے موجود تھا اور انجن اسٹارٹ تھا۔

وہ میو تھا۔ فرخ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور میو نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

سلطان دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور بے بسی سے اسٹیئرنگ وھیل پر مکے مارنے لگا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ معمولی سا آدمی اس کے لئے ٹیڑھی کھیر بن جائے گا۔

O----□----O
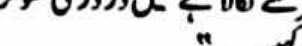
فرخ اور میو ٹھیک ایک ہفتے تک اس سفید لانسر کار کا تعاقب کرتے رہے جو عدنان کو اسکول چھوڑنے اور واپس لے جانے آتی تھی۔ یہ گاڑی ڈیفنس سوسائٹی سے روانہ ہوتی تھی اور کالا پل، شارع فیصل، شاہراہ قائدین اور دادا بھائی نوروجی روڈ سے ہوتی ہوئی نیوٹاؤن کے علاقے میں جاتی تھی، جہاں عدنان کا اسکول تھا۔ ڈرائیور ایک ادھیڑ عمر شخص تھا اور وقت کا بہت پابند تھا۔ صبح کے وقت وہ ساڑھے سات بجے بنگلے سے روانہ ہوتا تھا۔ گاڑی میں تین بڑے بچے بھی اسکول جاتے تھے۔ لیکن وہ شارع فیصل پر واقع عائشہ باوانی اسکول پر اتر جاتے تھے۔ چھٹی کے وقت سفید لانسر کبھی پونے ایک بجے اور کبھی ایک بجتے میں پانچ دس منٹ پر عدنان کے اسکول پہنچ جاتی تھی۔ اسکول میں ایک بجے چھٹی ہوتی تھی۔ یعنی عدنان کو کبھی بھی گاڑی کے لئے انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔

اتوار کے روز سفید لانسر کار جب کرائسٹ دی کنگ چرچ سے ذرا آگے پہنچی تو بغلی گلی سے آنے والی ایک ٹویوٹا کار سے ٹکرا گئی۔ ایکسیڈنٹ خاصا شدید تھا۔ پیچھے آنے والی ٹریفک رک گئی اور لوگ کھڑکیوں سے سر نکال کر صورت حال کا جائزہ لینے لگے۔

ٹویوٹا کار میو چلا رہا تھا۔ وہ چوری کی کار تھی اور پروگرام کے مطابق اسے فوراً وہاں سے کھسک جانا تھا۔ تاہم وہ پُراعتماد انداز میں باہر نکلا اور لانسر کے ڈرائیور سے الجھنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کو حادثے کا ذمے دار ٹھہرا رہے تھے۔

"دیکھو میاں، میں پولیس کو فون کرنے جا رہا ہوں۔" میو نے لانسر کا نمبر نوٹ کرتے ہوئے کہا۔ "گاڑیوں کی پوزیشن تبدیل نہیں کرنا۔"

"ہاں، ضرور پولیس کو فون کرو۔" ڈرائیور نے ہاتھ ہلاتے

ہوئے کہا "اور نزلی کسی اور کو دینا۔ غلطی تمہاری ہے۔ میں ادھر ہی کھڑا ہوں۔"

میرو لوگوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے قریبی پیٹرول پمپ کی طرف گیا اور فون کرنے کے بجائے گلی سے ہوتا ہوا شاہراہ قائدین کی طرف نکل گیا۔ وہاں سے ٹاور جانے والی ویگن میں سوار ہو گیا۔

ادھر ایک بجنے میں پانچ منٹ پر ایک سفید لانسر عدنان کے اسکول کے سامنے رکی۔ وہ بالکل اس لانسر کار جیسی تھی جو عدنان کو لینے آتی تھی۔ فرخ سفید یونیفارم اور پی کیپ پہنے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا یا دوسرے لفظوں میں اس نے اخبار سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ اس کی یونیفارم ہو بہو سلطان کے ڈرائیور جیسی تھی۔

پچھلی سیٹ پر شاہدہ بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ڈرائیور نے سلطان کو ایکسیڈنٹ کے بارے میں فون کر دیا تو وہ فوراً دوسری گاڑی بھیج دے گا اور کوئی عجب نہیں کہ وہ پرنسپل کو فون کر کے عدنان کو اندر ہی روکنے کے لئے کہہ دے۔

وہ کبھی اسکول کے گیٹ کی طرف، کبھی سڑک کی طرف اور کبھی اپنی گھڑی پر نظر ڈالتی تھی۔

ایک بجے چھٹی کی گھنٹی بجی اور بچے باہر آنا شروع ہو گئے۔ شاہدہ کھڑکی کے شیشے سے ایک ایک چہرہ دیکھنے لگی۔ ایک بج کر تین منٹ پر اسے عدنان کا چہرہ نظر آیا۔ وہ معمول کے مطابق سیدھا سفید لانسر کی طرف آیا اور اگلی سیٹ کا دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر شاہدہ نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے آواز دی۔

"امی، آپ!" عدنان کے چہرے پر حیرت اور خوشی نمودار ہو گئی۔ وہ جلدی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور شاہدہ نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ فرخ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"امی، آپ گھر آ گئی ہیں؟" عدنان نے پوچھا۔

"تم کچھ دن میرے پاس رہو گے۔" شاہدہ نے بیٹے کو پیار کرتے ہوئے کہا "میں تمہارے لئے اداس ہو گئی تھی۔"

فرخ نے دونوں کو خداداد کالونی میں شاہدہ کے گھر کے سامنے اتار دیا اور آگے روانہ ہو گیا۔

شاہدہ کا اسی شام بہاول نگر جانے کا پروگرام تھا۔ ٹرین میں اس کی اور عدنان کی سیٹ بک تھی۔ بہاول نگر میں اس کا بڑا بھائی رہتا تھا، جو ایک سرکاری افسر تھا۔ اس نے فرخ کو رابطے کے لئے اپنے بھائی کا فون نمبر دے دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ وہ اغوا کے پانچ روز بعد تاوان کے لئے سلطان سے رابطہ قائم کرے۔

O———□———O
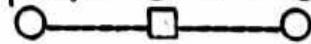
میرو اس منصوبے پر بہت خوش تھا۔ اس نے کار اور بنگلے کے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے۔ لیکن فرخ کو وہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ نادانستہ طور پر جرم کی دلدل میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔ جب وہ کرائے کی لانسر واپس کر کے میرو کے پاس پہنچا تو اسے بے چینی سے اپنا منتظر پایا۔

"میں نے سلطان کو فون کر دیا ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔

"تم نے کیا کر دیا ہے؟" فرخ نے حیرانی سے اسے گھورا۔

"سلطان کو فون کر دیا ہے۔ اسے کہہ دیا ہے کہ وہ پولیس کے پاس نہ جائے، ورنہ بچے کی لاش بھی نہیں ملے گی۔"

"یہ تم نے کیا کیا! ہم نے پانچ دن کے بعد سلطان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"یہ بہت ضروری تھا۔ میرا مطلب ہے کہ سلطان کو پولیس کے پاس جانے سے روکنا بہت ضروری تھا۔ میں نے اس کو تسلی بھی دی ہے اور کہا ہے کہ اس کا بیٹا بالکل خیریت سے ہے، اور اگر وہ بیٹے کی بخیریت واپسی چاہتا ہے تو پچاس لاکھ روپے تیار رکھے۔"

"پچاس لاکھ روپے!"

"پچاس لاکھ سے بات شروع کریں گے تو پچیس تیس لاکھ تک سودا پٹ جائے گا۔ میں نے اس کو کہہ دیا ہے کہ نہ تو پولیس کے پاس جائے اور نہ ہی اخبار میں خبر لگائے۔"

لیکن اگلے روز تمام اخباروں میں عدنان کے اغوا کی خبر موجود تھی۔ خبر کے آخر میں لکھا تھا کہ پولیس کو اغوا کرنے والوں کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں اور ان کی گرفتاری بہت جلد متوقع ہے۔

فرخ یہ خبر پڑھ کر فکر مند ہو گیا۔ اس نے سوچا، ہو سکتا ہے کہ سلطان نے اس کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا ہو۔ ایسی صورت میں پولیس اس کے گھر والوں کو پریشان کر سکتی ہے۔

میرو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "فرخ بھائی، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پولیس ہر واردات کے بعد ایسے ہی بیان دیا کرتی ہے۔ اس کیس کو ان کا باپ بھی نہیں پکڑ سکتا کیونکہ بچہ اپنی ماں کے پاس ہے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ سلطان پولیس کے سامنے میرا نام نہ لے۔"

"یہ غلطی وہ کبھی بھی نہیں کرے گا۔ اس کو پتا ہے کہ تمہاری گرفتاری سے اس کی بدنامی ہو گی۔ تم پولیس اور اخبار والوں کو بینک ڈکیتی کی کہانی سنا دو گے۔"

"یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔" فرخ نے سمجھداری سے سرہلایا۔ "اگر وہ میرا نام لے گا تو اس کو اس کا کوئی معقول جواز بھی پیش کرنا پڑے گا۔ اس ایک ڈکیتی کے علاوہ میرا اس سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ نہ دوستی، نہ دشمنی۔ اور ڈکیتی کا ذکر اس کے لئے بدنامی کا باعث بنے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرا نام کبھی نہیں لے گا۔ اب ہم آٹھ دس دن تک گھر میں آرام کریں گے اور پولیس کی کارگزاری کا تماشا دیکھیں گے۔"

O———□———O
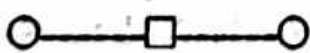
تیسرے دن عدنان کے اغوا کی خبر اندرونی صفحے پر پہنچ گئی۔ وہ ایک کالم کی چھوٹی سی خبر تھی۔ خبر کے مطابق پولیس کو اغوا کنندگان کا سراغ مل گیا تھا اور ان کی گرفتاری کے لئے ایک چھاپا مار پارٹی

اندرون سندھ روانہ کردی گئی تھی۔

یہ خبر پڑھ کر فرخ مزید مطمئن ہوگیا۔ اس دوران میں میمو نے ایسے فون کا انتظام بھی کرلیا تھا جہاں سے وہ پوری رازداری سے سلطان کو فون کرسکتے تھے۔ یہ فون میمو کے ایک دوست کا تھا' جو پرانی کاروں کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ اس کا نام ابوبکر تھا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا اور لارنس روڈ پر واقع ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے میمو کی سفارش پر فرخ کو کرائے دار کی حیثیت سے فلیٹ میں رکھ لیا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں دونوں آزادی کے ساتھ فون استعمال کرسکتے تھے۔

دونوں نے دس دن تک انتظار کیا۔ اس دوران میں عدنان کے اغوا کی خبر پرانی ہوگئی اور کئی دوسری خبریں اوپر آگئی تھیں۔

دسویں روز دن کے گیارہ بجے میمو نے سلطان کے دفتر کا نمبر ملایا اور رابطہ ملنے کے بعد کہا "خانہ برباد' تم کو ہم نے بولا بھی تھا کہ پولیس کے پاس مت جانا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو اپنے بچے سے کوئی پیار نہیں ہے۔"

فرخ نے سلطان کا جواب سننے کے لئے ریسیور کے قریب کان کرلیا تھا۔

"ہم۔۔۔ میرا بیٹا کہاں ہے؟" سلطان کی تیز آواز سنائی دی۔ "تم نے اس کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

"ابھی تک تو ہم نے اس کو پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔" میمو نے سخت لہجے میں کہا "اور ہمارا اس پر بہت خرچہ ہورہا ہے۔ اور ہم زیادہ دنوں تک خرچہ نہیں کرسکتے۔ اب تمہاری کیا مرضی ہے۔ تم کو اس کی ضرورت ہے یا نہیں؟"

"ضرورت کیوں نہیں ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ میرا خون ہے۔"

"پچاس لاکھ تیار ہے؟"

"یہ بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں زیادہ سے زیادہ بیس لاکھ دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ میری حیثیت نہیں ہے۔"

"تو پھر بات ختم سمجھو' بچے کو بھول جاؤ۔"

"ٹھہرو' ٹھہرو۔ تم بتاؤ' کم از کم کتنے پیسوں میں کام چل جائے گا؟"

"آخری بات بولتا ہوں۔ نہ کرو گے تو فون بند کردوں گا۔ کم از کم پینتیس لاکھ ہوں گے۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ میں رقم دینے کو تیار ہوں۔ کل تک پیسوں کا انتظام ہوجائے گا۔ رقم کہاں وصول کرو گے؟"

"اس بات کا جواب میں تمہیں کل دو بجے دوں گا۔ رقم ایک مضبوط قسم کے تھیلے میں ڈال کر رکھنا۔ کل دو بجے میں تمہیں اسی نمبر پر فون کرکے بتاؤں گا کہ رقم کہاں پہنچانی ہے۔ فون وصول کرنے کے بیس منٹ کے اندر رقم مقررہ جگہ پر پہنچ جانی چاہئے۔ جب تم دفتر سے روانہ ہوگے تو ہمارا ایک آدمی تمہارے پیچھے ہوگا۔ اگر تم نے پولیس کو اطلاع دی تو ہم رقم وصول نہیں کریں گے۔ اور پھر تم اپنے بیٹے کی شکل بھی نہیں دیکھ سکو گے۔"

"فکر نہیں کرو' میں کسی کو اطلاع نہیں دوں گا۔ میرا بیٹا کب تک گھر پہنچ جائے گا؟"

"ہم عدنان کو رقم وصول کرنے کے چار گھنٹے بعد تمہارے بنگلے کے پاس چھوڑ جائیں گے۔ خدا حافظ۔"

فون بند کرنے کے بعد میمو نے فرخ کی طرف دیکھا۔ بولا۔ "سارا کام ٹھیک ٹھاک ہورہا ہے۔ چوبیس گھنٹے کی بات اور ہے۔"

"ایک بات ٹھیک نہیں ہے۔" فرخ نے کہا "بچے کا وعدے کے مطابق گھر جانا ضروری ہے۔ اگر بعد میں بچہ شاہدہ کے پاس سے برآمد ہوگیا (جس کا سو فیصد امکان ہے) تو پولیس اس پر دباؤ ڈال کر ساری بات معلوم کرلے گی۔"

"پھر کیا کرنا چاہئے؟"

"اس فون سے ڈائریکٹ ڈائلنگ ہوسکتی ہے؟" فرخ نے شاہدہ کا بہاول نگر والا فون نمبر نکالتے ہوئے پوچھا۔

"ہو تو سکتی ہے' لیکن بل بہت آجائے گا۔"

"اس مہینے کا بل ہم ادا کریں گے۔" فرخ نے کہا اور شاہدہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پانچ منٹ تک کوشش کرنے کے بعد نمبر مل گیا اور دوسری طرف سے کسی بچے کی آواز سنائی دی۔

"میں کراچی سے بول رہا ہوں۔" فرخ نے قدرے اونچی آواز سے کہا "میرا نام فرخ ہے۔ کسی بڑے کو فون دو۔"

چند لمحوں کے بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "فرخ؟ میں شاہدہ بول رہی ہوں۔ کیا خبر ہے؟"

"ساری بات طے ہوگئی ہے۔" فرخ نے غیر واضح انداز میں بات کرتے ہوئے کہا "پیسے کل دو بجے تک مل جائیں گے۔ تم بچے سمیت فوراً کراچی پہنچو۔ بچے کا واپس جانا ضروری ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ بات چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ پولیس تم پر دباؤ ڈال کر ساری بات معلوم کرلے گی۔"

"کتنے پیسوں میں بات ہوئی ہے؟"

"پینتیس۔۔۔"

"ٹھیک ہے' میں کل دوپہر تک کراچی پہنچ جاؤں گی۔ کراچی ایکسپریس کے ذریعے آؤں گی۔ ریلوے انکوائری سے ٹرین کا وقت پوچھ کر رنگین شیشوں والی کار میں کینٹ اسٹیشن پر پہنچ جانا۔ بچے کو چھپا کر لانا بہت ضروری ہے۔ اور۔۔۔ حصے کے بارے میں یاد ہے نا؟ میرا آدھا حصہ ہے۔"

"ہاں' یاد ہے۔ تمہیں ایمانداری سے حصہ مل جائے گا۔" فرخ نے کہا اور خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کردیا۔

O——□——O

سلطان کو اپنے بیٹے کی سلامتی زیادہ عزیز تھی۔ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینے پر تیار نہیں تھا۔ اس کے کروڑپتی باپ کے لئے

پینتیس لاکھ روپے معمولی رقم تھی۔ وہ اغوا کنندہ کی ہدایت کے مطابق رقم کے ساتھ فون کا انتظار کر رہا تھا۔

دو بج کر پانچ منٹ پر اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو دوسری طرف سے اغوا کنندہ کی آواز سنائی دی۔ "رقم تیار ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں' تیار ہے۔"

"اپنے دفتر سے باہر نکلو۔ سیڑھیوں کے ذریعے نیچے پہنچو اور سڑک پار کر کے کنارے پر کھڑی کاروں پر نظر ڈالو۔ ان کاروں میں تمہیں سرمئی رنگ کی ایک شیراڈ نظر آئے گی۔ اس کا نمبر صفر تین پانچ دو ہے۔ اس کی اگلی سیٹ کا شیشہ کھلا ہوا ہے۔ رقم کا تھیلا کھڑکی سے سیٹ کے نیچے رکھ کر واپس چلے جانا۔ ہمارا آدمی آس پاس ہی موجود ہے۔ تمہارے جانے کے بعد وہ رقم وصول کر لے گا۔ یہ کام صرف تین منٹ کے اندر ہونا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے' ایسا ہی ہو گا۔" سلطان نے کہا اور فون بند کر کے رقم کا تھیلا اٹھا لیا۔ اس کا دفتر تیسری منزل پر تھا۔ وہ دو منٹ میں نیچے پہنچا اور سڑک کی دوسری جانب کھڑی کاروں پر نظر ڈالی۔ سرمئی رنگ کی شیراڈ دائیں طرف کھڑی تھی۔ اس کا سامنے والا حصہ باہر کی طرف تھا۔ آس پاس بے شمار لوگ چل پھر رہے تھے۔ کچھ قریبی بک اسٹال اور پان کی دکان پر کھڑے تھے۔ اتنے لوگوں میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ گاڑی کا ڈرائیور کون تھا۔

سلطان نے تھیلا سیٹ کے نیچے رکھ دیا' سڑک پار کر کے واپس عمارت میں داخل ہوا اور سیڑھیوں میں قدم رکھتے ہی رفتار تیز کر دی۔ پہلی منزل پر پہنچ کر اُس نے اوٹ میں رہتے ہوئے بالکونی سے نیچے دیکھا۔ اس وقت سرمئی شیراڈ حرکت میں آچکی تھی۔ ڈرائیور نے اپنا چہرہ ٹوپی اور مفلر میں چھپا رکھا تھا۔ تاہم اس کے ڈیل ڈول سے سلطان کو شک ہوا کہ وہ فرخ تھا۔

O———□———O

شاہدہ نے عدنان کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس نے گھر جا کر کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا۔

اگلی صبح اس نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور عدنان کو اس کے اسکول سے کچھ فاصلے پر اتار کر واپس چلی گئی۔

اسکول کے بچوں نے جب عدنان کو دیکھا تو وہاں ایک شور سا مچ گیا۔ پرنسپل نے عدنان کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور فوراً سلطان کے بنگلے پر فون کر دیا۔ عدنان سہما ہوا تھا۔ مگر خوفزدہ نہیں تھا۔ اس نے ماں کی ہدایت کے مطابق خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ کسی کے سوال کا جواب نہیں دے رہا تھا۔

نصف گھنٹے کے اندر سلطان اپنی پہلی بیوی کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ عدنان' ماں کی ہدایت کے مطابق "ابو" کہتے ہوئے باپ سے لپٹ گیا۔ سلطان نے اسے پیار کیا اور فوراً کار میں بٹھا کر بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہاں گھر کے تمام افراد اس کے گرد جمع ہو گئے اور مختلف سوالات کرنے لگے۔

عدنان نے ماں کی ہدایت کے مطابق بہت مختصر جواب دیا۔ دو آدمی اسے کار میں بٹھا کر بہت دور لے گئے تھے اور ایک بہت بڑے بنگلے میں رکھا تھا۔ وہ اسے اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیتے تھے اور اس کے ساتھ اچھی باتیں کرتے تھے۔ بنگلے میں ایک عورت بھی تھی۔ بچے نہیں تھے۔

سلطان کا باپ ظہیر خان ایک جہاندیدہ اور ذہین آدمی تھا۔ وہ بڑی باریکی سے اپنے پوتے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عدنان کی یونیفارم دھلی ہوئی اور استری شدہ تھی۔ اس پر کوئی داغ دھبا نہیں تھا۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اور اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ چند روز پہلے اس کی حجامت بھی بنائی گئی تھی۔ جرابیں بھی دھلی ہوئی تھیں۔ جوتے پالش سے چمک رہے تھے اور ناخن بھی کٹے ہوئے تھے۔

ظہیر خان نے یہ بھی نوٹ کیا کہ عدنان کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی اور رنگ روپ بھی نکھر آیا تھا۔ وہ تھوڑا سا گھبرایا ہوا ضرور تھا' مگر خوفزدہ نہیں تھا۔

ظہیر خان نے اسے گود میں بٹھا کر پیار کیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اچانک ایک ایسا سوال کیا' جس کا جواب سن کر سب چونک گئے۔ ظہیر خان یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ بچے کی اتنی زیادہ دیکھ بھال ماں کے سوا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

"بیٹے' یہ بتاؤ تمہاری امی تو خیریت سے ہیں نا؟" اس نے اچانک سوال کیا۔

"امی بالکل ٹھیک ہیں۔" عدنان نے معصومیت سے جواب دیا۔ یہ جواب سن کر ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا۔

ظہیر خان نے عدنان کو گود سے اتار دیا اور سلطان کو دوسرے کمرے میں لے جا کر کہا "مجھے یقین ہے کہ تم ساری بات سمجھ گئے ہو گے۔ یہ سارا ڈراما شاہدہ نے رچایا تھا۔"

"میں ابھی شاہدہ کے پاس جا کر بات کرتا ہوں۔"

"ایسے نہیں' شاہدہ کو کچھ مت بتانا' اسے منا کر خاموشی سے گھر لے آؤ۔ اس سے کہنا کہ عدنان اس کے لئے بہت اداس ہے۔ باقی بات چیت میں کروں گا۔ اسے یہ اندازہ نہیں ہونا چاہئے کہ تمہیں حقیقت معلوم ہو گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے' ڈیڈی۔ میں ابھی اس کے پاس جاتا ہوں۔"

"اکڑ نہ دکھانا۔ اگر ضرورت محسوس کرو تو جھک کر بات کر لینا۔" سلطان نے کار نکالی اور بیس منٹ کے اندر شاہدہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دستک کے جواب میں شاہدہ نے دروازہ کھولا اور شوہر کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ لیکن فوراً ہی سنبھل گئی اور اپنے چہرے پر سوگواری طاری کر لی۔

"عدنان کا کچھ پتا چلا؟" اس نے الیہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں' عدنان مل گیا ہے۔" سلطان نے دھیمی آواز میں کہا۔

"وہ کسی سے بات نہیں کر رہا۔ جب سے گھر پہنچا ہے' روئے جا رہا ہے اور تمہارے پاس جانے کی ضد کر رہا ہے۔"

"تو پھر تم اس کو ساتھ کیوں نہیں لے آئے؟" شاہدہ نے کہا۔ "میں اس کی ماں ہوں۔"

"تم میری بیوی بھی ہو۔ میں تمہیں اس کے پاس لے جانے کے لئے آیا ہوں۔" سلطان اندر داخل ہو گیا اور ساس سسر کو سلام کیا۔

شاہدہ اس وقت فرخ کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے سوچا' اگر فرخ' سلطان کی موجودگی میں اس کے دروازے پر پہنچ گیا تو سارا پول کھل جائے گا۔ پس وہ سلطان کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی۔ جانے سے پہلے اس نے اپنی ماں کو ایک طرف لے جا کر کہا کہ فرخ سے پیسے لے کر رکھ لے اور سلطان کا ذکر نہ کرے۔ پھر وہ تیار ہو کر سلطان کے ساتھ کار میں جا بیٹھی۔ ایک خیال اس کے دل میں یہ بھی تھا کہ کہیں عدنان کے منہ سے سچ نہ نکل جائے۔ وہ قریب رہ کر اس کی نگرانی کر سکتی تھی۔

جب ان کی کار گلی سے نکل کر مین روڈ پر پہنچی تو مزارِ قائد کی طرف سے فرخ اپنی کار میں ادھر آ رہا تھا۔ اس نے دوری سے دونوں کو پہچان لیا اور کار کی رفتار کم کر دی۔ چونکہ سلطان سوسائٹی کی طرف مڑ رہا تھا اس لئے اس نے فرخ کو نہیں دیکھا۔

فرخ سوسائٹی اپارٹمنٹ بلڈنگ والی چورنگی تک ان کے پیچھے رہا' پھر چورنگی کے اوپر سے گھوم کر واپس چلا گیا۔ شاہدہ اور سلطان کو ایک ساتھ دیکھ کر اس کے دل میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔

O———☐———O

ظہیر خان بہو اور بیٹے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ جب وہ بنگلے میں پہنچے تو وہ دونوں کو الگ کمرے میں لے گیا۔ شاہدہ نے اس کے تیور دیکھے تو سخت گھبرا گئی۔

"بیٹھو۔" ظہیر خان نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

شاہدہ نے شوہر کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ سلطان بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"جی' یہ سب کیا ہے؟" شاہدہ نے گھبرا کر کہا "مجھے مجرموں کی طرح یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"بی بی' بات یہ ہے کہ تم نے میرے شادی شدہ بیٹے کے ساتھ چھپ کر شادی کی تھی۔ اس کے باوجود میں نے تمہیں اپنی بہو تسلیم کر لیا۔" ظہیر خان نے بات شروع کرتے ہوئے کہا "اس زمانے میں میرا یہ بیٹا آوارگی اور جرائم میں پھنسا ہوا تھا اور میں اس کی وجہ سے بہت پریشان تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنی بری عادتوں سے توبہ کر لی اور کاروبار میں میرا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ پھر تم دونوں میں جھگڑا ہوا اور تم مجھے بتائے بغیر گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ حالانکہ اگر تم میرے پاس شکایت لے کر آ جاتیں تو میں اس سے زیادہ تمہاری حمایت کرتا۔ میرا یہ بیٹا جرائم میں ملوث رہا' مگر اس نے کبھی کسی کے معصوم بچے کو اغوا نہیں کیا۔ کیوں کہ ہم اعلیٰ اور معزز حسب نسب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر تم......" اس نے سخت نظروں سے شاہدہ کو گھورا..... "بدمعاشوں کے ساتھ مل کر اپنے ہی بیٹے کو اغوا کر لیا۔"

"جی..... یہ..... یہ غلط ہے۔"

"اگر ہمارے خاندان کی لڑکی یہ حرکت کرتی تو ہم اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیتے۔" ظہیر خان نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "مگر تمہارے ساتھ میں تھوڑی سی رعایت کروں گا۔ تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ اول یہ کہ اپنے ساتھیوں کے نام پتے بتا دو اور طلاق لے کر گھر چلی جاؤ۔ عدنان ہمارے پاس رہے گا۔ تمہیں اس کی شکل دیکھنے کی اجازت بھی نہیں ہو گی۔"

"آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ عدنان میرا بیٹا ہے۔"

"وہ خود بھی تمہاری شکل دیکھنے کا روادار نہیں ہو گا۔ ہم اسے ہر موقعے پر اغوا اور تاوان کی کہانی سناتے رہیں گے۔ جیسے جیسے اس کے اندر شعور پیدا ہو گا اسے تم سے نفرت ہوتی چلی جائے گی۔"

"نہیں..... یہ غلط ہے۔" شاہدہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "میں اپنے بیٹے کو ایسی کہانی نہیں سننے دوں گی۔"

"دوسرا راستہ یہ ہے کہ اگر تم اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتاؤ گی تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا اور تمہیں پتا ہی ہے کہ پولیس مجرموں سے اقرارِ جرم کروانے کے طریقے خوب جانتی ہے۔"

"نہیں..... پلیز..... مجھے معاف کر دیں۔ م..... میں تاوان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

ظہیر خان اٹھتے ہوئے بولا "میں تمہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" وہ اپنے بیٹے کی طرف مڑا۔ "سلطان' چوکیدار سے کہہ دو کہ شاہدہ بی بی بنگلے سے باہر نہیں جائے گی۔"

بات ختم کرتے ہی وہ کمرے سے نکل گیا۔

"سلطان' پلیز..... میری بات سنو۔"

سلطان نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور سر جھٹک کر کمرے سے نکل گیا۔

O———☐———O

فرخ اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں فکر مند بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شاہدہ نے اتنی جلدی سلطان سے صلح کیسے کر لی تھی۔ تقریباً ڈھائی بجے اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا۔

"فرخ؟" دوسری طرف سے شاہدہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "م..... میں شاہدہ بول رہی ہوں۔ سلطان کو سب کچھ پتا چل

گیا ہے۔ اس نے مجھے دھوکے سے یہاں بنگلے میں لا کر بند کر دیا ہے اور ساری بات بتانے کے لئے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی ہے۔ میں زیادہ دیر تک منہ بند نہیں رکھ سکوں گی۔ تم اپنا کوئی انتظام کر لو۔ اب مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ تو تم نے بہت بری خبر سنائی ہے۔"

"شاید کوئی آرہا ہے۔ خدا حافظ۔"

رابطہ منقطع ہو گیا۔ فرخ ریسیور کو گھورنے لگا۔ اس کا سر چکرانا شروع ہو گیا تھا۔ اغوا برائے تاوان کی سزا موت تھی۔ جیل کال کوٹھری' پھانسی کا پھندا' ذلت کی موت!

عجیب بات ہے۔ وہ بڑبڑایا۔ پہلے میں شوہر کے چکر میں آیا تھا۔ اس دفعہ بیوی کے چکر میں آگیا۔

اس نے نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا اٹھایا اور نیچے جا کر کرائے کی کار میں جا بیٹھا۔ میو اپنے حصے کی رقم لے جا چکا تھا اور پتا نہیں کہاں جشن منا رہا تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد فرخ نے اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی ماں اور بہنیں اسے دیکھ کر بری طرح چونک گئیں۔ انہیں اس کے چہرے کے تاثرات بہت خوفناک محسوس ہوئے۔

فرخ نے نوٹوں کا تھیلا ماں کے قدموں میں پھینکتے ہوئے کہا۔ "امی' آپ نے کہا تھا۔ فرخ بیٹے نے بی اے پاس کر لیا ہے۔ اب ہمیں کرائے کے مکان سے نجات مل جائے گی اور بیٹیوں کی شادیاں بھی دھوم دھام سے ہوں گی۔ آپ کے ان چند الفاظ نے مجھ پر اتنا بڑا بوجھ ڈال دیا..... اتنا بڑا بوجھ ڈال دیا کہ میں شریفانہ طریقے سے اسے ساری زندگی اپنے کندھوں سے نہیں اتار سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے ہر اس طریقے کو جائز سمجھا' جس سے ایک ماں کی خواہش پوری ہو سکتی تھی۔ میں اپنی کوئی خواہش پوری کرنے کے لئے ڈاکو نہیں بنا تھا۔ ماں کی خواہشات پوری کرنے کے لئے ڈاکو بنا تھا۔ جب میں ناکام ہو گیا تو ماں نے میری شکل دیکھنے سے انکار کر دیا۔ اب..... " وہ ایک قدم آگے بڑھا "اچھی طرح میری شکل دیکھ لیں۔ شاید آپ کو دوبارہ میری شکل دیکھنا نصیب نہ ہو۔" وہ واپس مڑا اور دروازے میں رکتے ہوئے بولا "اس تھیلے میں آپ کی خواہشات پوری کرنے کا سامان موجود ہے۔ اسے سنبھال کر رکھ لیں۔ اور آج ہی بلکہ ابھی یہ گھر چھوڑ کر کہیں دور چلی جائیں۔"

"بھیا..... رک جاؤ۔" عذرا نے کہا۔

"بیٹا' ذرا ٹھہرو۔" ماں نے کہا۔

لیکن فرخ ٹھہرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ واپس فلیٹ پر گیا۔ ریوالور چیک کر کے جیب میں رکھا اور سلطان کے دفتر پہنچ گیا۔ اس وقت مرتضیٰ بھی سلطان کے کمرے میں موجود تھا۔ سلطان نے اسے مشورے کے لئے بلایا۔

فرخ خوبرو سیکریٹری کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے سلطان کے کمرے میں گھسا اور اندر قدم رکھتے ہی ریوالور نکال لیا۔

"ہوں..... بہت خوب!" اس نے ریوالور دائیں بائیں لہرایا۔ "دونوں کتے ایک ہی جگہ موجود ہیں۔"

"رک جاؤ....." سلطان نے میز پر موجود تمام گھنٹیاں بجانا شروع کر دیں۔

"میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ مایوس آدمی بہت خطرناک ہوتا ہے۔" فرخ نے کہا تبھی مرتضیٰ کا ہاتھ اندرونی جیب کی طرف بڑھتے دیکھا۔ غالباً وہ پستول نکالنا چاہتا تھا۔ فرخ نے اس کے سینے کا نشانہ لے کر دو فائر کئے اور تیزی سے سلطان کی طرف مڑا' جو بجلی دراز کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "مرنے سے پہلے یہ بھی سن لو کہ جلال اور خاطر خان کو میں نے قتل کیا تھا۔"

"بات سنو' میں تمہارا حصہ....." سلطان نے کہنا چاہا۔

"میں نے کہا بھی تھا کہ میں تمہیں سرِ عام قتل کر دوں گا۔" فرخ نے کہا اور قریب سے اس کے سر میں ایک فائر کیا۔ پھر اس نے آسودہ نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا۔ مرتضیٰ کا خون اس کے لباس کو تر کر رہا تھا اور سلطان ..... کا خون اس کی کشادہ میز پر پھیل رہا تھا' کیوں کہ گولی کھانے کے بعد اس کا سر میز پر لڑھک گیا تھا۔

ہال کمرے میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

فرخ باہر نکلا تو گن مین کو راکفل تانے دیکھا۔

"ہاتھ اوپر کر لو۔" گن مین نے چیخ کر کہا "ریوالور نیچے پھینک دو۔ نہیں تو گولی مار دوں گا۔"

فرخ نے ریوالور اپنی کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا "مارو گولی۔"

اتنے میں ایک اور گن مین اوپر پہنچ گیا۔ اسٹاف کے لوگ اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کچھ میزوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ عورتیں چیخیں مار رہی تھیں۔

فرخ رک گیا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا "سنو" ان دونوں نے سات سال پہلے بینک میں ڈاکا ڈالا تھا۔ ستر لاکھ روپے ان کے حصے میں آئے تھے۔ میرے حصے میں سات سال کے لئے جیل کی کوٹھری تھی۔ میں نے ان سے بدلہ لے لیا۔ اب مجھے کوئی جیل میں بند نہیں کر سکے گا۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے ٹریگر دبا دیا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سر سے گرم گرم خون بہنے لگا۔

قارئین کرام: گزشتہ ماہ شاد صاحب کی کہانی زہرناز کے اختتام پر ایک غلط فہمی کی وجہ سے "انگریزی سے ماخوذ" کے الفاظ چھپ گئے۔ جب کہ درحقیقت وہ کہانی طبع زاد اور شاد صاحب کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا شاہکار تھی۔ ادارہ اس سہو پر شاد صاحب اور اُن کے پرستاروں سے معذرت خواہ ہے۔

جبران صدیل

گولیاں جب چلتی ہیں تو نفرت و دشمنی کی کبھی نہ بجھنے والی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور یہ آگ مال و اسباب ہی کو نہیں، انسانی جانوں کو بھی چاٹ جاتی ہے. وہ دونوں غیور پٹھان بھی ایسی ہی آگ کی لپیٹ میں آگئے تھے. برسوں سے اُن کے درمیان انتقام کے شعلے رقصاں تھے. گولیوں کی بوچھار سے بھڑکائی ہوئی اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بھی ایک گولی ہی کی ضرورت تھی اور یہ آخری گولی دونوں حریفوں میں سے کسی ایک کو چلانا تھی

نفرت کے شعلوں سے نمو پانے والے محبت کے پھولوں کا قصہ کہنہ روایات کے بند منوں میں بندھی کہانی

خان آدم خان کو اس بار بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس بار بھی اس کی رائفل سے نکلی ہوئی گولیوں نے دشمن کا سینہ چھلنی کرنے کے بجائے پہاڑوں سے اپنا سر ٹکرایا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے پہلے ہی دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے آیا تھا لیکن اس کی حالت ایسی ہی تھی جیسے وہ سیکڑوں کلومیٹر پیدل چل کر آیا ہو۔ کل جب سرِشام اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے دشمنوں نے صوابی سے صرف دس کلومیٹر کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالا ہے تو وہ چارپائی پر اچھل پڑا۔ اس اطلاع نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو جیسے سلب کر دیا تھا۔ اس نے فوراً ہی دشمنوں پر ٹوٹ پڑنے کا فیصلہ کیا۔ "ہم ابھی چلتے ہیں' یہاں سے شمال میں صرف دس کلومیٹر دور ہیں وہ لوگ۔ میری جیپ فوراً تیار کرو۔ رائفلیں اور کارتوس......"

"لیکن بابا' ہمارے ساتھ اس وقت آدمی کہاں ہیں؟ صرف چار آدمی ہیں گھر میں۔ معلوم نہیں ہمارے دشمن کے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔ صرف چار آدمیوں کے ساتھ اس طرف جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں جو قدم بھی اٹھانا ہے' سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔"

"تم تو پڑھ لکھ کر بزدل ہوگئے ہو سخاوت خان!" آدم خان نے کہا "تم یہ بھول جاتے ہو کہ تم ایک خان کے بیٹے ہو۔ ایک بہادر خان ہزاروں پر بھاری ہوتا ہے۔"

"میں بزدل نہیں ہوں بابا' مجھے فخر ہے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں' خان آدم خان کا' لیکن بہادری کا مطلب یہ بھی تو نہیں ہوتا بابا کہ اپنی بہادری ثابت کرنے کے لئے آگ میں چھلانگ لگا دی جائے۔"

"ہاں' ہم آگ میں چھلانگ لگانے جا رہے ہیں۔ اگر تم آگ میں چھلانگ لگانے کے لئے تیار نہیں ہو تو گھر میں بیٹھو' ہم لوگ جا رہے ہیں۔" آدم خان کے لہجے میں طنز بھی تھا اور حقارت بھی!

"تم دیکھنا ہم لوگ ابھی ان کا صفایا کرکے آتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بابا' چلیں۔" سخاوت خان نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "یوں بھی میں آپ کی مرضی اور اصولوں پر قربان ہونے کے لئے ہی پیدا ہوا ہوں۔"

آدم خان نے اپنے بیٹے کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کے چہرے پر دل کی بات تلاش کر رہا ہو۔ پھر چند لمحے بعد بغیر کچھ کہے گھر سے نکل کر جیپ میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی چار آدمیوں پر مشتمل قافلہ صوابی کے شمال میں روانہ ہوگیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی شخص بیٹھا تھا جس نے خان کو دشمنوں کے پڑاؤ کی خبر دی تھی۔ اپنے اس مخبر پر خان کو اندھا اعتماد تھا۔ اس کے بجائے کوئی اور اطلاع دیتا تو وہ فوراً ہی حرکت میں نہ آتا۔ اس کا ذہن اس اطلاع کے دس پندرہ فی صد غلط ہونے والے نکتے پر بھی غور کرتا اور اسی حساب سے حملے کا پروگرام بناتا۔ لیکن مخبری جب صد فی صد درست ہونے کا امکان ہو تو پھر وقت ضائع کرنا دانشمندی نہیں تھی۔

ساڑھے تین چار گھنٹے بعد یہ چار نفری قافلہ واپس آگیا تھا۔

"اطلاع تو بالکل ٹھیک تھی' بس وہاں تک ہمیں پہنچنے میں تھوڑی دیر ہوگئی۔" آدم خان نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے کہا "اگر ہم وقت پر پہنچتے تو انہیں بھون کر رکھ دیتے۔ خیر کوئی بات نہیں' اس بار وہ میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جائیں گے۔ ہیں وہ اسی علاقے میں۔"

"ناظم خان نے بے ضرورت فائر کھول دیا تھا۔" سخاوت خان نے کہا "میرا تو خیال ہے وہ فائرنگ کی وجہ سے ہی روپوش ہوگئے۔ یوں بھی جب تک دشمن نظر نہ آئے اس پر فائر کرنا بے وقوفی کی علامت ہے۔ اگر ناظم خان فائرنگ نہیں کرتا تو ممکن ہے ان لوگوں سے ہمارا آمنا سامنا ہو جاتا۔"

"فراز خان بزدل ہے۔ اس نے ہمارے کسی آدمی کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا' جب بھی وار کیا چھپ کر کیا۔" آدم خان نے ناخوشگوار لہجے میں کہا "گزشتہ دس سال میں اس نے ہمارے بائیس

آدمیوں کو ہلاک کیا لیکن بائیس میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی اس کا مقابلہ نہیں ہوا۔ اس نے جب وار کیا تنہا آدمی پر کیا اور چھپ کر کیا۔"

"کوئی ضروری تو نہیں بابا کہ بائیس آدمیوں کو فراز خان یا اس کے آدمیوں ہی نے مارا ہو۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ ان میں سے کئی آدمی تو نامعلوم دشمنوں کی گولیوں سے مرے ہیں۔ کئی ایک کے سلسلے میں تو آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ پولیس سے مفرور تھے۔ پولیس مقابلے میں بھی زخمی ہو سکتے تھے اور پھر جنگل میں ان کی لاشیں ملی ہیں۔ تاجدار خان اور اس کے دو بھائیوں کو پہاڑوں کے درمیان ڈاکوؤں نے گولیاں ماردی تھیں۔ منصف خان کو اس کے اپنے بھائی نے گولی ماری تھی' یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔ اگر وہ قتل کا الزام فراز خان پر نہیں لگاتا تو آج جیل میں ہوتا۔"

"کچھ بھی ہے' میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ جیسے فراز خان نے ہمارے خاندان کے تین آدمیوں کو قتل کیا تھا' ایسے اس نے ہمارے قبیلے کے انیس آدمیوں کو بھی قتل کیا۔ اب وہ اس چکر میں ہے کہ تمہیں اور مجھے ختم کردے' لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہیں ہوگی۔ میں بہت جلد اس کے سینے میں گولی اتار دوں گا۔ میرے آدمی اس کی تاک میں ہیں۔ چونکہ اسے میں اپنی ہی گولی کا نشانہ بنانا چاہتا ہوں اس لئے میرے آدمی اس وقت اس پر وار نہیں کرتے جب وہ نظر آتا ہے۔ وہ مجھے اطلاع دینے آتے ہیں اور وہ میرے پہنچنے سے قبل ہی فرار ہو جاتا ہے۔ آج بھی یہی ہوا۔ میرے مخبر نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اسے آسانی سے ٹھکانے لگا دیتا' لیکن وہ مجھے خبر دینے چلا آیا اور فراز خان نکل گیا۔"

"بابا' یہ بھی عجیب بات ہے۔ فراز خان ہمیں دیکھ کر روپوش یا فرار ہو گیا تھا اور ہم لوگ چاروں سمتوں میں اس خیال سے کہ وہ ہمارا گھیراؤ کر رہا ہے' فائرنگ کر رہے تھے۔ دو تین سو کارتوس ہم نے ضائع کردیے اور علاقے میں بھی ہراس پھیلا دیا۔"

"اس کے گھیراؤ کرنے کا امکان موجود تھا۔" آدم خان نے سرگوشیانہ انداز میں کہا "چھپ کر حملہ کرنے والا دشمن چھپ کر ہی گھیراؤ بھی کرسکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے ہم فائرنگ نہ کرتے تو وہ

ہمیں گھیری لیتا۔"

"میں آپ سے بحث تو نہیں کرتا بابا' لیکن اب اس سلسلے کو ختم ہونا چاہئے۔"

"کیوں؟ ختم کیوں ہونا چاہئے؟"

"میرا خیال ہے انسان کی جان بہت قیمتی ہوتی ہے۔ پھر آپ کے آدمیوں نے فراز خان کے خاندان کے تمام اہم افراد کو ٹھکانے لگا دیا ہے جب کہ انہوں نے بقول آپ کے ہمارے خاندان کے صرف تین افراد کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب شاید میری عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی اور اب میں چوبیس سال کا ہو گیا ہوں۔"

"یہ خاندانی دشمنی ہے چھوٹے خان۔ جب تک خاندان سلامت ہے' دشمنی زندہ رہے گی۔"

"ایک بات بتاؤں بابا؟"

"ہاں بتاؤ' ضرور بتاؤ۔"

"چند سال قبل ایک محفل میں اچانک ہی میری ملاقات فراز خان سے ہوئی تھی۔"

"اور تم نے بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے زندہ جانے دیا' کیوں؟"

"جس بزدلی کا مظاہرہ میں نے کیا تھا بابا' اسی بزدلی کا مظاہرہ فراز خان نے بھی کیا۔" سخاوت خان نے کہا "اس محفل میں مجھے کوئی ایسا موقع نہیں ملا کہ میں اسے گولی کا نشانہ بناتا لیکن اسے کئی ایسے مواقع ملے اور اس کے باوجود ہر بار اس نے مجھے نظر انداز کر دیا اور جب محفل سے رخصت ہونے لگا تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا' اپنے باپ سے کہہ دینا میں اس کا دشمن ہوں' اس کی اولاد کا نہیں جب کہ وہ میری اولاد کا بھی دشمن ہے۔ اس کے آدمیوں نے میرے دو بیٹوں کو قتل کیا۔ میں چاہتا تو تمہیں بہت آسانی سے مار سکتا تھا اور مار سکتا ہوں۔"

"نہیں' وہ تمہیں آسانی سے مار سکتا تو کبھی نہیں چھوڑتا۔"

"کیوں بابا' کیوں؟ وہ تو مجھے آسانی سے ــــ"

"کیا تم بزدل ہو؟ کیا گولی کا جواب گولی سے دینا نہیں جانتے؟"

"میں بزدل نہیں ہوں۔ گولی کا جواب گولی سے دینا بھی جانتا ہوں' لیکن بقول آپ کے فراز خان تو چھپ کر گولی چلاتا ہے۔ انجانی سمت سے آنے والی گولی کا جواب تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ گولی کھا کر مرجانے والا گولی کیسے چلا سکتا ہے؟"

"وہ بہت مکار ہے۔ اس سے ہوشیار رہا کرو۔ میرا خیال ہے تمہارے دل میں اس کے لئے ہمدردی کا ایک گوشہ موجود ہے۔ اگر ہے تو اسے بند کر دو۔" آدم خان نے کہا "تم ایسی جگہ گئے کیوں تھے جہاں وہ بھی موجود تھا؟ آئندہ اسے نظر بھی مت آنا۔ کیا وہ جانتا ہے تم کہاں رہتے ہو؟"

"نہیں' وہ نہیں جانتا' نہ ہی محفل میں اس نے مجھے پہچانا تھا۔ وہ تو ایک جاننے والے نے تعارف کرایا تھا۔"

"یہ بہت برا ہوا۔ بہرحال اب احتیاط رکھو۔" آدم خان نے کہا "اس نے تمہیں یہ تو بتایا ہی ہو گا کہ وہ رہتا کہاں ہے؟"

"نہیں' اس نے نہیں بتایا۔"

"اور تم نے پوچھا بھی نہیں ہو گا۔" آدم خان کے لہجے میں طنز تھا۔ "اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ میں نے خود ہی تمہیں خاندانی معاملات سے دور رکھا' لیکن مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ تم اس قدر دور ہو جاؤ گے۔ اگر عنایت خان یہاں ہوتا تو وہ میری ساری ذمے داریاں خود سنبھال لیتا۔"

"بھائی کا یہاں آنے کا کب تک ارادہ ہے؟" سخاوت خان نے پوچھا۔

"جب تک فراز خان زندہ ہے' میں خود نہیں چاہتا کہ وہ یہاں آجائے۔ پہلے میں فراز خان کو ٹھکانے لگاؤں گا پھر اسے یہاں بلا لوں گا۔"

سخاوت خان جانتا تھا کہ اس کے بڑے بھائی عنایت خان نے ہی فراز خان کے دو بیٹوں کو گولی کا نشانہ بنایا تھا اور پھر ملک سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ پولیس کے خوف سے نہیں گیا تھا' فراز خان کا خوف ہی اسے یہاں سے بھگانے کے لئے کافی تھا۔ پولیس اس پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالتی کیوں کہ نہ فراز خان نے پولیس میں رپورٹ کی تھی اور نہ ہی اس دوہرے قتل کا کوئی گواہ تھا۔ جن لوگوں نے عنایت خان کو گولیاں برساتے دیکھا تھا وہ کبھی بھی اس کے خلاف گواہی نہیں دے سکتے تھے۔ فراز خان ہی نہیں' علاقے کا ہر فرد جانتا تھا کہ عنایت خان نے ہی اس کے بیٹوں کو قتل کیا ہے' لیکن ہر شخص کی زبان پر آدم خان کا لگایا ہوا تالا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو تم؟" آدم خان نے سخاوت خان کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں' عنایت بھائی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرا خیال ہے میں ان سے ملنے جاؤں۔"

"چلے جانا' لیکن ابھی نہیں۔" آدم خان نے پُرخیال انداز میں کہا "میں خود بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میرا خیال ہے اس سال کے آخر تک ہم لوگ جا سکیں گے۔ فراز خان آخری کیل ہے جسے میں نکالنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے انجام کو پہنچے گا تو پھر اس کی نسل ہی ختم ہو جائے گی۔"

"اس کی ایک لڑکی بھی تو تھی؟" سخاوت خان نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں تھی' لیکن فراز خان نے اسے کہیں چھپا دیا یا وہ مر گئی۔" آدم خان نے کہا "بہرحال مجھے لڑکی کی زیادہ فکر نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ بھی ہے تو اس سے فراز خان کی نسل نہیں چلے گی' لیکن کہیں اس کے زندہ ہونے کا سراغ ملا تو اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں

گا۔"

سخاوت خان نے حیرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھا' لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ سوچ رہا تھا' جب فراز خان کی نسل ہی نہیں چلے گی تو پھر اس کی لڑکی کو ٹھکانے لگانے کا فائدہ کیا ہے۔ یوں بھی لڑکی یا عورت کا قتل کسی بہادر کو زیب نہیں دیتا' لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ کے آدمیوں نے فراز خان کی بیوی کے خون سے بھی اپنے ہاتھ رنگے تھے۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد آدم خان نے قدرے تیز آواز میں کہا "فراز خان کی لڑکی کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ اب میں اس کی تلاش پر بھی اپنے آدمی لگا دوں گا۔ تم بھی کوشش کرو کہ وہ کہیں تمہیں مل جائے۔ تم نے فراز خان کو اور اس کی بیوی کو دیکھا ہے۔ وہ لڑکی صورت شکل میں اپنے باپ کی طرح ہوگی یا اپنی ماں کی طرح۔ ان دونوں شباہت کی کوئی بھی لڑکی تمہیں نظر آئے' تم اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا' اور جیسے ہی تمہیں معلوم ہو کہ جس لڑکی کے بارے میں تم چھان بین کر رہے ہو وہ فراز خان کی بیٹی ہے تو اسے ختم کر دو' اگر تم خود کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکو تو پھر مجھے اطلاع دینا۔ میں اسے دوسرے دن کا سورج دیکھنے نہیں دوں گا۔"

"جب جاؤں گا شہر تو اسے ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔" سخاوت خان نے بے دلی سے کہا۔

"کب جانے کا ارادہ ہے؟"

"بس ایک ہفتے بعد چلا جاؤں گا لیکن ــــ"

"لیکن کیا؟"

"آپ بھی اب پشاور چلیں' میں چند روز پشاور میں رہوں گا اور پھر کراچی چلا جاؤں گا۔"

"تم نہیں کہتے تب بھی میں دو دن بعد پشاور جانے ہی والا تھا۔ یہاں یوں بھی اب کوئی کام نہیں رہا۔ کل تک مجھے فراز خان کے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا۔"

"وہ اس علاقے میں کہاں ہے بابا!" سخاوت خان نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ آدم خان نے سنا ہی نہیں۔ سخاوت خان کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ فراز خان صوابی کی طرف آتا بھی کیوں؟ اگر اسے کچھ کرنا تھا تو پھر پشاور ہر طرح سے مناسب جگہ تھی۔ یہاں آدم خان بغیر کسی خوف اور گارڈ کے گھومتا پھرتا تھا جب وہ پشاور سے کہیں باہر جاتا تو پھر اس کے ساتھ چند افراد اس کی حفاظت کے لئے ساتھ چلتے تھے۔

"رات بہت بیت گئی' اب تم بھی جا کر سو جاؤ۔" آدم خان نے کہا۔

"آپ بھی تو لیٹ جائیں۔"

"تم میری فکر مت کرو۔" آدم خان نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جب نیند آنکھوں میں بھر جائے گی' میں لیٹ جاؤں گا۔"

سخاوت خان اپنے بابا کے کمرے سے اٹھ کر اس بیڈ روم میں آیا جو اس کے لئے مخصوص تھا۔ وہ بیڈ پر تو اسی نیت سے لیٹ گیا تھا کہ فوراً ہی سو جائے گا' لیکن لیٹنے کے چند لمحے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اسے ابھی نیند نہیں آئے گی۔ بیڈ پر لیٹتے ہی اس کا ذہن فراز خان اور اس کے افراد خانہ کی طرف چلا گیا تھا۔ فراز خان یوں تو رشتے میں سخاوت خان کا چچا تھا' لیکن اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا' یہی محسوس کیا تھا کہ آدم خان' فراز خان کو بھائی تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ جو سخاوت خان کی سمجھ میں آئی تھی وہ یہ تھی کہ فراز خان کی ماں پٹھان نہیں تھی' اور یہ کہ فراز خان اپنے باپ کی دوسری بیوی کی اولاد تھا۔ ویسے فراز خان نے بھی اس بات کی کوشش نہیں کی تھی کہ اسے قبیلے ہی کا فرد تسلیم کیا جائے۔ فراز خان کے حصے میں اپنے باپ کی طرف سے جو کچھ بھی آیا تھا اس نے نہ صرف اسے محفوظ رکھا تھا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا تھا۔ پھر ایک دن زمین کے ایک ٹکڑے پر جس کا حصول آدم خان کے لئے ممکن نہیں تھا' اس نے نہ ختم ہونے والی دشمنی کی بنیاد رکھ دی۔

آدم خان جو زمین فراز خان سے حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اسے محض اس لئے دینے پر تیار نہیں تھا کہ اس پر ایک طرف اس کا آبائی مکان بھی تھا اور فراز خان اس کی حفاظت پر بہت توجہ دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مکان اور اس کے اطراف واکناف کی زمین اس کے والد کی یاد کو تازہ رکھتی ہے۔ جب فراز خان نے وہ زمین آدم خان کے ہاتھوں فروخت کرنے سے انکار کر دیا تو آدم خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور پھر اس کے اشارے پر ہی کچھ لوگوں نے فراز خان پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں وہ نہ صرف بال بال بچا تھا بلکہ آدم خان کے دو آدمیوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اس ہنگامے کے بعد دلوں میں ایک دوسرے سے انتقام کی آگ جل اٹھی تھی جو آج بھی روز اول ہی کی طرح جل رہی تھی۔

سخاوت خان کی تعلیم و تربیت گاؤں میں نہیں شہر میں ہوئی تھی۔ اس لئے اس کے دل میں انتقام کی آگ کے شعلے نہ ہونے کے برابر تھے۔ لیکن وہ اپنے دل کی بات اپنے بابا سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ دو چار فقرے ایسے کہنے کی کوشش ضرور کرتا تھا جن میں صلح صفائی کی بات پنہاں ہوتی تھی۔ آدم خان کا خیال تھا کہ شہر کے پانی نے اسے قدرے بزدل بنا دیا ہے' حالانکہ سخاوت خان بزدل نہیں تھا۔ وہ سالہا سال چلنے والی دشمنی اور اس کے حتمی اور انسانیت سوز ثمرات بٹورنے کا قائل نہیں تھا۔ فراز خان کے سلسلے میں اس کا خیال تھا کہ زیادتی اس کے بابا کی ہے۔ اس زیادتی کے خلاف فراز خان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ سینہ سپر ہو جائے۔ پھر حقیقی طور پر دیکھا جائے تو نقصان بھی فراز خان ہی کا ہوا تھا۔ آدم خان سے دشمنی کے بعد اس کا گھر اجڑ گیا تھا۔ دو جوان بیٹے اللہ کو

بیارے ہو گئے تھے۔ بیوی مر گئی تھی اور وہ اپنی بیٹی کو لے کر کہیں چلا گیا تھا۔ جس زمین کے لئے جھگڑا کھڑا ہوا تھا' وہ اپنی جگہ پڑی تھی۔ جب فراز خان اور اس کے بیٹے تھے تو زمین پر ساگ کے پھول کھلتے تھے اور اس کی کوکھ سے اجناس کے ڈھیر پیدا ہوتے تھے لیکن فراز خان کے فرار کے بعد سے وہ بانجھ ہو گئی تھی۔ اس زمین کو ملنے والا سارا پانی توم خان کی زمینوں کو سیراب کرنے لگا تھا اور وہ مکان جسے فراز خان کا آبائی مکان ہونے کا فخر حاصل تھا' نہ صرف ویران پڑا تھا بلکہ اس کے بعض حصے منہدم ہو گئے تھے۔

فراز خان سے دشمنی کے آغاز کے چند سال بعد ہی توم خان کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ فراز خان اپنی زمین اور مکان پر اکثر آتا ہے اور اسے ٹھکانے لگانے کے لئے موقع کی تاک میں ہے۔ اس کے بعد تو یہ ہوا کہ جہاں کہیں توم خان کے کسی کارندے یا عزیز کی لاش ملتی' گمان یہی ہوتا کہ اسے فراز خان اور اس کے توسیوں نے قتل کیا ہے۔ اس طرح دس بارہ سال کے اندر بائیس افراد کے قتل کا ذمے دار فراز خان کو قرار دیا گیا تھا۔ بعض مقتول افراد کے خاندان والوں نے توم خان سے مشورہ کئے بغیر تھانوں میں رپورٹیں بھی درج کرائی تھیں اور اس میں بھی قتل کا ذمے دار فراز خان ہی کو قرار دیا گیا تھا۔

جس دن سے فراز خان گاؤں سے فرار ہوا تھا کسی گاؤں والے نے اسے کہیں نہیں دیکھا تھا' جب کہ توم خان کے کارندے اسے کہیں نہ کہیں دیکھ لیتے تھے اور پھر اسے ختم کرنے کا منصوبہ بنایا جاتا' لیکن ہر بار یہی ہوتا تھا کہ وہ بقول توم خان کے کارندوں کے فرار ہو جاتا تھا۔ ان اطلاعات کے سلسلے میں سخاوت خان کا خیال تھا کہ توم خان کے کارندے اپنی نوکریاں برقرار رکھنے' توم خان کا دل جیتنے اور سیر سپاٹے کے لئے جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ یا پھر انہیں ہر مشکوک شخص پر فراز خان ہی کا گمان ہوتا تھا۔ اس نے خود بھی آج اپنے بابا سے جھوٹ بولا تھا کہ اس کی ملاقات فراز خان سے ایک محفل میں ہوئی تھی۔ اپنے بابا سے جھوٹ بولنے کی ضرورت اسے یوں محسوس ہوئی تھی کہ وہ فراز خان سے چلنے والی دشمنی کے اثرات کو کم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا جب بابا یہ سوچے گا کہ اس کے دشمن نے اس کے بیٹے کو موقع ملنے کے باوجود قتل نہیں کیا تو پھر میں کیوں اس کی جان لینے پر تلا ہوا ہوں؟ لیکن اس کی کوشش کے باوجود توم خان کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا۔ وہ دشمن کو بخش دینے والے زاویے سے سوچنے کا عادی ہی نہیں تھا' اس لئے اس نے بیٹے کو محتاط رہنے کی تلقین کی تھی۔

دوسرے دن سخاوت خان صوابی سے پشاور پہنچ گیا تھا۔ پشاور اس کا اپنا شہر تھا' لیکن وہ یہاں صرف سال میں چند ہفتے گزارتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں اس کے دوست احباب نہ ہونے کے برابر تھے' لیکن اس بار اس کا وقت بہت اچھا گزرا تھا۔ کراٹے کلب میں اس کی اچھی پذیرائی ہوئی تھی اور اس نے تین نمائشی مقابلوں میں حصہ لے کر کامیابی بھی حاصل کی تھی۔ کراٹے کلب سے وابستہ چند لڑکے اس کے دوست بن گئے۔ ان لڑکوں ہی کا خیال تھا کہ سخاوت خان مارشل آرٹ میں اپنا ایک روشن مقام پیدا کرے گا۔ اس نے ہی اس کلب کے کرتا دھرتا افراد سے کہا تھا کہ وہ کراچی میں ہونے والے سالانہ نمائشی مقابلوں میں حصہ لینے کی تیاری کریں۔ اس کا مشورہ سننے کے بعد کراٹے کلب کے صدر افضال خان نے کہا تھا۔ "اگر سخاوت' تم مشورہ نہیں دیتے تب بھی ہمارا ارادہ تھا کہ کراچی کے مقابلوں میں حصہ لیں۔ تم نے اس سلسلے میں جو معلومات ہم تک پہنچائی ہیں اس کا علم بہرحال ہمیں نہیں تھا۔ اب ہم لوگ ان معلومات کی روشنی میں تیاریاں کریں گے۔"

"ان مقابلوں میں لاہور' حیدر آباد' پشاور اور کراچی کے لڑکے اور لڑکیاں حصہ لیں گی۔" سخاوت نے کہا تھا "یہ تو اخبارات میں بھی آ چکا ہے کہ یہ نمائشی مقابلے عوام کے سامنے ہوں گے اور ان سے ہونے والی آمدنی معذور افراد کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جائے گی۔ یہی نہیں' ان مقابلوں میں شرکت کرنے والے کلب اپنے اخراجات کا بوجھ خود ہی اٹھائیں گے' اگر آپ اپنے کلب کے دس لڑکوں کو بھی لے جاتے ہیں تو ان پر خاصا خرچ ہو گا۔"

"خرچ کی ہمیں پروا نہیں ہے۔ کلب کے پاس خاصا فنڈ ہے اور پھر اس شہر کے چند صاحب حیثیت افراد ہماری سرپرستی کر رہے ہیں۔ ان افراد میں آپ کے والد کا نام سرفہرست ہے۔"

"اچھا' یہ بات تو میرے علم میں ہی نہیں تھی۔" سخاوت خان نے حیرت سے کہا۔

"عجیب بات ہے۔ کیا خان کو یہ معلوم ہے کہ تم خود مارشل آرٹ۔۔۔۔۔"

"نہیں' بابا بالکل نہیں جانتے کہ میں جوڈو کراٹے کی تربیت حاصل کر رہا ہوں۔" سخاوت خان نے کہا "اس کی وجہ یہ ہے کہ بابا اس فن کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ خود حفاظتی کی تربیت ہتھیار کے سامنے ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔"

"ان کا خیال ایک حساب سے ٹھیک ہی ہے۔" افضال خان نے کہا۔

"ہاں' مگر انسان چوبیس گھنٹے ہتھیار لے کر تو شہروں میں نہیں چلتا۔ شہروں کے حساب سے یہ فن بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مارشل آرٹ کے جاننے والوں میں خود اعتمادی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی تربیت کی بنا پر ہر وقت مقابلے کے لئے تیار رہتا ہے۔"

"آپ ہمارے کلب میں جب تک یہاں ہیں آیا کریں۔" افضال خان نے موضوع بدل دیا۔

"ضرور آیا کروں گا۔"

پشاور آنے کے بعد سخاوت خان کلب گیا تھا۔ افضال خان اور کلب کے دیگر اراکین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ "میری دو

دنوں بعد یہاں سے روانگی ہے۔" ٹھیک سلیک کے بعد سخاوت خان نے کہا "اس بار میں ایک ماہ سے زیادہ ہی رہ گیا۔ حالات ہی کچھ ایسے ہوئے' حالانکہ میں صرف ایک ہفتے کے لئے آیا تھا۔ بس اب آپ لوگوں سے کراچی ہی میں ملاقات ہوگی۔ مقابلوں میں شرکت کے لئے کتنے کھلاڑی آئیں گے؟"

"بہت کم آئے تب بھی دس لڑکے تو ہو ہی جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے' میں اس کلب کے دس لڑکوں کو ٹھہرانے کا انتظام کردوں گا۔" سخاوت خان نے مسکراتے ہوئے کہا "جب بابا اس کلب کی سرپرستی کر رہے ہیں تو پھر۔۔۔"

"ارے نہیں سخاوت' ہم لوگ اپنے طور پر ہی کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے۔"

"اس کی ضرورت کیا ہے! مکان ہے اپنا کراچی میں۔" سخاوت خان نے مسکراتے ہوئے کہا "اتنے بڑے مکان میں میرے ساتھ صرف تین لڑکے رہتے ہیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ ان کا تعلق بھی اندرون سندھ سے ہے۔ کھاتے پیتے گھرانوں کے ہیں۔ اچھی کمپنی رہتی ہے۔ وہ تینوں لڑکے بھی پڑھائی کے بعد مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ہم چاروں ایک ہی کلب کے ممبر بھی ہیں۔"

"سنا ہے کراچی میں لڑکیاں اس فن میں بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔" افضال خان نے کہا۔

"ہاں' تم نے ٹھیک سنا ہے۔ ہمارے کلب میں بھی لڑکیاں بہت ہیں۔ ان لڑکیوں میں چند تو اتنی ماہر ہیں کہ ان کے مقابلے کے لڑکے کلب میں کم ہیں۔"

"تو کیا تمہارے کلب میں لڑکی اور لڑکے کی فائٹ ہوتی ہے؟"

"ہو بھی جاتی ہے۔ یوں بھی لڑکیوں کو تربیت لڑکے ہی دیتے ہیں۔ اب کچھ لڑکیاں تیار ہو گئی ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی لڑکیوں کی تربیت کا فرض سنبھال لے۔"

"اس شہر میں تو ابھی تک لڑکیاں ہمارے کلب کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتی ہیں۔"

"یہ صورت حال زیادہ دنوں تک نہیں رہے گی۔" سخاوت خان نے کہا "معزز خاندانوں کی لڑکیوں تک اس فن کی خوشبو پہنچ گئی ہے۔ پہلے پہلے تو کراچی میں بھی لڑکیاں کلبوں تک آتی نہیں تھیں اور اب یہ صورت ہے کہ بعض کلبوں کو اعلان کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے کلب میں لڑکیوں کو تربیت دینے کا انتظام نہیں ہے۔"

"کاش یہ صورت یہاں بھی پیدا ہو جائے۔"

"مایوس کیوں ہوتے ہو' ایسا ضرور ہوگا۔ آئندہ سال جب میں پشاور آؤں گا تو تمہارے کلب میں لڑکیاں تربیت حاصل کر رہی ہوں گی۔"

"یہاں لڑکیوں میں شوق تو ہے لیکن وہ بس یوگا کی مشقوں سے آگے نہیں بڑھتیں۔ گھروں ہی میں مشقیں کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ شوق بھی ان میں اپنے جسموں کو فٹ رکھنے کے لئے ہے۔ لوگ موٹی اور بھدی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' لڑکیاں یوگا کی مشقیں جسم کو متناسب بنانے اور چست رکھنے کے لئے ہی کرتی ہیں۔"

"آپ کے گھر ٹیلی فون تو ہوگا خان؟" افضال خان نے پوچھا۔

"ہاں' ہے کیوں نہیں۔" سخاوت خان نے کہا اور پھر اپنا پتا اور فون نمبر لکھوا دیا۔ کلب سے واپسی کے بعد سخاوت خان نے واپسی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس نے دو دنوں تک اپنے بابا کا انتظار کیا تھا' لیکن جب وہ نہیں آئے تو اس نے ان سے فون پر بات کرنے کی ٹھان کر پشاور چھوڑ دیا تھا۔

جس دن سخاوت خان کراچی پہنچا تھا' اسی شام کو وہ اسٹار کراٹے کلب پہنچا تھا۔ کلب کے ماحول میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ صرف دو لڑکیوں اور پانچ لڑکوں کا اضافہ ہوا تھا۔ یہ ساتوں بھی تربیت کے ابتدائی مراحل میں تھے' اس لئے سخاوت خان نے ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس کی نگاہیں نوشین اور عالم نواز کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب اسے وہ دونوں کہیں نظر نہیں آئے تو اس نے ایک لڑکے اقبال سے پوچھا "کیا نوشین آج کلب نہیں آئی؟"

"نوشین!" اقبال نے کہا "اسے تو شاید میں نے تین دن سے نہیں دیکھا۔"

"اور عالم نواز؟"

"وہ تو ابھی یہیں تھے۔" اقبال نے کہا "شاید گیٹ پر دفتر میں ہوں۔"

اقبال کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ دس منٹ بعد سخاوت خان نے عالم نواز کو دفتر کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے خان تم آگئے!" عالم نواز نے سخاوت خان کے قریب پہنچتے ہی کہا "تمہارا انتظار عید کے چاند کی طرح ہو رہا تھا۔"

"کیوں بھئی' ایسی کیا خاص بات ہے؟" سخاوت خان نے دھیمی آواز میں کہا "مجھے تو ہر حال میں آنا تھا یہاں۔"

"ابھی میں تمہارا نام دفتر میں لکھوا کر آرہا ہوں۔ تمہاری غیر موجودگی میں وہ لوگ تمہارا نام لکھنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ لیکن جب میں نے بہت زور دیا تو انہوں نے لکھ تو لیا لیکن ان کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ ممکن ہے مجھے بتائے بغیر وہ کسی اور کا نام تمہاری جگہ پر لکھ دیں۔"

"نام کس سلسلے میں لکھوایا تم نے میرا؟"

"مقابلوں میں شرکت کے لئے۔" عالم نواز نے مسکراتے ہوئے کہا "مقابلوں میں اگر تم ساتھ نہیں ہو گے تو مزہ ہی نہیں آئے گا۔ اب آؤ میرے ساتھ' مل کر اطلاع دو کہ تم آگئے ہو۔"

"ارے یار مقابلوں میں ابھی بہت وقت ہے۔ لکھوا دیں گے جلدی کیا ہے۔"

"تم بات ہی نہیں سمجھ رہے ہو۔ آج جو فہرست بن رہی ہے وہ آخری ہے۔ آج کے بعد کسی کا نام بھی فہرست میں شامل نہیں کیا جائے گا۔"

"اپنے کلب کے کتنے لڑکے حصہ لے رہے ہیں مقابلوں میں؟"

"سات لڑکے اور تین لڑکیاں!"

"لڑکیوں میں نوشین کا نام موجود ہے کہ نہیں؟"

"نوشین کا نام سرفہرست ہے۔ وہ غیر معمولی لڑکی ہے یار' اگر اس کا نام شامل نہیں ہوتا تو میں کلب کی انتظامیہ سے لڑ جاتا۔"

"تم نہیں لڑتے تو میں ضرور لڑتا۔" سخاوت خان نے زیر لب کہا "سنا ہے وہ تین دنوں سے آئی نہیں۔"

"تشویش کی بات نہیں ہے۔" عالم نواز نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "تم کیوں پریشان ہو رہے ہو! وہ کل ضرور آئے گی۔ اس کے پروگرام کا مجھے علم ہے۔"

"اچھا تو اس نے تمہیں بتا دیا تھا کہ وہ تین دنوں تک کلب نہیں آئے گی۔"

"کلب ہی نہیں' یونیورسٹی بھی۔" عالم نواز نے کہا "کہہ رہی تھی کچھ گھریلو قسم کے کام ہیں' اس لئے وہ یونیورسٹی بھی نہیں جائے گی۔"

"گھریلو کاموں میں اس نے کب سے دلچسپی لینی شروع کر دی ہے؟ وہ تو بالکل مردانہ قسم کی لڑکی ہے۔"

"کل وہ آئے گی تو تم خود پوچھ لینا۔ اس انداز کا سوال تو میں خود نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اس کے اختیارات تمہارے پاس ہیں۔" عالم نواز نے خوشگوار لہجے میں کہا "اور سناؤ کیا بات ہے اس دفعہ تم نے گھر پر زیادہ دن لگا دیے؟"

"کوئی خاص بات نہیں' بس بابا نے الجھا دیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ گفتگو بعد میں کریں گے' پہلے تم میرے ساتھ دفتر چلو تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ تم آ گئے ہو۔"

"کیا مجھے نوشین کے بارے میں بھی بات کرنی پڑے گی؟"

"یوں تو اس کی ضرورت نہیں' وہ کل خود آ جائے گی۔" عالم نواز نے کہا "لیکن تم اپنا وزن ڈالنا ہی چاہتے ہو تو کر لو بات' حرج ہی کیا ہے! آج کل تو تمہارے اور نوشین کے چکر کا علم کلب میں شاید سب ہی کو ہو گیا ہے۔"

"کیسا چکر یار' کسی کو پسند کرنا کوئی بری بات تو نہیں ہے۔" سخاوت خان نے سنجیدہ لہجے میں کہا "اور میں نوشین کو پسند کرتا ہوں۔"

"پسند تو نوشین کو میں بھی کرتا ہوں' لیکن تمہاری اور میری پسند میں بہت فرق ہے۔" عالم نواز نے کہا "نوشین تمہیں بھی شاید بہت زیادہ پسند کرتی ہے۔ تمہارے جاتے ہی وہ اداس سی ہو گئی تھی' میرا خیال ہے اس کے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی تمہیں دیکھ کر ہی دور ہو گی۔"

"میں اس کے گھر جانا مناسب نہیں سمجھتا' ورنہ دل تو بہت کرتا ہے کہ اسے جا کر اپنی آمد کی اطلاع دے دوں۔"

"کبھی گئے ہو اس کے گھر؟"

"گھر تک تو گیا ہوں' اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ حالانکہ میں نوشین کے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ اشاروں کنایوں میں اپنی خواہش کا اظہار بھی میں نے اکثر کیا ہے' لیکن وہ ٹال گئی۔ پھر میں نے زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔"

"تم اظہار عشق کی منزل سے ابھی گزرے ہو کہ نہیں؟"

"زبان سے تو میں نے ابھی تک نہیں کہا۔ لیکن نوشین ذہین لڑکی ہے۔ وہ یقیناً سمجھ گئی ہو گی کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"

"اگر وہ سمجھ گئی ہے تو پھر اسے بھی تو کسی نہ کسی انداز میں اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہئے تھا۔" عالم نواز نے کہا۔

"ممکن ہے کہا ہو' لیکن میرے پلے نہیں پڑا' اور یہ میں جانتا ہوں وہ کھل کر کبھی بات نہیں کرے گی۔ میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ کوئی ایسا طریقہ نکالوں کہ وہ بول پڑے تاکہ مجھے بھی اطمینان ہو جائے' ورنہ یک طرفہ عشق میں تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

"تم نے بہت دیر کر دی' معاملہ جھٹ پٹ ہونا چاہئے۔" عالم نواز نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "کہیں ایسا نہ ہو کوئی اور جرأت کا اظہار کر دے اور وہ اپنی محبت کا ثمر جرأت مند کی جھولی میں ڈال دے۔ پھر جب تم شکایت کرو تو وہ یہ کہہ دے کہ خان' مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟"

"کیوں نہیں' اکثر ایسا ہوتا ہے۔"

"تو پھر میں پہلی فرصت میں اپنی خواہش کو زبان دے دیتا ہوں۔"

"اس میں بھی تو ایک پہلو نقصان کا ہے۔" عالم نواز نے مسکراتے ہوئے کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری جرأت کو چھچھورپن سمجھ لے اور تم سے بات کرنا بھی ترک کر دے' چھچھورے لڑکوں کو لڑکیاں منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتیں۔"

"تو' اب تم نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔" سخاوت خان نے کہا "خیر دو چار دنوں میں کوئی ایسا طریقہ میں سوچ ہی لوں گا جو نوشین کے مزاج کے مطابق ہو۔"

"ویسے ایک بات ہے' اس کلب میں نوشین سوائے تمہارے کسی سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ مجھ سے بھی وہ تمہارے حوالے ہی سے دو چار باتیں کر لیتی ہے۔"

"اس سے تم نے کیا اندازہ لگایا' یہی نا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ صرف تمہاری عزت کرتی ہو۔" عالم نواز نے کہا "کلب میں تم سے بہتر بندہ اور کوئی نہیں ہے۔ مارشل آرٹ میں تمہاری مہارت اپنی مثال آپ ہے۔"

"جہاں تک مہارت کی بات ہے تو نوشین بھی کسی سے کم ماہر نہیں ہے۔ بہت پھرتیلی' بے پناہ قوت ارادی کی مالک اور بے اندازہ قوت برداشت بھی رکھتی ہے۔"

"اس کے باوجود بھی اس نے تمہارے مقابل آنے کی بھی کوشش نہیں کی۔"

"ہاں' یہ بات تو ہے' لیکن اس کی وجہ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے میرے مقابل آنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔"

"تم نے بھی شاید اسے مقابلے کی دعوت' کبھی نہیں دی۔"

"میں عورتوں یا لڑکیوں سے مقابلہ کرنے کی کبھی سوچتا ہی نہیں۔ اسی کلب کی دو لڑکیوں نے مجھے مقابلے کی دعوت دی....."

"مجھے معلوم ہے!" عالم نواز نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم نے ان لڑکیوں کو بغیر مقابلہ ہی فاتح تسلیم کر لیا تھا۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی فاتح کہلانے کی حقدار نہیں ہے۔"

"خیر' اب اس ذکر کو چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو۔"

"کوئی بات اور کیا کی جاسکتی ہے۔ میرا کہنا مانو تو اس وقت نوشین کے گھر چلے جاؤ۔ بہانہ تمہارے پاس ہے' تم اس کے باپ سے کہہ سکتے ہو کہ تم ابھی ابھی پشاور سے آئے ہو اس لئے نوشین سے ملاقات کے لئے چلے آئے۔"

"کہیں بڑے میاں میرے دل کا چور نہ پکڑ لیں۔"

"اگر چور پکڑا ہی جاتا ہے تو اچھی بات ہے۔ کبھی نہ کبھی تو یہ چور پکڑا ہی جانا ہے۔ جلدی پکڑا جائے تو کم نقصان ہوگا۔"

"میں کوئی ایسا نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جو میری اور نوشین کی جدائی کا سبب بن جائے۔" سخاوت خان نے گمبھیر لہجے میں کہا "پتا نہیں کیوں نوشین سے جدا ہونے کے تصور سے ہی میں لرز جاتا ہوں۔"

"یار اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ تم نوشین کے عشق میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے ہو۔ اس کمال کی بہر حال مجھے تم سے توقع نہیں تھی۔ تم خان ہو' سخاوت خان! تعلیم ختم ہونے تک شغل کرو اور پھر اپنے گھر جاؤ۔ اس چکر میں کہاں پھنس گئے ہو۔ اتنے سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں تو نوشین دوستی کے قابل لڑکی ہے۔ پھر تم لوگوں میں تو خاندان ہی میں شادی ہوتی ہے۔ اگر وہ تم پر مرمٹی تو پھر برا ہوگا۔ تمہارے گھر والے اسے قبول نہیں کریں گے اور وہ بے چاری تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے بہتر یہی ہے زیادہ ہاتھ پاؤں مت پھیلاؤ۔ تمہاری اس سے دوستی ہے' یہی کافی ہے۔"

"ارے یہ تم نے کون سا مسئلہ چھیڑ دیا؟" سخاوت خان نے قدرے تیز آواز میں کہا "تم شاید نہیں جانتے' میں نے نوشین کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ فیصلہ خان سخاوت خان کا فیصلہ ہے۔ اسی طرح اٹل جس طرح سورج کا اگلنا اور رات کا آنا ہے۔"

"بڑی بات مت کرو یار۔" عالم نواز نے کہا "اگر نوشین نے تمہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تب....."

"تب' نہ سخاوت خان ہوگا اور نہ نوشین ہوگی۔"

"میرا خیال ہے اب مجھے خاموش ہی رہنا چاہئے۔" عالم نواز نے خود کلامیہ انداز میں کہا "چلو' اب اس موضوع کو ختم کرو۔"

تھوڑی دیر تک دونوں چپ رہے اور پھر سخاوت خان ہی نے خاموشی کو توڑا۔ "تم دفتر میں چل کر اپنا نام فہرست میں لکھا کرنے کی بات کر رہے تھے۔ چلو دفتر چلتے ہیں' پھر میں گھر جاؤں گا۔ بوجھل ہو گئی طبیعت' تم نے غلط موضوع پر بات شروع کر دی تھی۔"

●●●●**●●●

کلفٹن کے ایک بنگلے کے قریب چوتھی کار آکر رکی تھی۔ پہلے آنے والی تین کاروں اور اس کار کی آمد کے درمیان صرف چار منٹ کا وقفہ تھا۔ کار سے اترنے والے شخص نے کار کو لاک کیا اور چابیاں ہلاتا ہوا بنگلے کے بڑے سے گیٹ کے ذیلی دروازے کو دھکا دے کر کھولا اور اندر داخل ہو کر اس کی بھی کنڈی لگا دی۔ پھر خراماں خراماں بنگلے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

بنگلے کے ایک کشادہ اور آراستہ ڈرائنگ روم میں تین افراد مختلف صوفوں پر یوں بیٹھے تھے جیسے پُرسا دینے آئے ہوں۔ نہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور نہ باتیں کر رہے تھے۔ ان تینوں کے سوا ایک اور شخص ڈرائنگ روم کے دروازے سے لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں ان تینوں پر تھیں۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ان تینوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ڈرائنگ روم کے باہر سے ابھرنے والی قدموں کی چاپ پر وہ چونکا۔ پھر جیسے ہی آنے والے پر اس کی نظر پڑی اس کے چہرے پر اطمینان کے رنگ لہرا گئے۔

"میرا خیال ہے میں ٹھیک وقت پر پہنچا ہوں۔" آنے والے نے چابیاں جیب میں رکھتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا۔ پھر کھڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھ کر بولا۔ "قاسم' اب تم جاؤ اور ہمارے کھانے پینے کا انتظام کرو۔"

"آپ وقت پر تو یقیناً آئے ہیں۔" ان تینوں میں سے ایک نے کہا جو خاصا بھاری بھر کم تھا۔ "لیکن میٹنگ آپ نے غلط وقت رکھ دی۔ یہ تمبولا کا وقت ہے اور میرا اس وقت کلب میں ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔"

"اوہو' میں جانتا ہوں ابراہیم سیٹھ' یہ وقت آپ کا تمبولا کا ہے' لیکن یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ملازمین بھی ایمان دار....."

"ہاں بابا' ایمان دار ہیں پر اس ٹائم ہمارا ادھر ہونا ضروری ہے۔" ابراہیم سیٹھ نے کہا "چلو جنجو' ابھی جلدی بات کرو تمبیل

صاحب' اپنے پاس ٹائم بالکل نہیں ہے۔"

"جو بات میں کرنے والا ہوں ابراہیم سیٹھ' اس کے لئے تو آپ کے پاس ٹائم ہی ٹائم ہوگا۔" جمیل بیگ نے ابراہیم سیٹھ کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے کہا "یوں تو میں نے سرسری انداز میں آپ تینوں ہی سے بات کی ہے۔ آج ہم یہاں اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ اپنے منصوبے کو آخری شکل دی جائے۔ ہم چاروں ہی نے مارشل آرٹ کے بڑے بڑے کلب نام کمانے کے لئے نہیں بنائے بلکہ یہ ہمارے بزنس ہی کا ایک حصہ ہے۔ ہم ان کلبوں کے ذریعے بھی سرمایہ کمانا چاہتے ہیں۔ سرمایہ کمانے کا کام یوں ہم اپنے اپنے طور پر کر رہے ہیں۔ مارشل آرٹ کے فروغ کے نام پر ہم لوگ اپنی ہی برادری کے افراد سے لمبی لمبی رقمیں بطور فنڈ وصول کر رہے ہیں۔ لیکن جو سرمایہ کاری ہم لوگوں نے مارشل آرٹ کے نام پر کی ہے وہ میرے حساب سے ابھی خاطر خواہ منافع نہیں پیدا کر رہی ہے۔ کیا خیال ہے ستار صاحب' آپ نے تو ہم سب سے زیادہ سرمایہ لگایا ہے اپنے کلب پر؟" جمیل بیگ نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی طرف رخ کرکے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو بھائی جمیل' مجھے تو اب یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا سرمایہ کلب کی شکل میں منجمد ہوگیا ہو۔" ستار شیخ نے کہا "میں نے چند روز پہلے ہی بھائی ناصر سے بھی بات کی تھی۔" ستار شیخ نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ناصر خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بہر حال!" جمیل بیگ نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا "اب ہم نے آج کی میٹنگ جس مقصد کے لئے بلائی ہے اس پر بات کرتے ہیں۔ یہ بات تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ حکومت کھیلوں کی سرپرستی کرتی ہے اگر اسے موقع دیا جائے۔ کھیل ہماری ثقافت کا ایک حصہ ہیں۔ میں نے بڑے بڑے افسروں اور وزیروں سے اس مسئلے پر بات کی ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھادی ہے کہ جوڈو کراٹے وغیرہ بھی کھیل ہی ہیں۔ ایسے کھیل جو انسان میں خود اعتمادی پیدا کرتے ہیں اور یہ کہ جن قوموں میں خود اعتمادی نہیں ہوتی وہ تباہ ہوجاتی ہیں.....؟

"تم اپنی گفتگو کے نتائج بتاؤ تقریر مت کرو یار!" سیٹھ ابراہیم نے جمیل بیگ کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ہم لوگ کے پاس اتنا ٹائم کہاں ہے۔"

"نتائج ہماری مرضی کے مطابق ہی نکلے ہیں۔" جمیل بیگ نے کہا "میں نے متعلقہ افسران اور وزیر کو اس بات پر تیار کرلیا ہے کہ وہ اس کھیل کے فروغ کے لئے امداد دیں گے اور ہمارے ملک کے کھلاڑیوں کو بیرون ملک بھی بھیجنے کے انتظامات کریں گے۔"

"یہ ایک اچھی خبر ہے۔" ستار شیخ نے کہا "ہم جن کھلاڑیوں کو یہاں سے بھیجیں گے وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرکے پاکستان کا نام اونچا کریں گے اور....."

"پہلے آپ میری پوری بات سن لیں۔" جمیل بیگ نے کہا "میں نے بھاگ دوڑ کرکے جن نمائشی مقابلوں کا بندوبست کیا ہے' وہ حکومت سے امداد وصول کرنے کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ میرے ذہن میں جو پروگرام ہے وہ یہ ہے کہ ان نمائشی مقابلوں میں کراچی کے وہی کلب حصہ لیں گے جو ہمارے اپنے ہیں' لیکن اسٹار کراٹے کلب درمیان میں پھنس گیا ہے۔ اس کلب کا مالک ساجد کمال بھی بڑے تعلقات کا آدمی ہے۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی ہے' لیکن اس پر ایمان داری اور زندہ ضمیری کا بھوت سوار ہے۔"

"میں جانتا ہوں اس کو۔" سیٹھ ابراہیم نے کہا "نیا نیا باپ مرا ہے سالے کا۔ ہوزری کی دو فیکٹریاں اور کئی بنگلے چھوڑ کر مرا ہے باپ۔ ابھی وہ ایسا اونٹ ہے جو پہاڑ کے نیچے نہیں آیا' جب آئے گا تو اس کا ضمیر اور ایمان داری تیل لینے چلی جائے گی۔"

"ہم اس وقت تک انتظار نہیں کرسکتے سیٹھ ابراہیم!"

"پھر کیا کروگے تم؟ اس کے کلب میں جو لڑکے ہیں وہ کسی کو آگے بڑھنے نہیں دیں گے۔ وہ ون کرے گا۔"

"میں نے جہاں پاکستان کے دیگر شہروں کے کلبوں کا سروے کیا ہے ابراہیم سیٹھ' وہاں کراچی کے تمام کلب بھی میری نگاہ میں ہیں۔ پشاور' پنڈی' لاہور' حیدر آباد سے جو لڑکے یہاں آرہے ہیں ان کا مقابلہ ہمارے چاروں کلب کے لڑکے اور لڑکیاں آسانی سے کرلیں گے' لیکن اسٹار کراٹے کلب جب ہمارے کسی کلب کے مقابل آئے گا تو پھر فتح اسی کی ہوگی۔ اسٹار کراٹے کی فتح کا مطلب ہمارے منصوبے کا خاک میں ملنا ہی ہے۔"

"تمہارے ذہن میں کیا اسکیم ہے وہ بتاؤ نا یار! ٹائم کیوں ضائع کر رہے ہو۔" ابراہیم سیٹھ نے کہا۔

"آپ سے بات کرنے کا مجھے موقع نہیں ملا تھا' دوسرے دوستوں کو میں سرسری انداز میں اپنی اسکیم بتا چکا ہوں اور یہ لوگ تیار بھی ہیں۔" جمیل بیگ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "اسٹار کراٹے کلب کے جو لڑکے اور لڑکیاں نمائشی مقابلوں میں شرکت کر رہے ہیں ان کی فہرست میں نے حاصل کرلی ہے۔ اس فہرست سے اگر ہم ایک لڑکی اور دو لڑکوں کو نکال دیں تو پھر اسٹار کراٹے کلب تیسرے نمبر پر بھی نہیں آئے گا۔ اس لئے میں نے پروگرام بنایا ہے کہ آخری مقابلوں سے تھوڑی دیر قبل ہی ان تینوں کو اغوا کرلیا جائے۔"

"یعنی آخری مقابلے شروع ہونے سے پہلے؟" ابراہیم سیٹھ نے پُرخیال انداز میں کہا "اس وقت اغوا کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ انہیں مقابلوں کے آغاز میں ہی اغوا کرلیا جائے تاکہ پبلک ان کی شکل اور مقابلے دیکھ ہی نہ سکے۔ اگر پبلک نے انہیں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے دیکھ لیا تو پھر ان کے اچانک غائب ہونے پر شور مچادے گی اور پھر ججوں کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ انہیں

مقابلوں سے زبردستی ہٹایا گیا ہے۔"

"آپ کی کھوپڑی بھی ٹھیک کام کر رہی ہے سیٹھ!" جمیل بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہر جعلی کام میں اپنا کھوپڑی بالکل ٹھیک کام کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے' تو پھر انہیں مقابلوں کے آغاز سے آدھا گھنٹا پہلے ہی اٹھالیں گے۔" جمیل بیگ نے فیصلہ کن انداز میں کہا "انہیں اغوا کرنے کے سلسلے میں آپ میں سے کون میرا ساتھ دے گا؟ وہ بتائے یا یہ کام میں اپنے ہی آدمیوں سے کراؤں؟"

"جب سب ہی کچھ تم کر رہے ہو تو یہ کام بھی خود ہی کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" جمیل بیگ نے کہا "ایک بات اور۔ مارشل آرٹ کے فروغ کے لئے جو کمیٹی ہم نے بنائی ہے اس میں ایک نام کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ ہم چاروں کے علاوہ پانچواں جو نام ہوگا وہ ایک طرح سے اعزازی ہوگا' لیکن امداد میں ملنے والی رقم میں اس کا بھی چند فیصد حصہ ہوگا۔"

"یہ کیا بات کردی تم نے؟ ہم لوگ اس اعزازی ممبر کو حصہ کیوں دیں گے؟" ابراہیم سیٹھ نے قدرے ترش لہجے میں کہا "اور وہ ہوگا کون؟"

"وہ اندر کا آدمی ہے۔ وہی آدمی جو امداد دلانے میں قدم قدم پر ہماری مدد کرے گا۔"

"تمہارے خیال میں اسے حصہ دینا ضروری ہے تو پھر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" ستار شیخ نے کہا۔

"چلیں یہ بات بھی طے ہوگئی۔" جمیل بیگ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "اب میں سب سے اہم بات کر رہا ہوں۔"

"وہ بھی کرلو یار' پر جلدی کرو۔" ابراہیم سیٹھ نے دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"گزشتہ تین ماہ سے میں ان نمائشی مقابلوں کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔" جمیل بیگ نے کہا "اس سلسلے میں جو اخراجات ہو رہے ہیں ان کی منظوری میں نے صرف آپ لوگوں سے زبانی لی تھی' کسی سے ایک پیسہ بھی میں نے نہیں لیا۔ اب بات آخری مرحلے میں پہنچ گئی ہے' اس لئے جو کچھ میں نے خرچ کیا ہے اس کا حساب میرے پاس موجود ہے اور جو اب میں خرچ کروں گا اس کا تخمینہ بھی میں نے لگا لیا ہے۔ ساری رقم کو جوڑنے کے بعد میں نے اسے چار حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ آپ تینوں افراد اپنا اپنا حصہ کل کسی وقت ادا کردیں تاکہ کام۔۔۔"

"تم جس طرح رقم خرچ کر رہے ہو' اسی طرح کرتے رہو۔ جب امداد کی رقم ملے گی تو اس میں سے اپنی خرچ کی ہوئی رقم وصول کرلینا۔" ابراہیم سیٹھ نے جمیل کی بات کاٹ کر کہا "یوں بھی تم سربراہ ہو ہمارے' پھر ہم سب لوگ ہی دینے لینے کے معاملے میں کھرے ہیں۔"

"آپ کی بات صحیح ہے ابراہیم سیٹھ لیکن جو کام ہم لوگ کر رہے ہیں اس میں چند فی صد نقصان کا بھی امکان ہے۔" جمیل بیگ نے کہا "اور پھر حکومت سے امدادی رقم کی وصولی میں بھی تو وقت لگے گا' اتنے دنوں تک صرف میں اپنی رقم جام کرکے کیوں رکھوں؟ یہ کام سب کا ہے' اس لئے سب ہی کو اپنا حصہ اس میں جام تو کرنا ہی ہے۔ یہ تو ہم لوگ ایک طرح سے کاروبار کر رہے ہیں سیٹھ' مال لگائے بغیر مال کس طرح وصول ہوگا۔"

تھوڑی دیر کی بحث کے بعد سب نے ہی اگلی صبح رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا تو جمیل بیگ نے حساب کتاب کی ٹائپ شدہ ایک ایک کاپی سب کے ہاتھ میں تھمادی۔

"یہ تو خاصی لمبی رقم ہے!" ابراہیم سیٹھ نے کاغذ پر ایک نظر ڈالتے ہی کہا۔

"اس میں' میں نے ایک پائی کا بھی ہیر پھیر نہیں کیا سیٹھ!" جمیل بیگ نے قدرے تیز آواز میں کہا "میں نے بھاگ دوڑ میں جو وقت خرچ کیا ہے اور جو کروں گا اس کی قیمت نہیں لگائی' ورنہ وہ بھی ہزاروں ہی میں ہوگی۔"

"بات بدور ہے تمہاری۔ ٹھیک ہے' ابھی زیادہ پائی مت کرو۔" ابراہیم سیٹھ نے کہا "وہ سالا آدمی نہیں آیا جسے تم نے کھانے پینے کا انتظام کرنے بھیجا تھا۔"

"وہ میرے بغیر بلائے کیسے آتا سیٹھ!" جمیل بیگ نے کہا "معاملہ ختم ہوگیا ہے' اب وہ آجائے گا۔"

"بس ابھی اس کو بلاؤ' سالا اپنا وقت سارا برباد ہوگیا۔"

جمیل بیگ نے قاسم کو بلایا اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی کھانے پینے کا دور شروع ہوگیا۔ ابراہیم سیٹھ اور ستار شیخ بے نوشی میں جمیل بیگ کا ساتھ دے رہے تھے جب کہ ناصر خان صرف مشروب سے شغل کر رہا تھا۔ پینے کے بعد کھانا ہوا اور پھر رات گئے یہ میٹنگ اپنے اختتام کو پہنچی۔

دوسرے دن صبح جمیل بیگ کو بہت سے کام کرنے تھے۔ سب سے پہلا کام تو رقم کی وصولی تھا۔ دوسرا اسٹار کراٹے کلب کے دو لڑکوں' سخاوت خان' عالم نواز اور ایک لڑکی نوشین کے اغوا کے منصوبے کو آخری شکل دینی تھی' تیسرا کام نمائشی مقابلوں کی کمیٹی کی طرف سے ایک پریس ریلیز اخبارات کو بھجوانی تھی۔ اس نے رات ہی کو پریس ریلیز کا مضمون لکھ لیا تھا۔ "کراچی میں مارشل آرٹ کے نمائشی مقابلے منعقد کرانے والی کمیٹی نے ایک پریس ریلیز کے ذریعے اعلان کیا ہے کہ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر ان نمائشی مقابلوں میں صرف صوبہ سندھ کے مختلف شہروں کی ٹیمیں حصہ لے سکیں گی۔ واضح رہے کہ قبل ازیں یہ مقابلے ملک بھر کے مختلف شہروں کی ٹیموں کے درمیان کرانے کا اعلان کیا گیا تھا۔" پریس ریلیز کا یہ مضمون لکھتے ہوئے جمیل بیگ کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

●●●**●●●

سخاوت خان اسٹار کراٹے کلب کے کھلنے سے کچھ پہلے ہی پہنچ

گیا تھا۔ مکان میں بیٹھے بیٹھے اسے بے چینی سی ہوئی تھی۔ کل عالم نواز بھی کلب نہیں آیا تھا۔ اگر وہ آتا تو سخاوت خان اسے لے کر نوشین کے گھر جاتا۔ کلب بند ہونے تک اس نے عالم نواز کا انتظار کیا تھا۔ جب وہ نہیں آیا تو اسے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ آج بھی وہ جلدی اس لئے آگیا تھا کہ جیسے ہی عالم نواز آئے گا وہ اسے لے کر نوشین کی خیریت معلوم کرنے اس کے گھر جائے گا۔ سخاوت خان کرائے کلب کی عمارت کے ساتھ ہی کھڑا بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پہنچنے کے کوئی دس منٹ بعد ہی کلب کھولنے والے افراد پہنچ گئے تھے۔

"آج تو آپ جلدی آگئے؟" ایک نے پوچھا۔

"میری گھڑی کچھ غلط چل رہی تھی۔" سخاوت خان نے جھوٹ بولا "اس کا احساس مجھے یہاں پہنچنے کے بعد ہوا۔"

"آئیں پھر جب تک صفائی ہوتی ہے آپ دفتر میں بیٹھیں۔"

"نہیں' یہاں میں ٹھیک کھڑا ہوں۔ آپ لوگ صفائی وغیرہ کریں۔" سخاوت خان نے کہا "یوں بھی لڑکوں کے آنے میں ابھی دیر ہے۔"

"دیر کہاں ہے صاحب بس دس پندرہ منٹ میں بہت سارے تو پہنچ ہی جائیں گے۔"

"چلو پھر میں ان کا گیٹ پر استقبال کروں گا۔" سخاوت خان نے پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے کہا۔ جب وہ ان لوگوں سے بات کر رہا تھا تو اس کا رخ گیٹ ہی کی طرف تھا' اس لئے اس نے دائیں گلی سے نکل کر گیٹ کی طرف آتی ہوئی نوشین کو نہیں دیکھا تھا۔

"ارے آپ!" نوشین نے اس کے قریب پہنچ کر کہا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "آپ تو شاید ایک ہفتے بعد ہی آنے والے تھے۔ خیریت تو ہے؟"

"ہاں خیریت ہی ہے۔" سخاوت خان نے کہا "تم اپنی سناؤ۔ چھ دن ہو گئے مجھے واپس آئے ہوئے' لیکن تمہارا پتا ہی نہیں ہے۔ اس دوران میں تم یونیورسٹی بھی نہیں پہنچی ہو۔"

"میرا خیال ہے میں کوئی دس گیارہ دن بعد گھر سے نکلی ہوں۔" نوشین نے کہا "کل یونیورسٹی بھی جانے کا ارادہ ہے۔"

"دس گیارہ دنوں تک گھر میں کیا کرتی رہی ہو؟"

"کرنا کیا تھا' تیمارداری کر رہی تھی۔" نوشین نے اداس سے لہجے میں کہا۔ "اس بار بابا کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی۔"

"اف' مجھے معلوم ہی نہیں ورنہ میں عیادت کے لئے ضرور آتا۔ اب کیسی ہے ان کی طبیعت؟"

"اب تو اللہ کا شکر ہے۔" نوشین نے کہا۔ "اندر چلنے کا موڈ ہے یا یہیں کھڑے کھڑے باتیں کریں گے؟"

"اندر جانے کا موڈ تو نہیں ہے لیکن آدھے گھنٹے بعد ایک میٹنگ ہے۔ اس میں شرکت کرنا ضروری ہے۔ سنا ہے کلب کے مالک ساجد کمال ان لڑکے اور لڑکیوں سے بات چیت کریں گے جو نمائشی مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے منتخب کی گئی ہیں۔"

"میں بھی آج اسی سلسلے میں آئی تھی۔" نوشین نے کہا "مجھے تو آپ کا پتا ہی نہیں تھا کہ آپ بھی آگئے ہیں۔"

"میں تمہارے گھر آنا تو چاہتا تھا' لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا! آجاتے آپ۔ میرے گھر آنے پر پابندی تو نہیں ہے۔ یوں بھی خیریت دریافت کرنے کا بہانہ تو تھا ہی۔ پھر آپ میرے گھر والوں کے لئے اجنبی تو نہیں ہیں۔ غائبانہ طور پر سب جانتے ہیں آپ کو" نوشین نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "لیکن شاید آپ میرے گھر آنا پسند نہیں کرتے۔"

"یہ کیا بات کر دی تم نے!" سخاوت خان نے کہا۔ "پتا نہیں کتنی بار میں تمہارے گھر تک آیا ہوں' لیکن کبھی تم نے اندر چلنے کے لئے نہیں کہا۔ اس کا مطلب میری سمجھ میں تو یہی آیا تھا کہ تم اپنے گھر والوں سے مجھے ملانا نہیں چاہتی ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" نوشین نے کہا "میں تو یہ سوچتی تھی کہ اگر میں آپ سے گھر میں چلنے کا کہوں گی تو معلوم نہیں آپ کیا سوچیں گے۔"

"سوچنا کیا ہے' اب تو میں تمہارے بارے میں کچھ سوچنے کے مرحلے سے بہت آگے نکل گیا ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں آپ کی بات۔"

"نہ سمجھ میں آنے والا تو اس میں کوئی لفظ بھی نہیں تھا۔"

"پھر بھی وضاحت ضروری ہے۔"

"کہتے ہیں محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔" سخاوت نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "اگر تم اس فقرے کی وضاحت طلب کرو گی تو میں کیا اس کی وضاحت کروں گا۔"

"جن سے محبت ہو جاتی ہے نا' اسے انسان نہ تو اپنی نظروں سے اوجھل ہونے دیتا ہے اور نہ ہی خود اوجھل ہوتا ہے۔" نوشین نے جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجبوری بھی تو کوئی چیز ہے نوشین!"

"محبت کسی مجبوری کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ حالات کیسے ہی ہوں' وہ صرف فتح یاب ہونا ہی جانتی ہے۔"

"میری محبت بھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھے گی نوشین!"

"کاش ایسا ہو سکتا!" نوشین کے لہجے میں بلا کی اداسی اور مایوسی تھی۔

"تم اتنی اداس اور ناامید کیوں ہو؟"

"میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں خان!" نوشین نے زیر لب کہا "غریب باپ کی بیٹیاں اپنی محبت کے اظہار کے مواقع از خود کھو دیا کرتی ہیں۔"

"تم اس موقع کو کھونے کی کوشش مت کرو۔"

"میرا خیال ہے اب اندر چلیں۔" نوشین نے موضوع بدل دیا۔ "کلب کے سامنے یوں زیادہ دیر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اب کلب کے ممبر آنے لگے ہیں۔"

سخاوت خان چند لمحے عجیب سے انداز میں نوشین کو دیکھتا رہا اور پھر لمبی آہ بھرتے ہوئے بولا "آؤ چلیں۔ ویسے مجھ پر اعتماد کرو نوشین' میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔" نوشین نے کوئی جواب دینے کے بجائے قدم آگے بڑھا دیے۔

جب نوشین اور سخاوت خان اندر پہنچے تو منیجر نے کہا "صاحب ابھی آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے دس منٹ بعد ہی میٹنگ شروع ہوجائے گی۔"

منیجر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دس منٹ بعد ہی ساجد کمال کلب کی عمارت میں داخل ہوگیا تھا۔

"اس میٹنگ کی یوں تو ضرورت نہیں تھی' لیکن کچھ حالات ایسے سامنے آئے ہیں کہ میں نے آپ لوگوں کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔" ساجد کمال نے کہا "اللہ کا بڑا کرم ہے کہ ہمارے کلب کی شہرت دور دور تک ہے۔ یہاں کے نکلے ہوئے لڑکے اپنا ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ہمارے کلب کے پانچ لڑکوں نے گزشتہ سال جاپان کا دورہ بھی کیا تھا اور کئی اعزازات حاصل کئے' لیکن ان کا یہ کارنامہ ذاتی طور پر تھا' اس لئے کہ ان کے دورے کا انتظام سرکاری طور پر نہیں کیا گیا تھا لیکن ان لڑکوں کی اس کامیابی نے صوبائی وزارت ثقافت کو ہماری طرف متوجہ کیا۔ پروگرام یہ ہے کہ ان نمائشی مقابلوں کے بعد حکومت کی طرف سے ایک وفد غیر ملکی کے دورے پر روانہ ہوگا۔ ان نمائشی مقابلوں میں جو لڑکے اور لڑکیاں اپنے فن کا بہتر مظاہرہ کریں گے وہی اس وفد میں شامل ہوں گے۔ اس وفد میں شامل لڑکیاں اور لڑکے مختلف ممالک میں اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے تاکہ پاکستان کا نام مارشل آرٹ کے میدان میں بھی اونچا ہو۔"

"یہ تو ایک اچھا قدم ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں کیا پریشانی ہے؟" نوشین نے سوال کیا۔

"پریشانی بہت ہے بی بی!" ساجد کمال نے کہا "یہ سب جانتے ہیں کہ ان نمائشی مقابلوں میں ہمارے کلب کی کامیابی یقینی ہے۔ جب ہمارا کلب کامیاب ہوجائے گا تو بیرون ملک جانے والے وفد کی نمائندگی ہم کریں گے۔ آپ لوگوں نے وہ خبر پڑھی جو آج اخبارات میں شائع ہوئی ہے؟"

"ہاں' اب نمائشی مقابلوں میں صرف صوبہ سندھ کے مختلف شہروں کے کلب ہی حصہ لیں گے" عالم نواز نے کہا "یہ تو اچھی بات ہے' مقابلے اب آسان ہوگئے۔"

"نہیں' یہ اچھی بات نہیں ہے" ساجد کمال نے کہا "یہ صرف اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی سازش ہے۔ سارے صوبوں کے کلب حصہ لیتے تو ہر ایک کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملتا اور اس طرح جوہر خالص نکل کر سامنے آجاتا۔ پھر بیرون ملک جانے والے وفد میں چاروں صوبوں کی نمائندگی بھی ہوجاتی۔ دوسری بات یہ کہ چاروں صوبوں کے مقابلوں میں کسی ایک کلب کو نمائندگی دلانے کی سازش کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اصل مقابلہ کراچی کے چاروں کلبوں کے درمیان ہوگا۔ دو یا تین کلب کے مالکان سازش کرکے جس کلب کو نمائندگی ملنے کا امکان ہے اسے آسانی سے منظر سے آؤٹ کرسکتے ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق یہ سازش کی جارہی ہے۔ ہمارے کلب کو منظر سے آؤٹ کردیا جائے گا تو پھر تین وہ کلب رہ جاتے ہیں جن کے مالکان معزز جرائم پیشہ ہیں۔ جس طرح وہ منشیات' جوئے' سٹے اور تبرولے کے اڈے چلا رہے ہیں اس طرح وہ مارشل آرٹ کا اڈا بھی چلانا چاہتے ہیں۔ آج مارشل آرٹ جرائم پیشہ افراد کی بھی ضرورت بن گیا ہے۔ ایسے افراد مختلف کلبوں میں شریف لڑکے لڑکیوں کے ساتھ تربیت حاصل کررہے ہیں۔ شریف لڑکے اور لڑکیاں تو وقت پڑنے پر اپنی حفاظت کے لئے یہ فن سیکھ رہے ہیں' لیکن جرائم پیشہ افراد اس فن کو حتی اور گھناؤنے مقاصد کے حصول کے لئے سیکھ رہے ہیں۔ میں نے اپنے کلب میں داخلے پر جو مختلف پابندیاں لگائی ہیں اس کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ گندے لوگ میرے کلب میں تربیت نہ حاصل کرسکیں۔"

ساجد کمال سانس درست کرنے کے لئے رکا تو نوشین نے کہا "پھر آپ کو تو چاہئے تھا کہ نمائشی مقابلوں کے سلسلے میں بننے والی کمیٹی ہی کی مخالفت کرتے۔ جب آپ نے یہ کمیٹی بننے ہی دی ہے تو پھر اسے اپنی سرکردگی میں مقابلے کرانے دیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ویسے ہی ہوجائے گا۔"

"تمہارا خیال ٹھیک نہیں ہے۔ اگر میں اس کی مخالفت کرتا تب بھی وہ کمیٹی بن جاتی۔ جمیل بیگ بہت پہنچے باز شخص ہے۔ اس نے تینوں کلبوں کے مالکان کو پہلے ہی شیشے میں اتار لیا تھا۔ اگر میں مخالفت کرتا تب بھی وہ کمیٹی بن جاتی' کیوں کہ چار کلبوں کے مالکان ایک طرف ہوتے اور ایک طرف میں تھا......"

"خیر اب یہ بتائیں کرنا کیا ہے؟" سخاوت خان نے قدرے تیز آواز میں کہا۔

"کرنا تو خیر یہی ہے کہ ہم ان مقابلوں میں بھرپور انداز میں حصہ لیں اور دشمنوں کی ہر سازش کو ناکام بنادیں" ساجد کمال نے پرجوش انداز میں کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ جمیل بیگ حکومت سے لمبی رقم وصول کرنے کا چکر چلا رہا ہے۔ کچھ افسران اور ایک آدھ وزیر کو بھی اس نے شیشے میں اتار لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں جمیل بیگ صوبائی حکومت کے ساتھ کوئی فراڈ نہ کرسکے اور مجھے اس مقصد میں اسی وقت کامیابی ہوسکتی ہے جب میرا کلب کامیابی حاصل کرے۔ جن لڑکوں اور لڑکیوں کا انتخاب ان مقابلوں کے لئے ہم نے کیا ہے وہ سارے ہی اپنی مثال آپ ہیں۔ سخاوت خان'

عالم نواز' شوکت بٹ اور نوشین کا جواب نہیں۔ جو لوگ ہمارے خلاف سازش کر رہے ہیں وہ لوگ عین وقت پر ان چاروں کو اغوا بھی کر سکتے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کلب کا ہر رکن ان کی حفاظت پر لگ جائے۔ میں نے اس سلسلے میں آئی جی پولیس اور دیگر افسران سے بھی بات کی ہے۔ انہوں نے بھی ان چاروں کی حفاظت کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ پھر بھی ہمیں چوکنا رہنا ہے۔"

"میرا خیال ہے مقابلے شروع ہونے سے قبل ان چاروں کو کلب کی عمارت ہی میں رکھا جائے اور ہم سب لوگ یہاں رہ کر باری باری ان کی حفاظت کریں" ایک لڑکے نے کہا۔

"یہ بہرحال مشکل کام ہے" ساجد کمال نے کہا "لیکن میں کوئی نہ کوئی بہتر اور آسان انتظام کروں گا۔ آپ لوگوں کو ساری بات بتانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہم خوف زدہ ہو جائیں' بلکہ یہ میں نے سب کچھ چوکنا رہنے کے لئے بتایا ہے۔ اب اگر کسی کے ذہن میں کوئی تجویز ہو تو وہ بیان کرے۔ ممکن ہے کوئی بہتر سبیل نکل آئے۔"

چند لمحے تک کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر نوشین نے اس خاموشی کو توڑا "آپ سارے معاملات کو بہتر جانتے ہیں' اس لئے آپ جو فرمائیں گے ہم لوگ اس پر ہی عمل کریں گے۔ ہاں یہ طے ہے کہ ہم ان مقابلوں میں بھرپور انداز میں حصہ لیں گے۔ ناکامی کے لفظ سے ہم آشنا نہیں ہیں' انشاء اللہ کامیابی اشار کرانے کلب ہی کی ہوگی۔"

نوشین کے بعد کئی پُرجوش آوازیں کمرے میں ابھریں اور پھر لڑکے لڑکیاں آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"اب میں اجلاس برخاست کرتا ہوں' اب آپ لوگ اپنی اپنی مشقوں پر جائیں۔" ساجد کمال نے کہا اور کرسی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

"میرا تو خیال ہے اب ہم لوگ باہر چلیں" سخاوت خان نے عالم نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مشقیں اب کل ہی سے شروع کریں گے۔"

"میں تو صرف آپ دونوں کے ساتھ کلب سے باہر تک ہی چلوں گا۔ مجھے گھر جانا ہے۔ یہ میٹنگ نہیں ہوتی تو آج میں آتا نہیں" عالم نواز نے کہا۔

"کیا کوئی خاص کام ہے؟" نوشین نے پوچھا۔

"ہاں' خاص ہی سمجھ لو۔"

"اگر خاص کام ہے تو جاؤ' ورنہ کمپنی رہتی۔ بہت دنوں بعد ہم تینوں ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے" سخاوت خان نے کہا۔

"آج آپ دونوں بیٹھ کر چائے اڑائیں' کل میں بھی شامل ہو جاؤں گا۔"

کلب سے باہر آنے کے بعد عالم نواز نے نوشین اور سخاوت خان کو خدا حافظ کہا۔ اس کے جانے کے بعد سخاوت خان نے پوچھا

"کہاں بیٹھنے کا موڈ ہے؟"

"کسی پُرسکون جگہ چل کر بیٹھتے ہیں" نوشین نے کہا "لیکن آٹھ بجے تک مجھے گھر بھی پہنچنا ہے۔"

"تو آٹھ بجنے میں اب وقت ہی کتنا رہ گیا ہے" سخاوت خان نے دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "چلو تمہارے گھر چلتے ہیں۔ وہ بھی تو پُرسکون جگہ ہے۔"

"میرے گھر!"

"ہاں' میں تمہارے بابا سے مل بھی لوں گا۔"

"بابا سے ملیں گے آپ؟"

"کیا مجھے تمہارے بابا سے نہیں ملنا چاہئے؟"

"کیوں نہیں' چلیں' میرے گھر ہی چلتے ہیں" نوشین نے پُرخیال انداز میں کہا "آپ نے میرے بابا کو نہیں دیکھا' لیکن میرے بابا نے آپ کو دیکھا ہے اور وہ آپ کے متعلق بہت ساری باتیں جانتے ہیں۔ اکثر آپ کا تذکرہ ہمارے گھر میں ہوتا ہے۔"

"اچھا! یہ مجھے معلوم نہیں تھا" سخاوت نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو اشارے سے روکتے ہوئے کہا "میرے متعلق کیا جانتے ہیں تمہارے بابا؟"

"گڈری!" ٹیکسی کے رکنے کے بعد نوشین نے کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اثبات میں گردن ہلائی تو سخاوت خان نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ نوشین کے بعد وہ بھی سیٹ پر بیٹھا اور دروازہ بند کر کے لاک کر دیا تو نوشین نے کہا "وہ آپ کے خاندان سے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔"

"تعجب کی بات ہے" سخاوت خان نے کہا "خیر اتنا تو تم بھی جانتی ہو کہ میں ایک خان کا بیٹا ہوں۔"

"خان کی بیٹی تو میں بھی ہوں" نوشین نے سرگوشی کی۔

"کیا کہا؟"

"ہاں' میرے والد بھی خان ہیں۔"

"لیکن تم پشتو شاید نہیں جانتی ہو۔ ہندوستان اور پاکستان میں بہت خان ہیں' لیکن وہ ایسے ہی خان ہیں جیسے شیخ' سید' مرزا۔۔۔۔"

"نہیں' میری فیملی کا تعلق ایسے خوانین سے نہیں ہے۔"

"کیا تم اصلی خان ہو؟"

"ہاں' میں اصلی خان ہوں" نوشین نے پہلی بار پشتو میں کہا۔

"ارے تم تو۔۔۔۔"

"ہاں' مجھے پشتو آتی ہے اور میں جب بابا سے بات کرتی ہوں تو پشتو ہی میں کرتی ہوں۔"

"تمہارے بابا کرتے کیا ہیں؟" سخاوت خان نے پشتو ہی میں پوچھا۔

"میرے بابا شپ پر کام کرتے ہیں۔ ابھی ایک ماہ پہلے آئے ہیں۔ پورے ڈیڑھ سال بعد!"

"ڈیڑھ سال بعد۔"

"ہاں، وہ اکثر ڈیڑھ دو سال بعد ہی آتے ہیں۔"

"تمہارے بھائی رہتے ہوں گے یہاں؟" سخاوت خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میرا بھائی کوئی نہیں ہے۔"

"تو کیا تم اپنی والدہ کے ساتھ اکیلی رہتی ہو؟"

"میری والدہ بھی نہیں ہیں۔ میں اپنے چاچا اور چاچی کے ساتھ رہتی ہوں۔ چاچی کے دو لڑکے ہیں، لیکن وہ اپنی بیویوں کے ساتھ الگ رہتے ہیں۔"

"اچھا، میں اب سمجھا" سخاوت خان نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "والدہ کے مرنے کے بعد تمہیں تمہارے بابا نے ان کے پاس چھوڑ دیا ہوگا۔"

"ہاں، یہی بات ہے" نوشین نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "شاید میری عمر آٹھ نو سال تھی جب میرے بابا نے مجھے چاچا اور چاچی کے سپرد کیا تھا اور خود شپ پر چلے گئے تھے۔ انہوں نے شاید زندگی میں پہلی بار نوکری کی تھی، اس بار ان کی واپسی پورے تین سال بعد ہوئی تھی۔ ایک دو ماہ میرے ساتھ گزار کر وہ پھر چلے گئے تھے۔ حالاں کہ میں ضد کر رہی تھی کہ وہ نہ جائیں، لیکن وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر جب وہ آئے تو چھ ماہ تک میرے ساتھ ہی رہے۔ میرے چاچا، چاچی یوں تو مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ لیکن پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت سخت تھے۔ ان کی سختی ہی تھی کہ میں نے ایک ایک سال میں دو دو کلاسوں کا امتحان دیا اور پاس ہو گئی۔ میٹرک کے بعد نہ تو ان کی سختی رہی اور نہ میرا لاابالی پن۔"

"تو تمہارے بابا نے مجھے کہاں دیکھ لیا اور وہ میرے بارے میں کس طرح سب کچھ جانتے ہیں۔"

"جب تم پہلی بار کلب سے میرے ساتھ گھر تک آئے تھے اس وقت انہوں نے تمہیں دیکھا تھا" نوشین نے ذہن پر زور دے کر کہا "وہ اس سے پہلے بھی تمہیں شاید دیکھتے رہے ہیں، اس لئے کہ انہیں تمہارے گھر کا پتا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تم اپنے تین دوستوں کے ساتھ رہتے ہو۔"

"یہ اطلاعات تو میرے لئے حیرت کا باعث ہیں" سخاوت خان نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "پھر تو شاید میں بھی تمہارے بابا کو دیکھتے ہی پہچان لوں گا" اس بار سخاوت خان کا لہجہ بڑا معنی خیز تھا "تم تو جانتی ہو ہم لوگ جس شخص کے متعلق بہت کچھ معلومات رکھتے ہیں وہ ہمارا دشمن ہی ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے بابا کی اور میری کوئی دشمنی ہو۔"

"تم ٹیکسی بہت تیز چلا رہے ہو ڈرائیور، مزے مزے سے چلاؤ" سخاوت کی بات کے جواب میں کچھ کہنے سے قبل نوشین نے ڈرائیور سے کہا اور پھر سخاوت کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر بولی "اگر فرض کرو میرے بابا کی اور تمہاری دشمنی نکل آئی تو کیا تم اپنی محبت سے منکر ہو جاؤ گے؟"

سخاوت خان نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا "اگر میں آج قتل ہو گیا تو میرے ہاتھ سے ویسے ہی محبت کا دامن چھوٹ جائے گا اور قتل نہیں ہوا تب تو میں روز ہی تم پر قربان ہوتا رہوں گا۔ تمہاری باتوں سے میں نے کچھ کچھ اندازہ لگا لیا ہے، لیکن میں بزدل نہیں ہوں۔ تمہارے بابا سے ضرور ملوں گا۔ تاکہ جو شک میرے ذہن میں ابھر رہا ہے اس کی تصدیق کر لوں۔ میں خان آدم خان کی اولاد ہوں۔ بڑے خان کی بہت لوگوں سے دشمنی ہے۔ ممکن ہے تمہارے بابا بھی انہی لوگوں میں سے ہوں۔"

"یہ تو آپ چل کر دیکھیں" نوشین نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا "ایک بات میں جانتی ہوں، اگر میرے بابا آپ کو قتل کرنا چاہتے تو اسی دن قتل کر دیتے جس دن آپ اپنے نئے مکان میں آئے تھے۔ میرے خیال میں یہ تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ وہ آپ کو بغیر قتل کئے گھر آئے تھے اور پھر مجھ سے کہا تھا بیٹی، کسی کو قتل کرنا انتقام لینے کا سب سے کمزور اور آسان طریقہ ہے۔ میں اپنے دشمنوں سے آسان طریقے والا کمزور انتقام لینا نہیں چاہتا۔"

"بات تو تمہارے بابا نے بہت پتے کی کہی تھی۔"

آپ کو شاید یاد نہ ہو میں آپ کے قریب خود آئی تھی۔"

"میں نے محسوس نہیں کیا تھا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ پہلی ہی نظر میں میرے دل نے تمہیں قبول کر لیا تھا اور پھر میں خود ہی تمہارے آگے پیچھے رہنے لگا تھا۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا اسی دن میں نے عالم نواز سے تمہاری بات کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ میں نے اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کر لیا ہے۔ اس نے میرا مذاق تو بہت اڑایا تھا، لیکن جب اس نے دوسرے دن تمہیں دیکھا تو میرے انتخاب کی اسے داد ہی دینی پڑی تھی۔"

"میرا اپنا عالم بھی شاید یہی تھا" نوشین نے دبی دبی آواز میں کہا "میں نے بہت دنوں تک بابا کو یہ نہیں بتایا کہ میری اور آپ کی ملاقات ہو چکی ہے۔ لیکن جب وہ چھٹیاں گزار کر شپ پر جانے لگے تو میں نے ان سے کہا تھا کہ میں آپ سے مل چکی ہوں۔ بابا کے دل میں کیا تھا، وہ آپ کی اور میری ملاقات کیوں چاہتے ہیں، اس کا مجھے علم نہیں تھا اس کے باوجود بھی انہیں یہ اطلاع دیتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ انہوں نے چند لمحے میری صورت کو غور سے دیکھا اور بڑبڑائے۔ "شاید اب تم مجھے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دو گی" اتنا کہہ کر وہ شپ پر چڑھ گئے تھے۔ میں ان کے کہے ہوئے فقرے پر بہت غور کرتی رہی، لیکن اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ابھی اپنی بیماری کے دوران انہوں نے اچانک ہی مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تم سخاوت سے محبت کرنے لگی ہو؟ اس سوال کا فوراً جواب دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ جب میں تھوڑی دیر تک خاموش رہی تو انہوں نے کہا کہ تمہاری خاموشی اس بات کی علامت ہے کہ......"

"تم کہہ دیتیں اپنے بابا سے کہ ہاں' میں سخاوت سے محبت کرتی ہوں" سخاوت نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"یہ فقرہ تو ابھی تک میں اپنے آپ سے بھی نہیں کہہ سکی۔" نوشین نے سخاوت سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ اس کے حسین چہرے پر حیا کے رنگ کھیلنے لگے تھے۔ لیکن ٹیکسی میں موجود تاریکی ایک پردہ ہی تھی سخاوت اور اس کے درمیان۔

"حالاں کہ تمہیں اپنے آپ سے ہزار بار کہنا چاہئے تھا۔"

"اب کہہ لوں گی۔"

"یہاں سے گذری شروع ہے صاحب' اب کس طرف جانا ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور نے قدرے تیز آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے" نوشین نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اور پھر سخاوت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "گھر تک ٹیکسی لے چلیں کہ آگے جا کر اتر جائیں؟ تھوڑا فاصلہ پیدل بھی طے کر لیتے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے' کچھ پیدل بھی چلتے ہیں تاکہ میری لاش تمہیں گھر سے سڑک تک لانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے" سخاوت نے ہلکی آواز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کے محسوسات یہی ہیں تو ٹیکسی آپ کے گھر کی طرف بھی جا سکتی ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ آپ میری لاش سڑک پر دیکھنا پسند کرتے ہیں یا گھر میں" نوشین نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ڈرائیور' رک جاؤ" سخاوت خان نے کہا۔ جب ٹیکسی فٹ پاتھ کے ساتھ لگ کر رک گئی تو سخاوت نے نوشین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چلو اب نیچے اترو' تم بہت بڑی بڑی باتیں کرتی ہو۔ جب وقت پڑے گا تو ان باتوں کی سچائی بھی آزمالوں گا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کو سخاوت خان نے کرایہ دیا اور پھر دونوں دائیں طرف جانے والی ایک ذیلی سڑک پر مڑ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی نوشین ایک مکان میں داخل ہو رہی تھی "آپ چند لمحے یہاں رکیں' میں آپ کے بیٹھنے کا انتظام کر کے آتی ہوں۔"

سخاوت خان یہاں تک تو پہنچ گیا تھا' لیکن پتا نہیں کیوں بار بار اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا آخری وقت آگیا ہو۔ یہ بات تو اس کی سمجھ میں آ ہی گئی تھی کہ نوشین اس کے بابا کے دشمن فراز خان کی لڑکی ہے۔ فراز خان کے بارے میں نوشین نے جو کچھ بتایا تھا اگر سخاوت خان اسے سچ تسلیم کر لیتا تو پھر جو چار چھ قتل اس نے فراز خان کے کھاتے میں ڈالے تھے انہیں کہاں ڈالتا؟ آدم خان نے تو فراز خان کے کھاتے میں پورے بائیس قتل لکھے ہوئے تھے' لیکن سخاوت خان کے علم میں یہ بات تھی اور اس نے کچھ اندازے بھی لگائے تھے کہ ان بائیس افراد کا قاتل فراز خان نہیں ہے۔ ایک بات یہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ فراز خان اس سے کس انداز کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ یہ بات اب اس کے علم میں تھی کہ نوشین اس سے محبت کرتی ہے اور اگر وہ چاہے گا تو وہ بغیر کسی تاخیر کے اس سے شادی پر آمادہ ہو جائے گی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟ آئیں اندر۔" نوشین نے دروازے میں سے آواز دی۔

سخاوت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا "میں سوچ رہا تھا کہ میرے اور موت کے درمیان اب فاصلہ صرف چند گز کا رہ گیا ہے۔"

"یوں نہیں' آپ کے اور محبت بھری زندگی کے درمیان فاصلہ صرف چند قدم کا رہ گیا ہے" نوشین نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "آئیں' بابا منتظر ہیں آپ کے۔ جب میں نے ان سے کہا کہ آپ آئے ہیں تو انہوں نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں زندگی میں پہلی بار جھوٹ بول رہی ہوں۔"

سخاوت خان نے فراز خان کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا حالاں کہ بیماری کی بنا پر وہ خاصا کمزور ہو گیا تھا "میں خان آدم خان کی اولاد ہوں' یہی وجہ ہے کہ اپنی موت تک خود چل کر آگیا ہوں۔" اس نے فراز خان کی چارپائی کے قریب پہنچ کر کہا۔

"کیا خان آدم خان نے تمہیں بزرگوں کو سلام کرنا نہیں سکھایا؟"

"سکھایا تو ہے" سخاوت خان نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے۔ فراز خان کے چہرے پر جو رعب اور جلال نظر آ رہا تھا اس نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ اس نے بے سوچے سمجھے ہی فقرہ کہا تھا۔

"پھر پہلے سلام کرو" فراز خان نے کہا "تم میرے گھر آئے ہو۔ پٹھان اپنے گھر آئے ہوئے دشمن پر کبھی وار نہیں کرتا۔ ہماری اس زندہ روایت کا علم تو تمہیں ہوگا۔ اگر نہیں ہے تو آج گرہ میں باندھ لو۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے قریب بیٹھ جاؤں؟" سخاوت خان نے نظریں جھکاتے ہوئے سلام کرنے کے بعد کہا۔

"کیوں نہیں' بیٹھ جاؤ۔"

سخاوت جب فراز خان کی چارپائی پر بیٹھ گیا تو نوشین نے کہا "میں چائے لے کر آؤں؟"

"ہاں' ضرور لاؤ" فراز خان نے کہا۔ جب نوشین کمرے سے چلی گئی تو اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "تم آدم خان کے بیٹے ہو۔ ممکن ہے تمہیں میری بات پر یقین نہ آئے' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آدم خان نے ایک حقیر سے زمین کے ٹکڑے کے لئے میرے خاندان کو تباہ کر دیا۔ اس کے آدمیوں نے میرے سامنے میرے دو لڑکوں کو قتل کیا۔ جس کے بیٹے قتل ہو جائیں اس کی رائفل سے گولیاں تو نکلتی ہیں۔ میری رائفل سے بھی گولیاں نکلنے لگیں اور پھر میرے گھر کے سامنے کے کھیت میدان جنگ بن گئے۔ پھر میں فرار ہو گیا۔ میری غیر موجودگی میں میری شریک حیات اللہ کے گھر چلی گئی۔ یہ نوشین بچی تھی' گاؤں والوں نے خان کے

خوف سے اس بچی کو سہارا دینے کی بھی جرأت نہیں کی۔ ایک رات مجھے موقع ملا اور اپنی بچی کو لے کر میں جنگلوں میں نکل گیا۔ مختصر یہ کہ میں یہاں پہنچا۔ جس کے گھر میں تم بیٹھے ہو' یہ میرا دوست ہے' اس نے میری بچی کو رکھنے کا وعدہ کیا تو میں نوشین کو اس کے سپرد کر کے ایک شپ پر چلا گیا۔ میرا یہاں رہنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ آدم خان کے آدمی کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

"جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں ان میں سے بیشتر باتیں میرے علم میں ہیں" سخاوت خان نے کہا "دشمنی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ میرا خیال ہے جب بھی آپ باہر سے آتے تھے بابا کے کچھ آدمیوں پر آپ کی رائفل گولیاں اگل دیتی تھی۔"

"نہیں' یہ غلط ہے" فراز خان نے کہا "میں اپنی تباہی کا انتقام کسی اور طرح لینا چاہتا تھا' لیکن جب میں اس طرح کا انتقام لینے کے قابل ہوا تو میری نوشین درمیان میں آگئی۔ یہ بات میں نے محسوس کرلی ہے کہ اب تمہارے سلسلے میں نوشین میرے کہنے پر عمل نہیں کرے گی اور آج ..... آج تو وہ غیر متوقع طور پر تمہیں لے کر یہاں پہنچ گئی۔"

"آپ کس انداز کا انتقام لینا....."

"میرا خیال ہے' اب بات ختم کی جائے" نوشین نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ٹرے تھامے ہوئے تھی۔ جس میں چائے اور دیگر لوازمات سجے ہوئے تھے "بابا نے ٹھیک کہا' میں کسی سے کوئی انتقام لینے کی اب قائل نہیں ہوں۔ ہاں' اگر کوئی اب بھی اپنے انتقام کی آگ کو ہمارے لہو سے بجھانا چاہتا ہے تو ہم اس کے لئے تیار ہیں۔ ہم خاندان کے اب دو ہی فرد ہیں۔ بابا کا یوں بھی اب آخری وقت ہے اور میں موت سے نہیں ڈرتی۔"

"موت سے ڈرنے یا نہ ڈرنے کی بات نہیں ہے" سخاوت نے کہا "ہم میں سے شاید کوئی بھی موت سے نہیں ڈرتا۔ بات اصول کی ہے۔"

"بڑے خان تو اصول خود بناتے ہیں" فراز خان نے کہا۔ "تمہارے باپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ مجھ سے میری زمین اور میرا آبائی مکان چھینے لیکن اس نے کہا' تمہاری زمین میری زمین کے درمیان ہے اور یہ آبائی مکان اصولی طور پر اب بے کار ہو چکا ہے۔"

"کیا وہ آپ کی زمین اور مکان خریدنا چاہتے تھے؟"

"ہاں' خریدنا چاہتا تھا لیکن کوڑیوں کے مول" فراز خان نے پُرجوش آواز میں کہا "جب میں نے انکار کر دیا تو پھر اس نے اپنی خانی دکھائی۔ میری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو آدم خان کی رگوں میں ہے۔ ہم ایک ہی دادا کی اولاد ہیں اور ایک ہی قبیلے کے دو خاندان۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ وہ مجھے دبا لیتا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرا باپ اس کے باپ سے غریب تھا۔ اس نے اپنا سب کچھ بمبئی جیسے شہر میں اڑا دیا تھا۔ دولت اور زمین زیادہ نہ ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آدمی نیچ اور کم ذات ہو جائے۔ آدم خان کے پاس جنوب کی طرف حد نظر تک جو زمین ہے وہ میرے دادا ہی کی ہے۔ وہ کس طرح آدم خان کے باپ کے پاس پہنچی' یہ بھی میں جانتا ہوں' لیکن میں نے کبھی اس پر اپنا حق نہیں جتایا۔ میرے پاس جو زمین تھی وہ میرے مختصر سے خاندان کے لئے کافی تھی۔"

"پہلے چائے پی لیں" نوشین نے چائے بنا کر فراز خان اور سخاوت کے آگے رکھتے ہوئے کہا "باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

چائے پینے کے دوران نہ فراز خان نے کچھ کہا اور نہ ہی سخاوت نے زبان کھولی۔ نوشین دونوں کے چہروں کو دیکھ دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں' لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ دونوں کے چہروں سے ان کے دلوں کی باتوں کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن تھا۔

"اب میں چلوں گا" چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد سخاوت نے کہا۔

"نہیں' رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھالو" نوشین نے چائے سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کھانا میں پھر کسی وقت کھاؤں گا۔ فی الحال تو کھانا کیا' بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا ہے' اس لئے بہتر ہے کہ میں گھر جاؤں۔"

"جانے دو نوشین" فراز خان نے کہا۔

"میں پھر کسی وقت آپ کے پاس آؤں گا" سخاوت نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ضرور آؤ' میں تمہیں اسی گھر میں ملوں گا" فراز خان نے کہا تو سرسری انداز میں تھا لیکن اس چھوٹے سے فقرے میں جو کاٹ اور چیلنج تھا وہ صرف سخاوت خان ہی محسوس کر سکا تھا "اب میرا کہیں باہر جانے کا پروگرام نہیں ہے۔ بس اب تھک گیا ہوں اور پھر میں نے اتنا کچھ کما لیا ہے کہ میں ہی نہیں نوشین بھی زندگی بھر اسے خرچ نہیں کر سکیں گے۔"

"آؤ' میں تمہیں دروازے تک چھوڑ دوں" نوشین نے سخاوت کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں' میں چلا جاؤں گا" سخاوت کے انکار کے باوجود نوشین اسے دروازے تک چھوڑنے گئی۔

"اگر آج رات ٹھیک طرح نیند آگئی تو کل تم سے کلب میں ملاقات ہوگی" سخاوت نے جاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا "بابا کی باتوں نے طبیعت بوجھل کر دی۔"

نوشین کے گھر سے نکل کر جب سخاوت خان مین روڈ پر آیا تو اسے فوراً ہی ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھنے کے بعد

اس نے اپنے محلے کا نام لیا اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی۔ ٹیکسی نے جب رفتار پکڑی تو سخاوت نے نشست کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ فراز خان کا ایک ایک فقرہ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ اس کی باتوں میں بڑی کاٹ تھی۔ سخاوت نے سوچا' قصور میرے بابا ہی کا ہے' لیکن یہ بات بابا کو سمجھانا ناممکن ہی ہے۔ وہ اپنے مقابلے میں کسی کو گرادانتے ہی نہیں۔ وہ جب تک زندہ ہیں' فراز خان کی تلاش کرتے رہیں گے اور مرتے وقت وصیت کرجائیں گے کہ میری جائداد کے حقداروں پر لازم ہے کہ وہ فراز خان سے انتقام لیں۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔ اگر فراز خان اللہ کی طرف سے آنے والی موت کا نوالہ بن جائے تو اس کی بیٹی کو تلاش کرکے اس سے اپنے باپ کے کیے کا انتقام لیں تاکہ میری روح کو سکون نصیب ہوسکے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اچانک ہی سخاوت کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ کیا فراز خان کے ملنے کی اطلاع بابا کو دے دوں؟ نہیں.... نہیں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ نوشین کی اور اپنی محبت کا مذاق اڑانے کے مترادف ہوگا۔ نوشین کا نام ذہن میں آتے ہی اس کا حسین اور معصوم چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

گھر پہنچنے کے بعد سخاوت خان بغیر کچھ کھائے ہی بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ رہنے والے دوستوں نے کھانے کے لئے بہت اصرار کیا' لیکن اس نے سردرد کا بہانہ کرکے انہیں ٹال دیا۔ بیڈ پر وہ رات گئے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک خیال اسے بار بار تنگ کررہا تھا۔ اگر بابا کو پتا چل گیا کہ میں ان کے دشمن کی لڑکی سے نہ صرف محبت کرتا ہوں بلکہ اسے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں تو کیا ہوگا؟ وہ.... وہ نوشین کے ساتھ مجھے بھی گولی ماردیں گے' لیکن ہمارے ہاں دشمنی کو دوستی میں بدلنے کے لئے لڑکیوں کا لین دین بھی تو ہوتا ہے۔ دشمن کی بیٹی سے شادی کرکے تجدید دوستی بھی تو کی جاتی ہے۔ پھر فراز خان اور میرے بابا ایک دادا کی اولاد بھی تو ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں کوشش کرنی چاہئے۔ ممکن ہے بابا کے ذہن میں یہ نکتہ آہی جائے کہ فراز خان کی بیٹی کو گھر کی بہو بنا کر پرانی دشمنی کو دوستی میں بدل لیا جائے۔ نہیں.... نہیں۔ بابا کے ذہن میں یہ نکتہ نہیں آئے گا۔ کیوں کہ فراز خان بابا کا ہم پلہ نہیں ہے۔ سرحد کا بڑا خان کسی قلاش خان سے دوستی کی تجدید بھلا کیوں کرے گا؟ پھر.... پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟ یہی وہ سوال تھا جس نے سخاوت خان کو ٹھیک سے سونے نہیں دیا۔

صبح گیارہ بجے سے پہلے اس نے بستر نہیں چھوڑا تھا۔ ناشتا کرنے سے پہلے تک تو اس کا خیال تھا کہ وہ ناشتا کرکے یونیورسٹی چلا جائے گا' لیکن ناشتے کے بعد اس نے ارادہ ملتوی کردیا۔ گھر میں سوائے اس کے کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے تینوں دوست ناشتے کے بعد ہی چلے گئے تھے۔ اب ان کی واپسی کا امکان شام سے پہلے نہیں تھا۔ میں دن بھر گھر میں کیا کروں گا' اس نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے سوچا' نوشین یقیناً یونیورسٹی پہنچ گئی ہوگی۔ اس کے ساتھ وقت بہتر انداز میں گزر سکتا ہے.... نہیں' اگر اس کی زبان سے کوئی کچوکے لگانے والا فقرہ نکل گیا تو پھر پورا دن تباہ ہوجائے گا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس خیال سے گھر سے نکل گیا کہ گھر میں پڑے رہنے سے تو بہتر ہے کہ شہر کا گشت کرکے اور سینی شو دیکھ کے وقت کاٹا جائے۔

وہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اسے نوشین نظر آگئی۔ وہ ایک رکشے سے اتر رہی تھی۔

"میں رات ہی سمجھ گئی تھی کہ آپ کی رات ہی نہیں دن بھی بیکار ہوجائے گا" نوشین نے اس کے قریب پہنچ کر کہا "کہاں کے ارادے تھے؟"

"ابھی تو ٹیکسی کا انتظار کررہا تھا" سخاوت نے آہستہ سے کہا "ٹیکسی میں بیٹھ کر فیصلہ کرتا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے' پہلے ٹیکسی کرلیں' پھر فیصلہ کریں کہ اب ہمیں کہاں جانا چاہئے" نوشین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سنجیدہ ہوجاؤ نوشین' میرا ذہن بہت الجھا ہوا ہے۔"

"تو کیا آپ کے خیال میں میرا ذہن کم الجھا ہوا ہے؟" نوشین نے اداس سے لہجے میں کہا "میں بھی رات بھر نہیں سو سکی ہوں۔"

"اب ہمیں کرنا کیا چاہئے؟"

"کس سلسلے میں؟"

"شادی کے سلسلے میں" سخاوت نے کہا "نوشین تم میری پہلی اور آخری محبت ہو' اور میں تم سے شادی بھی کرنا چاہتا ہوں' لیکن اگر بابا کو پتا چل گیا کہ تم خان فراز خان کی بیٹی ہو تو پھر....."

"ہاں پھر وہ یہ بھول جائیں گے کہ ان کا بیٹا مجھ سے محبت کرتا ہے" نوشین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اگر ہم بابا کے علم میں لائے بغیر ایک دوسرے کے ہوجائیں تو؟"

"یہ ایسے ہی ہوگا جیسے کریلا اور نیم چڑھا۔"

"پھر... پھر کیا کریں؟" سخاوت خان نے لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا "تمہارے ذہن میں کوئی تجویز ہے؟"

"فی الحال تو ہم نمائشی مقابلے جیتنے کی کوشش کریں۔ مقابلے جیتنے کے بعد ہم لوگ حکومت کے خرچ پر بیرون ملک دورے پر جائیں گے تو وہاں بیٹھ کر سوچ لیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اس سے قبل کسی بات پر غور کرنا وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔ دن بہت کم ہیں اور ہمیں اپنی مشقوں کو تیز کرنا ہے۔"

"تم نے اپنے بابا سے بات کی تھی؟" سخاوت نے نوشین کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"بابا خود ہی سب جانتے ہیں' ان سے بات کرنے کا فائدہ؟"

"ممکن ہے ان کے ذہن میں ہمارے جنم جنم کے ملاپ کے سلسلے میں کوئی منصوبہ ہو۔"

"ان کے ذہن میں جو منصوبہ تھا وہ تو ہم دونوں کی محبت نے تباہ کر دیا۔" نوشین نے پُرخیال انداز میں کہا "وہ مجھے نکاح کے بعد کنواری بیوہ بنانا اور تمہاری جائداد ولانا چاہتے تھے۔ یہ بات انہوں نے مکمل کر نہیں کہی' لیکن میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں اپنے باپ کے کہنے پر ہی آپ کے قریب آئی تھی۔"

"اب صورت حال یہ ہے کہ اگر ہماری محبت کا علم بھی میرے بابا کو ہو گیا تو وہ مجھے زندگی بھر کنوارا رہنے پر مجبور کر دیں گے' اور اگر ہم نے شادی کرنے کے بعد انہیں بتایا تو پھر معاملہ زیادہ سنگین ہو جائے گا۔ میں رات سے کسی ایسی اسکیم پر غور کر رہا ہوں کہ تم بھی حاصل ہو جاؤ اور بابا بھی ناراض نہ ہوں۔"

"میرا خیال ہے یہ ممکن نہیں ہے۔"

"تو پھر فی الحال اس مسئلے پر غور ہی نہ کرو۔ ملک سے باہر جانے کے بعد غور کریں گے۔"

"مگر فرض کرو ہم ملک سے باہر نہ جا سکیں پھر...."

"پھر دونوں مل کر خودکشی کر لیں گے" نوشین نے مسکرا کر کہا "آپ الجھئے نہیں' ہو رہے گا جو نہ کچھ گھبرائیں کیا۔"

انہیں مین روڈ کے کنارے کھڑے کھڑے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کا احساس سخاوت ہی کو پہلے ہوا تھا "بہت دیر ہو گئی ہمیں یہاں کھڑے ہوئے۔"

"تو پھر میرے گھر چلو" نوشین نے کہا "پانچ بجے تک گھر رہیں گے اور پھر دونوں کلب چلیں گے۔"

سخاوت نے چند لمحے نوشین کی تجویز پر غور کیا اور پھر بولا "ٹھیک ہے۔ میں ٹیکسی روکتا ہوں۔"

●●●★★●●●

اسٹار کراٹے کلب کی وہ لڑکیاں اور لڑکے جنہیں نمائشی مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے منتخب کیا گیا تھا' انتہائی جوش اور ولولے سے تیاریوں میں مصروف تھے۔ تیاری کے آخری تین دنوں میں تو یہ جوش اور ولولہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ یہی نہیں' ساجد کمال نے ان لڑکیوں اور لڑکوں کے حفاظتی انتظامات بھی سخت کر دیئے تھے۔ ہر لڑکی اور لڑکے کو مسلح افراد گھر سے لے جا رہے تھے اور گھر پر چھوڑ رہے تھے۔ عالم نواز' سخاوت خان اور نوشین نے یہ تین دن ایک ساتھ ہی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ نوشین ہی کی تجویز پر عالم نواز اور سخاوت اس کے گھر رہنے لگے تھے۔ پہلے دن جب چند مسلح افراد کلب کی طرف سے ان تینوں کو لینے گھر پہنچے تو سخاوت نے یہ کہہ کر انہیں واپس کر دیا کہ ہم تین ہیں اور اپنی حفاظت بہتر انداز میں کر سکتے ہیں اس لئے آپ لوگ جائیں ہم آ جائیں گے۔ بے وجہ تماشا بنانے سے فائدہ کیا ہے۔ ان لوگوں نے بہت اصرار کیا' لیکن جب نوشین نے دھمکی دی کہ اگر ایسی صورت رہی تو ہم لوگ کلب ہی نہیں آئیں گے۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد عالم نواز نے کہا "میرا خیال ہے معاملات بہت گمبھیر ہو گئے ہیں۔ ساجد کمال غیر معمولی انداز میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

"لڑائی مالکان کے درمیان ہے" سخاوت نے کہا۔

"ایسا نہیں ہے' لڑائی سازشی اور جرائم پیشہ افراد کے سرپرست مالکان اور ایک شریف مالک کے درمیان ہے" نوشین نے کہا "اور یہ اتفاق ہی ہے کہ ہم شریف مالک کے حصے میں آ گئے۔ سنا ہے صوبائی حکومت سے جیتنے والے کلب کو لمبی امداد ملنے کی توقع بھی ہے۔"

"اور یہ رقم بیرون ملک دورے پر خرچ کر دی جائے گی" عالم نواز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں' دورہ تو حکومت اپنے خرچ پر خود کرائے گی۔ یہ رقم صوبائی حکومت مارشل آرٹ کے فروغ کے لئے دے گی اور ہر سال دیتی رہے گی" نوشین نے کہا۔

"ہو گا بھئی' ہم لوگ کیوں یہ سوچ کر وقت برباد کریں؟ چلیں اب گھر سے نکلیں' دیر ہو رہی ہے۔"

"نوشین' تم تیار ہو؟" سخاوت نے پوچھا۔

"ہاں چلیں!"

"ایک ریوالور میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے' عالم ایک تم اپنے پاس رکھ لو" سخاوت نے ریوالور عالم نواز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "کیا پتا ان کی ضرورت پڑ ہی جائے۔"

"ریوالور تو نوشین کے پاس بھی ہونا چاہئے۔"

"میرے پاس اپنا ہے" نوشین نے اپنے پرس کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں کبھی خالی ہاتھ کلب نہیں جاتی ہوں۔"

"چلانا بھی آتا ہے یا صرف....؟"

"نہ صرف مجھے چلانا آتا ہے بلکہ میرا ہاتھ بھی کبھی بہکتا نہیں۔" نوشین نے عالم نواز کی بات کاٹ کر کہا۔

"ٹھیک ہے' اب نکلیں گھر سے" سخاوت نے بیرونی دروازے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

گھر سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی انہیں ٹیکسی مل گئی تھی۔ نوشین اور سخاوت خان پچھلی نشست پر تھے جب کہ عالم نواز ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بیٹھا تھا۔ تین تلواروں والا چوراہا کراس کرنے کے بعد ہی عالم نواز کو احساس ہوا تھا کہ ان کا تعاقب ہو رہا ہے۔ ایک دوسری ٹیکسی تھوڑی فاصلے سے ان کے پیچھے آ رہی تھی "ڈرائیور صاحب' ذرا رفتار تیز کرنا" عالم نواز نے کہا۔ ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی۔ چند لمحوں کے لئے پیچھے والی ٹیکسی اور ان کی ٹیکسی کے درمیان کا فاصلہ بڑھا اور پھر اتنا ہی ہو گیا جتنا پہلے تھا "ہمارا تعاقب ہو رہا ہے" عالم نواز نے سخاوت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ممکن ہے کسی مناسب جگہ ہم پر حملہ ہو جائے' ہوشیار رہو۔"

"یہ تو طے ہے کہ تعاقب کرنے والے لوگ ہمیں جان سے

ختم نہیں کریں گے" سخاوت نے کہا "ان کی کوشش ہمیں اغوا کرنے کی ہوگی اور ہم اس کوشش کو ناکام بنادیں گے۔"

"دشمن کو کبھی حقیر مت سمجھنا خان!" عالم نواز نے کہا "ڈرائیور صاحب، آپ ہماری باتیں تو سن رہے ہیں۔"

"ہاں میں سن رہا ہوں۔"

"گھبراہٹ تو طاری نہیں آپ پر؟"

"اس کا اندازہ آپ کو حملے کے بعد ہوگا" ڈرائیور نے بریک پر ہلکا سا پاؤں رکھ کر ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"پھر ٹھیک ہے بھئی گاڑی چلاتے رہو" عالم نواز نے کہا۔

"ڈرائیور صاحب، راستے میں کون سی ایسی جگہ ہے، جہاں ہماری ٹیکسی کو روکا جا سکتا ہے؟" سخاوت نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"ہم مین روڈ پر ہی چلیں گے، اس لئے راستے میں کہیں ہمیں روکنے کی وہ شاید ہی کوشش کریں" ڈرائیور نے قدرے تیز لہجے میں کہا "ویسے ہم پر فائرنگ تو وہ اس سڑک پر کہیں بھی کر سکتے ہیں۔ میری گاڑی کو نقصان پہنچا صاحب، تو وہ آپ لوگ پورا کریں گے ورنہ میں مناسب جگہ ٹیکسی کھڑی کرتا ہوں آپ لوگ اتر جائیں۔"

"یہ تو آپ نے بزدلی کی بات کردی" عالم نواز نے کہا "گاڑی کے نقصان کا بہانہ کرکے آپ ہم سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔"

"یہ بات نہیں صاحب، ٹیکسی میری اپنی نہیں بھاڑے کی ہے۔ مالک مجھ سے نقصان بھروا لے گا۔"

"ٹھیک ہے، اگر نقصان ہوا تو ہم پورا کریں گے، تم چلتے رہو۔" سخاوت نے کہا "تم نقصان کی پرواہ مت کرو۔ نقصان چاہے کتنا ہی ہو دشمن اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوں، تب تو بات ہے۔ سمجھ گئے میری بات؟"

"ٹھیک ہے صاحب، میں سمجھ گیا ہوں بالکل سمجھ گیا ہوں۔" ڈرائیور نے سرگوشیانہ انداز میں کہا اور ٹیکسی کی رفتار میں اضافہ کردیا۔

نوشین اس دوران میں خاموش ہی رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اور مسئلے کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ اس کی مسلسل خاموشی دیکھ کر سخاوت نے کہا "تم فکر مت کرو نوشین، میں اکیلا ہی دس پر بھاری ہوں۔ انشاء اللہ کسی بندے کو میں تم تک پہنچنے ہی نہیں دوں گا۔"

"میرا اپنے بارے میں بھی یہی خیال ہے کہ میں دس پر بھاری ہوں" نوشین نے کہا "میں آپ کو موقع ہی نہیں دوں گی کہ آپ میری مدد کو پہنچیں، جب تک زندہ رہوں گی کسی کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دوں گی۔ اتنا ہنر تو مجھے آتا ہے۔"

وہ لوگ باتیں کررہے تھے اور ان کی ٹیکسی رفتہ رفتہ کلب کے قریب ہوتی جارہی تھی۔ پیچھا کرنے والی ٹیکسی اور ان کی ٹیکسی کے درمیان فاصلہ جوں کا توں ہی رہا اور وہ لوگ کلب تک پہنچ گئے

"ڈرائیور صاحب!" عالم نواز نے کہا "اس سامنے والی عمارت کے گیٹ کے سامنے روک دو۔"

ڈرائیور نے جیسے ہی ٹیکسی روکی وہ تینوں بہت پھرتی سے باہر آئے۔ انہوں نے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ دوسری ٹیکسی ان کی ٹیکسی سے چند فرلانگ ہی کے فاصلے پر رکی تھی۔ چند لمحے تو وہ تینوں چوکنا سے حملے کے منتظر رہے لیکن جب دوسری ٹیکسی سے اترنے والے افراد کو انہوں نے دیکھا تو تینوں کے لبوں پر ایک ساتھ مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ وہی افراد تھے جو نوشین کے گھر انہیں لینے کلب کی طرف سے آئے تھے۔

"آپ ناراض نہ ہوں جناب!" ان میں سے ایک نے ان کے قریب پہنچ کر کہا "آپ لوگوں کے تعاقب میں آنا بہت ضروری تھا۔ ہم لوگوں نے آپ سب کی حفاظت کرنے کا معاوضہ لیا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو کچھ ہوگیا تو ہم ساجد کمال صاحب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ جب آپ لوگ گھر جائیں گے تب بھی ہم پیچھے ہی ہوں گے اور کل آپ کو لینے بھی آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے جناب، آپ اپنی ڈیوٹی کریں" سخاوت نے کہا "لیکن آپ شاید اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ ہم اپنی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔"

"ممکن ہے ایسا ہو" اس شخص نے کہا اور پھر اپنے دیگر ساتھیوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔ نوشین، سخاوت اور عالم نواز کلب کی عمارت میں داخل ہوگئے۔

رات آٹھ بجے تک کلب میں مشقیں کرنے کے بعد جب وہ لوگ گھر جانے کے لئے باہر آئے تو گیٹ پر دو ٹیکسیاں پہلے ہی سے کھڑی تھیں "آپ لوگ اس ٹیکسی میں بیٹھ جائیں ہم لوگ دوسری ٹیکسی میں بیٹھیں گے" اس شخص نے کہا جو ان کے محافظوں کا لیڈر تھا۔

دوسرے دن شام پانچ بجے وہ لوگ کلب جانے کے لئے تیار ہوگئے تھے "میرا خیال ہے دس منٹ اپنے محافظوں کا انتظار کرلینا چاہئے" نوشین نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"انتظار کیوں کریں، جب انہوں نے آنے کو کہا تھا تو پھر انہیں وقت پر آنا چاہئے تھا" سخاوت نے کہا۔

"ممکن ہے کوئی وجہ ہوگئی ہو۔"

"ٹھیک ہے، دس منٹ انتظار کرلیتے ہیں" عالم نواز نے کہا۔

دس منٹ کے بجائے انہوں نے پندرہ منٹ انتظار کرلیا، لیکن وہ لوگ نہیں آئے تو پھر وہ گھر سے باہر آئے۔ انہیں ٹیکسی ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ کلب پہنچے تو انہیں گیٹ ہی پر کہا گیا کہ وہ دفتر میں چلے جائیں۔ دفتر میں سارے ہی قابل ذکر لڑکے اور لڑکیاں جمع تھیں۔ وہ تینوں بھی ایک طرف جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے پہنچنے کے شاید پانچ منٹ بعد ہی ساجد کمال دفتر میں داخل ہوا تھا۔ اس نے تمام لڑکیوں اور لڑکوں پر سرسری انداز میں نظر ڈالنے کے بعد کہا

"آج کی یہ ہماری میٹنگ ایک طرح سے ہنگامی میٹنگ ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو ایک اطلاع دینے' ایک خبر سنانے کے لئے جمع کیا ہے۔ جن نمائشی مقابلوں میں ہم شریک ہو رہے ہیں' پہلے یہ مقابلے پاکستان گیر بنیاد پر کرانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ پھر مقابلے منعقد کرانے والی خود ساختہ کمیٹی نے ان مقابلوں کو صوبہ سندھ تک محدود کر دیا۔ اس تبدیلی پر ہم اس سے مکمل بات کر چکے ہیں۔ اب ایک اور تبدیلی ہو گئی ہے۔ ہمارے علاوہ کراچی کے جو چار بڑے کلب ہیں وہ ان مقابلوں میں برائے نام ہی شرکت کر رہے ہیں۔ یہ بات سیٹھ ابراہیم' ستار شیخ اور ناصر خان نے مجھے بتائی۔ یہ تینوں آج میرے دفتر آئے تھے۔ انہوں نے جمیل بیگ پر الزام لگایا ہے کہ اس نے ان کے ساتھ فراڈ کیا اور تقریباً چھ لاکھ روپے وصول کر لئے۔ دو دن قبل اس نے مزید رقم کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ صوبائی حکومت کے ذمے دار افسران امداد منظور کرانے سے قبل ہی رشوت لینے کی بات کر رہے ہیں اور انہیں کم و بیش دس لاکھ روپے پہلے ادا کرنے پڑیں گے تو وہ پچاس لاکھ روپے سالانہ کی امداد منظور کرا دیں گے۔ جمیل بیگ نے چند افسران اور ایک وزیر کا نام بھی لیا تھا۔ اب یہ اتفاق ہی کی بات ہے کہ ان افسران اور وزیر موصوف سے ستار شیخ کے اچھے تعلقات ہیں۔ اس نے کہیں فوراً فوراً معلوم کیا تو پتا چلا کہ مارشل آرٹ کے فروغ کے لئے کوئی اسکیم زیر غور تک نہیں ہے تو بھلا امداد کی منظوری کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اس طرح جمیل بیگ کا فراڈ کھل گیا۔ اب ابراہیم سیٹھ وغیرہ جمیل بیگ کے ساتھ کیا کچھ کرتے ہیں یہ ان کا مسئلہ ہے' لیکن انہوں نے مجھ سے کہا کہ اب وہ ان مقابلوں کو ملتوی کرا دیں گے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا" عالم نواز نے تیز آواز میں کہا "مقابلوں کا ملتوی ہونا۔۔۔"

"مقابلے ملتوی ہوں گے اور نہ ان کے ختم کرنے کا اعلان کمیٹی کرے گی" ساجد کمال نے کہا "اب یہ مقابلے اسٹار کرانے کلب کی سرپرستی میں ہوں گے اور اس سلسلے میں جو اخراجات کئے گئے ہیں یا جو ہوں گے وہ سب ہمارا کلب برداشت کرے گا۔ یہ بات میں نے ابراہیم سیٹھ' ستار شیخ اور ناصر خان سے کر لی ہے اور کل صبح میں کمیٹی کو وہ رقم بھی ادا کر دوں گا جو اس نے ان مقابلوں کے انعقاد کے سلسلے میں جائز طور پر خرچ کی ہے۔ اب ہمارے کسی لڑکے اور لڑکی کے اغوا ہونے کا خطرہ بھی ٹل گیا ہے۔"

"اب شاید بیرون ملک دورے کا پروگرام بھی ملتوی ہو جائے گا" سخاوت نے کہا۔

"نہیں' بیرون ملک یہاں سے اچھے فن کا مظاہرہ کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں کا ایک وفد جائے گا۔ یہ وفد زیادہ سے زیادہ دس افراد پر مشتمل ہو گا اور ان کے اخراجات صوبائی حکومت نہیں بلکہ اسٹار کرانے کلب برداشت کرے گا۔"

"آپ اس وفد کے سربراہ ہوں گے؟" نوشین نے پوچھا۔

"اگر آپ لوگ مجھے سربراہ کی حیثیت سے ساتھ لے جانے پر تیار ہوں گے تو میں ضرور چلوں گا۔"

"اسٹار کرانے کلب کے مالک کے سوا اس وفد کا سربراہ اور کون ہو سکتا ہے؟" ایک لڑکے نے انتہائی دھیمی آواز میں کہا۔

"مال بھی تو خرچ کریں گے وہ" دوسرے نے بھی سرگوشی کی۔

"اب خطرہ تو ٹل گیا" عالم نواز نے کہا "اب ہمیں نوشین کے گھر سونے کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں ہمیں نوشین ہی کے گھر سونا چاہئے" سخاوت نے کہا "یہ دشمن کی چال بھی ہو سکتی ہے۔"

"سخاوت ٹھیک کہہ رہے ہیں" نوشین نے کہا "ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ کل مقابلے ہو جائیں گے۔ پھر تو آپ نے اپنے گھر ہی سونا ہے۔ ایک رات اور دن کی میزبانی کا شرف مجھے مزید بخش دیجئے۔"

"چلو ہم نے بخش دیا" سخاوت نے کہا۔

کلب سے ان تینوں کی واپسی ساڑھے آٹھ بجے رات ہوئی تھی۔ اس رات کھانے پر فراز خان بھی ان کے ساتھ تھا۔ کھانے کے بعد رات گئے تک گپ شپ رہی۔ ان تینوں کی طرح فراز خان کا موڈ بھی بہت خوش گوار تھا۔ اس نے مقابلوں کے بارے میں اور ان تینوں کے جیتنے یا ہارنے کے سلسلے میں بھی بہت سی باتیں کیں۔

"مقابلوں میں تو ہم تینوں ہی جیت جائیں گے بابا' اور اس کے بعد باہر بھی ایک ساتھ ہی جائیں گے۔"

"اللہ کرے ایسا ہو' مجھے بہت خوشی ہو گی۔ اگر میری صحت نے ساتھ دیا تو میں بھی تمہارے ساتھ سفر کروں گا۔"

"آپ ہمارے ساتھ کس طرح چلیں گے بابا؟"

"میں اپنے خرچ پر چلوں گا۔ جس جہاز میں تم لوگ سفر کرو گے میں بھی اسی میں ہوں گا۔ جس ہوٹل میں تم لوگ ٹھہرو گے۔ اسی ہوٹل میں' میں بھی ٹھہر جاؤں گا۔"

فراز خان جب یہ سب کہہ رہا تھا تو سخاوت اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا' لیکن فراز خان کے چہرے پر اسے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جو خطرے کی علامت ہو۔ پھر اس نے سوچا کوئی باپ اپنی بیٹی کے ہونے والے شوہر کو قتل نہیں کر سکتا' اور وہ بھی ایسے شوہر کو جس سے اس کی بیٹی بے پناہ محبت کرتی ہو۔

"اگر فرض کریں جس ہوٹل میں ہم ٹھہریں گے اس میں آپ کو کمرا نہیں ملا تب؟"

"تب میں کسی اور ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا اور تمہیں اس کی اطلاع کر دوں گا" فراز خان نے بچوں کے سے انداز میں کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اب سونے کی تیاری کرنی چاہئے" عالم نواز نے کہا "کل دن بھری مشقت کرنی ہے۔"

دوسرے دن نمائشی مقابلوں میں اسٹار کراٹے کلب کی منتخب لڑکیوں اور لڑکوں نے بہترین فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ سخاوت خان، عالم نواز، شرافت علی، نوشین اور شبانہ دّرانی نے توجوں کو حیران کر دیا تھا۔ مقابلوں کے اختتام پر مہمان خصوصی نے فن کا بہترین مظاہرہ کرنے پر کراچی اور سندھ کے دیگر شہروں کے تیرہ لڑکوں اور آٹھ لڑکیوں کو انعامات دیے تھے۔ یہ انعامات اسٹار کراٹے کلب کی دو لڑکیوں نوشین اور شبانہ دّرانی اور تین لڑکوں سخاوت خان، عالم نواز، اور شرافت علی کے حصے میں بھی آئے تھے۔ انعامات کی تقسیم کے بعد ساجد کمال نے اپنی سربراہی میں بارہ انعام یافتہ فنکاروں کو بیرون ملک لے جانے کا اعلان کیا تھا۔ ان بارہ افراد میں پانچ اسٹار کراٹے کلب کے انعام یافتہ کھلاڑیوں کے نام بھی تھے۔ یہ اعلان سن کر سب سے زیادہ خوشی نوشین کو ہوئی تھی۔ اس خوشی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ چند ہفتے خطروں سے دور سخاوت کی رفاقت میں رہنے کا موقع مل رہا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ فراز خان نے نوشین سے کہا تھا کہ وہ سخاوت سے اس کی شادی کی بات بھی ملک سے باہر جانے کے بعد ہی کرے گا۔

جیتنے، انعام پانے اور باہر جانے والے وفد میں شامل ہو جانے کی ان تینوں کو اتنی مسرت ہوئی کہ وہ یہ بھول گئے کہ آج سب کو اپنے اپنے گھر جا کر سونا تھا۔ یہ بات سب سے پہلے عالم نواز کو اس وقت یاد آئی جب نوشین نے کہا کہ پہلے رات کا کھانا کھالیا جائے اور پھر مقابلوں میں ہونے والی مضحکہ خیز حرکتوں پر گفتگو ہوگی۔

"لیکن سخاوت خان، آج تو ہم دونوں کو اپنے اپنے گھر جانا چاہیے تھا" عالم نواز نے کہا۔

"یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے بیٹے" فراز خان نے خوش گوار لہجے میں کہا "اگر جانا ہی ہے تو پھر کھانے کے بعد چلے جانا۔"

"نہیں بابا، اب تو کل ہی جائیں گے" سخاوت خان نے نوشین کی طرف شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "معلوم نہیں پھر ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کب نصیب ہو۔"

"میرا خیال ہے دو ہفتے بعد ہی ہم لوگ یہاں سے اڑ جائیں گے۔ پھر تو تین چار ہفتے ایک ساتھ ہی کھانا نصیب ہوگا" عالم نواز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد بہت دیر تک مقابلوں پر ہی تبصرے ہوتے رہے۔ فراز خان بس ان کے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔

***

نوشین جب یونیورسٹی چلی گئی تو فراز خان بستر سے اٹھا اور بیس منٹ بعد ہی وہ ٹیکسی میں منگھوپیر کی سمت جا رہا تھا۔ ٹیکسی جب گذری کی حدود سے نکل گئی تو اس نے سوچا، مجھے نوشین کے آنے سے پہلے ہی گھر پہنچ جانا چاہیے۔ ورنہ اسے جواب دینا مشکل ہو جائے گا "تم بہت آرام آرام سے چل رہے ہو خان!" اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "اگر میں وقت پر نہیں پہنچا تو آدمی نکل جائے گا۔ رفتار بڑھادو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے اس کی توقع سے کچھ زیادہ ہی رفتار بڑھادی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اندازے سے دس منٹ پہلے ہی وحید خان کے مکان پر دستک دے رہا تھا "اوہو فراز خان تم! کہاں ہو، دو ماہ بعد نظر آئے ہو" وحید خان نے اس پر نظر پڑتے ہی کہا "میں تو سمجھ رہا تھا تم باہر چلے گئے ہو۔"

"گیا تو نہیں تھا، اب جا رہا ہوں۔ دو روز بعد یہاں سے نکل جاؤں گا" فراز خان نے مکان میں داخل ہوتے ہوئے کہا "اور کوئی تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں، میرے گھر میں اور کون ہوگا" وحید خان نے کہا "اس وقت تو کوئی دوست بھی نہیں آتا۔ یہاں تو رات آٹھ بجے کے بعد محفل جمتی ہے۔"

"خیر یہ بات مجھے معلوم تھی، بس یوں ہی پوچھ لیا" فراز خان نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "اب اس آخری کام کا وقت آگیا ہے جس کے سلسلے میں، میں نے تم سے بات کی تھی۔ میرے یہاں سے جانے کے ایک ہفتے بعد تمہیں وہ کام کرنا ہے۔"

"کام کیا ہے، یہ تم نے کبھی نہیں بتایا۔ بس یہی کہتے رہے کہ ایک آخری کام بھی میں تمہارے ہی ہاتھوں انجام دلانا چاہتا ہوں۔"

"وہ کام آج میں تمہیں بتادوں گا" فراز خان نے کہا "پہلے یہ دس ہزار روپے رکھ لو" اس نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکال کر وحید خان کی طرف بڑھایا۔ "دس ہزار میں کام ہونے کے بعد دوں گا۔"

"کام بھی تو بتاؤ؟" وحید خان نے لفافہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"کام وہی ہے جو تم پہلے کرتے رہے ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے تم نشانہ لئے بغیر فائر کرتے رہے ہو، اس بار نشانہ لے کر فائر کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے نشانہ لے کر فائر کروں گا، میرا نشانہ بہت صحیح ہے" وحید خان نے اس کے قریب چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "کیا مجھے صوابی جانا ہوگا؟"

"ہاں صوابی جانا ہوگا" فراز خان نے کہا "تین تاریخ کو آج سے ٹھیک بارہ دن بعد آدم خان صوابی جائے گا۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ ہر ماہ کی اس تاریخ کو وہ اپنے آبائی گھر جاتا ہے اور ایک رات ضرور گزارتا ہے۔ تین تاریخ ہی کی رات کسی پہر اس مکان میں کسی نے اس کے باپ کو گولی ماردی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اسی تاریخ کی رات یا دن میں اس کے سینے میں بھی گولی اتار دی جائے۔"

"لیکن مکان میں گولی چلانا ایک تو مشکل ہے، دوسرے میں اندر داخل ہونے کا خطرہ مول نہیں لوں گا۔ تم تو جانتے ہو خان کہ میں پہلے فرار کی جگہ کا انتخاب کرتا ہوں اور پھر گولی چلاتا ہوں۔"

"پھر راستے میں ٹھیک رہے گا۔ لیکن وہ شاید راستے میں کہیں کار روکے گا ہی نہیں' چلتی کار پر فائر کرکے کسی کو مار دینا مشکل ہے۔"

"خیر تم اسے بھول جاؤ کہ میں خان آدم خان کو کہاں اور کیسے ماروں گا" وحید خان نے کہا "بہر حال وہ تین تاریخ کو اس دنیا سے اٹھ جائے گا۔ وہ میرا بھی دشمن ہے' میں بہت پہلے اسے ختم کردیتا' لیکن تم نے مجھے روک دیا تھا۔ جب بھی میں اس کا نام سنتا ہوں' میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور اپنے بھائی کی لاش پگڈنڈی کے کنارے پڑی نظر آتی ہے۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ تم نے اتنے دنوں تک مجھے اس کے قتل سے کیوں روکا۔"

"وجہ میں اس وقت بتاؤں گا جب تم اسے قتل کرکے باقی دس ہزار روپے مجھ سے لینے آؤ گے" فراز خان نے کہا "آج میں تمہیں آدم خان کو قتل کرنے کے لئے رقم دے رہا ہوں اور پہلے اسے قتل نہ کرنے کے سلسلے میں رقم دیتا رہتا تھا۔"

"ہاں' مجھے تم نے آدم خان کو قتل نہ کرنے کے سلسلے میں بہت رقم دی" وحید خان نے کہا "میں اکثر سوچتا رہا ہوں کہ تم ایسا کیوں کررہے ہو لیکن کبھی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ زیادہ سے زیادہ میں اس نتیجے تک پہنچ سکا تھا کہ اسے تم خود اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا چاہتے ہو۔"

"خیر' اب تم اسے ختم کرکے میرے پاس آنا' پھر میں وجہ بھی بتادوں گا" فراز خان نے کہا "آدم خان کے قتل کے تین دن بعد ہی میں تم سے ملوں گا۔ اسی جگہ جہاں ہم اکثر ملتے رہے ہیں۔ قتل کے تین دن بعد چھ تاریخ کو۔"

"چھ نہیں' آٹھ تاریخ رکھو" وحید خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "ممکن ہے واپسی میں کوئی گھپلا ہوجائے۔"

"ٹھیک ہے' آنے والے مہینے کی آٹھ تاریخ" فراز خان نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا "اب میں چلتا ہوں۔"

"کیا تم آج بھی چائے نہیں پیو گے؟"

"آٹھ تاریخ کو نہ صرف چائے پی لیں گے بلکہ ساتھ کھانا بھی کھائیں گے۔"

"ٹھیک ہے' آؤ میں تمہیں دروازے تک چھوڑ دوں" وحید خان نے بھی چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

❁❁❁✱✱❁❁❁

تفریحی دورے پر اسٹار کراٹے کلب کے سربراہ ساجد کمال کی قیادت میں جو وفد کراچی سے چلا تھا اس کی پہلی منزل ریاض تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ سعودی عرب کے مختلف شہروں ہی کی زیارت کی جائے۔ ریاض کے لئے جس طیارے میں وفد سوار ہوا تھا' فراز خان بھی اسی طیارے میں تھا۔ ریاض پہنچنے کے بعد وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا جس ہوٹل میں سارے لڑکے لڑکیاں اور ساجد کمال ٹھہرا تھا۔

اپنے قیام کے دوسرے دن اس نے نوشین اور سخاوت خان کو اپنے کمرے میں بلایا۔ جب وہ دونوں آگئے تو اس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد کہا "ہم اس وقت بہت مقدس سرزمین پر ہیں۔ پروگرام کے مطابق ہم یہاں سے مکہ معظمہ بھی جائیں گے اور مدینہ منورہ بھی۔"

"ہاں بابا' نصیب والے ہی ان شہروں کی زیارت کرسکتے ہیں۔" نوشین نے مسرت سے مسکراتے ہوئے کہا "ہم لوگ ابھی یہی باتیں کررہے تھے۔"

"اس سرزمین پر پہنچنے کے بعد میں نے انجام خدا پر چھوڑ کر ایک فیصلہ کیا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم دونوں کو میرا یہ فیصلہ قبول ہوگا کیوں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو' یہ بات اب مجھ سے پوشیدہ نہیں رہی۔"

"آپ فیصلہ تو سنائیں بابا" سخاوت نے بے صبرانہ انداز میں پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ کل میں ایک اہم فرض سے سبک دوش ہوجاؤں" فراز خان نے دھیمی آواز میں کہا "اس سرزمین پر نکاح کی سعادت بھی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ نکاح کے بعد تم دونوں پہلے مکہ اور پھر مدینہ وفد کے ساتھ جانا اور پھر میری طرف سے لندن کے لئے روانہ ہوجانا۔ اگر تم لوگ چاہو گے تو میں بھی تمہارے ساتھ لندن چلوں گا۔ وہاں میرے کئی دوست ہیں۔ میں ان کے گھر ٹھہر جاؤں گا اور تم لوگ کسی ہوٹل میں رک جانا۔"

"لیکن بابا' یہاں اور نکاح!" سخاوت خان نے کہا "اپنے بابا کے بغیر میں کس طرح نکاح کرسکتا ہوں۔"

"نوشین کے ساتھ اگر تم نکاح کرو گے تو کہیں بھی تمہارے بابا شریک نہیں ہوں گے' اور اگر شریک ہوگئے تو پھر میری بیٹی زندہ نہیں رہے گی۔ کیا تم نوشین کو لاش کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہو' بولو کیا تم نے نوشین سے......"

"نہیں بابا' نوشین میری زندگی ہے" سخاوت نے کہا "لیکن میں بابا سے کیا کہوں گا؟"

"فی الحال تو اس نکاح کو چھپانا ہے" فراز خان نے کہا "یہ نکاح اس وقت تک راز رہے گا جب تک حالات سازگار نہیں ہوتے اور مجھے امید ہے کہ جب خان آدم خان کو یقین آجائے گا کہ پہلے دن کے جھگڑے کے بعد جو حالات پیدا ہوئے' جتنے لوگ مارے گئے' ان میں میرا ہاتھ نہیں ہے تو ممکن ہے صورت حال بہتر ہوجائے۔"

"صورت حال ضرور بہتر ہوگی بابا' اب تو میں بھی کوشش کروں گا۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے' کل دن بھی اچھا ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی!" سخاوت خان نے کہا۔

"بس اب تم لوگ جاؤ' میں نکاح کا بندوبست کروں گا اور

یہیں کسی اور ہوٹل میں تم دونوں کے لئے کمرا بک کرا دوں گا۔ اپنے ساتھیوں سے کہنا کہ یہاں تمہارے چند عزیز رہتے ہیں' تم دونوں دو تین دن ان کے گھر رہو گے۔"

فراز خان نے جیسا چاہا ویسا ہی ہوا۔ سخاوت خان اور نوشین کا نکاح ہو گیا۔ اس نکاح میں عالم نواز' ساجد کمال اور دو نوجوان بہت رازداری سے شریک ہوئے۔ نکاح کے بعد نوشین اور سخاوت تین دنوں کے لئے دوسرے ہوٹل میں منتقل ہو گئے' لیکن جب ریاض سے مکہ اور مدینہ کے لئے کوچ ہوا تو یہ دونوں بھی وفد میں شامل ہو گئے۔

چار تاریخ کی رات جب یہ لوگ جدہ میں تھے تو کراچی سے کلب کی طرف سے فون پر سخاوت خان کے والد خان آدم خان کے قتل کی اطلاع دی گئی۔ یہ خبر سن کر سخاوت کے تو جیسے ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ فراز خان نے سخاوت کو بہت دلاسا دیا اور پھر دوسرے ہی دن رخت سفر باندھ لیا گیا۔

پشاور جاتے ہوئے سخاوت خان' نوشین کو فراز خان کے پاس ہی چھوڑ گیا تھا۔ وہ بہت دل برداشتہ تھا۔ جاتے ہوئے اس نے فراز خان کے کندھے پر سر رکھ کر گلوگیر آواز میں کہا تھا "بڑے بھائی جرمنی میں ہیں۔ انہوں نے بھی وہاں کسی جرمن لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اس شادی کی خبر صرف مجھے ہے۔ بابا نہیں جانتے تھے۔ اگر وہ آتے ہیں تو پھر میں آزاد ہی رہوں گا' ورنہ پھر پشاور سے نکلنا میرے لئے مشکل ہو گا۔ نوشین کو میں بابا کے چالیسویں کے بعد ہی لے کر جاؤں گا۔"

"جو تم مناسب سمجھو کرو۔ میں اب زیادہ دن یہاں نہیں رہوں گا۔ ممکن ہے تمہارے بابا کے چالیسویں سے پہلے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں۔ اب میں اپنی باقی عمر سیرو سیاحت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ ویسے میری خواہش ہے کہ تم اور نوشین چند ماہ لندن میں گزار آؤ۔"

"میری اپنی خواہش بھی یہی ہے۔ پشاور جانے کے بعد ہی پتا چلے گا کہ میں لندن جا بھی سکوں گا یا نہیں۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ جب تم واپس آؤ تو میں تمہیں یہاں نہ ملوں۔ نوشین کو میں اس کے چاچا اور چاچی کے سپرد کر جاؤں گا۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر نوشین کو میرے گھر چھوڑ جانا۔ میرے ساتھ جو دو تین دوست رہتے ہیں انہیں میں کہہ دوں گا کہ اب میری بیوی یہاں رہے گی۔ گھر میں ایک نوکرانی اور ایک نوکر ہے گھریلو کام کے لئے۔ گیٹ پر چوکیدار ہوتا ہے۔ نوشین میرے آنے تک وہاں سکون سے رہے گی' وہاں ٹیلی فون بھی ہے۔ میرا اس سے رابطہ بھی رہے گا۔"

"ٹھیک ہے' تو میں نوشین کو وہاں چھوڑ جاؤں گا" فراز خان نے کہا۔

سخاوت کے پشاور جانے کے بعد فراز خان نے نوشین کو اس کے گھر لے جا کر چھوڑا اور یہ کہہ کر وہاں سے واپس ہوا کہ موقع ملا تو لندن جانے سے پہلے ملاقات کے لئے آ جاؤں گا' ورنہ تم سخاوت کو میری طرف سے دعا کہنا۔ میرا ارادہ دو ایک دن بعد یہاں سے روانگی کا ہے۔ نوشین کو اس کے گھر چھوڑنے کے بعد دوسرے دن وہ مقررہ وقت پر وحید خان سے ملاقات کے لئے گھر سے نکلا۔ وہ جب ملیر ندی پر ریلوے پل کے نیچے پہنچا تو وحید خان ایک سمت سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا "مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟" اس نے قریب پہنچنے کے بعد کہا۔

"نہیں ہم دونوں ہی ٹھیک وقت پر پہنچے ہیں" فراز خان نے کہا۔

"اندھیرا پھیلنے لگا ہے' اس لئے یہاں زیادہ دیر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ ہماری موجودگی مشکوک ہو ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ لاؤ رقم نکالو" وحید خان نے کہا۔

"تو میں تمہیں رقم ہی دینے تو آیا ہوں" فراز خان نے کہا اور پھر اس سے پہلے کہ وحید خان صورت حال کو سمجھ پاتا اس کے ماتھے میں سوراخ ہو گیا تھا۔ فراز خان نے جیب سے رقم کے لفافے کے بجائے ریوالور نکالا تھا اور پھر بہت پھرتی سے فائر کر دیا تھا۔ ریوالور پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اس لئے فضا کے کان فائر کی آواز تو نہیں سن سکے' البتہ وحید خان کی گھٹی گھٹی بے دم سی چیخ چند لمحوں کو فضا میں تھرتھرا کر ڈوب گئی۔

وحید خان جب تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تو فراز خان پل کے نیچے سے نکل کر فیوچر کالونی کی سمت تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ جس رفتار سے اس کے قدم اٹھ رہے تھے اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے اس کا ذہن چل رہا تھا۔ اگر وحید خان کو میں زندہ چھوڑ دیتا تو کبھی نہ کبھی یہ بات کہ میں نے ہی آدم خان کو مروایا ہے' سخاوت خان کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ وحید خان کو زندہ چھوڑنے کا مطلب اپنی بیٹی کا گھر برباد کرنے کے مترادف تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر سمت کا تعین کیا۔ وہ فیوچر کالونی کے درمیان سے ہو کر داؤد چورنگی سے نکلنا چاہتا تھا۔ اس نے جب محسوس کر لیا کہ وہ ٹھیک جا رہا ہے تو قدم آگے بڑھاتے ہوئے سوچا' میرا انتقام آج پورا ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آدم خان کو ٹھکانے بھی لگاؤں گا اور اس کی دولت اور زمین پر بھی قبضہ کرلوں گا۔ میری بیٹی اب آدم خان کی جائداد' دولت اور شان و دبدبے کی مالک بھی ہے۔ اب میرا یہاں رہنا بے کار ہے۔ دنیا بہت وسیع ہے' کہیں بھی نکل جاؤں گا۔

کراچی چھوڑنے سے قبل نوشین کو فراز خان نے ایک فون کیا تھا "بیٹی' جو کچھ میں چاہتا تھا وہ میں نے کر دیا۔ اب میں جا رہا ہوں۔ ہمیشہ کے لئے۔ خدا حافظ!" پھر اس سے پہلے کہ نوشین کچھ کہتی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ڈائجسٹ ملکیت: محترم اے ڈی چشتی صاحب (پاکپتن)

[illegible]

منظر امام

پُرسکون زندگی میں اچانک کوئی طوفان آجائے تو انسان ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے. فوری طور پر وہ یہ سمجھ ہی نہیں پاتا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ وہ معصوم دوشیزہ بھی باپ کی موت کے بعد پیش آنے والی صورتِ حال سے سخت پریشان تھی کہ ایک سانحے نے اُس کی سوچوں کا رُخ ہی بدل دیا۔ وہ ایک نازک کلی تھی مگر یکایک ہی شعلہ بن گئی. ایسا شُعلہ جو اپنے قریب آنے والی ہر شے کو جلا کر راکھ کر دے لیکن اُس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ وقت یہ کھیل کیوں کھیل رہا ہے اور جب اس راز سے پردہ اُٹھا تو وہ حیران رہ گئی.

قسمت کے رحم و کرم پر وقت کی بےرحم موجوں سے سر ٹکراتی ایک لڑکی کی کہانی

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں اپنی ماں پر گئی ہوں اور بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ میری دل کشی میرے باپ کی مرہون منّت ہے کیونکہ میرا باپ ایک بہت خوب صورت اور وجیہہ آدمی تھا۔ جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان دونوں کا اثر قبول کیا ہے۔

میرا نام نورین ہے۔ میری ماں کا نام لزا تھا۔ وہ ایک فرانسیسی لڑکی تھی جو میرے باپ راحیل علی کی محبت میں گرفتار ہوئی۔ اس کے لئے اپنا ملک چھوڑ دیا' اپنا مذہب ترک کیا اور اسلام قبول کرکے پاکستان آگئی۔ مجھے ان دونوں کی ازدواجی زندگی کے ابتدائی حالات تو نہیں معلوم لیکن جب مجھ میں شعور آیا تو اس وقت ان کی زندگی بہت آرام اور سکون سے گزر رہی تھی۔ میرے باپ راحیل علی ایک کامیاب ڈاکٹر تھے۔ اچھی خاصی آمدنی تھی۔ ایک خوب صورت سا گھر تھا' گاڑی تھی' اور نورین نام کی ایک خوب صورت سی بچی تھی' یعنی میں۔ جس کی صورت دلوں کو موہ لیتی اور جس کی باتیں اپنا تاثر قائم کردیتیں۔

زندگی آرام اور سکون سے گزر رہی تھی۔ ایک خوب صورت اور پُرسکون ماحول میں صاف ستھری زندگی۔ میری ماں نے اردو سیکھ لی تھی لیکن ان کا لہجہ وہی فرانسیسی تھا' وہ جب فرانسیسی لہجے میں اردو بولا کرتی تھیں تو بہت اچھا معلوم ہوتا۔

میرے ابو مختلف بیماریوں کا علاج کیا کرتے تھے۔ لیکن موت ایسی بیماری ہوتی ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ تو ہوا یوں کہ ایک دن موت کی اس بیماری نے ابو کو گھیر لیا اور ان کے کلینک میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ اس کلینک میں دل کی بیماریوں کی دوائیں بھی رکھی ہوئی تھیں لیکن وہ ان دواؤں کی موجودگی میں مرگئے۔

یہ ہماری زندگی کا پہلا سانحہ تھا اور وہ بھی اتنا شدید کہ ہم مدتوں خون کے آنسو روتے رہے تھے۔ وقت کتنی بے رحمی اور سرعت کے ساتھ قدموں سے زمین کھینچ لیتا ہے۔ اس کا ہمیں گمان بھی نہیں تھا۔ ابو کی موت پہلا سانحہ تھی۔ اس کے بعد ایک سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابو کی حیثیت ایک ڈھال کی سی ہو۔ جو سرد و گرم ہوائیں اپنے آپ پر برداشت کرتی رہتی ہے۔ اس ڈھال کے ہٹتے ہی ہم براہِ راست ان ہواؤں کی زد میں آگئے۔

سب سے پہلا حملہ ابو کے رشتے داروں کی جانب سے ہوا۔ ان کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ رشتے دار یہاں آیا بھی کرتے تھے لیکن وہ ابو کی موجودگی میں آتے۔ جوان' بوڑھے' ادھیڑ عمر سب ہی ہوا کرتے۔ میں نے اس وقت کسی کی نگاہیں خود پر اتنی تیز محسوس نہیں کی تھیں یا ہوسکتا ہے کہ میں نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا ہو۔ میں سولہ سترہ برس کی ہو چکی تھی۔ میں اپنے حسن کے بارے میں بتا چکی ہوں کہ میں مغربی اور مشرقی حسن کا امتزاج تھی۔ دیکھنے والے بے خود سے ہو کر رہ جاتے تھے۔ ابو کی موت کے بعد احساس ہوا کہ حسن بھی ایک ایسے خزانے کی طرح ہوتا ہے جس کی چوری کا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔

وہ لوگ ابو کی موت کے حوالے سے گھر میں داخل ہوگئے تھے۔ کوئی ان کا پھوپی زاد' کوئی ماموں زاد' کوئی رشتے کی بہن اور ان کی اولادیں۔ ان کو گھر میں آنے سے روکا بھی نہیں جاسکتا تھا کیونکہ وہ سب غم بانٹنے کے لئے آئے تھے اور ان کا حق بھی تھا۔ اسی لئے ہم دونوں ماں بیٹی خاموشی سے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ انہوں نے عملاً پورے گھر پر قبضہ کرلیا تھا۔ میرے بیڈ روم میں تین لڑکیاں تھیں۔ امی کے ساتھ بھی دو چار عورتیں تھیں۔ ڈرائنگ روم میں مردوں کا قبضہ تھا۔ میں نے ایسی افراتفری اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اگر یہ لوگ دکھ بانٹنے آئے تھے تو ان کی کوشش واقعی بہت کامیاب تھی۔ کیونکہ ہم ان کے چکروں میں پھنس کر ابو کی

موت کا دکھ بھول گئے تھے۔
میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ غم کے اظہار کے طریقے کیسے کیسے ہوتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو دیکھا کرتی۔ کوئی بھی نیا رشتے دار گھر میں داخل ہوتا تو سب سے سب مل کر رونا دھونا شروع کر دیتے۔ پورا گھر ان کی آوازوں سے بھر جاتا۔ پھر پانچ منٹ کے بعد ہی ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگتیں۔ چائے بنوائی جاتی۔ زبردستی کھانا کھلایا جاتا۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ کچھ عورتوں نے باورچی خانے کا چارج بھی سنبھال لیا تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹی عملی طور پر معطل ہو کر رہ گئے تھے۔

میری امی نے مجھے ایک طرف لے جا کر اس موضوع پر بات کی۔ بہت مشکلوں سے ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع مل سکا تھا۔

"نورین' یہ سب کیا ہو رہا ہے یہاں؟" امی نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ میں خود نہیں سمجھ سکی' قسم سے اب تو الجھن ہونے لگی ہے۔"

"یہ لوگ آخر کب جائیں گے؟" امی نے الجھ کر پوچھا۔

"میں کیا بتاؤں' آپ خود ہی ان لوگوں سے بات کریں۔"

"ابھی نہیں' ابھی تو معاملہ تازہ ہے۔"

ہم لوگ خود اپنے گھر میں اجنبی ہو گئے تھے۔ وہ لوگ ہماری ذاتی چیزیں بھی بلا تکلف استعمال کرنے لگے تھے۔ کبھی کبھی تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے لیکن یہ سوچ کر خاموش رہتی کہ امی کو معلوم ہوا تو وہ بے چاری اور بھی پریشان ہو جائیں گی۔

تنگ آ کر چار پانچ دنوں کے بعد امی نے جمع ہونے والے رشتے داروں میں سب سے بزرگ شخص سے اس موضوع پر بات کی۔ انہوں نے فوری طور پر رشتے داروں کی ایک ہنگامی میٹنگ طلب کر لی۔ سب کے سب بڑے والے کمرے میں جمع ہو گئے تھے' میں اور امی بھی اس کمرے میں موجود تھیں۔

"تم لوگوں نے دلہن کا مطالبہ سن لیا" ان صاحب نے امی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسروں کو بتایا "یہ چاہتی ہیں کہ ہم لوگ ان کا گھر خالی کر کے چلے جائیں۔ آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ راحیل علی سے ہمیں کتنا پیار تھا۔ ہم اس پر مان کرتے تھے۔ وہ ہمارا کس کس طرح خیال رکھا کرتا۔ لیکن آج اسی کے گھر سے ہمیں چلے جانے کے لئے کہا جا رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم صرف رشتے دار ہیں' ہمارا وہ حق نہیں ہے جو راحیل علی کی بیوہ اور بیٹی کا ہو سکتا ہے' اس لئے ہم چلے جائیں گے۔"

"نہیں پھوپا' میں تو اس طرح نہیں جاؤں گی" میرے ابو کی ایک رشتے دار عورت نے کہا "میں نے تو یہ سوچا تھا کہ اپنے منصور کے لئے بات کر کے جاؤں گی۔ ماشاء اللہ اچھا خاصا کماتا ہے' اوور ٹائم بھی کرتا ہے۔"

"واہ بہن۔ اس خاندان میں صرف تمہارا منصور ہی تو نہیں ہے" ایک دوسری عورت بھی چمک کر بولی "ہمارا سجاد بھی تو ہے۔"

میں اور میری امی حیران ہو کر ان لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں شاید زمین کا کوئی ٹکڑا تھی یا اناج کی بوری تھی جسے آپس میں تقسیم کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے خوف زدہ ہو کر امی کا ہاتھ تھام لیا' اس وقت امی ہمت کر کے ان لوگوں سے مخاطب ہوئیں۔

"آخر آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی راحیل کا زخم بھی نہیں بھرا ہے اور آپ لوگ میرے گھر میں بیٹھ کر شادی بیاہ کی باتیں کر رہے ہیں۔"

"ہم لوگ تو تمہارے بھلے کی کہہ رہے ہیں بی بی" رشتے کی ایک چچی نے کہا "ذرا اپنی بیٹی کی طرف بھی تو دیکھو۔ دنیا بھر کا حسن اسی کے حصے میں آ گیا ہے۔ راحیل کے بعد تم دونوں اکیلی رہ گئی ہو۔ بیٹی کی شادی کر دو گی تو اطمینان ہو جائے گا۔"

"آپ لوگ فکر نہ کریں۔ ہم اپنی حفاظت کر سکتے ہیں" امی سخت لہجے میں بولیں "اور پلیز! آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں ورنہ میں پولیس کی مدد لوں گی۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں ایک غیر ملکی عورت ہوں۔ ہمارا سفارت خانہ پوری طرح ہماری مدد کرے گا' آپ لوگ خواہ مخواہ پریشان ہوتے رہیں گے۔"

ان کی یہ دھمکی کام کر گئی۔ وہ سب کے سب ہم دونوں کو برا بھلا کہتے واپس چلے گئے تھے۔ بظاہر تو وہ چلے گئے تھے لیکن میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ لوگ ایک بار پھر پلٹ کر حملہ کریں گے' جس طرح سانپ حملہ کیا کرتا ہے۔

مصیبت یہ تھی کہ ہم اپنے گھر کی دیواریں بلند نہیں کر سکتے تھے۔ میں اپنے حسن کو بدنما نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی حفاظت کے لئے ہم محافظ نہیں رکھ سکتے تھے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ کسی طرح اپنے آپ کو بچا کر رکھیں۔ مجھ میں اس وقت بہت حوصلہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک جوان لڑکی تھی۔ اور جوانی ہمیشہ باحوصلہ ہوا کرتی ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ جب پورا معاشرہ ہی بے رحم ہو جائے تو اس وقت ایک دو کی طاقت کچھ کام نہیں آتی۔

ابو کی وفات کو چالیس دن گزر چکے تھے۔ میں معمول کے مطابق کالج جانے لگی تھی کہ سجاد راستے میں مجھے مل گیا۔ شاید وہ صبح سویرے میری ہی راہ دیکھ رہا تھا۔

"نورین۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"سجاد بھائی۔ اگر آپ نے کوئی خاص بات کرنی ہے تو میرے گھر آ جائیں۔"

"گھر میں تو وہ بڑھیا چپکی رہتی ہے" سجاد نے تلخی سے کہا' یہ جملہ اس نے امی کے لئے کہا تھا۔

میں یہ برداشت نہیں کر سکی۔ میں نے پوری قوت سے ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ یہ پہلا طمانچہ تھا جو میں نے کسی

مرد کے چہرے پر مارا تھا۔ تھپڑ کھا کر وہ سکتے میں رہ گیا۔ اس کے تصور میں بھی یہ نہیں ہوگا کہ میرا ردعمل اتنا شدید بھی ہو سکتا ہے۔
آس پاس گزرتے ہوئے لوگ بھی اس صورتِ حال کو دیکھ کر رک گئے تھے۔ سجاد نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ خونخوار نگاہوں سے میری طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں اس وقت کالج نہیں گئی، وہیں سے واپس ہوگئی۔ میں نے جب امی کو یہ بتایا تو وہ بھی دہل گئی تھیں۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔"

"امی، اب میں کالج نہیں جاؤں گی" میں نے کہا "مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ ہم لوگ کب تک گھر میں چھپ کر رہ سکیں گے" امی پریشان ہو کر بولیں "زندگی کے ساتھ آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔"

"تو پھر آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟"

"اب یہی ہو سکتا ہے کہ میں کچھ دنوں تک تمہارے ساتھ ہی جایا کروں" امی نے کہا۔

امی کچھ دنوں تک ہی جاتی رہی تھیں۔ ظاہر ہے، وہ کب تک بچوں کی طرح مجھے پہنچانے اور لانے جایا کرتیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ان لوگوں کو اسی بات کا انتظار رہا ہو کہ کب میں تنہا کالج جاتی ہوں اور کب مجھ پر ہاتھ ڈال دیا جاتا ہے۔ ایک دن میں اپنے گھر سے نکلی ہی تھی کہ ایک گاڑی میرے پاس آکر رکی۔ اس میں سے دو آدمی اترے۔ میں ان دونوں کو نہیں جانتی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے میرے پاس آئے، پستول دکھایا اور مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے کر گاڑی میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت کسی نے یہ دیکھا تھا یا نہیں۔ اگر دیکھا بھی ہو تو نہیں دیکھا ہوگا۔

میں سہم کر رہ گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے چھانے لگے۔ گاڑی میں میرے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی تھی۔ نہ جانے کہاں، کس مقام پر۔ ہر شخص کی زندگی میں ایک نہ ایک ٹرننگ پوائنٹ آیا کرتا ہے۔ یہ میری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ گاڑی چلانے والا کوئی اور تھا جبکہ وہ دونوں مجھے اپنے درمیان پھنسا کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے سخت کھردرے جسم میرے جسم سے چپکے ہوئے تھے۔ میں خوفزدہ بھی تھی اور شرم سار بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ سوچنا چاہتی تھی لیکن کیا سوچتی۔ وہ دونوں بار بار میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے مجھے اتنے قریب دیکھ کر مبہوت سے ہو گئے ہوں۔ دوسری طرف خود میری اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ان سے یہ معلوم کر سکوں کہ مجھے کس جرم میں اغوا کیا جا رہا ہے اور اغوا کرنے والے کون ہیں۔

مجھے رہ رہ کر امی کا خیال آرہا تھا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ ان کی چہیتی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے تو نہ جانے ان کے دل پر کیسی قیامت گزر جائے گی۔ میں رونا چاہتی تھی لیکن آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ مجھے ہوش نہیں کہ کتنی دیر تک یہ سفر جاری رہا ہوگا۔ بہرحال اس کا اختتام ایک بڑے سے مکان کے احاطے میں ہوا تھا، جس کی سیڑھیوں کے پاس گاڑی روک لی گئی تھی۔ گاڑی کے رکتے ہی ان دونوں کو بھی ہوش آگیا تھا۔ انہوں نے مجھے گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا اور میں گاڑی سے اتر آئی۔ گاڑی چلانے والے نے پہلی بار مجھے دیکھا تھا۔ اب تک اس کا دھیان ڈرائیونگ کی طرف رہا تھا۔ وہ ایک طویل القامت، خوفناک مونچھوں اور سرخ سرخ آنکھوں والا آدمی تھا۔ جبکہ وہ دونوں بھی اس سے کسی طور کم نہیں تھے۔ میں اس وقت زمانے کے گرم و سرد سے ناواقف تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اچھے برے جذبے کیا ہوا کرتے ہیں لیکن چونکہ ایک لڑکی تھی اس لئے یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کے پورے وجود میں اس وقت ہوس کی آگ دہک رہی ہے۔

مجھے اس مکان کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کمرے میں فرنیچر بھی موجود تھا۔ ان میں سے ایک نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میرے برابر بیٹھ گیا اور اس وقت اچانک میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ورنہ اب تک میرے حواس گم ہی تھے۔

"اوہو۔ روتی کیوں ہو!" میرے برابر والے نے میرے شانے

پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ کسی غیر کے ہاتھ کا پہلا لمس تھا جو میں نے محسوس کیا تھا۔
"مجھے جانے دو۔ میں گھر جاؤں گی۔ تم لوگ مجھے کیوں لائے ہو؟"
"یار' میں تو کہتا ہوں اس لڑکی کو واپس بھیج دو" اس نے دوسروں سے کہا "یہ سجاد تو پاگل ہو گیا ہے۔"
تو مجھے سجاد نے اغوا کرایا تھا۔ شاید اس طرح وہ مجھ سے اپنی توہین' میرے تھپڑ کا بدلہ لے رہا تھا۔ سجاد میرا رشتے دار تھا لیکن اس نے غیروں کے ذریعے مجھے اغوا کرالیا تھا۔ بہت سی حقیقتیں کھلتی جارہی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نفرت اور انتقام کا جذبہ بھی محبت کی طرح شدید ہوا کرتا ہے جو آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔
"ٹھیک ہے۔ ہم سجاد کے آنے سے پہلے اس لڑکی کو واپس بھیج دیں گے" گاڑی چلانے والا بولا۔ اس کی آواز بھی اس کے چہرے کی طرح کرخت تھی "لیکن اس سے پہلے یہ لڑکی ہمارے کام آئے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔"
میں نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ جب آنکھوں میں ہوس اتر آئے تو آنکھوں کا رنگ کیسے بدل جاتا ہے۔ اس کی بات سن کر وہ سب دانت نکال نکال کر ہنسنے لگے۔ وہ کمرا ان کے مکروہ قہقہوں سے بھر گیا۔ مجھے تسلی دینے والا بھی ہوس کے اس سیلاب میں بہہ نکلا تھا۔ پھر وہی ہوا جو میں نے کبھی نہیں چاہا تھا۔ اور وہی جو اُن کی خواہش تھی۔ مجھے کس کس طرح پامال کیا گیا' میں نہیں بتا سکتی۔ میں نے بہت کوشش کی' بہت روئی' بہت تڑپی لیکن مجھے تار تار کر دیا گیا۔ پتا چلا کہ عورت پہلی دفعہ لٹ کر کتنی خالی اور کتنی ویران ہو جاتی ہے۔
میں گھر سے کالج جاتے وقت ایک لڑکی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جو فرشتوں کو وضو کرانے والا دامن رکھتی تھی لیکن جب واپسی ہوئی تو عورت بن چکی تھی۔ اور وہ بھی اس بری طرح کہ اپنی حالت پر رو دیا بھی نہیں جارہا تھا۔ میرے آنسو تک خشک ہو چکے تھے۔ مجھے احساس بھی نہیں رہا تھا۔ پتھر کا ایک مجسمہ اپنے گھر واپس آیا تھا۔ نہ جانے کتنی نگاہوں نے میری یہ حالت دیکھی ہوگی۔ میری لڑکھڑاہٹ کو بھانپ لیا ہو گا لیکن مجھے تو ہوش ہی کہاں تھا۔ گھر پہنچی' دستک دی اور جب امی نے دروازہ کھولا تو ان کے مہربان بازوؤں میں جھول کر بے ہوش ہو گئی۔
میں کیا لٹی کہ سب کچھ لٹ گیا۔ امی لٹ گئیں' گھر لٹ گیا' زندگی لٹ گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے مسلسل آنسوؤں کے درمیان امی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ پتھر بن کر میری طرف دیکھتی رہ گئی تھیں۔ نہ جانے کس جگر اور حوصلے سے انہوں نے میری داستان سنی ہوگی۔ شاید جب زخم تازہ ہو تو اس وقت درد کی شدت کا احساس نہیں ہوتا۔ ہمارے گھر پر سوگواری نے اپنا سایہ ڈال دیا تھا۔ محلے کی کچھ عورتیں کریدنے کے لئے ہمارے گھر بھی آئیں۔ یہ وہ عورتیں تھیں جنہوں نے مجھے بے حال گھر میں آتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ لیکن امی نے انہیں یہ بتایا کہ میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ میں نہیں سمجھتی کہ ان میں سے کسی کو یقین بھی آیا ہو گا۔
میں اپنے کمرے میں بند رہتی۔ ایک دن امی آئیں تو انہوں نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
"بس' اب ہم لوگ یہاں نہیں رہیں گے" انہوں نے کہا۔ "میں نے تو یہ سوچا تھا کہ اب یہی میرا وطن ہے۔ یہاں کے لوگ میرے اپنے ہیں لیکن میں کیا جانتی تھی کہ ہم بھیڑیوں کے درمیان رہ رہے ہیں۔ ہم فرانس چلے جائیں گے۔"
"نہیں امی' میں کہیں نہیں جاؤں گی" میں نے بھی امی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔
"کیا!" امی نے چونک کر میری طرف دیکھا "اپنے اس حال کے باوجود تم اس ملک سے نہیں جاؤ گی۔"
"نہیں امی' میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے' اس میں اس ملک کا کوئی قصور نہیں ہے' بلکہ یہ سب کچھ یہاں کے رہنے والوں نے کیا ہے اور وہ بھی میرے رشتے دار ہیں اور اس قسم کے لوگ ہر معاشرے میں ہوا کرتے ہیں' چاہے ہم کہیں بھی چلے جائیں۔"
"تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اسی طرح رو دھو کر چپ ہو جائیں۔"
"نہیں امی' اس حادثے نے مجھے بہت شعور دے دیا ہے۔ میں اپنے تباہ کرنے والوں کو تباہ کر دوں گی۔ میں ان سے ایسا انتقام لوں گی کہ زمانہ دیکھے گا۔"
میری امی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ایسی بات کبھی نہیں کی ہوگی۔ یہ میری عمر اور میری توانائی سے بہت آگے کی بات تھی لیکن میں جو کچھ کہہ رہی تھی' اس پر مجھے عمل کر کے بھی دکھانا تھا۔ عورت کا حسن جہاں ایک طرف خود اسے برباد کر سکتا ہے' وہاں دوسری طرف اوروں کو بھی تباہ کر سکتا ہو گا۔ بس یہ سوچ کر ہی میں نے ایسا ارادہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ میں جسمانی طور پر بھی توانا ہونا چاہتی تھی اور اس کا بھی ایک طریقہ میرے ذہن میں تھا۔
میں نے اپنے ساتھیوں سے کوان مائیڈو کی بہت تعریف سنی تھی۔ یہ ایک ایسی ورزش گاہ تھی جہاں جسمانی تربیت دی جاتی تھی۔ اپنے دفاع کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ جوڈو کراٹے کی کلاسز ہوا کرتی تھیں۔ میں نے یہ سنا تھا کہ اس ورزش گاہ کو چلانے والے ایک بوڑھے چینی ہیں جو نہ جانے کب سے برصغیر میں آکر آباد ہو گئے تھے اور اب یہاں لوگوں کو تربیت دیتے رہتے تھے۔
میں نے امی سے تذکرہ نہیں کیا۔ میں انہیں بتانا بھی نہیں چاہتی تھی کہ میں کس راستے پر جا نکلی ہوں لہٰذا ایک دن گھر سے نکلی

اور سیدھی ان کے پاس پہنچ گئی۔ پتا مجھے معلوم تھا۔ اس سانحے کے بعد پہلی دفعہ گھر سے باہر نکلی تھی۔ راستہ چلتے ہوئے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے امی سے یہ کہا تھا کہ میں اپنی ایک دوست صفیہ کے پاس جا رہی ہوں جو اسی محلے میں رہتی تھی' معاملہ چونکہ محلے ہی کا تھا۔ اس لئے امی نے اجازت دے دی۔

○☆○

وہ بہت بڑی درس گاہ تھی۔ نہ جانے کتنے طالب علم اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی طور پر توانا کرنے میں مصروف تھے۔ اس درس گاہ کے منتظم کا نام احمد حسین تھا۔ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد ہی اسلام قبول کرلیا تھا۔ اردو اہل زبان سے بھی بہتر جانتے تھے۔ ان کی درس گاہ میں چونکہ لڑکیاں بھی تربیت حاصل کیا کرتی تھیں۔ اس لئے میری آمد پر کسی نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے جب ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مجھے ان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

وہ ایک ایسے کمرے میں تھے جس میں چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں کے سہارے تکئے لگے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں ان کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ احمد حسین صاحب ایک طرف دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی عمر ساٹھ سے زیادہ ہی ہوگی لیکن بھرپور توانائی کا احساس ان کے پورے وجود سے منسلک تھا۔ میں ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ احمد حسین نے میری طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بچی' بتاؤ کیا بات ہے؟"

"جناب' میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔ میں توانائی اور طاقت حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ بہت کم وقت میں بہت زیادہ طاقت۔ میں رات دن ایک کردوں گی۔ آپ مجھے وہ سب کچھ نہیں سکھائیں گے جو دوسرے سیکھتے ہیں بلکہ ان سے الگ کوئی اور فن ہوگا۔"

"میرا خیال ہے بچی کہ تمہارے سینے میں انتقام کی آگ دہک رہی ہے" احمد حسین نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن یاد رکھو کہ انتقام انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہوا کرتا ہے' آدمی کو کھوکھلا کرکے رکھ دیتا ہے۔"

"بابا۔ اگر ایک بے بس انسان پر ظلم کے پہاڑ ڈھائے جائیں تو وہ کیا کرے؟"

"اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے بابا کہ خدا سے بڑا انصاف کرنے والا اور کوئی نہیں ہے لیکن اگر ایسے درندہ صفت لوگوں کو ڈھیل ملتی گئی اور انہیں لگام نہ دی گئی تو وہ اور نہ جانے کتنے گھروں کو تباہ کردیں گے۔ اس کو بھی چھوڑیں تو کیا اپنی حفاظت کا بندوبست کرنا لازم نہیں ہے؟"

میں نہ جانے کیا کیا بولتی رہی۔ میرے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ میں اتنی باتیں کرنے کی اہل نہیں تھی لیکن میرے وجود میں جو آگ دہک رہی تھی' وہ میں نے اس کمرے میں بکھیر دی۔

"ٹھیک ہے بچی" احمد حسین نے ایک گہری سانس کے ساتھ کہا "تم کل سے آجاؤ' میں تمہیں خصوصی تربیت دوں گا۔"

گھر پہنچ کر میں نے امی کو ساری بات بتائی تو وہ بھی حیران رہ گئی تھیں "نہیں نورین! یہ راستہ تمہارے لئے نہیں ہے۔ عورت بہت کمزور ہوتی ہے۔"

"نہیں امی۔ اس توہین نے مجھے طاقت ور بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ عورت صرف اس لئے کمزور ہوتی ہے کہ اسے بار بار یہ احساس دلایا جاتا ہے۔"

امی خاموش ہوگئیں۔ ارادے کی مضبوطی اپنا الگ لہجہ' اپنا الگ انداز رکھتی ہے۔ میں یہ بتا چکی ہوں کہ اس سانحے کے بعد میرے رشتے دار میرے گھر نہیں آئے تھے۔ خود سجاد اور اس کے گھر والوں کی طرف مکمل خاموشی تھی۔ شاید انہیں اس بات کا انتظار ہو کہ ہم دونوں ماں بیٹی روتی دھوتی اور پورے خاندان میں واویلا مچاتی پھریں گی لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ہم نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔

میں دوسرے دن درس گاہ پہنچ گئی اور میری سخت ترین ریاضت اور مشقت کا دور شروع ہوگیا۔ احمد حسین واقعی مجھ پر بہت توجہ دے رہے تھے۔ میں گھنٹوں ورزش کرتی رہتی۔ مارشل آرٹ کے اسرار و رموز سے واقف ہوتی۔ ٹریننگ کے پہلے دن مجھے احمد حسین نے مارشل آرٹ کا فلسفہ سمجھاتے ہوئے بتایا۔

"دیکھو بچی۔ آدمی کے کردار اور اس کے مزاج کی ساری خرابیاں بزدلی سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ بزدلی انسان کو بدکردار بنا دیتی ہے۔ بزدل انسان اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے لہٰذا سب سے پہلی خرابی جھوٹ کی پیدا ہوتی ہے۔ وہ چونکہ کسی کے سامنے کھل کر سچ نہیں بول سکتا اس لئے منافق ہو جاتا ہے۔ وہ کھلے عام کسی کا مقابلہ نہیں کرسکتا اسی لئے ظالم اور بے رحم ہو جاتا ہے۔ ہم مارشل آرٹ کے ذریعے سب سے پہلے بزدلی کو ختم کرتے ہیں۔"

احمد حسین صاحب کو مجھ پر بہت بھروسا اور فخر ہو گیا تھا۔ میں ان کے تمام شاگردوں سے زیادہ ہونہار ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے سیکھنے اور جاننے کی رفتار اتنی تیز رکھی تھی کہ خود احمد حسین صاحب کو حیرت ہوا کرتی۔ مجھے اس کے علاوہ اور کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ بس ایک جنون سا سوار ہو گیا تھا۔ اس بے پناہ محنت نے میرے اعصاب میں بل ڈال دئے تھے میری نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ میری امی کو یہ خوف تھا کہ اس طرح میں کہیں اپنی دوسری خوبی نہ ضائع کر بیٹھوں' یعنی حسن کی خوبی۔ ایسا نہ ہو کہ سخت ریاضت کی وجہ سے میرا رنگ اجڑ جائے' میری آنکھیں ویران ہو جائیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس مجھ میں بلا کا نکھار

اور تازگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ میں آئینے میں خود اپنے آپ کو دیکھ کر ٹھٹک جاتی تھی۔

دوسری طرف ہمارے حالات خراب ہوتے چلے جارہے تھے۔ ابو کی موت کے بعد اب تک اس بینک بیلنس پر گزارہ ہوتا رہا تھا جو ابو نے کسی طور اپنی زندگی میں اکٹھا کرلیا تھا لیکن وہ بھی کب تک ساتھ دے سکتا تھا۔ قارون کا خزانہ بھی ہوتا تو ختم ہوجاتا اور قارون کا خزانہ تو تھا نہیں۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ امی کس طرح اس پرابلم کو حل کرنے کی کوشش کررہی ہیں' پھر ایک دن امی نے خود ہی مجھ سے اس موضوع پر بات کی۔

"بیٹی۔ میں نے جاب کرنے کا ارادہ کیا ہے۔"

"جاب۔" میں نے حیرت سے امی کی طرف دیکھا۔ اس وقت مجھے معاملے کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔

"ہاں' کیونکہ گھر کے حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے ہیں۔ بینک میں جو کچھ بھی تھا' وہ ختم ہوگیا ہے۔ اب یہی راستہ رہ گیا ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ملازمت کرے۔ ظاہر ہے کہ تم کر نہیں سکتیں۔ لہٰذا میں ہی رہ گئی ہوں۔"

میں جانتی تھی کہ امی میں جاب کی صلاحیتیں ہیں۔ وہ بہت پڑھی لکھی تھیں۔ فرانسیسی ان کی مادری زبان تھی اردو اور انگریزی بھی جانتی تھیں۔

"آپ کو ملازمت کہاں ملے گی؟"

"میں نے اس کی بات کرلی ہے" امی نے مسکرا کر کہا "مجھے فرانسیسی سفارت خانے میں ملازمت مل رہی ہے۔ سفارت خانے کے پریس سیکریٹری کے ساتھ منسلک کیا جارہا ہے۔ کیونکہ میں پاکستان سے بھی بہت اچھی طرح واقف ہوں۔"

میں نے امی کے اس فیصلے پر کچھ نہیں کہا۔ ظاہر ہے' انہوں نے بہتر ہی سوچا ہوگا۔ امی کی ملازمت کے بعد زندگی ایک لگے بندھے ڈھرے پر آگئی۔ میں کالج کے لئے روانہ ہوجاتی اور امی اپنی ملازمت پر چلی جاتیں۔ دوپہر کو میں کالج سے واپس آتی۔ کھانے سے فارغ ہوکر کچھ دیر آرام کرتی' اس دوران امی بھی ملازمت سے آجاتیں اور میں شام کے وقت درس گاہ پہنچ جاتی۔ جہاں سے رات کے نو دس بجے تک میری واپسی ہوا کرتی۔

ہم جس علاقے میں رہتے تھے وہ متوسط لوگوں کی آبادی تھی۔ مکانوں کی دیواریں نہ ایک دوسرے کے اتنی قریب تھیں کہ سانسوں کی آوازیں سنائی دیں اور نہ ہی اتنا فاصلہ تھا کہ چیخ وپکار کی آواز باہر نہ جاسکے۔ اس لئے میں بہت سی نگاہوں کا مرکز بن گئی تھی۔ اب ان لوگوں میں یہ جستجو تھی کہ میں کہاں جاتی ہوں اور رات کو کہاں سے میری واپسی ہوتی ہے لیکن جب کوئی عمل بار بار ہونے لگے تو اس کی اہمیت کم سے کم ہونے لگتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ کھوج لگانے والی نگاہوں کا تجسس بھی دم توڑ گیا تھا۔ زندگی اپنے معمول پر آگئی تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری ریاضت بڑھتی چلی جارہی تھی۔ نہ جانے یہ کیسا جنون تھا جس نے مجھے اپنے آپ سے بھی بے گانہ کردیا تھا۔ عورت اپنی مرضی سے اپنی دنیا بھی حوالے کرکے خوش رہتی ہے لیکن جبر اس کے سینے میں ہلچل مچادیتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ کیفیت صرف عورت کے ساتھ نہیں بلکہ ہر ایک کے ساتھ ہوتی ہے۔

پھر ایک دن بظاہر پرسکون نظر آنے والی زندگی کی اس جھیل میں ایک پتھر آن گرا۔ میں نے اپنے اغوا کرنے والوں میں سے ایک کو دیکھ لیا تھا۔ میری اس سے مڈبھیڑ کالج کے قریب ایک بک اسٹال میں ہوئی تھی۔ میں وہاں کچھ کتابیں لینے پہنچی تو میں نے اس شخص کو وہاں کاؤنٹر پر کھڑا ہوا دیکھ لیا۔ وہ بھی شاید کوئی کتاب خریدنے آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ سوئی ہوئی آگ اچانک بھڑک کر جاگ اٹھی۔ میں نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی اس لئے میں جلدی سے ایک الماری کے پیچھے چلی گئی۔

اس بک اسٹال پر اس وقت میرے کالج کے بہت سے ساتھی بھی کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہی کو استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ شخص کاؤنٹر سے ہٹ کر جب الماری کے برابر سے گزرنے لگا تو میں جان بوجھ کر اس سے جا ٹکرائی۔ وہ بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹا اور میں نے ایک ہنگامہ برپا کردیا۔

"بدتمیز' آوارہ' بدمعاش' لوفر۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

میں نے چیخ چیخ کر سب سے کہا کہ اس نے جان بوجھ کر مجھے پکڑلیا تھا۔ وہ شاید میرے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا' بتانا چاہتا تھا لیکن اس کو اتنا موقع نہیں مل سکا۔ کالج کے ساتھیوں کے علاوہ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی پوری شدت سے اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ عورت کے لئے تو لوگ ویسے بھی جان ہتھیلی پر لئے گھومتے ہیں اور جب مجھ جیسی خوب صورت ترین لڑکی ان سے مدد کی درخواست کررہی تھی' ظاہر ہے کہ ان کا جوش اپنی انتہا کو پہنچ ہی جاتا۔ انہوں نے مار مار کر اس شخص کی حالت خراب کردی۔ جتنے زخم اس کے جسم پر لگ رہے تھے' اتنے ہی زخم میرے جسم کے مندمل ہورہے تھے۔ ایک ایسے سکون کا احساس ہورہا تھا جو بہت دنوں بعد حاصل ہوا تھا۔ لوگوں نے اسے مار مار کر بے ہوش کردیا' پھر اس کے بے ہوش جسم کو اٹھوا کر ایک طرف پھینک دیا۔

میں نے امی کو جب یہ بتایا تو پریشانی سے ان کے ماتھے پر لکیریں پڑگئیں "یہ بہت برا ہوا بیٹی۔ اب وہ شخص زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے۔ وہ اب تیرا دشمن ہوجائے گا۔"

"دیکھیں امی' جس وقت اس شخص نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مجھ سے زیادتی کی' اس وقت تو میں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا' اس کے باوجود اس نے مجھے تباہ کردیا۔ تو وہ تو پہلے بھی

دشمن تھا اور آج بھی دشمن ہے۔ لہٰذا صرف یہ سوچ کر خاموش کیوں رہا جائے کہ وہ دشمن ہو جائے گا' وہ دشمن تو ہے ہی۔"

امی نے پھر کچھ نہیں کہا۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ شاید میں بھی غلطی پر نہیں تھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہم دونوں آنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو گئے۔ اس شخص یا اس کے ساتھی یا خود سجاد کی طرف سے کسی نہ کسی حرکت کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ میں نے اتنی احتیاط برتنی شروع کر دی کہ کالج یا درس گاہ کی طرف آتے جاتے بہت محتاط رہا کرتی تھی۔ ہمیں جس طوفان کا اندیشہ تھا' وہ آیا ضرور لیکن اس کی نوعیت بہت مختلف تھی۔

ایک دن سجاد کے گھر والے میرے گھر آ گئے۔ یہ حیران کرنے والی بات تھی۔ شاید ان لوگوں سے خاموشی برداشت نہیں ہو سکی تھی۔ آنے والوں میں سجاد کے والدین اور اس کی بہن صنوبر تھی جس سے کسی زمانے میں میری دوستی رہی تھی۔ لیکن سجاد والے سانحے کے بعد مجھے اس سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ میں اور امی اس دن گھر پر ہی تھے۔ ان لوگوں کو اپنے دروازے پر دیکھ کر ہم حیران رہ گئے تھے۔ امی کا رویہ بھی بہت خشک تھا۔

"فرمایئے۔ کیسے آئے آپ لوگ؟"

"بہو' تم تو اس طرح بات کر رہی ہو جیسے ہم کوئی غیر ہیں۔ تم ہمیں نہیں جانتیں" سجاد کے والد فرقان نے کہا۔

"ہاں' ہم لوگ آپ لوگوں کو نہیں جانتے۔ ہمارا آپ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو۔ ہم دو چار دن کے لئے تمہارے یہاں آ کر رہ گئے تو تمہیں اتنا برا محسوس ہوا۔"

"اوہ!" میں نے ایک گہری سانس لی۔

میں اور امی نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان لوگوں کو مجھ پر گزرنے والی قیامت کا علم نہیں تھا۔ اس کمینے سجاد نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب خاندان والوں کی خاموشی بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں اپنے طور پر یہ سمجھ رہی تھی کہ میری تاراجی پورے خاندان میں مشہور ہو چکی ہو گی۔ کسی کے دامن پر اگر داغ لگ جائے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ پوری دنیا اسی داغ کی طرف دیکھ رہی ہے۔

"چلیں۔ آپ بتائیں' آپ لوگ کس لئے آئے ہیں۔"

اس وقت فرقان اپنی بیوی پر برس پڑا "میں نے تم سے کہا تھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ نہ لاؤ' لیکن تم لوگ بھی پاگل ہو گئے ہو۔ ضد کر کے مجھے بھی کھینچ لیا۔ اور اب جو بے عزتی ہو رہی ہے اسے دیکھنے کے لئے سجاد تو نہیں کھڑا ہے نا یہاں۔"

"تو مجھے کیا معلوم تھا کہ ان لوگوں کا ایسا رویہ ہو گا۔ میں تو دستور کے مطابق اپنے بیٹے کا رشتہ مانگنے آئی تھی۔"

اب تک تو میں یہ سب سنتی رہی تھی لیکن جیسے ہی انہوں نے سجاد کے رشتے کی بات کی تو میرے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ہم دونوں ماں بیٹی کو سجاد کی ہمت اور اس کی بے شرمی پر حیرت ہو رہی تھی۔ غصے نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف کر دی۔ میں نے اس وقت ایک ایسی حرکت کی جو شاید مجھے نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں اپنی جگہ سے کسی زخمی شیرنی کی طرح اچھلی اور میں نے پوری قوت سے سجاد کے باپ فرقان کے چہرے پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

میں یہ بتا چکی ہوں کہ میں نے ریاضت اور مشقت کی انتہا کر دی تھی لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ مجھ میں اتنی قوت پیدا ہو چکی ہو گی۔ فرقان کا چہرہ گھوم کر رہ گیا تھا۔ تھپڑ کی شدت نے اس کا گال پھاڑ دیا اور خون رسنے لگا۔ وہ ایک بھیانک سی چیخ کے ساتھ کرسی پر گر پڑا۔ اس کی بیوی اور بیٹی سکتے کے عالم میں دیکھتی رہ گئیں۔ خود امی کو بھی یہ اندازہ نہیں ہو گا کہ میں اتنی بڑی حرکت کر گزروں گی۔ فرقان نے اپنا گال اپنے ہاتھ سے چھپا لیا لیکن بہتا ہوا خون اس کی کلائی تک کو سرخ کر رہا تھا۔ خود میں بھی اس وقت کچھ متزلزل ہو گئی لیکن میں ان لوگوں کی طرف توجہ دیئے بغیر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

نہ جانے کس طرح وہ لوگ گئے ہوں گے' امی کے ساتھ کیا گزری ہو گی' میں یہ سب نہیں جانتی۔ میں اپنے کمرے میں بند ان کی آوازیں سنتی رہی تھی۔ اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو رہا تھا۔ بہت دیر

بعد گھر میں خاموشی ہوئی اور امی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے جب دروازہ کھولا تو امی کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا نورین۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا امی" میں نے کہا "میں شاید پاگل ہوگئی تھی۔"

"اس کا گال تو پورا پھٹ گیا تھا" امی نے بتایا "وہ سب بہت غصے میں گئے ہیں۔ اب نہ جانے کیا ہو۔"

"مجھے خود اس کا احساس ہو رہا ہے لیکن مجھے اس بات کا افسوس نہیں ہے کہ میں نے اسے کیوں مارا بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے یہ حرکت اپنے گھر میں کی۔ آپ یقین کریں امی 'اگر ہم اس وقت کہیں باہر ہوتے تو میں اسے شاید جان سے مار دیتی۔"

امی کانپ کر رہ گئیں۔ وہ بہت غور اور بے چینی سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس بات پر حیران تھیں کہ ان کی سیدھی سادی 'خاموش رہنے والی بچی میں اچانک اتنی تبدیلی کس طرح آگئی اور یہ تبدیلی کتنی حیرت انگیز اور کتنی بھیانک تھی۔

میں معمول کے مطابق کالج اور درس گاہ جاتی رہی۔ امی اپنی ملازمت کرتی رہیں۔ سجاد اور اس کے گھر والوں کی طرف سے ابھی تک کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ یا تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے تھے یا کچھ اور سوچ رہے تھے کوئی اور منصوبہ ان کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔

ایک دن امی دفتر نہیں گئیں۔ وہ گھر کی صفائی ستھرائی میں لگی رہی تھیں۔ انہوں نے کھانے پینے کی بہت سی چیزوں کا اہتمام کیا تھا۔ شاید کوئی خاص مہمان آنے والا تھا۔ ابو کی موت کے بعد پہلی دفعہ گھر میں کسی مہمان کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہے۔ میں نے شام کے وقت امی سے دریافت کیا تو وہ مسکرادیں۔

"ہاں۔ آج مسٹر لیچی آ رہے ہیں۔"

"کون ہیں یہ مسٹر لیچی؟"

"میرے باس" امی نے جواب دیا "میں ان ہی کے تحت کام کرتی ہوں۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔ تم ان سے مل کر بہت خوش ہوگی۔"

ان کے آنے سے پہلے امی نہا دھو کر تیار ہوگئیں۔ بہت دنوں کے بعد میں انہیں اس روپ میں دیکھ رہی تھی۔ میں شاید یہ بتا چکی ہوں کہ میری امی بے پناہ خوب صورت عورت تھیں۔ فرانسیسی حسن تو ویسے ہی بے مثال ہوا کرتا ہے اور امی اس حسن کا بھی ایک دل کش نمونہ تھیں۔ ان کی شخصیت سے عمر گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ ایک جوان لڑکی کی ماں تھیں۔ اس کے باوجود کسی طرح احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

مسٹر لیچی یوروپین دستور کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔ وہ خود بھی ایک ادھیڑ عمر انسان تھے لیکن بہت شاندار اکہرا بدن 'بلند قامت 'ذہانت سے بھری ہوئی آنکھیں۔ وہ فرانسیسی اور امریکی دونوں معلوم ہوتے تھے۔ بعد میں اس کی تصدیق ہوگئی کہ ان کی ماں امریکی تھی 'باپ فرانسیسی۔ مسٹر لیچی بہت تپاک اور محبت کے ساتھ مجھ سے ملے تھے۔

"بے بی۔ میں تمہارے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں۔" مسٹر لیچی نے کہا "تمہاری ممی ہر وقت تمہاری باتیں کرتی رہتی ہیں۔"

"میری ممی مجھ سے محبت بھی تو کرتی ہیں۔"

ہم لوگوں کے درمیان فرانسیسی ہی میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں بتا چکی ہوں کہ امی نے مجھے فرانسیسی بھی سکھادی تھی۔ مسٹر لیچی ایک خوش مزاج آدمی ثابت ہو رہے تھے لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جس کمرے میں مسٹر لیچی کو بٹھایا گیا تھا اس کمرے میں ابو کی ایک بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابو کی آنکھیں ہم پر لگی ہوئی ہوں۔ وہ بہت دکھ اور ناراضگی سے امی کی طرف دیکھ رہے ہوں کیونکہ امی کے انداز میں مسٹر لیچی کے لئے والہانہ پن تھا۔ وہ ان سے بے تکلف ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے امی کا یہ انداز پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا حالانکہ ان کا تعلق یورپ سے تھا جہاں اس قسم کی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں۔ لیکن امی کو میں نے ہمیشہ محتاط پایا۔ وہ بالکل مشرقی عورت کی طرح تھیں۔ لیکن آج انہیں نہ جانے کیا ہوگیا تھا۔

میری الجھن جب بڑھنے لگی تو میں ان سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

بہت دیر بعد امی نے اس وقت مجھے بلایا جب کھانا لگایا جا چکا تھا۔ میز پر مسٹر لیچی کی پسند کی ہر چیز موجود تھی۔ کھانے کے دوران وہ لوگ خاموش رہے تھے۔ شاید انہیں یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ میں نے امی کی بے تکلفی کا احساس کر لیا تھا۔ مسٹر لیچی نے مجھ سے باتیں بھی کیں تو میرے ہی بارے میں۔ مسٹر لیچی کے جانے کے بعد امی گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئیں 'جبکہ میں امی کا ہاتھ بٹانے کے بعد اپنے کمرے میں آگئی۔

دوسرے دن میں کالج نہیں گئی۔ امی اپنی ملازمت پر چلی گئیں۔ میں اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سجاد کی بہن صنوبر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ہم دونوں اس سانحے سے پہلے ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔ لیکن اب مجھے سجاد کے پورے گھرانے سے نفرت ہوگئی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ صنوبر کی آمد کا کیا مقصد ہو سکتا ہے لیکن وہ میری طرف دیکھ کر بڑے پیار سے مسکرا رہی تھی۔

"اب ایسا بھی کیا غصہ نورین" اس نے کہا "کیا تم مجھے اندر آنے کے لئے نہیں کہوگی؟"

میرا دل چاہا کہ میں انکار کردوں۔ اسے دھکے دے کر بھگادوں'

پھر میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ صنوبر بھی تو ایک لڑکی تھی' جس طرح میں ایک لڑکی ہوں۔ اور جس طرح مجھے تباہ کیا گیا' اس طرح صنوبر بھی برباد ہو سکتی تھی۔

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ آؤ اندر آجاؤ" میں ایک طرف ہٹ گئی۔

صنوبر مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔ اس کی مسکراہٹ' اس کا والہانہ پن میرے غصے کی آگ کو اور بڑھا رہا تھا۔ نہ جانے یہ کس قسم کے لوگ تھے۔ بار بار دھتکارے جانے کے باوجود چلے آتے تھے' پھر سجاد کتنا بے غیرت تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا' وہ معاف کرنے کے لئے نہیں تھا۔ لیکن میں نے اس وقت صنوبر پر اپنے غصے کا اظہار نہیں کیا۔

"کیا بات ہے نورین؟" صنوبر نے اندر آنے کے بعد میرا ہاتھ پکڑلیا "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم ہم لوگوں سے اتنی نفرت کیوں کرنے لگی ہو۔"

"نہیں' میں نفرت نہیں کرتی۔ بس مجھے شادی وغیرہ کے نام سے چڑ ہو گئی ہے۔ اس لئے دل چاہتا ہے کہ میرے سامنے کوئی اس قسم کی بات نہ کرے۔ اور جہاں تک تمہارا سوال ہے تو میں ابھی تک تمہاری دوست ہوں۔ تم سے اسی طرح پیار کرتی ہوں جس طرح پہلے کیا کرتی تھی۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ کیونکہ تمہارا رویہ بہت عجیب وغریب ہو گیا ہے۔"

"سب ٹھیک ہے۔ یہ ابو کی موت کا نفسیاتی ردعمل تھا لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اوہ!" صنوبر نے ایک گہری سانس لی "اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی گھر والوں کو یہ خوش خبری سنا دیتی ہوں۔ بے چارے سجاد بھائی تو یہ خبر سن کر دوبارہ جی اٹھیں گے۔"

"نہیں صنوبر۔ ایسی حماقت بھی مت کرنا" میں نے کہا "اپنے گھر والوں کو کچھ مت بتانا۔ ورنہ میں تم سے بھی بات نہیں کروں گی۔"

"ٹھیک ہے بابا' میں کچھ نہیں کہوں گی۔"

پھر بہت دیر تک میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس دوران میں اس کے بارے میں سوچتی ہی رہی تھی۔ نہ جانے میری فطرت کا کون سا پہلو بیدار ہو گیا تھا۔ مجھے صنوبر سے ذرا بھی اُنسیت محسوس نہیں ہو رہی تھی بلکہ میرے ذہن میں اس کے خلاف ایک ایسی سازش تیار ہو رہی تھی کہ اگر اسے ذرا بھی اندازہ ہو جاتا تو شاید وہ زندگی بھر میری صورت نہیں دیکھتی۔

"صنوبر! کیا تم میرے بلانے پر آسکتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں" صنوبر نے میرا ہاتھ پکڑلیا "تم جب کہو' میں آنے کو تیار ہوں بلکہ آج تو میں اتنی خوش ہوں کہ تم اس کا اندازہ نہیں کرسکتیں۔"

"تو پھر پرسوں شام کو چار بجے میرے پاس آجاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں اپنے ساتھ کہیں لے چلوں گی لیکن ابھی کچھ مت پوچھنا اور نہ ہی گھر والوں کو کچھ بتانا۔"

صنوبر کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک سوچتی رہی۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ خیر اور شر کے درمیان ایک جنگ جاری تھی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میرے ساتھ جو گزری تھی' وہ شر تھا یا اب میں شر کی طرف جا رہی تھی۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کسی کو برباد کرنے کا یہی بدلہ ہو سکتا ہے کہ اس کو بھی برباد کر دیا جائے۔ یہ معمولی معمولی سزائیں بے کار کی بات ہیں۔ دوسرے دن میں گھر سے کالج کے لئے نکلی لیکن کالج نہیں گئی' میں پرانی حویلی کی طرف جا رہی تھی۔

پرانی حویلی دراصل کوئی حویلی نہیں تھی یا شاید کسی زمانے میں حویلی رہی ہوگی۔ اب وہاں صرف ایک کوٹھری تھی جس کے اردگرد گری ہوئی دیواریں تھیں۔ میں اس کوٹھری سے بہت پہلے سے واقف تھی۔ اس طرف کسی کا آنا جانا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کوٹھری کے بعد قبرستان کی چہاردیواری شروع ہو جاتی تھی۔ یہ ہمارے علاقے کا پرانا قبرستان تھا۔ ابو بھی یہیں دفن کئے گئے تھے۔ اس قبرستان کا دروازہ کوٹھری کی سمت نہیں تھا۔ اس لئے وہ کوٹھری اور بھی محفوظ تھی۔ آدمی جب اپنے ذہن میں کچھ ٹھان لے تو پھر ہزار راستے' ہزار پہلو اس کے سامنے ہاتھ باندھے نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ان کے درمیان سے گزرتا جاتا ہے۔ چاہے وہ خیر کی طرف جا رہا ہو یا شر کی طرف۔ میں نے اس کوٹھری میں پہنچ کر کوٹھری کا جائزہ لیا۔ اس کا دروازہ سالم تھا۔ کوٹھری میں فرش پر گرد وغبار کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میرے منصوبے کی تکمیل کے لئے وہ کوٹھری ہر لحاظ سے مناسب تھی۔

اب مجھے صنوبر کا انتظار تھا۔ اس نے دوسرے دن آنے کے لئے کہا تھا۔ اب میں سوچتی ہوں تو حیرانی سی ہوتی ہے۔ میری معصومیت نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ میرے اندر کی لڑکی نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ عورت کو اس کے راستے سے بھٹکا دیا جائے تو شاید اس کی وہی کیفیت ہو جاتی ہے جو میری تھی۔ دوسرے دن صنوبر اپنے وعدے کے مطابق میرے پاس آگئی۔ میرا منصوبہ صرف اتنا تھا کہ اس کو اس کوٹھری میں لے جا کر قید کردوں گی تاکہ وہ چار دن تک اس کی گمشدگی سے گھر والوں کے ہوش ٹھکانے آجائیں لیکن اس کے آنے کے بعد میں کچھ نہیں کر سکی۔ پتا نہیں' یہ میری بے وقوفی تھی یا میرے اندر کی عورت جاگ اٹھی تھی۔ اس نے مجھے سمجھایا تھا کہ دیکھ' تیری دشمنی تو سجاد سے ہے۔ صنوبر بے چاری نے کیا قصور کیا ہے۔ اس لئے جب صنوبر آئی بھی تو میں اپنے منصوبے پر عمل نہیں کرسکی البتہ اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک اپنے آپ کو گالیاں دیتی رہی۔ برا بھلا کہتی رہی۔

O☆O

میں نے اپنی تربیت جاری رکھی۔ میری محنت پہلے سے زیادہ ہوگئی تھی' پھر ایک دن احساس ہوا کہ امی کا دھیان کسی اور طرف رہنے لگا ہے۔ عورت میں کوئی تبدیلی واقع ہونے لگے تو بہت جلد اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ امی اب تک گھر اور میرے لئے تھیں لیکن اب اس محبت میں کوئی اور بھی شریک ہو گیا تھا۔ مسٹر لیمی جو امی کے پاس تھے۔ اس وقت تک میں شعور اور آگہی کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ اس لئے مجھے احساس ہو گیا تھا کہ امی اور مسٹر لیمی ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے ہیں۔

مسٹر لیمی اس دوران کئی بار میرے گھر آچکے تھے۔ ہر بار امی ان کے لئے فرش راہ ہو جاتی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے ساتھ تفریح کے لئے بھی چلی جاتیں۔ اس وقت امی کی سج دھج دیکھنے کے قابل ہوا کرتی۔ وہ بلاشبہ ایک حسین عورت تھیں۔ ابو کی موت کے بعد انہوں نے اپنے آپ پر دھیان دینا ترک کر دیا تھا لیکن اب مسٹر لیمی کی صورت میں ایک آئینہ ان کے سامنے آگیا تھا جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی رہتی تھیں۔ جہاں تک میرا سوال تھا تو میں ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ایک طرف تو یہ دیکھ کر خوش ہوتی کہ امی زندگی کی خوشیوں کی طرف واپس آرہی ہیں اور دوسری طرف میں شرمندگی سی محسوس کیا کرتی تھی۔ نہ جانے امی کو کیا ہو گیا تھا۔ زندگی میں کس بات کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ شاید عورت زندگی بھر کسی سہارے کی تلاش میں رہتی ہے۔ چاہے اس کا تعلق کہیں سے بھی ہو۔

میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ میں اس معاملے میں امی سے کوئی بات کروں۔ پھر ایک دن امی نے خود ہی مجھے اپنی زندگی کے سب سے بڑے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ اس وقت وہ بہت دیر تک میری طرف اس طرح دیکھتی رہیں' جیسے کچھ کہنے کی ہمت کر رہی ہوں۔ پھر وہ دھیرے سے بولیں۔

"تورین۔ آج جو کچھ میں کہنے والی ہوں' وہ دراصل ماں بیٹی کی نہیں بلکہ دو سہیلیوں کی گفتگو ہے۔ جس طرح تمہارا یہاں سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح میرا بھی تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ ہمیں اپنے اپنے مسائل کے لئے ایک دوسرے ہی کی طرف دیکھنا ہے۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم سے کس طرح کہوں۔ دیکھو میری جان۔ اگر ہم یورپ میں ہوتے' تمہاری نشوونما اسی انداز سے ہوئی ہوتی تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرتی اور اپنے راستے ہو لیتی۔ لیکن یہ مشرق ہے اور میرے مزاج میں بھی اب مشرقیت شامل ہو گئی ہے جبکہ تم تو خالصتاً مشرقی لڑکی ہو۔"

"کوئی بات نہیں امی' آپ کہہ دیں" میں نے اپنی گردن جھکا دی "میں بہت کچھ سمجھ رہی ہوں۔ آپ شاید مسٹر لیمی کے بارے میں کچھ کہہ رہی ہیں۔"

"ہاں۔ میری جان' ہم دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

مجھے کچھ اسی قسم کی توقع تھی۔ اس کے باوجود میں لمحے بھر کے لئے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر ابو کی تصویر کی طرف دیکھا۔ وہ تصویر اسی جگہ موجود تھی۔ کوئی زلزلہ برپا نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ شاید زندگی اسی انداز سے اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔

"تو پھر امی؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ امی کی طرف دیکھا۔

"کیا بتاؤں۔" امی نے ایک گہری سانس لی "عورت چاہے جتنی بھی مضبوط اور خود مختار کیوں نہ ہو' اسے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ وہ تنہا نہیں رہ سکتی۔ اس کے وجود کے آگے مرد کے وجود کی ڈھال چاہئے تاکہ وہ اسے سامنے والی ہواؤں سے محفوظ رکھ سکے۔ میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ مسٹر لیمی بہت اچھے انسان ہیں' وہ تمہیں ایک باپ کا پیار دیں گے۔"

میں نے ایک بار پھر ابو کی تصویر کی طرف دیکھا۔ ابو کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کیا آپ کے علاوہ کوئی اور بھی مجھے باپ کا پیار دے سکتا ہے۔ امی اپنے ارادے سے آگاہ کر کے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ہم دونوں باپ بیٹی کو بہت دیر تک ایک دوسرے سے اپنے دکھ سکھ کہنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں بہت دیر تک ابو کی تصویر کے پاس کھڑی رہی تھی۔

میرے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ بہت سی الجھنیں تھیں۔ یہ شادی کہاں ہوگی! کیا شادی کے بعد ہم لوگ اس مکان اور اس علاقے میں رہ سکیں گے۔ اس علاقے کے لوگوں نے امی کو میرے مرحوم باپ کی بیوی کی حیثیت میں قبول کیا تھا۔ کیا وہ انہیں کسی اور کی بیوی کے روپ میں دیکھ سکتے تھے اور وہ بھی ایک غیر ملکی شخص کے۔ سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ ہمارا مذہب کیا ہوگا۔ امی مسلمان ہو گئی تھیں۔ ہماری تہذیب اسلامی تھی۔ جبکہ مسٹر لیمی عیسائی تھے۔ کیا وہ امی کے لئے اپنا مذہب تبدیل کریں گے یا امی ان کے لئے عیسائی ہو جائیں گی؟ ایک عجیب الجھن کا سامنا ہو رہا تھا۔ میں نے ایک دن جب امی اس موضوع پر بات کی تو وہ کچھ سوچتی ہوئی بولیں۔

"ہاں۔ میں بھی اس مسئلے میں الجھی ہوئی ہوں۔ میں نے اس موضوع پر مسٹر لیمی سے بات کی تھی لیکن وہ اپنا مذہب تبدیل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں لہٰذا یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں اور ہم لوگ اپنے مذہب پر۔"

میں امی کی طرف حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ کوئی اپنے کسی بھی عمل کو جائز ثابت کرنے کے لئے کیسے کیسے جواز تلاش کر لیتا ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ امی کی شادی کے بعد ہم کہاں جائیں گے۔ مسٹر لیمی ایک سفارت کار تھے۔ ان کے تبادلے ہوتے رہتے تھے تو پھر ہمیں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ لیکن یہ کیسے

ہو سکتا تھا۔ ابھی تو میرے دشمن آزاد گھوم رہے تھے۔ میں نے ان کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ ارادے مستحکم ہوں تو راستے نکل ہی آتے ہیں۔ تو ایک دن اچانک پھر ان لوگوں میں سے ایک مجھے دکھائی دے گیا جس نے مجھے اغوا کیا تھا۔ یہ وہ نہیں تھا جس کی میں نے بھرے بازار میں ٹھکائی کروائی تھی۔ یہ دوسرا تھا لیکن اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح کمینہ۔ اس کو دیکھتے ہی میرے پورے بدن میں آگ سی سلگ اٹھی۔ میں اس وقت اکیلی ہی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اگر میں کچھ دنوں پہلے اس کو دیکھتی تو خوفزدہ ہو جاتی لیکن اب مجھے اس سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا بلکہ انتہائی شدید نفرت نے مجھے باحوصلہ کر دیا۔ آدمی کو دو ہی جذبے حوصلہ مند کر دیتے ہیں یا تو شدید محبت یا شدید نفرت۔ مجھے اس سے شدید نفرت تھی۔ اس لئے کوئی ڈر محسوس نہیں ہوا بلکہ اسے زیر کرنے کے طریقے سوچنے لگی۔ اس دوران اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ وہ بھی اتنا بے دھڑک اور بے غیرت قسم کا انسان تھا کہ مجھے دیکھ کر سیدھا میرے پاس آگیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"کیوں مجھے پہچانتی ہو نا؟" اس نے میرے قریب آکر پوچھا۔

"ہاں۔ کیوں نہیں" میں بھی مسکرا دی "تمہیں کون بھول سکتا ہے۔"

"اس دن تم نے رشید کے ساتھ کیا حرکت کی تھی؟"

میں سمجھ گئی کہ میں نے بھرے بازار میں جس کی ٹھکائی کروائی اس کا نام رشید تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اپنی درگت کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔

"آدمی آدمی کی بات ہوتی ہے" میں نے کہا "اگر اس کی جگہ تم ہوتے تو شاید میں ایسی حرکت کبھی نہیں کرتی۔"

کسی بھی مرد کے لئے اس سے بڑا داؤ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کی تعریف کر دی جائے۔ اس سے لگاوٹ کا اظہار کیا جائے۔ اس پر دلبری کے انداز آزمائے جائیں۔ وہ چاروں خانے چت ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی شہ زور کیوں نہ ہو۔ میری عمر یہ سب جاننے کی نہیں تھی لیکن وقت نے مجھے بہت جلدی بوڑھا اور زیرک کر دیا تھا۔ اس لئے میں نے اس سے ایسی باتیں کی تھیں۔ وہ چت ہو گیا۔ ویسے تو وہ ایک بار پہلے بھی مجھے حاصل کر چکا تھا لیکن وہ بات کچھ اور تھی۔ میرے اور اس کے درمیان جبر کا تعلق تھا۔ لیکن اس وقت میں اسے یہ احساس دلا رہی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان لگاوٹ اور پسندیدگی کے جذبات بھی قائم ہو سکتے ہیں۔

"اچھا!" اس نے عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھا "تو پھر کیا خیال ہے، میرے ساتھ چل رہی ہو؟"

ظاہر ہے کہ اس ایک وقت کے جبر نے اس کی ہمت بڑھادی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ہاں کردی۔ نہ جانے میں نے یہ فیصلہ کس دل سے کیا ہوگا لیکن بات صرف اتنی تھی کہ میرے سامنے سوائے اپنے آپ کو تباہ کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ میں اگر انتقام لیتی تو اس کی یہی ترکیب ہوسکتی تھی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑی' نہ جانے کتنے اندیشوں' کتنے خدشات اور کتنے خوف کے ساتھ۔ نہ جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا لیکن اس بار جو کچھ بھی ہوتا وہ کسی جبر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔

وہ مجھے اپنے فلیٹ میں لے آیا۔ یہاں ایک اور حیرت میرے انتظار میں تھی۔ وہ آدمی رشید اسی فلیٹ میں موجود تھا۔ مجھے اس آدمی کے ساتھ دیکھ کر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئی تھیں۔ اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ میں اس طرح بے دھڑک دوبارہ ان کے پاس آسکتی ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ رشید کو فلیٹ میں دیکھ کر اس آدمی کا منہ بن گیا تھا جس کے ساتھ میں یہاں تک آئی تھی۔ پہلے والی بات اور تھی۔ اب تو میں اس آدمی کا مالِ غنیمت تھی۔

"جمیل' اسے کہاں سے لارہے ہو؟" رشید نے دریافت کیا اور اس دوسرے آدمی کا نام بھی معلوم ہوگیا۔

"تم یہاں کس وقت آئے" اس نے رشید کے سوال کو نظر انداز کردیا تھا۔

"میں یہ پوچھ رہا ہوں' یہ سونے کی چڑیا تمہارے ہاتھ کہاں سے آگئی" رشید نے کہا "میں تو بہت دنوں سے اس کی تلاش میں تھا۔ آج ملی ہے تو اس کی بوٹیاں تل کر کھا جاؤں گا' اس کے ساتھ ایسا سلوک کروں گا کہ یہ اپنی ساری ہوشیاری بھول جائے گی۔"

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بظاہر میں پُرسکون تھی لیکن میرا دل ہی جانتا ہے کہ میرے سینے میں کیسا طوفان برپا تھا۔ شاید میں اپنی حماقت سے ایک بار پھر پھنس گئی تھی لیکن میں نے پختہ کار اور تجربے کار عورت کی طرح اس صورتِ حال کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس لئے تیزی سے جمیل کے پاس پہنچ گئی۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"دیکھو' میں تمہارے ساتھ اس لئے نہیں آئی ہوں کہ اس آدمی کی ایسی باتیں سنوں۔ یہ تمہارے سامنے مجھے دھمکیاں دے رہا ہے۔"

"ابھی تو صرف دھمکیاں دی ہیں" رشید غراتا ہوا میری طرف بڑھا۔

لیکن میری حکمتِ عملی اپنا کام کرگئی تھی۔ جمیل سینہ تان کر اس کے سامنے آگیا اور اسے ایک طرف ہٹاتا ہوا بولا "بس بہت ہوچکی۔ اب تم یہاں سے دفع ہوجاؤ۔"

"تمہارا کیا دماغ خراب ہوگیا ہے" رشید دہاڑا "یہ کتیا تم پر جادو کررہی ہے۔"

جمیل نے اس کے جبڑے پر گھونسا رسید کردیا۔ رشید بھی کم نہیں تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے الجھ گئے۔ ان دونوں کے درمیان ایک لڑکی کے حصول اور انتقام کی جنگ ہورہی تھی۔ دونوں ذرا سی دیر میں لہولہان ہوگئے۔ دونوں ہی نئی دار تھے۔ لڑنے کا فن جانتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں نے چاقو نکال لئے۔ چاقو دیکھ کر میں بری طرح سہم گئی تھی۔ نہ جانے اس جنگ کا کیا انجام ہونے والا تھا۔ میرے پیروں میں لرزش برپا ہوگئی تھی۔ میں نے ایسا خونی کھیل پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ بھی میری وجہ سے میرے اکسانے پر ہورہا تھا۔ میرا ذہن اس وقت سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ نہ جانے کیا ہورہا تھا۔ کیا ہونے والا تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر چاقو سے وار کررہے تھے۔ کمرا گونج گیا۔ خون اگلتے ہوئے جسم' درد بھری چیخیں۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ میرے پیروں کی لرزش میرے پورے بدن پر محیط ہوگئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کمرے میں دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کردیا تھا۔ دونوں ہی حرام موت مرگئے تھے۔ صرف ایک لڑکی کے لئے۔ اور وہ لڑکی میں تھی جو ان دونوں لاشوں کے پاس کھڑی کانپ رہی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا جارہا تھا۔ میں بے ہوش ہوکر گرنے والی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال لیا۔ اس وقت گرچہ میرے اعصاب میرے قابو میں نہیں تھے لیکن میرا ذہن بہت تیزی سے کام کررہا تھا۔ میں بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ اگر ان دو لاشوں کے ساتھ ہی مجھے پکڑلیا جاتا تو پھر میرا کیا ہوتا' کیسی کیسی مزید بدنامیوں کے داغ میرے دامن پر لگ جاتے۔ میری زندگی تباہ ہوکر رہ جاتی۔ حالانکہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا' لیکن اس دہرے قتل کا محرک تو میں ہی تھی۔

ڈرائنگ روم کا فرش ان کے خون سے بھرگیا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ تڑپ رہے تھے۔ میرے لئے یہی بہتر تھا کہ میں جس طرح بھی ممکن ہو وہاں سے نکل لوں۔ یہ اچھا ہی تھا کہ ابھی تک کوئی اس طرف نہیں آیا تھا۔ شاید پڑوس والوں کو یا تو صورتِ حال کا اندازہ نہیں تھا یا وہ اس فلیٹ سے اس قسم کے شور و غل کے عادی ہوچکے تھے۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ کوریڈور میں کوئی نہیں تھا۔ میں آسانی سے نکل سکتی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اس فلیٹ سے باہر آگئی۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ مجرم عام طور پر اپنی گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے پکڑے جاتے ہیں' میں نہیں جانتی کہ میں نے کس طرح خود پر قابو پایا ہوگا۔ میں اس عمارت سے باہر نکل آئی' کسی نے میری طرف اشارہ نہیں کیا۔ کوئی مجھے روکنے کے لئے نہیں آیا اور میں گھر پہنچ گئی۔

بظاہر تو میں نے اپنے اعصاب پر قابو پالیا تھا لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ میں اندر سے بہت خوف زدہ تھی۔ اس رات مجھے بخار آگیا۔ خوف نے مجھے آخر کار توڑ دیا تھا۔ میں نے اسی سے بھی

کچھ نہیں بتایا تھا۔ دوسرے دن کے اخبارات میں ایک بہت چھوٹی سی خبر لگی تھی۔ جس کے مطابق دو جواری اور شرابی ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے ہلاک ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں کسی پر شبہ نہیں کیا گیا تھا۔ میں نہیں بتا سکتی کہ میں نے کس کس طرح خدا کا شکر ادا کیا ہو گا۔ ایک بہت بڑے عذاب سے میری جان بچ گئی تھی۔ اس کے باوجود میں کئی دنوں تک گھر سے باہر نہیں نکلی۔ ایک انجانا سا خوف مجھ پر طاری تھا۔ امی نے کئی بار سبب دریافت کیا لیکن میں نے اِدھر اُدھر کا بہانہ کر دیا۔

ایک دن امی نے مجھ سے اپنے اور میرے مستقبل کے بارے میں پھر باتیں کیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو مسٹرلیچی سے شادی کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

"ہمارے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی ہے نورین۔" انہوں نے بتایا "پہلے ہمارا ارادہ یہ تھا کہ یہاں سے فرانس جا کر شادی کر لیں گے لیکن اب ہمیں یہیں شادی کرنی ہو گی۔ کیونکہ مسٹرلیچی ایک سال بعد اپنے ملک جا سکیں گے اور ہم اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتے۔ ہم نے یہ سوچا ہے کہ ہم اس مکان کو فروخت کر دیں گے اور ایک اور مکان لے لیں گے۔ مسٹرلیچی کا مشورہ ہے کہ وہ مکان کرائے کا ہو کیونکہ ہم کو یہاں رہنا تو ہے نہیں۔ اب تم کیا کہتی ہو؟"

ہو سکتا ہے کہ میں انکار کر دیتی' لیکن اس حادثے کے بعد میں بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی۔ میں خواہ مخواہ کچھ لوگوں سے انتقام کی خاطر اپنے آپ کو بھی تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جو ہوا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ یہاں رہنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی لیکن ایک بات یاد رہے۔ آپ میں سے کوئی مجھے مذہب تبدیل کرنے کے لئے نہیں کہے گا۔"

"کیسی بات کرتی ہو" امی جلدی سے بولیں "میں خود ایک مسلمان عورت ہوں۔ میں یہ کیسے گوارا کر سکتی ہوں اور جہاں تک مسٹرلیچی کا تعلق ہے تو مجھے امید ہے کہ کچھ دنوں بعد وہ خود بھی مسلمان ہو جائیں گے۔"

میں نے امی کی بات پر اپنی گردن جھکا دی۔ ویسے اس دن بھی میں بہت دیر تک ابو کی تصویر کے پاس کھڑی رہی تھی۔ اس کے بعد کے معاملات بہت جلدی جلدی طے پانے لگے۔ ہمارا مکان بہت اچھی قیمت پر فروخت ہو گیا۔ مسٹرلیچی نے کرائے کا ایک مکان حاصل کر لیا۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز رکھ دی گئی۔ وہ مکان ہمارے اپنے مکان سے کہیں زیادہ شاندار تھا اور یہ علاقہ ایسا تھا جہاں کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون غیر ملکی ہے اور کون کسی کی بیوی ہے۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن رہنے والے لوگ تھے۔

خاندان والوں سے ہمارا کوئی رابطہ تو پہلے بھی نہیں تھا۔ ہم ان سے اور بھی دور ہو گئے۔ نئی جگہ آ جانے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ میرے ذہن سے بھیانک حادثوں کی یاد کم ہوتی چلی گئی۔ میں یہاں سے گاڑی پر کالج اور درس گاہ جایا کرتی۔ میں نے اپنے معمولات ترک نہیں کئے تھے۔

یہاں آنے کے بعد ایک دن احساس ہوا کہ ابو کی جو تصویر ڈرائنگ روم میں لگی رہتی تھی وہ دکھائی نہیں دے رہی۔ میں نے جب امی سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا۔

"بیٹی۔ وہ تصویر ہم نے اسٹور روم میں رکھ دی ہے۔ خواہ مخواہ مسٹرلیچی کو اس پر اعتراض ہوتا تھا۔ میں نے بھی یہ سوچا کہ اب جس آدمی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اس کی بات کیوں نہ مانی جائے۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے امی سے کچھ شکایت پیدا ہوئی۔ کیا مسٹرلیچی ان کی زندگی کے لئے اتنی اہمیت اختیار کر گئے تھے کہ انہوں نے ابو کی یاد کو اٹھا کر اسٹور روم میں بند کر دیا تھا۔ میں نے ان سے تو کچھ نہیں کہا البتہ وہ تصویر اسٹور روم سے نکال کر اپنے کمرے میں لگا لی۔ اس بات پر امی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔

پندرہ دنوں کے بعد امی کی مسٹرلیچی سے شادی ہو گئی۔

یہ شادی بھی بہت عجیب انداز کی تھی۔ ایک بار مشرقی طور پر گھر میں ہوئی۔ نہ جانے امی کو کیا سوجھی تھی۔ مسٹرلیچی کا نام عبدالرشید ظاہر کیا گیا تھا۔ امی بیوٹی پارلر جا کر دلہن بن آئی تھیں۔ اپنی امی کو دلہن بنانے کے سلسلے میں' میں بھی ان کے ساتھ گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کسی بیٹی کو ایسا موقع ملا ہو کہ وہ اپنی ماں کو دلہن بنتے ہوئے دیکھ سکے۔ ہم دونوں ماں بیٹی کے حسن نے بیوٹی پارلر میں ہلچل مچا دی۔ سب کی سب ہم دونوں کو دیکھ کر حیران ہوئی جا رہی تھیں۔ امی تو دلہن بننے کے بعد بے پناہ حسین لگ رہی تھیں۔

دوسرے دن امی کی شادی کورٹ میں ہوئی تھی۔ اس شادی میں سفارت خانوں وغیرہ کے علاوہ اور کوئی شامل نہیں ہوا تھا۔ اس طرح مسٹرلیچی میرے باپ اور امی کے شوہر بن کر ہماری زندگی میں داخل ہو گئے۔ میرے ایک نئے ابو آ گئے تھے۔ مسٹرلیچی کا رویّہ میرے ساتھ بہت شفقت بھرا تھا۔ ویسے بھی ہماری ملاقاتیں بہت کم ہوا کرتیں۔ صرف ناشتے کی میز پر ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے۔ اس کے بعد میں کالج کے لئے روانہ ہو جاتی۔ امی اور مسٹرلیچی اپنے کام پر چلے جاتے (نہ جانے کیوں میں انہیں ابو نہیں کہہ سکتی تھی' ایک عجیب سی جھجک ہوا کرتی تھی)

امی اب بہت خوش رہنے لگی تھیں۔ شاید انہوں نے اپنے پرانے دنوں کو فراموش کر دیا تھا۔ اور عقلمندی بھی یہی تھی کہ گزری باتیں فراموش کر دی جائیں۔ میں یہ محسوس کرتی کہ مسٹرلیچی دل و جان سے امی پر فدا تھے۔ ایسے رویّوں کا اظہار ذرا ذرا سی بات سے ہوا کرتا ہے۔ جبکہ میرا یہ خیال تھا کہ میں خود کو لئے دئے رکھتی۔

کچھ نہیں بتایا تھا۔ دوسرے دن کے اخبارات میں ایک بہت چھوٹی سی خبر لگی تھی۔ جس کے مطابق دو جواری اور شرابی ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے ہلاک ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں کسی پر شبہ نہیں کیا گیا تھا۔ میں نہیں بتا سکتی کہ میں نے کس کس طرح خدا کا شکر ادا کیا ہو گا۔ ایک بہت بڑے عذاب سے میری جان بچ گئی تھی۔ اس کے باوجود میں کئی دنوں تک گھر سے باہر نہیں نکلی۔ ایک انجانا سا خوف مجھ پر طاری تھا۔ امی نے کئی بار سبب دریافت کیا لیکن میں نے ادھر ادھر کا بہانہ کر دیا۔

ایک دن امی نے مجھ سے اپنے اور میرے مستقبل کے بارے میں پھر باتیں کیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو مسٹر لیمی سے شادی کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

"ہمارے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی ہے نورین۔" انہوں نے بتایا "پہلے ہمارا ارادہ یہ تھا کہ یہاں سے فرانس جا کر شادی کر لیں گے لیکن اب ہمیں یہیں شادی کرنی ہو گی۔ کیونکہ مسٹر لیمی ایک سال بعد اپنے ملک جا سکیں گے اور ہم اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتے۔ ہم نے یہ سوچا ہے کہ ہم اس مکان کو فروخت کر دیں گے اور ایک اور مکان لے لیں گے۔ مسٹر لیمی کا مشورہ ہے کہ وہ مکان کرائے کا ہو کیونکہ ہم کو یہاں رہنا تو ہے نہیں۔ اب تم کیا کہتی ہو؟"

ہو سکتا ہے کہ میں انکار کر دیتی' لیکن اس حادثے کے بعد میں بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی۔ میں خواہ مخواہ کچھ لوگوں سے انتقام کی خاطر اپنے آپ کو بھی تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جو ہوا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ یہاں رہنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی لیکن ایک بات یاد رہے۔ آپ میں سے کوئی مجھے مذہب تبدیل کرنے کے لئے نہیں کہے گا۔"

"کیسی بات کرتی ہو" امی جلدی سے بولیں "میں خود ایک مسلمان عورت ہوں۔ میں یہ کیسے گوارا کر سکتی ہوں اور جہاں تک مسٹر لیمی کا تعلق ہے تو مجھے امید ہے کہ کچھ دنوں بعد وہ خود بھی مسلمان ہو جائیں گے۔"

میں نے امی کی بات پر اپنی گردن جھکا دی۔ ویسے اس دن بھی میں بہت دیر تک ابو کی تصویر کے پاس کھڑی رہی تھی۔ اس کے بعد کے معاملات بہت جلدی جلدی طے پانے لگے۔ ہمارا مکان بہت اچھی قیمت پر فروخت ہو گیا۔ مسٹر لیمی نے کرائے کا ایک مکان حاصل کر لیا۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز رکھ دی گئی۔ وہ مکان ہمارے اپنے مکان سے کہیں زیادہ شاندار تھا اور یہ علاقہ ایسا تھا جہاں کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون غیر ملکی ہے اور کون کسی کی بیوی ہے۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن رہنے والے لوگ تھے۔

خاندان والوں سے ہمارا کوئی رابطہ تو پہلے بھی نہیں تھا۔ ہم ان سے اور بھی دور ہو گئے۔ نئی جگہ آ جانے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ میرے ذہن سے بھیانک حادثوں کی یاد کم ہوتی چلی گئی۔ میں یہاں سے گاڑی پر کالج اور درس گاہ جایا کرتی۔ میں نے اپنے معمولات ترک نہیں کئے تھے۔

یہاں آنے کے بعد ایک دن احساس ہوا کہ ابو کی جو تصویر ڈرائنگ روم میں لگی رہتی تھی وہ دکھائی نہیں دے رہی۔ میں نے جب امی سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا۔

"بیٹی۔ وہ تصویر ہم نے اسٹور روم میں رکھ دی ہے۔ خواہ مخواہ مسٹر لیمی کو اس پر اعتراض ہوتا تھا۔ میں نے بھی یہ سوچا کہ اب جس آدمی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اس کی بات کیوں نہ مانی جائے۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے امی سے کچھ شکایت پیدا ہوئی۔ کیا مسٹر لیمی ان کی زندگی کے لئے اتنی اہمیت اختیار کر گئے تھے کہ انہوں نے ابو کی یاد کو اٹھا کر اسٹور روم میں بند کر دیا تھا۔ میں نے ان سے تو کچھ نہیں کہا البتہ وہ تصویر اسٹور روم سے نکال کر اپنے کمرے میں لگا لی۔ اس بات پر امی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔

پندرہ دنوں کے بعد امی کی مسٹر لیمی سے شادی ہو گئی۔

یہ شادی بھی بہت عجیب انداز کی تھی۔ ایک بار مشرقی طور پر گھر میں ہوئی۔ نہ جانے امی کو کیا سوجھی تھی۔ مسٹر لیمی کا نام عبدالرشید ظاہر کیا گیا تھا۔ امی بیوٹی پارلر جا کر دلہن بن آئی تھیں۔ اپنی امی کو دلہن بنانے کے سلسلے میں' میں بھی ان کے ساتھ گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کسی بیٹی کو ایسا موقع ملا ہو کہ وہ اپنی ماں کو دلہن بنتے ہوئے دیکھ سکے۔ ہم دونوں ماں بیٹی کے حسن نے بیوٹی پارلر میں ہلچل مچا دی۔ سب کی سب ہم دونوں کو دیکھ کر حیران ہوئی جا رہی تھیں۔ امی تو دلہن بننے کے بعد بے پناہ حسین لگ رہی تھیں۔

دوسرے دن امی کی شادی کورٹ میں ہوئی تھی۔ اس شادی میں سفارت خانوں وغیرہ کے علاوہ اور کوئی شامل نہیں ہوا تھا۔ اس طرح مسٹر لیمی میرے باپ اور امی کے شوہر بن کر ہماری زندگی میں داخل ہو گئے۔ میرے ایک نئے ابو آ گئے تھے۔ مسٹر لیمی کا رویہ میرے ساتھ بہت شفقت بھرا تھا۔ ویسے بھی ہماری ملاقاتیں بہت کم ہوا کرتیں۔ صرف ناشتے کی میز پر ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے۔ اس کے بعد میں کالج کے لئے روانہ ہو جاتی۔ امی اور مسٹر لیمی اپنے کام پر چلے جاتے (نہ جانے کیوں میں انہیں ابو نہیں کہہ سکتی تھی' ایک عجیب سی جھجک ہوا کرتی تھی)

امی اب بہت خوش رہنے لگی تھیں۔ شاید انہوں نے اپنے پرانے دنوں کو فراموش کر دیا تھا۔ اور عقلمندی بھی یہی تھی کہ گزری باتیں فراموش کر دی جائیں۔ میں یہ محسوس کرتی کہ مسٹر لیمی دل و جان سے امی پر فدا تھے۔ ایسے رویوں کا اظہار ذرا ذرا سی بات سے ہوا کرتا ہے۔ جبکہ میرا یہ خیال تھا کہ میں خود کو لئے دئے رکھتی۔

کالج اور درس گاہ سے واپسی کے بعد میں اپنے کمرے میں آکر بند ہوجاتی تھی۔ کچھ دنوں بعد امی نے مجھے اس بات پر ٹوک بھی دیا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹی! تم سب لوگوں سے الگ الگ رہتی ہو۔ بالکل اجنبی کی طرح۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم نے انہیں قبول نہیں کیا ہے۔"

"نہیں امی' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو انہیں اپنے باپ کی جگہ سمجھنے لگی ہوں۔ وہ واقعی بہت اچھے آدمی ہیں۔"

امی مطمئن ہوگئیں۔ ان کا اطمینان ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد حالات کچھ ایسے ہوئے کہ سجاد حسین اور اس کے ساتھیوں کا دھیان بھی ذہن سے نکل گیا۔ اس کے دو ساتھی آپس میں لڑ کر فنا ہو چکے تھے۔ تین اور باقی تھے۔ جن میں سے ایک خود سجاد حسین تھا لیکن میں شاید سب کچھ فراموش کرچکی تھی۔ آدمی کہاں تک لکیروں کے تعاقب میں رہ سکتا ہے۔ وقت کی لہریں ریت پر بنے ہوئے نقش کی طرح سب مٹا دیتی ہیں۔ گھر کے حالات میں تبدیلی آئی تھی لیکن میں نے اپنے معمولات ترک نہیں کئے تھے بلکہ میں اپنی ریاضت میں اور وقت دینے لگی۔ میں کم سے کم وقت میں اس مقام تک پہنچ جانا چاہتی تھی جہاں دوسرے برسوں میں پہنچتے ہیں۔

ایک دن میرے استاد احمد حسین نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کرلیا۔ بہت دنوں کے بعد انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ ورنہ وہ عام طور پر دوری سے اپنے شاگردوں کو ریاضت کرتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ ان کی بیٹھک اسی طرح تھی جس طرح میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہی فرشی نشست اور درمیان میں بیٹھا ہوا ایک بردبار اور سکون بھرے دل کا مالک احمد حسین۔ میں استاد کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ بہت دیر بعد انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے میرے دل کو ٹٹول رہے ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔

"دیکھو بیٹی۔ یہ انتقام کی آگ جو ہوتی ہے نا' یہ سب سے پہلے اپنے دامن میں لگتی ہے" احمد حسین نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیکھو بیٹی۔ اصل امتحان یہ نہیں ہے کہ ساحل پر کھڑے ہو کر طوفان کو دیکھا جائے اور اس کے بارے میں بات کی جائے۔ بلکہ اصل امتحان یہ ہے کہ طوفان میں جاکر ساحل کی طرف بڑھا جائے۔ یہی زندگی ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہاری طرف سے بے خبر رہا ہوں۔ نہیں' جس دن تم میرے پاس پہلی بار آئیں۔ میں نے یہ جان لیا کہ تمہارے وجود میں کوئی جوالہ دہک رہا ہے۔ بہت جلد طاقت اور اقتدار کی خواہش کرنے والا وہ ہوتا ہے جسے یہ گمان ہو کہ اس کے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے لیکن تمہارے پاس وقت تھا۔ پھر تم ایسا کیوں چاہتی تھیں۔ اس کی یہی وجہ تھی کہ تمہاری نگاہیں سامنے کی طرف تھیں۔ تمہارے ذہن میں کوئی ایسی بات تھی جس نے تمہیں پریشان کر رکھا تھا۔ اس لئے بیٹی میں نے تمہاری لاعلمی میں ایک ایسی حرکت کی جس پر ہوسکتا ہے کہ تم مجھے معاف نہ کرسکو یا شاید معاف کردو۔"

"میں نہیں سمجھ سکی استادِ محترم" میں نے ادب سے کہا۔

"میں ایک دن تمہاری والدہ سے ملا تھا" احمد حسین صاحب نے بتایا۔

"کیا!" میں حیران رہ گئی تھی "آپ میری امی سے ملے تھے؟"

"ہاں۔ اور مجھے تم پر گزرنے والی کہانی معلوم ہوگئی ہے" احمد حسین صاحب نے کہا۔

میں نے شرم سے گردن جھکالی۔ یہ کیا ہوگیا تھا۔ کیا رسوائیاں پردے میں نہیں رہ سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ وہ اپنا اعلان کرتی پھریں۔ ایک عجیب سا تلخ احساس ہو رہا تھا۔ احمد حسین صاحب کو کیا ضرورت تھی میرے متعلق چھان بین کرنے کی۔ میں ان کی درس گاہ میں صرف تربیت حاصل کرنے آئی تھی۔ اس کے علاوہ میرا ان کا کیا رشتہ تھا' جو کچھ بھی ہوا اچھا نہیں ہوا تھا۔

"شاید تم اس بات پر ناراض ہو رہی ہو کہ میں نے تمہارے بارے میں جاننے کی کوشش کیوں کی" احمد حسین صاحب نے شاید میرے خیالات پڑھ لئے تھے "دیکھو بیٹی۔ بات یہ ہے کہ ایک اچھا استاد شاگرد کا دوست بھی ہوتا ہے اور اس کا باپ بھی' اور تم جہاں اور جس قسم کی تربیت حاصل کرنے آئی ہو وہ آسان نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر ریاضت کے ذریعے کوئی بھی بدنیت شخص طاقت حاصل کرلے تو وہ معاشرے کے لئے تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کی ذات دوسروں کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ تربیت حاصل کرنے والے کے پس منظر سے واقفیت حاصل کرلی جائے کہ ہم انجانے میں' بھول کر طاقت کی کنجی کسی غلط آدمی کے حوالے تو نہیں کر رہے۔"

"میں سمجھ گئی سر" میں نے ایک گہری سانس لی "تو اب میرے بارے میں کیا حکم ہے۔"

"حکم نہیں' بلکہ میں نے تمہیں یہ کہنے کے لئے بلایا ہے کہ اس دنیا میں سزا اور جزا کا عمل جاری ہے۔ یہ درست ہے کہ قانونِ قدرت ایسے لوگوں کو سزائیں دے دیتا ہے' جو کسی کی تباہی کا سبب بنتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ دوسروں کو یہ پتا نہیں چلتا کہ اس شخص کو کس چیز کی سزا دی گئی ہے۔ میرا نظریہ کچھ مختلف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس شخص کو یوں ہی جانے نہ دیا جائے۔ بلکہ اس کو باقاعدہ سزا دی جائے... تاکہ اسے اپنے اوپر گزرنے والے کرب کا اندازہ ہوسکے۔ حالانکہ اس کو دی جانے والی یہ سزا اس کے جرم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوگی لیکن اسے آزاد کردینے سے تو بہتر ہوگی نا۔"

"میں نہیں سمجھ سکی استادِ محترم کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہ ہمارے یہاں کی روایت نہیں ہے۔" احمد حسین نے کہا۔
"ہم تربیت کے دوران کسی کا کسی سے مقابلہ نہیں کرواتے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ لڑکی کا مقابلہ لڑکی اور لڑکے کا مقابلہ لڑکے سے ہی ہو لیکن تمہارے معاملے میں' میں نے اپنے دونوں اصول ترک کردیئے ہیں۔"

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ احمد حسین صاحب جو کچھ بھی کہہ رہے تھے وہ سمجھ میں آبھی رہا تھا اور اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

"آپ کی مہربانی ہوگی استاد محترم! اگر آپ مجھے ذرا سمجھا کر بتادیں۔"

"میں ایک شخص سے اگلے ہفتے تمہارا مقابلہ کروانا چاہتا ہوں" احمد حسین صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا!" میں نے اندازہ تو کرلیا تھا اس کے باوجود میں اپنی حیرت پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

"ہاں۔" احمد حسین صاحب نے غصے اور نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑ لئے "نہ جانے لوگ ایسی درس گاہوں کو غنڈا گردی سکھانے کا ادارہ کیوں سمجھنے لگے ہیں..... ان کا مقصد صبر اور برداشت کی قوت حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ وہ مار دھاڑ کے فن میں طاق ہو کر مخلوق کے لئے عذاب بنا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ لوگ میرے پاس آئے تھے۔ ان کے تیور' ان کے انداز اور ان کے حلیوں سے ان کے گھناؤنے ارادوں کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں شاگرد بنانے سے انکار کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غنڈا گردی پر اتر آئے۔ مجبوراً میں نے ان میں سے دو کو درس گاہ میں آنے کی اجازت دے دی۔ اور ان میں سے ایک سے تمہارا مقابلہ ہونے والا ہے۔"

"کیا وہ شخص اتنی جلدی مقابلے کے لئے تیار ہو گیا جناب؟"

"ہاں" احمد حسین نے گردن ہلادی "کیونکہ میں نے اس کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ میں اس وقت اس پر توجہ دوں گا۔ جب وہ ہمارے ادارے کی ایک لڑکی سے مقابلہ کرے گا۔ لڑکی سے مقابلہ کے ذکر پر اس کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔ اس سے بھی اس کی فطرت کی کمینگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اب تم یہ پوچھو گی کہ میں نے اس سے مقابلے کے لئے کسی لڑکی کا انتخاب کیوں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کو کسی لڑکی کے ہاتھوں پٹوانا چاہتا ہوں اور چونکہ تم اس قسم کے لوگوں کے خلاف بھری بیٹھی ہو۔ اس لئے اس پوری درس گاہ میں تمہارے علاوہ اور کوئی موزوں نہیں ہے لیکن اس سے پیشتر کہ تم اس سے مقابلہ کرو' میں تمہیں چند ہدایات دینا چاہتا ہوں۔"

احمد حسین صاحب نے مجھے کچھ نئے داؤ اور گُر بتائے' یہ سکھایا کہ ارتکاز کی قوت کیا ہوتی ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصل ہنر یہ ہے کہ مخالف کی طاقت کو خود اس کے خلاف استعمال کرو۔ ایسی کوشش کرو کہ اپنی قوت کا استعمال نہ کرنا پڑے۔ سانسوں کی چند مشقیں بتائیں اور آخر میں کہا۔

"اچھا بچی۔ اب سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم نے اب تک جتنی قوت حاصل کی ہے۔ اسے کس طرح استعمال کرتی ہو۔ میں نے یہ اندازہ لگالیا ہے کہ تمہارے وجود میں پارہ بھرا ہوا ہے۔ تم نے بہت کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرلیا ہے۔ تم نے نفرت کرنا سیکھ لیا ہے ایسے لوگوں سے جو کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس مقابلے میں ایسا ہی ایک بدنیت آدمی تمہارے سامنے آئے گا۔ اب دراصل یہی تمہارا امتحان ہے کہ تم کس طرح اس کو سبق سکھاتی ہو۔ میں سزا دینے کی بات نہیں کر رہا۔ کیونکہ تمہیں کسی کو سزا نہیں دینی۔ اپنی قوت اور ہنر کا کم سے کم استعمال کرنا ہے۔"

میں بہت دنوں بعد ہیجان میں مبتلا ہوئی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ استاد میرا کس طرح کا امتحان لے رہے تھے۔ انہوں نے اس آدمی سے مقابلہ کروانے کے لئے اپنی درس گاہ کے اصول کیوں بدل دیئے تھے لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس دن کے بعد' بلکہ اسی لمحے کے بعد میں اپنے آپ میں توانائی محسوس کرنے لگی تھی۔ ایک عجیب سی خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ احمد حسین صاحب نے سیکڑوں شاگردوں کے درمیان صرف مجھے اس قابل سمجھا تھا کہ میں ان کی طرف سے کسی کو سزا دے سکوں۔

یہ خبر جب درس گاہ میں پھیلی تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ دوسرے شاگردوں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ کسی لڑکی کا کسی لڑکے سے مقابلہ ہونے والا ہے۔ انہیں اس لڑکی کا نام نہیں معلوم تھا اور اسی طرح میں بھی یہ نہیں جانتی تھی کہ میرے مقابل آنے والا کون ہے۔

ایک دن اسی کشمکش میں رہی کہ امی کو اس بارے میں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ ہو سکتا تھا کہ امی یا مسٹر لیجی مجھے منع کردیتے۔ یہ سوچ کر میں نے ان دونوں سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ دو دنوں تک استاد کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ریاضت اور پریکٹس کرتی رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں یہ مقابلہ ضرور جیت لوں گی۔ اصل بات آدمی کے اپنے اعتماد کی ہوتی ہے اور مجھ میں مقابلہ جیت لینے کا اعتماد موجود تھا۔ بلکہ استاد نے اعتماد بحال کرادیا تھا۔

مقابلے کے وقت میری درس گاہ میں عجیب قسم کا جوش و خروش تھا۔ سارے شاگرد مخصوص سفید لباس میں اس ہال میں موجود تھے جس ہال میں مقابلہ ہونے والا تھا۔ چونکہ اپنی نوعیت کا پہلا مقابلہ تھا اس لئے سب ہی دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ مجھے استاد اپنے ساتھ لے کر ہال میں آنے والے تھے۔ جہاں وہ نوجوان پہلے سے موجود تھا۔ مقررہ وقت پر استاد نے ایک دو اور نصیحتیں کیں اور مجھے اپنے ساتھ لے کر درس گاہ کے ہال میں پہنچ گئے۔ وہ آدمی وہاں موجود تھا اور وہ سجاد حسین تھا۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ اسے دیکھ کر میرا کیا حال ہوا ہوگا یا اس کی کیا حالت تھی۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ بے پناہ حیرت نے اس

کی زبان گنگ کردی تھی۔ یہی حال میرا بھی تھا لیکن میری حیرت پر
میرا غصہ غالب آگیا تھا۔ میری نفرت غالب آگئی تھی۔ میں بھول گئی
کہ استادِ محترم نے کیا کہا تھا۔ ان کی کیا نصیحتیں تھیں۔ انہوں نے
کس کس طرح مجھے خود پر قابو پانے کی تلقین کی تھی۔ میں سب
بھول گئی تھی۔

مقابلہ شروع ہوا اور میں نے اس فن کے سارے اصول
سارے ضابطے بالائے طاق رکھ دیئے۔ میں مقابلہ کہاں کر رہی
تھی۔ میں تو اپنی نسوانیت' اپنی توہین' اپنی بے عزتی اور اپنی بربادی
کا انتقام لے رہی تھی۔ میں نے اس کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔
نہ جانے کتنی ٹھوکریں اس کی کمر' پیٹ اور سینے پر رسید کردیں۔
بیک کِک' فلائنگ کِک اور نہ جانے کون کون سے داؤ میں اس پر
استعمال کر رہی تھی۔ استاد مجھے روکنے کے لئے چیخ رہے تھے۔ دو
چار لڑکے اور لڑکیاں مجھے الگ کرنے آگے بڑھیں لیکن میں بھوکی
شیرنی بنی ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی
کتنی پسلیاں ٹوٹ کر اُس کے سینے سے جا لگی ہیں۔ اس کے منہ اور
ناک سے کس طرح خون جاری ہے۔ وہ فرش پر گرا ہوا تھا اور میں
اسے مارے جا رہی تھی۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب استاد اور
کچھ لوگوں نے مجھے زبردستی الگ کردیا۔

وہ ملغوبہ بن گیا تھا کچلے ہوئے گوشت اور خون کا۔ مجھے یہ بھی
پروا نہیں تھی کہ وہ زندہ ہے یا مرچکا ہے۔ البتہ صرف اتنا یاد ہے کہ
میں خود بھی جھومتی ہوئی بے ہوش ہوگئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد
جب آنکھ کھلی تو میں احمد حسین صاحب کے کمرے میں تھی۔ ہوش
میں آنے کے بعد میں جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ احمد حسین صاحب
میرے سامنے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اپنے طور پر اس وقت بھی
مطمئن تھی۔ شاید میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ لیکن استاد کے
خیال سے میں نے اپنی گردن جھکالی۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے" استاد کی آواز
ابھری "جو کچھ ہوا ۔ وہ میری سوچ کے مطابق ہی ہوا۔"

"کیا!" میں نے چونک کر استاد کی طرف دیکھا' جن کے
ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

"ہاں بیٹی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ اس موذی شخص کو تم اپنے
ہاتھوں سے سزا دو" استاد نے کہا "میں یہ جانتا تھا کہ وہ کون ہے' یہ
بات اسی دن معلوم ہوگئی تھی جب تمہاری امی سے میری ملاقات
ہوئی اور انہوں نے مجھے سب کچھ بتایا۔ پھر میں نے اس کا پتا چلایا
اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ جب یہ شخص خود
میرے پاس تربیت کے لئے آگیا۔ یہ میری درس گاہ میں بھی غنڈا
گردی کرنے آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے یہ سوچ لیا کہ میں اس
کو تمہارے ہی ہاتھوں سزا دلواؤں گا اور تم نے جو کچھ کیا وہ میری
منشا کے عین مطابق تھا۔"

"اوہ" میں نے ایک گہری سانس لی "تو اب کیا حال ہے اُس
کا؟"

"تم نے اس کی کئی پسلیاں توڑ دی ہیں" استاد نے کہا "اسے
اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ اس کا چہرہ بھی مسخ ہوچکا ہے۔ بہت برا حال
ہے اس کا لیکن تم فکر مت کرو' تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی کیونکہ
اُس کی یہ حالت ایک مقابلے میں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ پولیس
والوں سے میرے بھی اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ یہ کیس دبا دیا
جائے گا۔ تم بے فکر ہو کر گھر جا سکتی ہو۔"

"میری کچھ میں نہیں آ رہا استاد کہ میں کس منہ سے آپ کا
شکریہ ادا کروں" میں نے کہا "میں پاگل ہوگئی تھی۔ شاید مجھے ایسا
نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے اپنی طاقت اور اپنے ہُنر کا غلط
استعمال کیا۔ لیکن میں اس کو اپنے سامنے دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ
سکی تھی۔"

"تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ" استاد نے کہا "میں نے اپنے کچھ
شاگردوں کی ڈیوٹی لگادی ہے۔ وہ چوبیس گھنٹے تمہاری نگرانی کرتے
رہیں گے۔ ویسے تو خطرے کی کوئی بات نہیں ہے لیکن ہوسکتا ہے
کہ اس کے ساتھی اس کا بدلہ لینے کی کوشش کریں۔"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا" میں ممنون ہو کر بولی "ورنہ ان
لوگوں کی طرف سے یہ خدشہ ہوگیا تھا مجھے۔"

استاد کے دو شاگرد مجھے میرے گھر تک پہنچانے کے لئے آئے
تھے۔ میری ذہنی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں بیک وقت
اپنے اس کارنامے پر خوش بھی ہو رہی تھی اور خوف زدہ بھی تھی۔
خوف یہ سوچ کر ہو رہا تھا کہ کہیں وہ مر نہ جائے۔ اگر ایسا ہوجاتا تو
میں بہت بری طرح پھنس جاتی۔ استاد بھی اس وقت کچھ نہیں
کرسکتے تھے۔ پہلے تو میرا ارادہ یہ تھا کہ امی کو کچھ نہ بتایا جائے لیکن
اس خوف کے پیشِ نظر میں نے امی کو ساری صورتِ حال سے آگاہ
کردیا۔ وہ بے چاری خود بھی بہت پریشان ہوگئی تھیں۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا نورین" امی نے کہا "ہم تو اپنے دل پر
پتھر رکھ کر اس حادثے کو بھول بیٹھے تھے۔ ہماری زندگی کی راہ اب
کچھ اور ہوگئی تھی۔ اچھی خاصی پُرسکون زندگی گزرنے لگی تھی۔
آئندہ کے منصوبے ہمارے ذہن میں تھے لیکن اب شاید ایسا نہ
ہوسکے۔ اگر کچھ ہوگیا تو اچھی خاصی گڑبڑ ہوجائے گی۔"

"امی۔ کیا آپ کو اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ آپ کی بیٹی
اپنا بدلہ لینے کے قابل ہوگئی ہے اور یہ کہ اب کوئی مرد اسے تباہ
نہیں کرسکے گا۔"

"یہ سب کچھ تو ہے' لیکن ان اندیشوں کا کیا کیا جائے۔"

اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ کیونکہ وہی اندیشے
میرے ذہن میں بھی تھے لیکن حیرت انگیز طور پر کچھ بھی نہیں ہوا۔
بلکہ ایک حیرت کی بات یہ ہوئی کہ سجاد حسین نے عجیب و غریب
بیان دیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ کہیں جا رہا تھا کہ کچھ ایسے
غنڈوں نے اس پر حملہ کردیا جو اس کے لئے اجنبی تھے۔ ان غنڈوں

نے بہت بری طرح اسے مارا اور بے ہوش کر کے درس گاہ کے پاس پھینک گئے۔ جہاں سے درس گاہ کے ساتھی اسے اٹھا کر اسپتال لے آئے تھے۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اسپتال لے جانے والوں نے بھی یہی بیان دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ ساری کرشمہ سازی استاد کی تھی۔ انہوں نے ہی ایسا بندوبست کروایا ہوگا۔ درس گاہ کے طالب علم ان کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرلینے کے عادی تھے لیکن سجاد کو کیا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ وہ کس قسم کے دباؤ کا شکار ہوا تھا' یا ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنی عزت بچانے کے لئے ایسا بیان دیا کیونکہ اس کی ٹھکائی کرنے والی ایک لڑکی تھی۔ وہ اتنا بڑا غنڈا یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ اُس کو اس حال تک پہنچانے والی ایک لڑکی ہے۔ بات چاہے کچھ بھی ہو لیکن میرے سر سے بلا ٹل گئی تھی۔

ایک دن امی نے مجھے فرانس جانے کی خبر سنادی۔

"سارے انتظامات مکمل ہوگئے ہیں" امی نے بتایا "تمہارے پاپا نے پیرس میں ایک فلیٹ بھی لے لیا ہے۔ ہم دونوں کی وجہ سے تمہیں بھی بڑی آسانی سے وہاں کی شہریت مل گئی ہے۔ اب یہاں سے چلنے کی تیاری کرلو۔"

مجھے کیا تیاری کرنی تھی۔ اس شہر میں سوائے امی کے میرا تھا ہی کون۔ ایک استاد احمد حسین تھے تو جب میں نے ان سے جا کر اجازت لی تو وہ بہت دیر تک دعائیں دیتے رہے تھے۔ مسٹر لیجی کا رویہ ابھی تک بہت مشفقانہ تھا۔ وہ میرے معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ امی نے میرے اوپر گزرنے والی پریشانیوں کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی حالیہ واقعے کا ذکر کیا تھا۔ اس لئے اُن کا رویّہ نارمل تھا۔

امی یہ کہا کرتیں کہ میں انہیں پاپا کہا کروں لیکن میں انہیں پاپا نہیں کہہ سکی۔ اگر کوشش بھی کرتی تو حلق میں کوئی گولا سا آکر اٹک جاتا۔ ابو کا چھوٹا ہوں کے سامنے آجاتا۔ اس لئے میں انہیں آپ وغیرہ کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھی۔ میرے گھر کا ماحول کچھ عجیب سا تھا۔ میں اور امی مسلمان' مسٹر لیجی عیسائی۔ امی مسلمان ہونے کے بعد نماز وغیرہ کی پابندی بھی کیا کرتی تھیں۔ کم سے کم میں نے اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد یہی دیکھا تھا لیکن مسٹر لیجی سے شادی کے بعد ان کی بھی معمولات میں فرق آتا جارہا تھا۔ نماز وہ کبھی کبھی پڑھ لیا کرتیں۔ لباس کے معاملے میں انہوں نے مشرقیت کو خیرباد کہنا شروع کردیا تھا۔ وہ اس حد تک تو نہیں گئی تھیں پھر بھی ان کے لباس میں مغربیت آتی جارہی تھی۔ جبکہ میں وہی مشرقی لباس استعمال کیا کرتی۔ اس گھر میں اسلامی تقدس کی فضا کو قائم اور برقرار رکھنے کے لئے میں نے نماز بھی پابندی سے شروع کردی۔

مسٹر لیجی بڑی حیرت اور دلچسپی کے ساتھ مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کرتے۔ وہ بھی کبھی اتوار کو اپنی عبادت کے لئے چلے جایا کرتے۔ مجھے یہ سب غیر فطری محسوس ہوا کرتا۔ ایک گھر میں دو مختلف مذاہب اور طرزِ معاشرت کو اپنانے والے لوگ رہا کرتے تھے۔ اور ان کے درمیان رشتہ بھی کیسا تھا۔ شوہر اور بیوی' باپ (سوتیلا ہی سہی) اور بیٹی کا۔ خاندان والوں نے تو ہمیں چھوڑ ہی دیا تھا۔ اس لئے کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ ہماری طرزِ زندگی کے بارے میں جستجو کرتا۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب ہمیں اس ملک سے روانہ ہونا تھا۔ اس بار بھی بہت کچھ فروخت کیا گیا۔ پہلے مکان بکا تھا۔ اب گھر کے سامان کی باری تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک دوسرے ملک میں مستقل قیام کے لئے جارہے تھے۔ لہٰذا ان چیزوں کی وہاں ضرورت نہیں تھی۔ جانے سے پہلے میں اور امی' ابو کی قبر پر گئے تھے۔ میں اپنے بارے میں تو نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ میں تو وہاں جاتی رہتی تھی البتہ امی کو ساتھ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ قبرستان سے واپسی پر امی نے کہا "بیٹی۔ پاپا سے مت بتانا کہ ہم کہاں گئے تھے۔"

میں نے امی کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر دکھوں کے تاثرات تھے۔ شاید ابو یاد آگئے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے ابو کے ساتھ ایک عرصہ گزارا تھا۔

"نہیں امی" میں نے انہیں یقین دلایا "پاپا سے میری زیادہ بات چیت ہی کہاں ہوتی ہے۔"

"دیکھو بیٹی۔ ہم اس ملک سے جارہے ہیں۔ میرے لئے تو خیر یہ اجنبی ملک تھا۔ جہاں میں نے تمہارے ابو کے ساتھ آکر رہائش اختیار کرلی... اور خود کو یہاں کی زندگی اور معاشرت میں ڈھال لیا۔ جبکہ تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ تمہاری پیدائش اسی ملک میں ہوئی۔ تمہاری جڑیں اسی ملک میں ہیں۔ بہرحال' ہم یہاں سے بہت سی تلخ اور بہت سی خوش گوار یادیں لے کر فرانس جارہے ہیں۔ وہاں کی زندگی یہاں سے بالکل مختلف ہوگی۔"

"آپ میرے لئے پریشان نہ ہوں امی" میں نے کہا "جہاں آپ ہیں وہیں میری زندگی ہے' وہیں میری دنیا ہے۔"

پھر آنسوؤں' امیدوں اور اندیشوں کے ساتھ ہم نے پاکستان چھوڑ دیا اور فرانس آگئے۔ مسٹر لیجی نے واقعی پیرس کے مضافات میں ایک خوب صورت سے فلیٹ کا بندوبست کر رکھا تھا۔ چار پانچ دن تو سرکاری اور امیگریشن وغیرہ کی کارروائی میں گزر گئے تھے۔ پھر ہم فلیٹ کی سجاوٹ اور وہاں کے ماحول سے مانوس ہونے میں لگ گئے۔ ہمارا فلیٹ جس عمارت میں تھا۔ وہ ایک دس منزلہ عمارت تھی۔ جس میں بہت سے فلیٹس تھے لیکن بہت دنوں تک یہ پتا نہیں چلا کہ اس عمارت میں ہمارے علاوہ بھی کوئی رہتا ہے۔ اتنی خاموشی چھائی رہتی تھی۔ میرے لئے جو کمرا مخصوص کیا گیا تھا۔ اس کی کھڑکی ہرے بھرے ایک میدان کی طرف کھلتی تھی' جس کے درمیان سے ایک ریلوے لائن گزرا کرتی۔ میں اس لائن پر گزرنے والی ریل کو بہت دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد اس گھر کی سرگرمیاں معمول پر آگئیں۔ مسٹر لیجی نے دفتر آنا جانا شروع

کردیا جبکہ امی اور میں گھر میں رہا کرتیں۔
میں نے محسوس کیا کہ امی یہاں آکر بہت خاموش ہو گئی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسٹر لیچی کے آنے کے بعد وہ خود کو ہشاش بشاش بنالیتی تھیں۔ میرا داخلہ کچھ دنوں کے بعد وہاں کے ایک اسکول میں ہو گیا (ہاں۔ میں اپنے ملک میں کالج کی طالبہ تھی لیکن یہاں معیار اور زبان کے فرق کی وجہ سے مجھے اسکول ہی میں لیا گیا تھا) میں اسکول آنے جانے لگی۔ یہاں ایشیائی اور یورپ والوں کے درمیان تعصب دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایشیائی یہاں بہت کم تھے اور میں تو ویسے بھی ایک فرانسیسی ماں کی بیٹی تھی۔ میں نے اپنا رنگ روپ اپنی ماں سے اور وجاہت اپنے باپ سے حاصل کی تھی۔ اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ میں اس اسکول میں پڑھنے والی بہت سی لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت اور دل کش تھی۔
زندگی پُرسکون گزر رہی تھی۔ پھر ایک دن اس پُرسکون زندگی کے تالاب میں ایک کنکر آگرا۔ بہت چھوٹی سی یا شاید بہت بڑی بات ہوئی۔ صبح کا وقت تھا' میں اسکول جانے کے لئے لباس بدل رہی تھی کہ مسٹر لیچی اچانک کمرے میں آگئے۔ وہ یقیناً غلطی سے آئے ہوں گے کیونکہ میرا اور امی کا کمرا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھا لیکن کچھ لمحوں کے لئے ہم دونوں ہی پتھر بن کر رہ گئے۔ میں خوف اور شرم کی وجہ سے اور مسٹر لیچی نہ جانے کیوں۔ وہ مجھے دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے۔ پھر جس تیزی سے وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے اسی تیزی سے باہر بھی چلے گئے۔ وہ شاید اتنے بوکھلائے ہوئے تھے کہ معذرت بھی نہیں کر سکے۔
اس کے بعد میں اُن سے اور بھی کترانے لگی۔ خود وہ بھی بہت شرمندہ سے تھے۔ ان کی شرمندگی کا اظہار ان کے چہرے سے ہوتا تھا۔ ایک دن امی نے بھی اپنی ملازمت کی خبر سنادی۔ یہ ملازمت انہیں مسٹر لیچی کی کوششوں سے ملی تھی۔
"بیٹی۔ یہاں کا معاشرہ اور حالات ایسے ہیں کہ گھر کے ہر فرد کو ملازمت کرنی پڑتی ہے۔" امی نے بتایا "تمہارے گھر میں صرف تین افراد ہیں۔ ظاہر ہے کہ تم ابھی پڑھ رہی ہو۔ اس لئے تمہارا کوئی فرض نہیں بنتا لیکن میں تو کام کر سکتی ہوں نا۔"
میں یہاں بھی خاموش ہی رہی تھی۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ امی کو ملازمت کرنے کے لئے مسٹر لیچی ہی نے کہا ہوگا۔ واقعی معاشرہ بہت مختلف تھا۔ پاکستان میں تو ہم لگے بندھے مشرقی اصولوں کے مطابق زندگی گزارا کرتے تھے لیکن یہاں کی قدریں بہت مختلف تھیں اور میں ان قدروں کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ اب کبھی کبھی ہمارے فلیٹ میں کچھ لوگ بھی آنے لگے تھے۔ ان میں عورتیں بھی ہوتیں اور مرد بھی۔ یہ آنے والے یا تو مسٹر لیچی (میں انہیں' ابھی تک پاپا نہیں لکھ سکی ہوں) کے دوست ہوا کرتے یا ملازمت ملنے کے بعد امی کے دوست ہوتے۔ جن کے آنے پر
مسٹر لیچی کو کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ ایسے موقعوں پر میں اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔ وہ سب کے سب مجھے بہت دلچسپی اور حیرت سے دیکھا کرتے تھے۔ مجھ سے باتیں کرنے' میرے بارے میں جاننے کا انہیں شوق تھا لیکن میں نے کبھی ان میں سے کسی کی اتنی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی کہ آکر میرے دروازے پر دستک دے سکتا۔
ایک دن امی کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے مجھ سے اس موضوع پر بات کرلی۔
"بیٹی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اس معاشرے میں گھل مل جاؤ" امی نے کہا "کیونکہ اب یہی ہمارا وطن ہے۔"
"میں نے خود کو ایڈجسٹ تو کرلیا ہے امی۔"
"کہاں کیا ہے۔ یہاں کے کئی لڑکے تم سے دوستی کرنے کے خواہش مند ہیں لیکن تم بالکل تنہا رہتی ہو۔"
میں حیرت سے امی کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ وہ مجھے فرانسیسی لڑکوں سے دوستی کا مشورہ دے رہی تھیں۔ اپنے ملک میں تو انہوں نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ مجھے اپنے سائے تک سے بچا کر رکھا کرتی تھیں۔ امی نے شاید میری حیرت بھانپ لی اس لئے مسکراتی ہوئی بولیں۔
"میں سمجھتی ہوں کہ تم کو اس بات پر حیرت ہو رہی ہوگی لیکن میں تمہاری دشمن نہیں تمہاری ماں ہوں۔ اس لئے میری نگاہیں تمہارے مستقبل کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرکے ازدواجی زندگی کا آغاز کرسکو۔ ایک سے ایک بہتر رشتے مل سکتے ہیں۔ وہ معاشرہ اور تھا اور یہاں لڑکے لڑکیوں کی دوستی پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔"
"یہ تو میں جانتی ہوں امی' لیکن بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں" میں نے کہا "آپ اور میں اس گھر میں مسلمان ہیں۔ آپ کا تو خیر اس زمین سے تہذیبی اور معاشرتی رشتہ پہلے سے ہے لیکن میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے مشرقی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ کہا تھا کہ مسٹر لیچی مسلمان ہو جائیں گے لیکن وہ ابھی تک اپنے مذہب پر قائم ہیں جبکہ معاف کیجئے گا' میں یہ دیکھتی ہوں کہ خود آپ مشرقی معاشرت اور تہذیب سے دور ہوتی جارہی ہیں۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچتی ہوں کہ کہیں خود آپ ہی نے تو اپنا مذہب ترک نہیں کردیا؟"
"نہیں" امی نے انکار میں اپنی گردن ہلادی "ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے' لیکن سچ تو یہ ہے کہ ساتھ رہتے رہتے میں تہذیبی اور مذہبی اعتبار سے کمزور ہوتی جارہی ہوں۔ شاید میرے نزدیک اپنا اور تمہارا مستقبل ہی سب سے عزیز اور اہم ہے۔"
میں نے سوچا کہ میں امی سے یہ کہہ دوں کہ کاش آپ نے مسٹر لیچی سے شادی نہ کی ہوتی۔ کاش آپ ابو کی بیوہ بن کر ساری زندگی گزار دیتیں۔ کاش ہم پاکستان ہی میں رہتے۔ اگر آپ کو

شادی ہی کرنی تھی تو کیا پاکستان میں کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ آخر ابو بھی تو پاکستان ہی سے آئے تھے۔ اس قسم کے بے شمار سوالات تھے لیکن میں امی سے کچھ نہ کہہ سکی۔ بس خاموش رہی۔ البتہ انہیں یہ بتادیا کہ میرا مزاج چونکہ مختلف ہے۔ اسی لئے میں اس کو اپنا دوست بناؤں گی جو میرے معیار پر پورا اترتا ہوگا۔ امی خاموش ہوگئیں۔ ان کے لئے یہی بہت تھا کہ میں یہاں تک تو آگئی تھی۔

ایک سنیچر کی شام ہمارے فلیٹ میں پارٹی ہوئی۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس پارٹی میں امی اور مسٹر لیئی کے دوست آئیں گے۔ اس لئے میں اپنے کمرے میں جاکر بند ہوگئی۔ یہ چونکہ معمول کے مطابق تھا۔ اس لئے اُن دونوں میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ پارٹی کس وقت شروع ہوئی ہوگی۔ کیونکہ کچھ دیر کے بعد مجھے نیند آگئی تھی۔ میری آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے کھلی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ اس وقت باہر سے ہنسنے باتیں کرنے اور موسیقی کی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ پارٹی کا سلسلہ جاری تھا۔ ہوسکتا تھا کہ دستک دینے والی امی ہوں۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک فرانسیسی نوجوان تھا۔ جس نے مجھے دیکھ کر سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکیڑ لئے۔

"اوہ۔ تم تو واقعی بہت خوب صورت ہو۔"

میں نے غصے سے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکا تھا۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ جس کے عقب سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی ٹائی اس کے گلے میں بہت ڈھیلی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پہلے اس نوجوان کو نہیں دیکھا تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم!" میں نے غصے سے دریافت کیا "کیوں آئے ہو؟"

"اوہ۔ معاف کرنا" وہ جلدی سے بولا "میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ بات یہ ہے کہ مجھے تم سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ تمہارے بارے میں بہت سی باتیں سن رکھی تھیں۔ واقعی تم بے مثال حسن کی مالک ہو۔ تمہاری فرانسیسی بھی بہت اچھی ہے۔ بالکل اہل زباں کی طرح بولتی ہو۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ تم نے مشرق میں پرورش پائی ہے۔ ہاں اگر تمہارے جسم پر یہ عجیب وغریب لباس نہ ہو تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم فرانس کی نہیں ہو۔"

"دیکھو نوجوان۔ تم نے ایک سانس میں اچھی خاصی بکواس کرلی ہے" میں نے کہا "اب بہتر یہی ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں ہر ایک سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتی۔"

اتنا کہہ کر میں نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن اسی وقت امی وہاں آگئیں "ارے بیٹی۔ کیوں ناراض [illegible] ہو۔ یہ گارساں ہے۔"

میں نہیں جانتی تھی کہ [illegible] ہے۔ میں نے شاید اس کا نام بھی نہیں سنا تھا لیکن میرا د[illegible] ں وقت گارساں کی طرف نہیں بلکہ امی کی طرف تھا۔ کیونکہ امی نے شراب پی رکھی تھی۔

ہاں میری امی نے شراب پی رکھی تھی۔ اس ماں نے جس نے اپنا مذہب ترک کرکے اسلام قبول کیا تھا۔ جس نے اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان میں رہائش اختیار کی تھی۔ جس نے اپنے آپ کو بالکل تبدیل کردیا تھا۔ جو بہت سی مشرقی عورتوں سے بہتر تھی۔ آج وہی شراب کے نشے میں تھی۔ یہ امی کی طرف سے پہنچنے والا دوسرا صدمہ تھا۔ پہلا صدمہ تو اس وقت ہوا تھا جب امی نے ایک غیر مذہب کے شخص سے شادی کی تھی اور دوسرا صدمہ آج ملا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ امی کا لباس بھی بہت بے ہودہ سا تھا۔ امی کو شاید میری حیرت اور میرے صدمے کا کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی ڈرائنگ روم کی طرف لے چلیں۔ جہاں پارٹی ہو رہی تھی۔ گارساں بھی ہم دونوں کے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔

اس کمرے میں پہنچ کر امی رک گئیں۔ انہوں نے موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے اعلان کیا۔

"خواتین وحضرات۔ ہماری بیٹی۔"

وہاں موجود لوگ تالیاں بجانے لگے۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی پندرہ بیس سے کم نہیں تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ پوری فضا میں مہنگے سگار اور شراب کی بو رچی ہوئی تھی۔ عورتوں کے لباس ایسے تھے جن کو دیکھ کر میری آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ امی کے اس اعلان کے بعد وہ سب کے سب میرے اردگرد اس طرح جمع ہوگئے جیسے میں کوئی تماشا تھی۔ وہ سب میری خوب صورتی کی، میرے چہرے کی، میری آنکھوں کی تعریف کررہے تھے۔ میرے لباس سے ان کو حیرت ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ امی کچھ خوشی اور فخر سا محسوس کررہی تھیں۔ شاید ایک حسین بیٹی کی ماں اسی طرح کسی پارٹی وغیرہ میں اپنی بیٹی کا تعارف کرواتے ہوئے خوشی محسوس کرتی ہے۔

میں کچھ دیر تک بڑی بے دلی کے ساتھ ان لوگوں کے درمیان رہی۔ اس دوران گارساں نامی اس نوجوان نے کئی بار بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ میں تو امی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت بالکل ایک مغربی عورت تھیں۔ وہ شاید یہ بھول گئی تھیں کہ کبھی ان کا تعلق مشرق سے بھی رہا ہے۔ کچھ دیر بعد میں اپنے کمرے میں آگئی۔ ابو کی تصویر سامنے تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ابو کی آنکھیں اس تصویر میں بھی اداس ہوں۔

میں نے اس پارٹی کے بارے میں اور امی کے رویئے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ یہاں کے رنگ میں رنگ چکی تھیں اس لئے انہیں شرمندہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ میری بات نہیں مان سکتی تھیں لیکن میں یہ دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتی کہ امی اب اکثر نشے میں نظر آتیں۔ شراب نوشی ان کی

عادت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں ایک تبدیلی اور بھی آئی کہ وہ اب اکثر بیمار رہنے لگی تھیں۔ کبھی سر میں درد۔ کبھی پیٹ میں درد۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا حسین چہرہ مرجھاتا جا رہا تھا۔ نہ جانے انہیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ مسٹر لیجی ان کی بہت دیکھ بھال کیا کرتے۔ بالکل کسی اچھے شوہر کی طرح۔ وہ امی کو ایک دو بار علاج کے لئے بھی لے گئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ امی کو کیا ہوتا جا رہا ہے لیکن میرا دل لرزتا رہتا تھا۔ میرا سوائے امی کے اور تھا کون! نہ کوئی عزیز نہ کوئی دوست' کوئی بھی نہیں۔ صرف ایک سوتیلا باپ اور اس کا بھی تعلق غیر مذہب غیر ملک سے تھا اور میں خود ایک غیر ملک کی تھی۔ (اگر اپنے ملک میں بھی ہوتی تو کیا ہو جاتا۔ وہاں تو سجاد حسین اور اس کے ساتھیوں جیسے بے رحم لوگ موجود تھے) احساس ہونے لگا کہ جس کی قسمت میں کوئی سہارا نہ ہو' اسے کہیں چین نہیں مل سکتا۔ چاہے وہ ملک اپنا ہو یا پرایا۔

امی کو بھی شاید اپنی گرتی ہوئی صحت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ بہت خاموش رہنے لگی تھیں۔ میری طرف دیکھا کرتیں اور ان کی نگاہیں ویران ہو جاتیں۔ میں نے ان کی حالت کے بارے میں ایک دن مسٹر لیجی سے بات کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی موضوع پر بات کرنے ان کے پاس گئی تھی۔

"پاپا۔ پلیز' کیا آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ امی کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟"

مسٹر لیجی کچھ دیر تک گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے رہے' پھر ایک طویل سانس لے کر بولے "دیکھو بے بی۔ میں جانتا تھا کہ تم ایک نہ ایک دن یہ ضرور پوچھو گی۔ کیونکہ وہ تمہاری ماں ہیں لیکن اب میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے یا نہ بتایا جائے۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ مجھے بتا دینا بہتر ہو گا" میں نے کہا "کیونکہ اس طرح میں خود کو ذہنی طور پر تیار کر لوں گی۔ ورنہ اچانک پیش آنے والے حادثے بہت جان لیوا ہوتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم چونکہ ایک بہادر لڑکی ہو اس لئے میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تمہاری امی کو کینسر ہے۔"

ہو سکتا ہے کہ اس وقت زلزلہ نہ آیا ہو' طوفان برپا نہ ہوا ہو' آسمان نہیں ٹوٹا ہو لیکن میرے لئے سب کچھ ہو گیا تھا۔ میں امی کی کسی سیریس بیماری کی توقع تو کر رہی تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ بیماری ایسی ہو گی' اتنی مہلک اتنی' دہشت ناک۔ وہ بیماری جس کے بعد صرف ایک دروازہ کھلا رہتا ہے جو موت کا ہوتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میں نے کس طرح خود پر قابو پایا ہو گا۔ کس طرح اپنے آنسوؤں کو روکا ہو گا یا کس طرح میں خود مری نہیں تھی۔

مسٹر لیجی نے ہمدردی کے انداز میں میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ خدایا' میں اب کیا کر سکتی تھی۔ ماں کے ساتھ کہیں بھی ایسی خبر منسلک ہو جائے تو وہ پریشان کن ہوا کرتی ہے۔ اور یہ تو ایک اجنبی ملک تھا۔ پتا نہیں سارے دکھ میرے ہی نصیب میں کیوں تھے۔ میں نے اس وقت بہت تلخی سے سوچا تھا کہ میں اس بارے میں اپنے خدا سے ضرور شکوہ کروں گی' میں مسٹر لیجی کی ہمدردی کا شکریہ ادا کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

امی نے ملازمت چھوڑ دی۔ اب وہ زیادہ تر میرے پاس ہی رہتیں۔ میں سمجھتی تھی کہ انہیں رات دن میری فکر پریشان رکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی موجودگی میں میرے لئے کوئی جینے کی راہ نکل آئے لیکن دشواری یہ تھی کہ میں نے ابھی تک اس مقصد کے لئے اپنے ذہن کو تیار نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا تھا کہ میں فوری طور پر آنکھیں بند کر کے اس کے دامن سے وابستہ ہو جاتی۔ ایک خراب بات یہ تھی کہ امی نے اس بیماری کے دوران بھی شراب نوشی ترک نہیں کی۔ یہ صورت حال چونکہ میری برداشت سے باہر تھی اس لئے میں نے امی سے بات کی۔

"امی' اب آپ کو سمجھایا تو نہیں جا سکتا لیکن یہ اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ کو سمجھانے بیٹھ جاؤں۔ آپ خود اپنی حالت پر غور کریں۔ میں نے ہر بات برداشت کر لی' سب کچھ درگزر کر دیا۔ میں نے یہ بھی فراموش کر دیا کہ آپ اپنے محور سے ہٹتی جا رہی ہیں لیکن آپ کی یہ شراب نوشی مجھے پسند نہیں ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ خدا کے لئے اپنے حال پر رحم کریں۔ آپ بیمار ہیں۔ یہ عادت آپ کو موت کے بہت قریب لے جائے گی۔ اور یہ جان لیں کہ آپ کی موت میری موت بھی ہے۔"

"میں جانتی ہوں بیٹی" امی نے بے ساختہ مجھے سینے سے لگا لیا۔

خدا کی پناہ امی کے اس عمل سے مجھے کتنی فرحت ملی تھی۔ کتنا سکون حاصل ہوا تھا۔ نہ جانے کتنے دنوں کے بعد امی نے اس طرح اپنی آغوشِ محبت وا کی تھی۔ وہ اس وقت مغرب کی نہیں بلکہ مشرق کی عورت بن گئی تھیں۔ یا شاید ماں ہر جگہ ایک ہی جیسی ہوتی ہے' چاہے وہ پاکستان ہو یا فرانس۔

"آپ جانتی ہیں تو پھر ایسا کیوں کرتی ہیں۔ آپ کو تو یہ عادت کبھی نہیں تھی۔"

"ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو" امی نے ایک گہری سانس لی۔ وہ میرے برابر صوفے پر بیٹھ گئی تھیں "یہ عادت فرانس آنے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ مختلف پارٹیوں میں آنا جانا ہوا۔ پھر تمہارے پاپا کے کہنے پر میں نے یہ شروع کر دیا۔ تم تو جانتی ہو کہ تمہارے پاپا کے لئے یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے امی۔ لیکن آپ بیمار ہیں۔"

"اس بیماری نے تو پریشان کر دیا ہے" امی نے کہا' پھر میری طرف دیکھ کر بولیں "بیٹی' میرا خدا گواہ ہے کہ میری پریشانی اپنی بیماری کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ تمہارا کیا ہو گا۔ تم کہاں جاؤ گی' کیا کرو گی۔ اس لئے میں یہ چاہتی تھی کہ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے تمہارے لئے کوئی راہ نکل آئے۔"

"اور میرے لئے راہ یہی ہے کہ میری شادی ہو جائے کیوں۔"

"ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"نہیں امی!" میں فیصلہ کن لہجے میں بولی "آپ کے اس مغرب کی جہاں بہت سی باتیں مجھے ناپسند ہیں وہاں یہ بات پسند بھی آئی ہے کہ یہاں کوئی کسی کے معاملے میں مداخلت نہیں کرتا۔ ہر ایک کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ چاہے وہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ یہاں اگر کسی لڑکی کی شادی نہیں ہوئی تو اس میں کیڑے نہیں نکالے جاتے اور نہ ہی کسی کو اس بات کی پروا ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر خدانہ کرے آپ کو کچھ ہو گیا تو میں اپنی زندگی اس وقت تک اپنی مرضی سے گزاروں گی جب تک خدا کی طرف سے کوئی بہتر راستہ سامنے نہیں آجاتا۔ اور آپ تو جانتی ہیں کہ میری قوتِ ارادی کتنی مضبوط ہے۔"

امی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ مجھ سے اب اس موضوع پر بات نہیں کی جاسکتی۔

کچھ دنوں کے بعد امی کا مرض کھل کر سامنے آگیا۔ وہ درد کی شدت سے تڑپتی رہتیں۔ پھر ڈاکٹر بلائے جاتے۔ یا انہیں اٹھا کر اسپتال پہنچا دیا جاتا۔ مسٹرلیجی بہت خدمت کر رہے تھے اور جہاں تک میرا سوال تھا تو میں نے خود کو امی کے لئے وقف کردیا تھا۔ میں رات دن دعائیں مانگتی' خدا سے ان کی زندگی کی مہلت طلب کرتی' نمازیں پڑھا کرتی۔ لیکن موت پر آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایک رات امی کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچادیا گیا۔ اگرچہ اس شہر میں علاج وغیرہ کی ساری سہولتیں حاصل تھیں' اس کے باوجود دوسرے دن امی کا انتقال ہو گیا۔

میں خود مرگئی۔ میں نہ جانے کتنی بار بے ہوش ہوئی اور کتنی بار مجھے ہوش میں لایا گیا۔ میں یہ نہیں جانتی۔ مجھے کچھ احساس ہی نہیں تھا۔ ابو کی موت کے بعد امی کی محبت نے مجھے سہارا دیا تھا۔ میری زندگی کی راہیں استوار کی تھیں۔ لیکن امی کے بعد کون تھا! کوئی نہیں۔ دور دور تک سوائے سناٹے کے اور کچھ نہیں تھا۔ امی کی آخری رسومات اسلامی طریقے پر ہوئی تھیں۔ وہاں مسلمانوں کا ایک قبرستان تھا جس میں انہیں دفن کیا گیا تھا۔ میں خود بھی مسٹرلیجی کے ساتھ ان کی قبر پر گئی تھی۔ مسٹرلیجی مجھے سہارا دے کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ میں وہاں بھی دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔ ظاہر ہے' میرے پاس سوائے آنسوؤں کے اور رہ ہی کیا گیا تھا۔

میں ابھی تک اس فلیٹ میں تھی۔ اس کے علاوہ میرا ٹھکانا ہی کیا تھا۔ مسٹرلیجی نے میری خاطر ایک ایسی عورت کا بندوبست کردیا تھا جو اُن کے دفتر چلے جانے کے بعد میری دیکھ بھال کیا کرتی۔ وہ بے چاری میری کیا دیکھ بھال کرسکتی تھی۔ میں تو اپنے کمرے میں بند رہا کرتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زندگی کس طور سے گزاری جائے۔ کہاں رہوں' کیا کروں' وہ عورت یا مسٹرلیجی اگر کھانے کے لئے زور دیتے تو تھوڑا بہت کھا پی لیا کرتی۔ ورنہ سارا سارا دن امی کو یاد کرکے روتی رہتی۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ وقت ہر زخم کا مرہم ہوا کرتا ہے۔ یہ شاید درست ہی ہے۔ وقت نے امی کے خلا کو پُر تو نہیں کیا تھا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ آنسوؤں کی شدت میں کچھ کمی آگئی اور اس وقت میں نے ایک فیصلہ کرلیا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں اب اس فلیٹ میں نہیں رہ سکتی۔ میں نے جب مسٹرلیجی سے اپنے اس فیصلے کا اظہار کیا تو وہ بھی حیران رہ گئے۔

"کیوں نورین' تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟" انہوں نے پوچھا "تم یہاں کیوں نہیں رہ سکتیں؟"

"دیکھیں پاپا' بات یہ ہے کہ آپ نے مجھے بہت محبت دی' اتنی شفقت دی کہ میں نے جس کا تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن میری اور آپ کی اس محبت کے درمیان امی ایک زنجیر کی طرح تھیں۔ جس نے ہمیں ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا۔ اب وہ زنجیر ٹوٹ گئی ہے۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ معلق ہو گئے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ معاشرہ نہیں ہے۔ کوئی کسی کے بھی ساتھ رہے' کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ لیکن میں اسے اپنی جگہ اچھا نہیں سمجھتی۔ اس کے علاوہ آپ میں اور مجھ میں مذہب کا بھی ایک فرق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں بعد آپ دوسری شادی کرلیں۔ ایسی صورت میں میرا یہاں رہنا اور بھی نامناسب ہوگا۔ آپ کچھ دنوں بعد خود ہی میرے وجود سے اکتا جائیں گے' اس لئے میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔"

مجھے خود اس بات پر حیرت تھی کہ میں اتنی پختہ اور تجربے سے بھرپور باتیں کس طرح کہہ سکی۔ لیکن وقت استاد بھی ہوا کرتا ہے' وہ کسی کو بہت جلد ساری باتوں سے آگاہ کردیتا ہے اور کسی کو بہت دیر سے۔ تو مجھے بہت پہلے سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ زندگی اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ میرے سامنے آگئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا" مسٹرلیجی نے کہا۔ "لیکن کیا تم اپنے ملک واپس جاؤ گی؟"

"نہیں۔ کیونکہ وہاں بھی میرے لئے سوائے اندھیروں کے اور کچھ نہیں ہے" میں دھیرے سے بولی "میں نے یہاں کسی ہوسٹل میں رہنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ اور اپنی گزر اوقات کے لئے ملازمت تلاش کرلوں گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری رہائش اور ملازمت کے سلسلے میں میرا ضرور ساتھ دیں گے۔"

"ہاں' ہاں کیوں نہیں" مسٹرلیجی نے جلدی سے کہا "لیکن تمہیں ملازمت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیونکہ شاید تم کو نہیں معلوم کہ تمہاری امی تمہارے لئے اچھی خاصی رقم چھوڑ گئی ہیں۔ یہ رقم انہیں مکان اور فرنیچر وغیرہ فروخت کرنے کے بعد حاصل ہوئی تھی۔"

یہ ایک اچھی خبر تھی۔ اس کے لئے میں نے مسٹر لیجی کا شکریہ ادا کیا۔ میرا ارادہ دوسرے ہی دن کسی گرلز ہوسٹل منتقل ہونے کا تھا لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ وہ رات میرے لئے بہت بھیانک، بہت تباہ کن ثابت ہوئی۔ یہ وہ رات تھی جب میری تقدیر کا فیصلہ ہوگیا۔ اس رات ٹھیک ایک بجے مسٹر لیجی نے زور زور سے میرے دروازے پر دستک دینی شروع کردی۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ میں نے بوکھلا کر دروازہ کھول دیا حالانکہ اس وقت میرے جسم پر لباس بھی مناسب نہیں تھا لیکن میں لباس بھی بدل نہیں سکی تھی۔

"کیا بات ہے پاپا؟" میں نے مسٹر لیجی سے دریافت کیا۔

مسٹر لیجی کوئی جواب دیئے بغیر کمرے میں گھس آئے۔ ان کے مُنہ سے شراب کی بو آرہی تھی اور ان کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی۔ وہ ہوس جسے شناخت کرنے میں مجھ سے غلطی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں ایسی ہوس بھری نگاہوں کے عذاب سے پہلے بھی گزر چکی تھی اور آج ایک بار پھر ایک ہوس بھرا مرد میرے سامنے تھا۔

"پلیز پاپا۔ کمرے سے چلے جائیں آپ۔" میں نے اپنے آپ کو چھپاتے اور چراتے ہوئے کہا۔

"اب تو یہ ہوہی نہیں سکتا" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولے "تم نے یہاں سے جانے کی بات کی ہے۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا کیونکہ میں نے تم سے شادی کا ارادہ کیا ہے۔ اب تم میری بیوی بنوگی۔"

"کیا!" میں سکتے کے عالم میں ان کی طرف دیکھتی رہ گئی "آپ ہوش میں تو ہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"خود سوچو۔ تم جیسی خوب صورت لڑکی کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہ کر کون ہوش میں رہ سکتا ہے۔ میں تو اسی دن سے تمہارے حسن کا دیوانہ ہوگیا تھا جس دن میں تمہارے کمرے میں آیا تھا لیکن میں نے اس بُڑھیا سے کچھ نہیں کہا' کیونکہ میں جانتا تھا....."

"خاموش' ذلیل کمینے۔" میرے اندر کا جارحانہ پن بے دار ہوگیا۔ وہ شخص میری مرحوم ماں کی توہین کررہا تھا۔ اس نے میرے لئے ہوس کی بات کی تھی۔

"کیوں؟ اس میں کون سی بری بات ہوگئی" لیجی نے اپنے بازو پھیلادیئے "سب چلتا ہے۔ خود سوچو' مجھ سے اچھا شوہر تمہیں اور کہاں مل سکتا ہے۔ میں تمہاری اتنی دیکھ بھال کروں گا' تمہاری اتنی خدمت کروں گا' تم سے اتنا پیار کروں گا کہ تم سب بھول جاؤگی۔"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دنیا کی ہر چیز سے میرا اعتبار اچانک اٹھ گیا تھا۔ کیا ابو کے علاوہ دنیا کے سارے مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ اس دوران لیجی میرے قریب آچکا تھا۔ میرے بدن میں اس وقت آگ بھری ہوئی تھی۔ لیجی نے ناپاک ارادے سے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور میں نے اس پر ایک وار کردیا۔ یہ ایک جنونی وار تھا۔ یہ ایک ایسی لڑکی کا وار تھا جو اپنی عزت بچانے کی جدوجہد کررہی ہو۔ وہ تیورا کر گرا۔ اس کمرے میں پیتل کا ایک بڑا گلدان رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ گلدان اٹھایا اور اس کے سر پر مارنے لگی۔ ایک بار... دوبار.... تین بار۔ میرے سامنے اس وقت سجاد حسین تھا۔ اس کے ساتھی تھے بلکہ دنیا کا ہر بدکردار مرد میرے سامنے تھا۔ میں نے اس کے سر کو کچل کر رکھ دیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس پر کتنے وار کیئے تھے۔ اس پر وار کرنے کے ساتھ ساتھ میں خود بھی چیختی جارہی تھی۔ شور کرتی جارہی تھی۔ اس کے خون سے خود میں بھی لہو رنگ ہوگئی تھی۔ لیکن مجھے کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔

مجھے ہوش اس وقت آیا جب کسی نے مجھے پکڑلیا تھا۔ اور میں اس کی گرفت میں پھڑپھڑارہی تھی۔ پھر مجھے وہ ہوش بھی نہیں رہا (بعد میں پتا چلا کہ مجھے پکڑنے والی وہی عورت تھی جسے لیجی نے میری دیکھ بھال کے لئے رکھا تھا۔ وہ کسی کام سے فلیٹ میں آئی تو میرے کمرے سے میرے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اردگرد کے لوگوں کو بلا کر لے آئی۔ اس طرح مجھے قابو میں کرلیا گیا تھا) لیجی کی موت تو اسی لمحے واقع ہوگئی تھی۔ ایسے شخص کو مرہی جانا چاہئے تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ ایک نیا تجربہ تھا' ایک نئی کہانی تھی۔ میں اس بات پر شکر ادا کرتی ہوں کہ مجھ سے یہ جرم کسی اور ملک میں سرزد ہوا تھا۔ اگر اپنے ملک میں ہوتا تو نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ جب میں پولیس کی تحویل میں آگئی اور مجھ پر مقدمہ چلنے لگا تو اس وقت ایک نوجوان میری مدد کرنے میرے پاس آگیا۔ اور وہ نوجوان گارساں تھا۔ وہ فرانسیسی جس سے میری امی نے میرا تعارف کروایا تھا۔ وہ جب لاک اپ میں مجھ سے آکر ملا' اس وقت میں بالکل خالی الذہن تھی۔ کم از کم زندگی سے تو کوئی انسیت نہیں تھی۔ اب میرے لئے بھی سب سے بہتر راستہ موت ہی کا تھا۔ وہ موت جس کی آغوش میں جاکر غم زمانہ سے نجات مل جاتی ہے۔ میں اپنی زندگی کے اس موڑ پر کسی سے ملاقات کی امید نہیں کررہی تھی۔ اس لئے جب گارساں مجھ سے ملنے آیا تو مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔ میری اس کی ملاقات ایک کمرے میں ہوئی تھی۔ جس میں بہت آرام دہ صوفے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ میرے لئے پھولوں کا ایک گلدستہ بھی لے کر آیا تھا۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ موت کی خواہش کرنے والی ایک لڑکی کے لئے پھول لائے گئے جو زندگی کی علامت ہوا کرتے ہیں۔

"میں نہیں جانتا کہ میں کس انداز میں تم سے ہمدردی کروں۔" گارساں نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہمدردی کی کیا ضرورت ہے" میں تلخ ہوکر بولی "میں ایک خونی لڑکی ہوں۔ میں نے تمہارے ملک کے ایک معزز شہری کا خون کردیا ہے۔ اس لئے مجھے تو سزا ملنی چاہئے۔ یہ ہمدردی وغیرہ کیوں؟"

"نہیں۔ تم ایسی لڑکی نہیں ہو" گارساں نے کہا "یقیناً تمہارے ساتھ کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی جس کی وجہ سے تم اتنا بڑا

قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئیں۔"
"ہاں!" میں نے ایک گہری سانس لی "میرے ساتھ ایسی بات ہونے والی تھی۔ لیکن جو کچھ ہونے والا تھا اس کی تمہارے معاشرے میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ گرچہ قتل جیسے جرم کو ہمارے ملک میں بھی معاف نہیں کیا جاتا لیکن وہاں کم از کم اس بات کی ابھی تک اہمیت ہے۔ عورتوں کی عزت کا خیال رکھا جاتا ہے۔"
"میں سب جانتا ہوں اور مجھے یہ اندازہ ہے کہ اپنی امی کی موت کے بعد تم اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھیں۔ اور تم نے اس جنون کی حالت میں مسٹر لیتی کا قتل کیا ہے۔"
"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے کسی جنون میں قتل نہیں کیا بلکہ ہوش و حواس میں کیا ہے کیونکہ اس شخص نے میری طرف دست درازی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔"
"نہیں۔ تم نے جنون میں قتل کیا ہے۔" گارساں نے اپنی بات دہرائی "اور تمہیں یہی کہنا ہے۔ میں نے جن ڈاکٹروں سے بات کی ہے۔ وہ بھی اس بات کی تصدیق کر دیں گے۔ اس طرح تمہارے جرم کی نوعیت بدل جائے گی اور تمہاری سزا میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔"
"اوہ!" میں نے ایک گہری سانس لی "اب سمجھی۔ لیکن تم اتنی ہمدردی کیوں کر رہے ہو؟"
"یہ بات خود میری سمجھ میں نہیں آئی" گارساں مسکرا دیا۔ "ہو سکتا ہے کہ کبھی میرا تعلق بھی تمہارے مشرق سے رہا ہو۔ بہرحال میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک باحوصلہ لڑکی ہو۔ تم پریشانیاں برداشت کر لوگی۔ اور ہاں اس ملک میں خود کو تنہا مت سمجھنا۔ کم از کم تمہارا ایک دوست تو ہے۔"
میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ میرا اس کا رشتہ ہی کیا تھا۔ ایک دفعہ ملاقات ہوئی اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ میں نے اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔ اور یہ شخص میرا اتنا ساتھ دے رہا تھا۔ اتنی ہمدردی کر رہا تھا۔ اتنا حوصلہ دے رہا تھا۔ وہ مجھے دلاسے دے کر چلا گیا۔ میں نے نہ جانے کیوں اس کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ وہی بیان دیا جو اس نے کہا تھا۔ بہت دنوں تک میرے بارے میں بحث مباحثے ہوتے رہے۔ طرح طرح کے دلائل دیئے گئے۔ اخبارات میں میرا ذکر کیا گیا۔ امی کی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوا کرتی کہ ابھی تک امی کا کوئی رشتے دار سامنے کیوں نہیں آیا تھا حالانکہ امی اسی ملک کی تھیں۔ کسی نہ کسی کو تو سامنے آنا چاہئے تھا۔ پاکستان میں بھی امی نے اپنے کسی رشتے دار وغیرہ کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ میں اگر دریافت بھی کرتی تو وہ خاموش رہ جاتیں۔ امی کے خاندان کے بارے میں ابو بھی کچھ نہیں بتاتے تھے۔
یہ معمہ بھی گارساں ہی نے حل کیا۔ جب وہ ایک دن معمول کے مطابق مجھ سے ملنے آیا تو میں نے امی کے خاندان کا پتا چلانے کی درخواست کی۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ امی کا پرانا نام ازابیلا تھا اور وہ فرانس کے ایک قصبے سوہارو سے تعلق رکھتی تھیں۔ گارساں کئی دنوں بعد جب مجھ سے ملنے آیا تو اس کے ہاتھ میں پرانے اخبارات اور رسائل وغیرہ تھے۔
"میں نے تمہارے کہنے پر تمہاری امی کے ماضی کا پتا چلا لیا ہے" اس نے بتایا "لیکن بہتر یہی تھا کہ تم معلوم نہ کرتیں۔"
"کیوں!" میں نے گارساں کی طرف دیکھا "جو کچھ بھی ہے' میں تو اب ہر قسم کی خبر سننے کی عادی ہو چکی ہوں۔"
"پہلے یہ تصویریں دیکھ لو۔" گارساں نے پرانے رسائل میرے سامنے رکھ دیئے۔
ان رسائل کے .... ٹائٹل پر یا اندرونی صفحات پر ایک دل کش لڑکی کی تصویر چھپی تھی۔ وقت نے اس کے چہرے کے نقوش میں تبدیلی تو کر دی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ اس کی شناخت نہ ہو سکے۔ وہ تصویریں بلاشبہ امی کی تھیں۔ جب وہ جوان تھیں جب وہ بہت زیادہ خوب صورت اور طرح دار تھیں۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ وہ تصویریں مختلف انداز کی تھیں۔ شاید میری امی کوئی ماڈل گرل رہ چکی تھیں۔ یہ ایسا سچ تھا جسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔
"کیا میری امی کوئی ماڈل گرل تھیں گارساں؟" میں نے دکھے ہوئے دل سے پوچھا۔
"ہاں۔ فرانس کی بہت مشہور ماڈل گرل" گارساں نے بتایا۔ "لیکن میں تمہارا نقطۂ نظر سمجھ رہا ہوں۔ اس میں تمہارے لئے پشیمانی کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں تمہاری امی نہ تو پاکستان گئی تھیں' نہ تمہارے ابو سے ان کی شادی ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے تمہارا مذہب قبول کیا تھا۔ وہ چونکہ اس معاشرے کا ایک فرد تھیں اس لئے انہوں نے جو کچھ بھی کیا اپنے نقطۂ نظر سے درست ہی کیا۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ چلو تم مجھے ان کے بارے میں تفصیل سے بتا دو۔"
ان رسائل وغیرہ میں امی کے بارے میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔ لیکن میری ایک مجبوری یہ تھی کہ میں فرانسیسی پڑھ نہیں سکتی تھی حالانکہ امی نے اہلِ زبان کی طرح بولنا سکھا دیا تھا۔ لیکن فرانسیسی لہجے میری کمزوری تھی۔ اس لئے ابھی تک پڑھنے پر قادر نہیں ہو سکی تھی۔
"کیا واقعی اپنی امی کے بارے میں جان لینا چاہتی ہو؟"
"ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے" میں نے کہا "ماضی تو اپنی خوش گواری اور ناگواری سمیت گزر چکا ہے۔ جو کچھ ہونے والا تھا ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مجھے اپنی ماں کے بارے میں معلوم ہو جائے۔"
"تو پھر سنو۔ ازابیلا نامی ایک خوب صورت لڑکی سوہارو نامی ایک قصبے ہی پیدا ہوئی۔ اس کے والدین کسان تھے۔ لڑکی شروع ہی سے بہت خوب صورت اور ذہین تھی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی

قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئیں۔"

"ہاں!" میں نے ایک گہری سانس لی "میرے ساتھ ایسی بات ہونے والی تھی۔ لیکن جو کچھ ہونے والا تھا اس کی تمہارے معاشرے میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ گرچہ قتل جیسے جرم کو ہمارے ملک میں بھی معاف نہیں کیا جاتا لیکن وہاں کم از کم اس بات کی ابھی تک اہمیت ہے۔ عورتوں کی عزت کا خیال رکھا جاتا ہے۔"

"میں سب جانتا ہوں اور مجھے یہ اندازہ ہے کہ اپنی امی کی موت کے بعد تم اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھیں۔ اور تم نے اس جنون کی حالت میں مسٹر لینی کا قتل کیا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے کسی جنون میں قتل نہیں کیا بلکہ ہوش و حواس میں کیا ہے کیونکہ اس شخص نے میری طرف دست درازی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔"

"نہیں۔ تم نے جنون میں قتل کیا ہے۔" گارساں نے اپنی بات دہرائی "اور تمہیں یہی کہنا ہے۔ میں نے جن ڈاکٹروں سے بات کی ہے۔ وہ بھی اس بات کی تصدیق کردیں گے۔ اس طرح تمہارے جرم کی نوعیت بدل جائے گی اور تمہاری سزا میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔"

"اوہ!" میں نے ایک گہری سانس لی "اب سمجھی۔ لیکن تم اتنی ہمدردی کیوں کر رہے ہو؟"

"یہ بات خود میری سمجھ میں نہیں آئی" گارساں مسکرا دیا۔ "ہو سکتا ہے کہ کبھی میرا تعلق بھی تمہارے مشرق سے رہا ہو۔ بہرحال میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک باحوصلہ لڑکی ہو۔ تم پریشانیاں برداشت کرلوگی۔ اور ہاں اس ملک میں خود کو تنہا مت سمجھنا۔ کم از کم تمہارا ایک دوست تو ہے۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ میرا اس کا رشتہ ہی کیا تھا۔ ایک دفعہ ملاقات ہوئی اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ میں نے اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔ اور یہ شخص میرا اتنا ساتھ دے رہا تھا۔ اتنی ہمدردی کر رہا تھا۔ اتنا حوصلہ دے رہا تھا۔ وہ مجھے دلاسے دے کر چلا گیا۔ میں نے نہ جانے کیوں اس کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ وہی بیان دیا جو اس نے کہا تھا۔ بہت دنوں تک میرے بارے میں بحث مباحثے ہوتے رہے۔ طرح طرح کے دلائل دیئے گئے۔ اخبارات میں میرا ذکر کیا گیا۔ امی کی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوا کرتی کہ ابھی تک امی کا کوئی رشتے دار سامنے کیوں نہیں آیا تھا حالانکہ امی اسی ملک کی تھیں۔ کسی نہ کسی کو تو سامنے آنا چاہئے تھا۔ پاکستان میں بھی امی نے اپنے کسی رشتے دار وغیرہ کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ میں اگر دریافت بھی کرتی تو وہ خاموش رہ جاتیں۔ امی کے خاندان کے بارے میں ابو بھی کچھ نہیں بتاتے تھے۔

یہ معمہ بھی گارساں ہی نے حل کیا۔ جب وہ ایک دن معمول کے مطابق مجھ سے ملنے آیا تو میں نے امی کے خاندان کا پتا چلانے کی درخواست کی۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ امی کا پرانا نام ازابیلا تھا اور وہ فرانس کے ایک قصبے سوہارو سے تعلق رکھتی تھیں۔ گارساں کئی دنوں بعد جب مجھ سے ملنے آیا تو اس کے ہاتھ میں پرانے اخبارات اور رسائل وغیرہ تھے۔

"میں نے تمہارے کہنے پر تمہاری امی کے ماضی کا پتا چلالیا ہے" اس نے بتایا "لیکن بہتر یہی تھا کہ تم معلوم نہ کرتیں۔"

"کیوں!" میں نے گارساں کی طرف دیکھا "جو کچھ بھی ہے، میں تو اب ہر قسم کی خبر سننے کی عادی ہو چکی ہوں۔"

"پہلے یہ تصویریں دیکھ لو۔" گارساں نے پرانے رسائل میرے سامنے رکھ دیئے۔

ان رسائل کے.... ٹائٹل پر یا اندرونی صفحات پر ایک دلکش لڑکی کی تصویر چھپی تھی۔ وقت نے اس کے چہرے کے نقوش میں تبدیلی تو کردی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ اس کی شناخت نہ ہو سکے۔ وہ تصویریں بلاشبہ امی کی تھیں۔ جب وہ جوان تھیں جب وہ بہت زیادہ خوب صورت اور طرح دار تھیں۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ وہ تصویریں مختلف انداز کی تھیں۔ شاید میری امی کوئی ماڈل گرل رہ چکی تھیں۔ یہ ایسا سچ تھا جسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا میری امی کوئی ماڈل گرل تھیں گارساں؟" میں نے دکھے ہوئے دل سے پوچھا۔

"ہاں۔ فرانس کی بہت مشہور ماڈل گرل" گارساں نے بتایا۔ "لیکن میں تمہارا نقطہ نظر سمجھ رہا ہوں۔ اس میں تمہارے لئے پشیمانی کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں تمہاری امی نہ تو پاکستان گئی تھیں' نہ تمہارے ابو سے ان کی شادی ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے تمہارا مذہب قبول کیا تھا۔ وہ چونکہ اس معاشرے کا ایک فرد تھیں اس لئے انہوں نے جو کچھ بھی کیا اپنے نقطہ نظر سے درست ہی کیا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ چلو تم مجھے ان کے بارے میں تفصیل سے بتادو۔"

ان رسائل وغیرہ میں امی کے بارے میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔ لیکن میری ایک مجبوری یہ تھی کہ میں فرانسیسی پڑھ نہیں سکتی تھی حالانکہ امی نے اہل زبان کی طرح بولنا سکھادیا تھا۔ لیکن فرانسیسی لہجے میری کمزوری تھی۔ اس لئے ابھی تک پڑھنے پر قادر نہیں ہو سکی تھی۔

"کیا واقعی اپنی امی کے بارے میں جان لینا چاہتی ہو؟"

"ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے" میں نے کہا "ماضی تو اپنی خوش گواری اور ناگواری سمیت گزر چکا ہے۔ جو کچھ ہونے والا تھا ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مجھے اپنی ماں کے بارے میں معلوم ہو جائے۔"

"تو پھر سنو۔ ازابیلا نامی ایک خوب صورت لڑکی سوہارو نامی ایک قصبے ہی پیدا ہوئی۔ اس کے والدین کسان تھے۔ لڑکی شروع ہی سے بہت خوب صورت اور ذہین تھی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی

گئی اس کے چاہنے والوں کا حلقہ بڑھتا چلا گیا۔ قصبے کے نوجوان اس کو حاصل کرنے کی تمنا میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے پھر یہ ہوا کہ وہ جس وقت پندرہ برس کی ہوئی۔ اس کے والدین ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ اور وہ اس دنیا میں تنہا رہ گئی۔ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ کوئی بہن نہیں تھی۔ دور ونزدیک کے کسی رشتے دار کا بھی پتا نہیں چل سکا۔ دلبرداشتہ ہو کر وہ لڑکی پیرس آگئی کہ یہاں زندگی گزارنے کے مواقع تھے۔ پیرس میں اس کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو لڑکیوں سے نہ صرف ماڈلنگ کرایا کرتا بلکہ ان کے جسموں کے سودے بھی کیا کرتا تھا۔ زندہ رہنے کے لئے ازابیلا نے اسی آدمی سے سمجھوتا کر لیا۔ اس طرح وہ نہ صرف ایک ماڈل گرل بلکہ ایک کال گرل بھی بن گئی۔"

"خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ گارساں" میں رو پڑی "میں اور نہیں سن سکتی۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ ماضی کو کریدنے سے بہتر یہی ہے کہ اسے یوں ہی رہنا دیا جائے پھر یہ کہ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ یہ کہانی تو ازابیلا نامی ایک لڑکی کی ہے۔ جو اس وقت تمہاری ماں نہیں تھیں۔ پشیمانی تو اس وقت ہوتی جب وہ تمہاری ماں ہونے کے بعد کال گرل ہوتیں پھر یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کتنی مجبور تھیں۔ اس کے علاوہ اب بہتر یہی ہے کہ اب تم ان کے بارے میں سب کچھ جان لو۔ ورنہ تمہارے دل میں ہمیشہ کے لئے خلش رہ جائے گی۔ ادھورا علم مکمل جہالت سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے گارساں تو بتاتے جاؤ کہ ازابیلا کے ساتھ کیا گزری" میں نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

"پھر ہوا یہ کہ وہ لڑکی اس ملک کی ایک مشہور ماڈل بن گئی۔" گارساں نے کہا "اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے مشاغل بھی جاری رہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کے ساتھ زبردستی کی گئی۔ دولت اور شہرت ملنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو فروخت کرنے سے انکار کر دیا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس شعبے میں انکار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ جو ایک دفعہ اس جال میں پھنس گیا' اس کا پیچھا نہیں چھوٹتا۔ چاہے اس کے پاس کتنی ہی دولت اور شہرت کیوں نہ آچکی ہو۔ اس نے انکار کیا' فرار ہونا چاہا۔ لیکن اسے اجازت نہیں دی گئی۔ اس پر تشدد کیا گیا اور ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ وہ لڑکی جنون کا شکار ہو گئی۔ اور اس نے اس شخص کو ہلاک کر دیا جس نے اس شعبے میں اس کی سرپرستی کی تھی۔"

"کیا!" میں حیران اور دکھی ہو گئی تھی "کیا میری امی نے بھی؟"

"ہاں' یہ ایک حقیقت ہے۔ تمہاری امی نے اس آدمی کا خون کر دیا تھا" گارساں نے بتایا "یہ ایک ایسا قدم تھا جس کی توقع تمہاری امی سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن ازابیلا یہ بھی کر گزری۔ اس نے اس آدمی کو مار دیا۔ ایک ہنگامہ مچ گیا کیونکہ قتل کرنے والی ایک مشہور لڑکی تھی۔ اس کے ہزاروں پرستار تھے۔"

"اوہ" میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں "اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم دونوں ماں بیٹی کی قسمت تقریباً ایک ہی جیسی تھی۔"

"ہاں یہ ایک حیرت انگیز اتفاق ہے" گارساں نے کہا "وہ جو کچھ لوگ کہتے ہیں نا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو اس معاملے میں تاریخ نے خود کو دہرا دیا ہے۔ لیکن جانتی ہو اس انکشاف سے فائدہ کیا ہوا ہے۔"

"اس سے کیا فائدہ ہو گا سوائے اس کے کہ میری پشیمانی اور شرمندگی میں اضافہ ہو تا رہے۔"

"نہیں۔ تمہاری امی کے اس کیس کا حوالہ دے کر تمہارے کیس کو کمزور کیا جا سکتا ہے" گارساں نے کہا "مجبوری سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ جنون تمہاری امی کے مزاج سے تم میں منتقل ہوا ہے۔ تم نے بالکل وہی کیا جو تمہاری امی نے کیا تھا۔"

"گویا میں اپنے کیس کے سلسلے میں اپنی ماں کے ماضی سے فائدہ اٹھاؤں۔"

"ہاں۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر روح کا کوئی وجود ہے تو تمہاری ماں کی روح یہ دیکھ کر بہت خوش ہو گی کہ وہ موت کے بعد بھی تمہارے کام آرہی ہے۔"

"چلو آگے بتاؤ' آگے کیا ہوا؟"

"آگے کی کہانی یہ ہے کہ ازابیلا کو سات سال کی قید ہو گئی۔" گارساں نے کہا "وہ سزا کاٹ کر رہا ہوئی تو دنیا بدل چکی تھی۔ اس کی شہرت اور دولت ختم ہو چکی تھی۔ اس کے لئے زندگی پھن کاڑھے ہوئے سانپ کی طرح ہو گئی تھی۔ اسی مایوسی کے عالم میں ایک پاکستانی نوجوان سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ازابیلا نے اس نوجوان سے کچھ نہیں چھپایا' اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس کے باوجود اس نوجوان نے ازابیلا کو سہارا دیا۔ اس سے شادی کی اور اسے اپنے ساتھ پاکستان لے گیا۔"

"اور وہ نوجوان میرے ابو تھے گارساں" میں رو رہی تھی۔ "میرے ابو ایک گریٹ آدمی تھے۔ مجھے ان پر فخر ہے۔"

"ازابیلا بھی ایک گریٹ لڑکی تھی۔"

"ہاں۔ میری ماں بھی گریٹ تھی۔ اور میں اس ماں کی بیٹی ہوں۔ میں بھی جبر کے آگے سر نہیں جھکا سکتی۔ میرے لئے بھی عورت کی توہین ناقابلِ برداشت ہے۔"

امی کی کہانی سن لینے کے بعد میرے دل کا بوجھ کم بھی ہوا اور بڑھ بھی گیا۔ احساس ہو گیا کہ عورت ہر جگہ' ہر ملک میں مظلوم ہے۔ وہ مردوں کے اس بے رحم معاشرے میں کسی کھلونے کی طرح ہوتی ہے۔ جب چاہا خود کھیلا اور جب چاہا' کسی اور کے حوالے کر دیا۔ گارساں نے ٹھیک کہا تھا کہ میری امی کا واقعہ کیس کو کمزور بنانے میں مفید ثابت ہو گا۔ ایک بار پھر امی کے کیس کے حوالے سے ہنگامے ہوئے' پرانی باتیں یاد دلائی گئیں۔ ارکان بحث کرتے رہے۔ پھر مجھے پانچ سال کی سزا سنا دی گئی۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ گارساں اس بات پر کیوں خوش تھا۔

میری سزا کے اعلان کے بعد جب وہ مجھ سے ملنے آیا تو اس کی خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہاری سزا صرف پانچ سال کی ہے" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے اسی بات کا تو افسوس ہے گارساں" میں دھیرے سے بولی "کیونکہ میں تو عمر قید یا سزائے موت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پانچ سال بعد ملنے والی زندگی کو کیا کروں گی۔ سزا کاٹ کر رہا ہونے کی خوشی تو ان کو ہوتی ہے جن کے لئے کوئی انتظار کر رہا ہو۔"

"میں ہوں نا۔" گارساں نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

میرے لئے کسی مرد کا وہ پہلا لمس تھا' ہاں وہ پہلا لمس تھا۔ حالانکہ ویسے تو سجاد حسین کے ساتھی بھی تھے جنہوں نے مجھے تار تار کر دیا تھا لیکن وہ مرد نہیں تھے۔ مرد کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے والے کو نہیں کہتے بلکہ محبت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ان کے لمس جبر اور تشدد کے لمس تھے۔ ان میں محبت کی چاشنی نہیں تھی لیکن گارساں کا لمس پیار کا لمس تھا۔ یہ وہ لمس تھا جس نے میرے وجود کو سرشار کر دیا۔ زندہ رہنے کی خواہش ہونے لگی۔

"گارساں آخر کیوں۔ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے۔ تم کو تو یہاں ویسے بھی بہت سی لڑکیاں مل جائیں گی۔ ایک سے ایک اچھی اور ایسی لڑکیاں جن کے ساتھ ماضی کا کرب شامل نہیں ہو گا۔"

"ہاں مل تو جائیں گی لیکن ان میں مس نورین کوئی نہیں ہو گی۔" گارساں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور میں نے یہ فیصلہ اسی دن کر لیا تھا جس دن پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔"

گارساں کے جانے کے بعد میں اپنے آپ پر سوچتی رہی' غور کرتی رہی۔ میری زندگی بھی کتنی مختلف تھی۔ کتنی لڑکیوں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے ہوں گے! کتنی لڑکیاں ایسے عذابوں اور امتحانوں سے گزری ہوں گی! اس کے بعد بھی گارساں مجھ سے ملنے کے لئے آتا رہا۔ ہر بار اس کے جذبے' اس کے ارادے' اس کی محبت پہلے سے زیادہ شدید محسوس ہوتی۔ قید میں گزارے جانے والے دن بھی خوش گوار محسوس ہونے لگے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ پانچ سال میں میری ہڈیاں کڑکڑانے لگیں گی۔ چہرہ مرجھا کر رہ جائے گا۔ آنکھیں اداس اور ویران ہو جائیں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں جب رہا ہوئی تو میری دل کشی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دوران میں نے محبت حاصل کر لی تھی اور محبت تو پتھروں میں بھی نمو کے کرشمے دکھا دیتی ہے' میں تو خیر انسان ہی تھی۔

گارساں نے میرا بہت والہانہ پن' بہت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اس نے میرے لئے ایک فلیٹ سجا کر رکھا تھا۔ میں اس کے احسانات کا بوجھ نہیں چاہتی تھی لیکن اس نے اتنا مجبور کیا کہ میں اس کے فلیٹ میں منتقل ہو گئی۔ میں نے اب تک سوائے ابو کے ہر مرد کو بھیانک ہی دیکھا تھا اس لئے کچھ دنوں تک گارساں پر اعتماد قائم نہیں ہو سکا لیکن وہ ایسا شخص تھا جس نے میری مجبوریوں کے حوالے سے مجھ پر مسلط ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ وہ میرے ساتھ فلیٹ میں خود بھی رہنا چاہتا ہے۔ بلکہ وہ روزانہ شام کے وقت میری خیریت معلوم کرنے آجایا کرتا۔ اس دوران مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ معلوم کیا ہوا' اس نے خود ہی بتایا تھا۔

وہ پیرس یونیورسٹی سے سائنس کی ڈگری حاصل کر چکا تھا۔ اس کے والدین اسی شہر میں رہتے تھے لیکن مغرب کے تقریباً ہر گھرانے کی طرح وہ اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ گارساں اس زمانے میں ایک لیبارٹری میں ریسرچ ورکر تھا۔ اچھی خاصی آمدنی تھی اور وہ اپنی زندگی کے معاملات میں خود مختار تھا۔ میں جانتی تھی کہ ایک دن وہ مجھ سے شادی کی درخواست کرے گا لیکن حیرت یہ تھی کہ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ہمارے درمیان دنیا بھر کے موضوع پر بات ہوئی سوائے اس موضوع کے۔ میں اُس کے اس رویے سے حیران بھی ہوا کرتی تھی۔ بالآخر جب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا تو میں نے خود ہی اس موضوع پر بات کر لی۔ میری بات سن کر وہ مسکرا دیا تھا۔

"میں جانتا تھا کہ تم ضرور یہ پوچھو گی" اس نے کہا "لیکن بات صرف اتنی ہے کہ مجھ میں ہمت نہیں ہے کیونکہ میں نے سوچا کہ اگر میں نے اس قسم کی کوئی درخواست کر دی تو تمہارے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہی آئے گا کہ میں تمہاری مجبوریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے اور تمہارے درمیان مذہب کا بھی فرق ہے۔ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ دونوں کا مذہب الگ الگ ہو اس کے باوجود زندگی گزرتی رہتی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہوتا بلکہ آگے چل کر بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے یا تو تم میرا مذہب قبول کر لو یا میں مسلمان ہو جاؤں۔ درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"تم یقین کرو گارساں کہ تم نے آج شاید مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے دی ہے۔" میں نے کہا "کیونکہ مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی واضح اور صاف صاف بات کرو گے۔ تم شاید وہ پہلے آدمی ہو جس نے میرا نام دریافت کرنے سے پہلے میری طرف ہوس بھرا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اور اپنی پسند کے سلسلے میں مذہب کو اہمیت دی۔ اب سوال یہ ہے کہ ایک دوسرے کو اپنانے کے لئے کیا کیا جائے۔ تو ایسا کرتے ہیں کہ اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑتے ہیں۔"

"نہیں۔ وقت ہمارا فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور میرے اختیار میں یہ ہے کہ میں اسلام قبول کر لوں۔"

"کیا!" میں نے بے یقینی سے گارساں کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ میں نے جس دن تمہیں پہلی بار دیکھا' اس وقت مجھے احساس ہوا کہ تم یہاں کی لڑکیوں سے بہت مختلف ہو۔ تمہارے اندر جو شرم اور جھجک تھی' اس کا تو یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ مغرب کا ہر شخص عریانیت اور بے

شری کو پسند کرتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے...... یقیناً تمہارے یہاں بہت سے لوگ مغرب کی نقل کرتے ہوں گے۔ تو قصہ مختصر یہ کہ جب میں نے تم کو دیکھا' تمہارے انداز دیکھے تو تمہارے مذہب کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوئی۔ میں نے گزشتہ پانچ برسوں میں تمہارے دین کا نہ صرف اچھا خاصا مطالعہ کرلیا بلکہ خدا کے فضل سے آج میں کارساں نہیں بلکہ عبدالواحد ہوں۔ ہاں' میرا اسلامی نام عبدالواحد ہی ہے۔"

میں پھر رو رہی تھی۔ اس بار یہ آنسو خوشی کے تھے۔ جب خوشیاں بھی اچانک اور غیر متوقع مل جائیں تو آنکھیں اسی طرح رویا کرتی ہیں۔ کارساں نہیں بلکہ عبدالواحد نے بہت دیر بعد یہ خبر سنائی تھی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ اس طرح مجھے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ ایک خواب کی طرح تھا۔ اس شہر میں اسلامی طریقے پر ہماری شادی ہو گئی۔ اس شادی میں عبدالواحد کا خاندان اس سے کٹا ہوا نہیں تھا بلکہ وہ سب کے سب شریک ہوئے تھے۔ اس کے ماں باپ' اس کے بہن بھائی سب کے سب بہت اچھے اور سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ ان کے بیٹے نے اپنا مذہب ترک کردیا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں شخصی آزادی کے قائل تھے۔

شادی کے بعد ہم نے پیرس ہی میں رہائش اختیار کرلی۔ عبدالواحد نے مجھے اتنی محبت دی' اتنی محبت دی کہ عمر بھر کی محرومیوں کا ازالہ ہو گیا تھا۔ وہ مکمل اسلامی سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ میں تو خیر شروع ہی سے اس مزاج کی تھی اور عبدالواحد کی وجہ سے ہمارے گھر کا ماحول بھی پاکیزہ ہو گیا تھا۔ عبدالواحد ایک پڑھے لکھے انسان تھے۔ اس لئے ہمیں کسی قسم کی معاشی پریشانیاں بھی نہیں ہوئی تھیں۔ ہم بہت خوش تھے اور اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لئے ہمارے گھر ایک بچی کی پیدائش بھی ہو گئی۔

وہ بچی ہم سب کا عکس تھی۔ امی کا' ابو کا۔ عبدالواحد کا اور میرا۔ اس نے میری ہی طرح بے مثال حسن پایا تھا۔ ہم نے اس کا نام صالحہ رکھا تھا۔ صالحہ واحد۔ ایک خوب صورت نام ایک خوب صورت بچی۔ ہماری خوشیاں شاید مکمل ہو گئی تھیں۔

دن گزرتے گئے۔ اب صالحہ آٹھ برس کی ہو گئی تھی۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ راہ چلتے لوگ اسے دیکھ کر رک جاتے۔ عبدالواحد بالکل ایک مرد مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ سرخ و سفید رنگ پر داڑھی بہت بھلی لگتی تھی۔ ہم نے یہ دھیان رکھا تھا کہ اس ماحول میں بھی صالحہ کی تربیت خالص اسلامی اور مشرقی طرز پر ہو۔ ہم اسے اسلامی تعلیمات گھر پر دیا کرتے۔ اسکول وغیرہ میں ایسا بندوبست کہاں سے ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے اردو بھی سکھادی تھی تاکہ اپنی ثقافت سے بھی اس کا رابطہ بحال رہے۔ فرانسیسی تو خیر اس کی زبان ہی تھی۔ ہم یہ سوچ کر خوش تھے کہ ہم نے یہاں کے ماحول سے اسے بچا کر رکھا ہے لیکن یہ ہماری خوش فہمی تھی۔ ماحول دراصل ایک ایسے آکٹوپس کی طرح ہوتا ہے جو غیر محسوس طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ہمیں ماحول کی اس سنگینی کا احساس اس وقت ہوا جب صالحہ بارہ برس کی ہوئی اور ایک دن اس نے مجھ سے رات کو ایک ڈانس پارٹی میں شرکت کی اجازت طلب کی۔ میں یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ خدایا کیا اسی دن کے لئے میں نے اتنی احتیاط برتی تھی؟

"کیا! تم ڈانس پارٹی میں جاؤ گی؟"

"ہاں امی۔ میرے اسکول کے ساتھی بھی جا رہے ہیں" صالحہ نے کہا "میں نے سوچا کہ آپ سے اجازت لے لوں۔"

"تو کیا اس سے پہلے بھی جاتی رہی ہو؟"

"ہاں امی!" صالحہ نے گردن جھکالی "دو بار گئی تھی لیکن وہ تقریب دن میں ہوتی تھیں۔ اسکول والوں کے ساتھ گئی تھی اور دوپہر کے وقت تک واپس آگئی۔ لیکن آپ کے خوف سے میں نے آپ کو نہیں بتایا تھا۔ آپ یقین کریں کہ ہم وہاں جمع ہو کر ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔"

میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ صالحہ یہ سب کیا کہہ رہی تھی۔ مجھے تو اس لڑکی پر بہت مان تھا' بڑا فخر تھا کہ خالص یورپ کے ماحول میں وہ مشرقی اقدار کی نمائندہ ہے لیکن اس کا ماحول اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی تھا اور یہ معاشرہ ایک طرف۔ بھلا ہم کیا کر سکتے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہاں صرف ہنسی مذاق ہوا کرتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ یہی ابتدا ہوا کرتی ہے' ایک بڑی تباہی کی۔ ایک بڑے طوفان کی۔ میں نے صالحہ کو سختی کے ساتھ منع کردیا۔ چونکہ اس کی تربیت ذرا مختلف انداز سے ہوئی تھی اس لئے اس نے میرا حکم مان لیا ورنہ وہ اگر بغاوت کرجاتی تو میں کیا کرسکتی تھی۔

میں نے اس رات صالحہ کے موضوع پر جب عبدالواحد سے بات کی تو وہ بھی گم صم سے رہ گئے۔ (انسان اگر مذہب کو اپنی روح میں اتارلے تو اس کی شخصیت' اس کا مزاج بلکہ اس کی فطرت تک کس طرح تبدیل ہو جاتی ہے' اس کا اندازہ عبدالواحد کو دیکھ دیکھ کر ہوا کرتا تھا)

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہم اپنی بچی کے تحفظ کی خاطر یہاں نہیں رہ سکتے" عبدالواحد نے کہا "دیکھو نورین۔ میری اور تمہاری بات الگ تھی۔ کیونکہ ہم اپنے شعور کے اس مرحلے پر تھے جہاں سے ہم اختیاری طور پر خود کو یا تو سنبھال سکتے تھے یا برباد کرسکتے تھے۔ لیکن ہم نے خود کو سنبھال لیا۔ اب جہاں تک صالحہ کا تعلق ہے تو ہم اس کو ماحول کے اثرات سے الگ نہیں رکھ سکتے۔ اگر ہم کسی قسم کا جبر کرتے ہیں تو اس کے مزاج میں بغاوت پیدا ہو جائے گی جو اور بھی خطرناک ہوگی۔"

"تو کیوں نہ ہم پاکستان چلیں؟" میں نے مشورہ دیا۔

"کیا کہا! پاکستان؟" عبدالواحد نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں! ہمیں وہی ایک جائے اماں نظر آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہزار خرابیوں کے باوجود وہاں معاشرتی اور اخلاقی قدریں ابھی موجود ہیں۔ ہم اگر چاہیں تو خالص اسلامی طور پر صالحہ کی پرورش کرسکتے ہیں۔ میں پاکستانی شہریت رکھتی ہوں اور آپ میرے شوہر ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے پاس سائنس کی وہ ڈگری ہے جس کی ضرورت پاکستان جیسے ملک کو ہے' اس لئے ہمیں وہاں رہنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" عبدالواحد نے ایک گہری سانس لی "میں تو بہرطور اپنی عاقبت محفوظ دیکھنی چاہتا ہوں۔ اور پاکستان سے بہتر کوئی جگہ نظر میں نہیں ہے۔"

اسی دن سے ہم نے پاکستان کے لئے تیاریاں شروع کردیں۔ سفارت خانے میں بھاگ دوڑ۔ عبدالواحد کے لئے مناسب کام کی تلاش۔ کاغذات کی تیاریاں اور نہ جانے کیا کیا۔ کبھی کبھی یہ سوچا کرتی کہ میرے ابو کے خاندان والوں کا کیا حال ہوگا۔ پتا نہیں' ان میں سے کتنے ہیں اور کتنے نہیں ہوں گے۔ کتنا طویل عرصہ گزر گیا تھا' ان لوگوں نے تو شاید یہ سمجھ لیا ہوگا کہ میں مرکھپ چکی ہوں گی۔ اب اگر میں ان کے سامنے بھی آجاتی تو وہ مجھے پہچان نہیں سکتے تھے۔ خدا سے میری یہی دعا تھی کہ کاش کوئی سامنے نہ آئے۔ میں پرانے زخموں کو کریدنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

ایک ماہ کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد بالآخر وہ دن آگیا' جب ہم پاکستان کے لئے پرواز کررہے تھے۔ ہم نے اپنا فلیٹ فروخت کردیا تھا۔ سامان بھی فروخت ہوگیا تھا۔ صالحہ اس بات پر تھوڑی سی جزبز بھی ہوئی تھی کہ ہم فرانس کو چھوڑ کر پاکستان جارہے ہیں۔ پھر نئے ملک کو دیکھنے کی خواہش اس کی ناراضگی پر غالب آگئی۔ عبدالواحد کو کراچی ہی میں ایک دواؤں کی کمپنی میں بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ وہاں موجود ایجنٹ نے ہمارے لئے شہر کے ایک بہتر علاقے میں رہائش کا بندوبست بھی کردیا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ کراچی میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوگی' آخر وہ میرا اپنا شہر تھا۔

ہماری توقع کے عین مطابق کراچی میں ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ سب کچھ ہمارے مزاج اور ہماری پسند کے مطابق ہی تھا۔ واحد نے ملازمت پر جانا شروع کردیا۔ ہمارا مکان بہت خوب صورت تھا۔ صالحہ بھی یہاں آکر بہت خوش تھی۔ کسی بات کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ ہم نے صالحہ کی صورت میں اپنا معاشرتی اور مذہبی تشخص بچالیا تھا۔ ایک دو ماہ گھر کو اڈجسٹ کرنے میں لگ گئے تھے' پھر رفتہ رفتہ زندگی اپنے معمول پر آگئی۔ کراچی اب بہت تبدیل ہوچکا تھا۔ میں تقریباً سترہ برس بعد کراچی آئی تھی۔ اس زمانے میں جوڈو کراٹے یا مارشل آرٹ سکھانے والی ایک دو ہی درس گاہیں تھیں جن میں سے ایک احمد حسین صاحب کی تھی۔ اب جگہ جگہ ایسے ادارے وجود میں آچکے تھے۔ کون جانے ان میں سے کتنے کمرشل بنیادوں پر تھے اور کتنے اداروں کو احمد حسین جیسے شخص کی سرپرستی حاصل تھی۔

میں ایک دن اس درس گاہ کی طرف بھی گئی لیکن وہ درس گاہ ختم ہوچکی تھی۔ اب وہاں ایک پانچ منزلہ عمارت قائم تھی۔ اِدھر اُدھر معلوم کرنے سے پتا چلا کہ احمد حسین صاحب کا ایک عرصہ پہلے انتقال ہوچکا ہے۔ صالحہ کو میں نے بڑی حد تک کراچی کے علاقوں سے روشناس کرادیا تھا پھر ایک اچھے سے اسکول میں اس کا داخلہ بھی کرادیا گیا۔ آدمی چاہے جہاں بھی رہے حالات کچھ دنوں کے بعد اپنے معمول پر آہی جاتے ہیں۔ یہ وقت ایک دائرے ہی میں سفر کرتا ہے۔ یہ دائرہ ہی ہمیں معمول کے مطابق رکھتا ہے۔

ہمارے حالات معمول پر آتے گئے۔ یہاں ہمیں وہ کی آسانیاں تو حاصل نہیں تھیں' پھر بھی یہ ہمارا اپنا ملک تھا۔ ہر طرف اپنے لوگ تھے۔ اپنی معاشرت تھی جن کے درمیان زندگی گزر رہی تھی۔ ہمیں سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ ہم نے صالحہ کو محفوظ کرلیا تھا' بے راہ روی کے طوفان سے اس کو بچاکر لے آئے تھے۔

ایک دن جب میں اور عبدالواحد مکان کے برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو صالحہ اپنے کمرے سے نکل کر بہت تیزی سے ہمارے پاس آگئی۔ اس نے کہیں جانے کے لئے لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ جوش اور خوشی سے تمتمارہا تھا۔ اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سنیں۔ آج شام مجھے اپنی ایک سہیلی گل افشاں کے یہاں جانا ہے۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہے" عبدالواحد نے کہا "کیا اس کے یہاں کوئی تقریب ہے؟"

"ہاں پاپا' بہت زوردار تقریب۔ آج اس کے یہاں ایک ڈانس پارٹی ہے۔"

"کیا!" میرے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی "کیا کہہ رہی ہو۔ ڈانس پارٹی اور یہاں۔"

"ہاں می۔ پہلے تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا لیکن اب پتا چلا کہ یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ بڑے بڑے امیر گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں' خوب ڈانس کیا جاتا ہے۔ سب انجوائے کرتے ہیں۔ میں تو اس کو ایک بور ملک سمجھ رہی تھی لیکن یہاں تو سب کچھ ہے۔"

میں نے عبدالواحد کی طرف زخمی نگاہوں سے دیکھا۔ عبدالواحد بھی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ ان کی نگاہیں پوچھ رہی تھیں "نورین' ہم صالحہ کو فرانس کے ماحول سے بچاکر پاکستان لے آئے ہیں' اب یہ بتاؤ' ہم پاکستان سے کہاں لے جائیں۔"